کلیاتِ پریم چند

10

مُرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ پریم چند

10

پریم پچاسا

مرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک ۱، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی

Kulliyat -e- Premchand- 10

Edited by: Madan Gopal
Project Assistant: Dr. Raheel Siddiqi
Project Coordinator: Dr. Md. Ahsan

سنہ اشاعت : جولائی، ستمبر 2001 شک 1923

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : =/183

سلسلہ مطبوعات : 872

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1- آر کے پورم نئی دہلی 110066

طابع: ویپ انٹر پرائزز گرین پارک، نئی دہلی 110016

پیش لفظ

اردو زبان و ادب میں پریم چند کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ عرصۂ دراز سے ان کی تصانیف مختلف سطحوں کے تعلیمی نصابوں میں شامل رہی ہیں۔ ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن یکجا صورت میں منظرعام پر آئیں۔ بالآخر قومی اردو کونسل نے پریم چند کی تمام تحریروں کو "کلیاتِ پریم چند" کے عنوان سے مختلف جلدوں میں ایک مکمل سِٹ کی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کلیات 22 جلدوں پر مشتمل ہوگا جس میں پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبارِ اصناف یکجا کیے جائیں گے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ناول : جلد 1سے 8 تک ، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک، ڈرامے :
جلد15 و جلد 16 ، خطوط : جلد17، متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک،
تراجم : جلد 21 و جلد 22 تک

"کلیاتِ پریم چند" میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے مختلف شہروں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور پریم چند سے متعلق شخصیتوں سے بھی ذاتی طور پر ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں پریم چند کے پسرزادے پروفیسر آلوک رائے نے بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائیں۔

"کلیاتِ پریم چند" کی ترتیب میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ہر صنف کی تحریریں زمانی ترتیب کے ساتھ شاملِ اشاعت ہوں اور ہر تحریر کے آخر میں اول سنِ اشاعت، جس میں شائع ہوئی ہو، اس رسالہ کا نام اور مقامِ اشاعت بھی درج ہو۔ اس سے مطالعہ پریم چند کے نئے امکانات پیدا ہوں گے۔ ہماری کوشش ہے کہ "کلیاتِ پریم چند" میں شامل تمام تحریروں کا مستند متن قارئین تک پہنچے۔

"کلیاتِ پریم چند" کی شکل میں یہ منصوبہ نقشِ اولیں ہے ہماری پوری کوشش کے باوجود جہاں تہاں کوئی کوتاہی راہ پاسکتی ہے۔ مستقبل میں پریم چند کی نودریافت تحریروں کا

خیر مقدم کیا جائے گا اور نئی اشاعت میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔ کلیات سے متعلق قارئین کے مفید مشوروں کا بھی خیر مقدم کیا جائے گا۔

اردو کے اہم اور بنیادی کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کو انتخاب کرنے اور انھیں شائع کرنے کا فیصلہ قومی کونسل کی ادبی پینل کی کمیٹی کے ذریعے لیا گیا ہے۔ اس کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور ارکان پروفیسر شمیم حنفی، جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب بلراج پوری، پروفیسر نیّر مسعود، جناب احمد سعید ملیح آبادی اور کونسل کے نائب چیئرمین جناب راج بہادر گوڑ کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے اس پروجکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری معاونت فرمائی۔ "کلیاتِ پریم چند" کے مرتب مدن گوپال اور ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

ہمیں امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح "کلیاتِ پریم چند" کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

فہرست

پیش گفتار

منشی پریم چند نے اپنے سوانحی مضمون "میری کہانی" میں لکھا کہ ان کی ادبی زندگی کی شروعات 1900 میں مضمون اور ناول سے ہوئی۔ انھوں نے اسی مضمون میں لکھا تھا کہ اپنی پہلی کہانی 1907 میں لکھی تھی اور اس کہانی کا عنوان تھا دُنیا کا سب سے انمول رتن، یہ کانپور کے رسالہ زمانہ میں چھپی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کہانی زمانہ میں نہیں چھپی، یہی نہیں بلکہ اس دور کی تین اور کہانیاں بھی شیخ مخمور، یہ میرا وطن ہے، صلۂ ماتم۔ جس مجموعہ میں یہ شائع ہوئی اس کی صرف ایک کہانی حبِ وطن زمانہ (اپریل 1908) میں شائع ہوئی۔ جون 1908 میں ان پانچوں کہانیوں کو سوزِ وطن مجموعے میں زمانہ پریس نے نواب رائے کے نام سے شائع کیا۔

پریم چند کے اپنے الفاظ میں، اس وقت ملک میں تقسیم بنگال کی سورش برپا تھی اور کانگریس میں گرم دل کی بنیاد پڑچکی تھی۔ ان پانچوں کہانیوں میں حب وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔ یہ نئے زمانے کی آمد...... دیباچے میں لکھاتھا۔ "ہرایک قوم کا علم ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتاہے۔ جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے ہیں اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں۔ وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہورہے تھے۔ اس زمانے کی ادبی یادگار بجز عاشقانہ غزلوں اور چند سفلہ قصوں کے اوپر کچھ نہیں تھا۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے اور پُرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاح تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص وحکایات زیادہ تر اصلاحی اور تجدیدی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اور حب وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر اُبھارنے لگے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ اِس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند

کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں۔ اور یقین ہے کہ جیوں جیوں ہمارے خیال رفیع ہوجائیں گے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حُبِ وطن کی عظمت کا نقطہ جمائیں"۔سوزوطن کا اشتہار اگست 1908 میں زمانہ میں شائع ہوا۔ اشتہار شاید مصنف نے آپ ہی لکھاتھا، یہ تھا۔

"سوزوطن سوزوطن سوزوطن"۔

"زمانہ کے مشہور اور مقبول مضمون نگار منشی نواب رائے کی تازہ ترین اور بہترین اردو زبان میں حُسن و عشق، وصل و فراق، عیاری و مکاری، جنگ و جدل وغیرہ کی بہت سی داستانیں موجود ہیں اور ان میں بعض بہت ہی دلچسپ ہیں۔ مگر ایسے قصے جن میں سوز وطن کی چاشنی ہو، جن میں حب وطن ایک ایک حرف سے ٹپکے، اس وقت تک معدوم تھے۔ اس کتاب میں پانچ قصے لکھے گئے اور سب دردِ وطن کے جذبات سے پُر ہیں ممکن ہے کہ انھیں پڑھ کر ناظرین کے دل میں وطن کی الفت کا پاک جذبہ موجزن ہوجائے۔ بیانیہ نہایت لطیف اور دلکش ہے اور اندازِ بیان رقت آمیز۔ سائز چھوٹا، لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ اعلیٰ قسم کا سودیشی قسم اول اور نیز معمولی سودیشی کاغذ پر۔ قیمت چار آنہ قسم دوم معمولی سودیشی کاغذ پر قیمت تین آنہ ۔ چھ جز کی کتاب اس قیمت پر مفت ہے۔"

فرمائش بنام منیجر زمانہ۔ نیاچوک کانپور۔

سوز وطن کے تبصرے آریہ گزٹ، سوراجیہ، ہندوستان وغیرہ میں شائع ہوئے، فروری 1909 میں نواب رائے نے سوزِ وطن کی ایک کاپی ہندی کے مشہور رسالے سرسوتی کے ایڈیٹر کو تبصرہ کے لیے بھیجی۔ ایڈیٹر مہابیرپرساد دویدی نے لکھا "اس کتاب کی رچنا اردو کے مشہور ادیب نواب رائے نے کی ہے۔ قیمت ۴۰ر ملنے کا پتہ بابو وجے نرائن لال نیاچوک کانپور۔" یہ وجے نرائن لال نواب رائے کے ہم عمر اور سوتیلی ماں کے بھائی تھے اور نواب رائے کے گھر پرہی رہتے تھے۔ مصنف نواب رائے کا پتہ اس طرح پبلک کے سامنے تھا۔

سوزِ وطن زمانہ پرلیس میں چھپی تھی۔ غلطی سے زمانہ پریس کے نام کو کتاب پر نہیں دیاگیا ۔ اس وقت کے قانون کے تحت یہ ایک جرم تھا۔ پولیس نے تفتیش شروع کردی، اور انھیں پتہ چلاکہ کتاب کا مصنف نواب رائے ایک سرکاری ملازم ہے جس کا اصل نام ہے

دھنپت رائے ہے۔ اطلاع حکام تک پہنچی۔ ضلع کے کلکٹر نے دھنپت رائے کو طلب کیا اور جیسا پریم چند نے "اپنی کہانی" میں لکھا ہے۔ دھنپت رائے سے سوزِ وطن کی ہر کہانی کے بارے میں جانکاری حاصل کر کے کہا کہ ان سب کہانیوں میں Sadition (بغاوت) بھرا ہے۔ اگر تم مغل راج میں ہوتے تو تمھارے ہاتھ کاٹ دیۓ جاتے۔ شکر ہے برٹش سرکار ہے۔ جتنی کاپیاں پڑی ہیں ان کو کلکٹر کے حوالے کردو" دھنپت رائے کو تاکید بھی کی گئ کہ آگے سے لکھنا بند کرو۔ اگر لکھو تو سرکاری محکمے کی اجازت لے کر چھپواؤ۔

ادھر نواب رائے کے افسانوں کی شہرت اور اُدھر یہ پابندی ۔ ایک قصہ آتش کدۂ گناہ زمانہ کے دفتر میں پڑا تھا۔ دیانرائن نگم نے اس کے مصنف کا نام نواب رائے کے بجائے افسانہ کہن رکھا۔ یہ مارچ 1910 کے زمانہ مین چھپا۔ اپریل 1910 کے شمارے میں ایک اور افسانہ چھپا۔ عنوان تھا سیر درویش اس پر مصنف کا نام نواب رائے ہی دیاگیا، مگر اپریل اور مئ کی قسطوں پر کوئی نام نہیں۔ صرف جملہ حقوق محفوظ لکھا گیا۔ اگست 1910 کے شمارے میں ایک قصہ چھپا رانی سارندھا مصنف کا نام نہیں دیاگیا۔ سرکاری حکم کی تعمیل سے بچنے کے لیے دھنپت رائے نے ایک نیا قلمی نام اختیار کیا۔ یہ تھا پریم چند۔ کیونکہ اسے دیانرائن نگم نے ہی تجویز کیا تھا۔ یہ نام صرف زمانہ کے لیے ہی محدود تھا۔ ایک نیا رسالہ ادیب نکلا تھا اس کے ایڈیٹر تھے ان کے دوست پیارے لال شاکر میرٹھی۔ اس میں مصنف کا نام اس طرح لکھاجاتا تھا۔ "د۔ر" (دھنپت رائے)۔

پریم چند کے نام سے شائع ہونے والی پہلی کہانی تھی بڑے گھر کی بیٹی یہ دسمبر 1910 کے زمانہ کے شمارے میں شائع ہوئی۔ نام میں کچھ جادو تھا۔ یہ قصہ دنیا بھر کی زبانوں سے ٹکر لے سکتا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دھنپت رائے بندیل کھنڈ کے کئ مقامات کا دورہ کرتے تھے۔ بندیلوں اور راجپوتوں کی بہادری کے قصے سنتے تھے۔ انھیں قلم بند کرنے لگے۔ یہ بھی حبِ وطن کا دوسرا پہلو تھا۔ رانی سارندھا کے علاوہ وکرمادتیہ کا تیغہ، راجہ ہردول، آلہا وغیرہ قصے لکھے گئے۔ کرشمۂ انتقام زمانہ میں شائع ہوا۔ دونوں طرف سے، خوفِ رسوائی، بڑی بہن، دھوکے کی ٹٹی ادیب میں۔ منزلِ مقصود، عالم بے عمل، راج ہٹ، مامتا وغیرہ بھی انھیں دنوں چھپے۔

پریم چند کے افسانے بہت مقبول ہوئے۔ دھوم مچ گئی۔ اردو سے ہندی میں ترجمے ہوئے اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ان کے ترجمے شائع ہونے لگے۔ پریم چند نے سوچا پچیس افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جائے، وہ افسانے تھے: مامتا، وکرمادتیہ کا تیغہ، بڑے گھر کی بیٹی، رانی سارندھا، راج ہٹ، راجہ ہردول، نمک کا داروغہ، عالم بے عمل، گناہ کا اگن کنڈ، بے غرض محسن، آہ بیکس، آلہا، خون سفید، صرف ایک آواز، اندھیر، بانکا زمیندار، تریا چرتر، سوت، شکاری راج کمار، کرموں کا پھل، مناؤن، مرہم، اماوس کی رات، غیرت کی کٹار، منزل مقصود، افسانے مقبول تھے مگر پبلیشروں کا قحط تھا۔ کوئی شائع کرنے کو تیار نہ تھا۔ پریم چند نے فیصلہ کیا کہ اسے زمانہ پریس سے شائع کرایا جائے۔ دیانرائن سے شرکت کی بات کی۔ اگر نقصان ہوا تو آدھا آدھا۔ زمانہ پریس کو پیشگی درکار تھی مگر منیجر نے مطلع کیا کہ ان کو رسالہ سے ملنے والی رقم پیشگی رقم سے زیادہ ہے۔ خیر خط و کتابت شروع ہوئی یکم اکتوبر 1913 کو پریم چند نے دیا نرائن نگم کو لکھا "غالباً پریم پچیسی اب شب بلا تک نہ چھپ سکے گی...... اگر آپ کا پریس اتنا وقت ہی نہ نکال سکے تو میں بدرجہ مجبوری یہ التماس کروں گا کہ یا تو میرے 72 روپے عطا فرمائیں یا پریم پچیسی کے $4\frac{1}{2}$ جزو چھپے ہوئے ریل کے ذریعے میرے پاس بھیج دیں۔ غالباً ان درخواستوں میں میں غیر معقولیت سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ میں کسی دوسرے پبلیشر کو ڈھونڈوں گا۔ اور نہ مل سکا تو اس ساڑھے چار جزو کو ٹائٹیل پیج لگاکر ساڑھے چار جزو کی کتاب بنالوں گا۔ صرف دیباچہ اور ٹائٹیل کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ بھی نہ ہوسکا تو شہد اور گھی لگاکر ان اوراق پریشاں کو چاٹوں گا اور سمجھوں گا کہ زرخود میخورم، یا میوۂ محنت خود میخورم۔ بہرحال آپ جو کچھ فیصلہ کریں جلد کریں اور مجھے مطلع فرمائیں۔ قیامت کے انتظار میں بیٹھنے سے تو یہی بہتر ہے کہ جو کچھ، اس وقت ملتا ہے مل جائے"۔

اگلے ہی مہینے: "آپ میری کتاب جلدی سے چھپوا دیجیے تاکہ اس کی قدردانی دیکھ کر دوسرے حصے میں ہاتھ لگے۔ اور کچھ منافع بھی ہو۔ کیا کہوں آپ نے مجھے اچھالنے میں کوئی کسر نہیں رکھی، خوب اچھالا، مگر میں ہی قسمت کا اندھا ہوں کہ پرواز نہیں کرسکتا بلکہ نیچے گرنے کے لیے ڈرتا ہوں"۔ بعد میں پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا کہ پریم پچیسی میں نے اپنے خرچ پر زمانہ پریس سے چھپوائی تھی۔

پریم پچیسی کی کاپیوں کو اعلیٰ ادیبوں اور نقادوں کو بھیجا گیا تاکہ ان کی رائے آئے اور ان کا رسائل میں دئے جانے والے اشتہاروں میں استعمال کیا جاسکے۔ تبصرہ کے لیے بھی کاپیاں ارسال کی گئی۔ اشتہار چھپوائے گئے۔

پریم پچیسی دو حصوں میں شائع ہوئی۔ حصہ اول کو چھپنے میں تین سال لگ گئے۔ یہ 1914میں شائع ہوئی۔ الناظر لکھنؤ کے ستمبر 1915 کے شمارے میں ایک اشتہار شائع ہوا جس میں ڈاکٹر محمد اقبال کی رائے درج ہے۔ علامہ اقبال نے مصنف کو تحریر فرمایا تھا۔ ''آپ نے اس کتاب کی اشاعت سے اردو لٹریچر میں ایک نہایت قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نتیجہ خیز افسانے جدید اردو لٹریچر کی اختراع ہیں۔ میرے خیال میں آپ پہلے شخص ہیں جس نے اس راز کو سمجھا ہے اور سمجھ کر اس سے اہل ملک کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ان کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف انسانی فطرت کے اسرار سے خوب واقف ہے اور اپنے مشاہدات کو ایک دلکش زبان میں ادا کرسکتاہے''۔

منشی جی کی کہانیاں مقبول تو تھیں مگر کتابی صورت میں یہ بکتی نہیں تھیں۔ 2/مارچ 1917کو پریم چند نے دیانرائن نگم کو لکھا پریم پچیسی حصہ دوم میں ذرا سرگرمی فرمایئے...... جلدی ختم ہوجائے۔ ابھی بہت کچھ چھپوانا ہے۔ اگر پہلی منزل میں اتنا رُکے تو پھر اتنی لمبی زندگی کہاں سے آئے گی۔ تعطیل گرما کے پہلے ختم ہوجانا ضروری ہے۔

پریم پچیسی حصہ دوم کے بارے میں امتیاز علی تاؔج کو لکھا کہ اس کے چھپوانے کا کام شروع کردیا ہے۔ اور یہ یکم جولائی 1917تک پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا''۔ زمانہ کے مدیر نے لکھا ''یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ منشی پریم چند کے افسانوں نے پبلک میں کتنی شہرت حاصل کی ہے۔ یہ امر تسلیم ہے کہ صاحب موصوف کے زبردست اور عظیم قلم نے اپنے جادو بھرے قصوں میں اخلاقی اوصاف، حبِ وطن و حُسن و عشق کی بولتی چالتی تصویریں اور ان کے نہایت پاکیزہ پہلو کو نرالے ڈھنگ میں دکھائے ہیں۔ پریم پچیسی حصہ دوم میں ایسے دلچسپ اور پُراثر قصے درج کئے گئے ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شائقین جو منشی پریم چند صاحب کے جادونگار کا نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں قیمت ایک روپیہ''۔

پریم پچیسی کا حصہ اول 1914 میں شائع ہوا تھا حصہ دوم 1918 میں۔ ایک سال

بعد پریم چند نے نگم کو لکھا کہ "آپ کے منیجر کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم پچیسی حصہ دوم کی کل 119 جلدیں نکلی ہیں۔ اس حساب سے تو شاید کتاب میری زندگی میں بھی نہ نکل سکے گی"۔

اس ناامیدی کے برعکس وہ پریم بتیسی کی اشاعت کے لیے تیار تھے۔ اگست 1919 میں نگم کو لکھا کہ "ذرا منیجر صاحب زمانہ سے دریافت کرکے مطلع کریں کہ بتیسی کی چھپائی فی جز کتنی ہوگی۔ اس معاملے میں مجھے امید ہے کہ آپ کے امکان میں جتنی رعایت ہوگی اس سے دریغ نہ فرمائیں گے"۔ تین مہینے بعد "پریم بتیسی کے مضامین کی ترتیب بھیجتا ہوں کتاب شروع کردیجیے"۔ دو حصوں میں بتیس قصے تھے: سرپُرغرور، راجپوت کی بیٹی، نگاہِ ناز، بیٹی کا دَھن، دھوکا، پچھتاوا، شعلۂ حسن، اناتھ لڑکی، پنچایت، سوت، بانگِ سحر، مرضِ مبارک، قربانی، دفتری، دو بھائی، باز یافت، بوڑھی کاکی، بینک کا دیوالا، زنجیر ہوس، سوتیلی ماں، مشعلِ ہدایت، خنجر وفا، خوابِ پریشان، راہِ خدمت، حج اکبر، آتما رام، ایمان کا فیصلہ، فتح، دُرگا کا مندر، خونِ حرمت، اصلاح اور جگنو کی چمک۔

امتیاز علی تاج کو لکھا "پریم پچیسی کے دونوں حصے خود ہی شائع کیے تھے لیکن پبلیشر اور مصنف جدا جدا ہستیاں ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ لاہور میں میرے پریم بتیسی کے لیے کوئی پبلیشر مل جائے۔ میں اپنی بتیس کہانیوں کو دو حصوں میں نکالنا چاہتا ہوں۔ دونوں حصے مل کر غالبًا 500 صفحات کی کتاب ہوگی۔ اس میں سے پانچ سو جلدیں میں لاگت کی قیمت پر خرید لوں گا...... ایک اور تکلیف دیتاہوں۔ لاہور میں کتابت اور چھپائی کا نرخ کیا ہے اس سے بھی مطلع فرمائیں۔ اگر میں پریم بتیسی بارہ پاؤنڈ کے کاغذ پر چھپواؤں تو 32 جزو کی کتاب پر کیا لاگت آئے گی۔ ممکن ہے چھپائی ارزاں پڑے تو میں خود ہی جرأت کرپاؤں"۔ کچھ ہی دنوں بعد پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا "پریم بتیسی حصہ اول چھپ رہی ہے۔ غالبًا دو مہینے میں تیار ہوجائے گی۔ کیا آپ پریم بتیسی کا حصہ دوم اپنے اہتمام (دارالاشاعت) سے شائع نہیں کرسکتے۔ بازارِحسن تو ابھی معلوم نہیں کب تک تیار ہو۔ اس اثنا میں اگر بتیسی حصہ دوم آپ شائع کرسکیں تو خوب ہو۔ کچھ قصے آپ ہی کے دونوں پرچوں میں نکلے ہیں بقیہ میں دے دوں گا۔ کوئی دس جزو کی کتاب ہوگی"۔ امتیاز علی تاج حصہ دوم کی اشاعت کے لیے تیار ہوگئے۔ پریم چند نے 30 ستمبر 1919 کو لکھا "حصہ دوم کے لیے میں نے

کون کون سے قصے تجویز کیے تھے۔ ان کی فہرست مجھے بھیج دیجیے۔ مجھے یاد نہیں آتا"۔
"مسطر 21سطروں کا ہونا چاہیے اس پر حصہ اول چھپ رہا ہے۔ کاغذ میں نے حصہ اول کے لیے بیس پاؤنڈ کا لگایا ہے اگر آپ بھی یہی کاغذ لگائیں تو دونوں حصوں میں یکسانیت آجائے اور تب قیمت بھی یکساں رکھی جائے گی۔ گھٹیا کاغذ لگانا بے جوڑ ہوگا"۔ 16دسمبر1919 کے خط میں "کاغذ برا نہیں ہے۔ اس پر چھپنے دیجیے۔ چھپے ہوئے فارم ردکردینے سے نقصان ہوگا۔ میرا کاغذ ان سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن مضائقہ نہیں۔ سستا کاغذ رہے گا تو کتاب بھی ارزاں ہوگی۔ مسطر یہی رکھا جائے مگر کاتب کو تاکید کردی جائے کہ مکالمے ہمیشہ نئ سطروں سے شروع کیا کرے"۔ چار مہینے بعد 22اپریل 1920 کو "معلوم نہیں کاغذ دستیاب ہوا یا نہیں۔ میرے ہندی پبلیشر کلکتہ سے آپ کے پاس ہر قسم کا کاغذ سُبھتے کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ ہیں۔ نصف قیمت پیشگی درکار ہوگی۔ اگر آپ اسے منظور فرمائیں تو کاغذ آجائے گا۔" 16جون1920 "سن کر خوشی ہوئی کہ کاغذ آگیا اور پریم بتیسی کی کتابت مکمل ہوگئ اب تو اسے چھپوا بھی ڈالیں۔ حصہ اول بھی غالبًا آخر جولائی تک تیار ہوجائے گا۔جولائی تو کیا اگست آخر تک۔ حصہ اول ابھی تک دیانرائن نگم صاحب کی بے توجہی کے سبب معرض التوا میں پڑا ہوا ہے۔ مگر امید ہے کہ حصہ دوم کا شائع ہونا تازیانے کا کام دے گا۔ اور یہی میری غرض تھی"۔

دیانرائن نگم کو کاغذ کے دستیاب ہونے میں مشکلات تھیں۔ پریم چند نے 10 دسمبر 1920کو لکھا "پریم بتیسی کا ٹائٹیل ابھی لگایا یا نہیں؟ اب تو للہ دیر نہ کیجیے۔ جیسا کاغذ ملے اچھا یا بُرا بڑھیا یا گھٹیا، براؤن، کالا، پیلا، نیلا، سبز، سرخ، نارنگی، لیکن ٹائٹیل پیج چھپوا دیجیے۔ اور کتاب کی چھ سو جلدیں (قسم اول 500 قسم دوم 100) لاہور بھجوا دیجیے۔" دس دن بعد "بتیسی کا پیکٹ ملا۔ ٹائٹیل دیکھ کر رُو دیا۔ بس اور کیا لکھوں۔ کتاب کی مٹی خراب ہوگئ آپ نے بہتر کاغذ نہ پاکر وہ کاغذ استعمال کرلیا ہوگا۔ غالبًا کتاب کی تقدیر میں اس طرح بگڑنا لکھاتھا۔ خیر فی الحال چلنے دیجیے۔ لاہور والوں سے کہہ دوں گا کہ وہ ٹائٹیل بدل ڈالیں۔ آپ کے یہاں بھی اچھا کاغذ ملتے ہی ٹائٹیل بدلنا پڑے گا۔ کچھ نقصان ہوگا مگر غم نہیں"۔

پریم چند نے دیانرائن کو پھر لکھا "پریم بتیسی ابھی تیار ہوکر نہیں آئی۔ ٹائٹیل پیج میں زیادہ تردد اور جلدیں تیار ہونے کی امید نہ ہو تو آپ اس کی سات سو جلدیں بغیر

ٹائٹیل کے لاہور دفتر کہکشاں کو روانہ کردیں۔ وہ اپنا ٹائٹیل چھپواکر لگالیں گے اجرت مجھ سے وضع کرلیں گے۔"

پریم بتیسی حصہ اول کا تو یہ حال رہا ادھر حصہ دوم کے بارے میں امتیاز علی تاج کو 30اکتوبر 1920 کو لکھا "پریم بتیسی دیکھا، باغ باغ ہوگیا۔ مجھے یہ مجموعہ نہایت پسند آیا۔ کتابت اور جلی ہوتی تو بہتر ہوتا، تب قیمت اور زیادہ رکھنی پڑتی فی الجملہ کتاب خوب چھپی ہے۔ اور میں اس کے لیے آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ دیکھیں پبلک اس کی کیا قدر کرتی ہے۔ پہلا حصہ بھی شاید اس ماہ میں تیار ہوجائے۔ میں نے زمانہ کو لکھ دیا ہے کہ آپ کے یہاں پانچ سو کتابیں بھیج دیں"۔

اپنے دوست دیانرائن نگم کے زمانہ پریس سے اتنے پریشان تھے کہ جب زمانہ پریس کے منیجر نے پریم چند کو لکھا کہ پریم پچیسی کے دونوں حصے ختم ہوچکے ہیں اور انھوں نے دوسرے ایڈیشن کے لیے اصرار کیا تو پریم چند نے امتیاز علی تاج کو (14 ستمبر1920) لکھا کہ "میں نے عہد کرلیا ہے کہ زمانہ کی گردش میں نہیں پڑوں گا، اگر آپ اسے نکال سکیں تو بہتر ہے"۔

ستمبر 1920 میں پریم چند نے تاج صاحب کو ایک قصہ بھیجا تھا عنوان تھا دفتری اسی خط میں تاج کو مطلع کیا کہ یہ قصہ پریم چالیسی کا پہلا قصہ ہوگا۔چالیسی کی اشاعت نو سال بعد ہو سکی نہ تو زمانہ پریس سے نہ ہی دارالاشاعت سے، اسے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور کے مالک سعید مبارک علی نے شائع کیا۔ انھوں نے خود پریم چند سے لکھنؤ میں ملاقات کی اور سوزِ وطن اور پریم چالیسی کے لیے اجازت مانگی اور یہ بھی پوچھا کہ صفحے میں کتنی سطریں ہوں۔ پریم چالیسی کے بارے میں اب مزید معلومات نہیں ہے۔ بس یہی معلوم ہے کہ پریم چالیسی 1930 میں دو حصوں میں شائع ہوئی۔ اس میں شائع ہوئے قصےّ یوں ہیں: حصہ اول میں:۔ چوری، قزاقی، انتقام، رام لیلا، دین داری، سہاگ کا جنازہ، داروغہ کی سرگزشت، خانۂ برباد، کشمکش، الزام ،منتر، انسان کا مقدس فرض، استعفیٰ، کفّارہ، دیوی، قوم کا خادم، ترسول، مندر، بُھنی، آنسوؤں کی ہولی۔ حصہ دوم میں:۔ مجبوری، چکمہ، ابھاگن، حسرت، دیوی، جنت کی دیوی، سزا، دو سکھیاں، ماں، بیوی سے شوہر، پوس کی رات، جلوس، لیلےٰ، حرزجاں، مزارالفت، عفو، جہاد، امتحان، بند دروازہ۔

اس سے قبل پریم چند نے نگم کو 29اگست 1928 کے خط میں لکھا: ''اپنی کہانیوں کے ایک مجموعہ کو میں نے یہاں خود چھپوانا شروع کیا ہے۔ دس فارم چھپ گئے ہیں شاید ایک فارم اور ہو۔ اس کا نام رکھا ہے خاک پروانہ۔ اس میں سولہ کہانیاں ہیں: کپتان، خاک پروانہ، ملاپ، بڑے بابو، فکردنیا، ستیاگرہ، تالیف، مستعار گھڑی، نغمۂ روح، علٰحیدگی، عجیب ہولی، دعوت، مزار آتشیں، خودی، تحریک، نادان دوست۔ زمانہ کے اکتوبر نومبر 1928شمارہ میں اشتہار تھا اور فروری 1929 میں تبصرہ۔

اسی سال (1928 میں ہی)خواب و خیال کے نام سے ایک مجموعہ لاہور کے لاجپت رائے اینڈ سنز نے شائع کیا۔ اس میں مندرجہ ذیل چودہ کہانیاں تھیں: نوک جھونک، دست غیب، لال فیتہ، موٹھ، شطرنج کی بازی، مایۂ تفریح، نخل امید، فلسفی کی محبت، فتح، عبرت، خودی، دعوتِ شیراز، شدھی، ستی۔

اسی سال ایک اور مجموعہ، انڈین پریس آلہ آباد سے چھپوایا۔ یہ تھا فردوسِ خیال، اس میں بارہ افسانے تھے: نزولِ برق، بھوت، توبہ، ڈگری کے روپے، تہذیب کا راز، بھاڑے کا ٹٹو، راہِ نجات، سواسیر گیہوں، لیلیٰ، عفو، مریدی، نیک بختی کے تازیانے۔ 23 اپریل 1930دیانرائن نگم کو لکھے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی سے اردو میں ترجمہ پریم چند نے خود کیا۔

مارچ 1934 نرائن دت سہگل نے لاہور سے تیرہ کہانیوں کا مجموعہ ''آخری تحفہ'' شائع کیا۔ قصےّ تھے: جیل، آخری تحفہ، طلوع محبت، دو بیل، ادیب کی عزت، ڈیمانسٹریشن، نجات، شکار، آخری حیلہ، قاتل، وفا کی دیوی، برات، ستی۔

اردو گھر دہلی سے 1936میں ''زادِ راہ'' شائع ہوا۔ اس میں پندرہ کہانیاں تھیں: آشیاں برباد، ڈامُل کا قیدی، قہر خدا کا، بڑے بھائی صاحب، لعنت، لاٹری، خانہ داماد، فریب، زیور کا ڈبہّ، وفا کی دیوی، زادِ راہ، مِس پدما، حقیقت، ہولی کی چھٹّی۔

عصمت ڈپو دلّی نے پریم چند کی وفات کے بعد 1937 میں ''دودھ کی قیمت'' شائع کیا، اس میں نو کہانیاں ہیں: عصمت، کُسم، وفا کا دیوتا، اکسیر، عیدگاہ، سکون قلب، ریاست کا دیوان، دودھ کی قیمت، زاویہ نگاہ۔

پریم چند نے 19مارچ 1935 کو حسام الدین غوری کو لکھا تھا ''واردات چھپ

رہاہے۔" اس میں تیرہ افسانے ہیں: گلی ڈنڈا، مفت کرم داشتن، بدنصیب ماں، انصاف کی پولس، بیوی، مالکن، شکوہ شکایت، روشنی، معصوم بچہ، سوانگ، شانتی، قاتل کی ماں، غم نداری بُز بخر۔

اپنی وفات سے تین سال پہلے پریم چند نے "میرے بہترین افسانے" (جو کتاب منزل کشمیری گیٹ۔ لاہور 1933 نے شائع کی تھی) کے دیباچہ میں لکھا: "میرے دوست مدت سے مصر تھے کہ میں اپنی کہانیوں کا ایک ایسا نمائندہ مجموعہ منتخب کروں جس کے مطالعہ سے لوگ زندگی کے متعلق میرے نظریات معلوم کرسکیں۔ یہ انتخاب اس مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں میں نے محض ان کہانیوں کو چنا ہے جنھیں میں پسند کرتا ہوں اور جنھیں جدا جدا نوعیت کے نقادوں نے بھی سراہا ہے۔" یہ کہانیاں ہیں: راہِ نجات، منتر، مہا تیرتھ، پنچ پر میشور، رانی سارندھا، دو بیل، شطرنج کی بازی، ستی، پرائشچت، سجان بھگت۔

واردات کے بعد پریم چند کے قصوں کا کوئی مصدقہ مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ 1978 میں میں نے تیس قصوں کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ کو اشاعت کے لیے دیا تھا۔ کاپی رائٹ کی وجہ سے یہ کئی سال تک شائع نہیں ہوسکا، تب میں نے اسے واپس لے کر سٹار پبلیشر کو دے دیا کچھ سال بعد پتہ چلا کہ وہ مسودہ گم ہوگیا۔ اس میں بہت سی وہ کہانیاں تھی جو گوینکا کے اپراپیہ ساہتیہ میں پیش کی گئی ہیں ایک کہانی تھی اشکِ ندامت، وہ کہانی اب دستیاب نہیں ہے۔

کچھ محققین نے "داراشکوہ کا دربار" کو افسانوں میں شامل کرنا چاہا ہے۔ ستمبر 1908 میں لاہور کے ماہ وار رسالہ آزاد میں شائع ہوا یہ افسانہ نہیں انشائیہ ہے۔ پریم چند تاریخی واقعات کو موضوع بناکر افسانے ضرور لکھتے تھے جیسے امتحان، نزول برق، دل کی رانی، زنجیر ہوس، مگر ان سب میں وہ ڈرامائی کیفیت پیدا کردیتے تھے۔ مگر داراشکوہ کا دربار میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کے فرزند عظیم کی زندگی کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تو مضمون ایسے ہی ہے جیسے پریم چند کا کراوم ویل پر مضمون۔ اسے اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا جارہا ہے۔

1907 میں نواب رائے کا شائع ہونے والا ایک قصہ تھا روٹھی رانی یہ ہندی سے ترجمہ تھا کیونکہ اس کے آخر میں لکھا تھا "ماخوذ و ترجمہ از ہندی نواب رائے" اس قصہ کے

مصنف تھے منشی دیوی پرساد ساکن جودھپور، ان کے والد اجمیر کی درگاہ کے نائب رہ چکے تھے۔ دیوی پرساد فارسی اور ہندی کے مصنف تھے ریاست جودھپور میں ہندی کو سرکاری زبان قرار دلوایا تھا۔ تقریباً ساٹھ ہندی کتابوں کے مصنف تھے۔ مغل باشاہ اور راجستھان کے مہاراجاؤں پر کتابیں لکھی تھیں۔ ایک کتاب کا عنوان تھا روٹھی رانی۔ منشی دھنپت رائے جو نواب رائے کے نام سے رسائل میں لکھتے تھے (اور آگے چل کر پریم چند بنے) اس کتاب سے متاثر ہوئے اور اس کا اردو ترجمہ کرکے اسے زمانہ کے اپریل تا اگست 1907 کے شماروں میں شائع کرایا۔ مدیر دیا نرائن نگم نے اسے قصہ کا خطاب دیا ہے۔ اور اسے ایک کتابچہ کی شکل میں بھی چھاپ کر زمانے کے دفتر سے فروخت بھی کیا تھا۔ اس کے ٹائٹل پر بھی لکھا تھا، "ایک قصہ" میں نے یہ معلومات اپنی کتاب پریم چند لٹریری بایۂ گرافی میں پیش کی تھی۔ امرت رائے نے روٹھی رانی کو ایک ناول قرار کرکے منگلا چرن میں شائع کیا۔ حالانکہ زمانہ میں کوئی ناول شائع نہیں ہوا۔میں بھی دیا نرائن نگم کی طرح روٹھی رانی کو قصہ مانتا ہوں اور اسے پریم پچاسا میں شامل کیا ہے۔

پریم چند کے جو قصے اردو اور ہندی میں شائع ہوئے ہیں ان کی اشاعت کے بارے میں کچھ باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ ۔ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ وفات سے دس پندرہ سال پہلے پریم چند نے لگ بھگ دس افسانے لکھے، جن کا تعلق ان کے بچپن یا معلّمی کے زمانے کے تجربات سے تعلق رکھتے تھے۔ قزاقی، بڑے بھائی صاحب، چوری، گلی ڈنڈا، میری پہلی رچنا، ہولی کی چھٹی، میری کہانی، آپ بیتی، ڈھپورسنکھ، لال فیتہ، مفت کرم داشتن، لائبری وغیرہ۔

عام طور پر پریم چند کے قصے 10، 15 صفحات کے ہوتے تھے مگر کچھ قصے ایسے بھی ہیں جن کی ضخامت 50 ، 60 صفحات ہیں، روٹھی رانی، دو سکھیاں وغیرہ۔ کچھ کہانیاں اتنی چھوٹی ہیں کہ کہانی لفظ کا استعمال زیب نہیں دیتا۔ جیسے بانسری (یہ صرف 8 یا 10 لائنس کی کہانی ہے) کہکشاں لاہور کے جس شمارہ میں یہ کہانی چھپی تھی اس کی فہرست میں لکھا تھا بانسری۔ (کہانی مصنف پریم چند) گیلانی الکٹرانک پریس کے مالک سید مبارک شاہ گیلانی نے 1941 میں راقم الحروف کو بتلایا تھا کہ جب پریم چالیسی چھپ رہی تھی تو انھوں نے پریم چند کو ایک خط لکھا کہ فارم چھپ رہا ہے دو صفحے خالی ہیں، کچھ لکھ دیجیے، اور پریم چند نے دو صفحے کی کہانی لکھ دی۔ شاید اس کہانی کا عنوان تھا، دیوی۔ ایک دوسری

تھی قوم کا خادم، نادان دوست بھی اسی صف میں آتی ہیں۔

ابتدائی دور سے پریم چند کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ رابندرناتھ ٹیگور کی کہانیوں کے اردو ترجمے کیے تھے اور شائع کرائے تھے۔ ان کی تفصیل دستیاب نہیں ہے ٹالسٹائی کی بیس سے زیادہ کہانیوں کے ترجمے بھی کیے۔ کچھ کہانیاں بچوں کے لیے ہیں۔ جیسے جنگل کی کہانیاں یا کتے کی کہانی۔ ان کہانیوں کو ان کے افسانوں میں شامل نہیں کیا گیا۔ پریم پچپاسا کی چھ جلدوں میں ایک درجن سے زائد افسانے ایسے ہیں جو انگریزی اور بنگلہ کے افسانوں کے ترجمے ہیں۔ ان افسانوں کے ترجموں کو مجموعہ میں شامل کیا ہے کچھ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہیں۔ پریم چند کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ حیرانی اس بات کی ہے کہ ایک میٹرک پاس اسکول ماسٹر بندیل کھنڈ کے جنگلوں میں بسے، گاؤں یا چھوٹے قصبوں میں اسکول کا معائنہ کرنے والا کہاں سے ڈکنس، ہاتھرن اوسکروائلڈ، ٹیگور کو تلاش کرکے پڑھتا اور افسانے لکھتا تھا۔ انگریزی کی کتابوں کے علاوہ وہ روسی اور فرانسیسی مصنفوں کی کتابوں کے انگریزی ترجمے پڑھتے اگر ان کہانیوں سے متاثر ہوتے تو ان کے پلاٹ کو لے کر اردو میں کہانی لکھ تو ڈالتے۔ مگر انھوں نے ذکر نہ کیا کہ یہ افسانے کہاں سے ماخوذ ہیں۔ عام طور پر ترجموں کے اختتام پر پریم چند یا نواب رائے یا د۔ ر۔ لکھتے تھے مگر اصل مصنف کا نام نہیں دیتے تھے۔ سگِ لیلیٰ میں کرداروں کے نام وہی ہیں جو اصل افسانے میں ہے مگر یہ افسانہ کس کا لکھا ہے اس کی کوئی جانکاری نہیں۔ کبھی ماحول بدیشی ہوتا کبھی ہندستانی، چارلس ڈکنس کی ایک کہانی کے کردار سے متاثر ہوکر اشکِ ندامت لکھی اس کے کردار بدیشی ہیں۔ کبھی کبھی بنگلہ کہانیوں کے ہندی ترجمے کو لے کر اسے اردو میں لکھ ڈالتے۔ جیسے دھوکے کی ٹٹی، خوفِ رسوائی، اپنے فن کا استاد، قاتل، یہ بالکل ترجمے نہیں تھے بنگلہ (ہندی ترجمے) تھیم کو لے کر لکھتے۔ اور ان کہانیوں کو صرف اردو رسائل میں ہی چھپواتے تھے۔ رتن ناتھ سرشار کی سیر کہسار کو ہندی میں پربت یاترا کے نام سے لکھا۔ یہ کسی اردو مجموعے میں شائع نہیں ہوا۔ پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا تھا کہ اشکِ ندامت اور آبِ حیات کے بعد وہ ترجمہ نہیں کریں گے۔ حقیقت برعکس ہے انھیں جب کوئی افسانہ اچھا لگتا تھا تو اس کے بنا پر افسانہ لکھ کر رسائل کو بھیج دیتے ایک بار قبول کیا کہ انھوں نے Eternal city کے ایک جزو سے متاثر ہوکر ایک کہانی وشواس لکھی ہے۔ ایک روسی فنکار کپتان سیو جنھوں نے پریم چند کا

ہندی میں مطالعہ کیا تھا۔ مجھے 1950 میں بتایا تھا کہ پریم چند کی ایک کہانی گورکی کی کہانی تھی۔ نام یاد نہیں آرہا ہے مگر "ییلو" لفظ اس میں تھا۔

قارئین کو مدنظر رکھتے ہوئے پریم چند کرداروں کے نام بدل دیتے تھے۔کہکشاں میں ایک افسانہ حجِ اکبر شائع ہوا تھا اس میں کردار تھے صابر حسین، شاکرہ نصیر عباسی جب یہ ہندی میں شائع ہوا تو کردار تھے۔ رود منی، سکھدا، کیلاسی۔ دو بھائی جو زمانہ میں شائع ہوئی تھی اس کے کردار تھے کرشن، بلدیو، واسودیو، یشودھا، رادھا اس پر دوستوں' نے اعتراض کیا۔ ایڈیٹر کو خط لکھ کر صفائی پیش کی۔ جب یہ کہانی ہندی رسائل میں چھپی تو کرداروں کے نئے نام تھے۔شیوودت، کیدار، کلاوتی، مادھو وغیرہ۔ ایک کہانی آتما رام کے متعلق کہکشاں کے مدیر امتیاز علی تاج کو لکھا۔ "یہ اس قدر ہندو ہوگئی ہے کہ کہکشاں کے لائق نہیں آپ خود ہندو سہی مگر آپ کے ناظرین تو ہندو نہیں۔"

عام طور پر پریم چند کہانی کا خاکہ اردو یا انگریزی میں بناتے پھر اس بنیاد پر کہانی لکھتے۔ بعد میں ترجمے کرواتے یا خود کرتے اور رسائل میں بھیجنے سے پہلے کچھ ترمیم و اضافہ بھی کردیتے تھے۔ ڈامل کا قیدی کا خاکہ انگریزی میں ہے۔

1921 کے بعد پریم چند کے زیادہ افسانے ہندی میں شائع ہوتے پھر ان کا ترجمہ رسائل یا اخبار میں شائع کراتے۔ کبھی ترجمے خراب ہوتے، کبھی کبھی ان کے ہندی کے افسانوں کا اردو میں ترجمہ بغیر اجازت کردیا جاتا۔ جو اصل افسانے سے مختلف ہوتا۔ اکتوبر 1922 کو دیا نرائن نگم کو ایک خط میں لکھا "زمانہ کے لیے ایک مضمون لکھا اس کا ہندی ترجمہ کلکتہ کے ایک رسالے میں نکلا تھا۔ میں نے مضمون صاف کیا مگر ہندی میں نکلنے کے تیسرے دن ہی اس کا ترجمہ لاہور کے پرتاب میں نظر آیا...... حالانکہ لاہوری ترجمہ بالکل بھدا ہے مگر قصہ تو وہی ہے۔ اب کچھ اور لکھوں گا۔" آخری تحفہ میں ایک افسانہ ہے وفا کی دیوی یہ ہندی کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ زبان بھی پریم چند کی نہیں ہے اور انھیں شاید اس کا علم بھی نہیں تھا یہی کیفیت کچھ اور قصوں کی بھی ہوسکتی ہے۔ ایک محقق کے مطابق پنجابی ناشروں نے ایک اور پریم چند (ایم اے) کے افسانوں کے سترہ 17 مجموعے شائع کیے۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ پریم چند کو افسانہ نگاری میں غیر معمولی کامیابی حاصل

ہوئی تھی، اردو ہندی رسالوں سے فرمائش آتی رہتی تھی۔ پریم چند قصہ لکھتے۔ رسالہ کو بھیج دیتے، یہ چھپ جاتا، رسالہ کی کاپی آتی، اسے دیکھتے۔ دوست اور احباب پڑھنے کے لیے لے جاتے اس کی تعریف ہوتی اور پریم چند بھول جاتے کون لے گیا۔ عام طور پر واپس بھی کوئی نہ کرتا تھا، مگر انھیں تو اس کی اشاعت اور معاوضہ کی فکر تھی معاوضہ آیا بات ختم ہوگئی۔ جب نئے مجموعے کی اشاعت کی بات شروع ہوتی تب دماغ پر زور ڈالا جاتا۔ اگر قصہ یاد آگیا اور قصہ دستیاب نہیں ہوتا تو ایڈیٹر کو نقل کے لکھتے۔ اگر قصہ یاد نہیں رہا تو اسے اس مجموعے میں شامل نہیں کیا جاسکا۔ اور جب یاد آگیا تو اس کی نقل یا اس کی کاپی کرواکر کسی رسالے کو بھیج دیتے اور پھر بعد کے مجموعے میں شامل کرلیتے۔ ایک دو مثال پیش کرنا چاہوں گا۔

جون 1910 کے زمانہ میں ایک قصہ چھپا شکار، جب پریم پچیسی یا پریم بتیسی کے لیے قصے اکٹھے کررہے تھے تو اس کا دھیان نہیں آیا، اکتوبر 1931 میں اُسے چندن میں شائع کروایا اور اسے آخری تحفہ میں شامل کیاگیا۔ ایک اور کہانی تھی ملاپ، یہ زمانہ جون1913 میں شائع ہوئی تھی۔ پندرہ سال بعد اسے خاکِ پروانہ میں شامل کیا گیا۔ ایک افسانہ دونوں طرف سے زمانہ مارچ 1911 میں شائع ہوئی۔ کسی مجموعہ میں نہیں ہے۔

بعض اوقات قصہ کا عنوان بھی بدل دیتے تھے۔ ایک کہانی تھی دوا اور دارو ۔اس کا نام بدل کر کپتان کردیا۔ شامتِ اعمال کو بدل کر خاکِ پروانہ کردیا۔ موت اور زندگی کی جگہ امرت، حُسن و شباب کو بدل کر کشمکش نام دیاگیا، ہندی میں آگا پیچھا، سکونِ قلب کو بدل کر شانتی۔ زمانہ میں شائع کہانی معمہ کو بدل کر سمسیا کردیا۔ ایک مجموعے میں وِشم سمسیا بھی اسی کا نام رکھا۔

پریم چند کوشش کرتے کہ افسانے کو اردو اور ہندی رسائل کو ایک ساتھ ہی بھیجتے۔ اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ خود کرتے یا کسی شاگرد یا دوست سے کرواکر رسالوں کو بھیج دیتے تھے۔ ایک بار نگم کو لکھا کہ ترجمہ اقبال ورما سحر ہنگامی سے کروا لیں۔

جب پریم چند نے سرکاری نوکری سے عدم تشدد کے بعد نوکری سے استعفیٰ دے دیا تو ان کی آمدنی کا اہم ذریعہ افسانے ہی تھے۔ ناول سے انھیں بہت کچھ نہیں ملا، نہ ہی افسانوں کے مجموعوں سے۔ ان کا گذر رسالوں میں چھپے قصوں پرہی ہوتا تھا۔ معقول رقم

ملتی تھی۔ پہلے پانچ روپیہ، پھر دس روپیہ پھر بیس، رسالوں میں ہوڑ تھی اور پریم چند قصوں کے معاوضے کے بارے میں سودے بازی سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ہمدرد کے مدیر مولانا محمد علی انھیں ایک قصہ کے لیے ایک گنّی پیش کرتے تھے اور اُسے باقاعدہ پیکٹ میں رکھ کر بھیجتے تھے۔

پریم چند کے اردو ہندی افسانوں کا تقابلی مطالعہ میں نے1957 میں کیا تھا اور دو حصوں میں ایک فہرست تیار کی تھی جس میں یہ بتایا گیا کہ کون سا افسانہ کب اور کہاں ہندی، اردو میں شائع ہوا اور کس مجموعہ میں شامل ہے۔ اس کی ایک کاپی گوئنکا لے گئے تھے دوسری میرے پاس ابھی تک محفوظ ہے لیکن آج تک شائع نہ کراسکا۔ 1962 میں امرت رائے نے صرف 224 ہندی افسانوں کی فہرست پیش کی تھی اس کے سات سال بعد ڈاکٹر جعفر رضا نے ایک فہرست تیار کی تھی پھر شیلس زیدی نے بھی ایک فہرست شائع کی، مگر کسی بھی فہرست میں مکمل اور مستند جانکاری نہیں ہے۔ قصوں کے عنوان بدلنے کی وجہ سے اور ترجمہ میں ترمیم کی وجہ سے ہندی اور اردو میں قصوں کے تقابل میں کافی دقتیں پیش آتی ہیں کیوں کہ کچھ رسالوں کو چھوڑ کر باقی کی زندگی پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ سید علی اکبر اکبرآبادی نے 1910 میں آگرہ سے ادیب نکالا جو صرف ایک سال چلا پھر نوبت رائے نظر نے اسی نام سے الہ آباد سے رسالہ شائع کیا یہ تین سال چلا۔ لکھنؤ سے چکبست نے 1918 میں صبح امید نکالا 1926میں ان کی وفات ہوئی۔ سدرشن نے لاہور سے چندن نکالا جو کچھ ہی سال چلا۔ زمانہ ہی ایک ایسا رسالہ تھا جس کو 1902میں شیوبرت لال برمن نے شروع کیا اور 1903 میں نگم کو دے کر سنیاسی ہوگئے۔ اسے دیانرائن نگم اور پھر ان کے فرزند نے 1948 تک نکالا۔ زمانہ کی فائلیں کچھ لائبریریوں میں دستیاب تو ہیں مگر سب شمارے مشکل سے ملتے ہیں کچھ شماروں سے صفحات بھی غائب ہیں۔ دوسرے کم عمر رسالوں کی فائلوں کے بارے میں میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ پُرانے رسالوں کی فائلیں جنھیں میں نے پچاس سال پہلے دیکھی تھی اب غائب ہیں۔ اس لیے حواشی میں ساری تفصیلات ممکن نہیں ہیں۔ آج ادیب، العصر، کہکشاں، عصمت، ذخیرہ، نیرنگ خیال، صبح امید، ہمدرد، آزاد، تہذیب نسواں، پھول، ہزار داستان کے شماروں کی عدم موجودگی میں سارے قصص کی نقل اور ترتیب کا کام آسان نہیں ہے۔

ہندی میں پریم چند کی حیات میں ان کی بہت سی کتابوں کے دوسرے ایڈیشن نہیں شائع ہوئے۔ بعد کے کچھ ایڈیشنوں میں سنِ اشاعت نہیں دیا گیا۔ ہندی میں مانسرودور کی جن جلدوں کی تفصیل پریم پچاسا میں دی گئی ہے وہ ہنس پرکاشن کے ایڈیشن ہیں کیوں کہ امرت رائے نے مستند ایڈیشن شائع کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا نے ہندی میں اور جعفر رضا نے اردو میں تسلیم کیا ہے کہ لگ بھگ پچیس تیس قصے ایسے ہیں جن کی پہلی اشاعت کی تفصیل دستیاب نہیں ہے پھر بھی تحقیق کا کام جاری ہے۔

پریم چند قصے کیسے لکھتے تھے۔ اس بارے میں ان کے ایک خط کو پڑھیے جسے انھوں نے فروری 1934 میں نے نیرنگ خیال کے ایڈیٹر کو لکھا تھا:

"میرے قصےّ اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتاہوں۔ مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اسی میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اُٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیرکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اول سے آخر تک ذہن میں نہ جما لوں لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیرکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں کہ افسانے کے حسبِ حال ہوں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پُرلطف واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائمکس موجود ہوں تو خواہ وہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہو میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے جس کا نام ہے "دل کی رانی" میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھاتھا جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے۔ مجھے فوراً اس تاریخی واقعہ کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا۔ تاریخ میں کلائمکس کیسے پیدا ہو۔ اس کی فکر ہوئی۔ حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فنِ حرب کی تعلیم پائی تھی اور میدانِ جنگ مین کچھ تجربہ بھی حاصل کیاتھا۔ تیمور نے ہزارہا ترکوں کو قتل کردیا تھا۔ ایسے دشمنِ قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوئی؟ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائمکس نکل آتاہے۔ تیمور وجیہہ نہ تھا۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی و جذباتی محاسن

پیدا کئے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کرسکیں۔ اس طرح وہ قصہ تیار ہو گیا۔

کبھی کبھی سُنے سُنائے واقعات ایسے ہوتے کہ ان پر افسانہ کی بنیاد آسانی سے رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی واقعہ محض لچھے دار اور چست عبارت میں لکھنے اور انشاپردازانہ کمالات کی بنیاد پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں ان میں کلائمکس لازمی چیز سمجھتا ہوں اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کئے جائیں کہ کلائمکس قریب تر آتا جائے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے۔ جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے تو میں اس موقعہ سے ضرور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔

میں سست رفتار بھی ہوں۔ مہینے بھر میں شاید میں دو افسانے سے زیادہ نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیریکٹر تو سب مل جاتے ہیں۔ لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہوجانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقائق نہیں بیان کرسکتا۔ یہ ایک ذہنی امر ہے سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں۔ لیکن شاعری کی طرح اس کے لیے بھی اور ادب کے ہر شعبہ کے لیے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے پلاٹ بناتی ہے۔ ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثر لاتی ہے ادبی خوبیاں جمع کرتی۔ نادانستہ طور پر آپ ہی آپ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہوجانے کے بعد مین اسے خود پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے کچھ ندرت، کچھ جدّت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہوگیا۔ حالانکہ فیل اور پاس دونوں افسانے شائع ہوجاتے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا اسے احباب نے بہت زیادہ پسند کیا اس لیے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔"

پریم چند نے "میرے بہترین افسانے" کے دیباچہ میں لکھا تھا، ان کے قصوں کی تعداد تین سو ہے مگر ڈرامائی کیفیت والے قصّوں کی تعداد دو سو سے زیادہ نہیں ہے۔

افسانوں میں لگ بھگ ایک سو افسانے ایسے ہیں جو پہلی بار اردو میں لکھے گئے۔

اندازاً 120افسانے پہلی بار ہندی میں لکھے گئے۔ اور بعد میں اردو ترجمہ ہوا۔ تقریباً 70 افسانے ہیں جو ہندی میں لکھے گئے اور جن کا ابھی تک اردو میں ترجمہ نہیں ہوا ہے۔

پریم چند نے اپنے شروع کے افسانوں میں راجپوتوں اور بندیلوں کی بہادری کی تصویریں پیش کی تھیں، ان کی کچھ کہانیاں ٹھاکر کا کنواں، ستہ گتی ہریجنوں پر ظلم کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ ایک درجن سے زائد کہانیوں میں۔ جیسے پوس کی رات، پنچایت، قربانی، سہاگ کا جنازہ، راہِ نجات وغیرہ میں دیہاتی زندگی کے روشن پہلو نمایاں ہیں۔پریم چند کے اپنے قصوں میں سیاسی آزادی کی جھلک ملتی ہے، تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں انھوں نے لاگ ڈاٹ، لال فیتہ، مجسٹریٹ کا استعفیٰ جیسے افسانے لکھے۔ جلوس اورسمر یاترا میں 1930کی تحریک کی جھلک کی گونج سنائی دیتی ہے۔

دو کہانیاں قاتل اور بارات اردو میں پریم چند کے نام سے چھپی ہیں اور یہی دونوں کہانیاں شیورانی دیوی کے مجموعے ناری ہردے میں بھی چھپی ہیں۔ میں نے 1959 میں امرت رائے کو خط لکھ کر پوچھا بھی تھا (شیورانی دیوی حیات تھیں) جواب نہیں آیا میرا خیال ہے یہ کہانیاں پریم چند کی ہی ہیں۔

کچھ محققین ببوق اور پلشم کے نام سے شائع شدہ کہانیوں کو پریم چند کی کہانی سمجھتے ہیں میرے خیال میں یہ ٹھیک نہیں۔ ببوق کے نام سے ایک ادیب زمانہ میں لکھتے تھے مگر وہ اپنے نام کے ساتھ ایم ایس سی بھی لکھتے تھے۔ نیرنگ خیال میں ایک خواتین انیس فاطمہ بنت ببوق کے نام سے استاد تھے۔ جب ببوق کی کہانیاں شائع ہوئیں اس وقت پریم چند بہت مقبول تھے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس نام سے افسانے لکھتے پلشم ایک قلمی نام تھا۔ مشہور فلمی ایکٹرس مینا کماری کے نانا پیارے لال شاکر میرٹھی کا جنھوں نے دیانرائن نگم کے ساتھ کام کیا تھا اور بعد میں ادیب کے مدیر بنے۔ یہاں یہ لکھنا بھی واجب ہوگا کہ ایک دوسرے پریم چند بھی تھے۔ یہ پنجابی تھے جنھوں نے اپنے مجموعوں کو لاہور سے چھپوایا تھا۔ اپنے نام کے بعد ایم ۔اے۔ لکھتے تھے جبکہ منشی پریم چند صرف بی۔ اے ہی تھے۔

ٹالسٹائی کی بیس بائیس کہانیاں اور بچوں کے لیے جنگل کی کہانیوں کے علاوہ ہندی میں پریم چند کے کئ مجموعے شائع ہوئے۔"سپت سروج، اگنی سمادھی، پریم چتور تھی، پریم تیرتھ، پریم دوادشی، پریم پنچمی، پریم پچیسی، پریم پی یوش، پریم پورنما، پریم کنج، پریم پرتگیا، پرتما،

پریم پرمود، پریم سوتر، پرسون، سمر یاترا، پریم چند کی سروشریشٹ کہانیاں، پریم پچیسی کو چھوڑکر باقی سب چھوٹے چھوٹے مجموعے تھے۔ کوئی تین، کوئی چار، کوئی پانچ، کوئی سات، کوئی نو، کوئی بارہ قصوں کے۔ وفات کے تھوڑا پہلے پریم چند نے مان سروور کے عنوان سے دو مجموعے شائع کیے تھے۔ ان میں 53 قصے تھے۔ وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے شری پت نے ایک مجموعہ "کفن" شائع کیا جس میں بارہ قصے تھے۔ اس کے علاوہ 150 قصے ہندی اور اردو کے رسالوں سے تلاش کرا نھیں مان سرور کے اگلے چھ حصوں میں شائع کیا۔ پھر 1962 میں پریم چند کے چھوٹے بیٹے امرت رائے نے 56 کہانیوں کو زمانہ اور دوسرے اردو ہندی رسالوں سے اکٹھا کرکے گپت دھن کے دو حصوں میں شائع کیا۔ اس کے کئی سال بعد کمل کشور گوینکا نے 32 قصے ڈھونڈ نکالے انھیں پریم چند کے اپراپیہ ساہتیہ میں شائع کیا۔ مان سرور (آٹھ حصے) کفن، گپت دھن (دو حصے) اور پریم چند کے اپراپیہ ساہتیہ میں شائع ہوئے افسانوں کی تعداد 304 ہوجاتی ہے ویسے یہ تعداد صحیح نہیں ہے کیونکہ لال فیتہ کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا گیا، نہ ہی وفا کی دیوی۔

مان سرور (حصہ چار) کی سمسیا وہی افسانہ ہے جو مان سرور (آٹھ) میں وشم سمسیا کے عنوان سے ہے۔ گوینکا کے اپراپیہ ساہتیہ میں روئے سیاہ وہی کہانی ہے جو اسی کتاب میں پرتگیا کے عنوان سے ہے۔ گوینکا کے اپراپیہ ساہتیہ میں پرتشٹھا کی ہتیا وہی افسانہ ہے جو گپت دھن میں عزت کا خون کے عنوان سے شامل ہے۔ اسی طرح بہنی بھی دوبار شامل ہوگئی ہے۔ مان سرور حصہ دوم کی نیائے وہی افسانہ ہے جو گپت دھن میں نبی کا نیتی نرواہ کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان افسانوں کے علاوہ بمبوق کے نام شائع ہونے والی کہانی تانگے کی بڑ اور شادی کی پریم چند کی تخلیق نہیں ہے اگر ان سب کو خارج کردیا جائے تو پریم چند کے افسانوں کی تعداد 296 ہوجاتی ہے۔ پریم چند کے افسانوں کی تعداد گھٹانے یا بڑھانے میں میری کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری کوشش صرف یہ ہے کہ پریم پچاسا کی چھ٦ جلدوں میں تمام افسانوں کو جو نواب رائے، د۔ ر۔ افسانہ کہن یا پریم چند کے قلمی یا فرضی نام سے شائع ہوئے ہیں یکجا صورت میں پیش کردیا جائے۔

اردو کے مجموعوں میں افسانوں کی تعداد صرف 192 ہے یہ تعداد سوز وطن، پریم پچیسی، پریم بتیسی، پریم چالیسی، خاک پروانہ، خواب و خیال، فردوسِ خیال، آخری تحفہ،

زادِ راہ، دودھ کی قیمت اور واردات میں شائع ہوئے قصوں کی ہے۔ لگ بھگ ایک سو قصے ہیں جو کسی اردو مجموعے میں شائع نہیں ہوئے۔ 1942 میں میں نے پریم چند کے فرزند شری پت رائے سے پیشکش کی تھی کہ پریم چند کے افسانوں کو ایک سلسلے میں شائع کریں (میری خط و کتابت میری "پریم چند کی چٹھی پتری" (ہندی) میں شائع ہوچکی ہے) مگر یہ ممکن نہ ہوسکا۔ ایک دو ناشروں سے غیر رسمی بات ہوئی۔ کوئی تیار نہ ہوا۔ پریم چند کی پیدائش کے ایک سو سال بعد ان کی بہت تقریبیں ہوئی ہیں مگر اس طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے جس اسکیم کو اپنایا ہے اس کے تحت دیگر تنقیحات کے علاوہ ان کے تقریباً تین سو قصوں کو اشاعت کی تاریخ کے مطابق شائع کیا جا رہا ہے۔

پریم بتیسی کے دیباچے میں پریم چند نے لکھا تھا "میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ پریم پچیسی کئ سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک معاصر اخباروں کا تعلق ہے انھوں نے میری ناچیز کاوش کی داد دی لیکن شائقین پر اس کا بہت کم اثر ہوا۔ پہلا اڈیشن ختم ہونے میں کم و بیش پانچ سال لگ گئے۔ یہ قدردانی بہت حوصلہ انگیز تو نہ تھی۔ لیکن مصنف کو تصنیف کے سوا چارہ نہیں۔ اس لیے یہ دوسرا مجموعہ پریم بتیسی کے نام سے اردو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ پہلے مجموعہ کی نسبت اس کا زیادہ چرچا ہو۔ یا سارا تومار اشاعت کے گودام ہی میں پڑا سڑے۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوچکا۔ اب صرف یہی آرزو ہے کہ ایک منتخب مجموعہ پریم چالیسا یا پریم پچاسا کے نام سے اور نکل جائے ۔ بس یہی زندگی کا ماحصل ہوگا اور اسی پر قناعت کروں گا"۔ پریم چالیسی شائع ہوئی، مگر پریم پچاسا ان کی زندگی میں نہیں شائع ہوا۔

اب یہ افسانے پریم پچاسا کے نام سے کلیات کی چھ جلدوں میں پیش کیے جارہے ہیں۔

مدن گوپال

سَوت

پنڈت دیودت کی شادی ہوئے ایک زمانہ گزر گیا۔ مگر کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اب تک ان کے ماں باپ زندہ تھے۔ وہ ان سے ہمیشہ دوسری شادی کرنے کے لیے تقاضا اور اصرار کرتے رہے۔ مگر پنڈت جی کبھی اس پر راضی نہ ہوئے۔ اپنی گوداوری سے سچی محبت تھی۔ اور اولاد کی آرزو میں وہ اپنی موجودہ راحت اور اطمینان کو خیرباد نہیں کہنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ نئے خیالات کے آدمی تھے اور ان ذمہ داریوں کو سمجھتے تھے۔ جو اولاد اپنے ساتھ ہے۔ جب تک انسان میں اتنی مقدرت نہ ہو کہ وہ اپنی اولاد کی کما حقّہ تعلیم اور تربیت کا کفیل ہوسکے۔ اسے شادی سے محترز رہنا چاہیے جسے وہ خوب سمجھتے تھے۔ پہلے تو کبھی کبھی بچوں کو ہنستے کھیلتے دیکھ کر ان کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی تھی۔ مگر اب اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح وہ بھی جسمانی مرض میں مبتلا رہتے تھے۔ اور اولاد کا خیال کرتے ہی انھیں ایک خوف سا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن گوداوری اتنی جلد مایوس ہونے والی نہ تھی۔ پہلے تو وہ دیوی، دیوتا، گنڈے، تعویذ اور جنتر منتر پر معتقد رہتی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، تو اس نے پنڈت جی کی دوسری شادی کرنے کا منصوبہ کیا۔ اس نے ہفتوں مہینوں اس فکر میں کاٹے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ مگر جو بات من میں سما گئی تھی وہ کسی طرح نہ نکلی۔ ہاں اسے بڑی زبردست قربانی کرنا پڑے گی۔ شاید شوہر کی محبت کا انمول رتن بھی اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ پر کیا ایسا ہوسکتا ہے۔ پندرہ سال تک لگاتار جس نخلِ محبت کو پالا اور سینچا۔ کیا وہ ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ سہ سکے گا۔

گوداوری نے آخر کار اولاد کی پُر زور خواہش کے سامنے سر جھکا دیا اور سَوت کا خیرمقدم کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔

(۲)

پنڈت دیودت گوداوری کی یہ تجویز سنتے ہی ہنس پڑے۔ انھوں نے قیاس کیا کہ یا

تو میری محبت کا امتحان لیا جا رہا ہے یا میرا من لینے کی کوشش ہے۔ ہنس کر بات ٹال دی۔ مگر جب گوداوری نے متین انداز سے کہا۔ "تم اسے ہنسی مت سمجھو۔ میں سچے دل سے کہتی ہوں کہ اولاد کا منھ دیکھنے کے لیے میں سوت سے چھاتی پر مونگ دلوانے کے لیے بھی تیار ہوں۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پُر آب ہوگئیں۔ تب تو پنڈت جی کو کوئی شبہ نہ رہا۔ اتنے اعلیٰ اور بے نفس ارادے سے بھری ہوئی گوداوری کو انھوں نے گلے سے لگا لیا اور بولے۔ "مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ مجھے اولاد کی آرزو نہیں۔" گوداوری نے زور دے کر کہا۔ "تم کو نہیں، مجھے تو ہے۔ اگر اپنی خاطر سے نہیں، تو میری خاطر سے یہ کام کرنا پڑے گا۔"

پنڈت جی سیدھے سادے آدمی تھے۔ حامی تو نہ بھری مگر کچھ نیم راضی سے ہوگئے۔ بس اسی کی دیر تھی۔ پنڈت جی کو ذرا تکلیف نہ کرنا پڑی۔ گوداوری کی دانش مندی نے ساری منزل آسان کردی۔ اس نے صرف اپنے پاس سے روپے ہی نہیں نکالے بلکہ اپنے گہنے کپڑے بھی نذر کردیے۔ بدنامی کا خوف اس راستہ میں ایک بڑا زبردست کانٹا تھا۔ دیودت جی سوچتے کہ جب میں سر پر مور سجا کر، مونچھیں کٹوائے دولہا بنا ہوا نکلوں گا تو لوگ مجھے کیا کہیں گے۔ میرے دفتر کے لوگ میرا مضحکہ اڑائیں گے اور میری طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ ان کی یہ نگاہیں چھری سے بھی زیادہ تیز ہوں گی۔ اس وقت میں کہاں منھ چھپاؤں گا۔ مگر گوداوری نے اپنے گاؤں میں جا کر اس کام کو چھیڑا اور بخیریت انجام تک پہنچا دیا۔ نئی بہو گھر میں آگئی۔ اس وقت گوداوری ایسی خوش تھی گویا بیٹے کا بیاہ کرلائی ہے۔ وہ خوب گاتی بجاتی رہی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ بہت جلد اس گانے کے بدلے رونا پڑے گا!

(۳)

کئی مہینے گزر گئے۔ گوداوری اپنی سوت پر اسی طرح حکومت کرتی تھی گویا وہ اس کی ساس ہے۔ تاہم اسے یہ بات اک دم کے لیے نہ بھولتی تھی کہ میں اصل میں اس کی ساس نہیں ہوں۔ اُدھر گومتی کو بھی اپنی حیثیت کا پورا خیال رہتا تھا۔ اس لیے گوداوری کی حکومت ساس کی حکومت کی طرح سخت نہ ہونے کے باوجود اسے ناقابل برداشت معلوم ہوتی۔ اسے اپنی چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے بھی گوداوری کے سامنے ہاتھ

پھیلاتے شرم آتی تھی۔

کچھ دنوں بعد گوداوری کی عادت میں ایک نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ وہ پنڈت دیودت کو گھر میں آتے جاتے بڑی تیز متجسس نگاہوں سے دیکھتی۔ اس کی فطری متانت غائب سی ہوگئی۔ ذرا سی بات بھی اس کے پیٹ میں نہیں پچتی۔ جب پنڈت جی دفتر سے آتے ہیں۔ تب گوداوری گھنٹوں ان کے پاس بیٹھی ہوئی گومتی کا ذکرِ خیر کیا کرتی ہے۔ اس داستان میں اکثر ایسی چھوٹی باتوں کا ذکر ہوتا ہے کہ جب وہ ختم ہوجاتی ہیں تو پنڈت جی کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا ہے۔ گوداوری کیوں اتنی پُرگو ہوگئی تھی۔ اس کا راز سمجھنا مشکل ہے۔ شاید وہ اب گومتی سے ڈرتی تھی۔ اس کے حسن سے، اور اس کی شرمیلی آنکھوں سے، باندھ کو توڑ کر وہ اب پانی کا بہاؤ مٹی کے ڈھیلوں سے روکنا چاہتی ہے۔

ایک دن گوداوری نے گومتی سے میٹھے چاول پکانے کو کہا۔ شاید رکھشا بندھن تھا۔ گومتی نے کہا۔ "شکر نہیں"

گوداوری یہ سن کر متحیر ہوگئی۔ "اتنی شکر اتنی جلد کیسے اُٹھ گئی۔ جسے چھاتی پھاڑ کر کمانا پڑتا ہے۔ اسے اکھرتا ہے۔ کھانے والے کیا جانیں۔"

جب پنڈت جی دفتر سے آئے۔ تو یہ ذرا سی بات ایک طولانی داستان بن کر ان کے کانوں میں پہنچی۔ تھوڑی دیر کے لیے پنڈت جی کو شبہ ہوا کہ کہیں گومتی کو غلبہِ اشتہا کا مرض تو نہیں ہوگیا۔

ایسا ہی واقعہ ایک بار پھر ہوا۔ پنڈت جی کو بواسیر کی شکایت تھی۔ لال مرچ بالکل نہ کھاتے تھے۔ گوداوری جب کھانا پکاتی تو اس بات کا بڑا خیال رکھتی تھی۔ گومتی نے ایک دن مصالحہ کے ساتھ دال میں تھوڑی سی لال مرچ بھی ڈال دی۔ پنڈت جی نے دال کم کھائی۔ مگر گوداوری گومتی کے پیچھے پڑگئی۔ اینٹھ کر اس سے بولی۔ ایسی زبان جل کیوں نہیں جاتی۔"

(۴)

پنڈت جی سیدھے سادے آدمی تھے ہی۔ دفتر سے آئے۔ کھانا کھایا۔ پڑکر سو رہے۔ وہ ایک ہفتہ وار اخبار منگواتے تھے۔ مگر اسے کبھی کبھی مہینوں کھولنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ جس کام میں ذرا بھی تکلیف یا تردد ہو اس سے وہ کوسوں دور بھاگتے تھے۔ کبھی کبھی ان

کے دفتر میں تھیٹر کے پاس مفت ملا کرتے تھے۔ مگر پنڈت جی ان سے کبھی کام نہ لیتے۔ اور ہی لوگ مانگ لے جاتے تھے۔ رام لیلا یا اور کوئی میلہ تو شاید نوکری کرنے کے بعد کبھی دیکھا ہی نہیں۔ گوداوری ان کی عادت سے واقف ہوگئی تھی۔ پنڈت جی بھی ہر ایک معاملہ میں اسی کی رائے پر چلنے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔

پر روئی جیسی ملائم شے بھی دب کر سخت ہوجاتی ہے۔ پنڈت جی کو یہ آٹھوں پہر کی دیکھ بھال سخت ناگوار معلوم ہوتی۔ کبھی کبھی وہ من ہی من میں جھنجلانے بھی لگتے۔ قوتِ ارادی جو عرصہ دراز تک بے کار پڑے رہنے سے بالکل مردہ ہوگئی تھی ازسرِنو عود کرنے لگی۔

پنڈت جی یہ مانتے تھے کہ گوداوری نے سوت کو گھر لانے میں بڑے ایثار سے کام لیا۔ اس ایثار کو بشریت سے کوئی مناسبت نہیں۔ لیکن اُس کا جو احسان ہے۔ مجھ پر ہے۔ گومتی پر اس کا کیا احسان۔ میرے باعث اس سے کیوں اس بے دردی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہاں اسے کون سا سکھ مل گیا۔ ہے جس کے بدلے میں وہ یہ پھٹکاریں سہے۔ شوہر ملا ہے۔ وہ بوڑھا۔ دائم المرض۔ گھر ملا ہے۔ وہ ایسا کہ آج نوکری چھوٹ جائے۔ تو کل نان شبینہ کا بھی ٹھکانا نہیں۔ ان حالات میں گوداوری کا ظالمانہ سلوک انھیں بہت ناگوار معلوم ہوتا۔

گوداوری کی آنکھیں اتنی کم بیں نہ تھیں کہ پنڈت دیودت کی کیفیاتِ قلب نظر نہ آئیں۔ ان کے دل میں جو خیالات پیدا ہوتے وہ گوداوری کو ان کے چہرے پر موٹے حروف میں منقوش معلوم ہوتے۔ یہ علم اس کے سینے میں ایک طرف تو گومتی کے خلاف حسد کی آگ بھڑکاتا تھا اور دوسری طرف پنڈت جی پر خود غرضی، بے وفائی اور دغابازی کا الزام عائد کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دل کی کدورت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

(۵)

رفتہ رفتہ گوداوری نے پنڈت جی سے گومتی کا چرچا کرنا ہی چھوڑ دیا۔ گویا اس کے نزدیک گومتی گھر میں تھی ہی نہیں۔ وہ اب نہ اس کے کھانے پینے کی خبر لیتی ہے نہ کپڑے لتّے کی۔ ایک بار کئی دنوں تک اسے کچھ ناشتہ کرنے کو بھی نہ ملا۔ پنڈت جی آرام طلب آدمی تو تھے ہی سب بدعنوانیوں کو دیکھتے، مگراپنی عافیت کے سمندر میں تلاطم پیدا

ہونے کے خوف سے زبان نہ ہلاتے تھے۔ تاہم یہ آخری بے رحمی ان کے غیر معمولی تحمل و برداشت کے لیے بھی قاتل ثابت ہوئی۔ ایک دن انھوں نے گوداوری سے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”کیا آج کل گھر میں ناشتے کے لیے مٹھائی و ٹھائی نہیں آتی۔“

گوداوری نے ترش رو ہوکر جواب دیا۔ ”تم لاتے ہی نہیں، تو آئے کہاں سے، میرا کوئی نوکر بیٹھا ہے۔“

دیودت کے دل پر گوداوری کے یہ الفاظ تیر کی طرح لگے۔ آج تک گوداوری نے ان سے کبھی ایسے لہجہ میں بات چیت نہیں کی تھی۔ بولے۔ ”آہستہ بولو۔ جھنجلانے کی تو میں نے کوئی بات نہیں کی۔“

گوداوری نے آنکھیں نیچی کر کے کہا۔ ”مجھے تو جیسا آتا ہے۔ ویسے بولتی ہوں۔ دوسروں کی سی میٹھی چکنی باتیں کہاں سے لاؤں۔“

دیودت نے ذرا گرم ہوکر کہا۔ ” آج کل مجھے تمھارے مزاج کا کچھ رنگ ہی نہیں ملتا۔ بات بات پر الجھتی ہو۔“

گوداوری کا چہرہ غصہّ کی آگ سے لال ہوگیا۔ بیٹھی تھی۔ کھڑی ہوگئی۔ ہونٹ پھڑکنے لگے۔ بولی۔ ”اب تمھیں میری کوئی بات اچھی نہ لگے گی۔ اب تو سر سے پیر تک مجھ میں عیب ہی عیب بھرے ہیں۔ اب اور لوگ تمھاری مرضی کے مطابق کام کریں گے۔ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ یہ لو صندوق کی کنجی۔ اپنے روپے پیسے سنبھال لو۔ یہ آئے دن کی جھنجٹ مجھ سے نہیں برداشت ہوسکتی۔ جب تک نبھا نبھایا۔ اب نہیں نبھ سکتا۔“

پنڈت دیودت کو سکتہ سا ہوگیا۔ جس شور و شر کا انھیں خدشہ تھا۔ اس نے نہایت خوفناک صورت میں ان کے گھر میں قدم رکھا۔ اور کچھ نہ بول سکے۔ اس وقت زیادہ بولنے سے بات بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ باہر چلے آئے۔ سوچنے لگے کہ میں نے گوداوری کے ساتھ ایسی کون سی بے عنوانی کی ہے۔ جس کا یہ پھل مل رہا ہے۔ ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ گوداوری کے ہاتھ سے نکل کر گھر کا انتظام کیوں کر ہوسکے گا۔ اس قلیل آمدنی میں وہ نہ جانے کون سا جگت کرتی تھی۔ اب ایشور کیسے پار لگائیں گے۔ کچھ نہیں، اسے منانا پڑے گا۔ اور ہو ہی کیا سکتا ہے! گومتی کیا کرے گی۔ سارا بوجھ میرے سر پڑے گا۔ مانے گی تو۔ مگر مشکل سے۔

مگر پنڈت جی کے یہ خیالات باطل نکلے۔ صندوق کی وہ کنجی زہریلی ناگن کی طرح آنگن میں تین دن تک پڑی رہی۔ کسی کو اس کے نزدیک جانے کی جرأت نہ ہوئی۔

چوتھے دن پنڈت جی نے گویا جان پر کھیل کر کنجی اٹھالی۔ اس وقت انھیں ایسا محسوس ہوا، گویا کسی نے ان کے سر پر پہاڑ اٹھا کر رکھ دیا۔ آرام طلب آدمیوں کو اپنے مقررہ راستے سے ایک تل بھر ہٹنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ پنڈت دیودت جانتے تھے کہ میں اپنے دفتر کے باعث گھر کا انتظام نہیں کرسکتا۔ تاہم ان سے اتنی ڈھٹائی نہ ہوسکی کہ وہ کنجی گومتی کو دے دیں۔ مگر یہ محض دکھاوا تھا۔ کنجی دیکھنے کو پنڈت جی کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ کام سب گومتی کو کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح خاندان پر حکومت کرنے کا آخری وسیلہ بھی گوداوری کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اہل خانہ کے نام کے ساتھ جو عزت اور وقار وابستہ ہوتا ہے وہ بھی اس کنجی کے ساتھ چلا گیا۔ دیکھتے دیکھتے گھر کی مہری، اور پڑوس کی عورتوں کے برتاؤ میں فرق عیاں ہونے لگا۔ گوداوری اب معزول رانی تھی۔ جس کا اختیار صرف دوسروں کی ہمدردی پر رہ گیا تھا۔

(۲)

خانہ داری کے انتظام میں یہ تغیر ہوتے ہی گوداوری کی عادات میں بھی ایک افسوسناک تغیر آنے لگا۔ حسد دل میں رہنے والی شے نہیں۔ ہمسایوں میں رات دن اسی خاندان کے چرچے رہتے۔ دیکھو تو دنیا کیسی مطلب کی ہے۔ غریب نے زبردستی دولھا بنا دیا۔ جان بوجھ کر اپنے پیروں میں کلہاڑی ماری۔ اپنے گہنے کپڑے تک اتار دیے۔ مگر اب روتے روتے آنچل بھیگتا ہے۔ سوت تو سوت ہی ہے۔ شوہر نے بھی نظروں سے گرا دیا۔ بس اب لونڈی کی طرح گھر میں پڑی پڑی پیٹ جلایا کرے یہ بھی کوئی جینا ہے۔

گوداوری یہ ہمدردانہ باتیں سنتی اور اس کی آتشِ حسد اور بھی تیز ہوتی۔ اسے اتنا نہ سوجھتا کہ یہ زبانی غم گساریاں زیادہ تر نفس انسانی ہی کی خباثت سے پیدا ہوتی ہیں۔

گوداوری کو جس امر کا پورا یقین اور پنڈت دیودت کو جس کا بڑا خوف تھا۔ وہ بات نہ ہوئی۔ خانہ داری کے معاملات میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ ہاں تجربہ نہ ہونے کے باعث پنڈت جی کے انتظام میں ویسی صفائی نہ تھی۔ کچھ خرچ زیادہ پڑ جاتا تھا۔ مگر کام چلا جاتا تھا۔ ہاں گوداوری کو گومتی کے سبھی کام بے ڈھنگے نظر آتے تھے۔ حسد میں

آگ ہے۔ مگر آگ کی خاصیت اس میں نہیں ہے۔ وہ دل کو پھیلانے کے بدلے اور بھی تنگ کر دیتا ہے۔ اب گھر میں کوئی نقصان ہوجانے سے گوداوری کو رنج کے بجائے خوشی ہوتی ہے۔ برسات کے دن تھے۔ کئی دن آفتاب نہ نظر آیا۔ صندوق میں رکھے ہوئے کپڑوں میں پھپھوندی لگ گئی۔ تیل کے اچار بگڑ گئے۔ گومتی کو ان چیزوں کو دھوپ میں رکھنے کا خیال نہ رہا۔ گوداوری نے یہ نقصانات دیکھے۔ مگر اُسے ذرا بھی افسوس نہ ہوا۔ ہاں دوچار جلی کٹی باتیں سنانے کا موقع البتہ ہاتھ آگیا۔ ”مالکن بننا ہی آتا ہے۔ یا مالکن کا کام کرنا بھی۔“

پنڈت دیودت کی عادات میں بھی ایک تبدیلی نظر آنے لگی۔ جب تک گوداوری اپنے حسن انتظام سے گھر کا کام کاج سنبھالے ہوئے تھی۔ تب تک انھیں کسی چیز کی کمی نہیں کھلی۔ یہاں تک کہ ترکاری سبزی وغیرہ کے لیے بھی انھیں بازار نہ جانا پڑتا۔ مگر اب گوداوری انھیں دن میں کئی کئی بار بازار جاتے دیکھتی ہے۔ خانہ داری کا انتظام خراب ہونے کے باعث اکثر انھیں عین وقت پر بازار بھاگنا پڑتا ہے۔ گوداوری یہ سب کایا پلٹ دیکھتی۔ اور سنا سنا کے کہتی۔

”یہی مہاراج ہیں کہ ایک تنکا بھی نہ اٹھاتے تھے۔ اب دیکھتی ہوں سارے دن بازار میں ہی کھڑے رہتے ہیں۔ اب یہ کہتے ہوئے کبھی نہیں سنتی۔ ”کہ میرے لکھنے پڑھنے میں ہرج ہوگا۔“

گوداوری کو ایک بار اس کا ثبوت مل چکا تھا کہ پنڈت بھی خرید وفرخت کے معاملہ میں بہت ہوشیار نہیں۔ اسی لیے اسے جب کپڑوں کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے پڑوس کے ایک لالہ صاحب سے منگوایا کرتی تھی۔ پنڈت جی کو یہ بات بھول سی گئی تھی کہ گوداوری کو ساڑیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے سر سے تو جتنا بوجھ کوئی ہٹا دے اتنا ہی اچھا تھا۔ خود بھی وہی کپڑے پہنتے۔ جو گوداوری منگوا کر دے دیتی۔ انھیں نت نئے فیشن اور نمونے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مگر اب کپڑوں کے لیے بھی انھیں کو بازار جانا ہوتا تھا۔ ایک بار گومتی کے پاس ساڑیاں نہیں تھیں۔ پنڈت جی بازار گئے تو ایک بہت نفیس جوڑا لائے۔ بزاز نے من مانے دام لیے۔ اُدھار سودا لینے میں پنڈت جی کو مطلق پس وپیش نہ ہوتا تھا۔ گومتی نے وہ جوڑا گوداوری کو دکھایا۔ گوداوری نے دیکھا اور منھ پھیر کر

بولی۔ ”بھلا تم نے انھیں کپڑے لانا تو سکھا دیا۔ مجھے تو سولہ سال گزر گئے۔ ان کے ہاتھ کا لایا ہوا کپڑا خواب میں پہننا بھی نصیب نہ ہوا۔“

ایسے واقعات گوداوری کی آتشِ حسد کو اور بھی زیادہ مشتعل کیا کرتے تھے۔ جب تک اسے یقین تھا کہ پنڈت جی فطرتاً روکھے ہیں تب تک اسے اطمینان تھا۔ مگر اب ان کی یہ نئی نئی امنگیں دیکھ کر اسے معلوم ہوا کہ میں نے ہزار کوشش کرنے پر بھی جس محبت کو نہ پایا، اسے گومتی نے محض اپنے حسن سے جیت لیا۔ اسے یقین ہوا کہ میں جسے سچی محبت سمجھتی تھی۔ وہ فی الواقع ابلہ فریبی تھی وہ محبت نہ تھی۔ نری خودغرضی تھی۔

(۷)

اتفاق سے اسی زمانے میں گومتی بیمار پڑی۔ اٹھنے بیٹھنے کی سکت نہ رہی۔ گوداوری کھانا پکانے لگی۔ مگراسے یقین نہ ہوا کہ گومتی واقعی بیمار ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ مجھ سے کھانا پکوانے کے لیے یہ سوانگ رچایا گیا ہے۔ پڑوسنوں سے کہتی کہ لونڈی بننے میں اتنی ہی کسر تھی۔ وہ بھی پوری ہوگئی۔

پنڈت جی کو آج کل کھانا کھاتے وقت بھاگا بھاگ سی پڑجاتی ہے معلوم نہیں کیوں۔ وہ اکیلے گوداوری سے باتیں کرتے ڈرتے ہیں۔ جانے کیا لعن طعن کرنے لگے۔ اسی لیے کھانا کھاتے وقت وہ ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں وہ منحوس گھڑی آ نہ جائے۔ گوداوری اپنی تیز نگاہوں سے ان کی یہ حالت دیکھتی اور دل میں اینٹھ کر رہ جاتی۔ ایک دن اس سے نہ رہا گیا۔ بولی۔ ”کیا مجھ سے بولنے کی بھی ممانعت کردی گئی ہے۔ دیکھتی ہوں۔ کہیں تو رات رات بھر باتوں کا تار نہیں ٹوٹتا۔ پر میرے سامنے منھ نہ کھولنے کی بھی قسم کھالی ہے۔ گھر کا رنگ ڈھنگ تو دیکھتے ہو۔ اب تو سب کام تمھاری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے!“

پنڈت جی نے سر نیچا کیے ہوئے جواب دیا۔ ”اونھ جیسے چلتا ہے ویسے چلتا ہے۔ اب اس فکر میں کیا اپنی جان دے دوں۔ جب تم یہی چاہتی ہو کہ گھر مٹی میں مل جائے۔ تو میرا کیا بس ہے۔“

اس پر گوداوری نے کچھ سخت باتیں کیں۔ بات بڑھ گئی۔ پنڈت جی اٹھ آئے۔ گوداوری نے قسم دلا کر انھیں بٹھانا چاہا۔ مگر وہ نہ بیٹھے۔ تب اس نے رسوئی اٹھا دی۔

سارے گھر کو فاقہ کرنا پڑا۔ گومتی میں ایک خاص صفت یہ تھی کہ بات چاہے کیسی ہی سخت کیوں نہ ہو۔ وہ سہ لیتی تھی مگر بھوک کی برداشت اس سے نہ ہوسکتی تھی۔ اس لیے وہ کبھی برت (روزہ) نہ رکھتی تھی۔ ہاں بہت اصرار کرنے سے جنم اشٹمی رکھ لیتی تھی۔ لیکن آج کل بیماری کے باعث اسے اور بھی بھوک لگتی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ دوپہر ہونے آئی اور کھانا ملنے کی کوئی امید نہیں۔ تو اُس نے محض مجبور ہوکر بازار سے مٹھائی منگوائی۔ ممکن ہے اُس نے محض گوداوری کو جلانے کے لیے یہ حرکت کی ہو۔ کیونکہ کوئی بھی ایک وقت بھوکے رہنے سے مر نہیں جاتا۔ گوداوری کے سر سے پیر تک آگ لگ گئی۔ اس نے بھی فوراً مٹھائیاں منگوائیں۔ اور آج کئی برس کے بعد خوب پیٹ بھر کے مٹھائی کھائی۔ یہ سب حسد کے کرشمے ہیں۔

جو گوداوری دوپہر ہونے سے پہلے منہ میں پانی ڈالنا گناہ سمجھتی تھی۔ وہی گوداوری اب روزانہ علی الصباح ناشتے کے بغیر بے قرار ہوجاتی ہے۔ سر میں وہ ہمیشہ میٹھا تیل ڈالتی تھی۔ اب میٹھے تیل سے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ پان کھانے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ حسد نے اسے نئی نویلی بہو بنا دیا۔

جنم اشٹمی کا مبارک دن آیا۔ پنڈت دیودت کی خلقی مجہولیت ان دو دنوں کے لیے رخصت ہوجاتی تھی۔ وہ بڑے جوش سے اس کی تیاریاں کرتے تھے۔ گوداوری یہ برت بے آب و دانہ رکھتی تھی۔ اور پنڈت جی تو کرشن کے بھگت ہی تھے۔ ان کے اصرار سے اب گومتی نے بھی نرجل برت رکھنے کی جرأت کی۔ مگر اسے انتہا درجہ تعجب ہوا۔ جب مہری نے کہا۔ ”بڑی بہو برت نہ رکھیں گی۔ ان کے لیے بازار سے پوریاں منگوا دینا۔“

شام کے وقت گوداوری نے مان مندر جانے کے لیے یکہ کی فرمائش کی۔ گومتی کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔ مان مندر بالکل قریب تھا۔ اب یکے والے آج سیدھے منہ سے بات نہیں کرتے تھے۔ وہ چڑھ کر بولی۔ ”فضول پیسے پھینکنے سے کیا فائدہ، مان مندر کون بڑی دور ہے۔ پاؤں پاؤں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ فرمائش کردینا آسان ہے۔ کھلتا ہے جو چھاتی پھاڑ کر کماتا ہے۔“

تین سال پہلے گومتی نے اسی طرح کی باتیں گوداوری کے منہ سے سنی تھیں۔ آج وہی باتیں گوداوری کو اس کے منہ سے سننا پڑیں۔ دنوں کا پھیر!

گوداوری ان دنوں بڑی بے دلی سے کھانا بناتی تھی۔ پنڈت جی کے پرہیز کے متعلق اسے اب پہلے کی سی احتیاط نہ تھی۔ ایک دن اس نے مہری سے کہا۔ "کہ اندر سے مصالحے نکال کر پیس لا۔ مصالحے دال میں پڑے تو دال ذرا تیز ہوگئی۔ مارے خوف کے پنڈت جی سے نہ کھائی گئی۔ اور آرام طلب آدمیوں کی طرح چٹپٹی چیزیں انھیں بھی مرغوب تھیں۔ لیکن مرض کے ہاتھوں مجبور تھے۔ گومتی نے جب یہ ماجرا سنا۔ تو بھویں چڑھا کر بولی۔ "کیا بڑھاپے میں زبان گز بھر کی ہوگئی ہے۔" کچھ اس طرح کی سخت باتیں پہلے گوداوری نے بھی کہی تھیں۔ آج اس کی سننے کی باری تھی۔ نیرنگیٔ روزگار اسی کا نام ہے۔

(۸)

آج گوداوری گنگا سے ملنے آئی ہے۔ تین سال ہوئے وہ ایک بر دولھا دلہن کو لے کر۔ گنگا کو دودھ چڑھانے آئی تھی۔ آج وہ اپنی جان اسے نذر کرنے آئی ہے۔ آج وہ اس کی مسرّت بار موجوں میں آرام کرنا چاہتی ہے۔

گوداوری کو اس گھر میں ایک ایک لمحہ رہنا شاق تھا۔ جس گھر میں رانی بن کر رہی۔ اسی گھر میں لونڈی بن کر رہنا اس جیسی خود دار عورت کے لیے محال تھا۔

اب اس گھر سے گوداوری کا تعلق صرف اس پرانی رسی کی طرح تھا جو بار بار گرہ دینے پر بھی کہیں نہ کہیں سے ٹوٹ ہی جاتی ہے۔ اسے گنگاجی کے دامن میں پناہ لینے کے سوا اور کوئی تدبیر نہ نظر آتی تھی۔

کئی دن ہوئے اس کے منھ سے بار بار جان دے دینے کی دھمکی سن کر پنڈت جی غصۓ سے بول اٹھے تھے۔ "تم کسی طرح مر بھی تو جاتیں۔"

گوداوری وہ زہریلے الفاظ اب تک نہ بھولی تھی۔ چبھنے والی باتیں اس کے دل پر پتھر کی لکیر بن جاتی تھیں۔ آج گومتی نے بھی وہی باتیں کہیں۔ اگرچہ اس نے بہت کچھ سننے پر یہ الفاظ زبان سے نکالے۔ مگر گوداوری اپنی باتیں تو بھول گئی تھیں۔ صرف گومتی کی باتیں کان میں گونج رہی تھیں۔ آہ! اور پنڈت جی نے اسے ڈانٹا تک نہیں۔ مجھ پر ایسا غضب ڈھایا جائے۔ اور وہ زبان تک نہ کھولیں۔

آج سب لوگوں کے چلے جانے پر گوداوری گھر سے باہر نکلی۔ آسمان پر کالی

گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ پانی کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی۔

محبت کی زنجیر کتنی مضبوط ہے، اور پھر کتنی نازک! نازک ہے۔ دغا کے سامنے مضبوط ہے، بیوگ کے سامنے گوداوری چوکھٹ پر کھڑی کھڑی گھنٹوں روتی رہی۔ کتنی ہی پچھلی باتیں اسے یاد آتی تھی۔ کبھی اسی گھر میں اس کے لیے محبت بھی تھی۔ عزّت بھی تھی۔ زندگی کا سکھ بھی تھا۔ مگر اب کیا ہے۔! فوراً پنڈت جی کی وہ دل خراش باتیں یاد آگئیں۔ آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہوگئے۔ گوداوری گھر سے چل کھڑی ہوئی۔

اس وقت اگر پنڈت دیودت ننگے سر۔ ننگے پاؤں۔ پانی میں بھیگتے۔ دوڑتے آتے۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گوداوری کو پکڑ کر اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لیتے اور کہتے "پیاری" اس کے سوا ان کی زبان سے اور کچھ نہ نکلتا۔ کیا تب بھی گوداوری اپنے ارادے پر قائم رہتی۔؟

کنوار کا مہینہ تھا۔ رات کو گنگا کی لہروں کی گرج بہت خوفناک معلوم ہوتی تھی۔ ساتھ ہی جب یکایک بجلی کوندتی تو اچھلتی ہوئی لہریں روشنی میں ایسی معلوم ہوتیں گویا روشنی خود مست ہاتھیوں کے جسم میں کلیلیں کر رہی ہے۔ نزاع ہستی کا ایک خوفناک منظر آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔

گوداوری کے سینے میں بھی اس وقت خیالات کی پُر شور لہریں اٹھتی تھیں اور آپس میں ٹکراتی تھیں۔ کہاں؟ تاریکی میں جہاں کچھ نہیں تھا۔

کیا یہ گرجنے اڈنے والی گنگا گوداوری کے دلِ بے قرار کو تسکین دے سکتی ہے۔ اس کی لہروں سے نغمۂ شریں کی صدائیں نہیں آتیں۔ اس کی آنکھوں میں رحم کی جھلک نہیں ہے۔ وہ اس وقت غضب ناک اور پُر خروش ہیں۔

گوداوری کنارے پر بیٹھی کیا سوچ رہی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کیا اب بھی اسے یہ کھٹکا نہیں تھا کہ پنڈت دیودت آتے نہ ہوں۔ پریم کی رسی کتنی مضبوط ہوتی ہے۔

اسی تاریکی میں حسد اور یاس۔ اور بے مہری کے ہاتھوں ستائی ہوئی یہ دُکھیا گنگا کی گود میں گر پڑی۔ لہریں چاروں طرف سے جھپٹیں۔ اور اسے نگل گئیں۔

سویرا ہوا۔ گوداوری گھر میں نہیں تھی۔اس کی چار پائی پر یہ خط پڑا ہوا تھا۔

"سوامی جی۔! دنیا میں آپ کے سوا اور میرا کون تھا۔ میں نے اپنا سب کچھ آپ کے سکھ کی نذر کردیا۔ اب آپ کا سکھ اسی میں ہے کہ میں اس دنیا میں نہ رہوں۔ اسی لیے یہ جان بھی آپ کی نذر ہے۔ مجھ سے جو خطائیں ہوئی ہوں انھیں معاف کیجیے گا۔ ایشور آپ کو سدا سکھی رکھے۔"

پنڈت جی اس خط کو پڑھتے ہی غش کھا کر گر پڑے۔ گومتی رونے لگی۔ مگر معلوم نہیں کیا سوچ کر۔

پہلی بار یہ کہانی ہندی ماہنامہ سرسوتی (دسمبر 1915) میں شائع ہوئی۔ ہندی میں پریم چند کی پہلی کہانی تھی اردو میں پہلی بار پریم بتیسی 1 میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سروور 8 میں درج ہے۔

دو بھائی

صبح کے وقت آفتاب کی سُہانی سنہری دھوپ میں جسودھا اپنے دونوں بیٹوں کو زانوؤں پر بٹھائے دودھ روٹی کھلاتی تھی۔ کرشن بڑا تھا۔ بلرام چھوٹا۔ دونوں منھ میں لقمہ لیتے۔ کئی قدم اچھل کود کر پھر زانوؤں پر آبیٹھتے۔ اوراپنی توتلی بولی میں ان موزوں فقروں کی رٹ لگاتے تھے جو ایک پُرانے زندہ دل شاعر نے کسی جاڑے کے ستائے ہوئے لڑکے کی زبان سے ادا کیے ہیں۔

"دیو دیو گھام کرو۔ تمھرے بالک کو لگتا جاڑ۔"

ماں انھیں چمکار کر بلا لیتی اور بڑے بڑے کور کھلاتی۔ اس کے دل میں محبت کا سرور تھا۔ آنکھوں میں غرور کی جھلک۔ موتی تہہ آب میں تھا۔ حباب لہروں کے اوپر!

دونوں بھائی خوب بڑھے۔ ساتھ ساتھ گلے میں باہیں ڈالے کھیلتے تھے۔ کرشن ذہین تھا۔ بلرام توانا۔ دونوں میں‌اتنی محبت تھی کہ ساتھ ساتھ مکتب جاتے۔ مگر اکیلے مٹھائی نہ کھاتے تھے۔

دونوں بھائیوں کی شادیاں ہوئیں۔ کرشن کی رادھا چرب زبان اور چنچل تھی۔ ہرن کی سی آنکھوں والی۔ بلرام کی شاما سانولی۔ خوش قامت، کیم عورت تھی۔ بہت شیریں زبان، بہت متین، بہت کم سخن۔

کرشن رادھا پر موہے۔ بلرام شاما پر ریجھے۔ مگر جسودھا کا من کسی سے نہ ملا۔ وہ دونوں سے ناخوش۔ اور دونوں سے ناراض تھی۔ اس کی قوتِ تقریر وتضحیک وتمثیل بہت کچھ اس بے کار کوشش میں صرف ہوتی کہ رادھا اپنے شعور کا ایک حصہّ شاما کے خلق سے بدل لے۔

دونوں بھائی صاحبِ اولاد ہوئے۔ تناور درخت خوب پھیلا اور پھلوں سے لد گیا۔ چھریرے درخت میں صرف ایک پھل نظر آیا۔ وہ بھی کچھ زرد سا مرجھایا ہوا۔ مگر دونوں

تقدیر کے شاکی تھے۔ بلرام کو زر و مال کی ہوس تھی۔ کرشن کو اولاد کی تمنا۔

اس شکوۂ تقدیر نے رفتہ رفتہ رشک کی صورت اختیار کی جو حسد کا پیش خیمہ تھی۔ شاما اپنے بچوں کی ساز پرداخت میں مصروف رہتی۔ سر اٹھانے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ غریب رادھا کو چولھے میں جلنا اور چکی میں پسنا پڑتا۔ یہ کوفت اور جلن کبھی کبھی ناخوشگوار الفاظ میں ظاہر ہوتی۔ شاما سنتی۔ کڑھتی اور ضبط کرتی۔ مگر اس کا یہ ضبط وہ خموشی تھی جو ساہوکار کے تقاضوں کو روز بروز سختی کی جانب مائل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ آخری پیمانہ لبریز ہوگیا۔ ہرن راہ فرار نہ پاکر شکاری کی طرف لپکا۔ غضب ناک پیکار کے لیے سینگیں جھکائے ہوئے رادھا اور شاما زاویہ بنانے والے خطوں کی طرح علیحدہ ہوگئیں۔ اس دن ایک ہی گھر میں دو چولھے جلے۔ مگر بھائیوں نے دانہ کی صورت نہ دیکھی۔ اور جسودھا سارے دن روتی رہی۔

(۲)

کئی سال گزر گئے۔ دونوں بھائی جو کسی زمانہ میں ایک ہی زانو پر بیٹھتے تھے، ایک ہی تھالی میں کھاتے تھے اور ایک ہی چھاتی سے دودھ پیتے تھے۔ انھیں اب ایک گھر میں۔ ایک گاؤں میں رہنا شاق تھا۔ مگر خاندان کی ساکھ قائم رہے اس لیے اس رشک اور عناد کی دہکتی ہوئی آگ کو راکھ کے نیچے چھپانے کی کوشش ہوتی تھی۔ ان کے درمیان اب برادرانہ محبت اور خلوص کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ صرف بھائی کے نام کی عزّت تھی جو انھیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھی۔ بھائیوں کے ارتباط اور یگانگت کا معیار ہماری نگاہوں میں کتنا اونچا ہے۔ ماں اب بھی زندہ تھی۔ دونوں بیٹوں کی لاگ کو دیکھتی تھی اور کڑھتی تھی۔ دل میں محبت وہی تھی مگر آنکھوں میں غرور نہ تھا۔ پھول وہی تھا۔ مگر اس کی شگفتگی رخصت ہوگئی تھی۔

دونوں بھائی جب بچے تھے، تو ایک کو روتے ہوئے دیکھ کر دوسرا بھی رونے لگتا تھا۔ وہ تب بے سمجھ نادان اور بھولے تھے۔ آج ایک کو روتے ہوئے دیکھ کر دوسرا ہنستا تھا اور تالیاں بجاتا تھا۔ اب وہ سمجھدار، دانش مند اور ہوشیار ہوگئے تھے۔

جب انھیں اپنے پرائے کی تمیز نہ تھی، اس وقت اگر کوئی آدمی محض چھیڑنے کے لیے ایک کو اپنے ساتھ لے جانے کی دھمکی دیتا تو دوسرا زمین پر لوٹ جاتا اور اس آدمی

کا دامن پکڑ لیتا۔ اب اگر ایک بھائی کو موت بھی دھمکاتی تو دوسرے کی آنکھوں میں آنسو نہ آتے۔ اب انھیں اپنے پرائے کی تمیز ہوگئی تھی۔

بے چارے بلرام کا حال تباہ تھا۔ عیال کثیر۔ آمدنی قلیل۔ اس پر وضعداری کا نباہ۔ دل چاہے روئے۔ مگر ہونٹ ہنستے ہیں۔ سینہ تمام داغ داغ ہو مگر کپڑے نہ میلے ہوں۔ چار لڑکے۔ چار لڑکیاں۔ ضروریات زندگی موتیوں کے مول۔ چند پائیوں کی زمینداری کہاں تک سنبھالتی۔ لڑکوں کی شادی خیر اختیاری تھی۔ مگر لڑکیوں کی شادی کیسے ٹلتی۔ دو پائی زمین لڑکی کی شادی کی نذر ہوگئی۔ اس پر بھی باراتی لوگ آنگن سے بھات کھائے بغیر اٹھ گئے۔ دوسری لڑکی کا بیاہ کچّے دھاگے کی گانٹھ تھی۔ شاما نے دولھا کو دیکھا اور بھرے آنگن میں پھوٹ پھوٹ روئی۔ سال بھر بعد تیسری لڑکی کی شادی درپیش ہوئی۔ پیڑ پتے بھی نہ بچے۔ ہاں ڈال بھر پور تھی۔ مگر تنگدستی اور امانت میں سگ و استخواں کا تعلق ہے۔ دو سال کا لگان باقی تھا۔ لڑکی کے زیور گرو رکھے گئے۔ گلا چھوٹا۔ رادھا اسی موقع کی منتظر تھی۔ نئے رشتہ داروں کے یہاں خبر بھیج دی۔ تم لوگ غافل بیٹھے ہو۔ یہاں زیوروں کا صفایا ہوا جاتا ہے۔ تیسرے دن ایک نائی اور دو برہمن بلرام کے دروازے پر آکر بیٹھ گئے۔ غریب کی گردن میں پھانسی پڑی۔ روپے کہاں سے آئیں۔ نہ زمین نہ جائداد۔ نہ باغ۔ نہ باغیچہ۔ اعتبار کب کا اٹھ چکا تھا۔ اب اگر کوئی جائداد تھی تو صرف وہی دو کوٹھریاں جن میں اس نے اتنی عمر گزاری تھی۔ اور ان کا کوئی گاہک نہیں۔ ادھر تاخیر و تامل میں ناک کٹی جاتی تھی۔ مجبور و ناچار ہوکر کرشن کے پاس آیا اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے بولا۔ "بھیا! میں اس وقت بڑی آفت میں ہوں۔ میری مدد کرو۔"

(۳)

کرشن نے جواب دیا۔ "بلو! آج کل میں بھی سخت تنگ ہو رہا ہوں۔ تم سے سچ کہتا ہوں۔"

رادھا نے مالکانہ انداز سے مداخلت کی۔ "ارے تو کیا اب ان کے لیے بھی تنگ ہو رہے ہیں۔ الگ کھانا کھانے سے کیا عزّت الگ ہوجائے گی۔"

کرشن نے بیوی کی طرف خفیف نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "نہیں نہیں یہ مطلب نہیں تھا۔ ہاتھ تنگ ہے تو کیا۔ کوئی نہ کوئی فکر کرنا ہی پڑے گی۔"

رادھا نے بلرام سے پوچھا۔ "پانچ بیس سے کچھ اوپر ہی اوپر گہنے رکھے تھے نا۔"

بلرام نے جواب دیا۔ "ہاں سود ملاکر کوئی سوا سو روپے ہوتے ہیں۔"

کرشن بھاگوت پڑھ رہے تھے۔ پھر پڑھنے میں غرق ہو گئے۔ رادھا نے معاملہ کی بات چیت شروع کی۔ "روپیہ تو بہت ہے۔ ہمارے پاس ہوتے تو کوئی بات نہ تھی۔ مگر ہم کو بھی دوسرے سے دلانا پڑے گا۔ اور مہاجن بنا کچھ لکھائے پڑھائے روپیہ دیتے نہیں۔"

بلرام نے سوچا۔ اگر کچھ لکھانے پڑھانے کو ہوتا تو کیا اور مہاجن مرگئے تھے۔ تمھارے دروازے آتا ہی کیوں؟

بولا۔ "لکھنے پڑھنے کو میرے پاس ہے کیا۔ جو کچھ جائداد ہے۔ وہ یہی گھر ہے۔"

رادھا اور کرشن دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ کیا آج سچ مچ زندگی کے ارمان نکلیں گے اور یہ مایۂ شر خانہ بدر ہوگا۔ مگر اس روحانی سرور نے چہرہ تک آتے آتے فکر آمیز غور کی صورت اختیار کرلی۔ رادھا بولیں۔ "گھر پر کوئی مہاجن شاید ہی روپیہ دے۔ شہر ہو تو کچھ کرایہ ہی آئے۔ دیہات میں کوئی سینت میں رہنے والا نہیں۔ پر ساجھے کی چیز ٹھہری۔"

کرشن نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ کہیں کوئی لفظ مصلحت کے خلاف زبان سے نہ نکل جائے۔ "ایک مہاجن سے میری راہ و رسم ہے۔ وہ شاید کہنے سننے سے راضی ہوجائے۔"

رادھا نے گردن ہلا کر اس با موقع مداخلت کی داد دی۔ اور فرمایا "ہاں بس۔ آپس ہی میں معاملہ ہوسکتا ہے۔ اور پھر دو تین بیس سے زیادہ ملنا بھی کٹھن ہے۔"

کرشن نے جان پر کھیل کر کہا۔ کہ کہیں رادھا کی سخت گیری سے شکار نہ نکل بھاگے۔ "تمھارے دبانے سے چار بیس ہوجائیں گے۔ اور کیا؟"

رادھا نے اب کے پُرملامت انداز سے دیکھا۔ اور آنکھوں سے اس عجلت کی سرزنش کرنے کے بعد بولی۔ "چاربیس دلا دو۔ میں تو آج ہی لکھ پڑھ دوں۔ مہاجن ایسے اندھے نہیں ہوتے۔"

بلرام اپنے بھائی اور بھاوج کے رمزوکنایہ کو کچھ کچھ سمجھتا تھا۔ اور حیران تھا کہ نھیں اتنی عقل کہاں سے آگئی، بولا۔ "اور روپے کہاں سے آئیں گے؟"

رادھا نے چڑھ کر کہا۔ "اور روپے کے لیے فکر کرو۔ سوا سو روپے ان دو کوٹھریوں

کے اس جنم میں کوئی نہ دے گا۔ چار بیس چاہو تو ایک مہاجن سے دلا دوں۔ لکھا پڑھی کرلو۔"

بلرام اب ایک احمقانہ ضد کے ساتھ اڑ گیا۔ بولا۔ اور کون سی فکر کروں۔ گہنے زیور ہوتے۔تو کہتا۔ لاؤ گرو رکھ دوں۔ یہاں تو کچا دھاگا بھی نہیں ہے۔ جب بدنام ہی ہوئے۔ تو کیا دس کے لیے۔ کیا پچاس کے لیے۔ دونوں ایک ہی ہے۔ اگر گھر بیچ کر میری ناک بچ جائے۔ یہاں تو غنیمت ہے۔ لیکن گھر بھی بیچوں اس پر بھی آبرو کے لالے پڑے رہیں۔ ایسا میں نہ کروں گا۔ صرف نام کا خیال ہے۔ نہیں ایک بار انکار کرجاؤں تو میرا کیا بنالے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اور سچ پوچھو تو مجھے اپنے نام کی فکر نہیں ہے۔ مجھے کون جانتا ہے۔سنسار تو بھیا ہی کو ہنسے گا۔"

کرشن کا چہرہ زرد ہوگیا۔ رادھا بھی گھبرائی۔ معاملہ فہم عورت تھی اور خوش فہمی کی قدر کرتی تھی۔ مگر بلرام جیسے کندۂ ناتراش سے اسے ایسی گرفت کی امید نہ تھی۔ قدردانہ انداز سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ "لالہ کبھی کبھی تم بھی بچوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہو۔ بھلا اس جھونپڑی کے کون سوا سو روپے نکال کر دے دے گا۔ تم سوا سو کے بدلے سو ہی دلوا دو میں آج ہی اپنا حصہّ بیچتی ہوں۔ اتنا ہی میرا بھی تو ہے۔ گھر پر تو تم کو وہی چار بیس ملیں گے۔ ہاں اور روپیہ کی فکر ہم خود کردیں گے۔ عزّت ہماری تمھاری ایک ہے۔ وہ نہ جانے پائے گی۔ یہ روپیہ الگ کھاتے میں چڑھا دیا جائے گا۔"

بلرام کی باچھیں کھِل گئیں۔ اس نے میدان مار لیا۔ سوچنے لگا۔ مجھے تو روپیہ سے کام ہے۔ چاہے ایک نہیں دس کھاتوں میں چڑھا لو۔ رہا مکان! وہ جیتے جی چھوڑنا نہیں۔ خوش خوش چلا۔ اس کے جانے کے بعد رادھا کرشن نے بہروپ کھول دیا۔ اور بہت دیر تک اس معاملہ کے حسن و قبح پر مباحثہ کرنے اور ایک دوسرے کو اس کڑے سودے کا قصوروار ٹھہرانے کے بعد اس طرح دل کو سمجھایا۔ کہ لقمۂ شیریں ذرا سا بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔ ہاں اب دیکھیں، شاما رانی اس گھر میں کیسے راج کرتی ہیں۔

(۴)

دنیا میں نیک اوصاف اس قدر معدوم کیوں ہیں۔ اس کا خالق وہ پاک ہستی ہے جو فیض و رحمت کا بحر بیکراں اور جود و کرم کا سرچشمہ ہے۔ کیا اس نے یہ بہشتی نعمتیں دنیا کو

نہیں دیں۔

جس قدرت کاملہ نے دنیا کا نظام قائم کیا۔ اور بڑے بڑے سماوی اجرام حتیٰ کہ عناصر اور ہیولا کو بھی مقررہ قوانین کا مطیع فرمان بنایا۔ اس نے انسان جیسی ضعیف ہستی کو کیوں اس قدر آزاد کردیا۔ جب کہ وہ اس آزادی کا ہمیشہ بے جا استعمال کرتا ہے؟

وہ دونوں بیل جو کرشن کے دروازے پر بندھے ہوئے ہیں۔ ان میں کتنی دوستی ہے۔ دونوں ایک ہی جوئے میں چلتے ہیں۔ بس اتنا ہی ناتا ہے مگر ابھی چند روز ہوئے۔ جب ان میں سے ایک رادھا کے میکے میں مانگے گیا تھا۔ تو دوسرے نے یہاں تین دن تک ناند میں منھ نہیں ڈالا۔

مگر ایک گود کے کھیلے ہوئے بھائی۔ ایک چھاتی سے دودھ پینے والے۔ آج اتنے بیگانہ ہوگئے ہیں۔ کہ ایک گھر میں رہنے کے روا دار نہیں۔ کرشن کی بنسی اس دن بجے گی جب غریب بلرام اپنے بال بچوں کو لیے۔ خانہ تباہ۔ آوارۂ وطن بننے پر مجبور ہوگا۔

صبح کا وقت تھا۔ کرشن کے دروازے پر گاؤں کے مکھیا اور نمبردار جمع تھے۔ اور منشی داتا دیال منشیانہ شکوہ و تحمل کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے ہوئے رہن نامہ کا مسودہ مرتب کرنے میں غرق تھے۔ بار بار قلم بناتے۔ بار بار قط رکھتے۔ مگر خط کی شان نہ سدھرتی تھی۔ کرشن کا چہرہ اسی منظر صبح کی طرح شگفتہ تھا۔ اور رادھا خوشی سے اچھلی پڑتی تھی۔ مگر غریب بلرام ان غمناک خیالوں میں غرق تھا جو تاریکی کے رفیق ہیں۔ اور روشنی میں نہیں آتے۔

مکھیا نے کہا۔ "بھائی ایسا ہت۔ نہ بھائی ایسا دشمن۔ کرشن مہاراج نے چھوٹے بھائی کو سنبھال لیا۔"

نمبردار نے عالمانہ انداز سے فرمایا۔ "کرشن مہاراج نے تو سارے گوکل کو بچا لیا تھا۔ چھوٹا بھائی تو پھر بھائی ہے۔"

مختار نے فرمایا۔ "بھائی سپوتوں کے یہی کام ہیں۔"

داتا دیال نے پوچھا۔ "راہن کا نام۔"

بڑے بھائی بولے۔ "بلرام ولد باسدیو۔"

"اور مرتہن؟"

"کرشن ولد باسدیو۔"

بلرام نے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔ حیرت آگے تھی۔ آنسو کی قطار پیچھے۔ کرشن نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ نگاہ سامنے نہ ہو سکی۔ یہ انسان پر قدرت کی فتح ہے۔

نمبردار اور مختار اور مکھیا سب چونکے۔ کیا کرشن خود ہی روپے دے رہا ہے۔ بات چیت تو کسی ساہوکار کی تھی۔ جب گھر ہی میں روپیہ موجود تھا تو اس رہن نامہ کی کیا ضرورت تھی۔ کیا بھائی بھائی میں اتنا اعتبار نہیں۔ ارے رام رام!!

آنکھیں محو اشارہ ہوئیں۔ گویا کشتیاں حیرت کی اتھاہ ندی میں ڈگمگانے لگیں۔

شاما دروازے پر کھڑی تھی، وہ کرشن کی ہمیشہ عزّت کرتی تھی۔ مگر آج محض رواج کی پابندی نے اس موقع پر اسے اپنے خیال کے اظہار سے باز رکھا۔

بوڑھی امّاں نے سنا۔ سوکھی ندی اُمڈ آئی۔ اس نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھا۔ اور ماتھا ٹھونک لیا۔ نوشتۂ تقدیر سے ہار گئی۔

تب اسے اس دن کی یاد آئی۔ جب ایسی ہی سہانی صبح سنہری صبح تھی۔ اور دو پیارے پیارے گلعذار بچّے اس کی گود میں بیٹھے ہوئے اچھل اچھل کر دودھ اور روٹی کھاتے تھے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں کتنا غرور تھا۔ دل میں کتنا حوصلہ۔ کتنی امنگ۔

مگر آج ! آہ آج آنکھوں میں ندامت کے آنسو ہیں۔ اور دل پر حسرت و حزن کا ایک بار گراں۔ اس نے ایک بار پھر زمیں کی طرف دیکھا۔ اور لہجہ یاس میں بولی۔

"نارائن! کیا ایسے لڑکوں کو میری ہی کوکھ سے جنم لینا تھا۔"

اردو ماہنامہ زمانہ (جنوری 1916) میں شائع ہوا۔اردو مجموعہ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سرودور 7 میں ہے۔

نیکی کی سزا

سدھارن آدمی کی طرح شاہ جہاں پور کے ڈسٹرکٹ انجینیر سردار شیو سنگھ میں بھی بھلائیاں اور بُرائیاں دونوں ہی ورتمان (موجود) تھیں۔ بھلائی یہ تھی کہ ان کے یہاں نیائے اور دَیا میں کوئی انتر نہ تھا۔ برائی یہ تھی کہ وہ سَروَتھا (ہر طرح سے) نِرلوبھ (بے حرص) اور نِہہ سوارتھ (بے غرض) تھے۔ بھلائی نے ماتحتوں کو نڈر اور آلسی بنا دیا تھا۔ برائی کے کارن اس وِبھاگ (محکمہ) کے سبھی ادھیکاری ان کی جان کے دشمن بن گئے تھے۔

پراتہ کال (صبح) کا سَمے (وقت) تھا وہ کسی پُل کی نگرانی کے لیے تیار کھڑے تھے مگر سائس ابھی تک میٹھی نیند لے رہا تھا۔ رات کو اُسے اچھی طرح سمجھ دیا تھا کہ پَو پھٹنے کے پہلے گاڑی تیار کر لینا لیکن صبح بھی ہوئی، سورج بھگوان نے درشن بھی دیے، شیتل کرنوں میں گرمی بھی آئی، پر سائس کی نیند ابھی تک نہیں ٹوٹی۔

سردار صاحب کھڑے کھڑے تھک کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے سائس تو کسی طرح جاگا پَرنتو (لیکن) اردلی کے چپراسیوں کا پتہ نہیں۔ جو مہاشے ڈاک لینے گئے تھے وہ ایک ٹھاکر دوارا (پوجا کی جگہ) میں کھڑے چرنا مرت (پیر کا دھوون) کی پرتکشا (انتظار) کر رہے تھے۔ جو ٹھیکے دار کو بلانے گئے تھے وہ بابا رام داس کی سیوا میں بیٹھے دم رگا رہے تھے۔

دھوپ تیز ہوتی جاتی تھی۔ سردار صاحب جھنجھلا کر مکان میں چلے گئے اور اپنی پتنی سے بولے، اتنا دن چڑھ آیا، ابھی تک ایک چپراسی کا بھی پتہ نہیں۔ اس کے مارے تو میرے ناک میں دم آگیا ہے۔

پتنی نے دیوار کی طرف دیکھ کر دیوار سے کہا، یہ سب انھیں سر چڑھانے کا پھل ہے۔

سردار صاحب چڑھ کر بولے، کیا کروں، انھیں پھانسی دے دوں؟

(۲)

سردار صاحب کے پاس موٹر کار کا تو کہنا ہی کیا، کوئی فٹن بھی نہ تھی۔ وے اپنے یکہ سے ہی پرسنّ (خوش) تھے۔ جسے ان کے نوکر چاکر اپنی بھاشا میں اُڑن کھٹولہ کہتے تھے۔ شہر کے لوگ اسے اتنا آدرسوچک (پُرعزت) نام نہ دے کر چھکڑا کہنا ہی اُچت (مناسب) سمجھے تھے۔ اسی طرح سردار صاحب ایسے (دوسرے) ویوہاروں (سلوکوں) میں بھی بڑھے مِت بیی (کم خرچی) تھے۔ ان کے دو بھائی الہ آباد میں پڑھتے تھے۔ ودھوا (بیوہ) ماتا بنارس میں رہتی تھیں۔ ایک ودھوا بہن بھی انھیں پر اولمبت (منحصر) تھیں۔ ان کے علاوہ کئی غریب لڑکوں کو چھاترورتیاں (طالب علموں کے وظیفے) بھی دیتے تھے۔ انھیں کارنوں (وجہوں) سے وہ سدا خالی ہاتھ رہتے۔ یہاں تک کے ان کے کپڑوں پر بھی اس آرتھِک دَشا (مالی حالت) کے نشان دکھائی دیتے تھے۔ لیکن یہ سب کشٹ (تکلیف) برداشت کرکے بھی وہ لوبھ (لالچ) کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ جن لوگوں پر ان کا سنیہہ (پیار) تھا وہ ان کی نیکی کو سراہتے تھے اور انھیں دیوتا سمجھتے تھے۔ ان کی نیکی سے انھیں کوئی نقصان نہ ہوتا تھا لیکن جن لوگوں سے ان کے کاروباری تعلقات تھے وہ ان کے سدبھاؤں (اخلاص) کے گراہک (خریدار) نہ تھے کیونکہ انھیں ہانی (نقصان) ہوتی تھی۔ یہاں تک انھیں اپنے ہم پیشہ لوگوں سے کبھی کبھی نامناسب باتیں سنی پڑتیں تھیں۔

ایک دن وہ دفتر سے آئے تو ان کی بیوی نے پیار سے کہا، تمھاری یہ نیکی کس کام کی، جب سارا سنسار تم کو برا کہہ رہا ہے۔

سردار صاحب نے پُرزور طریقے سے جواب دیا، سنسار جو چاہے کہے پرماتما تو دیکھتا ہے۔

راما نے یہ جواب پہلے ہی سوچ لیا۔ وہ بولی، میں تم سے وِیواد (مخالفت) تو کرتی نہیں، مگر ذرا اپنے دل میں وچار کرکے دیکھو کہ تمھاری اس سچائی کا دوسروں پر کیا اثر پڑتا ہے؟ تم تو اچھی تنخواہ پاتے ہو۔ تم اگر ہاتھ نہ بڑھاؤ تو تمھارا نِرواہ (گذر) ہو سکتا ہے؟ روکھی روٹیاں مل ہی جائیں گی۔ مگر یہ دس دس پانچ پانچ روپے کے چپراسی، محرر، دفتری بے چارے کیسے گزر کریں۔ ان کے بھی بال بچے ہیں۔ ان کے بھی کُٹمب (خاندان) پریوار ہیں۔ شادی، غم، تہوار یہ سب ان کے پاس لگے ہوئے ہیں۔ بھلمنسی کا (اچھے انسان) بھیش

بنائے کام نہیں چلتا۔ بتاؤ ان کا گزر کیسے ہو؟ ابھی رام دین چپراسی کی گھر والی آئی تھی۔ روتے روتے آنچل بھیگتا تھا۔ لڑکی سیانی ہوگئی ہے۔ ہزاروں کا خرچ۔ بتاؤ اس کے آنسو کس کے سر پڑیں گے؟

یہ سب باتیں سچ تھیں۔ ان سے سردار صاحب کو انکار نہیں ہوسکتا تھا۔ انھوں نے خود اس موضوع پر بہت کچھ غور و فکر کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ بڑی نرمی کا سلوک کرتے تھے۔ لیکن سَرلتا (آسانی) شالینتا (انکساری) کا آتمِک (قلبی) گورَو (فخر) چاہے جو ہو، ان کا آرتھِک مول (مالی قیمت) بہت کم ہے۔ وہ بولے، تمھاری باتیں سب حقیقت پر مبنی ہیں لیکن میں مجبور ہوں۔ اپنے اصول کو کیسے توڑیں؟ اگر میرا بس چلے تو میں ان لوگوں کی تنخواہ بڑھا دوں۔ لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ میں خود لوٹ مچاؤں اور انھیں لوٹنے دوں۔

راما نے طنزیہ لفظوں میں کہا، تو یہ ہتیا (قتل) کس پر پڑے گی؟

سردار صاحب نے تیور ہوکر جواب دیا، یہ ان لوگوں پر پڑے گی جو اپنی حیثیت اور آمدنی سے زیادہ خرچ چاہتے ہیں۔ اردلی بن کر کیوں وکیل کے لڑکے سے لڑکی بیاہنے کو ٹھانتے ہیں۔ دفتری کو اگر ٹہلوئے (خادم) کی ضرورت ہو تو یہ کسی پاپ (گناہ) کاریہ (کام) سے کم نہیں۔ میرے سائس کی عورت اگر چاندی کی اینٹ گلے میں ڈالنا چاہے تو یہ اس کی مُورکھتا (بے وقوفی) ہے۔ اس جھوٹی بڑائی کا جواب دہ میں نہیں ہوسکتا ہے

(۳)

انجنیروں کا ٹھیکداروں سے کچھ ایسا ہی سنمبندھ (تعلق) ہے جیسے مدھ مکھیوں کا پھولوں سے۔ اگر وہ اپنے نیت بھاگ سے زیادہ پانے کی کوشش نہ کریں تو ان سے کسی کو شکایت نہیں ہوسکتی۔ یہ مدھورس (شہد) کمیشن کہلاتا ہے۔ رشوت لوک اور پرلوک دونوں کا ہی سَروناش (تباہ) کر دیتی ہے۔ اس میں خوف ہے، چوری ہے، بدمعاشی ہے۔ مگر کمیشن ایک منوہر واٹیکا (چمن) ہے جہاں نہ انسان کا ڈر ہے، نہ پرماتما کا بھَے (خوف)، یہاں تک کے وہاں آتما کی چھپی ہوئی چٹکیوں کا بھی گزر نہیں ہے۔ اور کہاں تک کہیں اس کی طرف بدنامی آنکھ بھی نہیں اُٹھا سکتی۔ یہ وہ بلیدان (قربانی) ہے جو ہتیا ہوتے ہوئے بھی دھرم کا ایک حصہّ ہے۔ ایسی حالت میں اگر سردار شیو سنگھ اپنے روشن کردار کو اس دھبّے سے صاف

رکھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے تو قابلِ معافی تھے۔

مارچ کا مہینہ بیت رہا تھا۔ چیف انجنیر صاحب ضلع میں معائینہ کرنے آرہے تھے۔ مگر ابھی تک عمارتوں کا کام نا مکمل تھا۔ سڑکیں خراب ہو رہی تھیں، ٹھیکداروں نے مٹی اور کنکڑ بھی جمع کیے تھے۔

سردار صاحب روز ٹھیکداروں کی تاکید کرتے تھے مگر اس کا کچھ پھل نہ ہوتا تھا۔

ایک دن انھوں نے سب کو بلایا وہ کہنے لگے، تم لوگ کیا یہی چاہتے ہو کہ میں ضلع سے بد نام ہوکر جاؤں۔ میں نے تمھارے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا۔ میں چاہتا تو آپ سے کام چھین کر خود کرا لیتا مگر میں نے آپ کو ہانی (نقصان) پہنچانا اُچت (مناسب) نہ سمجھا۔ اس کی مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ خیر۔

ٹھیکدار لوگ یہاں سے چلے تو باتیں ہونے لگیں۔ مسٹر گوپال داس، بولے، اب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ شہباز خاں نے کہا، کسی طرح اس کا جنازہ نکلے تو یہاں سے۔ سیٹھ چنّی لال نے فرمایا، انجنیر سے میری جان پہچان ہے میں ان کے ساتھ کام کرچکا ہوں وہ انھیں خوب لتھیڑے گا۔

اس پر بوڑھے ہری داس نے اُپدیش (نصیحت) دیا، یاروں سوارتھ (غرض) کی بات ہے۔ نہیں تو سچ یہ ہے کہ انسان نہیں، دیوتا ہے۔ بھلا اور نہیں تو سال بھر میں کمیشن کے دس ہزار تو ہوتے ہوں گے۔ اتنے روپیوں کو ٹھیکرے کی طرح ادنیٰ سمجھنا کیا کوئی سہج (آسان) بات ہے؟ ایک ہم ہیں کہ کوڑیوں کے پیچھے ایمان بیچتے پھرتے ہیں۔ جو سجّن ہم سے ایک پائی کا روادار نہ ہو، سب پرکار کے کشٹ اُٹھا کر بھی جس کی نیت ڈاواں ڈول نہ ہو، اس کے ساتھ ایسا ذلیل اور سخت رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اسے اپنی بدقسمتی کے سوا اور کیا سمجھیں۔ شہباز خاں نے فرمایا۔ ہاں! اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ شخص نیکی کا فرشتہ ہے۔

سیٹھ چنّی لال نے گمبھیرتا (سنجیدگی) سے کہا، خاں صاحب! بات تو وہی ہے، جو تم کہتے ہو۔ لیکن کیا کیا جائے؟ نیک نیتی سے تو کام نہیں چلتا۔ یہ دنیا تو چھل کپٹ کی ہے۔ مسٹر گوپال داس بی۔اے پاس تھے۔ وہ فخر کے ساتھ بولے انھیں جب اس طرح رہنا تھا تو نوکری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کون نہیں جانتا کہ نیت کو صاف رکھنا اچھی بات

ہے۔ مگر یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ اس کا دوسروں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ہم کو تو ایسا آدمی چاہیے جو خود کھائے اور ہمیں بھی کھلائے۔خود حلوہ کھائے ہمیں روکھی روٹیاں ہی کھلائے۔ وہ اگر ایک روپیہ کمیشن لے گا تو اس کی جگہ پانچ کا فائدہ کردے گا۔ ان مہاشے کے یہاں کیا ہے؟ اس لیے آپ جو چاہیں کہیں، میری تو کبھی ان سے نبھ نہیں سکتی۔

شہباز خاں بولے، ہاں، نیک اور پاک صاف رہنا ضرور اچھی چیز ہے، مگر ایسی نیکی ہی سے کیا جو دوسروں کی جان لے لے۔

بوڑھے ہری داس کی باتوں کی جن لوگوں نے پُشٹی (تائید) کی وہ سب گوپال داس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے! نربل (ناتواں) آتماؤں میں سچائی کا پرکاش (روشنی) جگنو کی چمک ہے۔

(۴)

سردار صاحب کی ایک بیٹی تھی اس کی شادی میرٹھ کے ایک وکیل کے لڑکے سے طے پائی تھی۔ لڑکا ہونہار تھا۔ ذاتی کُل کا اونچا تھا۔ سردار صاحب نے کئی مہینوں کی دوڑ دھوپ میں اس شادی کو طے کیا تھا۔ اور سب باتیں طے ہوچکی تھیں، صرف جہیز کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ آج وکیل صاحب کا ایک خط آیا۔ اس نے اس بات کا بھی فیصلہ کردیا، مگر وِشواس، آشا اور وَچن کے بالکل پرتی کول (برعکس)۔ پہلے وکیل صاحب نے ایک ضلع کے انجنیر کے ساتھ کسی پرکار کا ٹھہراؤ ویرتھ (بے کار) سمجھا۔ بڑی ستی اُدارتا (رواداری) پرکٹ (ظاہر) کی۔ اس شرمناک اور نفرت آمیز سلوک پر خوب آنسو بہائے۔ مگر جب زیادہ پوچھ تاچھ کرنے پر سردار صاحب کے دَھن وِبھَو (جائداد) کا بھید کھل گیا تب جہیز کا ٹھہرانا ضروری ہوگیا۔ سردار صاحب نے آشنکیت (اندیشہ ناک) ہاتھوں سے خط کھولا، پانچ ہزار روپے سے کم پر شادی نہیں ہوسکتی۔ وکیل صاحب کو بہت(کھید اور لجّا) دُکھ اور شرم تھی کہ وہ اس وِشے (موضوع) میں اسپشٹ(ظاہر) پر مجبور کیے گئے۔ مگر وہ اپنے خاندان کے کئی بوڑھے حرات وچارہین (حقیر خیال)، سوارتھاردھ (غرض کا اندھا) مہاتماؤں کے ہاتھوں بہت تنگ تھے۔ ان کا کوئی وَش (اختیار) نہ تھا۔ انجنیر صاحب نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ساری امیدیں مٹی میں مل گئیں۔ کیا سوچتے تھے، کیا ہوگیا۔ بے چین ہوکر کمرے میں ٹہلنے لگے۔

انھوں نے ذرا دیر پیچھے خط کو اٹھا لیا اور اندر چلے گئے۔ سوچا کہ یہ خط راما کو سنائیں، مگر پھر خیال آیا کہ یہاں ہمدردی کی کوئی امید نہیں۔ کیوں اپنی نربلتا (کمزوری)

دکھاؤں؟ کیوں مُورکھ بنوں؟ وہ بغیر باتوں کے بات نہ کرے گی۔ یہ سوچ کر وہ آنگن سے لوٹ گئے۔

سردار صاحب سوبھاؤ کے بڑے دیالو (رحم دل) تھے۔ اور نازک دل مصیبتوں میں سکون سے نہیں رہ سکتا۔ وہ دُکھ اور گلانی سے بھرے ہوئے سوچ رہے تھے کہ میں نے اِسے کون سے بُرے کام کیے ہیں جن کا مجھے یہ پھل مل رہا ہے۔ برسوں کی دوڑ دھوپ کے بعد جو کام سِدھ (بنا) ہوا تھا وہ چھن ماتر (لمحہ بھر) میں نشٹ ہوگیا۔ اب وہ میری قابو سے باہر ہے، میں اسے نہیں سنبھال سکتا۔ چاروں طرف اندھ کار ہے۔ کہیں آشا کا پرکاش نہیں کوئی میرا مددگار نہیں۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

سامنے میز پر ٹھیکیداروں کے بِل رکھے ہوئے تھے۔ وہ کئی ہفتوں سے یوں ہی پڑے تھے۔ سردار نے انھیں کھول کر بھی نہ دیکھا تھا۔ آج اس آتمک گلانی اور (نیراشیہ) مایوسی کی حالت میں انھوں نے ان بِلوں کو ترشنا (لالچ) کی آنکھوں سے دیکھا۔ ذرا سے اشارے پر یہ ساری پریشانیاں دور ہوسکتی ہیں۔ چپراسی اور کلرک صرف میری رضامندی کے سہارے سب کچھ کرلیں گے۔ مجھے زبان ہلانے کی بھی ضرورت نہیں۔ نہ مجھے لجّت (شرمندہ) ہی ہونا پڑے گا۔ ان وچاروں (خیالوں) کا اتنا برابلیہ (احساس) ہوا کہ وہ واستو (حقیقت) میں بِلوں کو اٹھا کر غور سے دیکھنے اور حساب لگانے لگے کہ ان میں کتنی نکاسی ہوسکتی ہے۔

مگر جلد ہی آتما نے انھیں جگا دیا۔ آہ! میں کس بھرم میں پڑا ہوا ہوں؟ کیا اس آتمِک پوترتا (روحانی پاکیزگی) کو، جو میری جنم بھر کی کمائی ہے، صرف تھوڑے سے دھن پر اَرپن (نچھاور) کردوں؟ جو میں اپنے سہکاریوں (ہم پیشہ والوں) کے سامنے فخر سے سر اُٹھائے چلتا تھا، جس سے موٹر کار والے بھراتی گن (بھائی بند) آنکھیں نہیں ملا سکتے تھے، وہیں میں آج اپنے سارے گورو اور مان (فخر اور عزت) کو اپنی سمپُرون (مکمل) آتمِک سمپتی (روحانی دولت) کو دس پانچ ہزار روپیوں پر تیاگ (ترک) دوں۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔

اب اس بُرے خیال کو زیر کرنے کے لیے، جس نے پل بھر کے لیے ان پر فتح پا لی تھی وہ اس سنسان کمرے میں زور ٹھٹّا کر ہنسے۔ چاہے یہ ہنسی ان بِلوں نے اور کمرے کی دیواروں نے نہ سنی ہوں، مگر ان کی آتما نے ضرور سنی۔ اس آتما کو ایک کٹھن پریکشا (مشکل امتحان) میں پار پانے پر پرَم آنند (خاص مسرت) ہوا۔

سردار صاحب نے ان بلوں کو اٹھا کر میز کے نیچے ڈال دیا۔ اور پھر انھیں پیروں سے کچلا تب وہ اس فتح پر مسکراتے ہوئے وہ اندر گئے۔

(۵)

بڑے انجینیر صاحب صحیح وقت پر شاہجہان پور آئے۔ اس کے ساتھ سردار صاحب کی بدقسمتی بھی آئی۔ ضلعے کے سارے کام ادھورے پڑے ہوئے تھے۔ ان کے خانساماں نے کہا، حضور! کام کیسے پورا ہو؟ سردار صاحب ٹھیکیداروں کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ ہیڈ کلرک نے دفتر کے حساب کو بھرم اور بھولوں سے بھرا ہوا پایا۔ انھیں سردار صاحب کی طرف سے نہ کوئی دعوت دی گئی نہ کوئی بھینٹ۔ تو کیا وہ سردار صاحب کے ناتے دار تھے۔ جو غلطیاں نہ نکالتے۔

ضلعے کے ٹھیکیداروں نے ایک بیش قیمت ڈالی سجائی اور اسے بڑے انجنیر صاحب کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے۔ وہ بولے، حضور! چاہے غلاموں کو گولی مار دیں، مگر سردار صاحب کی نا انصافی اب سہی نہیں جاتی۔ کہنے کو تو کمیشن نہیں لیتے مگر وہ سچ پوچھیے تو جان لے لیتے ہیں۔

چیف انجینیر صاحب نے معائنے کی کتاب میں لکھا، "سردار شیو سنگھ بہت ایماندار آدمی ہیں۔ ان کا چرتر روشن ہے، مگر وہ اتنے بڑے ضلعے کے کام کا بھار نہیں سنبھال سکتے۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک چھوٹے سے ضلعے میں بھیج دیے گئے اور ان کا درجہ بھی گھٹا دیا گیا۔ سردار صاحب کے دوستوں اور بھلا چاہنے والوں نے بڑے دھوم دھام سے ایک جلسہ کیا۔ اس میں ان کی دھرم نِشٹھا (مذہبی عقیدت) اور سوَتنترتا (آزادی) کی پرشنسا (تعریف) کی۔ سبھاپتی (صدرِ مجلس) نے پُرنم آنکھوں سے کانپتی آوازوں میں کہا، سردار صاحب کی جدائی کا دُکھ ہمارے دل میں سدا کھٹکتا رہے گا۔ یہ زخم کبھی نہ بھرے گا۔ مگر وداعی دعوت میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ مزیدار کھانوں کے سامنے جدائی کا دُکھ بے معنی ہے۔

سفر کا سامان تیار تھا۔ سردار صاحب جلسے سے آئے تو راما نے انھیں بہت اداس اور غمگین دیکھا۔ اس نے بار بار کہا تھا کہ بڑے انجنیر کے خانساماں کو انعام دو، ہیڈ کلرک کی

دعوت کرو، مگر سردار صاحب نے اس کی بات نہ مانی تھی اس لیے جب اس نے سنا کہ ان کا درجہ گھٹا اور بدلی بھی ہوئی تب اس نے بڑی بے رحمی سے اپنے طنز کے تیر چلائے۔ مگر اس وقت انھیں اداس دیکھ کر اس سے نہ رہا گیا۔ بولی، کیوں اتنے اداس ہو؟ سردار صاحب نے جواب دیا، کیا کروں ہنسوں؟ راما نے گمبھیر سُور (سنجیدہ آواز) سے کہا، ہنسنا ہی چاہیے، روئے تو وہ جس نے کوڑیوں پر اپنی آتما بُھرشٹ (بے ایمان) کی ہو۔ جس نے روپیوں پر اپنا دھرم بیچا ہو۔ یہ برائی کا ڈنڈ نہیں ہے۔ یہ بھلائی اور نیکی کا ڈنڈ ہے، اسے بہ خوشی جھیلنا چاہیے۔

یہ کہہ کر اس نے پتی (شوہر) کی طرف دیکھا تو آنکھوں میں سچا انوراگ (الفت) بھرا ہوا دکھائی دیا۔ سردار صاحب نے بھی اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ ان کی دل لبھانے رائے کا کشادہ نفس سچی خوشی سے معمور تھا اسے گلے لگا کر وہ بولے، راما! مجھے تمھاری ہی ہمدردی کی ضرورت تھی۔ اب میں اس سزا کو بہ خوشی سہوں گا۔

یہ قصہ ماہنامہ ''سرسوتی'' مارچ 1916 میں شائع ہوا تھا۔ عنوان تھا ''سجنتا کا دنڈ''۔ یہ مان سروور 8 میں شامل ہے۔ اردو ترجمہ کے بارے میں معلوم نہیں، پریم چند نے امتیاز علی تاج (11/فروری 1920) کو لکھا تھا کہ ''نیکی کی سزا'' کسی ہندی رسالے میں شائع ہوا تھا۔ اس کا مسودہ میرے پاس ہے صرف نقل کرنا باقی ہے۔ یہ افسانہ کسی اردو مجموعے میں شائع نہیں ہوا۔

پنچایت

جمن شیخ اور الگو چودھری میں بڑا یارانہ تھا۔ ساجھے میں کھیتی ہوتی۔ لین دین میں بھی ساجھا تھا۔ ایک کو دوسرے پر کامل اعتماد۔ جمن جب حج کرنے کو گئے تھے تو اپنا گھر الگو کو سونپ گئے تھے۔ اور الگو جب کبھی باہر جاتے تو جمن پر اپنا گھر چھوڑ دیتے۔ وہ نہ ہم نوالہ تھے۔ نہ ہم پیالہ۔ نہ ہم مشرب۔ صرف ہم خیال تھے۔ اور یہی دوستی کی اصلی بنیاد ہے۔

اس دوستی کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ جب دونوں لڑکے جمن کے پدر بزرگوار شیخ جمعراتی کے روبرو زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ الگو نے استاد کی بہت خدمت کی۔ خوب رکابیاں مانجھیں۔ خوب پیالے دھوئے۔ ان کا حقہ دم نہ لینے پاتا تھا۔ ان خدمتوں میں شاگردانہ عقیدت کے سوا اور کوئی بھی خیال مضمر نہ تھا۔ جسے الگو خوب جانتے تھے۔ ان کے باپ پرانی وضع کے آدمی تھے۔ تعلیم کے مقابلے میں انھیں استاد کی خدمت پر زیادہ بھروسہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے۔ استاد کی دعا چاہیے۔ جو کچھ ہوتا ہے اس کے فیض سے ہوتا ہے۔ اور اگر الگو پر استاد کے فیض یا دعاؤں کا کچھ اثر نہ ہوا تو اسے تسکین تھی کہ تحصیلِ علم کا کوئی دقیقہ اس نے فروگذاشت نہیں کیا۔ علم اس کی تقدیر ہی میں نہ تھا۔ شیخ جمعراتی خود دعا اور فیض کے مقابلے میں تازیانے کے زیادہ قائل تھے۔ اور جمن پر اس کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ اسی کا یہ فیض تھا کہ آج جمن کی قرب و جوار کے مواضعات میں پرستش ہوتی تھی۔ ان کے بیع نامے یا رہن نامے کے مسودات پر تحصیل کا عرائض نویس بھی قلم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ حلقہ کا پوسٹ مین۔ کانسٹبل اور تحصیل دار کا مذکوری یہ سب ان کے دستِ کرم کے محتاج تھے۔ اس لیے اگر الگو کو ان کی ثروت نے ممتاز بنا دیا تھا تو شیخ جمن بھی علم کی لازوال دولت کے باعث وقار کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

(۲)

شیخ جمن کی ایک بوڑھی بیوہ خالہ تھیں۔ ان کے پاس کچھ تھوڑی سی مِلک تھی۔ مگر قریبی وارث کوئی نہ تھا۔ جمن نے وعدے وعید کے سبز باغ دکھا کر خالہ اماں سے وہ مِلک اپنے نام کرا لی تھی۔ جب تک ہبہ نامے کی رجسٹری نہ ہوئی تھی، خالہ جان کی خوب خاطرداریاں ہوتی تھیں۔ خوب میٹھے لقمے اور چٹ پٹے سالن کھلائے جاتے تھے۔ مگر رجسٹری کی مہر ہوتے ہی ان خاطرداریوں پر بھی مہر ہوگئی۔ وہ وعدے وصال کے وعدے ثابت ہوئے۔ جمن کی اہلیہ بی فہمین نے روٹیوں کے ساتھ کچھ تیز تیکھی باتوں کے سالن دینے بھی شروع کیے۔ اور رفتہ رفتہ سالن کی مقدار روٹیوں سے بڑھنے لگی۔ بڑھیا عاقبت کے بورے بٹورے گی کیا؟ دوتین بیگھے اوسر کیا دے دی ہے گویا مول لے لیا ہے۔ بگھاری دال بغیر روٹیاں نہیں اترتیں۔ جتنا روپیہ اس کے پیٹ میں جھونک چکے، اس سے تو اب تک کئی گاؤں مول لے لیتے۔" کچھ دنوں تک خالہ جان نے سنا، اور ضبط کیا۔ مگرجب برداشت نہ ہوئی تو جمن سے شکایت کی۔ جمن صلح پسند آدمی تھے۔ "مقامی" کارکن کے انتظام میں مداخلت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کچھ دن اور یوں ہی رو دھوکر کام چلا۔ آخر ایک دن خالہ جان نے جمن سے کہا۔ "بیٹا! تمھارے ساتھ میرا نباہ نہ ہوگا۔ تم مجھے روپے دے دیا کرو۔ میں اپنا الگ پکا لوں گی۔"

جمن نے بے اعتنائی سے جواب دیا روپیہ کیا یہاں پھلتا ہے۔"

خالہ جان نے بگڑ کر کہا۔"تو مجھے نان نمک چاہیے یا نہیں؟"

جمن نے مظلومانہ انداز سے جواب دیا۔ "چاہیے کیوں نہیں۔ میرا خون چوس لو۔ کوئی یہ تھوڑے ہی سمجھا تھا کہ تم خواجہ خضرؑ کی حیات لے کر آئی ہو۔"

خالہ جان اپنے مرنے کی بات نہیں سن سکتی تھیں۔ جامے سے باہر ہو کر پنچایت کی دھمکی دی۔ جمن ہنسے۔ وہ فاتحانہ ہنسی، جو شکاری کے لبوں پر ہرن کو جال کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر نظر آتی ہے۔ کہا۔ " ہاں ضرور پنچایت کرو۔ فیصلہ ہوجائے۔ مجھے بھی رات دن کا وبال پسند نہیں۔"

پنچایت کی صدا کس کے حق میں اٹھے گی۔ اس کے متعلق شیخ جمن کو اندیشہ نہیں تھا۔ قرب و جوار میں ایسا کون تھا، جو ان کا شرمندۂ منت نہ ہو، کون تھا، جو ان کی دشمنی کو حقیر سمجھے۔ کس میں اتنی جرات تھی، جو ان کے سامنے کھڑا ہوسکے۔ آسمان کے فرشتے

تو پنچایت کرنے آئیں گے نہیں! مریض نے آپ ہی دوا طلب کی۔

(۳)

اس کے کئی دن تک بوڑھی خالہ لکڑی لیے آس پاس کے گاؤں کے چکر لگاتی رہی۔ کمر جھک کر کمان ہوگئی تھی۔ ایک قدم چلنا مشکل تھا۔ مگر بات آپڑی تھی۔ اس کا تصفیہ ضروری تھا۔ شیخ جمن کو اپنی طاقت، رسوخ اور منطق پر کامل اعتماد تھا۔ وہ کسی کے سامنے فریاد کرنے نہیں گئے۔

بوڑھی خالہ نے اپنی دانست میں تو گریہ و زاری کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ مگر خوبیٔ تقدیر کوئی اس کی طرف مائل نہ ہوا۔ کسی نے تو یوں ہی ہاں کرکے ٹال دیا۔ کسی نے زخم پر نمک چھڑک دیا۔ "ذرا اس ہوس کو دیکھو! قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہیں۔ آج مریں کل دوسرا دن ہوا۔ مگر صبر نہیں ہوتا۔ پوچھو اب تمھیں گھر بار، جگہ زمین سے کیا سروکار؟ ایک لقمہ کھاؤ ٹھنڈا پانی پیو۔ اور مالک کی یاد کرو۔" سب سے بڑی بات ستم ظریفوں کی تھی۔ خمیدہ کمر۔ پوپلامنہ۔ سَن جیسے سفید بال اور ثقلِ سماعت۔ جب اتنے تفریح کے سامان موجود ہوں تو ہنسی کا آنا ایک قدرتی امر ہے۔ غرض ایسے درد رس، انصاف پرور آدمیوں کی تعداد بہت کم تھی جنھوں نے خالہ جان کی فریاد کو غور سے سنا ہو۔ اور اس کی تشفی کی ہو۔ چاروں طرف سے گھوم گھام کر بڑھیا الگو چودھری کے پاس آئی۔ لاٹھی ٹیک دی۔ اور دم لے کر کہا "بیٹا! تم بھی چھن بھر کو میری پنچایت میں چلے آنا۔"

الگو بے رخی سے بولے۔ "مجھے بلا کے کیا کرو گی۔ کئی گاؤں کے آدمی تو آئیں ہی گے۔"

خالہ نے ہانپ کر کہا۔ "اپنی پھریاد تو سب کے کان میں ڈال آئی ہوں۔ آنے نہ آنے کا حال اللہ جانے، ہمارے سدسالار گائے گہار سن کر پیڑھی سے اٹھ آئے تھے۔ کیا میرا رونا کوئی نہ سنے گا؟"

الگو نے جواب دیا۔ "یوں آنے کو میں آجاؤں گا۔ مگر پنچایت میں منہ نہ کھولوں گا۔"

خالہ نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں بیٹا؟"

الگو نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔ "اب اس کا کیا جواب؟ اپنی اپنی طبیعت۔ جمن

میرے پرانے دوست ہیں۔ ان سے بگاڑ نہیں کر سکتا۔"

خالہ" نے تاک کر نشانہ مارا۔ "بیٹا کیا بگاڑ کے ڈر سے ایمان کی بات نہ کہو گے؟"

ہمارے سوئے ہوئے ایمان کی ساری جتھا چوری سے لٹ جائے، اسے خبر نہیں ہوتی۔ مگر کھلی ہوئی للکار سن کر وہ چونک پڑتا ہے۔ اور ہوشیار ہو جاتا ہے۔ الگو چودھری اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ کیا وہ "نہیں" کہنے کی جرأت کر سکتے تھے؟

(۴)

شام کو ایک پیڑ کے نیچے پنچایت بیٹھی۔ ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ حقے پان کا بھی انتظام تھا۔ یہ سب شیخ جمن کی مہمان نوازی تھی۔ وہ خود الگو چودھری کے ساتھ ذرا دور بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ جب کوئی آتا تھا ایک دبی ہوئی سلام علیک سے اس کا خیرمقدم کرتے تھے۔ مگر تعجب تھا کہ با اثر آدمیوں میں صرف وہی لوگ نظر آتے تھے جنھیں ان کی رضا جوئی کی کوئی پروا نہیں ہو سکتی تھی۔ کتنے مجلس کو دعوتِ احباب سمجھ کر جھنڈ کے جھنڈ جمع ہو گئے تھے۔

جب پنچایت پوری بیٹھ گئی تو بوڑھی جی نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔

"پنچو! آج تین سال ہوئے۔ میں نے اپنی سب جائداد اپنے بھانجے جمن کے نام لکھ دی تھی۔ اسے آپ لوگ جانتے ہوں گے۔ جمن نے مجھے تاحیات روٹی کپڑا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سال چھ مہینے تو میں نے ان کے ساتھ کسی طرح رو دھو کر کاٹے۔ مگر اب مجھ ے رات دن کا رونا نہیں سہا جاتا۔ مجھے پیٹ کی روٹیاں تک نہیں ملتیں۔ بے کس بیوہ ہں۔ تھانہ کچہری کر نہیں سکتی۔ سوائے تم لوگوں کے اور کس سے اپنا دکھ درد روؤں۔ تم اگ جو راہ نکال دو، اس راہ چلوں۔ اگر میری برائی دیکھو، میرے منہ پر تھپڑ مارو۔ جمن ی برائی دیکھو تو اسے سمجھاؤ۔ کیوں ایک بے کس کی آہ لیتا ہے؟"

رام دھن مِصر بولے۔ "(ان کی کئی اسامیوں کو جمن نے توڑ لیا تھا۔) جمن میاں پنچ کسے بدتے ہو۔ ابھی سے طے کر لو۔"

جمن نے حاضرین پر ایک اُڑتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اپنے تئیں مخالفوں کے نرغے میں پایا۔ دلیرانہ انداز سے کہا۔ "خالہ جان جسے چاہیں پنچ بنائیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔

خالہ نے چلا کر کہا۔ "ارے اللہ کے بندے تو پنچوں کے نام کیوں نہیں بتا دیتا؟"

جمن نے بڑھیا کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "اب اس وقت میری زبان

نہ کھلواؤ۔ جسے چاہو پنچ بنا دو۔"

خالہ نے جمن کے اعتراض کو تاڑ لیا۔ بولیں۔ "بیٹا خدا سے ڈر۔ میرے لیے کوئی اپنا ایمان نہ بیچے گا۔ اتنے بھلے آدمیوں میں کیا سب تیرے دشمن ہی دشمن ہیں؟ اچھا! اور سب کو جانے دے۔ الگو چودھری کو تو مانے گا؟"

جمن فرطِ مسرّت سے باغ باغ ہوگئے۔ مگر ضبط کر کے بولے۔ "الگو چودھری ہی سہی۔ میرے لیے جیسے رام دھن مصر ویسے الگو چودھری۔ کوئی میرا دشمن نہیں ہے۔"

الگو "بغلیں جھانکنے لگے۔ وہ اس جھمیلے میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے۔ معترضانہ انداز سے کہا۔ "بوڑھی اماں! تم جانتی ہو کہ میری اور جمن کی گاڑھی دوستی ہے۔" خالہ نے جواب دیا۔ "بیٹا دوستی کے لیے کوئی اپنا ایمان نہیں کھوتا۔ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ پنچ کے منھ سے جو بات نکلتی ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے نکلتی ہے۔"

الگو کو کوئی چارہ نہ رہا۔ سرپنچ بنے۔ رام دھن مصر دل میں بڑھیا کو کوسنے لگے۔
الگو چودھری نے فرمایا۔ "شیخ جمن! ہم اور تم پرانے دوست ہیں۔ جب ضرورت پڑی ہے۔ تم نے میری مدد کی ہے۔ اور ہم سے بھی جو کچھ بن پڑا ہے، تمھاری خدمت کرتے آئے ہیں۔ مگر اس وقت نہ تم ہمارے دوست ہو، نہ ہم تمھارے دوست۔ یہ انصاف اور ایمان کا معاملہ ہے۔ خالہ جان نے پنچوں سے اپنا حال کہہ سنایا۔ تم کو بھی جو کچھ کہنا ہو کہو۔"

جمن ایک شانِ فضیلت سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بولے۔

"پنچو! میں خالہ جان کو اپنی ماں کے بجائے سمجھتا ہوں۔ اور ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں رکھتا۔ ہاں عورتوں میں ذرا اَن بن رہتی ہے۔ اس میں میں مجبور ہوں۔ عورتوں کی تو یہ عادت ہی ہے۔ مگر ماہوار روپیہ دینا میرے قابو سے باہر ہے۔ کھیتوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے چھپی نہیں۔ آگے پنچوں کا حکم سر اور ماتھے پر ہے۔"

الگو چودھری کو آئے دن عدالت سے سابقہ رہتا تھا۔ قانونی آدمی تھے۔ جمن سے جرح کرنے لگے...... ایک ایک سوال جمن کے دل پر ہتوڑے کی ضرب کی طرح لگتا تھا۔ رام دھن مصر اور ان کے رفیق سر ہلا ہلا کر ان سوالوں کی داد دیتے تھے۔ جمن حیرت میں تھے کہ الگو کو کیا ہوگیا ہے؟ ابھی تو یہ میرے ساتھ بیٹھا کیسے مزے مزے کی باتیں کررہا تھا۔اتنی ہی دیر میں ایسی کایا پلٹ ہوگئی کہ میری جڑ کھودنے پر آمادہ ہے۔ اچھی دوستی نباہی! اس سے اچھے تو رام دھن ہی تھے۔ وہ یہ تو جانتے تھے کہ کون کون سے کھیت کتنے

پر اٹھتے ہیں۔ اور کیا نکاسی ہوتی ہے۔ ظالم نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔

جرح ختم ہونے کے بعد الگو نے فیصلہ سنایا۔ لہجہ نہایت متین اور تحکمانہ تھا۔

"شیخ جمن! پنچوں نے اس معاملے پر اچھی طرح غور کیا۔ زیادتی سراسر تمھاری ہے۔ کھیتوں سے معقول نفع ہوتا ہے۔ تمھیں چاہیے کہ خالہ جان کو ماہوار گزارے کا بندوبست کردو۔ اس کے سوائے اور کوئی صورت نہیں۔ اگر تمھیں یہ منظور نہیں، تو ہبہ نامہ منسوخ ہوجائے گا۔"

جمن نے فیصلہ سنا اور سناٹے میں آگئے۔ احباب سے کہنے لگے۔"بھئی اس زمانے میں یہی دوستی ہے کہ جو اپنے اوپر بھروسہ کرے، اس کی گردن پر چھری پھیری جائے۔ اسی کو نیرنگئ روزگار کہتے ہیں۔ اگر لوگ ایسے دغا باز، جو فروش گندم نما نہ ہوتے۔ تو ملک پر یہ آفتیں کیوں آتیں۔ یہ ہیضہ اور پلیگ انھیں مکاریوں کی سزا ہے۔"

مگر رام دھن مصّر اور فتح خاں اور جگو سنگھ اس بے لاگ فیصلے کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ اسی کا نام پنچایت ہے۔ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی۔ دوستی دوستی کی جگہ ہے۔ مقدم ایمان کا سلامت رکھنا ہے۔ ایسے ہی ستیہ بادیوں سے دنیا قائم ہے۔ ورنہ کب کی جہنم میں مل جاتی۔"

اس فیصلے نے الگو اور جمن کی دوستی کی جڑیں ہلا دیں۔ تناور درخت، حق کا ایک جھونکا بھی نہ سہہ سکا۔ وہ اب بھی ملتے تھے۔ مگر تیر وسپر کی طرح۔ جمن کے دل سے دوست کی غداری کا خیال دور نہ ہوتا تھا۔ اور انتقام کی خواہش چین نہ لینے دیتی تھی۔

(۵)

خوش قسمتی سے موقع بھی جلد مل گیا۔ پچھلے سال الگو بٹیسر کے میلے سے بیلوں کی ایک اچھی گوئیں مول لائے تھے۔ پچھائیں نسل کے خوبصورت بیل تھے۔ مہینوں تک قرب و جوار کے لوگ انھیں دیکھنے آتے رہے۔

اس پنچایت کے ایک مہینے بعد ایک بیل مرگیا۔ جمن نے اپنے دوستوں سے کہا۔ "یہ دغا بازی کی سزا ہے۔ انسان صبر کرجائے، مگر خدا نیک و بد دیکھتا ہے۔" الگو کو اندیشہ ہوا کہ جمن نے اسے زہر دلوا دیا ہے۔ اس کے برعکس چودھرائن کو خیال تھا کہ اس پر کچھ کردیا گیا ہے۔ چودھرائن او فہیمن میں ایک دن زور و شور سے ٹھنی۔ دونوں خاتونوں نے روانی بیان کی ندی بہا دی۔ تشبیہات اور استعاروں میں باتیں ہوئیں۔ بارے جمن نے

آگ بجھائی۔ بیوی کو ڈانٹا۔ اور رزم گاہ سے ہٹالے گئے۔ ادھر الگو چودھری نے اپنے ڈنڈے سے چودھرائن کی شیریں کلامیوں کی داد دی۔

اب ایک بیل کس کام کا۔ اس کا جوڑا بہت ڈھونڈا۔ مگر نہ ملا ناچار اسے بیچ ڈالنے کی صلاح ہوئی۔ گاؤں میں ایک سیٹھ تھے وہ یکہ گاڑی ہانکتے تھے۔ گاؤں میں گڑ گھی بھرتے اور منڈی لے جاتے منڈی سے تیل نمک لاد کر لاتے گاؤں میں بیچتے۔ اس بیل پر ان کی طبیعت لہرائی۔ سوچے۔ اسے لے لوں۔ تو دن میں بلا کسی منت کے تین کھیوے ہوں۔ یہاں تو ایک ہی کے لالے رہتے ہیں۔ بیل دیکھا، گاڑی میں دوڑایا، بال بھونری کی پہچان کرائی، مول بھاؤ کیا۔ اور اپنے دروازے پر لاکر باندھ دیا۔ دام کے لیے ایک مہینے کا وعدہ ہوا۔ چودھری بھی غرض مند تھے۔ گھاٹے کی کچھ پروا نہ کی۔

سمجھو نے نیا بیل پایا۔ تو پاؤں پھیلائے۔ دن میں تین تین چار چار کھیوے کرتے۔ نہ چارے کی فکر تھی۔ نہ پانی کی۔ بس کھیوؤں سے کام تھا۔ منڈی لے گئے۔ وہاں کچھ سوکھا بھس ڈال دیا۔ اور غریب جانور ابھی دم بھی نہ لینے پایا تھا کہ پھر جوت دیا۔ الگو چودھری کے یہاں تھے تو چین کی بنسی بجتی تھی۔ راتب پاتے۔ صاف پانی۔ دَلی ہوئی ارہر۔ بھوسہ کے ساتھ کھلی۔ کبھی کبھی گھی کا مزہ بھی مل جاتا۔ شام سویرے ایک آدمی کھریرا کرتا۔ بند کھجلاتا۔ جھاڑتا۔ پونچھتا۔ سہلاتا۔ کہاں وہ ناز و نعمت۔ کہاں یہ آٹھوں پہری کی رپٹ۔ مہینے بھر میں بے چارے کا کچومر نکل گیا۔ یکہ کا جوا دیکھتے ہی بے چارے کا ہیاؤ چھوٹ جاتا۔ ایک ایک قدم چلنا دوبھر تھا۔ ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ لیکن اصیل جانور۔ مار کی تاب نہ تھی۔ ایک دن چوتھے کھیوے میں سیٹھ جی نے دونا بوجھ لادا۔ دن بھر کا تھکا جانور پیر مشکل سے اٹھتے تھے۔اس پر سیٹھ جی کوڑے رسید کرنے لگے۔ بیل جگر توڑ کر چلا۔ کچھ دور دوڑا۔ چاہا کہ ذرا دم لے۔ ادھر سیٹھ جی کو جلد گھر پہنچنے کی فکر۔ کئی کوڑے بڑی بے دردی سے لگائے۔ بیل نے ایک بار پھر زور لگایا۔ مگر طاقت نے جواب دے دیا۔ زمین پر گر پڑا۔ اور ایسا گرا۔ کہ پھر نہ اٹھا۔ سیٹھ جی نے بہت پیٹا۔ ٹانگ پکڑ کر کھینچی۔ نتھنوں میں لکڑی ٹھونس دی۔ مگر لاش نہ اٹھی۔ تب کچھ اندیشہ ہوا۔ غور سے دیکھا۔ بیل کو کھول کر الگ کیا۔ اور سوچنے لگے کہ گاڑی گھر کیوں کر پہنچے۔ بہت چیخے اور چلائے۔ مگر دیہات کا راستہ بچوں کی آنکھ ہے۔ سرِ شام سے بند۔ کوئی نظر نہ آیا۔ قریب کوئی گاؤں بھی نہ تھا۔

مارے غصہ کے موئے بیل پر اور دڑے لگائے۔ سسرے! تجھے مرنا تھا تو گھر پر مرتا۔ تو نے اُدھے رستے میں دانت نکال دیے۔ اب گاڑی کون کھینچے۔ اس طرح خوب جلے بھنے۔ کئی بورے گڑ اور کئی کنستر گھی کے بیچے تھے۔ دوڈھائی سو روپے کمر میں بندھے ہوئے تھے۔ گاڑی پر کئی بورے نمک کے تھے۔ چھوڑ کر جا بھی نہ سکتے تھے۔ گاڑی پر لیٹ گئے۔ وہیں رت جگا کرنے کی ٹھان لی۔ اور آدھی رات تک دل کو بہلاتے رہے حقہ پیا۔ گایا۔ پھر حقہ پیا۔ آگ جلائی۔ تاپا۔ اپنی دانست میں تو وہ جاگتے ہی رہے۔ مگرجب پو پھٹی۔ چونکے۔ اور کمر پر ہاتھ رکھا تو تھیلی ندارد۔ کلیجہ سَن سے ہوگیا، کمر ٹٹولی۔ تھیلی کا پتہ نہ تھا۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کئی کنستر تیل کے بھی غائب تھے۔ سر پیٹ لیا۔ پچھاڑیں کھانے لگے۔ صبح کو بہ ہزار خرابی گھر پہنچے۔

سیٹھانی جی نے یہ حادثہ الم ناک سنا تو چھاتی پیٹ لی۔ پہلے تو خوب روئیں۔ پھر الگو چودھری کو گالیاں دینے لگیں۔ حفظ ماتقدم کی سوجھی۔ نگوڑے نے ایسا منحوس بیل دیا کہ سارے جنم کی کمائی لٹ گئی۔

اس واقعے کو کئی ماہ گزر گئے۔ الگو جب اپنے بیل کی قیمت مانگنے جاتے تو سیٹھ اور سیٹھانی دونوں جھلائے ہوئے کتوں کی طرح چڑھ بیٹھتے۔ "یہاں تو سارے جنم کی کمائی مٹی میں مل گئی۔ فقیر ہوگئے۔ انھیں دام کی پڑی ہے۔ مردہ منحوس بیل دیا تھا۔ اس پر دام مانگتے ہیں۔ آنکھ میں دھول جھونک دی۔ مرا ہوا بیل گلے باندھ دیا۔ نرا پونگا ہی سمجھ لیا ہے۔ کسی گڑھے میں منہ دھو آؤ۔ تب دام لینا۔ صبر نہ ہوتا ہو تو ہمارا بیل کھول لے جاؤ۔ مہینے کے بدلے دو مہینے جوت لو۔ اور کیا لوگے۔"؟ اس فیاضانہ فیصلے کے قدردان حضرات کی بھی کمی نہ تھی۔ اس طرح جھڑپ سن کر چودھری لوٹ آتے۔ مگر ڈیڑھ سو روپے سے اس طرح ہاتھ دھو لینا آسان کام نہ تھا۔ ایک بار وہ بھی بگڑے۔ سیٹھ جی گرم پڑے۔ سیٹھانی جی جذبہ کے مارے گھر سے نکل پڑیں۔ سوال و جواب ہونے لگے۔ خوب مباحثہ ہوا۔ مجادلہ کی نوبت پہنچی۔ سیٹھ جی نے گھر میں گھس کر کواڑ بند کرلیے۔ گاؤں کے کئی معزز آدمی جمع ہوگئے۔ دونوں فریق کو سمجھایا۔ سیٹھ جی کو دلاسا دے کر گھر سے نکالا اور صلاح دی کہ پنچایت کرلو۔ جو کچھ طے ہوجائے، اسے مان جاؤ۔ سیٹھ جی راضی ہوگئے۔ الگو نے بھی حامی بھری۔ فیصلہ ہوگیا۔

(۶)

پنچایت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دونوں فریق نے غول بندیاں شروع کیں۔ تیسرے دن اسی سایہ دار درخت کے نیچے پھر پنچایت بیٹھی۔

وہی شام کا وقت۔ کھیتوں میں کوؤں کی پنچایت لگی ہوئی تھی۔ امر متنازعہ یہ تھا کہ مٹر کی پھلیوں پر ان کا جائز استحقاق ہے یا نہیں۔ اور جب تک یہ مسئلہ طے نہ ہوجائے، وہ رکھوالے لڑکے کی فریاد بے داد پر بلاغت آمیز ناراضگی کا اظہار ضروری سمجھتے تھے۔

درخت کی ڈالیوں پر طوطوں میں سرگرم مباحثہ ہورہا تھا۔ بحث طلب یہ امر تھا کہ انسان کو انھیں من حیث القوم بے وفا کہنے کا کیا حق حاصل ہے۔

پنچایت پوری آبیٹھی۔ تو رام دھن مصر نے کہا۔ ”اب کیوں دیر کی جائے۔ بولو چودھری کن کن آدمیوں کو پنچ بدتے ہو؟“

الگو نے منکسرانہ انداز سے جواب دیا۔ ”سمجھو سیٹھ ہی چن لیں۔“

سمجھو سیٹھ کھڑے ہوگئے۔ اور کڑک کر بولے۔ ”میری طرف سے شیخ جمن کا نام لکھ لو۔“

الگو نے پہلا نام جمن کا سنا اور کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ گویا کسی نے اچانک تھپڑ مار دیا۔ رام دھن مصر الگو کے دوست تھے۔ تہہ پر پہنچ گئے۔ بولے۔ ”چودھری تم کو کوئی عذر تو نہیں ہے؟“

چودھری نے مایوسانہ انداز سے جواب دیا۔ ”نہیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔“

اس کے بعد چار نام اور تجویز کیے گئے۔ الگو پہلا چرکا کھاکر ہوشیار ہوگئے تھے۔ خوب جانچ کر انتخاب کیا۔ صرف سرپنچ کا انتخاب باقی تھا۔ الگو اس فکر میں تھے کہ اس مرحلے کو کیوں کر طے کروں۔ کہ یکایک سمجھو سیٹھ کے ایک عزیز گوڈر شاہ بولے۔ ”سمجھو بھائی سرپنچ کسے بناتے ہو؟“

سمجھو کھڑے ہوگئے۔ اور اکڑ کر بولے۔ ”شیخ جمن کو۔“

رام دھن مصر نے چودھری کی طرف ہمدردانہ انداز سے دیکھ کر پوچھا۔ الگو تمھیں کچھ عذر ہو، تو کہو۔“

الگو نے قسمت ٹھونک لی۔ حسرت ناک لہجے میں بولے۔ ”نہیں! مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔“

(۷)

اپنی ذمے داریوں کا احساس اکثر ہماری تنگ ظرفیوں کا زبردست مصلح ہوتا ہے۔ اور گمراہی کے عالم میں معتبر رہنما۔

ایک اخبار نویس اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھا ہوا مجلس وزراء کو کتنی بے باکی اور آزادی سے اپنے تازیانۂ قلم کا نشانہ بناتا ہے۔ مگرایسے موقع بھی آتے ہیں، جب وہ خود مجلس وزراء میں شریک ہوتا ہے۔ اس دائرے میں قدم رکھتے ہی اس کی تحریر میں ایک دل پذیر متانت کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ذمےّ داری کا احساس ہے۔

ایک نوجوان عالمِ شباب میں کتنا بے فکر ہوتا ہے۔ والدین اسے مایوسانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسے ننگِ خاندان سمجھتے ہیں۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد ہی وارفتہ مزاج، ننگِ خاندان، کتنا سلامت رو، کتنا محتاط ہوجاتا ہے۔ یہ ذمے داری کا احساس ہے۔ یہ احساس ہماری نگاہوں کو وسیع کردیتا ہے۔ مگرزبان کو محدود۔

شیخ جمن کو بھی اپنی عظیم الشان ذمے داری کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا۔ میں اس وقت انصاف کی اونچی مسند پر بیٹھا ہوں۔ میری آواز اس وقت حکم خدا ہے۔ اور خدا کے حکم میں میری نیت کو مطلق دخل نہ ہونا چاہیے حق اور راستی سے جَو بھر ٹلنابھی مجھے دنیا اور دین دونوں ہی میں روسیاہ بنا دے گا۔

پنچایت شروع ہوئی۔ فریقین نے اپنے حالات بیان کیے، جرح ہوئی، شہادتیں گزریں۔ فریقین کے مددگاروں نے بہت کھینچ تان کی۔ جمن نے بہت غور سے سنا۔ اور تب فیصلہ سنایا۔

الگوچودھری اور سمجھو سیٹھ! پنچوں نے تمھارے معاملے پر غور کیا۔ سمجھو کو بیل کی پوری قیمت دینا واجب ہے۔ جس وقت بیل ان کے گھرآیا، اس کو کوئی بیماری نہ تھی۔ اگر قیمت اسی وقت دے دی گئی ہوتی تو آج سمجھو اسے واپس لینے کا ہرگز تقاضا نہ کرتے۔"

رام دھن مصر نے کہا۔ "قیمت کے علاوہ ان سے کچھ تاوان بھی لیا جائے۔ سمجھو نے بیل کو دوڑا دوڑا کے مار ڈالا۔"

جمن نے کہا۔ "اس کا اصل معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔"

گوڈرشاہ نے کہا۔ "سمجھو کے ساتھ کچھ رعایت ہونی چاہیے۔ ان کا بہت نقصان ہوا ہے اور اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے۔"

جمن بولے۔ ''اس کا بھی اصل معاملے سے کوئی تعلق نہیں یہ الگو چودھری کی بھل منسی پر منحصر ہے۔'' یہ فیصلہ سنتے ہی الگوچودھری پھولے نہ سمائے۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور زور سے ہانک لگائی۔

''پنچ پرمیشری کی جے!''

آسمان پر تارے نکل آئے تھے۔ اس نعرے کے ساتھ ان کی صدائے تحسین بھی سنائی دی۔ بہت مدھم گویا سمندر پار سے آئی ہو۔

ہر شخص جمن کے انصاف کی داد دے رہا تھا۔ انصاف اس کو کہتے ہیں! آدمی کا یہ کام نہیں۔ پنچ میں پرماتما بستے ہیں۔ یہ ان کی مایا ہے۔ پنچ کے سامنے کھوٹے کو کھرا بنانا مشکل ہے۔ گھنٹہ بھر کے بعد جمن شیخ الگو چودھری کے پاس آئے اور ان کے گلے سے لپٹ کر بولے۔

''بھیا! جب سے تم نے میری پنچایت کی ہے، میں دل سے تمھارا جانی دشمن تھا۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ پنچایت کی مسند پر بیٹھ کر نہ کوئی کسی کا دوست ہوتا ہے نہ دشمن، انصاف کے سوا اور اسے کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ بھی خدا کی شان ہے۔ مجھے یقین آگیا کہ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔''

الگو رونے لگے۔ دل صاف ہوگیا۔ دوستی کا مرجھایا ہوا درخت پھر ہرا ہوگیا۔ اب وہ بالو کی زمین پر نہیں، حق اور انصاف کی زمین پر کھڑا تھا۔

اردو ماہنامہ زمانہ مئی اور جون 1916 میں شائع ہوا پنچ پرمیشور کے عنوان سے ہندی ماہنامہ سرسوتی جون 1916 میں شائع ہوا اردو مجموعہ پریم بتیسی میں مان سروور 7 میں شامل ہے۔

سرِ پُرغرور

شام ہوگئی تھی۔ میں سرجو ندی کے کنارے اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا دریا کا لطف اٹھا رہا تھا کہ میرے فٹ بال نے دبے پاؤں قریب آکر مجھے سلام کیا۔ گویا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔

''فٹ بال'' کے نام سے جس مخلوق کا ذکر کیا گیا۔ وہ میرا اردلی تھا۔ اسے صرف ایک نظر دیکھنے سے یقین ہوجاتا تھا کہ یہ نام اس کے لیے کامل طور پر موزوں ہے۔ وہ سرتاپا ایک انسانی اور لحمی جرم تھا۔ عرض اور طول مساوی اس کا مدوّر شکم جس نے اس دائرے کے بنانے میں خاص حصہّ لیا تھا، ایک لمبے کمر بند میں لپٹا رہتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ انتہا سے آگے نہ بڑھ جائے۔ جس وقت وہ تیزی سے چلتا تھا۔ نہیں بلکہ لڑھکتا تھا۔ تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فٹ بال ٹھوکر کھاکر لڑھکتا چلا آتا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا کہتے ہو؟''

اس پر فٹ بال نے ایسی رونی صورت بنائی گویا کہیں سے پٹ کر آیا ہے اور بولا۔ ''حضور ابھی تک یہاں رسد کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔ زمیندار صاحب کہتے ہیں کہ میں کسی کا نوکر نہیں ہوں۔''

میں نے اس نگاہ سے دیکھا۔ گویا مین اور زیادہ نہیں سننا چاہتا۔ یہ غیر ممکن تھا کہ ایک مجسٹریٹ کی شان میں زمیندار سے ایسی گستاخی سرزد ہوتی۔ یہ میرے حاکمانہ غصےّ کو مشتعل کرنے کی ایک بے تمیزانہ کوشش تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''زمیندار کون ہے؟''

فٹ بال کی باچھیں کھل گئیں۔ بولا۔ ''کیا کہوں کنور سجن سنگھ۔ حضور بڑا سرکش آدمی ہے۔ رات ہونے آئی ہے۔ اور ابھی تک حضور کے سلام کو بھی نہیں آیا۔ گھوڑوں کے سامنے نہ گھاس ہے نہ دانہ۔ لشکر کے سب آدمی بھوکے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مٹی کا ایک برتن بھی نہیں بھیجا۔''

مجھے زمینداروں سے رات دن سابقہ رہتا تھا۔ مگر یہ شکایت کبھی سننے میں نہیں آئی تھی۔ اس کے برعکس وہ میری خاطروتواضع میں ایسی جانفشانی سے کام لیتے تھے جو خودداری کے شایاں نہ تھی۔ اس میں فیاضانہ مہمان نوازی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ نہ اس میں تکلف تھا۔ نہ نمودِ ثروت۔ جو عیب ہے۔ مگرسفلے پن سے خالی۔ اس کے بجائے وہاں رسوخِ بے جا کی فکر اور خودمطلبی کی ہوس صاف نظر آتی تھی۔ اور اس رسوخِ طلبی کی قیمت شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ ان بے نواؤں سے وصول کی جاتی تھی جن کا بیکسی کے سوا اور کوئی دستگیر نہیں۔ ان کے طرزِ کلام اور آداب میں وہ ملائمت اور عاجزی برتی جاتی تھی جس کا اعتبار حسنِ ظن کے ساتھ بیر ہے اور اکثر ایسے موقعے آتے تھے، جب ان خاطرداریوں سے تنگ ہوکر دل چاہتا تھا کہ کاش ان حریص اور خوشامدی آدمیوں کی صورت نہ دیکھنا پڑتی۔

مگر فٹ بال کی زبان سے یہ کیفیت سن کر میری جو حالت ہوئی، اس نے ثابت کردیا کہ روزانہ خاطرداریاں اور شیریں کلامیاں مجھ پر بے اثر نہیں ہوئی تھیں۔ میں یہ حکم دینے والا ہی تھا کہ کنور سجن سنگھ کو حاضر کرو۔ دفعتاً مجھے خیال آیا۔ ان مفت خورے چپراسیوں کے کہنے پر ایک معزز آدمی کو مطعون کرنا قرینِ انصاف نہیں۔ اردلی سے کہا۔

''بنیوں کے پاس جاؤ۔ نقد دام دے کر چیزیں لاؤ۔ اور یاد رکھو کہ میرے پاس کوئی شکایت نہ آئے۔''

اردلی دل میں مجھے نفرین کرتا چلا گیا۔

مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب وہاں ایک ہفتے تک مقیم رہنے پر بھی مجھے کنور صاحب سے نیاز حاصل نہ ہوا۔ اپنے عملوں اور لشکر والوں کی زبان سے کنور صاحب کی شرکشی اور غرور اور ہیکڑی کی داستانیں روز سنا کرتا اور میرے جہاندیدہ پیشکار نے ایسے نامہمان نواز گاؤں میں پڑاؤ ڈالنے کے لیے مجھے کئی بار کنایتاً فہمائش کی۔ غالباً میں پہلا شخص تھا جس سے یہ خطا سرزد ہوئی تھی۔ اور اگر میں نے ضلع کے نقشے کے بجائے لشکر والوں سے اپنے دورے کا پروگرام بنانے میں مدد لی ہوتی۔ تو شاید اس ناگوار تجربے کی نوبت نہ آتی۔ لیکن کچھ عجب بات تھی کہ کنور صاحب کی مذمت مجھ پر الٹا اثر ڈالتی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے اس شخص سے ملاقات کرنے کا اشتیاق ہوا جو ہمہ گیر اور

ہمہ کن افسروں سے اس قدر بے نیاز رہ سکتا ہے۔

(۲)

صبح کا وقت تھا۔ میں گڑھی میں گیا۔ نیچے سرجو ندی لہریں مار رہی تھی۔ اس پار ساکھو کا جنگل تھا۔ میلوں تک بادامی ریت، اس پر خربوزے اور تربوزے کی کیاریاں تھیں۔ زرد پھولوں سے لہراتی ہوئی۔ بگلوں اور مرغابیوں کے غول کے بیٹھے ہوئے تھے۔ سورج دیوتا نے جنگلوں سے سر نکالا۔ لہریں جگمگائیں۔ پانی میں تارے نکلے۔ سہانا روح افزا منظر تھا۔

میں نے اطلاع کی، اور کنور صاحب کے دیوان خانے میں داخل ہوا۔ وسیع کمرہ تھا۔ فرش سے آراستہ۔ سامنے مسند پر ایک نہایت قوی ہیکل شخص بیٹھا ہوا تھا۔ سر کے بال منڈے ہوئے۔ گلے میں رودراکش کی ایک مالا۔ سرخ آنکھیں۔ اونچی پیشانی۔ مردانہ غرور کی اس سے بہتر تصویر نہیں ہوسکتی۔ چہرے سے ہیبت اور رعب برستا تھا۔

کنور صاحب نے میرے سلام کو اس انداز سے لیا گویا وہ اس کے عادی ہیں۔ مسند سے اٹھ کر انھوں نے نہایت مربیانہ انداز سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ خیریت پوچھی۔ اور اس تکلیف کے لیے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد عطر پان کی تواضع کی۔ تب وہ مجھے اپنی اس گڑھی کی سیر کرانے چلے، جس نے کسی زمانے میں ضرور آصف الدولہ کو زچ کیا ہوگا۔ مگر اس وقت شکستہ حال تھی۔ یہاں کے ایک ایک روڑے پر کنور صاحب کو ناز تھا۔ ان کی خاندانی عظمت اور اقتدار کا تذکرہ، ان کی زبان سے سن کر باور نہ کرنا غیر ممکن تھا۔ ان کا طرزِ بیان یقین کو مجبور کرتا تھا۔ اور وہ ان روایات کے محض پاسبان ہی نہ تھے بلکہ یہ ان کے ایمان کا جزو تھیں۔ اور جس قدر ان کے امکان میں تھا انھوں نے اپنی آن نبھانے میں کبھی فروگذاشت نہیں کی۔

کنور سجن سنگھ خاندانی رئیس تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب جابجا ٹوٹتا ہوا، آخر کسی مہاتما رشی سے مل جاتا تھا۔ گو انھیں عبادت و ریاضت کا دعویٰ نہ تھا۔ لیکن اس کا فخر ضرور تھا کہ وہ ایک رشی کی اولاد ہیں۔ بزرگوں کے جنگی کارنامے بھی ان کے لیے کچھ کم باعثِ فخر نہ تھے۔ ان کا تاریخ میں کہیں ذکر نہ ہو، مگر خاندانی بھاٹ نے انھیں امر بنانے میں کوئی کسر نہیں رکھی تھی۔ اور اگر الفاظ میں کچھ طاقت ہے، تو یہ گڑھی روہتاس یا کالنجر

کے قلعوں پر بھی سبقت رکھتی تھی۔ کم سے کم قدامت اور پامالی کی ظاہری علامتوں میں تو اس کی مثال مشکل سے مل سکتی تھی۔ کیونکہ زمانۂ قدیم میں چاہے اس نے محاصروں اور سرنگوں کو حقیر سمجھا ہو، لیکن اس وقت وہ چیونٹیوں اور دیمکوں کے حملوں کی بھی مدافعت نہ کرسکتی تھی۔

کنور سجن سنگھ سے میری ملاقات بہت مختصر تھی۔ لیکن اس دلچسپ انسان نے مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ نہایت ذکی۔ نکتہ سنج۔ دور رس آدمی تھا۔ آخر مجھے اس کا بندۂ بے درم ہونا تھا۔

(۳)

برسات میں سرجو ندی اس زور شور سے چڑھی کہ ہزاروں گاؤں غارت ہوگئے۔ بڑے بڑے تناور درخت تنکوں کی طرح بہتے چلے جاتے تھے۔ چارپائیوں پر سوتے ہوئے بچے اور عورتیں، کھونٹے پر بندھے ہوئے گائے اور بیل، اس کی گرجتی ہوئی لہروں میں سما گئے۔ کھیتوں میں ناؤ چلتی تھی۔

شہر میں اڑتی ہوئی خبریں پہنچیں۔ امداد کے رزولیوشن پاس ہوئے۔ سکریٹریوں نے ہمدردی اور رنج کے ارجنٹ تار ضلع کے بڑے صاحب کی خدمت میں روانہ کیے۔ ٹاؤن ہال میں قومی ہمدردی کی پرشور صدائیں، اور اس ہنگامے میں ستم رسیدوں کے پردرد نالے دب گئے۔

سرکار کے کانوں میں فریاد پہنچی۔ ایک تحقیقاتی کمیشن تعینات کی گئی۔ زمینداروں کو حکم ہوا کہ وہ کمیشن کے روبرو اپنے نقصانات کی تفصیل بیان کریں۔ اور اس کے ثبوت دیں۔ شیورام پور کے مہا راجا صاحب کو اس کمیشن کی صدارت کا منصب عطا ہوا زمینداروں میں ریل پیل شروع ہوئی نصیب جاگے۔ نقصان کے تخمینے کے تصفیے میں شاعرانہ سخن شناسی سے کام لینا پڑا۔ صبح سے شام تک کمیشن کے روبرو ایک جمگھٹ رہتا تھا۔ آنربیل مہا راجا صاحب کو سانس لینے کی فرصت نہ تھی۔ دلیل اور شہادت کا کام سخن سازی اور خوشامد سے لیا جاتا تھا۔ مہینوں یہی کیفیت رہی۔ لبِ ساحل کے سب ہی زمیندار اپنے نقصان کی فریادیں پیش کر گئے۔ اگر کوئی کمیشن سے بے فیض رہا تو وہ کنور سجن سنگھ تھے۔ ان کے سارے موضعے سرجو کے کنارے پر تھے۔ اور سب تباہ ہوگئے

تھے۔ گڑھی کی دیواریں بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکی تھیں۔ مگر ان کی زبان خوشامد سے ناآشنا تھی۔ اور یہاں اس کے بغیر رسائی مشکل۔ چنانچہ وہ کمیشن کے روبرو صورتِ سوال بنے ہوئے نہ آسکے۔ میعاد ختم ہونے پر کمیشن نے رپورٹ پیش کی۔ سیلاب سے ڈوبے ہوئے علاقوں میں لگان کی عام معافی ہوگئی۔ رپورٹ کے مطابق صرف سجن سنگھ ہی وہ خوش نصیب زمیندار تھے جن کا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ کنورصاحب نے رپورٹ سنی۔ مگر پیشانی پر بل نہ آیا۔ ان کے اسامی گڑھی کے صحن میں جمع تھے۔ یہ حکم سنا تو آہ و زاری کرنے لگے۔ تب کنور صاحب اٹھے۔ اور بلند آواز سے بولے۔ ”میرے علاقے میں بھی معافی ہے۔ ایک کوڑی لگان نہ لیا جائے گا۔“ میں نے یہ واقعہ سنا۔ اور خودبخود میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بیشک یہ وہ شخص ہے جو حکومت اور اختیار کے طوفان میں جڑ سے اکھڑ جائے مگر خم نہ ہوگا۔

(۴)

وہ دن بھی یاد رہے گا جب اجودھیا میں ہمارے جادو نگار، زندۂ جاوید شنکر کو قوم کی جانب سے مبارک باد پیش کرنے کے لیے عظیم الشان جلسہ ہوا۔ ہمارا مایۂ ناز۔ ہمارا پرجوش۔ نازک بیان شنکر یورپ اور امریکہ پر اپنے کلام کا جادو کرکے واپس آیا تھا۔ اپنے کمالات پر ناز کرنے والے یورپ نے اس کی پرستش کی تھی۔ اس کے جذبات نے براؤننگ اور شیلے کے عاشقوں کو بھی پابندِ وفا نہ رہنے دیا۔ اس کے آبِ حیات سے تشنہ کامانِ یورپ سیراب ہوگئے۔ ساری مہذب دنیا نے اس کی پرواز کے آگے سر جھکا دیے اس نے بھارت کو یورپ کی نگاہوں میں اگر زیادہ نہیں تو یونان اور روم کے پہلو میں بٹھا دیا تھا۔

جب تک وہ یورپ میں رہا۔ روزانہ اخبارت کے صفحات اس کے تذکروں سے پر ہوتے تھے۔ یونیورسیٹوں اور علماء کی انجمنوں نے اس پر خطابات کی موسلا دھار بارش کردی تھی۔ وہ تمغۂ افتخار جو اہل یورپ کا پیارا خواب اور زندہ آرزو ہے۔ وہ تمغہ ہمارے پیارے زندہ دل شنکر کے سینے پر زیب دے رہا تھا۔ اور اس کی واپسی کے بعد آج انھیں قومی جذبات پر اظہارِ عقیدت کے لیے ہندوستان کے دل اور دماغ اجودھیا میں جمع تھے۔

اسی اجودھیا کی گود میں سری رام چندر کھیلتے تھے۔ اور یہیں انھوں نے والمیک کی

سحر نگاریوں کی داد دی تھی۔ اسی اجودھیا میں ہم اپنے شیریں کلام شنکر پر اپنی محبت کے پھول چڑھانے آئے تھے۔

اس قومی فرض میں حکام سرکاری بھی نہایت فیاضی کے ساتھ ہمارے شریک تھے۔ شنکر نے شملہ اور دارجلنگ کے فرشتوں کو بھی اجودھیا میں کھینچ لیا تھا۔ اجودھیا کو بہت انتظار کے بعد یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔

جس وقت شنکر نے وسیع شامیانہ میں قدم رکھا۔ ہمارے دل قومی غرور اور نشے سے متوالے ہوگئے۔ اس سے محسوس ہوتا تھا کہ ہم اس وقت کسی زیادہ پاک۔ زیادہ روشن دنیا کے بسنے والے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے۔ افسوس صرف ایک لمحے کے لیے اپنی پستی اور پامالی کا خیال ہمارے دلوں سے دور ہوگیا جے! جے!! کی صداؤں نے ہمیں اس طرح مست کردیا۔ جیسے مہور ناگ کو مست کر دیتا ہے۔

ایڈریس پڑھنے کا فخر مجھے حاصل ہوا تھا۔ سارے پنڈال میں خاموشی کا عالم طاری تھا۔ جس وقت میری زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ ''اے قوم کے رہنما! اے ہمارے روحانی گرو! ہم سچی محبت سے تمھیں مبارک باد دیتے ہیں۔ اور سچی ارادت سے تمھارے قدموں پر سر جھکاتے ہیں۔'' یکایک میری نگاہ اٹھی۔ اور میں نے ایک قوی ہیکل آدمی کو تعلقہ داروں کی صف سے اٹھ کر باہر جاتے دیکھا۔ یہ کنور سجن سنگھ تھے۔

مجھے کنور صاحب کی یہ بے موقع حرکت جسے بدتہذیبی خیال کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے، بری معلوم ہوئی۔ ہزاروں آنکھیں ان کی طرف حیرت سے اٹھیں۔

جلسے کے ختم ہوتے ہی میں نے پہلا کام جو کیا وہ کنور صاحب سے اس امر کے متعلق جواب طلب کرنا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیوں صاحب! آپ کے پاس اس بے موقع فعل کا کیا جواب ہے؟''

سجن سنگھ نے متانت سے جواب دیا۔ ''آپ سننا چاہیں تو جواب دوں۔''

''شوق سے فرمایئے۔''

اچھا تو سنیے۔ میں شنکر کے کلام کا دلدادہ ہوں۔ شنکر کی عزت کرتا ہوں شنکر پر ناز کرتا ہوں۔ شنکر کو اپنا اور اپنی قوم کا محسن سمجھتا ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ہی انھیں اپنا

روحانی گرو ماننے یا ان کے قدموں پر سر جھکانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"
میں حیرت سے ان کا منھ تکتا رہ گیا۔ یہ انسان نہیں غرور کا پتلا ہے۔ دیکھیں یہ سر کبھی جھکتا ہے یا نہیں؟

(۵)

پورنماشی کا پورا چاند سرجو کے سنہرے فرش پر ناچتا تھا۔ اور لہریں خوشی سے گلے مل مل کر گاتی تھیں۔ پھاگن کا مہینہ تھا۔ پیڑوں میں کونپلیں نکلی تھیں۔ اور کوئل کوکنے لگی تھی۔

میں اپنا دورہ ختم کرکے صدر لوٹتا تھا۔ راستے میں کنور سجن سنگھ کے فیضِ صحبت کا اشتیاق مجھے ان کے درِ دولت تک لے گیا۔ جو اب میرے لیے خانۂ بے تکلف تھا۔

میں شام کے وقت دریا کی سیر کو چلا۔ وہ ہوائے جاں پرور، وہ درخشاں لہریں۔ وہ روحانی سکوت۔ سارا منظر ایک دلآویز پُر مزہ خواب تھا۔ چاند کے نغمۂ درخشاں سے جس طرح لہریں جھوم رہی تھیں۔ اسی طرح فکرِ شیریں سے دل امڈا آتا تھا۔

مجھے اونچے کراڑے پرایک درخت کے نیچے کچھ روشنی نظر آئی۔ میں اوپر چڑھا۔ وہاں برگد کے گھنے سائے میں ایک دھونی جل رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک سادھو پیر پھیلائے برگد کی ایک موٹی جٹا کے سہارے لیٹے ہوئے تھے۔ ان کا نورانی چہرہ آگ کی چمک کو لجاتا تھا۔ نیلے تالاب میں کنول کھلا ہوا تھا۔

ان کے پیروں کے پاس ایک دوسرا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ وہ اس سادھو کے پیروں پر اپنا سر رکھے ہوئے تھا۔ قدموں کو چومتا تھا۔ اور آنکھوں سے لگاتا تھا۔ سادھو اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھے ہوئے تھے۔ گویا ہوس صبر اور قناعت کے دامن میں پناہ ڈھونڈتی تھی۔ بھولا لڑکا ماں باپ کی گود میں آبیٹھا تھا۔

دفعتاً وہ سر پر خم اٹھا۔ اور میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ مجھے سکتہ سا ہوگیا۔ یہ کنور سجن سنگھ تھے۔ وہ سر جوخم ہونا نہ جانتا تھا۔ اس وقت زمین بوس تھا۔ وہ ماتھا جو ایک اعلیٰ منصب دار کے سامنے نہ جھکا۔ جو ایک با ثروت اور با اختیار مہا راجا کے سامنے نہ جھکا۔ جو ایک باکمال قوم پرست۔ شاعراور فلاسفر کے سامنے نہ جھکا۔ اس وقت ایک سادھو کے قدموں پر گرا ہوا تھا، ترک اور استغناء کے سامنے سرنگوں ہوگیا تھا۔

میرے دل میں اس عبرت ناک نظارے سے عقیدت کا ایک ولولہ پیدا ہوا۔ آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹا اور کنور سجن سنگھ کا روحانی مرتبہ دکھائی دیا۔ میں کنور صاحب کی طرف چلا۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھانا چاہا۔ لیکن میں ان کے پیروں سے لپٹ گیا۔ اور بولا۔

"میرے دوست! میں آج تک تمھاری روحانی عظمت سے بالکل بے خبر تھا۔ آج تم نے میرے دل پر نقش کردیا کہ جاہ اور ثروت۔ کمال اور شہرت یہ سب سفلی اور مادی ہیں۔ نفس کے ناز بردار اس قابل نہیں کہ ہم ان کے سامنے فرقِ نیاز جھکائیں۔ ترک اور تسلیم ہی وہ علوی صفات ہیں، جن کے آستانے پر حشمت اور جاہ سے بے نیاز سر بھی جھک جاتے ہیں۔ یہی وہ طاقت ہے، جو جاہ وحشم کو، بادۂ غرور کے متوالوں کو اور تاج مرصع کو، اپنے قدموں پر گرا سکتی ہے۔ اے کنجِ خلوت میں بیٹھنے والی روحو! تم دھنیہ ہو کہ غرور کے پتلے بھی تمھارے پیروں کی دھول کو ماتھے پر چڑھاتے ہیں۔

کنور سجن سنگھ نے مجھے چھاتی سے لگا کر کہا۔ "مسٹر واگلے، آج آپ نے مجھے سچے غرور کی صورت دکھا دی۔ اور میں کہہ سکتا ہوں۔ کہ سچا غرور سچی عبادت سے کم نہیں۔ یقین مانیے مجھے اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غرور میں بھی روحانیت کا پاس ہوسکتا ہے۔ آج میرے سر میں غرور کا جو نشہ ہے، وہ کبھی نہیں تھا۔

اردو ماہنامہ زمانہ میں اگست 1916 میں شائع ہوئی۔اردو میں مجموعہ پریم بتیسی اور ہندی میں 'گھمنڈ کا پتلا' کے عنوان سے گپت دھن ۱ میں شامل ہے۔

اپنے فن کا استاد

جس زمانے کا واقعہ میں لکھنا چاہتا ہوں اس کے چھ ماہ قبل کلکتہ کے مشہور الائنس بنک میں چوری ہوگئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چوری اسی بینک کے خزانچی ہریندر اور اس کے معاون بھون چندر کی کرتوت تھی۔ چوری ہونے کے بعد ہی سے وہ دونو ں لاپتہ تھے۔ پولیس نے بہتیرا سر مارا مگر ابھی تک ان کا سراغ نہیں ملا۔

میں یونین تھیٹر کا مالک ہوں۔ اس زمانے میں ہمارے ڈراما نویس ہیم بابو نے ایک ناٹک ''عظمتِ کشمیر'' کے نام سے لکھا تھا۔ حالانکہ یہ ان کی پہلی ہی تصنیف تھی، مگر میں اسے کھیلنے پر راضی ہوگیا۔ اس وقت مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ کیا ترکیب کروں کہ کھیل والے دن خوب ہجوم ہو۔

کئی دن سوچتے سوچتے مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ جسے عملی صورت میں لانے کی لیے میں ہیم بابو سے ملاقات کرنے گیا۔

سات بجے کا وقت تھا۔ ہیم بابو بستر پر سے اتر کر چائے پینے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی آگ ہوگئے۔ بڑی رکھائی سے بولے۔ ''اب کیا؟ پھر کہیں رد و بدل کرانے چلے ہو کیا؟'' اگر ایسا ہے تو آپ سیدھے راستے واپس جایئے۔ اب میں ایک لفظ کیا ایک حرف تک نہ بدلوں گا۔ آپ کو سو دفعہ غرض ہو تو میرا ناٹک کھیلئے۔ ورنہ مت کھیلئے۔ آپ کو ناٹک کیا دیا اپنے سر زحمت لے لی۔ سب کاموں کی ایک حد ہوتی ہے۔ مگر آپ نے تو مارا ناک میں دم کردیا۔ ہمیشہ یہی لگائے رہتے ہو کہ یہاں یوں بنا دیجیے۔ یہاں یوں بدل دیجئے۔ وہاں سے یہ نکال دیجیے۔ آخر کوئی کہاں تک برداشت کرے۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ آپ براہِ کرم میری کتاب واپس کر دیجئے۔ میں اس کھیل سے باز آیا۔''

میری ہنسی روکے نہ رکتی تھی۔ مجھے ہنستے دیکھ کر ہیم بابو اور بھی زیادہ بگڑے ۔ ''جی ہاں خوب ہنسیے۔ ہنسنے میں کچھ خرچ تو ہوتا نہیں۔ اگر آپ کو معلوم ہوتا کہ ایسی

باتوں سے مصنف کے دل کو کتنا صدمہ ہوتا ہے۔ کتنی روحانی تکلیف ......" اب کی بار میں نے جوں توں کر کے ہنسی روکی اور ان کی بات کاٹ کر بولا۔ "جناب من ٹھہریے ٹھہریے، میں جس کام کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور ہی کام ہے۔"

یہ سن کر ان کا غصہ اور بھی بڑھا۔ جھنجھلا کر بولے تو پھر اب تک کیوں نہیں کہا، وہ کون سا کام ہے؟

"بتلاتا ہوں سنیے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کا ناٹک بڑی دھوم دھام سے کھیلا جائے۔ یہ سن کر ہیم بابو دھیمے پڑے۔ مسکرا کر بولے۔ "دیکھیے دیویندر بابو۔ کل رات کو کھٹملوں کے مارے آنکھ تک نہیں لگی۔ طبیعت بدمزہ ہے۔ جھنجلاہٹ میں اگر آپ کو کچھ کہہ سن دیا ہو تو معاف کیجیے گا۔ ہاں تو اس بارے میں آپ کیا تجویز کرتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "میری ترکیب بالکل اچھوتی ہے۔ آیئے آپ اور میں کشمیر چل کر ...... ہیم بابو نے قطع کلام کرکے کہا "کاشمیر چل کر؟ آپ کیا کہتے ہیں؟ کشمیر ہندوستان کی شمالی حد پر ہے۔ کیا ہم لوگ اتنی دور جائیں گے! یہ ٹھیک نہیں۔ یہ غیر ممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی دوسری ترکیب ہو تو بتلایے۔"

ہیم بابو جتنے ہی موٹے ہیں اتنے ہی کاہل الوجود ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ان کے نزدیک ملک الموت کے یہاں جانے سے کم نہیں۔ کاہلی ہی تک نہیں ایک مشکل اور بھی تھی۔ وہ حال ہی میں دوسری شادی کرکے لائے تھے۔ بڑھاپے میں اس سولہ سالہ نازنین کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے۔ اس سے ایک لمحہ کی جدائی شاق تھی۔ ہمیشہ اس کے آنچل کے کونے میں بندھے رہنا چاہتے تھے۔ قندِ مکرر کا لطف کون نہیں تھا۔ اس لیے مجھے ان کے کشمیر جانے پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ میں تو یہ پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ اور اس کے لیے تیار تھا۔

میں نے ہنستے ہوئے انھیں سمجھا کر کہا۔ اجی آپ نے پوری بات تو سنی ہی نہیں۔ میں سچ مچ کشمیر چلنے کو تھوڑے ہی کہتا ہوں۔ ہم اور آپ کسی گاؤں میں چل کر تین ماہ تک چھپ رہیں۔ ادھر میرے گویندے اخباروں میں خبر اڑا دیں گے کہ یونین تھیٹر کے مالک اور "عظمتِ کشمیر" کے مصنف دونوں کشمیر سے تاریخی تصاویر جمع کرنے کے لیے ساتھ ساتھ کشمیر گئے ہیں۔ وہاں کے رسم و رواج اور معاشرت کے نظارے فراہم کر رہے

ہیں۔ اس دھوم دھام سے ''عظمتِ کشمیر'' اب کی کھیلا جائے گا، آج تک کوئی ڈراما اتنی تیاریوں سے نہیں کھیلا گیا اور نہ اب شاید کھیلا جائے۔ ناٹک کیا ہوگا کشمیر کی پُر فضا سیر ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد وہ کہیں گے کہ آج دونوں سیاح فلاں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے۔ اور اس کا فوٹو لیا۔ آج فلاں بات کی تحقیقات کی۔ آج فلاں جھیل کی سیر کی۔ آج فلاں مجلسِ رقص و سرود میں شریک ہوئے۔ اور اس کی تصویر مع حسینانِ کشمیر کے اتاری۔ غرض روز مرہ اخباروں میں اسی قسم کی خبریں شائع کی جائیں گی۔ تین مہینے میں اچھی ہلچل ہو جائے گی۔ اور جب کھیل ہوگا تو اس دن سارا شہر اٹد آئے گا۔ بیٹھنے والوں کو جگہ نہ ملے گی۔ ناکام لوٹ جائیں گے۔

میں نے جب ناٹک کی کامیابی کی ایسی شاندار تصویر کھینچی تو ہیم بابو کے چہرے پر ہلکا ہلکا تبسم نظر آیا۔ وہ تکیے کے سہارے لیٹے ہوئے میری باتوں کو بڑی غور سے سن رہے تھے۔ شاید خیال میں انھیں شبِ اول کی آمدنی کے نوٹ اور اشرفیوں کے ڈھیر کے ڈھیر نظر آرہے تھے۔ بے چارے ہنسی کو روکتے تھے۔ مگر وہ روکے نہ رکتی تھی۔

جب میں خاموش ہوا تو وہ خوشی سے بولے۔ ''واہ! بابو صاحب واہ! کیا ترکیب سوچی ہے۔ بس اب اس میں دیر نہ کیجیے۔ آپ کو بھی پرماتما نے کیا دقیقہ رس عقل دی ہے۔ مجھے تو خواب میں بھی یہ نہ سوجھتا۔''

میں نے پوچھا۔ تو آپ چلنے کو مستعد ہیں۔

ہیم بابو تعجب سے بولے ''میں! واہ آپ بھی کیا کہتے ہیں۔ بھلا میں کیسے چل سکتا ہوں؟ دیکھیے مجھے ایک خاص بیماری ہے۔ وقتاً فوقتاً اس کا دورہ ہوجاتا ہے۔ آج کل تو اس نے بہت دق کر رکھا ہے۔ مجھے کہاں لے چلیے گا۔ آپ اکیلے ہی جائیے نا۔''

میں نے کہا۔ ''اکیلے نہیں ہوسکتا۔ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ ہم دونوں کو ساتھ ساتھ جانا چاہیے۔''

ہیم بابو تھوڑی دیر کچھ سوچ کر بولے۔ ''لیکن اس کام میں کوئی آفت آنے کا خوف تو نہیں؟ مان لو کسی نے دیکھ لیا تو پھر؟ اور یہ تو بتائیے چلیے گا کہاں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ابھی اس کا فیصلہ نہیں کر سکا۔ رات ہی کو تو یہ ترکیب

سوجھی ہے۔ اور اس وقت آپ سے صلاح لینے چلا آیا۔ چلنا ایسی جگہ چاہیے جہاں کلکتہ کے بہت تھوڑے آدمی ہوں۔ چھپ کر رہنے کے لیے جگہ کی کمی نہیں۔ اور نہ بہت دور ہی جانا پڑے گا۔ ابھی اس دن ہریندر اور بھون بینک پر ہاتھ صاف کرکے غائب ہوئے اور ان کا پتہ نہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ وہ قریب ہی کے کسی گاؤں میں روپوش ہیں۔ اور ادھر پولیس سارے شہر کی خاک چھان رہی ہے۔ ہاں آپ نے رام نگر کا نام کبھی سنا ہے؟

"نہیں۔ کیوں؟

"وہ مقام جاڑے میں ایسا ویران ہوجاتا ہے جیسا عرب کا ریگستان۔ وہاں نام بدل کر رہنے سے کسی کو ہماری خبر نہ ہوگی۔ رام نگر کے پاس ہی ایک ندی ہے۔ شام سویرے آپ اس ندی کے کنارے ٹہلیے گا۔ اس سے آپ کی صحت کو بھی نفع ہوگا۔"

"میں بالکل تندرست ہوں۔ دیہات جاکر صحت حاصل کرنے کی ضرورت مجھے نہیں۔ اورپھر مہینہ پندرہ دن کی بات ہوتی تو خیر۔ تین تین مہینے! غضب رے غضب!"

بہت بحث وتکرار کے بعد ہیم بابو نے سوچ کر جواب دینے کا وعدہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ بیوی سے صلاح لے لیں۔

(۲)

مستقبل کے سبز باغ دکھا کر آخر میں نے ہیم بابو کو بڑی مشکل سے اپنے ساتھ چلنے پر راضی کیا ایک ہفتے کے اندر ہی تمام تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ ہم لوگ اسٹیشن پر پہنچے۔ ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ہیم بابو نے جو محرمی صورت بنائی وہ مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ اتنا غم تو انھیں پہلی بیوی کے مرنے پر بھی نہیں ہوا تھا۔ بے چارے کی صورت پر ترس آتا تھا۔ اسٹیشن سے میں نے دو انگریزی اخبار خرید لیے تھے۔ ان دونوں ہی میں ہم لوگوں کے کشمیر جانے کی بڑی لمبی چوڑی خبریں درج تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہم لوگ سچ مچ کشمیر جارہے ہیں۔

سفر ختم ہوا۔ ہم لوگ رام نگر پہنچے۔ گاؤں بہت چھوٹا ہے۔ اور سب خالی پڑا ہے۔ ہم لوگوں کو مکان کرائے پر آسانی سے مل گیا۔ میں نے مالک مکان سے کہہ دیا کہ میرے دوست کی صحت خراب ہے۔ یہاں ہم لوگ آب و ہوا تبدیل کرنے آئے ہیں۔

پانچ سات دن گزرنے پر بسنتی ہوا چلنے لگی۔ ایک دن میں نے ہیم بابو سے پوچھا

"کہیے کیسی جگہ ہے؟"

ہیم بابو منہ بنا کر بولے۔ "ارے رام رام! ایسی جگہ بھی آدمی آتے ہیں! نہ کوئی دلچسپی و تفریح۔ گاؤں کیا ہے مرگھٹ ہے۔ بیٹھے بیٹھے جی اکتا جاتا ہے۔ نہ کوئی کام نہ کاج۔ شام کو ضرور روزانہ اخبار آجاتے ہیں مگر دن کیسے کٹے؟"

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر بولے۔ "کہیے کتنے دن گزر گئے۔ میرا تو ناک میں دم آگیا۔ اس گندے مکان میں بیٹھے بیٹھے میں تو سڑ گیا۔ کہیں ذرا گھومنے پھرنے کا بھی موقع نہیں۔ میں موٹا ایسا بے حساب ہوں کہ راستے میں نکلنے سے لڑکوں سے پنڈ چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ خیریت اتنی ہے کہ اس گاؤں میں لڑکے زیادہ نہیں ہیں۔ نہیں تو اب تک میں سچ مچ پاگل ہوجاتا۔ یہ باتیں میرے لیے کچھ نئی نہ تھیں۔ روز یہی دکھڑا رہتا تھا۔ ہنسی روک کر میں نے اتنا ہی کہا۔ "ہم لوگوں کو یہاں آئے ہوئے صرف بیس ہی دن ہوئے ہیں۔ ابھی صرف ۷۰ دن اور باقی ہیں۔ پھر پو بارہ ہے۔ نصیبوں کا ستارہ چمکے گا۔ ہیم بابو افسردگی سے بولے۔ "جی ہاں! اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو۔ یہاں تو ایک ایک دن کٹنا مشکل ہے۔ اگر بیچ ہی میں لڑھک گیا تو وہ دولت کس کے کام آئے گی۔ ابھی ۷۰ دن ہیں۔ یہ کہیے پورا ایک زمانہ پڑا ہے۔ نہیں منیجر صاحب! اس سے تو یہی بہتر ہے کہ کلکتہ لوٹ چلیے۔ سچ کہتا ہوں یہاں کی ہوا میرے لیے نا قابلِ برداشت ہوگئی ہے۔ صحت بھی خراب ہو چلی ہے۔ یہ فکر بھی لگی ہوئی ہے کہ وہاں کوئی میری سدہ کرکے کراہ رہا ہوگا۔"

مجھے تو معلوم ہی تھا کہ نئی بیوی سے الگ رہ کر ہیم بابو کبھی خوش اور تندرست نہیں رہ سکتے۔ بات ٹال کر بولا۔ "لیکن اب کلکتہ جانے کی کون صورت ہوسکتی ہے۔ یہ ۷۰ دن تو یہاں کاٹنے پڑیں گے۔" ہیم بابو نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اور خاموش ہوگئے۔

(۳)

ایک روز میں ہیم بابو کو ڈیرے پر چھوڑ کر کچھ کاغذ خریدنے بازار گیا تھا۔ وہاں دیکھا کہ دُکان کے اندر تخت پر بیٹھا ہوا ایک آدمی زور زور سے اس دن کا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اور کئی بے کار آدمی بیٹھے سن رہے تھے۔ مضمون تھا ہماری فرضی سیاحت کا۔

میں وہاں کھڑا ہی تھا کہ ایک دُبلے پتلے آدمی نے ایک پیسہ پھینکا اور چائے مانگی

میں نے دل میں سوچا کیا ایسے پھٹے حال آدمیوں کو بھی چائے کا شوق ہوتا ہے؟ اس آدمی کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ بہت سوچا مگر یاد نہ آیا کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں گھبرا گیا۔ اس کا گھورنا دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ میں اسے نہیں پہچانتا تو کیا مگر وہ مجھے ضرور پہچانتا ہے۔ میرے خوف کا سبب ظاہر تھا۔ کہیں اس نے اخباروں میں میرے سفر کا حال پڑھا ہو۔ اور مجھے یہاں اس طرح بہ یک بنی و دوگوش دیکھ کر بھانڈا پھوڑ دے تو سارا کھیل بگڑ جائے۔ ہم لوگوں کی ساری پول کھل جائے گی۔ اور آج ہی کل میں اس دھوکے بازی کا حال سارے ملک میں مشہور ہوجائے گا۔ پھر تو ہم منھ دکھانے کے لائق نہ رہیں گے۔ مارے فکر کے میں بدحواس ہوگیا۔ دل میں اپنے کو کوسنے لگا۔

خیر دکاندار کو پیسے دے کر میں جلد جلد قدم بڑھاتا ہوا گھر کی طرف چلا۔ پر دو ہی قدم چلا تھا کہ پیچھے سے کسی نے پکارا۔ ”اجی صاحب! اجی دیویندر بابو! میں نے پیچھے پھر کر کہا۔ ”آپ بھولتے ہیں صاحب۔ میرا نام دیویندر بابو نہیں ہے۔“

اس نے جواب دیا۔ کیوں صاحب آپ جھوٹ کیوں بولتے ہیں۔ میں آپ کو خوب پہچانتا ہوں مگر اسے جانے دیجیے۔ براہِ کرم پانچ منٹ ٹھہر کر میری دو باتیں سن لیجیے۔ تھیٹر میں جاکر تو آپ سے ملاقات ہونے کی نہیں۔

اب مجھے کوئی شک نہ رہا کہ وہ شخص مجھے پہچانتا ہے۔ لاچار کھڑا ہوکر بولا۔ ”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

وہ کہنے لگا۔ ”میں ایک ایکٹر ہوں۔ بچپن ہی سے مجھے نقل کرنے کا شوق ہے۔ اتنی عمر میں میں سبھی قسم کے ناٹک کھیل چکا ہوں۔ مجھ میں ایکٹ کرنے کی خاص لیاقت ہے مگر کوئی ضامن نہ ملنے کے باعث مجھے کلکتے میں نوکری نہ ملی۔ جب تک کوئی میری سفارش نہ کرے۔ کسی کو کیوں میرے اوپر یقین آئے گا۔ میں نے آپ کا اتنا وقت ضائع کیا، معاف کیجیے۔ میری درخواست ہے کہ ایک بار مجھے کام دے کر دیکھیے کہ فی الواقع مجھے کھیلنا آتا ہے یا نہیں؟“

اس کی باتیں سننے سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ اسے ابھی تک ہم لوگوں کے کشمیر جانے کی خبر نہیں ہے۔ مگر کون جانے کہ آدھ ہی گھنٹے بعد یہ خبر اس سے چھپی رہے

گی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ اگر اسے نوکری نہ دوں تو وہ ضرور لوگوں سے اس ملاقات کا تذکرہ کرے گا۔ پھر تو میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ تو آپ کون پارٹ اچھی طرح کھیل سکتے ہیں؟

شاید مارے خوشی کے اس نے میری باتوں کو نہیں سنا۔ بولا ”اجی میں بہت تھوڑی تنخواہ پر راضی ہوجاؤں گا۔“

میں نے کہا۔ ”چلیے تھوڑی دور تک باتیں کرتے چلیں۔ اچھا آپ کو کام دینے کے قبل ایک بار آپ کا امتحان ضروری ہے کہ آیا آپ میں اس کام کا مادہ بھی ہے یا نہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ یونین تھیٹر کے معمولی ملازم بھی ضرورت پڑنے پر ایکٹ کرسکتے ہیں۔ تو آپ کے گاؤں میں کوئی امیشور تھیٹر نہیں ہے۔ کیا کوئی ٹھیکے کا کام بھی نہیں ملتا؟“

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ جی نہیں یہاں کوئی کام نہیں ملتا۔ اس وجہ سے گھر بیٹھا ہوں۔“

”مگر آپ تو ناٹکوں کے دنیا سے اتنی دور پڑے ہوئے ہیں؟“

”جی ہاں، اس کا سبب ہے کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ میری ایک چھوٹی لڑکی بھی ہے۔“

”کلکتے میں بھی تو کتنے ہی ایکٹر بال بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔“

جی ہاں ان کی ویسی ہی چلتی بھی تو ہے۔ پھر میرے جیسا بے کار آدمی کس بوتے پر جا کر کلکتے میں رہے۔ غریب آدمی کی لڑکی۔ جو دیکھے گا دوتکارے گا۔ مجھے ساری عمر اس گاؤں میں کاٹنی منظور ہے۔ مگر اپنی لڑکی کو موت کے منھ میں نہ ڈالوں گا۔ وہی میری ساری عمر کی کمائی ہے۔“

”ہاں، آپ کا نام کیا ہے؟“

”جی میرا نام پرآن پدپان ہے۔“

”تو پرآن پد بابو۔ آپ کا کھیل دیکھے بغیر تو میں آپ کو کام نہیں دے سکتا۔ اور آپ ہی سوچیے اس میں کوئی بیجا بات تو نہیں ہے۔“

”نہیں بیجا کیا ہے۔ تو آپ مجھے اطلاع دیں گے؟“

”ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ میرے پاس آپ کو خبر ملنے میں ذرا دیر لگے گی۔

"عظمتِ کشمیر" ناٹک جب شروع ہوجائے تو آپ ایک خط لکھ کر مجھے یاد دلا دیجیے گا۔ میں یہاں کچھ عرصے تک اور رہوں گا۔ کل سویرے کی گاڑی سے کشمیر جاؤں گا۔ اخباروں میں آج ہم لوگوں کے کشمیر جانے کی خبر نکل چکی ہے۔ اس لیے یہ کسی پر ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ آپ آج مجھے ملے۔ تو ہاں آپ کی بات مجھے یاد رہے گی۔"

اسے شاید میری باتوں کا یقین نہ آیا۔ وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ تب افسوسناک لہجے میں بولا۔ بابو صاحب! آپ نے میرے ساتھ جس بھلمنسی کا اظہار کیا ہے اس کا میں مشکور ہوں۔ مگر آپ نے میرے ساتھ سلوک کیا کیا۔ میں جوں کا توں فاقہ مست بنا رہا۔

"نہیں نہیں آپ مایوس نہ ہوں۔ میں بہت جلد آپ کو اطلاع دوں گا۔" مجھے نہیں معلوم تھا کہ تقدیر کی نیرنگیاں مجھے اس دن اسی سے دوچار کریں گی۔

(۴)

میں نے ڈیرے پر آکر دیکھا کہ ہیم بابو خوابِ خرگوش میں مبتلا ہیں۔ ناک نغمہ سرائی کر رہی ہے میں نے انھیں فوراً جگا کر کہا "کپڑے وغیرہ جلد سمیٹ کر تیار ہوجایئے آج ہی یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔"

ہیم بابو نے متحیر ہو کر پوچھا۔ "کیوں بات کیا ہے؟"

"بات ہے میرا سر۔ یہاں ایک کمبخت چھوکرا ہے جو مجھے پہچانتا ہے۔ میں اس سے کہہ آیا ہوں کہ ہم لوگ آج ہی کشمیر چلے جائیں گے۔ اسی سے کہتا ہوں آج چل دیں۔ کہ کل وہ ہمیں یہاں نہ دیکھ پائے۔"

ہیم بابو لیٹے تھے۔ اٹھ بیٹھے اور بولے۔ "تو ہم لوگوں کو کلکتہ چلنا ہوگا؟"

"ارے نہیں نہیں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے۔ کہیں اور چلیں گے۔"

"کیوں؟ ہم لوگ کیا چور ہیں؟ اچھا دیویندر بابو۔ اس طرح اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنے سے کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ میں کلکتہ لوٹ جاؤں؟ وہاں میں خوب خبر داری سے گھر کے دروازے بند کر کے بیٹھا رہوں گا۔ کوئی پتہ نہ پاسکے گا۔ یہ سب سے اچھا ہوگا۔"

میں نے ہیم بابو کی باتوں پر دھیان نہیں دیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ گھر میں چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہم لوگ

روشنی کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں ایک اجنبی آدمی روشنی لیے ہوئے داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر میں جتنا نہیں چونکا تھا اس سے زیادہ اس کی باتیں سن کر چونک پڑا۔ یہ حضرت کہتے کیا ہیں کہ تم لوگ الائنس بینک سے روپیہ چرا کر بھاگے ہو۔ وہ حضرت پولیس کے انسپکٹر تھے۔ اور ہمیں لوگوں کے سراغ میں کلکتہ سے آئے تھے۔

ہم دونوں نے باہم ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سمجھ لیا کہ اب ایسا موقع آپڑا ہے کہ نام چھپانے سے کام نہ چلے گا۔ میں نے ہمت کرکے انسپکٹر سے کہا۔ "جناب آپ بھولتے ہیں میرا نام دیوندر ناتھ ہے۔ میں یونین تھیٹر کا مالک ہوں۔ اور آپ کا نام ہمیندر ناتھ ہے۔ گھر بھی کلکتہ میں ہے۔ ناحق ہم لوگوں کو دق نہ کیجیے۔"

اس پر ہماری باتوں کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔

میری جیب میں میرے نام کے کارڈ تھے۔ میں نے ایک کارڈ نکال کر کہا۔ "پتہ دیکھیے میرے نام کا کارڈ ہے۔"

سب انسپکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ "اس میں کیا رکھا ہے۔ اس میں تو کوئی خاص بات نہیں جو آپ کو بے خطا ثابت کردے۔ پھر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ نے دیوندرو کے نام کے کارڈ چرا کر نہیں لیے۔ میں یہ سب باتیں نہیں سننا چاہتا۔ آپ لوگ میرے ساتھ آیئے۔ میرے سپاہی باہر کھڑے ہیں۔ آپ کو جو کچھ کہنا سننا ہو وہ تھانہ میں چل کر کہیے۔ چلیے چلیے اٹھیے۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے غصے سے کہا۔ خبردار۔ میرے بدن میں ہاتھ نہ لگانا۔ ورنہ جہنم رسید کردوں گا۔ میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔ میں یونین تھیٹر کا مالک ہوں۔ مجھے معمولی آدمی مت سمجھنا۔ خاک میں ملا دوں گا۔ پھر پیروں پر گر کر ناک رگڑنے پر بھی چٹنی کیے بغیر نہ چھوڑوں گا۔"

پھر بھی وہ اٹل تھا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "ہریندر کا حلیہ بالکل آپ سے ملتا ہے۔ اونچا قد۔ مونچھیں منڈی ہوئی۔ پیشانی اونچی۔ اور بھوَن کے حلیہ میں سر کے بال بڑھے ہوئے عمر پچاس سال۔ جسم نہایت فربہ، جو علامتیں بتلائی گئی ہیں وہ سب آپ کے ساتھی صاحب سے ملتی ہیں۔ فضول کا بکھیڑا نہ کیجیے۔ چپ چاپ میرے ساتھ چلے آیئے۔"

ہیم بابو گرج کر بولے۔ ''نرا گدھا ہے۔ کیوں رے احمق۔ کیا سارے کلکتہ میں بھوون کے سوا اور کوئی موٹا آدمی ہے ہی نہیں؟''

''اجی حضرت یہ کسی اور سے جاکر پوچھیے۔ یہ نہ میں جانتا ہوں اور نہ جاننا چاہتا ہوں۔''

ہیم بابو دانت پیس کر بولے۔ ''میں تمھیں جتائے دیتا ہوں اب بھی سنبھل جاؤ۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ اپنی خیریت چاہتے ہو تو ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کی راہ لو۔ ورنہ میرا مارا پانی بھی نہیں مانگتا۔ بھوون ہی سارے دنیا میں موٹا آدمی ہے؟ یہ کہاں کی منطق ہے؟ بھوون بھی موٹا تھا اور میں بھی موٹا آدمی ہوں۔ بس اس کے یہی معنی ہیں کہ میں بھوون ہوں؟ اس نے مذاق میں ہنس کر کہا۔ ''اور اسی کا کیا ثبوت ہے کہ آپ بھوون نہیں ہیں۔''

اپنی بریت کے ثبوت میں تو آپ کے پاس بس یہی ایک کارڈ ہے نا۔ مگر اس کا گواہ کون ہے کہ آپ میں سے ایک صاحب دیوندرو بابو ہیں؟ جانے دیجیے۔ بہت ہوگیا۔ اب میرے ساتھ چلیے۔ میرے پاس ضائع کرنے کے لیے ذرا بھی وقت نہیں ہے۔ آپ جیسے حضرات کی بدولت مرنے کی بھی فرصت نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اگر میں یہاں کے کسی آدمی سے ثابت کرا دوں کہ میں ہریندر ہوں۔ تب تو پھر ہم لوگوں سے کوئی مطلب نہ رہے گا؟

ہیم بابو نے اتھاہ ندی میں سہارا پاکر پوچھا۔ اسی آدمی کی بات ہے نا جس سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی؟

انسپکٹر صاحب نے کہا۔ ''میں نے اپنی دانست میں تو یہاں کسی آدمی کو نہیں چھوڑا جس سے آپ لوگوں کی نسبت دریافت نہ کیا ہو۔''

میں نے زور دے کر کہا۔ ''مگر یہاں کم سے کم ایک آدمی ایسا ضرور ہے جو مجھ سے واقف ہے۔ اور وہ بھی یہاں کا نیا نہیں پرانا باشندہ ہے۔''

''خیر، اس کا نام بتلایئے۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا نام؟'' بات یہ ہے کہ مجھے اس کا نام یاد نہیں آتا تھا۔ اس وقت محض اس سے گلا چھڑانے کے لیے کہہ دیا تھا کہ آپ کی بات مجھے یاد رہے گی۔

بہت دیر تک سوچنے پر بھی مجھے اس کا نام یاد نہ آیا۔ تو میں نے جواب دیا۔ جناب اس کا نام تو نہیں یاد پڑتا۔

انسپکٹر بولا۔ ”وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ سب حیلہ بازی ہے۔ اچھا تو دیر نہ کیجیے۔ فوراً میرے ساتھ چلیے۔“

میں نے قطع کلام کر کے کہا۔ ”نہیں نہیں اس سے آج ہی میری ملاقات ہوئی ہے۔ نام ہونٹوں ہی پر ہے۔ ذرا ٹھہرو میں بتاتا ہوں۔

ہیم بابو مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔

پولیس انسپکٹر نے کہا۔ ”بہت دیر دیکھ لیا۔ اب نہیں ٹھہر سکتا۔ چلیے چلیے اٹھیے۔ میں نے اپنے حافظے پر انتہا کا زور صرف کیا۔ آخر نام یاد آگیا۔ میں اچھل کر بولا۔ ”لیجیے لیجیے یاد آگیا۔ اس کا نام ہے پران پدیاں۔“

اس نے اپنے پاکٹ میں یہ نام درج کرلیا۔ پھر بولا۔ ”اس سے کہاں ملاقات ہوگی۔؟“

میں نے جواب دیا یہ میں کیوں کر بتا سکتا ہوں؟ اس گاؤں کے کسی آدمی سے جاکر پوچھو۔ اور خوب سمجھ لو۔ میں نے اس گاؤں کے ایک ایسے آدمی کا نام بتا دیا ہے جو مجھے پہچانتا ہے۔ اب بھی اپنی خیریت چاہتے ہو تو اسے بلا کر تحقیق کرلو۔ تمھارے لیے ایک آفت سے نجات پانے کا آخری موقع ہے۔“

انسپکٹر نے کہا۔ ”اچھا تو میں بھی آپ سے کہے دیتا ہوں کہ اگر وہ آدمی ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملا تو آپ کی خیریت نہیں ہے۔“

اس نے جنگل کے پاس جاکر ایک چھوٹی سے سیٹی بجائی۔ اس کے بعد دبی زبان سے کہا ”جاؤ یہاں پران پد نام کا کوئی آدمی ہے۔ اسے بلا لاؤ۔ اور اس سے پوچھنا کہ کیا آج یونین تھیٹر کے مالک دیوندر بابو سے اس کی ملاقات ہوئی تھی؟“

پھر وہ واپس آکر ہم لوگوں کے پاس بیٹھ گیا۔ جو آدمی پران پد کو بلانے گیا تھا ہم لوگ اس کا بڑے اضطراب سے انتظار کر رہے تھے۔ اُف! اتنا وقت کتنی مشکل سے کٹا۔ انسپکٹر بیٹھے بیٹھے اکتا کر باہر چلا گیا۔

ذرا دیر کے بعد ہیم بابو بولے۔ ”سنتے ہیں کچھ؟ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آدمی لوٹ

آیا ہے یہ سینے وہ باتیں کرر ہے ہیں۔"

کچھ منٹ اور گزر گئے۔ انسپکٹر نے "تنہا گھر میں آکر کہا" پران پد بابو سے میرے آدمی کی ملاقات ہوئی۔ اور انھوں نے بھی کہا کہ آج سویرے دیوندر بابو سے وہ ملے تھے۔ لیکن اس سے کیا ہوسکتا ہے؟ آپ دونوں میں سے کون دیوندر بابو ہیں؟ یہ مجھے کیسے معلوم ہو۔ پران پد بابو بیٹھے اپنی لڑکی کو کہانی سنا رہے ہیں۔ اس وقت نہ آسکیں گے۔ اب فضول دیر کیوں کیا جائے۔ "چلیے فوراً تھانے میں۔" عالمِ یاس میں میرے منھ سے فوراً نکلا۔ یا پرماتما" سچ کہنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ مجھے اب چھوٹنے کی کوئی امید نہ تھی۔ آخری سہارا ٹوٹ گیا۔ میں سراسیمہ ہوکر گھر میں ٹہلنے لگا۔ پران پد پر غصہ آتا تھا۔ کمبخت اس حالت میں ہم لوگوں کے لیے یہاں تک آنے کی تکلیف نہیں اٹھا سکتا۔ انسپکٹر سے پوچھا اس بدمعاش نے کیا کہا؟

انسپکٹر بولا۔ میرے آدمی کی زبانی صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ وہ کہتا ہے کہ جب دیوندر بابو کو میرا نام تک یاد ہے۔ اور وہ میرے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کرسکتے تو میں بھی کیوں ان کی بیگار کرنے جاؤں۔"

میں بیٹھ گیا۔ دنیا تاریک نظر آنے لگی۔ بدن میں رعشہ سا ہو رہا تھا۔ کلیجہ سن سن کرتا تھا میری یہ حالت دیکھ کر انسپکٹر کو بھی کچھ ترس آگیا۔ بولا شاید اس کے نام ایک خط لکھنے سے کام نکل جائے۔ آپ لکھنا چاہیں تو میں تھوڑی دیر ٹھہر سکتا ہوں۔"

میں میز پر سے کاغذ قلم اٹھا کر چٹھی لکھنے بیٹھا۔ انسپکٹر نے روک کر کہا۔ "ایسے نہیں، آپ اسے کچھ سکھا دیں تو میں کیا کروں گا۔ میں بولتا ہوں آپ لکھیے۔ یہ بہتر ہوگا۔

میں نے لاچار ہوکر کہا۔ "اچھا آپ ہی بولیے۔ کیا لکھوں۔"

اس نے کہا ہاں لکھیے۔ جناب مکرم بندہ تسلیم۔

"جی ہاں لکھ چکا۔ آگے بولیے آگے۔"

وہ بولنے لگا۔ "میں نے اتنی دیر میں اچھی طرح سمجھ لیا کہ آپ میں ایکٹ کرنے کی بے نظیر قابلیت موجود ہے۔ یہ جان کر آج سے اپنے تھیٹر میں ایک سو روپے ماہوار تنخواہ پر آپ کو ملازم رکھتا ہوں۔ میں جب تک تھیٹر میں رہوں گا آپ کو ملازمت سے

برطرف نہ کروں گا۔"

میں حیرت سے خاموش اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ذرا دیر بعد جب ناطقہ قابو میں ہوا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "جناب آپ کون ہیں؟"

اس نے مسکرا کر کہا "کیوں۔ آپ کا غلام پران پدپان۔ وہ جسے ابھی آپ نے سو روپیہ ماہوار پر نوکر رکھا ہے۔ اب اس پر دستخط کر دیجیے۔"

اب پران پد بابو کی مشاقی پر ذرا بھی شبہ نہ رہا۔ میں نے خوشی سے اس خط پر دستخط کردیے۔ اور بولا بے شک آپ اپنے فن کے استاد ہیں۔"

پران پد مسکرا کر بولا۔ "اچھا تو آداب عرض کرتا ہوں۔ غلام پر نظر عنایت رکھیے گا۔"

اردو ماہنامہ زمانہ ستمبر 1916 میں شائع ہوا۔ اس پر نام درج ہے د۔ر یہ کسی بنگلہ قصہ کا ترجمہ ہے جس کا ہندی ترجمہ مریادا میں شائع ہوا تھا۔ ہندی اور اردو کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔

جگنو کی چمک

شیر پنجاب کی آنکھیں بند ہوچکی تھیں۔ اور اراکینِ سلطنت باہمی نفاق و عناد کے ہاتھوں مرمٹے تھے۔ رنجیت سنگھ کی بنائی ہوئی شاندار مگر کھوکھلی عمارت پامال ہوگئی تھی۔ کنور دلیپ سنگھ انگلستان میں تھے۔ اور رانی چندر کنور چنار کے قلعے میں۔

چندر کنور نے گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی۔ مگر آئینِ سیاست برتنا نہ جانتی تھی۔ اور حسن و عشق کی شیرازہ بندیاں رقابت کی آگ بھڑکانے کے سوا اور کیا کرتیں!

رات بھیگ چکی تھی۔ رانی چندر کنور اپنے مسکن کے بالاخانے پر کھڑی گنگا کی طرف تاکتی تھی کہ لہریں کیوں اس قدر آزاد ہیں۔ انھوں نے کتنے گاؤں اور شہر ڈبائے ہیں، کتنا جان و مال نگل گئی ہیں۔ مگر پھر بھی آزاد ہیں۔ کوئی انھیں بند نہیں کرتا۔ اسی لیے نہ کہ وہ بند نہیں رہ سکتیں۔ وہ گرجیں گی، بل کھائیں گی، اور باندھ کے اوپر چڑھ کر اسے پامال کردیں گی۔ اپنے زور میں اسے بہا لے جائیں گی۔

یہ سوچتے سوچتے رانی مسند پر لیٹ گئی۔ اس کی نظروں کے سامنے عمرِ رفتہ کی یادگاریں ایک دلکش خواب کی طرح آنے لگیں۔ کبھی اس کے تیور کے بل تلوار سے زیادہ قاتل تھے۔ اور اس کا تبسم ہوائے بسنت سے بھی زیادہ جان پرور۔ مگر آہ! اب یہ جنسیں کتنی ارزاں ہیں! روئے تو اپنے کو سنانے کے لیے، ہنسے تو اپنے کو بہلانے کے لیے، اگر بگڑے تو کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ بنے تو کسی کا کیا بنا سکتی ہے۔ رانی اور باندی میں کتنا فرق ہے!

رانی کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے گرنے لگے۔ جو کبھی زہر سے زیادہ قاتل، اورامرت سے زیادہ انمول تھے۔ وہ اسی طرح اکیلی، بے آس، کتنی بار روئی تھی، جب آسمان کے تاروں کے سوا اور کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔

(۲)

اسی طرح روتے روتے چندر کنور کی آنکھیں جھپک گئیں اور اس کا پیارا لختِ جگر کنور دلیپ سنگھ جس میں اس کی جان تھی غرورِ پامال کی صورت بنا ہوا اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ جس طرح گائے دن بھر ہار میں رہنے کے بعد شام کو گھر آتی ہے اور اپنے بچّے کو دیکھتے ہی اس کی طرف مامتا سے مست، تھنوں میں دودھ بھرے، دُم اٹھائے دوڑتی ہے، اسی طرح چندر کنور دونوں ہاتھ پھیلائے اپنے پیارے کنور کو سینہ سے لپٹانے کے لیے دوڑی۔ مگر آنکھیں کھل گئیں اور زندگی کی آرزوؤں کی طرح وہ خواب بھی پریشان ہوگیا۔ اس نے گنگا کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''مجھے بھی اپنے ساتھ لیتی چلو۔''

رانی فوراً بالاخانے سے اُتری۔ کمرے میں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ اس کی روشنی میں ایک میلی ساڑی پہنی، گہنے اتار دیئے۔ جواہرات کا ایک صندوقچہ اور ایک خنجر آبدار کمر میں رکھا اور باہر نکلی۔ ہمت یاس کی تصویر تھی۔ سنتری نے پکارا۔ ''رانی نے جواب دیا۔ میں ہوں جھنگی۔''

کہاں جاتی ہے۔؟

گنگا جل لاؤں گی۔ صراحی ٹوٹ گئی ہے۔ رانی جی پانی مانگ رہی ہیں۔

سنتری ذرا قریب آکر بولا۔ ''چل میں بھی تیرے ساتھ چلتا ہوں۔ ذرا ٹھہر۔''

جھنگی بولی۔ ''نہیں میرے ساتھ مت آؤ۔ رانی کوٹھے پر ہیں دیکھ لیں گی۔''

سنتری کو دھوکا دے کر چندر کنور چور دروازے سے ہوتی ہوئی، اندھیرے میں کانٹوں سے الجھتی، چٹانوں سے ٹکراتی۔ گنگا کے کنارے جا پہنچی۔

آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ گنگا میں کنجِ قناعت کا سا سکون تھا۔ لہریں تاروں کو گوشۂ جگر میں بٹھائے محوِ راز و نیاز تھیں۔ چاروں طرف سنسان تھا۔

رانی ندی کے کنارے کنارے، مڑمڑ کر پیچھے دیکھتی چلی جاتی تھی۔ دفعتاً اسے ایک کشتی کھونٹے سے بندھی ہوئی نظر آئی۔ رانی نے غور سے دیکھا۔ ملاح لیٹا ہوا تھا۔ ملاح کو جگانا موت کو جگانا تھا۔ اس نے فوراً رسی کھول دی اور کشتی پر سوار ہوگئی۔ کشتی آہستہ آہستہ دھار کے سہارے چلنے لگی۔ ایامِ غم کی طرح سست اور تاریک۔ خوابِ حسرت تھا۔ جو موجِ خیال پر بہتا چلا جاتا تھا۔

کشتی میں حرکت ہوئی تو ملاح چونکا، اُٹھ بیٹھا، آنکھیں ملیں، دیکھا تو سامنے تختے پر ایک عورت ہاتھ میں ڈانڑ لیے بیٹھی ہے۔ گھبرا کر بولا۔ "تیں کون ہے رے؟ ناؤ کہاں لیے جات ہے؟ رانی ہنس پڑی۔ انتہائے خوف کو ہمت کہتے ہیں۔ بولی سچ بتا دوں یا جھوٹ؟"

ملاح رانی کے انداز سے کچھ خائف ہو کر بولا۔ "سچ بتاوا جائے۔"

رانی بولی۔ "اچھا تو سن، میں لاہور کی رانی چندر کنور ہوں۔ اسی قلعے میں قید تھی۔ آج بھاگی جاتی ہوں۔ مجھے جلد بنارس پہنچا دے۔ تجھے نہال کردوں گی۔ اور اگر تو کچھ شرارت کرے گا تو دیکھ اس کٹار سے تیرا سر کاٹ دوں گی۔ صبح ہونے سے پہلے ہم کو بنارس پہنچنا چاہیے۔"

یہ دھمکی کارگر ہوگئی۔ ملاح نے ادب سے اپنا کمل بچھا دیا۔ اور تیزی سے ڈانڑ چلانے لگا۔ کنارے کے درخت، اور سر پر جگمگاتے ہوئے مدھم تارے، ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔

(۳)

صبح کو چنار کے قلعے میں ہر شخص حیرت زدہ اور پریشان تھا۔ سنتری اور چوکیدار اور لونڈیاں سب سر جھکائے افسرِ قلعے کے روبرو حاضر تھے۔ تفتیش ہو رہی تھی۔ مگر کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔

ادھر رانی بنارس پہنچی۔ مگر وہاں پہلے ہی سے پولیس اور فوج کا جال بچھا ہوا تھا۔ شہر کے ناکے بند تھے۔ رانی کا سراغ لگانے کے صلے میں ایک بیش قرار انعام کا اعلان کردیا گیا تھا۔ حرص دعوت پاکر بھوکے گدھ کی طرح منڈلا رہی تھی۔

قید سے نکل کر رانی کو معلوم ہوا کہ وہ اور بھی سنگین قید میں ہے۔ قلعے میں ہر شخص اس کے حکم کا فرماں بردار تھا۔ افسرِ قلعے بھی اس کا ادب کرتا تھا۔ لیکن آج آزاد ہوکر اس کے ہونٹ بند تھے۔ در و دیوار دشمن ہو رہے تھے۔ طائرِ بے پر کو کنجِ قفس ہی میں عافیت ہے۔

پولیس کے افسر ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اس بھکارنی کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا جو ایک پھٹی ہوئی ساڑی پہنے، جاتریوں کے پیچھے پیچھے آہستہ

آہستہ سر جھکائے گنگا کی طرف سے چلی آ رہی ہے۔ نہ وہ چونکتی ہے، نہ ہچکتی ہے، نہ گھبراتی ہے، اس بھکارنی کی رگوں میں رانی کا خون ہے۔

یہاں سے بھکارنی نے اجودھیا کی راہ لی۔ دن بھر اوگھٹ راستوں سے چلتی، رات کو کسی سنسان جگہ پر لیٹ رہتی۔ چہرہ زرد، پیروں میں چھالے۔ پھول سا بدن کمھلا گیا تھا۔

وہ اکثر گاؤں میں لاہور کی رانی کے چرچے سنتی۔ کبھی کبھی پولیس کے آدمی بھی اس رانی کی ٹوہ میں سرگرم نظر آتے۔ مگر انھیں دیکھتے ہی بھکارنی کے سینے میں سوئی ہوئی رانی جاگ اٹھتی۔ گردن اٹھا کر انھیں حقارت آمیز نظروں سے دیکھتی۔ اور غصہ و غم سے چہرہ تمتما جاتا۔

ایک دن اجودھیا کے نواح میں پہنچ کر رانی ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی اس لیے کمر سے خنجر نکال کر رکھ دیا تھا اور سوچ رہی تھی کہ کہاں جاؤں؟ میری منزلِ مقصود کیا ہے؟ کیا اس جگت میں میرے لیے اب کہیں ٹھکانا نہیں ہے؟

وہاں سے تھوڑی دور پر ایک آموں کا بڑا باغ تھا۔ اس میں بڑے بڑے شامیانے اور خیمے گڑے ہوئے تھے۔ کئی سنتری زرق برق وردیاں پہنے ٹہل رہے تھے۔ کئی گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ رانی نے اس شاہانہ کروفر کو حسرت سے دیکھا۔ ایک بار وہ بھی کشمیر گئی تھی۔ اس کا پڑاؤ اس سے کہیں شاندار تھا۔

بیٹھے بیٹھے شام ہوگئی۔ رانی نے وہیں رات کاٹنے کی ٹھانی۔ اتنے میں ایک بوڑھا سپاہی ٹہلتا ہوا آیا اور اس کے قریب ٹھہر گیا۔ اینٹھی ہوئی داڑھی تھی۔ چست چپکن کمر میں تلوار لٹک رہی تھی۔ رانی نے اسے دیکھتے ہی فوراً خنجر اٹھا کر کمر میں کھونس لیا۔ سپاہی نے اسے تیز نگاہ سے دیکھ کر پوچھا۔ "بیٹی کہاں سے آتی ہو؟"

رانی نے کہا۔ "بہت دور سے۔"

کہاں جاؤ گی؟

کچھ معلوم نہیں۔ بڑی دور۔

سپاہی نے پھر رانی کی طرف غور سے دیکھا اور بولا۔ ذرا اپنی کٹار مجھے دکھا دو، رانی خنجر سنبھال کر کھڑی ہوگئی۔ اور تند لہجے میں بولی۔ "دوست ہو یا دشمن" ٹھاکر نے کہا۔ "دوست"۔

سپاہی کے اندازِ کلام اور چہرے میں کوئی ایسی بات تھی جو یقین کو مجبور کرتی تھی۔
رانی بولی "دغا نہ کرنا۔ یہ دیکھو۔"

ٹھاکر نے تلوار ہاتھ میں لی۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اور بڑے ادب کے ساتھ اسے آنکھوں سے لگایا۔ تب رانی کے آگے تعظیم سے سر جھکا کر بولا۔ "مہا رانی چندر کنور۔"

رانی نے پر حسرت آواز سے کہا۔ نہیں بے کس بھکارنی، تم کون ہو؟

سپاہی نے جواب دیا۔ "آپ کا ایک سیوک"

رانی نے اس کی طرف پُرسوال انداز سے دیکھا اور بولی۔ بے کسی کے سوا میرا اس سنسار میں کوئی نہیں ہے۔"

سپاہی نے کہا مہا رانی جی ایسا نہ کہیے۔ شیرِ پنجاب کی مہا رانی کی آواز پر اب بھی گردنیں جھک سکتی ہیں۔ دیس میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے تمھارا نمک کھایا ہے اور اسے بھولے نہیں ہیں۔"

رانی اب یہ ارمان نہیں۔ صرف ایک گوشۂ عافیت چاہتی ہوں۔ ایسے ٹھونٹھ کی تلاش ہے جہاں تنکوں کا گھونسلہ بنا سکوں۔

سپاہی! ایسا گوشہ پہاڑوں ہی میں مل سکتا ہے ہمالیہ کی گود میں چلیے وہی آپ آندھی اور طوفان سے بچ سکتی ہیں۔

رانی نے تعجب سے کہا۔ "دشمنوں میں جاؤں؟ نیپال کا دربار کب ہمارا دوست رہا۔"

سپاہی بولا۔ "رانا جنگ بہادر قول کا پکا راجپوت ہے۔"

رانی "مگر یہی جنگ بہادر تو ہیں جو ابھی حال میں ہمارے خلاف لارڈ ڈلہوزی کو مدد دینے پر آمادہ تھے۔"

سپاہی خجالت آمیز انداز سے بولا۔ "تب آپ مہا رانی چندر کنور تھیں۔ آج آپ بھکارنی ہیں۔ اقبال کے حاسد اور دشمن سب جگہ ہوتے ہیں۔ جلتی ہوئی آگ کو پانی سے بجھاتے ہیں۔ راکھ ماتھے پر چڑھائی جاتی ہے۔ آپ ذرا بھی پس و پیش نہ کریں۔ نیپال میں اب بھی دھرم باقی ہے۔ آپ بے خوف چلیں۔ دیکھیے کہ آپ کو وہ کس طرح سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔

رانی نے رات اسی درخت کے سایے میں کاٹی۔ سپاہی بھی وہیں سویا۔ صبح کو وہاں دو تیز گام گھوڑے نظر آئے۔ ایک پر سپاہی سوار تھا۔ دوسرے پر ایک نہایت خوش رو

نوجوان۔ یہ رانی چندر کنور تھی۔ وہ جائے پناہ کی تلاش میں نیپال جاتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد رانی نے پوچھا۔ "یہ پڑاؤ کس کا ہے؟"

سپاہی نے جواب دیا۔ "اسی رانا جنگ بہادر کا۔ تیرتھ جاترا کرنے آئے ہوئے ہیں۔ مگر ہم سے پہلے پہنچ جائیں گے۔"

رانی "تم نے ان سے یہیں کیوں نہ ملا دیا؟ ان کا عندیہ معلوم ہو جاتا۔"

سپاہی یہاں ان سے ملنا غیر ممکن تھا۔ آپ مخبروں کی نگاہ سے نہ بچ سکتیں۔

(۴)

اس زمانے میں سفر کرنا جان جوکھم تھا۔ دونوں مسافروں کو بارہا ڈاکوؤں سے سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت رانی کے جیوٹ، اور ہاتھ کی تیزی اور صفائی دیکھ کر بوڑھا سپاہی دانتوں تلے انگلی دباتا تھا۔ کبھی ان کی تلوار کام کر جاتی۔ اور کبھی گھوڑوں کی رفتار تیز۔

لمبا سفر تھا۔ جیٹھ کا مہینہ راستے ہی میں ختم ہو گیا۔ برسات آئی۔ آسمان پر بادل منڈلائے۔ سوکھی ندیاں ابل پڑیں۔ پہاڑی نالے گرجنے لگے۔ نہ ندیوں میں کشتی۔ نہ نالوں پر گھاٹ۔ مگر گھوڑے سدھے ہوئے تھے۔ خود بخود پانی میں اتر جاتے۔ اور ڈوبتے، اتراتے، بہتے، بھنور کھاتے، پار جا پہنچتے۔ ایک بار بچھو نے کچھوے کے پیٹھ پر ندی کا سفر کیا تھا۔ یہ سفر اس سے کم خطرناک نہ تھا۔

کہیں بلند قامت ساکھو اور مہوے کے جنگل تھے۔ کہیں خوش اندام جامن کے بن۔ ان کی گود میں ہاتھیوں اور ہرنوں کے غول کلیلیں کر رہے تھے۔

دھان کی کیاریاں پانی سے لبریز تھیں۔ کسانوں کی عورتیں دھان بٹھاتی تھیں اور سہانے گیت گاتی تھیں۔ کبھی ان سہانی آوازوں کے بیچ میں کھیت کے مینڈ پر چھتری کے سایہ میں بیٹھے ہوئے زمیندار کی کرخت اور تحکمانہ آواز بھی سنائی دیتی تھی۔

اس طرح سفر کی تکلیفیں جھیلتے، ترائی کو طے کر کے دونوں مسافر نیپال کی سرزمین میں داخل ہو گئے۔

(۵)

صبح کا وقت تھا۔ نیپال کے مہاراج سریندر بکرم سنگھ کا دربار سجا ہوا تھا۔ اراکین دربار پایہ بہ پایہ بیٹھے ہوئے تھے۔ نیپال نے ایک طولانی جنگ کے بعد تبت پر فتح پائی

تھی۔ اور اس وقت شرائطِ صلح پر بحث ہو رہی تھی۔ کوئی تاوان جنگ کا خواستگار تھا۔ کوئی الحاق کا حامی بعض اصحاب سالانہ خراج پر زور دے رہے تھے۔ صرف رانا جنگ بہادر کے آنے کی دیر تھی۔ وہ کئی ماہ کی سیر و سیاحت کے بعد آج ہی رات کو مکان پر پہنچے تھے۔ اور یہ اہم مسئلہ جو انھیں کی واپسی کا منتظر تھا۔ اب مجلسِ وزرا میں پیش کیا گیا تھا۔ تبت کے سفیر امید وبیم کی حالت میں وزیراعظم کی زبان سے قطعی فیصلہ سننے کا انتظار کر رہے تھے۔

آخر چوبدار نے رانا کے آنے کی اطلاع دی۔ اہلِ دربار تعظیماً کھڑے ہوگئے۔ رانا کو آداب بجالا کر اپنے نقرئی سنگھاسن پر رونق افروز ہوئے۔ مہا راج نے فرمایا۔ "آپ صلح کے لیے کیا شرائط تجویز کرتے ہیں؟"

رانا نے ادب سے سر جھکا کر کہا۔ میری ناچیز رائے میں اس وقت سخت گیری بالکل بے محل ہے۔ غم نصیب دشمن کے ساتھ فیاضی سے برتاؤ کرنا ہمیشہ ہمارا شعار رہا ہے۔ کیا اس موقع پر خودغرضی کے نشے میں ہم اپنے اس زریں اصول کو بھول جائیں گے؟ ہم ایسی صلح چاہتے ہیں۔ جو اصلی معنوں میں صلح ہو۔ جو ہمارے دوستانہ تعلقات کی ضامن ہو۔ اور ہمارے دلوں کو ملائے۔ اگر دربارِ تبت ہمیں تجارتی رعایتیں پیش کرنے پر آمادہ ہو تو ہم کو صلح کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔"

وزراء میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ عام رائے اس فیاضی کے موافق نہ تھی۔ مگر مہاراج نے اس کی تائید کی۔ اس لیے کسی کو رانا کی مخالفت میں زبان کھولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

سفیروں کے رخصت ہوجانے کے بعد راناجنگ بہادر نے کھڑے ہوکر کہا۔ "حاضرینِ دربار! آج نیپال کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہونے والا ہے یہ یادگار نیک ہوگی یا بد اس کا اختیار آپ کو ہے۔ آج مجھے دربار میں آتے وقت یہ شقہ ملا ہے جسے میں آپ صاحبوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اپنے مفہوم کے لحاظ سے یہ ایک نہایت بلیغ درخواست ہے۔ سائل نے تلسی داس کی صرف یہ چوپائی لکھ دی ہے۔

"آپت کال پرکھیے۔ چاری دھیرج، دھرم، متر، اور ناری"

مہاراج نے پوچھا۔ یہ خط کس نے بھیجا ہے؟

ایک بھکارنی نے۔

بھکارنی کون ہے؟

مہا رانانی چندر کنور۔

کڑبڑ کھتری نے حیرت سے پوچھا "جو ہمارے دوست انگریزی سرکار سے باغی ہوکر بھاگ گئی ہیں؟" رانا جنگ بہادر نے شرمندہ ہوکر کہا "جی ہاں۔ حالانکہ اسی خیال کو دوسرے طریق پر ظاہر کرسکتے ہیں۔"

کڑبڑکھتری۔ "انگریزوں سے ہماری دوستی ہے۔ اور دوست کے دشمن کی مدد کرنا آئین کے خلاف ہے۔"

جنرل شمشیر بہادر۔ ایسی حالت میں بہت اندیشہ ہے کہ انگریزی سرکار سے ہمارے تعلقات کمزور ہوجائیں۔"

راج کمار رنبیر سنگھ۔ "یہ مانتے ہیں کہ مہمان نوازی ہمارا فرض ہے۔ مگر اسی حد تک کہ ہمارے دوستوں کو ہماری جانب سے بدگمان ہونے کا موقع نہ ملے۔"

اس مسئلے پر یہاں تک اختلاف ہوا کہ ایک ہنگامہ سا برپا ہوگیا۔ اور کئی اراکین یہ کہتے ہوئے سنائی دیے کہ مہارانی صاحبہ کا اس وقت آنا ملک کے لیے فالِ بد ہے۔

تب رانا جنگ بہادر اٹھے۔ ان کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ وہ مخالفت کے متحمل نہ ہوئے تھے۔ اس وقت بھی مصلحت غصّے پر حاوی ہونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ بولے "بھائیو! اگر اس وقت میری باتیں آپ لوگوں کو ضرورت سے زیادہ سخت معلوم ہوں تو مجھے معاف کیجیے گا۔ کیونکہ مجھے اب زیادہ سننے کی تاب نہیں ہے۔ اپنی قومی بے ہمتی کا یہ دل شکن نظارہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اگر نیپال کے دربار میں اتنی بھی اخلاقی ہمت نہیں کہ وہ مہمان نوازی اور حمایت کے آئین کو نبھا سکے تو میں اس واقعہ کے متعلق ساری ذمہ داریوں کا بار اپنے سر لیتا ہوں۔ دربار اپنے تئیں بالکل سبک دوش سمجھے۔ اور اس کا عام اعلان کردے۔"

کڑبڑکھتری گرم ہوکر بولے۔ "محض یہ اعلان ملک کو خطروں سے نہیں بچا سکتا۔"

رانا جنگ بہادر نے غصّے سے ہونٹ چبا لیا۔ مگر ضبط کر کے بولے۔ ملک داری خطروں اور ذمّے داریوں کا نام ہے۔ ہم ذمّے داریوں سے آنکھیں نہیں چرا سکتے اپنے

سایۂ حمایت میں آنے والوں کی دستگیری، راجپوتوں کا دھرم تھا۔ ہمارے بزرگ جن کے نام لیوا ہم لوگ ہیں، ہمیشہ اصول پر، دھرم پر، آن پر، جان دیتے تھے۔ اپنے مانے ہوئے دھرم کو توڑنا ایک خوددار قوم کے لیے شرمناک ہے۔ انگریز ہمارے دوست ہیں۔ اور ہزار شکر ہے کہ دانا دوست ہیں۔ مہا رانی چندر کنور کو زیرنگاہ رکھنے میں ان کا مدعا صرف یہ تھا کہ فتنہ و شر کو اجتماع کا کوئی مرکز باقی نہ رہے۔ اگر ان کا یہ مدعا فوت نہ ہوتو انھیں ہم سے بدگمان ہونے کا نہ کوئی موقع ہے اور نہ ان سے شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت۔

کڑبڑکھتری۔ مہارانی چندرکنور یہاں کس غرض سے آئی ہیں؟

جنگ بہادر۔ صرف ایک گوشۂ عافیت کی تلاش میں جہاں انھیں اپنی مجبوریوں کا خیال سوہانِ روح نہ ہوں۔ وہ صاحبِ اقبال رانی، جو رنگ محلوں میں عیش کرتی تھی، جسے پھولوں کے سیج پر بھی آرام نہ ملتا تھا، آج سینکڑوں کوس سے، طرح طرح کی مصیبتیں اٹھاتی، ندی نالے، اور کوہ و بیابان طے کرتی یہاں صرف ایک گوشۂ عافیت کی تلاش میں آئی ہے۔ امڈی ہوئی ندیاں، اور اُبلتے ہوئے نالے۔ برسات کا موسم، ان تکلیفوں کو آپ لوگ جانتے ہیں۔ اور یہ سب اسی ایک کنجِ عافیت کی خاطر، اسی ایک گوشۂ زمین کی تمنا میں! مگر ہم ایسے تنگ ظرف ہیں کہ یہ تمنا بھی پوری نہیں کرسکتے! حمیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم گوشۂ زمین کے بجائے اپنے گوشۂ جگر پیش کرتے۔ سوچیے کتنے فخر کی بات ہے کہ ایک ستم نصیب رانی اپنے مصیبت کے دنوں میں جس ملک کو یاد کرتی ہے وہ یہی پاک ملک ہے۔ مہا رانی چندرکنور کو ہماری عالی ظرفی پر، اور ہماری بیکس نوازی پر پورا بھروسہ تھا، اور وہی حسنِ عقیدت انھیں یہاں تک لایا ہے۔ اسی امید پرکہ پشوپتی ناتھ کے سایۂ حمایت میں انھیں کد و کاوش سے نجات ملے گی، وہ یہاں تک آتی ہیں۔ آپ کو اختیار ہے چاہے ان کی یہ امید پوری کریں یا اسے خاک میں ملادیں۔ چاہے آئینِ حمایت کو نبھا کر صفحۂ تاریخ میں اپنا نام نیک چھوڑ جائیں۔ یا قومی اور اخلاقی پابندیوں کو مٹا کر اپنے تیئں اپنی ہی نگاہوں میں گرالیں۔ کیونکہ مجھے یقین نہیں ہے کہ ایک فرد بھی ایسا بے حمیت ہے جو اس موقع پر آئینِ دستگیری کو فراموش کر کے اپنا سر اونچا کرسکے۔ اب میں آپ کے فیصلے کا منتظر ہوں۔ آپ اپنے قوم اور ملک کا نام روشن کریں گے؟ یا ہمیشہ کے لیے اپنے ماتھے پر بدنامی کا داغ لگا لیں گے؟"

راج کمار نے جوش سے کہا۔ "ہم مہا رانی کی قدموں تلے آنکھیں بچھائیں گے۔"
کپتان بکرم سنگھ بولے۔ "ہم راجپوت ہیں اور اپنے دھرم کو نبھائیں گے۔"
جنرل رنبیر سنگھ نے فرمایا۔ "ہم ان کا وہ شاندار استقبال کریں گے کہ دنیا عش عش کرے گی۔"
رانا جنگ بہادر نے کہا۔ میں اپنے معزز دوست کڑبڑکھتری کی زبان سے ان کا فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔"
کڑبڑکھتری ایک با اثر آدمی تھے اور مجلسِ وزراء میں وہ رانا جنگ بہادر کی مخالف جماعت کے سرغنہ سمجھے جاتے تھے۔ ندامت آمیز لہجے میں بولے۔ "اگرچہ میں مہا رانی کی تشریف آوری کو خطروں سے خالی نہیں سمجھتا مگر اس موقع پر ہمارا دھرم یہی ہے کہ ہم مہا رانی صاحبہ کو سر اور آنکھوں پر بٹھائیں۔ دھرم سے منھ موڑنا کسی قوم کے لیے فخر کا باعث نہیں ہوسکتا۔"
کئی آوازوں نے پُر جوش لہجے میں اس خیال کی تائید کی۔
مہا راجا سریندر بکرم سنگھ نے اس مباحثے کو غور سے سنا۔ اور تب زبانِ مبارک سے فرمایا۔
"دھرم بیرو! میں تمھیں اس مردانہ فیصلے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ تم نے قوم کا نام رکھ لیا۔ پشوپتی اس کارِ خیر میں تمھاری مدد کریں۔!"
مجلسِ وزراء برخاست ہوئی۔ اور قلعے سے سلامی دغنے لگی۔ سارے شہر میں خبر گونج اٹھی کہ پنجاب کی مہا رانی چندرکنور تشریف لائی ہیں۔ جنرل رنبیر سنگھ اور جنرل شمشیر بہادر پانچ ہزار فوج کے ساتھ مہا رانی کے استقبال کو روانہ ہوئے۔ مہمان خانے کی آرائش ہونے لگی۔ بازاریں بیرقوں اور نبدن واروں سے سج گئیں۔
اقبال کی خاطر و تعظیم ہر جگہ ہوتی ہے۔ مگر کسی نے بھکارنی کی ایسی تعظیم دیکھی ہے! فوجیں بینڈ بجاتی، اور پتاکے لہراتی ہوئی، ایک اُمڈی ندی کی طرح موج بہ موج چلی جاتی تھیں۔ سارے شہر میں مسرّت کا ہنگامہ تھا۔ دونوں طرف خوش لباس تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ فوج کے سردار آگے آگے گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور سب کے آگے رانا جنگ بہادر، قومی آن اور غرور کے نشے میں مخمور اپنے زرنگار ہودے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ بے کس

نوازی کا ایک پاک نظارہ تھا!

دھرم شالے کے دروازے پر یہ جلوس رکا۔ رانا ہاتھی سے اترے۔ مہارانی چندر کنور کمرے سے باہر نکل آئیں۔ رانا نے جھک کر مجرا عرض کیا۔ رانی حیرت سے ان کی طرف تاکنے لگی۔ یہ وہی ان کا رفیق، ان کا بوڑھا سپاہی تھا۔ آنکھیں لبریز ہوگئیں۔ اور مسکرائی۔ کھلے ہوئے پھول پر سے شبنم کے قطرے ٹپکے۔ بولی "میرے بوڑھے ٹھاکر، میری ناؤ پار لگانے والے! کس منہ سے تمھارا جس گاؤں۔"

رانا نے سر جھکا کر کہا۔ "آپ کے قدم سے ہمارے نصیب روشن ہوگئے۔"

دربار نیپال نے پچیس ہزار روپے سے مہا رانی کے لیے ایک شاندار محل دیا۔ اور ان کے لیے دس ہزار روپے ماہوار وثیقہ مقرر کیا۔

وہ عمارت آج تک قائم ہے۔ اور نیپال کی عالی ظرفی اور وفا کیشی کی یاد گار ہے پنجاب کی رانی کو لوگ آج تک یاد کرتے ہیں۔

یہی زینہ ہے جس سے قومیں نیک نامی کے سنہرے مینار تک پہنچتی ہیں۔

یہی واقعے ہیں جن سے قومی کارنامے روشن اور امر ہوجاتے ہیں۔

پولیٹکل رزیڈنٹ نے اپنے گورنمنٹ کو رپورٹ کی۔ گمان تھا کہ گورنمنٹ انڈیا اور نیپال کے درمیان کچھ کشیدگی پیدا ہوجائے۔ مگر گورنمنٹ کو رانا جنگ بہادر پر کامل اعتماد تھا۔ اور جب دربار نیپال نے یقین اور اطمینان دلا دیا کہ مہارانی چندر کنور کو کسی مخالفانہ کوشش کا موقع نہ دیا جائے گا تو گورنمنٹ انڈیا کو بھی اطمینان ہوگیا۔ کوئی شک نہیں کہ یہ واقعہ ہندوستانی تاریخ کی اندھیری رات میں جگنو کی چمک کی شان رکھتا ہے۔

اردو ماہنامہ زمانہ اکتوبر 1916میں شائع ہوا۔ اردو مجموعے پریم بتیسی میں شامل ہے، ہندی میں اسی عنوان سے مان سرودر6 میں درج ہے۔

دھوکا

ستی کنڈ میں کھلے ہوئے کنول بسنت کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ صبح کی سکون بخش سنہری کرنیں ان سے گلے مل مل کر مسکراتی تھیں۔ حسن کے پھول وفا کے سنہرے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

راج کماری پربھا کنڈ کے کنارے ہری ہری گھاس پر کھڑی خوش نوا چڑیوں کے نغمے سن رہی تھی۔ اس کا کندنی رنگ انھیں پھولوں کی طرح دمک رہا تھا۔ صباحت کی ایک تصویر تھی جو آفتاب کی زریں شعاعوں سے بنائی گئی تھی۔

پربھا نے مولسری کے درخت پر بیٹھی ہوئی ایک شیاما کی طرف دیکھ کر کہا میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی ایسی ہی چڑیا ہوتی۔

اس کی سہیلی امبا نے مسکرا کر پوچھا "یہ کیوں؟"

پربھا نے کنڈ کی طرف تاکتے ہوئے جواب دیا۔ "پیڑ کی ہری بھری ڈالیوں پر بیٹھی ہوئی چہچہاتی۔ میری شیریں نوائیوں سے سارا باغ گونج اٹھتا۔"

امبا نے چھیڑ کر کہا۔ "نوگڑھ کی رانی ایسی کتنی ہی چڑیوں کا گانا جب چاہے سن سکتی ہے۔"

پربھا شرم سے سر جھکا کر بولی۔ "مجھے نوگڑھ کی رانی بننے کی آرزو نہیں ہے۔ میرے لیے کسی ندی کا سنسان کنارہ چاہیے۔ ایک بین، اور ایسے ہی خوش نوا پرندوں کی صحبت۔ نغمۂ شیریں میں میرے لیے ساری دنیا کی نعمتیں بھری ہوئی ہیں۔"

پربھا نے شاعرانہ مزاج پایا تھا۔ اور اکثر ایسے سپنے دیکھا کرتی تھی۔ امبا کچھ جواب دینا چاہتی تھی کہ اتنے میں باہر سے کسی کے گانے کی آواز آئی۔

کرگئے تھوڑے دن کی پریت

پربھا نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔ اور بے قرار ہو کر بولی۔ "بہن اس آواز میں

جادو ہے۔ مجھ سے اب بغیر سنے نہیں رہا جاتا۔ اسے اندر بلا لاؤ۔"

امبا پر بھی نغمے کا جادو اثر کر رہا تھا۔ بولی۔ بے شک ایسا راگ میں نے آج تک نہیں سنا۔ کھڑکی کھول کر بلا لاتی ہوں۔

تھوڑی دیر میں راگیا اندر داخل ہوا شکیل، خوش قامت نوجوان تھا۔ برہنہ پا، برہنہ سر، کندھے پر ایک مرگ چھالا تھا۔ بندن پر گیروے رنگ کی کفنی، اور ہاتھوں میں ایک ستار، چہرے سے نور برس رہا تھا۔ اس نے دبی ہوئی نگاہوں سے دونوں حسینوں کو دیکھا اور تب سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

پربھا نے بھی جھجھکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اور نگاہیں نیچی ہو گئیں۔

امبا نے کہا۔ "جوگی جی! ہمارے بڑے بھاگ تھے کہ آپ کے درشن ہوئے ہم کو بھی کوئی پد سُنا کر تارتھ کیجیے۔" جو گی نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "ہم جوگی لوگ نراین کا بھجن کرتے ہیں۔ ایسے ایسے درباروں میں ہم کیا گا سکتے ہیں۔ پر آپ کی مرجی ہے تو سنیے۔"

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

کہاں وہ پریت، کہاں یہ بچھرن، کہاں مدھوبن کی ریت کر گئے تھوڑے دن کی پریت جوگی کی رسیلی اور پُر درد آواز، ستار کی زمزمہ سنجیاں، اس پر نغمے کی لطافت پربھا کو بے خود کیے دیتی تھیں۔ اس نے بڑی دور رس طبیعت پائی تھی، اور اس کا ذوقِ نغمہ نہایت لطیف تھا۔ جس طرح ستار کے زمزمے ہوا میں گونج رہے تھے اسی طرح پربھا کے دل میں شیریں تصورات کی ترنگیں اٹھ رہی تھیں وہ جذبات جو اب تک ہیولیٰ میں تھے جاگ پڑے۔ دل سرزمینِ خواب میں جا پہنچا۔ ستی کنڈ کے کنول طلسم کی پریاں بن بن کر منڈلاتے ہوئے بھونروں سے دست بستہ اور باچشم پُرآب کہتی تھیں۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

سرخ اور سبز پتیوں سے لدی ڈالیاں، حجاب سے سر جھکائے چہکتی ہوئی چڑیوں سے رو رو کہتی تھیں۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

اور راج کماری پربھا کا دل بھی ستار کی مستانہ اداؤں کے ساتھ گونجتا تھا۔

کر گئے تھوڑے دن کی پریت

(۲)

پربھا بھوکی کے راؤ دیوی چند کی اکلوتی بیٹی تھی۔ راؤ صاحب پرانے وقتوں کے رئیس تھے کرشن کی اپاسنا میں غرق رہتے جس کا ایک خاص جزو سماع ہے۔ اس لیے ان کے دربار میں دور دور سے کلاونت اور گویے آیا کرتے اور انعام و اکرام پاتے۔ راؤ صاحب کو نغمے کا عشق تھا۔ خود بھی اس فن کے استادِ کامل تھے۔ اگرچہ اب پیرانہ سالی کے باعث کاوش کی طاقت باقی نہ تھی۔ پر اس فن کے رموز و نکات کے ماہر تھے۔ پربھا بچپنے ہی سے ان صحبتوں میں بیٹھنے لگی۔ اور کچھ طبعی مناسبت اور کچھ شب و روز کے چرچوں کے طفیل اسے بھی اس فن میں درخور ہوگیا تھا۔ اس وقت اس کے حسن کا شہرہ تھا۔ راؤ صاحب نے نوگڑھ کے جوان بخت اور نیک نہاد راجا ہری چند سے اس کی شادی تجویز کی تھی۔ طرفین سے تیاریاں ہورہی تھیں۔ راجا ہری چند میو کالج اجمیر کے متعلم تھے۔ اور نئی تہذیب کے دلدادہ۔ ان کی استدعا تھی کہ انھیں ایک بار راج کماری پربھا سے بالمشافہ ہم کلام ہونے کا موقع دیا جائے۔ پر راؤ صاحب اس گناہِ عظیم کے مرتکب نہ ہوسکتے تھے۔

پربھا راجا ہری چند کے نئے خیالات کے چرچے سن سن کر دلاً اس تعلق سے بہت مطمئن نہ تھی۔ پر جس وقت سے اس نے اس باکمال اور نوجوان جوگی کا گانا سنا تھا، اس وقت سے وہ اسی کے دھیان میں ڈوبی رہتی، امبا اس کی سہیلی تھی۔ ان کے درمیان کوئی پردہ نہ تھا۔ پر اس راز کو پربھا نے اس سے بھی پوشیدہ رکھا۔

امبا اس کی مزاج شناس تھی۔ معاً تاڑ گئی۔ پر اس نے پندونصیحت کر کے اس آگ کو بھڑکانا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے خیال کیا کہ کسمپرسی کی حالت میں یہ وہم چند دنوں میں کافور ہوجائے گا۔ جیسا کہ اکثر سودائے خام کا انجام ہوتا ہے۔ مگر اس کا قیاس غلط ثابت ہوا۔ جوگی کی صورت کبھی پربھا کی آنکھوں سے نہ اترتی۔ اس کا مدھرراگ ہر دم اس کے کانوں میں گونجا کرتا۔ اسی کنڈ کے کنارے وہ از خود رفتگی کے عالم میں سارے دن بیٹھی رہتی، اور عالمِ خیال میں وہی مدھر دلکش راگ سنتی اور وہی نوارنی صورت دیکھتی۔ کبھی کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا کہ باہر سے وہ آواز آرہی ہے۔ وہ چونک پڑتی اور وحشت کے عالم میں باغ کی چار دیواری تک جاتی۔ وہاں سے مایوس ہوکر لوٹ آتی اور اپنے تئیں سمجھاتی، یہ میری کیا حالت ہے؟ مجھے کیا ہوگیا ہے! میں ہندو لڑکی ہوں، ماں باپ جسے

سونپ دیں اس کی لونڈی بن کر رہنا میرا دھرم ہے۔ مجھے دل وجان سے اس کی خدمت کرنی چاہیے، کسی دوسرے کا خیال بھی دل میں لانا میرے لیے پاپ ہے۔ آہ! دل میں پریم کا خیال رکھ کر میں کس منھ سے اپنے شوہر کے پاس جاؤں گی۔ ان کانوں سے کیونکر وہ محبت کی باتیں سنوں گی۔ جو میرے لیے طعنے سے بھی زیادہ تلخ ہوں گی! ان آنکھوں سے کیسے وہ محبت کی کاہن دیکھوں گی جو نگاہِ قہر سے بھی زیادہ دلسوز ہوں گی! اس گردن میں وہ محبت کے ہاتھ پڑیں گے وہ زنجیر سے بھی زیادہ گراں بار ہوں گے! پیارے! تم میرے دل سے نکل جاؤ۔ یہ جگہ تمھارے لیے نہیں۔ میرا بس ہوتا تو تمھیں دل کے تیج پر سلاتی، مگر میں دھرم کی رسیوں میں بندھی ہوئی ہوں۔

اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ بیاہ کے دن نزدیک آتے جاتے تھے۔ اور پربھا کا کنول سا چہرہ مرجھایا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ان حسرتناک خیال سے بے چین ہوکر اس کا جی چاہتا تھا کہ کنڈ کی گود میں پناہ لوں۔ لیکن راؤ صاحب پر اس صدمۂ جانکاہ کے اثر کا خیال کرکے رک جاتی۔ اور سوچتی میں ان کا سرمایۂ زندگانی ہوں۔ مجھ بدنصیب کو انھوں نے کس ناز و نعمت سے پالا ہے۔ میں ہی ان کی زندگی کا سہارا اور ان کی آخرت کی امید ہوں۔ نہیں یوں جان دے کر میں ان کی آرزوؤں کا خون نہ کروں گی۔ میرے دل پر جو چاہے گزرے انھیں نہ کڑھاؤں گی۔

بہ ظاہر پربھا کا ایک گویّے جوگی کے پیچھے دیوانہ ہوجانا سبک سری معلوم ہوتی ہے۔ اس کے نغمے تان سین کی تانوں سے بھی زیادہ دل ربا کیوں نہ ہوں، پر ایک راج کماری کے لیے اس کے ہاتھوں بک جانا حد درجے کی کمزوری کہی جاسکتی ہے۔ لیکن راؤ صاحب کے دربار میں علم کا، شجاعت کا، مردانہ جان نثاریوں کا، کوئی چرچا نہ تھا، جن سے حسن کی کلیاں کھلتی ہیں۔ وہاں تو شب و روز زمزمہ سنجیوں کے دور رہتے تھے۔ اس کے ماہر اعزاز کی مسند پر جلوہ افروز ہوتے تھے۔ اور انھیں پر تحسین کے بہترین جواہر لٹائے جاتے تھے۔ وہاں گانا ہی کمال کا معیار تھا۔ پربھا نے اوائل سے یہی صحبتیں دیکھی تھیں اور اس پر ان کا گاڑھا رنگ چڑھ گیا تھا۔ ایسی حالت میں اس کی طبیعت نے جو روش اختیار کی اس پر تعجب کا کوئی مقام نہیں۔

(۳)

شادی بڑی دھوم سے ہوئی۔ راؤ صاحب نے پربھا کو گلے سے لگا لیا اور رو روکر رخصت کیا۔ پربھا بھی بہت روئی۔ امبا کو تو وہ کسی طرح چھوڑتی ہی نہ تھی۔

نوگڑھ بڑی ریاست تھی۔ اور راجا ہری چند کی خوش انتظامی کے باعث رونق پر تھی۔ پربھا کی خدمت کے لیے لونڈیوں کی ایک فوج تھی۔ اس کے لیے آنند بھون سجایا گیا تھا۔ جسے قدرت نے فضا دی تھی اور صنعت نے فرحت۔ مشاطہ نے دولہن کو خوب سنوارا۔ راجہ صاحب شوقِ دیدار سے بے چین تھے۔ اندر گئے۔ پربھا نے ہاتھ جوڑے ہوئے سر جھکا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ مگر آنکھوں سے آنسو کی ندی بہہ رہی تھی۔ دولھا نے عاشقانہ جوش سے گھونگھٹ ہٹا دیا۔ حسن کا باغ تھا پر بے نور۔

دوسرے دن سے راجا صاحب کی یہ کیفیت ہوئی کہ بھونرے کی طرح ہر دم اس پھول پر منڈلایا کرتے۔ نہ امور کی فکر تھی، نہ سیر و شکار کی پروا۔ پربھا کی باتیں نغمہ تھیں، اس کی نگاہیں ساغر اور اس کے دیدار میں سیرِ کہسار کی دلآویزی تھی۔ محبت کے نشے میں بیخود ہوئے جاتے تھے۔ وہ کیا جانتے تھے کہ دودھ میں مکھی ہے!

یہ غیر ممکن تھا کہ راجا صاحب کی ان دلجوئیوں اور ناز برداریوں کا پربھا پر کوئی اثر نہ ہوتا اور ان سے اظہارِ ثروت مقصود نہ تھا۔ اس میں سچا انوراگ بھرا ہوا تھا۔ جو ہم سے محبت کرتا ہے اس سے ہم نفرت نہیں کرسکتے۔ پربھا دل میں نادم ہوتی۔ وہ اپنے کو ایسی کامل، خالص، محبت کے قابل نہ پاتی تھی۔ اس خلوص کے عوض میں اسے اپنے مصنوعی رنگے ہوئے جذبات ظاہر کرتے ہوئے روحانی صدمہ ہوتا تھا۔ جب تک کہ راجا صاحب اس کے ساتھ رہتے وہ انھیں اپنی شیریں ادائیوں میں مخمور رکھتی۔ وہ ان کے گردن میں لتا کی طرح لپٹی ہوئی گھنٹوں پریم کی باتیں کیا کرتی۔ وہ ان کے ساتھ گلشن کی کیاریوں میں چہلیں کرتی۔ ان کے لیے پھولوں کے ہار گوندھتی اور ان کے گلے میں ڈال کر کہتی پیارے! دیکھنا یہ پھول مرجھا نہ جائیں۔ انھیں ہمیشہ تازہ رکھنا، وہ چاندنی راتوں میں ان کے ساتھ کشتی پر بیٹھ کر جھیل کی سیر کرتی۔ اور انھیں پریم کے راگ سناتی، اگر انھیں باہر سے آنے میں ذرا بھی دیر ہوجاتی تو وہ پُرمزہ شکوے کیا کرتی اور انھیں بے رحم اور بے درد کہتی۔ ان کے سامنے خود ہنستی آنکھیں ہنستیں، اور آنکھوں میں کاجل ہنستا تھا۔ مگر

آہ جب وہ اکیلی ہوتی تو طائرِ خیال اڑکر اسی کنڈ کے کنارے جا پہنچتا۔ کنڈ کا وہ نیلگوں پانی اس پر تیرتے ہوئے کنول، اور مولسریوں کی قطاریں آنکھوں کے سامنے آجاتیں۔ پھر امبا مسکراتی، نزاکت سے لچکتی آجاتی۔ اور تب رسیلے جوگی کی دلفریب مستانہ تصویر آنکھوں میں آبیٹھتی۔ اور ستار کے نشہ خیز زمزموں کے ساتھ نغمۂ جاں گداز کی صدائیں آنے لگتیں۔

کرگئے تھوڑے دن کی پریت

تب وہ ایک سرد آہ کھینچ کر اٹھ بیٹھتی، اور باہر نکل کر پنجرے میں چہکتی ہوئی چڑیوں کی شیریں نوائیوں میں پناہ لیتی۔ اس طرح یہ خواب پریشان ہوجاتا۔

(۴)

اس طرح کئی مہینے گزر گئے۔ ایک روز راجا ہری چند پربھا کو اپنے نگار خانے میں لے گئے۔ جو استادانِ فن کی سحر طرازیوں کا بے نظیر مجموعہ تھا۔ طاق اول میں تاریخی تصاویر تھیں۔ داخل ہوتے ہی رانا پرتاب کی قد آدم تصویر نظر آئی۔ جس کے چہرے سے مردانہ سطوت کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ ذرا اور آگے بڑھ کر دائیں طرف سرفروش سانگا، جانباز جگمل اور دلیر درگا داس جلوہ افروز تھے۔ بائیں طرف غیور اجیت اور شیر دل بھیم سنگھ بیٹھے ہوئے تھے۔ رانا پرتاب کے مقابل سلیم اور ثابت قدم سیواجی کی تصویر تھی۔ طاق کے بالائی حصے میں آمنے سامنے کامل کرشن اور روشن ضمیر رام براجتے تھے۔ مصوروں نے چہرہ نگاری میں کمال دکھایا تھا۔ باطن کو ظاہر بنا دیا تھا۔ پربھا نے پرتاپ کے پیروں کو چوما اور کرشن کے سامنے دیر تک آنکھوں میں احترام اور پریم کے آنسو بھرے، سرجھکائے کھڑی رہی۔ اس کے دل پر اس وقت ایک تقدس آمیز رعب طاری تھا۔ اسے معلوم ہوتا تھا یہ ان بزرگوں کی تصویریں نہیں، بلکہ ان کی پاک روحیں ہیں جن کے کارناموں سے ہندوستان کی تاریخ روشن ہے۔ جو ہندوستان کا بہترین قومی سرمایہ، اعلیٰ ترین قومی یادگار، اور بلند ترین قومی نعرے ہیں۔ وہ ان کے سامنے کھڑی نہ ہوسکی اور جلدی سے طاق کے دوسرے حصے میں داخل ہوگئی۔ یہاں وسط میں نورانی بدھ یوگ آسن میں بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان کی دائیں طرف عارف شنکر تھے۔ اور بائیں طرف بیدار مغز دیانند۔ ایک حصے میں درویش کبیر۔ اور صاحبِ دل رام داس پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ اور دیوار پر عالی مقام گرو گوند اپنے شہادت کے دونوں تاروں کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ دوسری دیوار

پر ہندو فلسفہ کی بزمِ جاوید قائم تھی۔ مصوروں کا کمال ایک ایک عضو سے ٹپکتا تھا۔ پربھا نے ان کے قدموں کو بوسہ دیا۔ پر ان کے سامنے سر نہ اٹھا سکی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ ان کی منور آنکھیں اس کے دل پر داغ میں چبھی جاتی ہیں۔

اس کے بعد طاق کا تیسرا درجہ آیا۔ شعرائے نازک خیال کی مجلس آراستہ تھی۔ روشن خیال والمیک اور ہمہ گیر ویاس جائے صدر پر رونق افروز تھے۔ داہنے طرف رنگین بیان کالی داس تھے۔ بائیں طرف جدت طراز وِبھوتی، قریب ہی بھرتری اپنے گوشۂ قناعت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بائیں طرف دیوار پر اردو شعرا کی محفل تھی۔ مسندِ اعزاز پر سحر بیان میرؔ رونق افروز تھے۔ جانبِ راست معنی آفریں غالبؔ، اور انسانی فطرت کے رمزشناس انیسؔ تھے۔ جانبِ چپ پُرسطوت ذوقؔ اور شیریں کلام آتشؔ، پُرگو نظیرؔ، زمانہ شناس حالیؔ لطیف اکبرؔ اور رفیق اقبال نے اس دائرے کو پورا کردیا تھا۔

دائیں طرف کی دیوار پر ہندی شعرا کا مجمع تھا۔ صوفی سورؔ، فطرت نگار تلسیؔ، قادر الکلام کیشوؔ، اور عاشق تن بہاریؔ، درجہ بدرجہ جلوہ افروز تھے۔ سور داس سے پربھاؔ کو روحانی عقیدت تھی۔ اس نے قریب جاکر ان کے قدموں کو بوسہ دینا چاہا۔ دفعتاً انھیں قدموں کے سامنے سر جھکاے اسے ایک چھوٹی سی تصویر نظر آئی۔ بربھا اسے دیکھ کر چونک پڑی۔ یہ وہی تصویر تھی جو اس کے پردۂ دل پر کھنچی ہوئی تھی۔ وہ دوبدو اس کی طرف نگاہ نہ کرسکی۔ دبی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

راجا ہری چند نے مسکرا کر پوچھا۔ ”اس شخص کو تم نے کہیں دیکھا ہے؟“

اس سوال سے پربھاؔ کا دل کانپ اٹھا۔ جیسے ہرن شکاری کے سامنے راہِ فرار نہ پاکر گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اسی طرح پربھاؔ دیوار کی طرف تاکنے لگی۔ سوچنے لگی کیا جواب دوں؟ اس کو کہاں دیکھا ہے؟ انھوں نے یہ سوال مجھ سے کیوں پوچھا؟ کہیں تاڑ تو نہیں گئے۔ یا نارائن میری پت تمھارے ہاتھ ہے۔ کیونکرکر انکار کروں۔ چہرہ زرد ہوگیا۔
سر جھکاکر دبی ہوئی زبان سے کہا، ہاں خیال آتا ہے کہ کہیں دیکھا ہے؟
ہری چند۔ ”کہاں دیکھا؟“

پربھا کے سرمیں چکر سا آنے لگا۔ بولی ”شاید وہ ایک بار گاتا ہوا میرے باغ کے سامنے سے جا رہا تھا۔ امّاں نے بلا کر اس کا گانا سنا تھا۔“

ہری چند نے پوچھا کیسا گانا تھا؟

پربھا کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ سوچتی تھی راجا کا ایسی باتیں پوچھنا معنی سے خالی نہیں دیکھو آج لاج رہتی ہے یا نہیں؟ بولی اس کا گانا تو ایسا برا نہ تھا۔"

ہری چند نے شرارت آمیز انداز سے مسکرا کر پوچھا کیا گایا تھا؟

پربھا اس سوال پر باخبر ہوگئی۔ سوچی اس سوال کا سچا جواب دے دوں تو پھر باقی کیا رہتا ہے۔ یقین ہوگیا کہ آج خیریت نہیں ہے۔ چھت کی طرف دیکھ کر بولی۔ سور داس کا کوئی پد تھا۔ ہری چند نے کہا۔ "یہ تو نہیں۔"

کرگئے تھوڑے دن کی پریت

پربھا کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سر تیورانے لگا۔ کھڑی نہ رہ سکی۔ بیٹھ گئی۔ اور مایوسانہ انداز سے بولی "ہاں یہی پد تھا" اور فوراً ہی کلیجہ مضبوط کرکے پوچھا آپ کو کیسے معلوم ہوا؟

ہری چند بولے وہ میرے یہاں اکثر آیا جایا کرتا ہے۔ مجھے بھی اس کا گانا پسند ہے۔ اسی نے مجھ سے یہ حال بتایا تھا۔ مگر وہ تو کہتا تھا کہ راج کماری نے میرے گانے کو بہت پسند کیا۔ اور پھر آنے کے لیے اصرار کیا۔"

پربھا کو اب سچا غصہ دکھانے کا موقع ملا۔ تیز ہو کر بولی۔ "یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔"

ہری چند بولے۔ "وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ حضرت کی چالاکی ہے۔ ڈینگ مارنا گویوں کا خاصہ ہے۔ مگر اس میں تو تمھیں انکار نہیں کہ اس کا گانا برا نہ تھا۔ پربھا خفیف ہوکر بولی نا! اچھی چیز کو برا کون کہے گا؟ ہری چند نے پوچھا۔ "پھر سننا چاہو تو اسے بلواؤں، سر کے بل دوڑا آئے گا۔"

کیا ان کے درشن پھر ہوں گے؟ اس امید سے اس کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ مگر ان کئی مہینوں کی متواتر کوشش سے جس خیال کو فراموش کرنے میں وہ کامیاب ہوچلی تھی اس کے پھر تازہ ہوجانے کا خوف دامن گیر ہوا۔ بولی۔ "میرا اس وقت گانا سننے کو جی نہیں چاہتا۔"

ہری چند نے اصرار کیا۔ "یہ میں نہ مانوں گا۔ تم اور گانا سننا نہ چاہو۔ میں ابھی اسے بلائے لاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر راجا ہری چند تیر کی طرح طاق سے باہر نکل آئے۔ پربھا انھیں روک نہ سکی۔ وہ دم بخود، فکر میں ڈوبی، کھڑی تھی۔ دل میں خوشی اور رنج کی لہریں باری باری سے اٹھتی تھیں۔ مشکل سے دس منٹ گزرے ہوں گے، ا... کی مستانہ صداؤں کے ساتھ جوگی کا رسیلا تان سنائی دیا۔

کرگئے تھوڑے دن کی پریت

وہی دلآویز نغمہ تھا۔ وہی جذباتی تاثیر، وہی روحانی دلکشی، وہی سب کچھ جو فکر اور تخیل اور جذبات کو مرغزار تمنا میں پہنچا دیتا ہے۔

ایک لمحے میں جوگی کی موہنی صورت دکھائی دی۔ وہی مستانہ پن، وہی نشیلی آنکھیں، وہی دیوتاؤں کی سی صورت۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم تھا۔ پربھا نے اس کی طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ دفعتاً اس کا کلیجہ اُچھل پڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ بیخودی کے نشے سے اٹدی ہوئی، آنکھوں میں پریم کے آنسو بھرے، وہ اپنے شوہر کے پیروں پر گر پڑی اور بولی۔ ''پریتم''

راجا ہری چند کو آج گرمئی محبت، خلوص جذب، اور تسلیم کامل کا ایک نیا ولولہ انگیز، اور سرور افزا تجربہ ہوا۔ وہ ناقابلِ اظہار کمی جو عالمِ خلوص میں بھی کھٹکا کرتی تھی، دور ہو گئی تھی۔ انھوں نے پربھا کو سینے سے لگا لیا۔ آج ان دونوں دلوں کے درمیان کوئی میل، کوئی حدِ فاصل، کوئی آڑ نہیں ہے۔ آج ان میں سچّا ملاپ ہوا۔

راجا ہری چند نے کہا۔ ''جانتی ہو میں نے یہ سوانگ کیوں رچا تھا؟ گانے کا مجھے ہمیشہ سے شوق ہے۔ اور سنا کہ تمھیں بھی اس کا جنون ہے۔ تمھیں اپنا دل نذر کرنے سے پہلے ایک بار تمھارا درشن کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اور اس کے لیے سب سے بہتر ترکیب یہی نظر آئی۔''

پربھا نے سرشار آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ ''جوگی بن کر تم نے جو کچھ پا لیا وہ راجا رہ کر تم ہرگز نہ پاسکتے۔ تم میرے پتی رہتے، پریتم نہ ہوسکتے۔ اب تم میرے پتی بھی ہو۔ اور پریتم بھی۔ مگر تم نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ اور میری آتما کو گنہگار بنایا۔ اس کا ذمّے دار کون ہوگا؟

اردو ماہنامہ زمانہ کانپور نومبر 1916 میں شائع ہوا۔ اردو مجموعہ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سرودر 6 میں شامل ہے۔

دروازہ

میری جان ہمیشہ آفت میں رہتی ہے۔ اول تو گھر کے لڑکے دم نہیں لینے دیتے۔ میرے دونوں پٹوں کو زور سے ٹکرانا ان کا کھیل ہے۔ میری پسلیاں چور ہوجاتی ہیں۔ دوسرے ہوا کے تیز جھونکے اور بھی بلائے جاں۔ اس بے رحمی سے مجھے زیر و زبر کرتے ہیں کہ الاماں، اس پر طرہ یہ۔ کہ میری فغانِ درد پر صاحبِ خانہ کو بھی ترس نہیں آتا۔ وہ الٹے مجھی پر ناراض ہوتے ہیں۔ میں گھر کا رازدار ہوں اور ظاہرداری کو نبھانا میرا کام ہے۔ اکثر گھر میں صاحبِ خانہ کے موجود ہونے پر بھی مجھے بند کردیا جاتا ہے۔ خاص کر کسی چندے کی وصولیاں، بجاج کے تقاضے کے دن مجھے بند کردیا جاتا ہے اور وہ اپنا سا منھ لے کر لوٹ جاتے ہیں۔ میں سینہ سپر اپنے آقا کو ندامت اور حیلاسازی سے بچا لیتا ہوں۔ مگر پچھلے دنوں جب مجھے بند دیکھ کر ڈاکیہ منی آرڈر واپس لے گیا تو صاحبِ خانہ مجھی کو کوسنے لگے۔ میری نیکیوں کا کوئی بھی نام نہیں لیتا، مگر برائیوں پر سب کے سب برہم ہوجاتے ہیں۔

زمانے کا عجب ڈھنگ ہے۔ مجھے اپنے فرائضِ منصبی دینے میں کتنی گالیاں کھانی پڑتی ہیں۔ مجھے بند پاکر لقمۂ لذیز کی خواہش سے بے تاب کتے کتنے برہم ہوجاتے ہیں اور کتنے مایوس۔ اور چور تو میری جان کے گاہک ہیں۔ کبھی بغلی گھونسے مارتے ہیں، کبھی چول کھسکا دیتے ہیں۔ کبھی کچھ۔ حتیٰ کہ گداگروں کو بھی مجھ سے بغض ہے۔ مجھے بند پاکر کوستے ہیں اور ناکام واپس لوٹ جاتے ہیں۔

آہ! عمرِ رفتہ کی یاد کتنی حسرت ناک ہے؟ میں نے کبھی اچھے دن دیکھے ہیں۔ وہ دن نہیں بھولتا، جب مالکہ نئی نویلی دلہن بنی۔ گہنوں سے لدی، شرم سے سر جھکائے پالکی سے اتری تھی۔ اس وقت پہلے میں نے ہی ان کے رخِ روشن کا نظارہ کیا تھا۔ اور ان کے کمل سے نازک پیروں کا بوسہ لیا تھا۔ ایک روز جب بابو جی شام کو کسی وجہ سے گھر نہیں

آئے، تو انتظار میں بیٹھے بیٹھے وہ نئی نویلی دلہن حیا سے گردن جھکائے، دیواروں سے لجاتی میری گود میں آکر کھڑی ہوگئی اور کتنی دیر تک میرے پہلوؤں سے لپٹی ہوئی سامنے کے وسیع میدان کی طرف تاکتی رہی۔ اس وقت سینے میں کیسی دھڑک تھی اور آنکھوں میں کتنا فکر آمیز اشتیاق۔ بابوصاحب کو آڑے سے آتے دیکھ کر وہ کس طرح خوشی سے اُمڑی ہوئی جلدی سے گھر میں چلی گئی، یہ پُرمزہ باتیں کبھی بھول سکتی ہیں؟ بابو جی جیوں جیوں بوڑھے ہوتے جاتے ہیں، انھیں مجھ سے انس ہوتا جاتا ہے۔ اب وہ اکثر میرے پہلوؤں میں بیٹھے رہتے ہیں، شاید انھیں میری جدائی کا غم ستایا کرتا ہے۔ ابھی جب وہ بیمار تھے تو مالکن کتنی بار مجھ سے لپٹ لپٹ کر روئی تھیں، معلوم نہیں کیا!

اس گھر میں کون قدم رکھے گا، اگر اسے معلوم ہوجائے کہ اسے کبھی یہاں سے جانے کا اختیار نہیں ہے۔ میں گھر اور باہر کے بیچ کی کڑی ہوں۔ باہر کتنی وسیع دنیا۔ گھر محدود ہے، باہر کی کوئی انتہا نہیں۔ محدود اور غیر محدود کے درمیان رشتہ اتصال ہے۔ قطرے کو باہر سے ملانا میرا کام ہے۔ میں ایک کشتی ہوں، فنا سے بقا کو لے جانے کے لیے۔

اردو ماہنامہ الناظر لکھنؤ جنوری 1917 میں پہلی بار شائع ہوا۔ ہندی اور اردو کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔

راجپوت کی بیٹی

یہ وہ زمانہ ہے جب چتوڑ میں شیریں بیان میرابائی تشنہ کامانِ معرفت کو پریم کے پیالے پلاتی تھی۔ رنچھوڑجی کے مندر میں جس وقت وہ روحانی سرور سے متوالی ہوکر اپنی دلکش آواز میں پاکیزہ پدوں کو الاپتی تو سننے والے مست ہوجاتے اور میرؔا کی طرح بیخودی کے نشے میں جھومنے لگتے۔ ہرروز شام کو یہ روحانی لطف اٹھانے کے لیے سارے چتوڑ کے لوگ اس طرح بے قرار ہوکر دوڑتے جیسے دن بھر کی پیاسی گائیں دور سے کسی ندی یا ساگر کو دیکھ کر اس کی طرف بھاگتی ہیں۔ اور اس چشمۂ معرفت سے چتوڑ والے ہی شادکام نہ ہوتے تھے۔ سارے راجپوتانے کی پیاسی زمین اس کے آب روح پرور سے سیراب تھی۔

ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ جھالاوار کے راؤصاحب اور مندار کے راج کمار د... ہی خدم وحشم کے ساتھ چتوڑ میں وارد ہوئے۔ رائے صاحب کے ساتھ ان کی راج کماری پربھؔا بھی تھی جس کے حسن کا دور دور شہرہ تھا۔ یہیں رنچھوڑ کے مندر میں دونوں کی نگاہیں ملیں۔ حقیقت نے مجاز کا راستہ دکھادیا۔ کئی دن متواتر یہی کیفیت رہی۔ نگاہوں نے پیام محبت پہنچا دیے۔

راج کمار سارے دن وحشت کے عالم میں کوچہ و بازار میں گھوما کرتا۔ راجکماری سارے دن اداس دروازے پر کھڑی رہتی۔ شام ہوتے ہی دونوں گرسنہ اور پیاسے مندر میں آتے۔ یہاں چاند کو دیکھ کر کمدنی کھل جاتی۔

روشن ضمیر میرؔا نے کئی بار ان کی نگاہِ شوق کو ہم آغوش ہوتے دیکھا۔ ایک روز کیرتن کے بعد جب جھالاوار کے راؤصاحب چلنے لگے تو اس نے مندار کمار کو بلاکر پربھؔا کے نازک ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دیے اور مسکرا کر بولی ”راؤ صاحب! آپ کو یہ داماد مبارک ہو۔“

پربھا شرم سے گڑ سی گئی۔ راؤصاحب مندار کے راج کمار کے حسنِ اخلاق پر پہلے ہی گرویدہ ہورہے تھے۔ خوش ہوکر فوراً سینہ سے لگالیا۔

اسی وقت چتوڑ کے رانا بھوج راج بھی مندر میں آئے۔ اور پربھا کو دیکھا۔ چھاتی پر سانپ لوٹ گیا۔

(۲)

جھالاوار میں۔ ”بڑی دھوم تھی۔ راج کماری پربھا کا آج بیاہ ہوگا۔ مندار سے بارات آئے گی۔ مہمانوں کی خاطرومدارات کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ نوبت خانے نغمہ زن تھے، دوکانیں سجی ہوئی، سڑکیں خنداں، بالاخانے رشکِ گلزار۔ مگر وہ جس کے لیے یہ سب تیاریاں تھیں، باغیچے کے کنج میں اداس بیٹھی رو رہی تھی۔

رنواس میں ڈومنیاں مبارک باد گارہی تھیں، کہیں حسینوں کی چہل تھی، کہیں زیوروں کی چمک دمک، کہیں عمر رفتہ کے دل خوش کن چرچے۔ نائن بات بات پر تیز ہوتی تھی، مالن کا دماغ آسمان پر تھا، پھولوں کو داغ کی طرح چھپاتی تھی۔ کمہارن مٹکے کی طرح پھولی ہوئی تھی، منڈپ کے نیچے پروہت جی بوڑھے غمزے کرتے تھے۔ بات بات پر اشرفیوں کے لیے ٹھنکتے تھے۔ رانی بھوکی پیاسی، سر کے بال بکھرے اِدھر اُدھر دوڑتی تھیں۔ چاروں طرف کی بوچھاریں سہتی تھیں اور انھیں ماتھے پر چڑھاتی تھیں۔ دل کھول کر زروجواہر لٹاتی تھیں۔ آج پربھا کا بیاہ ہے۔ بڑے نصیبوں سے ایسے دن آتے ہیں۔ اور بڑے بھاگوان سے ایسی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ سب اپنی اپنی دھن میں مست ہیں۔ کسی کو پربھا کی فکر نہیں ہے جو کنج میں اکیلی بیٹھی ہے۔

ایک حسینہ نے آکر نائن سے کہا۔ ”بہت بڑھ بڑھ باتیں نہ کر، کچھ راج کماری کا بھی دھیان ہے۔ چل ان کے بال گوندھ۔ نائن نے دانتوں تلے زبان دبائی۔ دونوں پربھا کو ڈھونڈھتی ہوئی باغ میں آئیں۔ پربھا نے آنسو پونچھ ڈالے۔ نائن موتیوں سے مانگ بھرنے لگی۔ اور پربھا سر جھکا کر آنکھوں سے موتی برسانے لگی۔“

سہیلی نے آبدیدہ ہوکر کہا۔ ”بہن اتنا دل چھوٹا مت کرو، جی کو سنبھالو۔ منھ مانگی مراد مل رہی ہے، پربھا نے سہیلی کی طرف بے کسانہ انداز سے دیکھ کر کہا، بہن نہ جانے کیوں دل بیٹھا جاتا ہے۔ بہت سنبھالتی ہوں، نہیں سنبھلتا۔“

سہیلی نے چھیڑ کر کہا۔ "پیا سے ملنے کی بے کلی ہے۔"

پربھا حسرتناک انداز سے بولی۔ "کوئی میرے دل میں بیٹھا کہہ رہا ہے کہ اب ان سے ملاقات نہ ہوگی۔ سہیلی نے اس کے بال سنوار کر کہا "جیسے صبح کے پہلے اندھیرا ہوجاتا ہے اسی طرح ملاپ کے پہلے پریمیوں کے دل پر مایوسی غالب ہوجاتی ہے۔"

پربھا بولی۔"تم تو جانے کیا کہتی ہو بہن، مجھے شگون اچھے نہیں نظر آتے۔ آج دن بھر میری آنکھ پھڑکتی رہی۔ رات کو میں نے بڑے خواب دیکھے ہیں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آج ضرور کوئی نہ کوئی آفت آئے گی۔ تم بھوجراج کو جانتی ہو نا؟

شام ہوگئی آسمان پر تاروں کے چراغ جلے۔ جھالاوار میں برنا و پیر بارات کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگے۔ مردوں نے ڈاڑھیاں باندھیں، پاگین سنواریں، ہتھیار سجے۔ عورتوں نے بناؤ سنگار کیے۔ اور گاتی بجاتی رنواس کو چلیں۔ ہزاروں عورتیں محل کے چھت پر بیٹھی ہوئی بارات کی راہ دیکھ رہی تھیں۔

دفعتاً غل مچا کہ بارات آگئی۔ لوگ سنبھل بیٹھے۔ نقاروں پر چوب پڑی، سلامیاں دغنے لگیں، جوانوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی۔ دم کی دم میں مسلح سواروں کی ایک فوج شاہی محل کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ لوگوں نے حیرت سے دیکھا۔ یہ مندار کی بارات نہ تھی، رانا بھوجراج کی فوج تھی!

دم زدن میں چتوڑ والوں نے شاہی محل کو گھیر لیا۔ جھالاواری بھی چونکے۔ سنبھل کر تلواریں کھینچ لیں۔ اور تیغے چلنے لگے۔ رانا محل میں گھسے۔ عورتوں میں کہرام مچ گیا۔

پربھا سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہیں۔ وصال کی ذرہ بھر خوشی نہیں، مگر فراق کا بارِگراں دل کو مسلے ڈالتا تھا۔ یہ ہنگامہ برپا ہوتے ہی گھبراکر اٹھ بیٹھی۔ سہیلی سے بولی۔ "بہن وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا، سہیلی نے کہا۔ "چل کر تہہ خانے میں چھپ رہو۔"

پربھا نے متین انداز سے کہا۔ "میں تہہ خانے میں چھپ رہوں اور یہاں خون کی ندی بہنے دوں مجھے اپنی جان اتنی پیاری نہیں ہے۔"

اتنے میں راؤصاحب ہانپتے ہوئے آئے اور بولے "بیٹی پربھا! رانا نے ہمارے محل کو گھیر لیا ہے۔ تم فوراً نیچے تہہ خانے میں چلی جاؤ۔ اور دروازے بند کرلو۔ اگر ہم راجپوت ہیں تو ایک چتوڑی بھی جیتا نہ جائے گا۔"

راؤصاحب کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ رانا بھوجراج کئی دلیروں کے ساتھ پہنچے اور بولے۔ "چتوڑ والے تو سر کٹانے کے لیے آئے ہی ہیں۔ مگر وہ راجپوت ہیں تو پربھا کو لے کر ہی جائیں گے۔"

بوڑھے راؤصاحب کے بدن میں رعشہ آگیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں، تلوار کھینچ کر رانا کی طرف جھپٹے۔ رانا وار کو بچا کر پربھا سے بولے۔ "راج کماری ہمارے ساتھ چلوگی؟"

پربھا سر جھکائے رانا کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور بولی۔ "ہاں چلوں گی۔"

راؤصاحب تڑپ کر بولے۔ "پربھا! تو راجپوت کی بیٹی ہے۔"

پربھا نے سر جھکالیا۔ زبان سے کچھ نہ بولی۔

راؤصاحب نے طیش میں آکر کہا۔ "بے غیرت!"

چھری کے تلے پڑا ہوا جانور جس طرح قاتل کی طرف دردناک نگاہوں سے دیکھتا ہے اسی طرح پربھا نے رانا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "جس جھالاوار کی گود میں پلی ہوں کیا اسے خون سے رنگوا دوں۔"؟

راؤصاحب نے اسی غضبناک انداز سے کہا۔ "راجپوتوں کو خون اتنا پیارا نہیں ہوتا۔ عزت پر جان دینا ان کا دھرم ہے۔ تب پربھا کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ بولی۔ "راجپوت کی بیٹی اپنی حفاظت خود کرسکتی ہے۔ اس کے لیے خون بہانے کی ضرورت نہیں۔"

چشم زدن میں رانا نے پربھا کو گود میں اٹھا لیا۔ بجلی کی طرح کوند کر باہر نکلے۔ گھوڑا تیار تھا۔ پربھا کو اپنے ساتھ بیٹھایا۔ ایڑ لگائی اور غائب ہوگئے۔

چتوڑ کے جانبازوں نے بھی باگیں موڑ دیں۔ ان کے دو سو جوان زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ مگر کسی نے میان سے تلوار نہ نکالی تھی، رات کو دس بجے مندار سے بارات جھالاوار پہونچی، مگر شہر کے باہر ہی اس سانحۂ دلدوز کی خبر ملی۔ دولھے نے سر پیٹ لیا۔ مگر مایوس و دل شکستہ الٹے قدم واپس گیا۔ جس طرح رات کو ندی کا کنارہ سنسان ہوجاتا ہے، اسی طرح ساری رات جھالاوار میں سناٹا چھایا تھا۔

(۳)

چتوڑ کے شیش محل میں پربھا خاموش بیٹھی سامنے کے خوشنما پودوں کی پتیاں گن

رہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ کہ رانا اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ پربھا اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

رانا نے کہنا شروع کیا۔ پربھا! میں تمھارا خطاوار ہوں، میں تمھیں جبراً تمھارے ماں باپ کی گود سے چھین لایا ہوں۔ لیکن اگر میں تم سے کہوں کہ یہ سب تمھاری محبت کی بدولت ہوا تو تم اپنے دل میں ہنسوگی اور کہوگی کہ یہ اظہارِ محبت کا انوکھا نرالا ڈھنگ ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے۔ جس وقت میں نے تمھیں رنچھوڑجی کے مندر میں دیکھا اس وقت تمھارا بندۂ محبت ہوگیا۔ اور اگر تمھیں اپنا بنانے کی کوئی اور صورت ہوتی تو یقین مانو میں اس وحشیانہ طریقہ سے کام نہ لیتا۔ میں نے راؤصاحب کی خدمت میں بار بار پیغام بھیجے مگر انھوں نے ہمیشہ انکار کیا۔ یہاں تک کہ ایک بار میرے آدمیوں کو دربار سے دھکے دے کر نکلوا دیا۔ آخر جب میں نے دیکھا کہ ایک ہی دن میں تم اس پاک دائرے میں داخل ہوجاؤگی جہاں قدم رکھنا میرے لیے بدترین گناہ ہے تو مجبور ہو کر مجھے یہ ظلم کرنا پڑا۔ میں مانتا ہوں کہ یہ سراسر میری خودغرضی ہے۔ میں نے اپنے جذبۂ محبت کے سامنے تمھارے خیالات کی پرواہ نہ کی۔ مگر محبت خودغرضی کا دوسرا نام ہے۔ محبت میں انسان کو صرف ایک چیز نظر آتی ہے اور وہ وصالِ یار ہے۔ مجھے یقین کامل تھا کہ میں اپنی خدمت سے، محبت سے، عقیدت سے، تمھیں اپنا بنا لوں گا۔ خدمت پتھر کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ اور اسی دعویٰ پر مجھ سے یہ خطا سرزد ہوئی۔ پربھا! پیاس سے مرتا ہوا انسان اگر کسی گھڑے میں منھ ڈال دے تو وہ سزا کے قابل نہیں۔ میں محبت کا پیاسا ہوں۔ سزا کے قابل نہیں۔ کاش میری رانی مجھ سے محبت کرتی۔ اس کا دل محبت کا اتھاہ ساگر ہے۔ اس کا ایک پیالہ بھی مجھے مست کرنے کے لیے کافی تھا۔ مگر جس دل میں ایشور کا باس ہو وہاں میرے لیے کہاں جگہ ہے۔ تم یہ کہوگی کہ اگر محبت کا بھوت تمھارے سر پر سوار تھا تو سارے راجپوتانے میں کیا عورتیں نہ تھیں؟ بے شک راجپوتانے میں حسن کی کمی نہیں، اور نہ چتوڑ کے رانا کی طرف سے شادی کا پیغام کسی راجپوت کے لیے سبکی کا باعث ہوسکتا ہے۔ مگر اس سوال کا جواب تم خود ہو، اس خطا کی خطاوار تم خود ہو۔ راجستھان میں ایک ہی چتوڑ ہے، ایک ہی رانا ہے، اور ایک ہی پربھا ہے! کاش راؤصاحب نے کوئی سویمبر رچا ہوتا تو مجھے اس ستمگری کی ضرورت نہ ہوتی۔ سارے راجپوتانے میں ایک جوان بھی ایسا

نہیں جو میرا لوہا نہ مانتا ہو۔ مگر جب چاروں طرف کے راستے بند ہیں اور اس بے بہا رتن کو جس پر میرا حق ہے ایک دوسرا شخص اٹھائے لیے جاتا ہو تو کیا میرے لیے یہی مناسب تھا کہ خاموش بیٹھا دیکھا کرتا! ممکن ہے میری تقدیر میں محبت کا سکھ نہ لکھا ہو۔ ممکن ہے میں اپنی تقدیر سے جنگ کررہا ہوں۔ مگر تقدیر سے لڑنا مردوں کا کام ہے۔ اس پر شاکر ہو کر بیٹھ رہنا مردوں کا کام نہیں۔ اس جنگ میں میری جیت ہوگی یا ہار اس کا میں کیا جواب دے سکتا ہوں؟ اگر محبت کا صلہ کچھ ملتا ہے تو وہ مجھے ملے گا۔ اس کا فیصلہ تمھارے ہاتھ ہے۔"

پربھا کی آنکھیں زمین کی طرف تھیں، اور خیالات طائروں کی طرح اِدھر اُدھر اڑتے پھرتے تھے۔ وہ جھالاوار کو کشت وخون سے بچانے کے لیے رانا کے ساتھ آئی تھی۔ مگر رانا کی طرف سے بھری بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے ننگِ خاندان، ننگِ قوم، ظالم، کمینہ، نفس کا غلام، بزدل کہہ کر دل کا بخار نکالنا چاہتی تھی، اس کو یقین تھا کہ یہ پھٹکار سن کر رانا بلبلا جائے گا۔ غضبناک ہوکر مجھے بزور قابو میں لانا چاہے گا۔ اس آخری موقع کے لیے اس نے اپنے کلیجے کو خوب مضبوط، اور اپنے آبدار خنجر کو خوب تیز کر رکھا تھا۔ اس کا ایک وار ان پر ہوگا، دوسرا اپنے جگر پر، اور یوں قضیہ تمام ہوجائے گا۔ لیکن رانا کی لجاجت، ان کے دردناک انداز تقریر، ان کے اعترافِ گناہ، اور ان کی سرگرمی نے اس وقت پربھا کو رام کرلیا۔ آگ پانی سے بجھ جاتی ہے۔

رانا ذرا دیر وہاں بیٹھے رہے۔ جب پربھا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور رانا کو اس کے بشرے سے معلوم ہوا کہ میرا بیٹھنا ناگوار معلوم ہو رہا ہے تو اٹھ کر چلے گئے۔

(۴)

پربھا کو چتوڑ میں رہتے دوماہ گزر چکے ہیں۔ رانا پربھا کے پاس دوبارہ نہ آئے۔ اس دوران میں رانا کے خیالات میں بہت کچھ انقلاب ہوگیا ہے جھالاوار پر حملہ کرنے کے پہلے میرابائی کو اس کی ذرا بھی خبر نہ تھی۔ رانا نے اس راز کو کسی پر آشکارا نہیں کیا تھا۔ مگر اب میرا بائی اکثر انھیں اس فعل پر نادم کیا کرتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ رانا کو بھی یقین ہونے لگا ہے کہ پربھا ان کی رضا جوئیوں سے قابو میں آنے والی عورت نہیں۔ انھوں نے اس کی آسائش کے سامان مہیا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا تھا۔ مگر پربھا اس کی

طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ رانا پربھا کی لونڈیوں سے، ہر روز کی کیفیت دریافت کیا کرتے ہیں۔ اور انھیں ایک ہی یاس انگیز داستان روز سنائی دیتی ہے۔ مرجھائی ہوئی کلی کسی طرح نہیں کھلتی۔ اس لیے کبھی کبھی رانا کو اپنے فعل پر افسوس ہوتا ہے۔ پچھتاتے ہیں کہ میں نے ناحق یہ بلا سر پر لی۔ مگر پھر پربھا کی دلفریب صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اور وہ اپنے دل کو اس خیال سے سمجھالیتے ہیں کہ ایک خوددار عورت کے دل پر اتنی جلد اثر نہیں ہوسکتا۔ اور یقیناً میری نازبرداریاں جلد یا دیر میں اپنا اثر دکھائیں گی۔

پربھا دن کے دن اکیلے بیٹھے بیٹھے اکتاتی اور جھنجھلاتی۔ اس کی تفریح کے لیے گاؤں والی عورتوں کی ایک جمیعت مقرر تھی۔ مگر گانے کی طرف اس کی طبیعت کبھی مائل نہ ہوتی۔ وہ ہردم اپنے خیالوں میں غرق رہتی۔ رانا کی لجاجت کا اثر اب زائل ہوچکا تھا۔ اور اب پھر ان کی بے رحمانہ زیادتی اسے اپنی اصلی صورت میں محسوس ہونے لگی تھی۔ چرب زبانیاں قائل نہیں کرتیں، صرف لاجواب کردیتی ہیں۔ پربھا کو اب اپنے لاجواب ہوجانے پر تعجب ہوتا تھا۔ اسے رانا کی گفتگو کا دنداں شکن جواب دینے کے پہلو بھی نظر آنے لگے تھے۔ وہ کبھی کبھی ان سے لڑ کر اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے بے قرار ہوجاتی۔

مگر قسمت کا فیصلہ کیا ہوگا؟ میں اپنی نگاہ میں ابھی تک راؤ صاحب کی بیٹی ہوں، لیکن دنیا کی نگاہ میں رانا کی رانی ہوچکی۔ اب اگر بفرضِ محال اس قید سے نکل بھی جاؤں تو میرے لیے کہاں ٹھکانہ ہے؟ میں کیسے منھ دکھاؤں گی؟ مندار کمار کو مجھ سے سچی محبت ہے۔ مگر وہ اس حالت میں مجھے شوق سے آغوشِ محبت میں لیں گے، اس میں شک ہے۔ اور اگر وہ زبان خلق کی پرواہ نہ کرکے مجھے قبول بھی کرلیں تو ان کا سر ہمیشہ کے لیے نیچا ہوجائے گا۔ اور کسی نہ کسی وقت ضرور ان کا دل مجھ سے پھر جائے گا اور وہ مجھے اپنے خاندان کا کلنک سمجھیں گے۔

تو میرے لیے اب صرف دو راستے ہیں۔ یا تو اسی قیدِ تنہائی میں زندگی کے دن کاٹوں، یا یہاں سے کسی طرح بھاگ جاؤں۔ مگر بھاگ کر کہاں جاؤں، باپ کے گھر؟ وہاں اب میرا گزر نہیں، مندارکمار کے پاس؟ اس میں ان کی ذلت ہے۔ اور میری بھی۔ بھکارنی بن جاؤں؟ اس میں بھی جگ ہنسائی ہوگی۔ اور آیندہ چل کر زندگی کی کیا صورت ہو؟ ایک بیکس عورت کے لیے حسن بلائے جان ہے۔ ایشور! وہ دن نہ آئے کہ میں ننگِ قوم بنوں!

راجپوت قوم نے عزت پر اپنا خون پانی کی طرح بہایا ہے۔ اس کی ہزاروں دیویاں سایۂ غیر کے خوف سے سوکھی لکڑی کی طرح جل مری ہیں۔ وہ گھڑی نہ آجائے کہ میرے کارن کسی راجپوت کی آنکھیں شرم سے زمین کی طرف جھکیں۔ نہیں۔ میں اسی قید میں مر جاؤں گی، رانا کے ظلم سہوں گی، جیوں گی، مروں گی، مگر اسی گھر میں۔ بیاہ تو جس سے ہونا تھا ہوچکا۔ بیاہ صرف ایک بار ہوتا ہے۔ دل میں اسی کی پرستش کروں گی، مگر زبان پر اس کا نام نہ لاؤں گی۔

ایک دن جھنجھلا کر اس نے رانا کو بلوا بھیجا۔ رانا آئے۔ صورت متفکر تھی۔ بولے۔ "پربھا! تم نے آج مجھے بلایا ہے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے۔ تم نے مجھے یاد تو کیا۔ مگر یہ مت سمجھو کہ میں میٹھی میٹھی باتیں سننے کی امید لے کر آیا ہوں، نہیں، میں جانتا ہوں جس لیے تم نے یاد کیا ہے۔ یہ لو تمھارا گنہگار تمھارے سامنے حاضر ہے۔ جو سزا چاہے دو۔ مجھے اب تک آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس کا باعث صرف یہی خوف تھا۔ تم راجپوتنی ہو۔ اور راجپوتنیاں ان گناہوں کو معاف کرنا نہیں جانتیں۔ جھالاوار میں جب تم میرے ساتھ آنے پر مستعد ہوگئی تھیں اس وقت میں نے تمھارے جوہر پرکھ لیے۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ تمھارے سینہ میں اپنے اوپر بھروسہ کرنے والا باہمت دل ہے، اور اسے قابو میں لانا آسان نہیں۔ یہاں بارہا آیا، مگر ہمیشہ تمھیں خاموش تیور چڑھائے دیکھا اندر قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی اُلٹے قدم لوٹ گیا مگر آج تم نے مجھے بلایا ہے۔ میں بن بلایا مہمان نہیں ہوں، اور تمھیں مہمان کی خاطر کرنا چاہیے۔ دل سے نہ سہی، جہاں آگ دہک رہی ہوں وہاں ٹھنڈک کہاں؟ زبان ہی سے سہی۔ اپنے اوپر جبر ہی کرکے سہی، مہمان کی خاطر ہونی لازم ہے۔ دنیا میں دشمن کی بھی خاطر کی جاتی ہے۔ اور اکثر دوستوں سے زیادہ۔ پربھا! میں دیکھتا ہوں کہ تم میرے غریب خانے کو قید سے بھی بدتر سمجھ رہی ہو۔ مجھے امید تھی کہ تم میری خطاؤں کو معاف کروگی۔ اور میرے اوپر ترس کھاؤ گی۔ مگر میری امید پوری نہ ہوئی۔ ذرا دیر کے لیے غصے کو دباؤ اور میری خطاؤں پر غور کرو۔ میرے اوپر الزام ہے کہ میں تمھیں ماں باپ کی گود سے زبردستی چھین لایا۔ تم جانتی ہو کرشن بھگوان رکمنی کو زبردستی چھین لائے تھے۔ راجپوتوں میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسے واقعات سے ہماری تاریخیں بھری ہوئی ہیں۔ تم کہوگی اس سے جھالاوار والوں کی بے عزتی ہوئی۔ ایسا

ہرگز نہیں ہوا۔ جھالاوار والوں نے وہی کیا جو مردوں کو کرنا چاہیے تھا۔ انھوں نے اپنی غیرت کا دلیرانہ ثبوت دیا۔ اگر وہ ناکام رہے تو ان کی خطا نہیں ہے۔ دلیروں کی ہمیشہ جیت نہیں ہوتی۔ ہم کامیاب ہوئے اس لیے کہ ہم تعداد میں زیادہ تھے اور اس کام کے لیے مستعد ہوکر گئے تھے۔ وہ بے خبر تھے اسی لیے ان کی ہار ہوئی مگر ایشور کے لیے یہ مت خیال کرو کے میں عذرِ گناہ کررہا ہوں! نہیں مجھ سے غلطی ہوئی۔ اور میں اس پر دل سے نادم ہوں۔ اب اس بگڑے ہوئے کھیل کو تمھارے ہی اوپر چھوڑتا ہوں۔ اگر مجھے تمھارے دل میں کوئی گوشہ مل سکے تو میں اسے سورگ (بہشت) سمجھوں گا۔ ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟"

پربھا نے دیوار کی طرف تاکتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں"

رانا۔ "جھالاوار جانا چاہتی ہو؟"

پربھا۔ نہیں۔

رانا۔ "مندار کمار کے پاس بھیج دوں؟"

پربھا۔ "ہرگز نہیں۔"

رانا۔ "مگر تمھارا یہ کڑھنا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔"

پربھا۔ آپ کو اس کوفت سے جلد نجات مل جائے گی۔"

رانا نے سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ "جیسی تمھاری مرضی، اور چلے گئے۔"

(۵)

رات کے دس بج گئے تھے۔ رنچھوڑ جی کے مندر میں کیرتن ختم ہوگیا تھا۔ اور ویشنو سادھو بیٹھے کھانا کھارہے تھے۔ میرا خود تھال لالا کر سامنے رکھتی۔ سادھو سنتوں کی خاطر و تعظیم میں اس دیوی کو روحانی حظ حاصل ہوتا تھا۔ وہ کسی مہاتما کو بغیر شکم سیر کھلائے نہ جانے دیتی۔ سادھو لوگ جس رغبت اور شوق سے کھانے میں منہمک تھے اس سے شبہہ ہوتا تھا کہ اغراق میں زیادہ لذت ہے یا غذائے لطیف میں۔ ایشور کے عطیات سے فیض اٹھانا بجائے خود عبادت ہے۔ ضعیف انسان اس کے سواء اور کیا کرسکتا ہے۔ اس لیے یہ مہاتما لوگ خوشنودیٔ خدا کے اس سیدھے راستے پر اندھا دھند دوڑ رہے تھے۔ پیٹ پر بار بار ہاتھ پھیرتے۔ کبھی اس پہلو بیٹھتے، کبھی اس پہلو۔ اور زبان سے "بس" کہنا تو ان کے

نزدیک کفرانِ نعمت سے کم نہ تھا۔

مگر ان میں ایک مہاتما ایسے بھی تھے جو آنکھیں بند کیے خیال میں بیٹھے تھے۔ اور تھال کی طرف تاکتے بھی نہ تھے۔ ان کا نام پر یمانند تھا۔ آج ہی وارد ہوئے تھے۔ عارفِ کامل تھے۔ چہرے سے جلال برستا تھا۔ دیگر اولیائے کرام کھاکر اٹھ گئے۔ مگر انھوں نے کھانے کی طرف نگاہ بھی نہ کی۔ یہ حیرت کی بات تھی۔

میرا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ مہاراج! آپ نے پرساد کو چھوا بھی نہیں۔ کوئی بات مزاج کے خلاف تو نہیں ہوگئی؟

سادھو نے متین انداز سے کہا۔ "بھن اِچھا (خواہش) نہیں تھی۔"

میرا۔ "کچھ میری خاطر سے کھایئے۔"

سادھو۔ "اچھا نہیں ہے۔"

میرا۔ "میری یہ بنے (استدعا) ماننا پڑے گی۔"

سادھو۔ "میں نے برت (عہد) کیا ہے کہ کہیں نہ کھاؤں گا۔"

میرا۔ اور میں نے برت کیا ہے کہ کسی کو یہاں سے بغیر کھائے نہ جانے دوں گی۔"

سادھو۔ "میرا برت ٹوٹے گا تو اس کے لیے بڑی دکشنا دینی پڑی گی۔"

میرا نے خوش ہوکر کہا۔ "کیا آگیا(حکم) ہے شوق سے کہیے؟"

سادھو۔ "ماننا پڑے گی۔"

میرا۔ "مانوں گی۔"

سادھو۔ "بچن دیتی ہو۔؟"

میرابائی کا خیال تھا کہ سادھو کسی مندر بنوانے، یا کسی یگیہ کرا دینے کا سوال کریں گے۔ سادھوؤں کے اس وطیرے کا اسے بارہا تجربہ ہوچکا تھا۔ اور میرا کا سب کچھ ایسے کارِخیر کے لیے وقف تھا۔ مگر اسے کتنی حیرت ہوئی جب سادھو نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ "آج رات کو محل کا دروازہ کھول دینا۔"

میرابائی کو سکتہ سا ہوگیا۔ "بولی آپ کون ہیں؟"

سادھو۔ "مندار کا راج کمار۔"

میرا نے مندار کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ نگاہ میں تعظیم کے بجائے حقارت تھی۔

بولی راجپوت یوں دھوکا نہیں دیتے۔

راج کمار نے جواب دیا۔ "یہ قاعدہ اس موقع کے لیے ہے جب دونوں فریق برابر ہوں۔"

میرا۔ "ایسا نہیں ہوسکتا۔"

راج کمار آپ نے بچن دیا ہے۔ "اسے پورا کرنا ہوگا۔"

میرا "مہاراج کے حکم کے سامنے میرا بچن کوئی چیز نہیں۔"

راج کمار "میں یہ کچھ نہیں جانتا۔ اگر آپ کو اپنے بچن کا خیال ہے تو اسے پورا کیجیے۔"

میرا۔ "(سوچ کر) محل میں جا کر کیا کرو گے؟"

راج کمار۔ "نئی رانی سے دو باتیں۔"

میرا فکر میں ڈوب گئی۔ ایک طرف رانا کی ممانعت تھی۔ دوسری طرف اپنا قول۔ اور اس کے پورا کرنے کے نتائج۔ دسرتھ نے بچن کے لیے بیٹے کو جلاوطن کردیا۔ بچن کے لیے بزرگوں نے کون کون سی مصیبتیں نہیں جھیلیں۔ کن کن آفتوں میں نہیں پھنسے۔ بچن ہی کے لیے کرشن نے دھرم کی بھی پرواہ نہ کی۔ بچن کو پالنا میرا فرض ہے!

مگر پتی کی آگیا کو کیسے توڑوں؟ انھوں نے سخت ممانعت کردی ہے۔ اگر اس کے خلاف کرتی ہوں تو لوک اور پرلوک(دنیا اور آخرت) دونوں بگڑتا ہے۔ کیوں نہ ان سے صاف صاف کہہ دوں! کیا وہ میری اتنی درخواست نہ مانیں گے؟ میں نے آج تک ان سے کچھ نہیں مانگا۔ میں آج ان سے یہ بھیک مانگوں گی۔ کیا وہ میرے بچن کی پرواہ نہ کریں گے؟ ان کا دل فراخ ہے۔ یقیناً وہ مجھے ہمیشہ کے لیے وعدہ شکنی کے الزام سے بچائیں گے۔

اس طرح میرا فیصلہ کرکے بولی۔ "کس وقت کھول دوں؟"

راج کمار نے اچھل کر کہا۔ "آدھی رات کو۔"

میرا۔ "میں خود تمھارے ساتھ چلوں گی۔"

راج کمار "کیوں؟"

میرا۔ تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ مجھے تمھارے اوپر بھروسہ نہیں ہے۔"

راج کمار نے خفیف ہو کر کہا۔ ''آپ دروازے پر کھڑی رہیے گا۔''
میرا۔ ''اگر تم نے دغا کی تو جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔''
راج کمار۔ ''میں سب افتادوں کے لیے تیار ہوں۔''

(۲)

میرا یہاں سے رانا کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ رانا اس کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ کھڑے ہوگئے۔ اس وقت میرا کا آنا ایک غیر معمولی بات تھی۔ پوچھا بائی جی۔ اس وقت کیسے تکلیف کی؟''

میرا نے جواب دیا۔ آپ سے بھیک مانگنے آئی ہوں۔ مایوس نہ کیجیے گا۔ میں نے آج تک آپ سے کوئی سوال نہیں کیا ہے۔ ۔پر آج ایک مصیبت میں پھنس گئی ہوں، آپ ہی مجھے اس سے نکال سکتے ہیں۔ مندار کے راج کمار کو آپ جانتے ہیں؟

رانا۔ ہاں خوب اچھی طرح۔

میرا۔ آج اس نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ ایک ویشنو مہاتما کا روپ بھر کر رنچھوڑ جی کے مندر میں آیا کیرتن کے بعد جب سادھوؤں کا بھوج ہوا تو اس نے کچھ نہ کھایا۔ میرے یہاں قاعدہ ہے کہ کوئی سادھو بغیر کھائے نہیں جاتا۔ میں نے اس سے کھانے کے لیے اصرار کیا۔ آخر بہت کہنے سننے پر راضی ہوا۔ مگر اس شرط پر کہ میں بھی اس کا ایک سوال پورا کروں۔ میں نے سمجھا کسی مندر کے بنوانے کا سوال کرے گا۔ بچن دے بیٹھی۔ تب اس نے اپنا سوال پیش کیا۔ سنتے ہی مجھے سکتہ سا ہوگیا۔ پوچھا تونام بتلایا۔ میری ہمت نہیں پڑتی کہ اس کا سوال آپ سے کہوں۔

رانا۔ پربھا سے ملادینے کو تو نہیں کہا؟

میرا۔ جی ہاں اس کا منشا یہی تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں آدھی رات کو چور دروازہ کھول دوں۔ میں نے اسے بہت سمجھایا۔ بہت دھمکایا۔ مگر وہ کسی طرح نہ مانا۔ آخر میں نے مجبور ہوکر اس کے سوال کو پورا کرنے کا وعدہ کرلیا۔ تب اس نے کھانا کھایا۔ اب میرے بچن کی لاج آپ کے ہاتھ ہے۔ آپ چاہیں اسے پورا کرکے میرا مان رکھیں۔ چاہے اسے توڑ کر میرا مان کھو دیں۔ آپ میرے اوپر جو دیا رکھتے ہیں اسی کے بھروسے پر میں نے بچن دے دیا۔ اب اس پھندے سے آپ ہی مجھے چھڑا

سکتے ہیں۔"

رانا سوچ کر بولے۔ "تم نے بچن دیا ہے۔ اس کا پورا ہونا ضروری ہے۔ تم دیوی ہو۔ تمھارے بچن نہیں ٹل سکتے۔ محل کا دروازہ کھلوا دو۔ مگر یہ مناسب نہیں کہ وہ راجکمار پربھا سے اکیلے ملاقات کرے۔ تم خود اس کے ساتھ جانا۔ میری خاطر اتنی تکلیف کرنا۔ مجھے خوف ہے کہ وہ اسے قتل کرنے کا ارادہ کرکے نہ آیا ہو۔ حسد آدمی کو اندھا کردیتا ہے۔ بائی جی! میں اپنے دل کی بات آپ سے کہتا ہوں' مجھے پربھا کو ہر لانے کا سخت افسوس ہے۔ میں نے سمجھا تھا کہ وہ یہاں رہتے رہتے مانوس ہوجائے گی۔ مگر یہ خیال بالکل غلط نکلا۔ مجھے خوف ہے کہ اگر کچھ دن اسے یہاں اور رہنا پڑا تو وہ جیتی نہ بچے گی۔ خونِ ناحق ہوجائے گا۔ میں نے اس سے جھالاوار جانے کے لیے کہا، لیکن راضی نہیں ہوئی۔ آج آپ اس کی باتیں سنیں۔ اگر وہ مندارکمار کے ساتھ جانے پر راضی ہو تو میں شوق سے اجازت دے دوں گا۔ مجھ سے ان کا کڑھنا نہیں دیکھا جاتا۔ کاش اس حسینہ کا دل میری طرف سے اتنا سخت نہ ہوتا۔ تومیری زندگی سپھل ہوجاتی۔ مگر جب میری تقدیر میں یہ سکھ نہیں لکھا ہے تو کیا چارہ۔ میں نے تم سے ان باتوں کا ذکر نہیں کیا۔ تم سے ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تمھارے پاک دل میں ان باتوں کے لیے کہاں جگہ ہے؟"

میرابائی نے اوپر دیکھ کر کہا۔ "تو مجھے اجازت ہے کہ چور دروازہ کھول دوں؟"

رانا۔ "تم خود مالک ہو۔ مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔"

میرابائی نے پرنام کیا اور چلی گئی۔

(۷)

آدھی رات گزر گئی تھی۔ پربھا خاموش بیٹھی طلائی شمعدان میں جلتی ہوئی شمع کو دیکھ رہی تھی۔ اور سوچتی تھی اس کے گھلنے سے روشنی ہوتی ہے۔ یہ اگر جلتی ہے تو دوسروں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ میرے جلنے سے کسی کو کیا فائدہ ہے؟ میں کیوں گھلوں؟ میرے زندہ رہنے کی کیا ضرورت ہے؟

اس نے پھر کھڑکی سے سر نکال کر آسمان کی طرف دیکھا۔ سیاہ سطح پر تارے جگمگارہے تھے۔ تاریکی نے انھیں خوب روشن کردیا تھا۔ پربھا نے سوچا میرے سیاہ نصیب

میں روشن تارے کہاں ہیں؟ میرے لیے زندگی کی خوشیاں کہاں ہیں؟ یہی تنہائی کی قید جھیلنے کے لیے زندہ ہوں؟ رونے کے لیے جیوں؟ ایسے جینے سے کیا فائدہ؟

اور جینے میں بدنامی بھی تو ہے۔ میرے دل کا حال کون جانتا ہے؟ دنیا مجھے بے عزت کہتی ہوگی۔ جھالاوار کی دیویاں میرے مرنے کی خبر سننے کی منتظر ہوں گی۔ میری پیاری ماتا کی آنکھیں اوپر نہ اٹھتی ہوں گی۔ مگر جس وقت وہ میرے مرجانے کی خبر پائیں گی غرور سے ان کا سر اونچا ہوجائے گے۔ یہ بے حیائی کی زندگی ہے۔ ایسے جینے سے مرنا بہتر۔

پربھا نے سرہانے کے نیچے سے ایک آبدار کٹار نکالی۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے کٹار کی طرف نظر جمائی۔ اس سے ہم آغوش ہونے کے لیے جگر کو مضبوط کیا۔ ہاتھ اٹھایا مگر نہ اٹھایا گیا۔ ارادے میں ضعف تھا۔ آنکھیں جھپک گئیں۔ سر میں چکر آگیا۔ کٹار ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔

پربھا جھنجھلائی۔ کیا سچ مچ میں بے غیرت ہوں؟ میں راجپوت کی بیٹی ہوکر مرنے سے ڈرتی ہوں؟ عزت کھوکر بے حیا جیا کرتے ہیں۔ وہ کون سی آرزو ہے جس نے مجھے اتنا کمزور بنا رکھا ہے؟ کیا رانا کی میٹھی میٹھی باتیں؟ دشمن کی دل جوئیاں؟ انھوں نے مجھے جانور سمجھ لیا ہے۔ جسے ہم شکار کرکے لاتے ہیں اور تب قفس میں بند کرکے اسے ہلاتے ہیں۔ کاش اس جادوگر کے سامنے میری زبان کھلتی، وہ اس طرح گھما گھما کر باتیں کرتے ہیں اور میری طرف سے دلیلیں نکال کر ان کا ایسا جواب دیتے ہیں کہ میں بالکل بے زبان ہوجاتی ہوں۔ ہائے ظالم نے میری زندگی خاک میں ملادی۔ اور اب مجھے یوں گھلا رہا ہے۔ کیا اسی لیے زندہ ہوں کہ اس کے قفس کا کھلونا بنوں؟

پھر کون سی آرزو ہے؟ راج کمار کی محبت؟ آہ اب اس کا خیال کرنا بھی میرے لیے گناہ ہے۔ میں اب اس دیوتا کے لائق نہیں ہوں۔ پیارے! میں نے عرصہ ہوا تمھیں دل سے نکال دیا۔ تم بھی مجھے دل سے نکال ڈالو۔

ایشور! ایسی باتیں میرے دل میں کیوں آتی ہیں؟ مجھے تو اب موت کے سوا ٹھکانہ نہیں۔

شنکر! میرے کمزور دل کو سنبھالو۔ اور مرنے کے بعد مجھے رسوائی سے بچانا۔

پربھا نے پھر کٹار نکالی۔ ارادہ کامل تھا۔ ہاتھ اٹھا۔ اور قریب تھا کہ کٹار اس کے داغدار سینے میں چبھ جائے کہ اتنے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ اس نے چونک کر سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھا۔ مندار کمار آہستہ آہستہ پیر دباتا کمرے میں داخل ہوا۔

(۸)

پربھا اسے دیکھتے ہی چونک پڑی۔ کٹار کو چھپا لیا۔ راج کمار کو دیکھ کر اسے خوشی نہیں ہوئی، بلکہ خوف تھا۔ اگر کسی کو ذرا بھی خبر ہوگئی تو اس کی جان کی خیریت نہیں۔ اسے فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اگر اسے باتوں کا موقع دوں تو دیر ہوگی۔ اور پھر وہ ضرور گرفتار ہوجائے گا۔ رانا اسے ہرگز زندہ نہ چھوڑیں گے۔ یہ خیالات برق و باد کی طرح اس کے دماغ میں آئے۔ تیز آواز میں بولی۔ ''اندر مت آؤ۔''

راج کمار نے پوچھا۔ ''مجھے پہچانا نہیں؟''

پربھا۔ ''خوب پہچان لیا۔ مگر یہ باتیں کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اندر مت آؤ۔ رانا تمھاری گھات میں ہیں ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔''

راج کمار نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور بیباکانہ انداز سے بولا۔ ''پربھا تم مجھ سے بے مروتی کرتی ہو۔''

پربھا۔ ''تم اگر یہاں ٹھہرو گے تو شور مچادوں گی۔''

راج کمار۔ ''اس کا مجھے خوف نہیں۔ میں زندگی سے بیزار ہوں۔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آیا ہوں۔ آج دو میں سے ایک فیصلہ ہوجائے گا۔ یا تو رانا رہیں گے، یا میں رہوں گا۔ تم میرے ساتھ چلوگی۔''

پربھا نے کہا۔ ''نہیں۔''

راج کمار۔ ''کیوں؟ کیا چتوڑ کی آب و ہوا پسند آگئی؟''

پربھا۔ ''دنیا میں سب کچھ اپنی مرضی کے موافق نہیں ہوتا۔ جس طرح میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی ہوں وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ مگر لوک لاج بھی تو کوئی چیز ہے۔ دنیا کی نگاہ میں میں چتوڑ کی رانی ہوچکی۔ اب رانا جس طرح رکھیں اسی طرح رہوں گی۔ میں مرتے دم تک ان سے نفرت کروں گی، جلوں گی، کڑھوں گی، جب یہ جلن نہ سہی جائے گی تو زہر کھالوں گی، سینے میں کٹار مار کر مرجاؤں گی۔

مگر اسی گھر میں۔ اس گھر سے باہر قدم نہ نکالوں گی۔"

راج کمار کے دل میں شبہہ ہوا۔ اس نے سوچا پربھا پر رانا کا منتر چل گیا۔ یہ مجھ سے دغا کررہی ہے۔ محبت کی جگہ حسد کا شعلہ پیدا ہوا۔ تیز آواز سے بولا۔ "اور اگر میں تمھیں یہاں سے اٹھالے جاؤں تو؟"

پربھا کے تیور بدل گئے۔ بولی۔ "تو میں وہی کروں گی جو راجپوتنیاں کیا کرتی ہیں۔ یا اپنے گلے میں چھری مارلوں گی یا تمھارے گلے میں۔"

راج کمار ایک قدم اور آگے بڑھا اور طعن آمیز انداز سے بولا۔ "رانا کے ساتھ تو تم خوشی سے چلی آئیں۔ اس وقت یہ چھری کہاں گئی تھی؟"

پربھا تلملا گئی۔ تیر سا لگا۔ بولی۔ "اس وقت اس چھری کے ایک وار سے خون کی ندی بہنے لگی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے پیچھے میرے بھائی بندوں کی جان جائے۔ اس کے سوائے میں کنواری تھی۔ کم سے کم دنیا مجھے ایسا سمجھتی تھی۔ مجھے اپنے ناموس کے مٹنے کا خوف نہ تھا۔ میں نے پتی برت نہیں لیا تھا۔ کم سے کم دنیا یہی سمجھتی تھی۔ میں اپنی نگاہ میں اب بھی وہی ہوں۔ مگر دنیا کی نگاہ میں کچھ اور ہوگئی ہوں۔ دنیا نے مجھے رانا کا پابند بنادیا ہے۔ دنیا نے پتی برت کی زنجیر میرے گلے میں باندھ دی ہے۔ اب یہی میرا دھرم ہے۔ اس کے سوا اور کچھ کرنا چھترانیوں کے نام پر بٹہ لگانا ہے۔ چھتریوں کا سر نیچا کرنا ہے۔ تم میرے زخم پر نمک چھڑکتے ہو۔ یہ کون سی شرافت ہے؟ میری تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے بھوگ رہی ہوں۔ مجھے بھوگنے دو۔ اور منت کرتی ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔"

راج کمار ایک قدم اور بڑھا اور شرارت آمیز انداز سے بولا۔ "پربھا کیا رانا تمھیں تریا چرتر بھی سکھا دیا؟ تم میرے ساتھ بے وفائی کرکے اب دھرم کی آڑ لے رہی ہو۔ تم نے میرے دل وجان کو پیروں تلے مسل دیا۔ اور اب نام و ناموس کا عذر کرتی ہو۔ ان آنکھوں سے تمھیں رانا کے آغوشِ الفت میں عیش اڑاتے نہیں دیکھ سکتا۔ میری آرزوئیں خاک میں ملتی ہیں۔ ہم تو تمھیں لے کر جائیں گے۔ تمھاری بے وفائی کی یہی سزا ہے۔ بولو کیا فیصلہ ہے؟ اس وقت میرے ساتھ چلتی ہو یا نہیں؟ قلعہ کے باہر میرے آدمی تیار کھڑے ہیں۔"

پربھا نے بیخودی سے کہا۔ ''نہیں''

راج کمار۔ ''یہ آخری فیصلہ ہے؟''

پربھا۔ ''ہاں'' .

راج کمار نے تلوار کھینچ لی۔ اور پربھا کی طرف لپکا۔ پربھا خوف سے آنکھ بند کیے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ معلوم ہوتا تھا اسے غش آجائے گا۔

دفعتاً رانا تلوار کھینچے ہوئے اندار داخل ہوئے۔ راج کمار سنبھل کر کھڑا ہوگیا۔

رانا نے غضبناک ہوکر کہا۔ ''دور ہٹ۔ چھتری عورتوں پر تلوار نہیں اٹھاتے۔''

راج کمار نے تن کر جواب دیا۔ ''بے حیا عورتوں کی یہی سزا ہے۔''

رانا نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمھارا رقیب تو میں تھا۔ میرے سامنے کیا شرماتے تھے۔ میں بھی تمھاری تلوار کے جوہر دیکھتا۔''

راج کمار نے اینٹھ کر رانا پر تلوار چلائی۔ رانا تلوار بازی میں یکتائے روزگار تھے۔ وار خالی دے کر راج کمار کی طرف جھپٹے۔ دفعتاً پربھا جو ایک سکتے کے عالم میں دیوار سے چمٹی ہوئی کھڑی تھی۔ بجلی کی طرح کوند کر راج کمار کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ رانا وار کرچکے تھے۔ تلوار کا پورا ہاتھ اس کے شانے پر پڑا اور سینے تک چلا گیا۔ خون کا فوارہ چھوٹنے لگا۔ رانا نے ایک آہ سرد لی۔ اور تلوار ہاتھ سے پھینک کر گرتی ہوئی پربھا کو سنبھال لیا۔''

دم زدن میں پربھا کے چہرے پر مردنی چھاگئی۔ آنکھیں بجھ گئیں۔ چراغ ٹھنڈا ہوگیا۔ مندارکمار نے بھی تلوار پھینک دی۔ اور آنکھوں میں آنسو بھرے پربھا کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ دونوں عاشقوں کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ پروانے بجھے ہوئے چراغ پر نثار ہوتے تھے۔

محبت کے آداب اور آئین نرالے ہیں۔ ابھی ایک لمحے پہلے راج کمار پربھا پر تلوار لے کر جھپٹا تھا۔ پربھا کسی طرح اس کے ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ رسوائی کا خوف، دھرم کی زنجیر، فرض کی دیوار مانع تھی۔ مگر اسے تلوار کی زد میں دیکھ کر اس کے لیے اپنی جان تک دے دی۔ شرطِ وفا نباہ دی۔ مگر اپنے قول کے موافق اسی گھر میں۔

ہاں محبت کے آداب نرالے ہیں۔ ابھی ایک لمحے پہلے راج کمار پربھا پر تلوار لے

کر جھپٹا تھا۔ اس کے خون کا پیاسا تھا۔ حسد کی آگ سینے میں مشتعل تھی۔ وہ آگ خون کے دھاروں سے بجھ گئی۔ وہ ایک عالم بیخودی میں کچھ دیر تک بیٹھا روتا رہا۔ پھر اٹھا۔ اور تلوار اٹھا کر زور سے اپنے سینے میں چبھالی۔ پھر خون کا فوارہ نکلا۔ دونوں دھاریں مل گئیں۔ اور ہم رنگ ہوگئیں۔

پربھا اس کے ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ مگر پریم کی زنجیر کو نہ توڑ سکی۔ دونوں ایک ساتھ رخصت ہوگئے۔

اردو ماہنامہ زمانہ جنوری 1917میں شائع ہوا۔ اردو مجموعہ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں مجموعہ مان سروور 6 میں مریادا کی دیدی کے عنوان سے شامل ہے۔

شعلۂ حُسن

ڈگری لینے کے بعد میں قریب قریب روز پبلک لائبریری جایا کرتا تھا۔ اخباروں اور کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لیے نہیں۔ کتابوں کو تو میں نے چھونے کی قسم کھا لی تھی۔ جس دن گزٹ میں اپنا نام دیکھا اسی دن مِل اور کینٹ کے پرزے پرزے کردیے۔ میں صرف اسٹیمین اور پایونیر کے "وانٹڈ" کالموں کو دیکھا کرتا تھا۔ فکرِ معاش دامن گیر تھی۔ میرے دادا نے بغاوت کے زمانے میں کسی انگریز افسر کی جان بچائی ہوتی، یا قبضے میں کثیر موروثی جائداد ہوتی تو کسی معزز عہدے کے لیے کوشش کرتا۔ اب میرے لیے بجز زندگی کے دن کاٹنے کے اور کیا تھا۔ معلوم نہیں "لیڈر" میں ایسے اشتہارات کیوں نہیں ہوتے۔ اخبار اشتہاروں کی آمدنی پر چلتے ہیں۔ یہاں کی ضرورتیں اسکول ماسٹروں تک ختم ہوجاتی ہیں۔ کیا ہمارے فیشنبل ہندوستانیوں کو گھوڑوں اور موٹروں اور کتوں اورزیوروں کے خریدوفروخت کی ضرورت نہیں ہے؟ غالبًا یہ لوگ اپنی ضرورتیں انگریزی اخباروں سے پوری کرتے ہوں گے۔ خیر مہینوں اسی طرح دوڑتے گزر گئے۔ اپنی مزاج کے موافق کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مجھے اکثر اپنے بی۔ اے۔ ہونے پر غصہ آتا تھا۔ کاش ڈرائیور یا فائر میں خانساماں، یا باروچی ہوتا تو مجھے انتظار نہ کرنا پڑتا۔

آخر ایک روز مجھے اپنی مرضی کے موافق ایک "مانگ" نظر آئی۔ کسی رئیس کو ایک پرائیوٹ سکرٹری کی ضرورت تھی۔ جو اعلیٰ درجے کا تعلیم یافتہ، رنگین طبع، خوش مذاق، اور وجیہہ ہو۔ تنخواہ ایک ہزار۔ درخواست کے ساتھ فوٹو بھی طلب کیا گیا تھا۔ میں اچھل پڑا۔ کاش تقدیر یاوری کرتی اور یہ منصب میرے ہاتھ آتا تو زندگی چین سے کٹ جاتی۔ اسی دن درخواست مع فوٹو روانہ کردی۔ مگر اپنے احباب سے اس کا ذکر نہ کیا کہ کہیں خفت نہ اٹھانی پڑے۔ دل ہردم اسی خیال میں ڈوبا رہتا۔ بیٹھے بیٹھے شیخ چلی کے منصوبے باندھا کرتا۔ پھر ہوش میں آکر اپنے تئیں سمجھاتا کہ مجھ میں ایسے جلیل منصب کے لیے کون سی

قابلیت ہے۔ میں ابھی کالج کا نکلا ہوا کتابی اصولی انسان ہوں۔ دنیا سے بے خبر۔ اس جگہ کے لیے ایک سے ایک عالم، فاضل، منہ پھیلائے بیٹھے ہوں گے۔ میرے لیے کوئی امید نہیں۔ میں خوش رو سہی، سجیلا سہی، مگر ایسے عہدوں کے لیے محض خوش رو ہونا کافی نہیں ہوسکتا۔ اس کے لکھنے کا منشا صرف اتنا ہوگا کہ سائل کو صرف کمزور نہ ہونا چاہیے۔ اور یہی معقول بھی ہے۔ بلکہ بہت سجیلا پن تو مناصب گرامی کے لیے کچھ خلافِ شان ہے۔ مختصر سا توند بھرا ہوا بدن، پھولے ہوئے رخسارے اور تحکمانہ اندازِ تقریر، یہ حکومت اور قلب کے لوازمات ہیں۔ اور مجھے ان میں سے ایک بھی میسر نہیں۔ میرے لیے کیا امید ہوسکتی ہے! اسی امید و بیم کی حالت میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ اور اب میں بالکل مایوس ہوگیا۔ سوچا میں بھی کیسا احمق ہوں کہ ایسی بے سر پیر کی بات کے پیچھے پھول اٹھا۔ اسی کو لونڈا پن کہتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس اشتہار کی کوئی اصلیت نہیں۔ کسی ستم ظریف نے آج کل کے تعلیم یافتہ آدمیوں کی حماقت کا امتحان لینے کے لیے یہ شگوفہ چھوڑا ہے۔ میں بھی کتنا کوتہ اندیش ہوں کہ یہاں تک بھی نگاہ نہ پہنچی۔

آٹھویں دن علی الصباح تار کے چپراسی نے مجھے آواز دی۔ میرے کلیجے میں گدگدی سی ہونے لگی۔ لپکا ہوا آیا۔ تار کھول کر دیکھا۔ لکھا تھا۔ ”منظور ہے۔ فوراً آؤ۔ عیش گڈھ۔“ مگر اس تار کے ملنے سے مجھے وہ خوشی نہ ہوئی جس کی امید تھی۔ میں اسے لیے کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ اعتبار نہ آتا تھا۔ ضرور کسی ستم ظریف کی شرارت ہے۔ مگر خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے بھی اس کا دنداں شکن جواب دینا چاہیے۔ کیوں نہ تار دے دوں ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی بھیج دو۔ آپ ساری کیفیت کھل جائیں گی۔ لیکن پھر سوچا کہیں فی الواقع طالعِ خفتہ بیدار ہوا ہو تو اس قسم کی حماقت سے بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ چلو۔ دل لگی سہی۔ زندگی میں یہ واقعہ بھی یاد رہے گا۔ اس طلسم کو کھول ہی ڈالوں۔ فوراً تار سے اپنی روانگی کی تاریخ کی اطلاع دی اور سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ مقام دکن کی طرف ہے۔ ٹائم ٹیبل میں اس کا ذکر مفصل لکھا تھا۔ مقام بہت خوش منظر سیر کے قابل ہے۔ آب و ہوا بہت اچھی نہیں مگر مضبوط جسم کے نوجوان پر اس کا اثر دیر میں نظر آتا ہے۔ وادیاں تاریک ہیں۔ ان میں گھسنا خطرناک ہے۔ کیونکہ زہریلے جانور بہت چھپے رہتے ہیں۔ غرض حالات کافی طور پر اشتیاق انگیز تھے۔ آکر مختصر سامان سفر

درست کیا۔ اور خدا کا نام لے کر چل کھڑا ہوا۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے اس کا مطلق ذکر نہ کیا۔ کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ دوچار دن میں اپنا منہ لیے لوٹوں گا۔ اس وقت شماتتِ ہمسایہ کا خوف نہ ہوگا۔

(۲)

گاڑی پر بیٹھا تو شام ہوگئی تھی۔ کچھ دیر تک تو سگار اور اخبار سے دل بہلاتا رہا۔ پھر معلوم نہیں کب نیند آگئی۔ آنکھ کھلی اور کھڑکی سے باہر کی طرف جھانکا تو صبح کا دل فریب نظارہ دکھائی دیا۔ دونوں طرف سبزے سے ڈھکے ہوئے کہسار تھے۔ ان پر چرتی ہوئی اجلی اجلی گائیں اور بھیڑیں آفتاب کی سنہری شعاعوں میں رنگی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے ندی میں چمکتے ہوئے تارے۔ جی چاہتا تھا کاش میرا آشیانہ بھی انھیں پہاڑوں میں ہوتا! جنگل کے پھل کھاتا، جھرنوں کا خوش گوار پانی پیتا، اور قدرت کے گیت گاتا۔ دفعتاً منظر بدلا۔ ایک وسیع جھیل پہاڑوں کے دامن میں نظر آئی۔ کہیں مرغابیاں تیرتی تھیں۔ کہیں چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں ارادۂ کمزور کی طرح ڈگمگاتی ہوئی چلی جاتی تھیں۔ یہ منظر بھی بدلا۔ پہاڑیوں کی گود میں ایک آباد گلزار گاؤں نظر آیا۔ جھاڑیوں اور درختوں سے ڈھکا ہوا۔ جب طائروں نے درختوں پر عافیت کے آشیانے بنائے ہوں۔ کہیں بچے کھیلتے تھے۔ کہیں گائے کے بچھڑے کلیلیں کرتے تھے۔ پھر ایک گھنا جنگل ملا۔ غول کے غول ہرن نظر آئے جو گاڑی کی آواز سنتے ہی چوکڑیاں بھرتے دور بھاگتے تھے۔ یہ سب مناظر خواب کی تصویروں کی طرح نظر آتے تھے۔ اور آنکھوں سے چھپ جاتے تھے۔ ان میں ایک ناقابلِ بیان شاعرانہ دلآویزی تھی جو دل میں حسرت اور شوق کا جادو پھونکتی تھی۔

آخر عیش گڑھ قریب آیا۔ میں نے بستر سنبھالا۔ ذرا دیر میں اسٹیشن کا سگنل دکھائی دیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گاڑی رکی۔ میں نے ادھر ادھر قلیوں کی تلاش میں نظر دوڑائی کہ دو وردی پوش آدمیوں نے آکر مجھ سے پوچھا۔ ”آپ ہی ...... سے تشریف لارہے ہیں؟ چلیے موٹر حاضر ہے۔ میری باچھیں کھل گئیں۔ تحکمانہ انداز سے موٹر پر جا بیٹھا۔ دل میں نادم تھا کہ اسباب اور لباس اس سے بہتر کیوں نہ ہوئے۔ اگر جانتا کہ ستارہ سچ مچ چمکا ہے تو ہرگز اس پریشان حالی سے نہ آتا۔ موٹر چلا۔ دو رویہ مولسریوں کے سایہ دار درخت تھے۔ سڑک پر سرخی بچھی ہوئی تھی۔ دونوں طرف سبزہ زار تھا۔ سڑک

کمان کی طرح خم کھاتی۔ اس میدان سے نکل گئی تھی۔ دفعتاً سامنے ایک پُرفضا ساگر دکھائی دیا۔ اور ساگر کے اس پار پہاڑیوں پر ایک عالی شان محل تھا۔ جس کا شکوہِ درخشاں پرستان کی یاد دلاتا تھا۔ محل حرصِ رفعت کی طرح غرور سے سر اٹھائے ہوئے جھیل گوشئہ قناعت کی طرح متین اور پرسکون، سارا منظر نغمہ اور حسن اور شعر کا مسکن معلوم ہوتا تھا۔ ہم صدر دروازے پر پہنچے۔ کئی خدمتگاروں نے آکر ہمارا خیرمقدم کیا۔ ان کے ساتھ ایک منشی جی آنکھوں میں سرمہ لگائے کاکلیں سنوارے نظر آئے۔ جو مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ میرے لیے ایک کمرہ پہلے ہی سے آراستہ تھا۔ منشی جی نے مجھے کمرے کے دروازے پر پہنچا دیا۔ اور بولے۔ سرکار نے فرمایا ہے اس وقت آپ آرام فرمائیں۔ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں، شام کو تشریف لایئے گا۔

مجھے اب تک خبر نہ تھی کہ یہ سرکار کون ہیں۔ نہ کسی سے پوچھنے کی جرأت ہوئی۔ اپنے آقا کے نام تک سے بے خبر رہنے کا الزام نہیں لینا چاہتا تھا۔ مگرچاہے کوئی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شخص شرافت کا پتلا ہے۔ مجھے اتنی خاطر و مدارات کی ہرگز امید نہ تھی۔ اپنے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹا تو مسرت سے میری آنکھیں لبریز ہوگئیں۔ سامنے چھجا تھا۔ نیچے جھیل تھی، سانپ کے کیچل کی طرح سیاہ و سفید، اور میں جسے تقدیر نے ہمیشہ اپنا سوتیلا لڑکا، سمجھا تھا۔ اس وقت زندگی میں پہلی بار خالص مسرّت کا لطف اٹھا رہا تھا۔ وائے بے خبری!

سہ پہر کو سرمہ باز منشی جی نے آکر اطلاع دی کہ سرکار نے یاد فرمایا ہے۔ میں نے اس اثنا میں خط صاف کر لیے تھے۔ پھر اپنا بہترین سوٹ پہنا اور سرکار کی خدمت میں چلا۔ اس وقت دل میں ایک قسم کی کمزوری سی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن میں اپنی قابلیت کا بہترین اظہار کرنے کے لیے تیار تھا۔ ہم کئی برآمدوں سے ہوتے ہوئے آخر سرکار کے دروازے پر پہنچے۔ ایک ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔ منشی جی نے پردہ اٹھا کر مجھے اشارے سے بلایا۔ میں اندر داخل ہوا۔ اور حیرت سے ششدر رہ گیا۔ میرے سامنے حسن کا ایک شعلہ دہک رہا تھا!

(۳)

پھول میں بھی حسن ہے، شعلے میں بھی حسن ہے۔ پھول میں طراوت اور تازگی

ہے، شعلے میں سوز اور تپش۔ پھول پر بھونرا اڑ اڑ کر اس کا رس لیتا ہے۔ شعلے پر پروانہ جل کر راکھ ہوجاتا ہے۔ میرے سامنے اس وقت زرنگار مسند پر جو نازنین شان سے بیٹھی ہوئی تھی وہ فی الواقع حسن کا شعلہ تھی۔ اس کی مخمور آنکھوں سے جاں سوز حرارت کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ پھول کی پنکھڑیاں ہوسکتی ہیں۔ شعلے کو بکھیرنا ممکن نہیں۔ اس کے ایک ایک عضو کی تعریف کرنا شعلے کو کاٹنا ہے۔ اس کا سرتا پا ایک شعلہ تھا۔ وہی دمک، وہی حرارت، وہی سرخی، کوئی مصور سطوتِ حسن کی اس سے بہتر تصویر خیال میں نہیں لاسکتا۔

اس نے میری طرف مربیانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ آپ کو دورانِ سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟

میں نے اپنے تئیں سنبھال کر جواب دیا۔ جی نہیں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی،

نازنین۔ "یہ مقام پسند آیا؟"

میں نے دلیرانہ سرگرمی سے جواب دیا۔ اس سے زیادہ دلکش مقام روئے زمین پر نہ ہوگا۔ ہاں گائڈبک سے معلوم ہوا کہ یہاں کی آب و ہوا بظاہر جتنی خوش گوار ہے، فی الواقع ایسی نہیں۔ کچھ خطرناک جانوروں کی بھی شکایت تھی۔"

نازنین کا چہرہ زرد ہوگیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم میں رعشہ آگیا۔ مگر دم زدن میں اس کے چہرے پر پھر اسی پُرغرور متانت کا جلوہ نظر آیا۔ بولی۔ "یہ مقام اپنی خوبیوں کے باعث اکثر حاسدوں کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ ہنر کے حاسد بہت ہوتے ہیں۔ اور بالفرض آب و ہوا میں کچھ نقص ہو بھی تو ماشاء اللہ ابھی آپ کا عالمِ شباب ہے، آپ کو اس کا کیا غم ہوسکتا ہے۔ رہے زہریلے جانور، وہ آپ کی نظروں کے سامنے موجود ہیں۔ اگر مور اور ہرن اور ہنس زہریلے جانور ہیں تو بے شک یہاں زہریلے جانوروں کی کثرت ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے میری طرف مستانہ نگاہوں سے دیکھا۔

میں نے جوش کے ساتھ جواب دیا۔ ان گائڈبکوں پر اعتبار کرنا سراسر جہل اور حماقت ہے۔

اس جملے سے نازنین کے دل پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ بولی۔ "آپ صاف گو معلوم

ہوتے ہیں۔ اور یہ انسان میں ایک جوہر ہے۔ میں آپ کی تصویر دیکھتے ہی اتنا سمجھ گئی تھی۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ میرے پاس ایک لاکھ سے زائد درخواستیں آئی تھیں۔ کتنے ہی ایم اے تھے۔ کوئی ڈی ایس سی تھا۔ کوئی انگلستان سے پی ایچ ڈی کی ڈگری پا چکا تھا۔ گویا یہاں مجھے کسی ریاضی یا علمی مسئلہ کی تحقیقات مدِ نظر تھی۔ کئی بزرگوں نے اپنی کبر سنی کی بنا پر درخواست کی تھی جن کی دوا دارو کے لیے مجھے حکیموں کی ضرورت ہوتی۔ سب سے زیادہ درخواستیں انھیں لوگوں کی تھیں جو کتاب کے کیڑے ہوتے ہیں۔ اور آداب و اخلاق کے سُر اَلاپا کرتے ہیں۔ ان کی دانست میں اس ملک میں سب سے زیادہ ضرورت عابدوں اور مولویوں کی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انھیں حضرات نے اس ملک کا ستیاناس کیا ہے۔ اخلاقی تعلیم کا اب زمانہ نہیں رہا۔ روایات قدیم قصےّ کہانیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ زمانہ مادیت اور مادی تعلیم کا ہے۔ جبکہ لوگ سامانِ عیش پر اپنے تیئں قربان کردیتے ہیں۔ میں نے وہ سب درخواستیں ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیں۔ سچ کہتی ہوں سیکڑوں درخواستیں انھیں اخلاقی رفارمروں کی تھیں۔ وہ اپنی تصانیف کو سند کے طور پر پیش کرتے تھے۔ صورتیں ایک سے ایک قابلِ دید! جنھیں دیکھ کر گھنٹوں ہنسیے۔ میں نے انھیں ایک البم میں لگا لیا ہے اور فرصت کے وقت جب ہنسنے کا جی چاہتا ہے تو انھیں دیکھا کرتی ہوں۔ وہ علم اور کمال جو چہرے کو بگاڑ دے اور انسان سے بن مانس بنا دے مرض ہے۔ آپ کی تصویر دیکھتے ہی میری نظر انتخاب نے فیصلہ کرلیا اور شکر ہے کہ میری نگاہ نے غلطی نہ کی۔''

اس نے میری طرف چشم ہائے پرفسوں سے دیکھا۔ اس کی آواز میں نغمے کی تاثیر تھی۔ نورانی اور دلآویز۔ اور اس کے خیالات نئی روشنی کے خیالات تھے، حقیقی لباس میں، برہنہ اور ہولناک۔ مگر اس آخری جملے نے جو مجھ سے تعلق رکھتا تھا، مجھے متوالا کردیا۔ میرے رگوں میں رعشہ سا آگیا۔ معلوم نہیں کیوں معنوی خوبیوں کے مقابلے میں ظاہری اوصاف کی تعریف سے ہم زیادہ محظوظ ہوتے ہیں۔ اور ایک حسینہ کی زبان پر تو وہ چلتا ہوا جادو ہے۔ بولا۔ حتی الامکان جناب کو مجھ سے شکایت کا کوئی موقع نہ ملے گا۔''

حسینہ نے معترف انداز سے میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ مجھے اس کا یقین ہے۔ میری قیافہ شناسی نے اتنا پہلے ہی بتلا دیا تھا۔ اب کچھ معاملہ کی گفتگو ہوجانی چاہیے۔ یہاں آپ

میرے مہمان رہیں گے۔ اس جھونپڑے کو خانۂ بے تکلف سمجھیے۔ میرے تعلقات نہایت وسیع ہیں۔ دنیا کے ہر ایک گوشے میں میرے کرم فرما موجود ہے۔ اور مجھے اکثر یاد کرتے ہیں۔ ان احباب کو میں آپ کے سپرد کرتی ہوں۔ ان میں آپ مختلف مزاج اور خواص کے انسان پائیں گے۔ کوئی مجھ سے مدد مانگتا ہے۔ کوئی میری شکایت کرتا ہے، کوئی مجھے سراہتا ہے، کوئی مجھے کوستا ہے، اب سب حضرات کو شافی جواب دینا آپ کا کام ہوگا۔ دیکھیے یہ آج کے خطوط کا انبار ہے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں۔ بہت عرصہ ہوا آپ کی تحریک سے اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے بعد ان کی جائداد پر قبضہ کرلیا تھا۔ اب ان کا لڑکا بالغ ہوگیا ہے۔ اور مجھے اپنی جائداد کی واپسی کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اتنے عرصے تک میں اس جائداد پر قابض تھا۔ اس سے دست بردار ہونا شاق گزرتا ہے۔ اب آپ کے مشورے کا منتظر ہوں۔" انھیں جواب دیجیے کہ فی الحال لطائف الحیل سے کام لو۔ لڑکے سے ہمدردی ظاہر کرو۔ اسے ملا لو۔ تب اسے غافل پاکر اس سے ایک سادے اسٹامپ پر دستخط کرا لو۔ بعد ازاں پٹواری اور دیگر عمال کی مدد سے اس اسٹامپ پر جائداد کا بیعنامہ لکھا لو۔ اگر ایک خرچ کرکے دو ملتے ہوں تو تامل نہ کرو۔"

مجھے اس جواب پر سخت حیرت ہوئی۔ اخلاقی احساس کو چوٹ سی لگی۔ اس طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ "یہ تو انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے۔"

نازنین کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور بولی۔ "انصاف! یہ کتابی عالموں کا ایجاد کیا ہوا گورکھ دھندا ہے۔ دنیا میں اس کا وجود نہیں۔ باپ قرض کھاکرمر جاے۔ لڑکا کوڑی کوڑی بھرے۔ علماء کے نزدیک یہ انصاف ہے! میں اسے ظلم کہتی ہوں۔ اس انصاف کے پردے میں گانٹھ کے پورے مہاجن کی دست درازی صاف نظر آتی ہے۔ "ایک ڈاکو کسی سرکاری عملے کے گھر میں ڈاکہ مارتا ہے اور گرفتار ہوکر جیل خانے جاتا ہے۔ علماء اسے انصاف کہتے ہیں۔ مگر یہاں بھی وہی دولت اور حکومت کی زبردستی ہے۔ عملے صاحب نے کتنے ہی گھروں میں ڈاکہ مارا۔ کتنوں ہی کا گلا دبایا۔ اور اس طرح روپے کا انبار جمع کیا۔ کسی کو ان کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ڈاکو نے جب ان کا گلا دبایا تو وہ اپنی دولت اور اثر کے زور سے غالب آگئے۔ میں اسے انصاف نہیں کہتی۔ دنیا میں دولت، ہوشیاری، چالاکی، فریب اور طاقت کا راج ہے۔ یہی کارزارِ ہستی ہے۔ یہاں ہر ایک تدبیر جس سے

ہمارا کام نکلے، جس سے ہم اپنے دشمنوں پر ظفریاب ہوں، جائز اور مباح ہے۔ دھرم یدھ کے دن اب نہیں رہے۔ یہ دیکھیے ایک دوسرے صاحب کا شکایت نامہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں "میں نے اول درجے میں ایم اے پاس کیا۔ اول درجے میں قانون کی سند حاصل کی۔ پر اب کوئی میری بات نہیں پوچھتا۔ اب تک یہ امید تھی کہ قابلیت ضرور اپنا اثر دکھائے گی۔ مگر تین سال کے تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ محض کتابی قانون ہے۔ اس عرصے میں بزرگوں کی کمائی بھی گاؤ خورد ہوگئی۔اب مایوس ہوکر آپ کے آستانے پر فرقِ نیاز جھکاتا ہوں۔ مجھ بدنصیب کے حالِ زار پر رحم کیجیے اور میرا بیڑا پار لگایئے۔" انھیں جواب دیجیے کہ جعلی دستاویز بنایئے اور فرضی موکلوں کی طرف سے دعوے دائر کرکے ڈگری کرالیجیے یقیناً چند ماہ میں آپ کی نحوست دور ہوجائے گی۔ یہ دیکھیے ایک اور صاحب فرماتے ہیں لڑکی سیانی ہوگئی ہے۔ جہاں جاتا ہوں لوگ جہیز کی گٹھری مانگتے ہیں۔ یہاں نانِ شبینہ کا ٹھکانہ نہیں۔ کسی طرح وضعداری نبھاتا ہوں۔ بدنامی ہو رہی ہے۔ جیسا ارشاد ہو تعمیل کروں۔" انھیں لکھیے کسی ہفتاد سالہ صاحبِ جائداد بوڑھے سے شادی کر دیجیے۔ وہ جہیز لینے کے بجائے دینے پر تیار ہوجائے گا۔ میرے خیال میں اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ایسے سائلوں کو کس قسم کا جواب دینے کی ضرورت ہے۔ جواب مختصر ہوں۔ بہت زیادہ توجیہہ اور تشریح کی ضرورت نہیں۔ ابھی چند روز یہ کام آپ کو مشکل معلوم ہوگا۔ اکثر کاموں میں آپ کو غور و خوض سے کام لینا پڑے گا۔ مگرآپ طباع آدمی ہیں۔ بہت جلد مہارت ہوجائے گی۔ آپ کی ذات سے ہزاروں بندگانِ خدا کا بھلا ہوگا اور وہ آپ کا جَس گائیں گے۔

(۴)

مجھے یہاں رہتے ایک ماہ کے قریب ہوگیا۔ مگراب تک یہ نہ معلوم ہوا کہ میں کس کا ہوں۔ وہاں دولت کی کمی نہ تھی۔ تکلفات کے سامان وافر، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دولت آتی کہاں سے ہے۔ ایک بار سرمہ باز منشی جی سے میں نے اشارتاً اس کا ذکر چھیڑا تھا۔ انھوں نے کہا ان کے ذرائع غیر محدود ہیں۔ دنیا کے ہر گوشے میں ان کے مرید موجود ہیں۔ وہ انھیں نذریں دیا کرتے ہیں۔ اس سے میں نے یہ اخذ کیا تھا کہ شاید یہاں پیری مریدی کا کوئی سلسلہ ہے۔ مگر یہ نازنین کون ہے؟ آیا کوئی خوش نصیب پروانہ ہے جو اس

شعلے پر نثار ہوتا ہے۔ یہ راز سربستہ ہی رہا۔ مجھے قریب قریب روز اس سے نیاز حاصل ہوتا تھا۔ آہ! اس کے روبرو بیٹھ کر میں بیخود ہوجاتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں زبردست قوت جاذبہ تھی جو میری روح کو رگوں سے کھینچ لیا کرتی تھی۔ میری یارائے گفتار سلب ہوجاتی تھی۔ بس چھپی ہوئی دزدیدہ آنکھوں سے تاکا کرتا۔ وہ بھی مجھ سے غیر ملتفت نہ تھی۔ پر نہ معلوم کیوں مجھے اس کے مہر انگیز نگاہوں اور پُرشوق کنائیوں میں محبت کی جھلک نظر نہ آتی تھی۔ نگاہیں تیر کی طرح صرف چھیدتی تھیں۔ کنائے صرف بے تاب کرتے تھے۔ شکاری کو اپنا شکار کھلانے میں جو لطف آتا ہے وہی بے رحمانہ مسرّت اس نازنین کو میری وارفتگی سے حاصل ہوتی تھی۔ وہ شعلہ تھی اور شعلہ دلِ بیتاب کو کیا تسکین دے سکتا ہے۔ باوجود اس کے میں پروانہ وار اس شعلے پر نثار ہونا چاہتا تھا۔ مجھے اب تک عشاق کا مرغ بسمل کی طرح تڑپنا محض شاعرانہ تخیل معلوم ہوتا تھا۔ پر اس وقت میری بعینہ یہی حالت تھی۔ جی چاہتا کہ کسی طرح ان قدموں پر سر رکھ کرجان دے دوں۔ رغبتِ حسن نے دل سے شوق اور تمنا کو مٹا کر صرف جانبازی کی حسرت رکھ چھوڑی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ اپنے تیز رو موٹر بوٹ پر بیٹھ کر ساگر کی سیر کرتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا شفق میں چاند تیر رہا ہے۔

اپنے کارِ منصبی میں اب کافی مہارت ہوگئی تھی۔ روز خطوط کا ایک دفتر میرے پاس آتا۔ معلوم نہیں کس ڈاک سے ان پر مہر کا کوئی نشان نہ ہوتا تھا۔ مجھے ان سائلوں میں اکثر وہ اسمائے گرامی نظر آئے جن کی اب تک میرے دل میں سچی عزّت تھی۔ کتنے ہی ایسے حضرات تھے جن کی میں پرستش کرتا تھا۔ بڑے بڑے نامور پروفیسراور مصنف، بڑے بڑے صاحبِ ثروت روساء حتیٰ کہ کتنے ہی ہادیانِ مذہب روز اپنی مصیبت کی داستان سناتے تھے۔ ان کی حالتیں واقعی قابلِ رحم تھیں۔ مجھے رفتہ رفتہ یہ معلوم ہوتا جاتا تھا کہ ابتدائے افرینش سے باوجود لاکھوں صدیاں گزر جانے کے انسان ویسا ہی وحشی، ویسا ہی غضبناک، جذبات کا غلام، ویسا ہی خونخوار، ویسا ہی خودغرض بنا ہوا ہے۔ ہادیانِ دین اور معلمانِ اخلاق کی کوششیں مطلق کامیاب نہیں ہوئیں۔ بلکہ اس زمانے میں لوگ سادگی کے باعث اس قدر کنبہ پرست، اس قدر بغض پرور، اور اپنی سفاکیوں میں اس قدر ہنرمند اور چالاک نہیں تھے۔ ان میں کتنے ہی خطوط شکریے کے ہوتے تھے۔ اکثر چٹھیاں ان لوگوں کی

ہوتیں تھیں جو کسی سابقہ موقع پر اس نازنین کے مشورے پر عمل کر چکے تھے اور اب اس کے نتائج بھگت رہے تھے۔ وہ زیادہ تر دشنام اور لعن طعن سے پُر ہوتی تھیں۔ ایک روز اپنے کالج کے ایک پروفیسر صاحب کا خط ملا۔ یہ حضرت سب پروفیسروں سے زیادہ نیک نام تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ان کا نامۂ اعمال ازسر تا پا سیاہ تھا۔ ان خطوط کو دیکھ کر اس تاریک متعفن پستی کا اندازہ ہوسکتا تھا جہاں تک انسان جاسکتا ہے۔ ایک ایک خط عبرت کا دفتر تھا اور وائے برحال من! محض اپنے ذاتی فائدے کے لیے میں انسانی اور روحانی فرائض کو طاق پر رکھ کر گمراہیوں کا آلۂ تحریک بنا ہوا تھا۔ معلوم نہیں مجھ بدنصیب کے ہاتھوں کتنے گھر تباہ ہوئے ہوں گے۔ اور کتنی زندگیاں خاک میں مل گئی ہوں گی۔

ایک روز شام کے وقت نازنین نے مجھے یاد کیا۔ میں اپنی شوریدہ سری کے زعم میں سمجھتا تھا کہ میرے مردانہ حسن اور بانکپن کا اس پر ضرور کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے۔ اپنا بہترین سوٹ پہنا، بال سنوارے اور متین لاپراوئی کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اگر وہ مجھے اپنا شکار بنا کر کھیلتی تھی تو میں بھی شکار بن کر اسے کھلانا چاہتا تھا۔ اور وہ جفاکار تھی تو میں بھی اس کے تاثیر حسن سے بے اثر بننے کی کوشش کرتا تھا۔ اگر میں اسے بے رحم سمجھتا تھا تو اسے بھی مجھے بے نیاز سمجھنے میں کوئی امر مانع نہ ہوسکتا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک دلآویز تبسم سے میرا مصافحہ کیا۔ گر چہرہ کچھ مضمحل تھا۔ میں بے تاب ہوکر بولا۔ کیا دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہے؟

اس نے حسرتناک انداز سے جواب دیا۔ جی ہاں۔ قریب ایک مہینے سے ایک درد لاحق ہوگیا ہے۔ اب تک طبیعت کو سنبھالتی رہی، پر اب مرض زور پکڑتا جاتا ہے۔ اس کی دوا ایک بڑے بے رحم آدمی کے پاس ہے۔ وہ مجھے روز تڑپتے دیکھتا ہے اور اس کا دل ذرا بھی نہیں پسیجتا۔"

میں کنایہ سمجھ گیا۔ بدن کی ایک ایک رگ میں بجلی کی سی حرکت ہوگئی۔ تنفس میں طوفان آگیا۔ بے باک ہوکر بولا۔ ممکن ہے جسے آپ نے بے رحم سمجھ رکھا ہے اسے آپ سے بھی یہی شکایت ہو، مگر حالات سے مجبور ہوکر صرف شکایت زبان پر نہ لاسکتا ہو۔"

حسینہ نے کہا۔ تو کوئی ایسا علاج بتلایے جس سے طرفین کی شکایتیں رفع ہو جائیں۔ بے تابئ درد نے مجھے بے باک بنا دیا ہے۔ میرے دل میں زیادہ پردہ داری کی گنجائش نہیں ہے۔ میرا دل و جان آپ کی نذر ہے۔ میرے پاس وہ خزانے ہیں جو کبھی خالی نہ ہوں گے۔ آپ کو میں شہرت کی معراج پر پہنچا دوں گی۔ میرے آغوش میں آکر دلِ بے قرار کو تسکین دیجیے۔

نازنین کا چہرہ سرخ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ نشۂ شوق سے سرشار وہ آغوش کھولے ہوئے میری طرف بڑھی۔ مگر جس طرح تنکا شعلے سے دور بھاگتا ہے اسی طرح میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس گرمئ محبت سے مجھے ایک وحشت سی ہوگئی۔ دل پر ایک موہوم دہشت کا غلبہ ہوا۔ میں گھبرا گیا۔ حسینہ ٹھٹک گئی۔ جس طرح شکار کے چھن جانے سے شیرنی برہم ہوجاتی ہے اسی طرح قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ یہ گریز کیوں؟

میری زبان سے اضطراری طور پر نکلا۔ ”میں آپ کا جانثار خادم ہوں۔ اس اعزاز کے قابل نہیں۔“

حسینہ نے غضبناک ہوکر کہا۔ ”آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں؟“

میں نے مؤدبانہ انداز سے جواب دیا۔ ”اس کا کبھی خواب میں بھی گمان نہ کیجیے۔ آپ شمع ہیں، میں پراونہ ہوں، میرے لیے اتنا ہی اعزاز کافی ہے۔ آپ ذرہ نوازی فرمانا چاہتی ہیں تو مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔“

حسینہ غصہ مایوس کے ساتھ بیٹھ گئی اور بولی۔ ”آپ سچ مچ ظالم اور بے رحم ہیں۔ میں آپ کو ایسا نہ سمجھتی تھی۔“

میں نے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ جب اپنے کمرے میں آکر دل میں اس واقعے کو تولنے لگا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں اگنی کنڈ میں گرتے گرتے بچا۔ کوئی غیبی قوت میری معاون ہوگئی۔ یہ غیبی قوت کیا تھی؟ میرا اخلاقی احساس، جو اتنے عرصے تک مجہول رہنے کے بعد بھی بالکل بے جان، پامال، نہ ہوا تھا۔ میں اس کی صورت پر فریفتہ تھا۔ لیکن اس کی فتنہ بازیوں اور ابلہ فریبیوں سے نفرت کرتا تھا۔ جسم اس کی طرف خودبخود کھنچتا تھا۔ مگر روح دور بھاگتی تھی۔

(۵)

جس کمرے میں میں مقیم تھا اس کے سامنے جھیل کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا

شکستہ حال جھونپڑا تھا۔ اس میں ایک خمیدہ کمر مگر نمازی صورت پیر مرد رہا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی اس محل میں آیا کرتے تھے۔ نازنین معلوم نہیں کیوں ان سے نفرت کرتی تھی۔ شاید دل میں ان سے خائف تھی۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ اتنی باثروت ہوکر بھی وہ ایک خستہ حال بڈھے سے کیوں ڈرتی ہے۔ انھیں دیکھتے ہی نازنین کا رنگ فق ہوجاتا تھا۔ اپنے کمرے میں جاکر چھپ جایا کرتی تھی۔ دوچار مرتبہ اس نے مجھ سے بھی اشارتاً پیر مرد کا ذکر کیا تھا۔ لیکن بہت حقارت کے ساتھ۔

رات کو مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ ادھیڑ بن میں مصروف تھا۔ کبھی جی چاہتا تھا کہ آؤ آنکھ بند کرکے بہارِ حسن لوٹیں۔ دنیا کی نعمتوں کا لطف اٹھائیں۔ جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ ایسے زریں موقعے کہاں نصیب ہوتے ہیں۔ پھر خودبخود طبیعت کھنچ جاتی۔ اور الہام سا ہوتا کہ اس طلسم میں قدم نہ رکھنا ورنہ تا زیست نہ نکل سکو گے۔

رات کو دس بجے ہوں گے کہ دفعتاً میرے کمرے کا دروازہ کھل گیا اور وہی پیر مرد اندر داخل ہوئے۔ حالانکہ میں اپنی مالکہ کی ناراضگی کے خوف سے کبھی ان سے ہمکلام نہ ہوا تھا لیکن ان کے روئے مبارک پر تقدس کی ایسی شان تھی کہ خواہ مخواہ ان کے فیضِ صحبت کا اشتیاق ہوتا تھا۔ میں نے تعظیم کی اور لاکر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ انھوں نے میری طرف ترحم کی نگاہ سے دیکھ کر پوچھا۔ میرا مخل ہونا ناگوار تو نہ گزرا؟"

میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ جناب کی تشریف آوری میرے عین اعزاز کا باعث ہے۔

پیر مرد بولے۔ "اچھا تو سنو اور ہوشیار ہوجاؤ۔ تمھارے اوپر ایک بلائے عظیم آنے والی ہے۔ تمھارے لیے اس وقت سب سے بہتر یہی ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ تا زیست کفِ افسوس ملتے رہو گے۔ میرا جھونپڑا تمھارے سامنے تھا۔ مگر تم نے کبھی مجھ سے ملنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ کاش تم پہلے ہی دن مجھ سے ملتے تو ہزاروں خاندانوں کو تباہ کرنے کا عذاب تمھارے سر پر نہ ہوتا۔ تعجب تو یہ ہے کہ تم ایسے بیدار مغز ہوکر اس دام میں کیوں کر آپھنسے۔ اور اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ پھنس کر تم کیوں کر نکل سکے۔ اگر حسینہ ایک بار تمھیں اپنی آغوشِ محبت میں لے لیتی تو پھر تمھارے لیے کوئی امید نہ تھی۔ تم اس وقت اس کے عجائب خانے میں داخل کردیے جاتے۔ وہ جس پر ریجھتی ہے

اس کی یہی گت بناتی ہے۔ یہی اس کی محبت ہے۔ چلو ذرا اس عجائب خانے کی سیر کرو۔ تب تم سمجھو گے کہ تمھارے باموقع گریز نے تمھیں کس آفت سے بچا لیا۔"

یہ کہہ کر پیر مرد نے دیوار میں ایک بٹن دبائی۔ فوراً ایک دروازہ نمودار ہوا۔ وہ نیچے جانے کا زینہ تھا۔ پیر مرد داخل ہوئے اور مجھے بھی بلایا۔ تاریکی میں کئی زینے اترنے کے بعد ایک وسیع کمرہ نظر آیا۔ اس میں ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ وہاں میں نے جو نفرت انگیز، دل خراش نظارے دیکھے انھیں یاد کر کے آج بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اطالیہ کے زندہ جاوید دانتے نے دوزخ کا جو سین دکھایا ہے اس سے کہیں ہولناک، کہیں پُراستکراہ سین میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ جابجا نجاست اور غلاظت میں لپٹے ہوئے آدمی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ان کے اعضاء انسانی تھے۔ لیکن صورتیں مسخ ہوگئی تھیں۔ کوئی کتے سے مشابہ تھا، کوئی گیدڑ سے، کوئی بن بلاؤ سے ملتا تھا، کوئی سانپ سے۔ ایک گوشے میں کوئی موٹا تازہ آدمی ایک نحیف و خستہ آدمی کے جگر میں منہ لگائے اس کا خون چوس رہا تھا۔ ایک طرف دو گدھ کی صورت والے انسان ایک کرم خوردہ لاش پر بیٹھے پنجہ و منقار سے ایک دوسرے کو نوچ رہے تھے۔ ایک جگہ ایک اژدھے کی صورت والا آدمی ایک بچے کو نگلنا چاہتا تھا۔ پر حلق میں کافی گنجائش نہ ہونے کے باعث بے تاب ہو کر زمین پر لوٹتا تھا اور چیختا تھا۔ ایک جگہ میں نے خون کو منجمد کرنے والا نظارہ دیکھا۔ دو ناگن کی شکل کی عورتیں ایک بھیڑیئے کی صورت والے انسان کے گلے میں لپٹی ہوئی اسے کاٹ رہی تھیں۔ اس کے بدن سے خون کے فوارے جاری تھے۔ مجھ سے اب اور نہ دیکھا گیا۔ فوراً وہاں سے بھاگا۔ اور گرتا پڑتا اپنے کمرے میں آپہنچا۔ پیر مرد بھی میرے ساتھ چلے آئے۔ جب میرے ہوش ذرا بجا ہوئے تو انھوں نے کہا، تم اتنی جلد گھبرا گئے۔ ابھی تو ایک گوشہ بھی نہیں دیکھا۔ یہ تمھاری مالکہ کی سیر گاہ ہے۔ یہ ان کے پالتو جانور ہے۔ ان کی حرکات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ انھوں نے اس عجائب خانے میں چن چن کر آدمی رکھے ہیں۔ تمھیں بھی اسی لیے منتخب کیا تھا۔ معلوم نہیں کیا بنانا چاہتی تھی۔ وہ نت نئے جال بناتی رہتی ہے۔ اب کی کسی تعلیم یافتہ آدمی کو پھانسنا چاہتی تھی۔ اسی لیے پرائیوٹ سکریٹری کا اشتہار دے رکھا تھا۔ اب میری یہی صلاح ہے کہ تم اس وقت یہاں سے بھاگو ورنہ حسینہ کے دوسرے وار سے نہ بچ سکو گے۔"

یہ کہہ کر پیر مرد غائب ہوگئے۔ میں نے بھی اپنا بقچہ سنبھالا۔ اور آدھی رات کے سناٹے میں چوروں کی طرح کمرے سے باہر نکلا۔ فرحت بخش ہوائیں چل رہی تھیں۔ سامنے جھیل میں تارے تھرک رہے تھے۔ حنا کی خوشبو سے ہوا معطر تھی۔ اور جھیل کے اس پار پیرمرد کی شکستہ جھونپڑی میں روشنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ میں نے سیدھا راستہ چھوڑ دیا اور جھیل کے کنارے کنارے کیچڑ میں پھنستا سڑک تک آپہنچا۔ کس شان سے آیا تھا۔ کس مصیبت کذائی سے جا رہا تھا۔ لیکن دل میں ایسا خوش تھا جیسے کوئی چڑیا پنجہ باز سے چھوٹ جائے۔

گو میں ایک مہینے کے بعد لوٹا تھا۔ پر معلوم نہیں کیوں ابھی تک گھر کے آدمیوں کو نہ احباب کو میری فکر تھی۔ کمرے میں ذرا بھی گردوغبار نہ تھا۔ میں نے جب اپنے گھر پر اس واقعے کا ذکر کیا تو لوگ خوب ہنسے اور احباب تو ابھی تک تمسخر کیا کرتے ہیں۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ ایک مہینے غائب رہنے کا ذکر ہی کیا۔ اس وجہ سے اب مجھے بھی مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے کہ شاید میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ بہرحال جو کچھ ہو میں خدا کا ہزار شکر کرتا ہوں کہ میں اس آزمائش سے بچ کر نکل آیا۔ مگر اس کے ساتھ مجھے اس آزمائش میں پڑنے کا افسوس نہیں ہے۔ کیوں کہ اس نے ہمیشہ کے لیے میری آنکھیں کھول دیں۔

اردو ماہنامہ زمانہ میں مارچ 1917میں شائع ہوا اردو کے کسی مجموعے میں نہیں ہے۔ ہندی میں جوالامکھی کے عنوان سے مان سروور 8 میں شامل ہے۔

مشعل ہدایت

الہ آباد کے تعلیم یافتہ حلقے میں پنڈت دیورتن شرما کی ذات غنیمت تھی۔ ان کی اعلیٰ تعلیم اور خاندانی وقار کی بنا پر گورنمنٹ نے انھیں ایک معزز خدمت پر مامور کرنا چاہا مگرانھوں نے آزادی کو ہاتھ سے دینا مناسب نہ سمجھا۔ ان کے چند خیرخواہ احباب نے بہت سمجھایا کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ سرکاری ملازمت بڑے نصیبوں سے ملتی ہے بڑے بڑے لوگ اس کے لیے ترستے ہیں اور اس کی آرزو لیے دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں اپنے خاندان کا نام روشن کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اسے الہ دین کا چراغ سمجھو۔ ثروت اور اعزاز، اور اختیار، اور شہرت یہ سب اس کے غلام ہیں۔ رہ گئی قومی خدمت! تو بھئی قوم کے لیے تمھیں کیوں مرتے ہو؟ اسی شہر میں بڑے بڑے عالی دماغ، صاحب ثروت اصحاب ہیں جو بنگلوں میں شان سے رہتے ہیں، اور موٹروں پر گردوغبار کا طوفان اڑاتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ کیا وہ قوم کے خادم نہیں ہیں؟ جب ضرورت یا موقع آتا ہے تو وہ قوم کی خدمت کرتے ہیں۔ ابھی جب میونیسپل ووٹ کا معاملہ درپیش تھا تو میوہال کے احاطے میں فٹن اور موٹروں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ اور ہال کے اندر قومی نعروں اور تقریروں کا۔ مگر ان میں سے کون ایسا ہے جس نے اپنے ذاتی فوائد کو بالائے طاق رکھ دیا ہو۔ دنیا کا دستور ہے کہ پہلے گھر میں چراغ جلا کر تب مسجد میں چراغ جلاتے ہیں۔ یہ قومی چرچے کالج ہی کے لیے مخصوص ہیں، یا اس زمانے کے لیے جب تک انسان کو اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ بیکار نہ رہے بیگار ہی کی وجہ سے جب کاروبار چلا گیا تو پھر کہاں کی قوم اور کہاں کے قومی چرچے! یہی سارے زمانہ کا دستور ہے۔ تو تمھیں کو قوم کا قاضی بننے کی کیا ضرورت ہے؟ اور حقیقت تو یہ ہے کہ سرکاری ملازمت میں قومی خدمت کے جتنے موقعے ملتے ہیں اتنے کسی اور حالت میں نہیں مل سکتے۔ ایک رحم دل داروغہ سیکڑوں قوم پرستوں سے بہتر ہے۔ ایک منصف مزاج، فرض شناس، مجسٹریٹ

ہزاروں قومی نعرہ بازوں سے زیادہ قومی خدمت کرسکتا ہے۔ اس کے لیے دل میں لاگ چاہیے۔ انسان جس حالت میں ہو قوم کو کچھ نہ کچھ نفع اپنی ذات سے پہنچا سکتا ہے۔ شرما جی اس آخری دلیل کی اہمیت سے انکار نہ کرسکے۔ مگر قائل ہونے پر بھی ان کے دل کو اطمینان نہ ہو۔ خواہ اصولاً، خواہ محض سہل انکاری اور آرام طلبی کے باعث، جو اکثر ایسی حالت میں قومی خدمت کا درجہ پا جاتی ہے، انھوں نے ملازمت سے دور رہنے ہی کا فیصلہ کیا۔ ان کے اس فیصلے پر کالج کے پُرجوش طلبا نے انھیں مبارک بادیں دیں اور اس قومی فتح پر ایک ڈراما کھیلا گیا۔ جس کے ہیرو شرما جی ہی تھے۔ اونچے حلقوں میں جابجا اس ایثار کی چرچا ہوئی۔ اور شرما جی کو قومی دائرے میں قدم رکھتے ہی خاصی شہرت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ وہ کئی سال سے قوم کی خدمت کرتے تھے۔ اور اس خدمت کا بیشتر حصہ اخباروں کے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا جو بجائے خود ایک اعلا درجے کا قومی کام ہے۔ اس کے علاوہ اخباروں اور رسالوں کے لیے مضامین لکھتے۔ قومی جلسے منعقد کرتے۔ فری لائبریری کے سکریٹری، اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن کے صدر، سوشل سروس لیگ کے اسسٹنٹ سکریٹری اور پرائمری ایجوکیشن کمیٹی کے پُرجوش ممبر تھے۔ قومی رفاہ و فلاح کی تجویزیں شب و روز ان کے دماغ میں گونجا کرتی تھیں۔ زراعت کی ترقی سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ رسالوں میں جہاں کسی نئی کھاد یا نئی پیداوار کا ذکر دیکھتے فوراً سرخ پنسل سے نوٹ کردیتے اور اپنی تقریروں میں اس کا حوالہ دیتے۔ مگر باوجودیکہ شہر سے تھوڑی ہی دور پر ان کا ایک بڑا موضع تھا اپنے کسی اسامی سے روشناس نہ تھے۔ یہاں تک کہ الہ آباد ہی میں گورنمنٹ کے زراعتی فارم کی سیر کرنے کبھی نہ گئے تھے۔

(۲)

اسی محلے میں ایک لالہ بابو لال رہتے تھے۔ ایک وکیل کے محرر تھے۔ تھوڑی سی اردو ہندی جانتے تھے۔ مگر اپنا قانونی کام اچھی طرح کرسکتے تھے۔ وضع و قطع بھدی اور جسم بھی کچھ بہت سڈول نہ تھا مئو کے چار خانے کی لمبی اچکن اس کے بیڈول اور غیرمتناسب جسم پر بہت نظر فریب نہ ہوسکتی تھی۔ جوتا بھی دیسی ہی پہنتے تھے۔ اور باوجودیکہ بے چارے اکثر کڑوے تیل سے اس کی مالش کرتے رہتے تھے وہ اپنی گراں باری کا انتقام لینے سے نہ چوکتا تھا۔ منشی جی سال کے چھ مہینے برابر پیروں میں مرہم لگاتے

رہتے تھے۔ جوتا ان کے پیروں کا محافظ نہیں، ان کی آبرو کا نگہبان تھا۔ اوئل عمر میں کچھ دنوں تک شرما جی ہم سبق رہے تھے۔ اس رشتے سے کبھی کبھی ان کے پاس آیا کرتے۔ شرما جی کو ان کا آنا بہت ناگوار گزرتا۔ بالخصوص جب وہ خوش لباس اور خوش تقریر احباب کی موجودگی میں آجاتے۔ اورنشی جی بھی کچھ ایسے کم نگاہ تھے کہ انھیں اپنا انملاپن مطلق نظر نہ آتا۔ بلکہ ایسے موقعوں پر وہ ضرور آپہنچتے۔ اور سب سے بڑا ستم یہ کہ برابر کرسی پر ڈٹ جاتے۔ جیسے ہنسوں میں کوا۔ اس وقت یہ لوگ انگریزی میں باتیں کرنے لگتے۔ اور بابو لال کو کم فہم، مخبوط الھواس، بدھو، اکسنٹیرک، وغیرہ معزز القاب سے یاد کرتے۔ ان پر پھبتیاں چست کرتے۔ ہاں شرما جی کی یہ شرافت تھی کہ وہ اپنے ناموقع شناس دوست کو حتی الامکان تضحیک سے بچاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بابو لال کو شرما جی سے سچی ارادت تھی۔ ان کی قومی تجاویز کو بڑے غور سے سنتا۔ اور دل میں ان کی پرستش کرتا تھا۔

(۳)

ایک بار الہ آباد میں عین چیت کے مہینے میں پلیگ کا دورہ ہوا۔ رؤسائے شہر نکل بھاگے۔ محلے ویران ہوگئے۔ غربا مکھیوں کی طرح مرنے لگے۔ شرما جی نے بھی سامانِ سفر درست کیا۔ لیکن "سوشل سروس لیگ" کے سکریٹری تھے۔ ایسے موقع پر نکل جانے میں بدنامی کا خوف تھا۔ کسی حیلے کی فکر ہوئی۔ "لیگ" میں زیادہ تر کالج اور اسکول کے طلبا تھے۔ ان کی ایک میٹنگ طلب کی۔ اور یوں قومی خدمت کی تلقین فرمائی۔

"دوستو! آپ اس بدنصیب قوم کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ اس دیوار لرزاں کے سہارے ہیں۔ ہمارے سر پر آج آفت آئی ہوئی ہے۔ ان آفتوں میں ہماری نگاہیں آپ کی طرف نہ اٹھیں تو اور کس طرف اٹھیں گی؟ دوستو! زندگی میں قومی خدمت کے ایسے موقعے نہ ملیں گے۔ ثابت کرو کہ تم مردوں کا دل رکھتے ہو۔ جو حوادثِ روزگار سے نہیں ڈرتا۔ ہاں دنیا کو دِکھا دو کہ ہندستان جس نے بھرت اور ہریش چندر کو پیدا کیا وہ آج بھی ایثار اور قربانی سے خالی نہیں ہے۔ جس قوم کے نوجوانوں میں حرارت اور زندگی ہے وہ قوم دنیا میں ہمیشہ زندہ اور نیک نام رہے گی۔ آیئے ہم کمر ہمت باندھیں۔ بے شک راستہ خطرناک ہے، کام مشکل ہے۔ آپ کو اپنے آرام اور تکلفات اور فیشنبل ظاہرداریوں کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ بعض اوقات تم ہچکوگے، ہٹوگے، اور منھ پھیر لوگے، مگر بھائیو یہ

ہمارے ہاتھ اگر قوم کے کام نہ آئیں تو کس کام کے! اگر یہ ہمارے پیر قوم کی چاکری میں نہ دوڑیں تو کس کام کے! کاش میں اس خدمت میں تمھارا ہاتھ بٹا سکتا! لیکن مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ہی مفصلات میں بھی بیماری کے پھیلنے کی خبریں آئی ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ اپنے دیہات کے بھائیوں کی جو کچھ خدمت ہوسکے وہ انجام دیں مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے قومی فرائض کو دل وجان سے ادا کریں گے۔ اور امید کرتا ہوں کہ واپسی پر میں بھی شاید آپ کی خدمت میں کچھ اضافہ کرسکوں۔"

اس کے بعد پروگرام تیار ہوا۔ مختلف خدمات کے لیے جدا جدا جماعتیں قائم کی گئیں۔ کوئی تیمارداری کے لیے، کوئی دوا فروشی کے لیے، کوئی لاشوں کے جلانے کے لیے یا دفن کرنے کے لیے۔ اس طرح شرما جی نے اپنا گلا چھڑایا۔ اور شام کو اپنے ٹمٹم پر سوار ہوکر اسبابِ سفر لیے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر طبیعت کچھ گری ہوئی تھی۔ اپنی کم ہمتی اور کمزوری پر دل میں نادم تھے۔

سوئے اتفاق سے اسٹیشن پر ان کے ایک بے تکلف دوست مل گئے۔ یہ وہی وکیل صاحب تھے جن کی کرسئ وزارت پر منشی بابولال رونق افروز تھے۔ بھاگے جارہے تھے۔ شرماجی کو دیکھ کر پوچھا "کیوں جناب کہاں کا قصد ہے۔ بھاگ کھڑے ہوئے؟"

شرما جی پر گھڑوں پانی پڑگیا۔ سنبھل کر بولے۔ "بھاگوں کیوں؟"

وکیل صاحب۔ "یہ سارا شہر کس لیے بھاگا جارہا ہے؟"

شرما جی۔ "میں ایسا بزدل، نافرض شناس نہیں ہوں۔"

وکیل صاحب۔ "یار کیوں باتیں بناتے ہو۔ اچھا بتاؤ کہاں جاتے ہو؟"

شرما جی۔ بعض دیہاتوں میں بیماری پھیل رہی ہے وہاں کچھ ریلیف کا کام کروں گا۔

وکیل۔ "سراسر غلط ہے۔ ابھی میں ڈسٹرکٹ گزٹ دیکھے آتا ہوں۔ شہر کے باہر بیماری کا نام بھی نہیں ہے۔"

شرما جی۔ "لاجواب ہوکر بھی بحث کرسکتے تھے۔ دل قائل ہوجائے پر زبان نہ قائل ہوتی تھی۔ بولے ڈسٹرکٹ گزٹ کو آپ وحی سمجھتے ہوں گے۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔"

وکیل۔ "تو کیا آپ کے کان میں فرشتے کہہ گئے۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ جان کے ڈر کے مارے بگٹٹ بھاگا جا رہا ہوں۔"

شرما جی۔ "اچھا بالفرض ایسا ہی سہی۔ تو کیا گناہ کر رہا ہوں سب کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔"

وکیل۔ "ہاں اب آئے راہ پر۔ یہ مردوں کی سی باتیں ہیں۔ اپنی جان بچانا قدرت کا پہلا قانون ہے۔ لیکن اب بھول کر بھی قوم پرستی کا دعویٰ نہ کیجیے گا۔ اس کے لیے آہنی استقلال اور زبردست روحانی طاقت درکار ہے۔ تن پروری اور قوم پرستی میں بُعد المشرقین ہے۔ قوم کا خادم قوم پر مٹ جاتا ہے اپنے تئیں قوم پر نثار کر دیتا ہے۔ تب اسے یہ آسمانی اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ کم سے کم میں اخبار بینی کو قوم پرستی کا درجہ نہیں دے سکتا۔ اب کبھی بڑھ بڑھ کر باتیں نہ کیا کیجیے گا۔ گویا آپ کو اپنے سوائے سارے جہان کو خود غرض، خودپرور، خودمطلب کہنے کا حق حاصل ہے۔"

شرما جی نے اس دریدہ دہنی کا کچھ جواب نہ دیا۔ حقارت سے منھ پھیر لیا۔ اور جاکر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

(۴)

جمنا پار تین اسٹیشنوں کے بعد شرماجی کا ایک موضع تھا۔ مختار صاحب سواری لیے حاضر تھے۔ شرما جی اپنے وکیل دوست کی لعن طعن پر دل میں پیچ وتاب کھاتے اترے۔ وہ حضرت بھی قریب ہی بیٹھے تھے۔ ہنس کر بولے۔ جناب آپ ہی کے گاؤں میں پلیگ آیا ہے۔ چلوں میں بھی قلعی کھولوں۔

شرما جی نے کچھ جواب نہ دیا۔ بہلی پر بیٹھے۔ بیگار حاضر تھے۔ انھوں نے اسباب سر پر لادا۔ چیت کا مہینہ تھا۔ آم کی بور کی خوشبو سے لدی ہوئی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئل کی سہانی کوک سنائی دے جاتی تھی۔ کھلیانوں میں کسان خوشی سے مست ہو ہوکر گارہے تھے۔ پر شرما جی اپنی خفت سے اس درجہ مکدر ہو رہے تھے کہ انھیں ان دل فریبیوں کا احساس ہی نہیں ہوا۔

گاؤں بہت دور نہ تھا۔ شرما جی کے والد مرحوم خوش مذاق آدمی تھے۔ ایک چھوٹا سا باغ، مختصر سا بنگلہ، پختہ کنواں، شیو جی کا مندر، انھیں کی یادگاریں تھیں۔ وہ گرمی کے دنوں میں یہیں چلے آیا کرتے تھے۔ پر شرما جی کو اس موضع میں آنے کا پہلا اتفاق تھا۔

بنگلے میں آسائش کے سامان موجود تھے۔ بہلی سے اترے تو سیکڑوں اسامیوں کو دروازے پر کھڑا پایا۔ پر شرما جی تھکے ہوئے تھے۔ کسی سے مخاطب نہ ہوئے۔

دو گھڑی رات جاتے جاتے شرماجی کے نوکر چاکر بھی ٹمٹم لیے آپہنچے۔ کہار، سائیں، اور مہراج تینوں نے اس شان سے اسامیوں کو دیکھا گویا وہ سب ان کے غلام ہیں۔ سائس نے ایک موٹے تازے کسان سے کہا "گھوڑے کو کھول دو"

غریب کسان ڈرتے ڈرتے گھوڑے کے قریب گیا۔ گھوڑے نے اجنبی صورت دیکھی۔ تیور بدلے، کنوتیاں کھڑی کیں، کسان ڈرکر لوٹ آیا۔ تب سائس نے اس کو دھکا دے کر کہا۔ بس بچھیا کے تاؤ ہی ہو۔ ہل جوتنے سے کیا اکل بھی چلی جاتی ہے۔ یہ لو گھوڑے کو ٹہلاؤ۔ منھ کیا بناتا ہے۔ کیا کوئی سنگھ ہے جو کھا جائے گا۔ کسان نے ڈرتے ڈرتے راس پکڑی۔ غریب کی سہمی، رونی صورت دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ قدم قدم پر خائف نگاہوں سے گھوڑے کی طرف دیکھتا اور اس طرح ڈرتا تھا۔ گویا پولیس کا سپاہی ہے۔ رسوئیں بنانے والے مہراج نے فرمایا۔ ارے نائی کہاں ہے چل پانی وانی لا۔ ذرا پیر دبا دے تھک گیا ہوں۔

مختار صاحب ان مہمانوں کی ضیافت کا انتظام کرنے لگے۔ سائیس اور کہار کے لیے پوریاں پکوائیں۔ مہراج کے لیے بوٹی بھنگ مہیا کی۔ اشارے پر دوڑتے تھے۔ اور کسانوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ وہ تو بن داموں کے غلام تھے۔ سچی اور آزاد محنت کی کمائی کھانے والے کسان اس وقت غلاموں کے غلام بنے ہوئے تھے۔

(۵)

کئی دن گزر گئے۔ شرما جی اپنے بنگلے میں بیٹھے ہوئے اخبار اور کتابیں پڑھا کرتے۔ ہالینڈ کی زراعت، امریکہ کی صنعت، جرمنی تعلیم کی اعداد اور نقشے ان کے پیش نظر رہتے۔ گاؤں میں ایسا کون تھا جس سے وہ حظِ صحبت حاصل کرسکتے۔ بیشک کسانوں سے بات چیت کرنے کا انھیں شوق تھا۔ مگر یہ اجڈ، اکھڑ، کسان نہ معلوم کیوں ان سے محترز رہتے۔ شرما جی کا دماغ زراعتی معلومات کا ذخیرہ تھا۔ وہ کسانوں کو اپنے اس ذخیرے سے فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔ لیکن یہ گنوار ان سے ملتفت ہی نہ ہوتے۔ وہ انھیں جھک کر سلام ضرور کرتے۔ اور تب کترا کر نکل جاتے جیسے کوئی پاگل کتے سے بچ کر نکل جائے۔ اس امر کا

فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ شرما جی کے ان سے ہمکلام ہونے کی خواہش کا کیا راز تھا۔ خالص ہمدردی یا اپنی ہمہ دانی کا اظہار!

شرما جی کی ڈاک شہر سے لانے اور لے جانے کے لیے دو آدمی روز روانہ کیے جاتے۔ ''وہ لوئی کونے'' کے طرز علاج کے قائل تھے۔ سبزی اور میوے زیادہ استعمال کرتے۔ ایک آدمی اس کام کے لیے بھی دوڑایا جاتا۔ شرما جی نے اپنے مختار کو سخت تاکید کردی تھی کہ کسی سے مفت کام نہ لیا جائے۔ اسے مناسب مزدوری دی جایا کرے۔ پھر باوجود اس کے انھیں تعجب ہوتا تھا کہ کوئی آدمی خوشی سے ان کاموں کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔ روز باری باری سے اسامی بھیجے جاتے۔ وہ اسے بھی ایک قسم کی بیگار سمجھتے۔ مختار صاحب کو اکثر سختی سے کام لینا پڑتا۔ شرما جی کاشتکاروں کی اس تامل اور تساہلی کو متمردی اور کج خلقی کے سوا اور کسی خیال سے منسوب نہ کرسکتے۔ کبھی کبھی خود بھی کنوار کے بادلوں کی طرح اپنے گوشۂ عافیت سے نکل کر ان پر برس پڑتے۔ گھوڑے کے لیے چارے کا انتظام بھی تردد سے خالی نہ تھا۔ روز شام کے وقت جبروتشدد کی بانگِ بلند کے ساتھ بین و بکا کی دبی ہوئی سسکیاں ان کے کان میں آتیں۔ ایک کہرام سا مچ جاتا۔ لیکن اس معاملے میں بھی وہ اپنے تئیں معذور سمجھتے۔ گھوڑا بھوکوں نہیں مرسکتا۔ گھاس کا دام دیا جاتا ہے۔ اس پر بھی اگر واویلا مچتا ہے تو مچے۔ اس کی دوا میرے پاس نہیں۔ ان کے دل میں یہ گمان پختہ ہوتا جاتا تھا کہ یہ دیہاتی بڑے سرکش، جبر پسند، اور متمرد ہیں۔ مختار عام صاحب ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اس میں سرمو فرق نہیں ہے۔ اخباروں اور تقریروں میں فضول اس قدر شور و شر مچایا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس سے زیادہ ہمدردی کے مستحق نہیں۔ اور جو لوگ ان کی بے کسی اور پستی کا راگ الاپتے ہیں وہ حقیقت حال سے بے خبر ہیں۔

ایک روز شرما جی بیٹھے بیٹھے اکتا کر سیر کرنے نکلے۔ اور گھومتے گھامتے کھلیان کی طرف نکل گئے۔ آموں کی جھرمٹ میں کسانوں کی گاڑھی محنت کے سنہرے انبار لگے ہوئے تھے۔ چاروں طرف بھس کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ حلقۂ ماہ کی طرح زمین پر جو اور گیہوں کے ڈنٹھلوں کے حلقے بنے ہوئے تھے۔ بیلوں کے منہ میں جالی نہ تھی۔ وہ جب چاہتے تھے بھوسے میں منہ ڈال کر اناج کا ایک گال کھا لیتے تھے۔ یہ سب انھیں کے پسینے

کی کمائی ہے۔ آج ان کے منھ میں جالی دینا ناشکری ہے۔ جابجا اناج کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ گاؤں کا دھوبی اور چمار اور بڑھئی اور کمھار صورتِ امید کھڑے تھے۔ ایک طرف نٹ ڈھول بجا بجا کر اپنے کرتب دکھا رہا تھا۔ بھاٹ کی طبع موزوں آج مد اکبر پر تھی۔ شرما جی اس نظارے سے بہت خوش ہوئے۔ مگر اس ہنگامۂ مسرت میں ان کی نگاہ اپنے کئی سپاہیوں پر پڑی جو لٹھ لیے اناج کے ڈھیروں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ سہانے سبزہ زار میں ٹھونٹھ جتنا بدنما معلوم ہوتا ہے۔ نغمۂ دلپذیر میں بے سری آواز جس طرح کانوں کو ناگوار گزرتی ہے اسی طرح شرما جی کی پُر ذوق نگاہوں میں یہ منڈلاتے ہوئے سپاہی نظر آئے۔ انھوں نے قریب جاکر ایک سپاہی کو بلایا۔ سب کے سب پگڑیاں سنبھالتے ہوئے آکر کھڑے ہوگئے۔ شرما جی نے پوچھا۔ تم لوگ یہاں اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ سرکار ہم لوگ اسامیوں کے سر پر سوار نہ رہیں تو ایک کوڑی لگان نہ وصول ہو۔ اناج گھر میں جانے کی دیر ہے۔ پھر تو یہ سیدھے بات نہ کریں گے۔ بڑے سرکش لوگ ہیں۔ ہم لوگ رات کو یہیں رہتے ہیں۔ اتنے پر بھی جہاں آنکھ جھپکی ڈھیر غائب ہوا۔

شرما جی۔ ”آخر تم لوگ یہاں کب تک رہوگے؟“

سپاہی۔ ”جب تک سرکاری جمع کوڑی وصول نہ ہوجائے گی۔ ہم لوگ بیے کو بلا کر اپنے سامنے اناج تو لاتے ہیں۔ جو کچھ ملتا ہے اس میں سے سرکاری رقم کا ٹکر اسامی کو دیتے ہیں۔

شرما جی نے سوچا جب یہ کیفیت ہے تو ان کسانوں کی حالت کیوں نہ خراب ہو۔ غریب اپنے دھن کے مالک خود نہیں ہیں۔ یہ اسے اپنے پاس رکھ کر زیادہ بہتر موقع پر نہیں بیچ سکتے۔ اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟ بالفرض میں اس وقت ان کے ساتھ رعایت کردوں، لیکن لگان نہ وصول ہوئی تو کاش ہالینڈ کی زراعتی سوسائٹیاں یہاں ہوتیں! شرما جی کے دل میں کسانوں کی متمردی کا جو خیال پیدا ہوچلا تھا اس میں اس نظارے نے کچھ خفیف سی ترمیم کردی۔

اس مسئلے کو سوچتے ہوئے وہ یہاں سے چل دیے۔ سپاہیوں نے ساتھ چلنا چاہا۔ لیکن انھوں نے منع کردیا۔ جلوس سے انھیں الجھن ہوتی تھی۔ اکیلے گاؤں میں گھومنے

لگے۔ گاؤں کیا تھا ملیریا اور غلاظت کا مرکز تھا۔ انا فیلی(۱) کی رقص گاہ۔ کولکس(۲) کی عملداری۔ اور اسٹگومایا(۳) کا میدانِ قتال! کہیں گوبر کے ڈھیر، کہیں کوڑے کا انبار، ہوا میں عفونت، مکانات اکثر بوسیدہ، دیواریں چھپر کے بوجھ سے زمین میں دھنسی ہوئی، پرنالوں کا پانی چاروں طرف بہتا ہوا۔ شرما جی نے ناک بند کری اور تیزی سے قدم بڑھانے لگے۔ دم گھٹنے لگا تو دوڑے خوب زور سے اور ہانپتے ہوئے ایک سایہ دار نیم کے درخت کے نیچے آکر کھڑے ہوگئے۔ اور ابھی اچھی طرح سانس نہ لینے پائے تھے۔ کہ بابو لال آکر کھڑے ہوگئے۔ اور ابھی اچھی طرح سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ بابو لال نے آکر پالاگن کیا۔ اور پوچھا "کیا کوئی سانڈ وانڈ تھا کیا؟"

اس موضعے میں بابو لال بھی آدھ آنے کے حصے دار تھے۔ تعطیلوں میں یہیں چلے آیا کرتے تھے۔ پلیگ کے وجہ سے کچہری بند ہوگئی تھی۔ اس لیے چلے آئے تھے۔

شرما جی بولے۔ "سانڈ سے بھی زیادہ ہولناک گندہ ہوا تھی۔ اف! یہ لوگ یہاں کیسے رہتے ہیں؟"

بابو لال۔ "رہتے کیا ہیں زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔"

شرما جی۔ "مگر یہ مقام تو صاف نظر آتا ہے۔"

بابو لال۔ "جی ہاں اس طرف گاؤں کے کنارے تک صاف جگہ ملے گی۔"

شرما جی۔ "تو پھر اس طرف کیوں اتنی گندگی ہے؟"

بابو لال۔ گستاخی معاف ہوتو عرض کروں۔"

شرما جی(ہنس کر) جان بخشی کیوں نہ کروائی۔ واقعی کیا بات ہے؟ ایک طرف ایسی صفائی دوسری طرف ایسی غلاظت؟"

بابو لال۔ "یہ میرا حصہ ہے۔ وہ آپ کا حصہ ہے۔ میں اپنے حصے کی نگرانی خود کرتا ہوں، آپ کا حصہ ملازموں کی توجہ پر ہے۔"

شرما جی۔ "اچھا! یہ بات ہے! آخر آپ کیا حکمت کرتے ہیں؟"

بابو لال۔ "کچھ نہیں صرف تاکید کرتا رہتا ہوں۔ جہاں زیادہ گندہ پن دیکھتا ہوں خود صاف کردیتا ہوں۔ صفائی کا ایک انعام مقرر کردیا ہے۔ جس کا مکان سب سے زیادہ صاف ہوتا ہے اس کو یہ انعام ملتا ہے۔ آیئے تشریف رکھیے۔"

شرما جی کے لیے ایک کرسی رکھ دی گئی۔ آکر بیٹھ گئے اور بولے شاید آج ہی آئے ہو؟

بابو لال۔ ”جی ہاں پلیگ نے کچہریوں پر بھی اثر کیا۔“

شرما جی۔ ”شہر کی کیا کیفیت ہے؟“

بابو لال۔ بہت خراب۔ بیماری بڑھتی جاتی ہے۔ سوشل سروس والے آپ کے آتے ہی غائب ہوگئے۔ غریبوں کے گھروں میں لاشیں پڑی سڑتی ہیں۔ میونسپلٹی والے بھی جان بچاتے پھرتے ہیں۔ بازاریں بند ہیں اناج مشکل سے ملتا ہے۔“

شرما جی۔ ”بھلا بتلایے ایسی حالت میں وہاں رہ کر کیا کرتا۔ بس لوگوں نے میری ہی جان سستی سمجھ رکھی ہے کیا ایک مجھ ہی کو قومی خدمت کا دعویٰ ہے؟ جسے دیکھو وہی تو قومی شہید بنا پھرتا ہے۔ جو لوگ ہزاروں روپے عیش اور تکلف میں اڑاتے ہیں ان کا شمار بھی قومی فدائیوں میں ہے۔ میں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہوں۔ آخر میں بھی انسان ہوں، کوئی دیوتا نہیں، فرشتہ نہیں۔ دولت کی ہوس نہ سہی، مگر قومی اعزاز کی ہوس مجھے بھی ہے۔ میں جو شب و روز اخبار بینی میں صرف کروں، اخباروں کے لیے مضامین لکھنے میں سر کھپاؤں، جابجا تقریریں کرتا پھروں، اس کا صلہ بس یہی کافی سمجھا جاتا ہے کہ جب کسی سیٹھ جی یا وکیل صاحب کے درِ دولت پر حاضر ہوجاؤں تووہ ایک مربیانہ انداز سے میری مزاج پرسی کرلیں۔ لیکن جب کوئی ممبری خالی ہوتی ہے تو نظرِ انتخاب فوراً کسی وکیل صاحب پر جا پڑتی ہے۔ جنھیں بجز اپنی ذاتی ثروت کے اس اعزاز کا کوئی استحقاق نہیں۔ تو بھی جو گڑ کھائے وہ کان چھدائے۔ قومی سرفروشی کا بہترین صلہ قومی اعزاز ہے۔ جب وہاں تک میری رسائی ہی نہیں تو کیوں جان دوں؟ اگر یہ آٹھ سال میں نے لکشمی کی پوجا میں صرف کیے ہوتے تو غالباً اب تک میرا شمار بھی لیڈروں میں ہوتا ورنہ ابھی تک چھٹ بھیوں میں سمجھا جاتا ہوں۔ جہاں دیکھو وہاں دولت کی پوچھ اور قدر ہے۔ ابھی میں نے کتنی محنت سے زراعتی بینک پر مضمون لکھا۔ مہینوں اس کی تیاری میں صرف کیے۔ سیکڑوں میگزین اور رسالے پڑھنا پڑے مگر کسی نے اس مضمون کو پڑھنے کی بھی تکلیف نہ گوارا کی۔ اگر اتنی محنت کسی اور

کام میں صرف کرتا تو کم سے کم اپنا بھلا تو ہوتا۔ نہیں تو بھاڑ لیپ کر ہاتھ کالا کرنے کے سوا اور کیا نتیجہ ہوا؟"

بابو لال۔ "آپ کا فرمانا بجا ہے۔ مگر جب آپ جیسے لوگ ایسے خیالات کو دل میں جگہ دیں گے تو یہ قوم کا بیڑا کون پار لگائے گا؟"

شرما جی۔ "وہی جو آنریبل بنے گھومتے ہیں۔ بندہ تو اب سیر و سیاحت کرے گا۔ دنیا کی ہوا کھائے گا بابولال نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا یہ تو بتلایے دیہات کو آپ نے پسند کیا؟"

شرما جی۔ "پسند نہیں خاک کیا۔ ہاں کچھ نئے تجربے البتہ ہوگئے۔ خیال تھا کہ کاشتکار لوگ بڑے غریب اور بیکس ہوتے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ لوگ موٹے نامہمان نواز اور جبر پسند ہیں۔ سیدھے سے بات نہ سنیں گے۔ مگر سختی سے جو کام چاہو کر والو بس چوپایوں کا خاصہ ہے۔ اور تو اور مالگذاری کے لیے بھی ان کے سر پر سوار رہنے کی ضرورت ہے۔ ٹل جاؤ تو کوڑی نہ وصول ہو۔ نالش کیجیے قرقی کرایئے بے دخلی کیجیے۔ خود زیر بار ہوکر انھیں زیر بار کیجیے۔ یہ سب انھیں منظور ہے۔ پر وقت پر روپیہ دینا نہیں جانتے۔ یہ سب تجربہ میرے لیے نئے ہیں۔ مجھے اب تک ان سے جو ہمدردی تھی۔ وہ اب نہیں ہے اخباروں میں ان کے حالِ زار پر جو مرثیے گائے جا رہے ہیں وہ بالکل خیالی اور فرضی ہیں۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟"

بابو لال۔ "مجھے تو اب تک اس قسم کی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے خلیق، احسان شناس اور بامروت ہیں۔ ہاں ان کے یہ اوصاف سطح پر نہیں نظر آتے۔ ان سے ہمدردی کیجیے۔ ملیے۔ ان کے دل میں گھسیے۔ تب ان کے جوہر کھلتے ہیں۔ ان پر اعتبار کیجیے تب وہ آپ پر اعتبار کریں گے۔ آپ کہیں گے پیش قدمی کرنا ان کا کام ہے۔ اور آپ کا یہ کہنا درست ہے۔ پر صدیوں سے انھوں نے اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ ان میں آزادانہ اوصاف سلب ہوگئے ہیں۔ زمیندار کو وہ ایک ہوا سمجھتے ہیں جس کا کام انھیں نگل جانا ہے۔ چونکہ وہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اس لیے مکروفریب سے کام لیتے ہیں جو کمزوروں کی سپر ہے۔

لیکن ایکبار آپ ان کی نگاہ میں اپنا اعتبار جما دیجیے۔ اور پھر آپ کو شکایت کا کوئی موقع نہ رہے گا۔"

بابو لال "یہ باتیں کہہ ہی رہے تھے کہ چماروں نے گھاس کے گٹھے لاکر ان کے دروازے پر ڈال دیے۔ اور چپ چاپ چلے گئے۔ شرما جی کو تعجب ہوا۔ اسی گھاس کے لیے ان کے بنگلے پر روز ہائے وائے مچتی ہے۔ اور یہاں کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ پوچھا۔ "آخر اعتبار جمانے کی بھی کوئی ترکیب ہے؟"

بابو لال نے منکسرانہ انداز سے کہا۔ آپ خود عاقل اور زمانہ شناس ہیں۔ میرا آپ کے روبرو زبان کھولنا گستاخی ہے۔ میں تو اس کی ایک ہی ترکیب جانتا ہوں۔ انھیں کسی تکلیف میں دیکھ کر فوراً ان کی مدد کیجیے۔ میں نے انھیں کے لیے ہومیوپیتھی سیکھی اور ایک چھوٹا موٹا شفاخانہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ اگر کبھی روپے کی ضرورت ہوتی ہے تو روپے، اناج کی ضرورت ہوتی ہے تو اناج دیتا ہوں، پر سود نہیں لیتا۔ اس میں مجھے خسارہ ہرگز نہیں ہوتا۔ دوسری صورتوں میں سوا سے بھی بہت زیادہ مل رہتا ہے۔ گاؤں میں دو اندھی عورتیں اور دو یتیم لڑکیاں ہیں۔ ان کی پرورش کا انتظام کردیا ہے۔ ہوتا سب کسانوں ہی کی کمائی سے ہے۔ پر نیک نامی مجھے ہوتی ہے۔

اتنے میں کئی اسامی آئے اور بابو لال سے بولے۔ "بھیا! باکی لے لی جائے۔"

بابو لال نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ وہ روپے رکھ کر چل دیے۔ شرما جی نے سوچا، اسی لگان کے لیے میرے چپراسی کھلیان میں چارپائیاں ڈال کر سوتے ہیں اور وہی لگان یہاں اس طرح بے خرخشہ وصول ہورہا ہے۔ بولے یہ تو اسی حالت میں ہوسکتا ہے۔ جب زمیندار خود گاؤں میں رہے۔

بابولال۔ "جی ہاں اور کیا۔ اور محض رہنے ہی سے کیا ہوگا۔ اس کی نیت صاف ہو، طبیعت میں ہمدردی کا مادہ ہو۔ حریص، خودغرض، اور ظالم نہ ہو۔ ورنہ اس کا گاؤں سے دور رہنا ہی اچھا۔ ہاں بڑے بڑے زمینداروں کو البتہ یہ دقت ہوتی ہے کہ بعض اوقات وہ نیت صاف رکھنے پر بھی اپنے اسامیوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے کیوں کہ ان کے ملازم کچھ کا کچھ کیا کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر آقا کسی کام کو دل سے کرنا چاہے تو اس کے ملازم جلد یا دیر میں ضرور اس کی راہ پر چلنے لگتے ہیں۔ ہاں اگر آقا میں خود ہی کمزوری باقی ہے۔ نیت کا صاف ہے لیکن ارادے کی

قوت اور فیصلے کی ہمت نہیں رکھتا تو ملازموں کی بن آتی ہے۔ وہ اسے اپنے ڈھرّے پر کھینچ لے جاتے ہیں۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شرما جی کے کہار نے اطلاع دی کہ رسوئیں ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ چل کر جیم لیجیے۔

(۶)

شرما جی یہاں سے اٹھے تو بابو لال کی باتیں ان کے کان میں گونج رہی تھیں۔ ان کے معقول ہونے میں شک نہ تھا۔ لیکن شرما جی اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ آدمی تھے اور کسی بات کو خود وہ بظاہر کیسی ہی معقول کیوں نہ ہو بغیر استدلال اور توجیہ کے تسلیم نہیں کرسکتے تھے۔ بابو لال کو وہ ہمیشہ ایک معمولی عقل کا انسان سمجھتے آئے تھے اور اس خیال میں یکبارگی تغیر ہونا ممکن نہ تھا۔ ان باتوں کا الٹا اثر یہ ہوا کہ انھیں بابو لال سے کچھ چڑھ سی ہوگئی۔ انھیں ایسا معلوم ہوا گویا وہ زمینداری کے معاملات میں اپنی فضیلت کا اظہار کرتا ہے۔ جس شخص نے ہمیشہ دوسروں کی تعلیم و تنبیہ کی ہو وہ بابو لال جیسے آدمی کا معتقد کیوں کر ہوسکتا۔ وہ اپنے بنگلے کو لوٹنے لگے تو ان کا استدلال بابو لال کی باتوں کے پرزے پرزے کر رہا تھا۔ خوب! اب میں دیہات میں آکر رہوں، ساری زندگی کی آرزوؤں سے ہاتھ دھولوں، دہقانوں کے ساتھ بیٹھا گپیں اڑاؤں، گھڑی آدھ گھڑی خیر دل بہلاؤ کے طور پر ان سے بات چیت کرنا ممکن ہے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ دس پانچ گنوار میرے سر پر سوار رہیں۔ مجھے تو مالیخولیا ہوجائے گا۔ مانا کہ میرا فرض ان کی خبر گیری ہے، پر یہ نہیں ہوسکتا کہ ان کے لیے میں اپنے تئیں بدل ڈالوں، بابو لال بننا اب میرے امکان سے باہر ہے، جس کی پروازِ فکر اس گاؤں کے احاطے سے باہر نہیں جاسکتی۔ مجھے دنیا میں بہت کام کرنا ہے، میرے لیے یہ زندگی ناموزوں ہی نہیں، بلکہ مہلک ہے!

یہی سوچتے ہوئے وہ بنگلے پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کئی کانسٹبل مغرورانہ انداز سے برآمدے میں لیٹے ہوئے ہیں۔ مختارِ عام نے شرما جی کو دیکھتے ہی بڑھ کر کہا۔ حضور! آج داروغہ جی آگئے ہیں۔ میں نے کمرے میں ان کے پلنگ بچھوا دیے ہیں۔ یہ لوگ جب اس علاقے میں آجاتے ہیں تو یہیں قیام کرتے ہیں۔ حضور کا پلنگ اوپر بچھا ہوا ہے۔"

شرما جی اپنے دوسرے اخبار نویس بھائیوں کی طرح پولیس سے بغض للہ رکھتے تھے۔

یہ باتیں سنتے ہی ان کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ خشمگیں نگاہوں سے مختار صاحب کی طرف دیکھا اور دل میں یہ ٹھان کر کہ ابھی ان حضرات کا بوریا بدھنا اٹھاکر پھینک دیتا ہوں، تیور بدلے، جھپٹتے ہوئے برآمدے میں پہنچے کہ چھوٹے داروغہ جی ٹھاکر کوکلت سنگھ نے کمرے سے نکل کر پالاگن کیا اور ہاتھ بڑھا کر بولے "اچھی ساعت سے چلا تھا کہ آپ سے نیاز ہوگیا۔ آپ مجھے بھول تو نہ گئے ہوں گے۔

یہ حضرت دو سال قبل سوشل سروس لیگ کے ایک سرگرم ممبر تھے۔ انٹرمیڈیٹ کلاس میں فیل ہوجانے کے بعد پولیس ٹریننگ میں داخل ہوگئے تھے۔ شرماجی نے انھیں دیکھا، پہچان گئے۔ ہاتھ بڑھا دیا۔ غصہ فرو ہوگیا۔ مسکرانے کی کوشش کرکے بولے۔ حافظہ تو ذی اختیار لوگوں کا کمزور ہوتا ہے۔ میں تو آپ کو دور ہی سے پہچان گیا۔ کہیے کیا اسی تھانے میں تعینات ہوئے کیا؟

کوکلت سنگھ۔ "جی ہاں۔ آج کل یہیں ہوں۔ آیئے آپ کو داروغہ جی سے انٹروڈیوس کرا دوں، اندر آرام کرسی پر داروغہ ذوالفقار خاں لیٹے ہوئے حقہ پی رہے تھے قوی ہیکل آدمی تھے۔ چہرے سے رعب اور تحکم نمایاں تھا۔ شرما جی کو دیکھتے ہی اٹھ کر ہاتھ ملایا اور بولے آپ سے نیاز حاصل کرنے کا شوق مدت سے تھا۔ آج خوش نصیبی سے موقع بھی مل گیا۔ اس تعرف بیجا کو معاف فرمایے گا۔

شرما جی کو تجربہ ہوا کہ پولیس کے لوگ خواہ مخواہ کج خلق مشہور ہیں۔ ہاتھ ملاکر بولے یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ یہ آپ کا خانۂ بے تکلف ہے۔

لیکن پولیس پر چھینٹے جمانے کا ایسا نادر موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہتے تھے۔ کوکلت سنگھ سے بولے۔ آپ نے تو شاید پچھلے سال کالج چھوڑا۔ لیکن پولیس میں کیوں کر آپھنسے؟

داروغہ ذوالفقار خان یہ للکار سن کر سنبھل بیٹھے اور بولے۔ کیوں جناب! کیا پولیس ہی سارے محکموں سے گیا گزرا ہے۔ ایسا کون سا محکمہ ہے جہاں رشوت کا بازار گرم نہیں؟ اگر آپ کسی ایسے محکمے کا نام بتا دیجیے تو تا زیست غلامی کروں۔ ملازمت کرکے کوئی رشوت سے بچ جائے یہ محال ہے۔ تعلیم کے محکمے کو بے لوث کہا جاتا ہے۔ مگر اس کا بھی تجربہ ہوگیا۔ ایڈیٹر لوگ بڑے پاک و صاف بنتے ہیں، مگر ان کی بھی تھاہ لے چکا۔

شفاخانے کا محکمہ پاک سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میں حلف اٹھا سکتا ہوں کہ پولیس سے وہ کسی معنی میں بہتر نہیں۔ اب میں کسی کے راست بازی کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کرسکتا اور دوسرے محکموں کی نسبت تو نہیں کہہ سکتا، لیکن پولیس کے محکمے میں جو رشوت نہیں لیتا اسے میں احمق سمجھتا ہوں۔ میں نے دو ایک راست باز سب انسپکٹر دیکھے ہیں۔ لیکن ہمیشہ تباہ۔ کبھی معطل، کبھی برخاست۔ جو شخص خود نہ کھائے گا۔ وہ دوسروں کو کیوں کھانے دے گا۔ لیکن چوکیدار اور کانسٹبل ہمارے دست و بازو ہیں۔ انھیں کی کارگذاری اور جان فشانی پر ہماری نیک نامی کا دار و مدار ہے۔ جب وہ خود پریشان حال ہوں گے تو کام کیا خاک کریں گے۔ جو لوگ خود ہاتھ بڑھا کر لیتے ہیں وہ دوسروں کو بھی کھلاتے ہیں اور افسروں کو بھی خوش رکھتے ہیں۔ ان کا شمار کارگذار اور نیک نام افسروں میں ہوتا ہے۔ میں نے تو اپنا یہی اصول مقرر کرلیا ہے اور خدا کا شکر ہے افسر اور ماتحت سبھی خوش ہیں۔

شرما جی نے کہا۔ انھیں وجوہ سے تو میں نے ٹھاکر صاحب سے کہا کہ آپ یہاں کیوں کر آپھنسے۔"

ذوالفقار خان تیز ہوکر بولے۔ "پھنسے نہیں یہاں آکر پاس ہوگئے ورنہ کسی دوسرے صیغے میں ہوتے تو ٹھوکریں کھایا کرتے پھرتے۔ اب گھوڑے پر سوار نوشہ بنے گھومتے ہیں۔ ہاں ذرا ابھی تنہا خوری کی عادت ہے، وہ رفتہ رفتہ دور ہوجائے گی۔ بھئی ٹھاکر صاحب برا نہ مانیے گا۔ میں نے کئی نئے ٹریننگ والوں کو دیکھا۔ یہ حضرات چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہے اکیلے ہی ہضم کرلیں۔ چپکے چپکے لیتے ہیں۔ تھانے کے دیگر اہل کار منھ تاکتے رہ جاتے ہیں۔ دنیا کی نگاہ میں ایماندار بنا چاہتے ہیں۔ ایماندار بنتے ہو تو دل سے بنو، اس مکاری سے کیا حاصل ہے۔ جب خدا ہی کا خوف نہیں تو دنیا کا کیا ڈر۔ یہ حضرات چھوٹی چھوٹی رقموں پر گرتے ہیں۔ مارے غرور کے کسی دیرینہ آدمی سے تجربہ حاصل نہ کریں گے۔ جہاں آسانی سے سو مل سکتے ہیں وہاں پانچ میں بلبل ہوجاتے ہیں۔ کہیں دودھ والے کی قیمت مار لی۔ کہیں مودیوں سے نرخ کے بارے میں دردسری کی۔ کہیں حجام کے پیسے دبا لیے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے فائدہ تو بہت کم ہوتا ہے بدنامی البتہ بہت۔ میں بڑے بڑے شکاروں پر نگاہ رکھتا ہوں۔ پدّی اور بیٹر ماتحتوں کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ اور حق تو یہ ہے غرض بری شے ہے! رشوت دینے والوں سے زیادہ احمق، اندھے آدمی دنیا میں نہ

ہوں گے۔ کتنے ہی ایسے باولے آتے ہیں جو محض یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے کسی پٹی دار یا رقیب کو دوچار جھڑپ سنا دوں۔ اتنے ہی کے لیے مجھے سیکڑوں روپے دے جاتے ہیں۔ ایسے عقل کے دشمنوں پر رحم کرنا حماقت ہے۔ اس علاقے کو ضلع میں کان جواہر کا خطاب ملا ہوا ہے۔ سب انسپکٹر لوگ اس کے عاشق ہیں۔ ایک نہ ایک فساد روز برپا ہوتا رہتا ہے۔ زمیندار نرے جاہل، لٹھ، ذرا ذرا سی بات پر فوجداریاں کر بیٹھتے ہیں۔ بس سارے علاقے میں یہی آپ کا پٹی دار بابو لال البتہ سمجھدار آدمی ہے۔ اس کے یہاں کسی کی دال نہیں گلتی۔ اور لطف یہ ہے کہ کوئی اس سے ناخوش نہیں۔ بس میٹھی میٹھی قندوشکر کی سی باتوں سے من بھر دیتا ہے۔ اپنے اسامیوں کے لیے جان دینے کو حاضر۔ اور حق یہ ہے کہ میں زمیندار ہوتا تو اسی کے نقشِ قدم پر چلتا۔ زمیندار کا فرض ہے کہ اپنے اسامیوں کو ظلم و ستم سے بچائے، ان پر شکاریوں کا وار نہ ہونے دے۔ یوں حرص یا ضرورت سے مجبور ہو کر انسان کیا نہیں کر ڈالتا۔ لیکن ان غریب بیکسوں کی حالت واقعی قابل رحم ہے۔ اور ان کے لیے جو شخص سینہ سپر ہو اس کی داد دینی چاہیے۔"

شرما جی نے داروغہ صاحب کی اس طولانی تقریر کو اس طرح سنا گویا وہ کسی مجذوب کی بکواس ہے۔ ظالمانہ صاف گوئی، اور ستم ظریفانہ انداز، اور رقیق انسانیت کے ساتھ برہنہ خودغرضی نے اس میں ایک خاص لطافت پیدا کردی تھی۔ ایسی تقریر کا جواب دینے کی کوشش کرنا بے سود تھا۔ بولے کیا کوئی تفتیش درپیش ہے یا محض گشت؟

داروغہ جی نے فرمایا۔ "جی نہیں مٹرگشت؟ آج کل فصل کے دن ہیں۔ اور یہی زمانہ ہماری فصل کا بھی ہے۔ شیر کو بھی تو ماند میں بیٹھے بیٹھے شکار نہیں ملتا۔ ہم بھی شکار کی تلاش میں گھوم رہے ہیں۔ خفیہ فروش کو گرفتار کریں گے، کسی کو سرقے کا مال خریدتے ہوئے پکڑیں گے۔ اور اگر ہمارے نصیب سے کہیں ڈاکہ پڑ گیا تو ہماری پانچوں گھی میں ہیں۔ علاقے میں جتنے شری، فتنہ باز، سیاہ قلب دو پائے ہیں وہ سب اپنے تابع فرمان ہیں۔ آپ میری صاف گوئی پر حیران ہوں گے۔ لیکن میں اپنے سارے ہتھکنڈے بیان کردوں تو شاید آپ کو یقین نہ آئے ۔ اور لطف یہ ہے کہ میرا شمار ضلع کے نہایت ہوشیار، متدین، اور کارگزار سب انسپکٹروں میں ہے۔ فرضی ملزم بھی پکڑتا ہوں، مگر سزا میں اصلی دلواتا ہوں، میری فراہم کی ہوئی شہادتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بیرسٹر کا باپ بھی ہو تو ناکوں چنے چبائے۔

اس اثنا میں شہر سے ڈاک آگئی۔ شرما جی اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ "داروغہ جی آپ کی باتیں بڑی وزن دار ہوتی ہیں۔ اب اجازت دیجیے۔"

(۷)

چاندنی رات تھی۔ شرماجی کھلی چھت پر لیٹے ہوئے اخبار پڑھنے میں غرق تھے۔ اخبار ان کے لیے دعوتِ روح تھی۔ اس میں انھیں نغمہ اور بہار کا لطف حاصل ہوتا تھا۔ دفعتاً ایک ہلچل سن کر نیچے جھانکا تو کیا دیکھتے ہیں کہ گاؤں کے ہرطرف سے کسانوں کے غول کے غول کانسٹبلوں کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ رہ رہ کر کانسٹبلوں کی گالی گلوچ بھی سنائی دیتی تھی۔ یہ سب آدمی بنگلے کے سامنے صحن میں بیٹھتے جاتے تھے۔ کہیں کہیں سے عورتوں اور بچوں کے رونے اور چیخنے کی پُر زور آوازیں کان میں آرہی تھیں۔ شرما جی حیران تھے کہ کیا ماجرا ہے۔ دفعتاً بڑے داروغہ صاحب کی گرج سنائی دی۔ "تم لوگوں کو تھانہ چلنا ہوگا۔ ہم ایک نہ مانیں گے۔"

پھر سناٹا ہوگیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسانوں میں کان پھوسی ہو رہی ہے۔ اس کے بعد ایک کہرام سا مچ گیا۔ مختار صاحب داروغہ جی کی مغلظات اس گریہ و زاری یوں سنائی دیتی تھی۔ جیسے آندھی میں بادل گرج۔

شرما جی سے اب صبر نہ ہوسکا وہ زینے کے دروازے پر آئے اور کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ میز پر روپے گنے جا رہے تھے۔

داروغہ صاحب بولے۔ "اتنے بڑے موضع میں یہ رقم!"

مختار صاحب نے جواب دیا۔ "گھبرائیے نہیں۔ اب کی مکھیوں کی خبر لی جائے۔"

یہ کہہ کر مختار صاحب نے کئی آدمیوں کے نام پکارے۔ مگر صدائے نہ برخاست۔ تب داروغہ جی نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ حرامزادے سیدھے سے نہ مانیں گے۔ اٹل سنگھ! ان مکھیوں کو گرفتار کرلو۔ فوراً ہتھکڑیاں بھردو۔ ایک ایک کو جیل بھجوا دوں گا۔ یہ ڈاکہ انھیں لوگوں کا کام ہے۔ دیکھوں کیسے بچتے ہیں۔

پھر صحن میں ڈھول سی پٹنے لگی۔ شرما جی کا خون جوش کھا رہا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ حق اور انصاف کی حمایت کی تھی۔ ظلم وستم کا یہ ڈراما اپنی آنکھوں سے دیکھ کر خاموش رہنا ان کے لیے غیر ممکن تھا۔

یکایک کسی نے چیخ کر کہا۔ "دوہائی ہے سرکار کی۔ مکتار صاحب ہم لوگن کا ہک ناہک

مروائے ڈارت ہیں۔"

اس فریاد نے بارود میں آگ لگا دی۔ شرما جی غصّے سے بھرے ہوئے بے تحاشا زینے سے اترے۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ جاتے ہی جاتے مختار صاحب کو ٹھوکروں سے گرا دیں گے۔ اور داروغہ کی ایسی لعن طعن کریں گے کہ اسے بھاگتے ہی بن پڑے۔ مگر پبلک ہمدردیوں میں ضبطِ نفس کی بڑی طاقت ہے۔ سنبھل گئے۔ توازن غصّے پر غالب آگیا۔ مختار صاحب کو بلا کر کہا۔ "لالہ صاحب! آپ نے یہ کیا غل غپاڑہ مچا رکھا ہے؟"

مختار صاحب بولے۔ "حضور داروغہ جی نے ان آدمیوں کو ایک ڈاکے کی تفتیش کے لیے طلب کیا ہے۔"

اور شرما جی کے کان میں کہا۔ "آدھا ساجھا طے ہوگیا ہے۔"

شرما جی کو اب تاب نہ رہی۔ تلملا کر بولے۔ تم حرامخور ہو۔ خبردار جو مجھ سے ایسی بات کی۔ ان آدمیوں کو فوراً رخصت کرو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

داروغہ جی بڑے موقع شناس آدمی تھے۔ مختار صاحب کی باتوں سے انھوں نے اخذ کیا تھا کہ شرما جی اس مالِ غنیمت میں شریک ہوں گے۔ ان کی صاف بیانیاں اسی غلط فہمی کا نتیجہ تھیں۔ اب انھیں اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ شرما جی کے تیور دیکھے۔ آنکھوں سے غصّے کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ ان کے رسوخ اور وقار سے واقف تھے۔ قریب آکر بولے۔ "جنابِ آپ کے مختار صاحب نے مجھے بڑا دھوکہ دیا ورنہ حلف سے کہتا ہوں یہاں ہرگز یہ شر نہ برپا کرتا۔ آپ میرے دوست بابو کولت سنگھ کے محسن ہیں اور اس لحاظ سے میں آپ کو اپنا مربی سمجھتا ہوں۔ اپنے ہی گھر میں آگ نہ لگاتا لیکن اس شخص نے مجھے بڑا چکمہ دیا۔ اور میں بھی ایسا احمق تھا کہ اس چکمے میں آگیا۔ میں سخت نادم ہوں اور آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ (آہستہ سے) میری ایک دوستانہ صلاح قبول فرمایئے۔ اس مختار کو جس قدر جلد ممکن ہو الگ کردیجیے۔ یہ آپ کی ریاست کو تباہ کیے ڈالتا ہے۔"

(۸)

منشی بابو لال اپنے دروازے پر بیٹھے ہوئے اسی ماجرے کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔

شیو دین۔ "بھیا آپ جاکے دروگا کو کیوں نہیں سمجھاتے؟ رام رام ایسا اندھیر!"

بابو لال۔ "بھئی میں دوسرے کے معاملے میں دخل دینے والا کون؟ شرما جی تو وہیں ہیں۔

ان کی مرضی جیسی ہوگی ویسا کریں گے۔ یہ آج کوئی نئی بات تھوڑے ہی ہے۔ دیکھتے تو ہو کہ ہر مہینے میں ایک نہ ایک لتڑ لگا رہتا ہے۔" یہ سب مختار صاحب کے کرتوت ہیں۔ شرما جی متین آدمی ہیں۔ شرافت اور ملائمیت سے پیش آتے ہیں۔ مختار صاحب نے سمجھا ہوگا وہ اس معاملے میں بھی زبان نہ کھولیں گے۔ اور غالباً اس کا خیال صحیح نکلا۔ ورنہ شرما جی کے روبرو یہ طوفان کیوں کر مچتا۔ ہاں یہ تو بتلاؤ اب کی کتنی اوکھ بوئی ہے؟"

رام داس۔ "اوکھ تو بہت ہے پر جب دشٹوں کے مارے بچے۔ بھیا تم مانت نہیں ہو پر آنکھوں دیکھی بات ہے کہ کڑاہ کا کڑاہ رس جل گیا۔ اور پاؤ بھر بھی نہ پڑا۔ نہ جانے ایسا کون سا منتر مار دیتے ہیں۔"

بابو لال۔ "اچھا اب کی میرے کہنے سے یہ نقصان اٹھالو۔ دیکھوں ایسا کون بڑا منتر باز ہے جو کڑاہوں کا رس جلا دیتا ہے۔ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی راز ہے۔ اب کی میرے سامنے گڑ بنانا۔ اور کسی باہر کے آدمی کو مت آنے دینا پھر دیکھوں کیسے مال نہیں پڑتا۔ اس گاؤں میں جتنے کولہو زمین میں دھنسے پڑے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہاں بہت اوکھ ہوتی ہوگی۔"

شیو دین۔ "بھیا ہمارے ہوش میں یہ سب کولھو چلتے رہے۔ ماگھ پوس میں رات بھر بجار لگی رہتی تھی۔ پر جب سے یہ بدیا پھیلی ہے تب سے کوئی اوکھ کے پاس نہیں جاتا۔"

بابو لال۔ "ایشور چاہیں گے تو پھر ویسی ہی اوکھ ہوگی۔ اب کی میں اس منتر کو الٹ دوں گا بھلا اوکھ لگ جائے تو تمھارے پٹی میں ایک ہزار کا گڑ ہوجائے گا۔"

شیو دین۔ "بھیا کیسی بات کہتے ہو۔ اس پٹی میں پچیس بیگھ سے۔ کم اوکھ نہیں ہے۔ کچھ نہ ہوتو تین چار ہزار کہیں نہیں گئے۔"

بابو لال۔ "تب تو بیعائی میں پچاس روپے مل جائیں گے۔ اس سے تمھاری پٹی میں چار لالٹین جل سکتی ہیں۔"

دفعتاً سامنے سے شرما جی ایک آدمی کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیے۔ بابو لال نے اسامیوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔ کرسی رکھوا دی اور چند قدم آگے بڑھ کر بولا۔ "آپ نے کیوں تکلیف کی مجھ ہی کو بلالیا ہوتا۔"

شرما جی۔ آپ کو کس منہ سے بلواتا۔ میرے آدمی وہاں پٹ رہے تھے۔ ان کا گلا دبایا جارہا

تھا۔ اور آپ قریب نہ پھٹکے۔ مجھے آپ سے مدد کی امید تھی۔"

بابو لال۔ "میں واقعی نادم ہوں کہ اس وقت آپ کی کچھ خدمت نہ کرسکا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میرے وہاں جانے سے داروغہ جی اور مختارصاحب دونوں برا مانتے۔ یہاں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آئے دن ایسے سوانگ ہوتے رہتے ہیں۔ اور کچھ اسی گاؤں میں نہیں۔ جہاں دیکھیے یہی نقشہ نظر آتا ہے۔ میں آپ سے اس کا ذکر نہ کرتا تھا کہ شاید آپ اسے غیبت خیال کریں۔"

شرما جی۔ "آخر یہ بلا تو جوں توں کرکے ٹلی۔ مگر دیکھتا ہوں کہ اس طرح کام نہ چلے گا۔ اپنے اسامیوں کو آج اس مصیبت میں دیکھ کر مجھے روحانی صدمہ ہوا۔ میرا دل مجھے بار بار نفرین کرتا ہے۔ جن کی کمائی کھاتا ہوں جن کی بدولت ٹمٹم پر سوار ہوکر رئیس بنا گھومتا ہوں، ان کے کچھ حقوق مجھ پر بھی تو ہیں۔ مجھے اپنی خود غرضی صاف نظر آرہی ہے۔ اپنی نظروں میں خود گر گیا ہوں۔ میں ساری قوم کی نجات کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہوں۔ سارے ہندستان کا قاضی بننے کا مدعی ہوں۔ مگر اپنے گھر کی خبر نہیں۔ جن کی روٹیاں کھاتا ہوں ان کی طرف سے ایسا بے فکر! میں نے اس شرمناک حالت کی اصلاح کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔ اور اس کام میں آپ کی مدد اور ہمدردی کا سائل ہوں۔ مجھے اپنی شاگردی میں لیجیے۔ میں سچے دل سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اس بار کے سنبھالنے میں مجھے سہارا دیجیے۔ میری تعلیم نے مجھے کتاب کا کیڑا بنا کر چھوڑ دیا۔ اور صحبت نے خیالی پلاؤ پکانا سکھایا۔ میں انسان نہیں، اصولوں کا پوتھا ہوں۔ اب مجھے انسان بنایئے۔ میں نے یہیں بودوباش کرنے کا پکا ارادہ کرلیا ہے۔ مگر آپ کو بھی شہر سے تعلق ترک کرنا پڑے گا۔ آپ کو جو کچھ نقصان ہوگا اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ اپنے تئیں میرا مختارِکل سمجھیے۔ اور مجھے عملی زندگی بسر کرنے کا سبق سکھایے۔ ممکن ہے کہ آپ کے نقشِ قدم پر چل کر میں اپنے فرائض ادا کرنے کے قابل ہوجاؤں۔"

اردو ماہنامہ زمانہ میں مئی 1917 میں شائع ہوا۔ اردو مجموعہ 'دیہات کے افسانے' اور ہندی میں 'اپدیش' کے عنوان سے مان سروور 8 میں شامل ہے۔

ایمان کا فیصلہ

کان پور کے ضلع میں پنڈت بھرگودت مصر ایک بڑے زمیندار تھے۔ منشی ست نرائن لال ان کے مختار عام تھے۔ ساری ریاست کا سیاہ و سفید ان کے ہاتھ میں تھا۔ بڑے آقا پرست متدین آدمی تھے۔ لاکھوں روپے کا تحصیل وصول اور ہزاروں من غلے کا لین دین انجام دیتے تھے۔ اور سارا انتظام اس خوب صورتی سے کرتے کہ ریاست روزبروز بڑھتی جاتی تھی۔ ایسے وفاکیش ملازم کی جتنی عزت ہونی چاہیے تھی۔ وہ ہوتی تھی۔ شادی وغم کی ہر ایک تقریب میں پنڈت جی ان کے ساتھ بڑی سیر چشمی سے پیش آتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان پر اتنا اعتبار ہوگیا کہ کاغذات کا سمجھنا بھی ترک کردیا۔ خانگی مصارف کا حساب تک منشی جی کے ذمے کر دیا گیا۔ اسی اثنا میں پنڈت جی مرگِ بے ہنگام کے شکار ہوئے۔ گنگا نہانے گئے تھے۔ معلوم نہیں کسی گڑھے میں پھسل پڑے یا کوئی جانور کھینچ لے گیا۔ ان کا پھر پتہ نہ چلا۔

اب منشی ست نرائن لال کے اختیارات اور بھی وسیع ہوئے۔ بجز ایک بیوہ عورت اور تین چھوٹے چھوٹے بچوں کے خاندان میں اور کوئی نہ تھا۔ مراسمِ وفات سے فرصت پانے کے بعد ایک روز بدنصیب بھان کنور نے انھیں بلایا اور روکر بولی۔ "لالہ، سوامی جی تو ہمیں منجدھار میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب ڈونگا تمھیں پار لگاؤ تو لگ سکتا ہے۔ یہ سب کھیتی تمھاری لگائی ہوئی ہے۔ اِسے تمھارے اوپر چھوڑتی ہوں۔ یہ تمھارے بچّے ہیں۔ ان کا منھ دیکھو۔ جب تک تمھارے مالک جیے تمھیں اپنا بھائی سمجھتے رہے۔ مجھے بشواس ہے کہ تم اسی طرح اس بوجھ کو سنبھالے رہو گے۔"

ست نرائن لال نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "بھابھی! بھیا کیا اٹھ گئے میری تقدیر پھوٹ گئی۔ نہیں تو مجھے آدمی بنادیتے۔ میں انھیں کا جلایا جیا ہوں اورانھیں کی چاکری میں مروں گا۔" آپ اطمینان رکھیں۔ کسی طرح اندیشہ نہ کریں۔ میں مرتے دم تک آپ کا

حقِ نمک ادا کردوں گا۔ آپ صرف اتنا کیجیے گا کہ میں کارندے یا ملازم کی آپ سے شکایت کروں۔ اس کی تنبیہہ ضرور کردیجیے گا۔ ورنہ یہ لوگ شیر ہوجائیں گے۔

(۲)

اس حادثے کے بعد کئی سال تک منشی نرائن لال نے اس ریاست کو سنبھالا۔ کبھی کسی معاملے میں ایک کوڑی کا بل نہیں پڑا۔ سارے ضلع میں انھیں کا رسوخ تھا۔ لوگ پنڈت جی مرحوم کو بھول سے گئے۔ درباروں میں، کمیٹیوں میں انھیں کو دعوت ملتی۔ حکام ضلع ان سے اس طرح پیش آتے گویا وہ زمیندار ہیں۔ ضلع کے دیگر رؤسا ان کا ادب اور لحاظ کرتے۔ مگر روز افزوں وقار اور رسوم کے ساتھ مصارف بھی بڑھتے جاتے تھے۔ اور بھان کنور دوسری عورتوں کی طرح جزرس تھی۔ انسانی طبائع کی پیچیدگیوں سے واقف نہ تھی۔ پنڈت جی مرحوم ہمیشہ انھیں انعام واکرام عطاکرتے رہتے تھے۔ اور عنایات کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ روحانی طاقت کے بعد ایمان کا دوسرا ستون فارغ البالی ہے۔ اس کے سوا وہ خود کبھی کبھی کاغذات کی جانچ کرلیا کرتے تھے۔ برائے نام ہی سہی۔ مگر اس سے نگرانی کا خوف بنا رہتا تھا۔ کیوں کہ طبعی خیانت کے بعد ایمان کا سب سے بڑا دشمن موقع ہے۔ بھان کنور یہ چٹکلے نہ جانتی تھی۔ موقع اور احتیاج جیسے مہلک دشمنوں کے نرغے میں پڑ کر منشی کی دیانت کیوں کر جانبر ہوسکتی تھی'

کان پور شہر سے متصل ایک بہت آباد اور زرخیز موضع تھا۔ عین گنگا کے کنارے۔ پنڈت جی اس گاؤں کی حسرت لیے ہوئے دنیا سے کوچ کرگئے۔ پختہ گھاٹ اور مندر اور باغ اور بنگلے کی آرزو دل ہی میں رہی۔ اتفاق سے اب یہ موضع بیع ہوا۔ اس کے زمیندار ایک ٹھاکرصاحب تھے۔ کسی فوجداری کے معاملے میں ماخوذ ہوگئے تھے۔ مقدمے کی پیروی کے لیے زرِ نقد کی اشد ضرورت تھی۔ منشی جی اپنے منصبی فرائض کے سلسلے میں کچہری گئے ہوئے تھے۔ ٹھاکرصاحب نے اس کا ذکر کیا۔ منشی جی کو منھ مانگی مراد ملی۔ اسی وقت مول تول ہوا۔ بیعنامہ لکھا گیا۔ رجسٹری ہوئی۔ داخل خارج کی درخواست پیش ہوگئی۔ گو روپے موجود نہ تھے۔ مگر شہر میں ساکھ تھی۔ ایک مہاجن سے رقعہ لکھ کر بیس ہزار روپے منگوائے اور ٹھاکرصاحب کے نذر کیے۔ ہاں سہولیت کے خیال سے یہ سب معاملہ اپنے ہی نام سے طے کیا۔ کیوں کہ نابالغوں کے نام سے بیع کرانے میں قانونی پیچیدگیاں پیدا

ہوتیں۔ اور تاخیر سے شکار ہاتھ سے نکل جاتا۔

منشی جی اس دن خوش خوش بیعنامہ لیے ہوئے بھان کنور کے پاس آئے۔ پردہ کرایا۔ اور جاکر یہ مژدۂ جاں فزا سنایا۔ بھان کنور نے آنسوؤں سے شکریہ ادا کیا۔ پنڈت جی کے نام پر پختہ گھاٹ، مندر اور بنگلہ بنوانے کی یاد تازہ ہوگئی۔ منشی ست نرائن لال دوسرے دن اس موضع میں گئے۔ اسامی حاضر ہوئے۔ نذریں گزاریں۔ ایک پرتکلف دعوت دی گئی۔ حکام اور رؤسائے شہر مدعو ہوئے۔ اور کشتیوں کی خوب سیر رہی۔

(۳)

حالانکہ اس موضع کو اپنے نام سے خریدتے وقت منشی کے دل میں دغا کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ لیکن دو ہی چار دنوں میں اس کے اکھوے نکل آئے۔ اس موضع کے آمدو خرچ کا حساب وہ علاحدہ لکھا کرتے اور اسے اپنی مالکن کو سمجھانے کی مطلق ضرورت نہ سمجھتے۔ بھان کنور یوں بھی ان معاملات میں زیادہ دخل دینا مصلحت کے خلاف سمجھتی تھی۔ اس معاملے میں بالخصوص اسے منشی کے جذبات کا بہت زیادہ لحاظ تھا کہ کہیں انھیں یہ اندیشہ نہ ہو کہ میں ان سے بدگمان ہوں۔

اس طرح کئی سال گزر گئے۔ اور اب رفتہ رفتہ دونوں فریق کے دلوں میں چور بیٹھا۔ بھان کنور کو خوف ہوا کہ کہیں یہ سارے کا سارا موضع ہضم کرنے کی فکر میں تو نہیں ہیں۔ ادھر قانونی طاقت منشی جی کے اخلاقی احساس پر غالب آئی۔ انھوں نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ موضع میرا ہے۔ زیادہ سے زیادہ میں بیس ہزار کا مقروض ہوں۔ کوئی بہت کرے گا اپنے روپے لے لے گا۔ اس کے سوا کوئی کیا کرسکتا ہے؟ مگر یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ منشی جی پیش قدمی کے انتظار میں مسلح بیٹھے تھے۔ اور بھان کنور موقع کی منتظر تھی۔ ہاں تیر و تفنگ سے محترز رہنا چاہتی تھی۔

ایک روز اس نے منشی جی کو اندر بلا کر کہا۔ "لالہ جی۔ برگدا میں مندر کا کام کب سے شروع ہوگا؟ اسے لیے ہوئے آٹھ سال ہوگئے۔ اب کام لگ جائے تو اچھا ہو۔ زندگی کا کیا اعتبار ہے۔ جو کام کرنا ہے اسے کرہی ڈالنا چاہیے۔"

حملے کا آغاز نہایت خوش اسلوبی سے ہوا۔ منشی جی بھی دل میں اس کے قائل ہوگئے۔ ذرا سوچ کر بولے۔ ارادہ تو میرا کئی بار ہوا۔ مگر موقع کی زمین نہیں ملتی۔ گنگا

کے کنارے کی ساری زمین اسامیوں کی جوت میں ہے اور وہ اسے کسی طرح چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔"

بھان کنور۔ یہ بات تو مجھے آج معلوم ہوئی۔ آٹھ سال ہوئے اس گاؤں کا آپ نے کبھی بھولے سے بھی تو ذکر نہیں کیا۔ معلوم نہیں کتنی تحصیل ہے۔ کتنا منافع۔ کیسا گاؤں ہے۔ کچھ سیر ہوتی ہے یا نہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں آپ ہی کرتے ہیں۔ اور کریں گے۔ لیکن کچھ مجھے بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔ منشی جی سنبھل بیٹھے۔ مبارزانہ پیش قدمی شروع ہوگئی۔ بولے۔ آپ کو اس سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اس لیے میں نے خواہ مخواہ آپ کو دق کرنا مناسب نہ سمجھا۔"

بھان کنور کو سکتہ سا ہوگیا۔ پردے سے باہر ہوگئی۔ اور منشی جی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ نے گاؤں میرے لیے لیا تھا۔ یا اپنے لیے؟ روپیہ میں نے دیا یا آپ نے؟ اس پر جو خرچ پڑا وہ میرا یا آپ کا ؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ اس وقت ہوش میں ہیں؟"

ست نرائن لال نے سن کر جواب دیا۔ یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ موضع میرے نام سے بیع ہوا۔ روپیہ ضرور آپ کا لگا۔ مگر اس کا میں دیندار ہوں۔ رہا تحصیلِ وصول کا خرچ۔ یہ سب میں نے ہمیشہ اپنی جیب سے کیا ہے۔ اس کا حساب و کتاب، آمد وخرچ ہمیشہ الگ رکھتا گیا ہوں۔"

بھان کنور نے غصے سے بل کھا کر کہا۔ "اس دغا کا پھل آپ کو ضرور ملے گا۔ آپ اس طرح میرے بچوں کا گلا نہیں کاٹ سکتے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ نے پیٹ میں یہ چھری چھپا رکھی ہے۔ نہیں تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟ خیر اب سے میرا روکڑا اور کاغذات آپ کچھ نہ چھوئیں۔ میرا جو کچھ ہوگا۔ میں آپ سے لے لوں گی۔"

یہ کہہ کر بھان کنور پھر پردے کی آڑ میں آبیٹھی۔ لالہ صاحب کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ خفیف ہوکر وہاں سے اٹھ آئے۔ اور دفتر میں جاکر کچھ کاغذات الٹ پلٹ کرنے لگے۔ مگر بھان کنور ان کے پیچھے پیچھے مردانے میں چلی آئی اور ڈانٹ کر بولی۔ "میرا کوئی کاغذ مت چھونا۔ ورنہ برا ہوگا۔ تم زہر بھرے ہوئے سانپ ہو۔ میں تمھارا منھ دیکھنا نہیں چاہتی۔"

لالہ صاحب کاغذوں میں کچھ ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ خزانے کی کنجی نکال کر پھینک دی۔ بہی کھاتے پٹک دیے۔ کواڑ دھڑاکے کے ساتھ بند کیا۔ اور ہوا کی طرح سن سے باہر نکل گئے۔

دوسرے مختاروں کارندوں نے یہ کیفیت سنی تو پھولے نہ سمائے۔ منشی ست نرائن کے سامنے ان کی دال نہ گلنے پاتی تھی۔ آکر آگ پر تیل چھڑکنے لگے۔ نمک عجیب چیز ہے۔ پھوٹ پھوٹ کر نکلے گا۔

طرفین سے مقدمے بازی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ایک طرف قانون کا قالب تھا۔ دوسری جانب قانون کی روح۔ مادہ کی روح سے پیکار کرنے کا حوصلہ ہوا تھا۔

بھان کنور نے منشی چھکن لال سے پوچھا۔ "ہمارا وکیل کون ہے؟"

چھکن لال نے ادھر ادھر جھانک کر کہا۔ "سیٹھ جی تھے۔ مگر ست نرائن لال نے انھیں پہلے ہی گانٹھ رکھا ہے۔ اس مقدمے کے لیے بہت ہوشیار آدمی درکار ہے مہرا بابو کی آج کل خوب چل رہی ہے۔ حاکموں کے قلم پکڑ لیتے ہیں۔ بولتے ہیں تو جیسے موٹر کار چھوٹ گیا۔ حضور! اور کیا کہوں۔ مجرموں کو پھانسی سے اتار لیا ہے۔ ان کے سامنے کوئی وکیل تو زبان کھول ہی نہیں سکتا۔ حضور فرمائیں تو انھیں کو کرلیا جائے۔"

اس طولانی تمہید کا اثر کچھ نہ ہوا۔ بھان کنور نے کہا۔ پہلے سیٹھ جی سے پوچھ لیا جائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ آپ جایئے اور انھیں بلا لایئے۔" چھکن لال نے زیادہ حیل وحجت نہیں کی۔ سیٹھ جی کے پاس جاکر پیغام دیا۔ سیٹھ جی پنڈت بھرگودت کے زمانے سے یہاں کے قانونی مشیر تھے۔ مقدمے کی کیفیت سنی تو حیرت میں آگئے۔ ست نرائن لال کو وہ نیک نیت آدمی سمجھتے تھے۔ اسی وقت آئے۔ بھان کنور نے خود ان سے مقدمے کی روداد بیان کی اور ان پر اپنے بچوں کے بہت حقوق جتانے کے بعد اس معاملے کو فوراً ہاتھ میں لینے کی استدعا کی۔ سیٹھ جی نے باہمی مصالحت کا ذکر کیا۔ بھان کنور پھر پردے کے باہر نکل آئی۔ اور بولی۔ "نہیں۔ کبھی نہیں۔ میں صلح نہ کروں گی۔ آپ کاغذات دیکھیں۔ میرے بچوں کی خاطر تکلیف اٹھائیں۔ ست نرائن کی نیت پہلے خراب نہ تھی۔ تھوڑے دنوں سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ دیکھیے جس تاریخ کو گاؤں بیع ہوا تھا۔ اس متی میں ۳۲ ہزار کا خرچ دیکھا گیا ہے۔ اس نے اپنے نام قرض لکھا ہو تو دیکھیے۔ سالانہ

سود ادا ہوا ہے یا نہیں؟ ایسے دغا باز آدمی سے صلح کروں گی؟

اس میں کچھ نکتہ ہو یا نہ ہو۔ مگر جو عورت کبھی ان معاملات کے قریب نہیں گئی اس کی قانونی گرفت واقعی حیرت انگیز تھی۔ یہ اس ذہن کی برکت تھی جو اس وقت بھان کنور کے سر پر سوار تھی۔ خلاصہ یہ کہ کاغذات کی جانچ ہوئی، ثبوت بہم کیے گئے۔ اور استغاثہ کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔

(۴)

منشی ست نرائن لال غصے میں بھرے ہوئے مکان پر پہنچے۔ لڑکے نے مٹھائی کے لیے ضد کی۔ اسے پیٹا بیوی پر اس لیے برس پڑے کہ اس نے کیوں لڑکے کو رلایا۔ اپنی بوڑھی ماں کو ڈانٹا۔ تم سے اتنا بھی نہیں ہوسکتا کہ ذرا لڑکے کو بہلاؤ۔ اب میں گھر پر آؤں تو بیٹھ کر لڑکے کو کھلاؤں۔ مجھے دنیا میں نہ اور کوئی کام ہے نہ اور کوئی فکر۔ اس طرح گھر میں ایک طوفان برپا کرکے وہ باہر آئے۔ اور سوچنے لگے۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں بھی کیسا احمق ہوں۔ اتنے دنوں تک سارے کاغذ اپنے ہاتھ میں تھے۔ جو چاہتا کرسکتا تھا۔ مگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ آج جب سر پر آپڑی تو سوجھی۔ میں چاہتا تو نئے بہی کھاتے بنا سکتا تھا۔ جس میں اس گاؤں کے روپے کا خرچے کا ذکر ہی نہ ہوتا۔ افسوس گھر میں آئی ہوئی لکشمی میری حماقت اور ناعاقبت اندیشی کی بدولت اٹھی جاتی ہے۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ شیطان کی خالہ اس طرح مجھ سے پیش آئے گی کہ کاغذات کو ہاتھ نہ لگانے دے گی۔

اسی ادھیڑبن میں پڑے پڑے یکایک منشی جی اچھل پڑے۔ ایک ترکیب سوجھ گئی۔ کیوں نہ کار پردازوں کو ملا لوں۔ وہ سب کے سب میری سخت گیریوں کی بدولت مجھ سے ناراض تھے۔ اس وقت سیدھے منھ بات نہ کریں گے۔ پر ان میں ایسا تو کوئی نہیں ہے جو زر سے بے نیاز ہو۔ ہاں اس میں صرفِ کثیر کی ضرورت ہوگی۔ مگر اتنا روپے آئے گا کہاں سے؟ کاش ذرا پہلے چیت گیا ہوتا تو یہ سب دقتیں ایک بھی نہ ہوتیں۔ بس ایک ہی ترکیب ہے کہ کسی طرح وہ کاغذات غائب کردوں۔ خطرناک معاملہ ہے۔ پر کرنا ہی پڑے گا۔

نفس کے سامنے ایک بار سر جھکانے کے بعد پھر سنبھلنا مشکل ہوتا ہے۔ گناہ کی اتھاہ ندی میں ایک بار پھسل کر ہم دم بہ دم پیچھے ہی ہوتے جاتے ہیں۔ منشی ست نرائن لال

جیسا نیک نیت آدمی اس وقت اس فکر میں تھا کہ کیوں کر سیند لگاؤں۔ گناہ کی غذا گناہ ہے۔ منشی جی نے سوچا کیا سیند لگانا آسان ہے؟ اس میں کتنی ہمت کتنی ہوشیاری، کتنی پھرتی اور صفائی کی ضرورت ہے۔ کون کہتا ہے کہ چوری آسان کام ہے اور اگر کہیں پکڑا گیا۔ تو پھر بجز ڈوب مرنے کے اور کوئی علاج نہیں۔ منشی جی کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ ہاں ایک ترکیب اس سے آسان نظر آئی، کیوں نہ دفتر میں آگ لگادوں۔ ایک بوتل مٹی کے تیل اور ایک دیا سلائی کی ضرورت ہے۔ کسی بدمعاش کو ملالوں۔ اس کی مدد سے سارا کام ہوسکتا ہے۔ مگر یہ کیا معلوم کہ وہ بھی اس کمرے میں رکھی ہے یا نہیں۔ اس چڑیل نے ضرور اسے اپنے پاس رکھا ہوگا۔

منشی جی اسی ادھیڑبن میں بہت دیر تک کروٹیں بدلتے رہے۔ نئے نئے منصوبے سوچتے۔ مگر پھر اپنی ہی دلیلوں سے انھیں مٹادیتے۔ جیسے برسات میں آسمان پر بادلوں کی نئی نئی صورتیں بنتی اور پھر ہوا کے زور سے بگڑجاتی ہیں۔ لیکن یہ خیال دل سے کسی طرح دور نہ ہوتا تھا کہ ان کاغذات کو اپنے ہاتھ میں لانا چاہیے۔ یہ کام کٹھن ہے۔ مانا۔ پر ہمت نہ تھی تو راڑ کیوں مول لی تھی۔ کیا کسی کی بیس ہزار کی جائداد آسانی سے ہاتھ آجائے گی؟ خواہ کسی صورت سے ہو، چور بنے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ آخر جو لوگ یہ کام کرتے ہیں وہ بھی تو آدمی ہی ہوتے ہیں۔ بس ایک چھلانگ کا کام ہے۔ اگر پار ہوگئے تو راج کریں گے۔ اور گر پڑے تو جان سے ہاتھ دھوئیں گے۔

اس طرح منشی ست نرائن نے اپنا دل مضبوط کیا۔

(۵)

رات کے دس بج گئے تھے۔ منشی ست نرائن لال کنجیوں کا ایک گچھا کمرے میں دبائے گھر سے باہر نکلے۔ دروازے پر تھوڑے سے پیال رکھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ چونک پڑے۔ مارے خوف کے کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ کوئی آدمی چھپا بیٹھا ہے۔ ان کے قدم رک گئے۔ پیال کی طرف غور سے دیکھا۔ اس میں مطلق حرکت نہ ہوئی۔ تب ہمت بندھ گئی۔ آگے بڑھے اور دل کو سمجھانے لگے۔ میں کیسا احمق ہوں۔ اپنے دروازے پر کس کا خوف۔ راستے ہی میں مجھے کس کا خوف ہے۔ میں اپنی راہ جاتا ہوں۔ کوئی میری طرف ترچھی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں جب مجھے کوئی عین موقع پر

پکڑلے تو البتہ۔ دفعتاً انھوں نے بھان کنور کے ایک چپراسی کو آتے دیکھا۔ کلیجہ سن سے ہو گیا۔ وہ لپک کر ایک اندھیری گلی میں گھس گئے۔ اور وہاں بڑی دیر تک کھڑے رہے۔ جب وہ سپاہی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو پھر سڑک پر آئے۔ سپاہی آج تک ان کے حکم کا غلام تھا۔ اسے انھوں نے بارہا گالیاں دی تھیں۔ لاتیں بھی ماری تھیں۔ مگر آج اس کی صورت دیکھ کر ان کی روح فنا ہو گئی۔

انھوں نے پھر دلیل کی پناہ لی۔ میں جیسے کچھ بھنگ کھا گیا ہوں۔ اس چپراسی سے اتنا ڈرا۔ بالفرض وہ مجھے دیکھ ہی لیتا۔ تو میرا کیا کر سکتا تھا؟ ہزراوں آدمی راستہ چل رہے ہیں۔ انھیں میں ایک میں بھی ہوں۔ کیا وہ سب کے دلوں کا حال دیکھنے نکلا ہے؟ غالباً مجھے دیکھ کر وہ ادب سے سلام کرتا۔ اور کچھ دور تک میرے ساتھ چلتا۔ عجیب نہیں کہ آج وہاں کی داستان بیان کرتا۔ اس طرح دل کو مضبوط کر کے وہ پھر آگے بڑھے۔ یہ شاید سچ ہے کہ گناہ کے قابو میں آیا ہوا دل خزاں کا مارا ہوا پتہ ہے۔ جو ہوا کے جھونکے میں گر پڑتا ہے۔ بازار میں پہنچے۔ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ان میں سانڈ اور گائیں بیٹھے ہوئے رمزوکنائے کر رہے تھے۔ صرف حلوائیوں کی دکانیں کھلی تھیں۔ اور کہیں کہیں ایک آدھ گجرے والے ہار کی ہانک لگاتے پھرتے تھے۔ یہ حلوائی منشی جی کو پہچانتے تھے۔ مگر منشی جی سر نیچا کر لیا۔ کچھ رفتار تبدیل کی اور لپکتے ہوئے چلے۔ دفعتاً ایک بگھی آتی ہوئی دکھائی دی انھوں نے اسے پہچان لیا یہ بلبھ داس سیٹھ وکیل کی بگھی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ ہزاروں بار سیٹھ جی کے ساتھ کچہری گئے تھے۔ پر آج یہ انھیں کالے دیو کی طرح خوفناک معلوم ہوئی۔ انھوں نے رخ پھیر لیا۔ اور بھاگ کر ایک خالی دکان پر چڑھ گئے۔ سانڈ نے سمجھا کوئی نیا رقیب پیدا ہوا ہے۔ سینگ جھکائے پھنکارتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پر اس اثنا میں بگھی نکل گئی۔ اور منشی کی جان میں جان آئی۔ اب کے انھوں نے دلیلوں سے دل کو نہ سمجھایا۔ سمجھ گئے کہ اس وقت اس سے کوئی سود نہیں۔ خیریت ہوئی کہ وکیل نے دیکھا نہیں۔ ورنہ ایک ہی گھاگ ہے۔ میرے بشرے سے تاڑجاتا۔ ایک فرلانگ چل کر ایک گلی ملی۔ یہی بھان کنور کے مکان کا راستہ تھا۔ ایک دھندلی سی لالٹین روشن تھی۔ جیسا منشی جی نے قیاس کیا تھا پہرے دار کا پتہ نہ تھا۔ اصطبل میں چماروں کے یہاں ناچ ہو رہا تھا۔ کئی چمارنیں بناؤ سنگار کر کے ناچ رہی تھیں۔ چمار مردنگ بجا بجا کر گاتے تھے۔

گھر پے نہیں مائیں شیام گھیر آئے بدرا

اور دونوں پہرے دار وہاں تماشا دیکھ رہے تھے۔ منشی جی کے کلیجے میں دھڑکن تھی۔ سردھم دھم کرتا تھا۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ سانس پھول رہی تھی۔ بدن کا ایک ایک رویاں آنکھ اور کان بنا ہوا تھا۔ ان کی ساری طاقت اور چستی اور اوسان اور حواس اور احتیاط ارادے کی مدد پر مستعد تھیں۔

منشی جی بلی کی طرح دبے پاؤں لالٹین کے پاس گئے اور جس طرح وہ چوہے پر جھپٹتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے جھپٹ کر اس کا پٹ کھولا۔ اور اسے گل کردیا۔ ایک مرحلہ طے ہوگیا۔ مگر جتنا سمجھتے تھے اتنا مشکل نہ تھا۔ دل کچھ مضبوط ہوا۔ دفتر کے برآمدے میں پہنچے اور ایک لمحے تک خوب کان لگا کر آہٹ لی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ اس کی کنجی آج بہت تلاش کرکے بازار سے خرید لائے تھے۔ قفل کھل گیا۔ کواڑوں نے بہت ہی دبی زبان سے صدائے احتجاج بلند کی۔ منشی جی دفتر میں داخل ہوئے۔ ان کے اعضاء میں اس وقت بندر کی سی پھرتی اور چستی تھی۔ اندر چراغ جل رہا تھا۔ منشی جی کو دیکھ کر اس نے ایک بار سر ہلایا۔ گویا انھیں اندر آنے کی ممانعت کی۔

منشی جی کے پیر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ایڑیاں زمین سے اچھلی پڑتی تھیں۔ سانس سینے کو پھوڑ کر نکلنا چاہتا تھا۔ گناہ کا اتنا سنگین بار ان کی برداشت سے باہر تھا۔ پل بھر منشی جی نے بہیوں کو الٹا پلٹا۔ ان کی تحریر آنکھوں میں تیرتی تھی۔ انتخاب کی مہلت نہ تھی۔ انھوں نے کاغذات کا ایک پشتارہ باندھا اور بغل میں دبا کر تیر کی طرح کمرے سے باہر نکل آئے۔ دروازے کو آہستہ سے بند کیا اور اس پاپ کی گٹھڑی کو لیے ہوئے اندھیری گلی میں غائب ہوگئے۔

تنگ اندھیری متعفن گلیوں میں وہ برہنہ پا تیزی سے قدم بڑھائے ہوئے اس طمع، خود غرضی، بے وفائی اور دغا کا بار گراں لیے ہوئے چلے جاتے تھے۔ گویا گناہوں سے لدی ہوئی روح دوزخ کی نالیوں میں بہی جاتی تھی۔

بہت دیر تک بھٹکنے کے بعد وہ گنگا کے کنارے پہنچے۔ جس طرح تاریک دلوں میں کہیں کہیں ایمان کی دھندلی روشنی چھپی رہتی ہے اسی طرح ندی کی سیاہ اور ساکت سطح پر تارے جھلملارہے تھے۔ کنارے پر چند سادھو دھونی رمائے ہوئے تھے۔ شعلہ حقیقت دل

کے بجائے باہر دہک رہا تھا۔ منشی جی نے اپنا پشتارہ اتارا۔ اور اپنی چادر میں لپیٹ کر اسے ندی میں پھینک دیا۔ سوئی ہوئی لہروں میں کچھ ہلچل ہوئی اور پھر سناٹا ہو گیا۔

(۶)

منشی ست نرائن لال کے گھر میں ان کی ماں اور بیوی دو عورتیں تھیں۔ تاہم منشی جی کو گنگا میں ڈوب مرنے یا کہیں بھاگ جانے کی ضرورت نہ تھی۔ دونوں عورتیں تعلیم سے بے بہرہ تھیں۔ نہ وہ باڈیس پہنتی تھیں۔ نہ موزے، نہ ہارمونیم پر گاسکتی تھیں۔ یہاں تک کہ انھیں صابن کے استعمال تک کا علم نہ تھا۔ وہ بالوں میں ہیرپن(Hair Pin) لگانا تک نہ جانتی تھیں۔ بہو میں اپنی عزت کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ نہ ساس میں خوداری کی اسپرٹ۔ بہو اب تک ساس کی گھڑکیاں بھگی بلی کی طرح سہ لیتی تھی۔ ساس کو بچوں کے نہلانے دھلانے حتیٰ کہ گھر میں جھاڑو دینے تک سے عار نہ تھا۔ بہو عورت کیا مٹی کا لوندا تھی۔ ایک پیسے کی بھی ضرورت ہو تو ساس سے مانگتی۔ غرض دونوں عورتیں اپنے حقوق سے بے خبر، جہالت کی تاریکی میں پڑی ہوئی، جانوروں کی طرح زندگی کے دن کاٹتی تھیں۔ ایسی پھوہڑ تھیں کہ دال موٹ، سموسے وغیرہ بھی گھر ہی میں بنالیتی تھیں۔ اپنے ہی ہاتھوں سے کتنی ہی جسمانی شکایتوں کا علاج بھی کر لیتی تھیں۔ بیٹھی گھاس پات کوٹا کرتی تھیں۔ منشی جی نے ماں کے پاس جا کر کہا۔ ”اماں! کچھ روپیہ نکالو۔ مجھ سے بھان سے اَن بن ہو گئی۔ کل انھوں نے مجھے بے قصور الگ کردیا۔ ماں نے چونک کر پوچھا۔ الگ کردیا۔ کیا بات ہوئی؟ بھان کنور کا مزاج تو ایسا نہ تھا۔“

منشی۔ بات کچھ نہیں تھی۔ میں نے اپنے نام سے جو موضع لیا تھا۔ اسے میں نے اپنے قبضے میں کرلیا۔ کل مجھ سے ان سے صاف صاف باتیں ہوئیں۔ میں نے کہہ دیا کہ گاؤں میرا ہے میں نے اپنے نام سے لیا ہے۔ اس سے تمھارا کوئی واسطہ نہیں۔ بس جامے سے باہر ہوگئیں۔ جو جی میں آیا بکتی رہیں۔ اسی وقت مجھے نکال دیا اور کہا۔ میں تم سے لڑکر اپنا گاؤں لے لوں گی۔ اب آج ان کی طرف سے میرے اوپر مقدمے دائر ہوگا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ میرا اس پر قبضہ ہے۔ ایک نہیں ہزار مقدمے چلائیں۔ ڈگری میری ہوگی۔ ماں نے بہو کی طرف دیکھا۔ بہو نے ماں کی طرف تاکا۔ ماں بولیں۔ ”کیوں بھیا؟ وہ گاؤں تو تم نے انھیں کے روپے سے

انھیں کے لیے لیا تھا؟

منشی۔ لیا تھا۔ تب لیا تھا۔ اب مجھ سے ایسا آباد زرخیز گاؤں چھوڑا نہیں جاتا۔ وہ میرا کچھ نہیں کر سکتیں۔ اپنے روپے کی وصول یابی کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ ڈیڑھ سو گاؤں تو ہیں۔ تب بھی ہوس نہیں مانتی۔

ماں۔ بیٹا، کسی کے دھن ہوتا ہے تو وہ اسے پھینک تھوڑا ہی دیتا ہے۔ تم نے اپنی نیت خام کی۔ یہ اچھا نہیں کیا۔ دنیا تم کو کیا کہے گی۔ اور دنیا چاہے کچھ کہے یا نہ کہے بھلا تم کو ایسا چاہیے کہ جس کی گود میں اتنے دن پلے، جس کا اتنے دنوں تک نمک کھایا، اب اسی سے دغا کرو۔ نارائن نے تمھیں کیا نہیں دیا ہے۔ مزے سے کھاتے ہو، پہنتے ہو، گھر میں نارائن کا دیا چار پیسے ہیں۔ بال بچے ہیں۔ اور کسی کو کیا چاہیے۔ میرا کہنا مانو۔ یہ کلنک کا ٹیکا اپنے ماتھے نہ لگاؤ یہ اجس مت لو۔ برکت اپنے پسینے کی کمائی میں ہوتی ہے۔ حرام کی کوڑی کبھی نہیں پھلتی۔

منشی۔ یہ سب باتیں پوتھی کے بیگن ہیں۔ دنیا ان پر چلنے لگے تو سارا نقشہ بگڑ جائے۔ میں نے اتنے دنوں ان کی خدمت کی۔ ایسے ایسے چار پانچ گاؤں میری ہی بدولت بڑھ گئے۔ جب تک پنڈت جی زندہ تھے، میری نیت کی قدر تھی۔ آنکھ میں دھول ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ خود ہی میری خاطر کردیا کرتے تھے۔ انھیں مرے ہوئے آٹھ سال ہوگئے۔ مگر مسماۃ کے ایک بیڑے پان کی بھی قسم کھاتا ہوں۔ میری ذات سے ان کی ہزاروں روپے ماہوار کی بچت ہوتی تھی۔ کیا ان کو اتنی سمجھ نہیں تھی کہ یہ شخص جو اتنی ایمان داری سے میرا کام کرتا ہے۔ اس نفع میں کچھ اس کا بھی حق ہے یا نہیں۔ حق کہہ کر نہ دو۔ انعام کہہ کر دو۔ کسی طرح دو تو۔ مگر وہ تو سمجھتی تھیں کہ میں نے اسے دس روپے مہینے پر مول لے لیا ہے۔ میں نے آٹھ سال تک صبر کیا۔ اب کیا دس روپے میں زندگی بھر غلامی کیا کروں اور اپنے بچوں کو دوسروں کا منھ تاکنے کے لیے چھوڑ جاؤں؟ مجھے یہ موقع ملا ہے۔ اسے کیوں چھوڑوں؟ زمینداری کی ہوس لیے ہوئے کیوں مروں؟ جب تک زندہ رہوں گا۔ خود کھاؤں گا۔ میرے بعد میرے بچے چین اڑائیں گے۔'' ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولیں۔ بیٹا! میں نے تمھارے منھ سے ایسی بات کبھی نہ سنی تھی۔

تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تمھارے آگے بال بچے ہیں۔ آگ میں ہاتھ نہ ڈالو۔" بیوی نے ساس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ایسا دھن نہ چاہیے۔ ہم اپنی روٹی دال میں خوش ہیں۔"

منشی۔ اچھی بات ہے۔ تم لوگ روٹی کھانا۔ گزی گاڑھا پہننا۔ مجھے اب حلوے پوری کی خواہش ہے۔"

ماں۔ یہ ادھرم مجھ سے نہ دیکھا جائے گا۔ میں گنگا میں ڈوب مروں گی۔"

بیوی۔ "تمھیں یہ کانٹے بونا ہے تو مجھے میکے پہنچادو۔ میں اپنے بچوں کو لے کر اس گھر میں نہ رہوں گی۔"

منشی نے جھنجھلاکر کہا۔ "تم لوگوں کی عقل تو بھنگ کھاگئی ہے۔ یہ سب سرکاری ملازم رات دن دوسروں کا گلا دبا دبا کر رشوتیں لیتے ہیں اور چین کرتے ہیں، نہ ان کے بال بچّوں ہی کو کچھ ہوتا ہے نہ ان کو۔ ادھرم ان کو کیوں نہیں کھا جاتا۔ جو مجھ ہی کو کھا جائے گا۔ میں نے تو ایمان داروں کو ہمیشہ تکلیف ہی میں دیکھا۔ میں نے تو جو کیا ہے اس کا سکھ اٹھاؤں گا۔ تم لوگوں کے جی میں جو آئے کرو۔

(۷)

صبح کے وقت بھان کنور کا دفتر کھلا۔ تو کاغذات سب غائب تھے۔ منشی چھکن لال بدحواس گھر میں گئے۔ اور مالکہ سے پوچھا۔ کاغذات کیا آپ نے اٹھوا لیے ہیں؟" بھان کنور نے کہا۔ "مجھے کیا خبر۔ جہاں آپ نے رکھے ہوں گے۔ وہیں ہوں گے۔" دم کے دم میں سارے گھر میں طوفان مچ گیا۔ پہرے داروں پر مار پڑنے لگی۔ بھان کنور کو معاً ست نرائن لال پر شبہ ہوا۔ مگر ان کے خیال میں چھکن لال کی مدد کے بغیر یہ کام ہونا غیر ممکن تھا۔ پولیس میں رپٹ ہوئی۔ ایک اوجھا نام نکالنے کے لیے بلایا گیا۔ مولوی صاحب نے قرعہ پھینکا، اوجھا نے بتلایا کسی پُرانے دشمن کا یہ کام ہے۔ مولوی صاحب نے بتلایا کسی گھر کے بھیدی نے یہ حرکت کی ہے۔ شام تک یہی دوڑ دھوپ رہی اور تب یہ صلاح ہونے لگی کی ان کاغذات کے بغیر مقدمے کیوں کر چلے گا۔ روداد پہلے ہی کمزور تھی۔ جو کچھ سہارا تھا۔ انھیں اندراجات کا تھا، جو خود منشی ست نرائن لال نے کیے تھے۔ اب تو وہ ثبوت بھی ہاتھ سے گئے۔ دعوے میں کچھ جان ہی نہیں باقی رہی۔ مگر بھان کنور نے

مقدمے دائر کرنے پر زور دیا۔ بلا سے ہار جائیں گے۔ ہماری چیز کوئی دوسرا چھین لے تو ہمارا دھرم ہے کہ اس چیز کو واپس لینے کے لیے اپنے قابو بھر لڑیں۔ ہار مان کر بیٹھ رہنا بزدلوں کا کام ہے۔ سیٹھ جی وکیل کو اس سانحے کی اطلاع دی گئی۔ انھوں نے بھی یہی کہا۔ کہ مقدمہ بالکل بے جان ہوگیا۔ صرف عقلی اور قیاسی دلیلوں پر دار و مدار ہے۔ عدالت نے تسلیم کیا تو کیا۔ ورنہ ہارنا پڑے گا۔ پر بھان کنور کو ضد تھی کہ مقدمہ ضرور دائر ہو۔ لکھنؤ اور الہ آباد سے دو بلند بانگ بیرسٹر بلائے گئے۔ اور ایک ہفتے کے اندر استغاثہ دائر ہو گیا۔

سارے شہر میں اس مقدمے کی دھوم تھی۔ کتنے ہی رؤسا کو بھان کنور نے شہادت میں طلب کیا تھا۔ دلچسپی کا خاص سبب یہ تھا کہ بھان کنور خود بھی پردے کی آڑ میں بیٹھی ہوئی روداد سنتی تھی۔ کیونکہ اسے اب اپنے مختاروں اور ملازموں پر مطلق بھروسہ نہ تھا۔

استغاثے کے بیرسٹر نے ایک مدلل اور موثر تقریر کی۔ اس نے منشی ست نرائن کی سابقہ دیانت اور خلوصِ نیت اور ان پر پنڈت بھرگودت کے کامل اعتماد کا ذکر کیا۔ بعد ازاں یہ دکھایا کہ مدعا علیہ کی مالی حالت ہرگز ایسی نہ تھی۔ جو اتنے صرفِ کثیر کی متحمل ہوسکتی۔ آخر میں اس نے منشی جی کی دغا اور بدعہدی پر ایسے رقت آمیز پیرائے میں بحث کی کہ سامعین کی آنکھیں پُرآب ہوگئیں۔ ”کتنے افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ ایسا وفادار، آقا پرست آدمی رفتہ رفتہ اتنا گرجائے کہ اس کی بے کس بیوہ اوریتیم بچوں کی گردن پر چھری پھیرنے سے باز نہ آئے، جن کا نمک اس کی ہڈیوں میں پیوست ہوگیا ہے۔ انسانی خباثت اور کجروی کی اس سے زیادہ عبرت ناک مثال نہیں مل سکتی۔ نتائج کے اعتبار سے دیکھیے تو اس شخص کی سابقہ دیانت اور وفا کی وقعت بالکل باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ وہ جواہر نہ تھے بلکہ سنگ ریزے تھے۔ جو محض ایک رنگین جال تھا۔ جو ایک خوش اعتقاد اور کم اندیش رئیس کو پھنسانے کے لیے پھیلایا گیا تھا۔ خیال کیجیے کہ اس شخص کا باطن کتنا تاریک کتنا گہرا اور اس کی خیانت کتنی دور رس ہے۔ اپنے حریف کے ساتھ دغا کرنا کسی حد تک معافی کے قابل ہے۔ مگر اس شخص نے ان بے کسوں کے ساتھ دغا کی ہے جن کے ساتھ بہبودی کرنا انسانی سرشت کا خاصہ ہے۔ کاش ہمارے ہاتھ میں اندراجات ہوتے جو بیعنامہ لکھانے کے وقت منشی صاحب ممدوح نے فرمائے تھے۔ تو

عدالت پر ان کی سیہ باطنی روشن ہوجاتی۔ مگر ان کا دفتر سے عین برخاستگی کے روز غائب ہوجانا بھی عدالت کے لیے کچھ کم یقین انگیز نہ ہونا چاہیے۔ ایسی رزالت کے بعد اس شخص کے نزدیک کوئی کام ناکردنی نہیں ہوسکتا۔"

کئی روز تک شہر کی شہادتیں ہوئیں۔ مگر بیشتر سماعی تھیں۔ دو ایک صاحبوں نے چشم دید شہادت کا دعویٰ کیا۔ پر جرح میں اکھڑ گئے۔

آج کی کاروائی ختم ہوگئی۔ دوسرے دن پھر مقدمے پیش ہوا۔

فریقِ مخالف کے وکیل صاحب نے جوابی تقریر کرنا شروع کی۔ جس میں تضحیک کا پہلو غالب تھا۔ "یہ نرالی منطق ہے کہ ایک دولت مند کا ملازم جو کچھ خریدے، وہ اس کے آقا کی چیز ہے۔ اس دلیل کے مطابق ہماری گورنمنٹ کو اپنے ملازمین کی جائداد پر قبضہ کرلینا چاہیے۔ یہ تسلیم کرنے میں ہم کو عذر نہیں کہ ایسی کثیر رقم ہماری دسترس سے باہر تھی اور یہ رقم ہم نے اپنے آقا ہی سے قرض لی۔ مگر بجائے اس کے کہ ہم سے قرضے کی وصولی کا تقاضا کیا جاتا ہم سے وہ جائداد مانگی جاتی ہے۔ حساب کے کاغذات پیش کیے جائیں تو وہ صاف بتلا دیں گے کہ اب میرے ذمے بھان کنور کا ایک حبہّ بھی باقی نہیں ہے۔ اگر میں آپ سے قرض لے کر اپنی شادی کرلوں تو کیا کل آپ مجھ سے میری بیوی کو چھین لینے کا دعویٰ کریں گے؟

ہمارے روشن خیال دوست نے ہمارے اوپر بے کسوں اور یتیموں کے ساتھ دغا کرنے کا الزام لگایا ہے۔ اگر منشی ست نرائن لال کی نیت فاسد ہوتی تو اس کا بہترین موقع وہ تھا، جب اس کے آقائے نامدار کی وفات ہوئی تھی۔ اس طولانی انتظار کی کیا ضرورت تھی۔ اگر آپ شیر کو پھنسا کر اس کے بچے کو اسی وقت نہیں پکڑ لیتے بلکہ اسے بڑھنے اور خونخوار ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ تو مجھے آپ کے دماغ کے صحیح ہونے پر شبہ ہوگا۔ مگر شاید منشی ست نرائن لال کے رنگین جال میں کوئی ایسی کرامات ہو۔ جسے سمجھنے میں ہمارے عالم دوست قاصر ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ منشی جی نے حقِ نمک ادا کردیا۔ آٹھ سال تک کمالِ دیانت سے کام انجام دیا۔ اور آج انھیں اپنی نیک نیتی کا ثمرہ جو مل رہا ہے وہ نہایت درجہ دل دوز اور جگر خراش ہے۔ اس میں بھان کنور کی کوئی خطا نہیں، وہ ایک نیک خاتون ہیں۔ مگر اپنی صنف کی اعتقادی کمزوریوں سے خالی نہیں۔ دیانت دار آدمی خاصۃً صاف گو اور کم سخن ہوتا ہے۔ اسے باتوں میں نمک مرچ ملانے اور قند وشکر گھولنے کی

ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی باعث ہے کہ پنڈت جی کی بیوہ پر شیریں بیان رقیبوں کو وار کرنے کا موقع مل گیا۔ اس دعوے کی بنیاد صرف اتنی ہے اور کچھ نہیں۔ بھان کنور یہاں موجود ہیں۔ کیا وہ کہہ سکتی ہیں کہ اس آٹھ سال میں کبھی اس موضع کا ذکر انھوں نے کیا؟ کبھی اس کے نفع نقصان، آمد وخرچ یا لین دین کا چرچا ان سے کیا گیا؟ میں گورنمنٹ کا ملازم ہوں۔ مگر میں آج دفتر میں آکر اپنے خانگی انتظامات کی داستانیں چھیڑوں اپنے اخراجات کی زیادتی اور اپنے خدمت گار کی نیکیوں کا قصہ گانے لگوں، تو شاید مجھے بہت جلد اپنے عہدے سے سبک دوش ہونا پڑے اور ممکن ہے کچھ دنوں بنارس کے شاندار مہمان خانے میں رکھا جاؤں۔"

اس کے بعد متعدد شہادتیں پیش ہوئیں۔ بالخصوص قرب و جوار کے مواضعات کے لوگوں کی، جنھوں نے بیان کیا کہ منشی ست نرائن لال کو اپنے دستخط سے رسیدیں دیتے اور اپنے ہی نام سے خزانے میں روپے داخل کرتے دیکھا ہے۔ اس موضع کا دفتر اسی جگہ تھا۔ اس میں منشی جی کی سیر بھی ہوتی ہے وغیرہ۔

اس کاروائی کے بعد شام ہوگئی۔ منصف عدالت نے کل فیصلہ سنانے کا وعدہ کیا۔

(۸)

منشی ست نرائن لال کی فتح اب یقینی تھی۔ استغاثے کی شہادتیں کمزور تھیں، بحث قیاسی دلیلوں پر مبنی۔ ان کے منصوبے اب پورے ہونے والے تھے۔ ان کا شمار بھی زمینداروں میں ہوگا اور اپنی سعی و محنت سے بہت جلد وہ بھی رؤسا کے زمرے میں داخل ہوسکیں گے۔ لیکن کسی نہ کسی وجہ سے وہ اب شہر کے شرفاء سے آنکھیں ملاتے شرماتے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی ان کا سر نیچا ہوجاتا تھا اور وہ ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ اس مسئلے کو نہ چھیڑدیں۔ وہ بازار میں نکلتے تو انھیں دیکھ کر اکثر دکانداروں میں سرگوشیاں ہونے لگتیں۔ اور لوگ ان کی طرف بری نگاہوں سے دیکھتے۔ اس لیے وہ بازار سے سر جھکائے قدم بڑھائے بھاگ نکلتے تھے۔ اب تک لوگ انھیں ایک سچا، بے لوث اور پاک طینت آدمی سمجھتے تھے۔ شہر کے وضعدار اور شریف لوگ انھیں اعزاز کی نگاہ سے دیکھتے اور بڑی خاطر سے پیش آتے۔ حالانکہ ابھی منشی جی کو آزمائش کا موقع نہیں ملا تھا۔ پر ان کا دل کہتا تھا کہ اب میری وہ بات نہیں رہی ۔ اصل حقیقت سارے زمانے پر روشن ہے۔ اور عدالت میرے حق میں فیصلہ ہی کیوں نہ کردے لیکن میری ساکھ اب جاتی رہی۔ دلوں

سے میری عزت اٹھ گئی۔ اب مجھے بھی لوگ خود غرض ریاکار۔ مطلبی سمجھیں گے۔

غیروں کی تو بات الگ رہی۔ خود ان کے گھر والے اب ان کے شریک نہیں تھے بوڑھی ماں نے تین دن سے منہ میں پانی نہیں ڈالا۔ اور بیوی بار بار ہاتھ جوڑ کر کہتی کہ اپنے بچوں پر رحم کرو۔ برے کام کا پھل کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ نہیں تو پہلے مجھ ہی کو زہر دے دو۔"

فیصلے کے دن صبح کو ایک کنجڑن سبزی لے کر آئی۔ منشائن سے بولی۔ "بہو جی! ہم نے بجار میں ایک بات سنی ہے۔ برا نہ مانو تو کہوں۔ جس کو دیکھو ان کے منہ میں یہی بات ہے کہ لالہ بابو نے جال ساجی سے پنڈتائن کا الاکا لے لیا۔ ہمیں تو اس پر اکین کبھی نہیں آتا۔ لالہ بابو نے نہ سنبھالا ہوتا تو اب تک پنڈتائن کی ایک انگل زمین نہ بچتی۔ انھیں کا ایسا جگر تھا کہ سب کو سنبھال لیا۔ تو اب کیا انھیں کے ساتھ بدی کریں گے؟ ارے بہو! کوئی کچھ ساتھ لاتا ہے کہ لے جائے گا۔ یہی نیکی بدی رہ جاتی ہے۔ برے کا پھل برا ہی ہوتا ہے۔ آدمی نہ دیکھے پر اللہ سب کچھ دیکھتا ہے۔"

بہو جی پر گھڑوں پانی پڑگیا۔ جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے تو اس میں سما جاؤں۔ عورتوں میں عزت اور حیا بہت زیادہ ہوتی ہے۔ طعن و تشنیع کی برداشت ان سے نہیں ہوسکتی۔ سر جھکائے ہوئی بولی۔ "بوا میں ان باتوں کو کیا جانوں۔ میں نے تو یہ بات آج تمھارے منہ سے سنی ہے۔ کون کون سی ترکاری ہے۔"

منشی ست نرائن لال بھی اپنے کمرے میں پڑے کنجڑن کی یہ باتیں سن رہے تھے۔ اس کے چلے جانے کے بعد وہ بیوی کے پاس آکر پوچھنے لگے۔ "یہ کیا کہہ رہی تھی۔؟"

بیوی نے شوہر کی طرف سے منہ پھیر کر زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے نہیں سنا؟ تمھارے کرتب کا بکھان کررہی تھی۔ تمھاری بدولت دیکھیں کس کس کے منہ سے یہ باتیں سننا پڑتی ہیں۔ اور کس کس سے منہ چھپانا پڑتا ہے۔"

منشی جی اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔ بیوی کی باتوں کا کچھ جواب نہ دیا۔ دل پر غیرت کا غلبہ ہوگیا۔ جس شخص کی نیک نیتی کی سارے شہر میں دھوم ہو۔ جو ہمیشہ غرور سے گردن اٹھا کر چلتا رہا ہو۔ جو ہمیشہ اعزاز و احترام کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہو۔ وہ کبھی زبانِ خلق سے بے پروا نہیں ہوسکتا۔ بدنامی کا خوف ہی بدنیتی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ منشی جی نے سمجھا تھا، میں اس فعل کو ایسے خفیہ طریقہ سے کرلوں گا کہ کسی کو کانوں کان

خبر نہ ہوگی۔ اور میرے اعتبار میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آئے گا۔ ان کی یہ آرزو تو پوری نہ ہوئی۔ مشکلات پیدا ہوگئیں۔ ان مشکلات کے دور کرنے میں انھیں چوری تک کرنا پڑی۔ لیکن یہ سب اسی بدنامی کے خوف سے جس میں کوئی یہ نہ کہے کہ اپنی مالکہ کو دھوکا دیا۔ باوجود اس احتیاط کے وہ رسوائی کے تازیانہ سے نہ بچ سکے۔ بازار کی سودا بیچنے والی عورتیں تک اب انھیں ذلت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ پنجہ نفس میں دیا ہوا ایمان اس صدمے کو برداشت نہ کرسکا۔ منشی جی سوچنے لگے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ مانا کہ میں صاحبِ جائداد ہوجاؤں گا۔ لیکن بدنامی میرے گلے کا ہار بنی رہے گی۔ عدالت کا فیصلہ مجھے ذلت سے نہ بچا سکے گا۔ ثروت کا نتیجہ ہے، عزت اور وقار۔ جب یہی نہیں تو ثروت کس کام کی؟ اطمینانِ قلب کھو کر، دنیا کی آنکھوں میں ذلیل بن کر، بے حیائی کا بوجھ سر پر رکھ کر اور اپنے گھر میں نفاق بو کر ثروت اور دولت میرے کس کام آئے گی؟ اور اگر سچ مچ مجھ پر قہر الٰہی نازل ہو۔ تو میرے لیے منھ میں کالک لگا کر گھر سے نکل جانے کے سوا اور کوئی علاج نہ ہوگا۔ نیک نیت انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو لوگ اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں۔ سیہ کاروں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو لوگ اسے طعنے دیتے ہیں۔ اس حالت میں ایشور بے انصاف ٹھیرایا جاتا ہے۔ لیکن اس حالت میں ایشور کے انصاف کی تعریف ہوتی ہے۔ پرماتما کسی طرح مجھے اس غار سے نکالو! کیوں نہ جاکر میں بھان کنور کے پیروں پر گر پڑوں اور کہوں کہ مقدمے اٹھا لیجیے ہائے افسوس! پہلے مجھے یہ بات کیوں نہ سوجھی؟ پر اَب کیا ہوسکتا ہے؟ آج تو فیصلے کا دن ہے۔

منشی جی بہت دیر تک انھیں خیالات میں ڈوبے رہے۔ لیکن کچھ فیصلہ نہ کرسکے کہ کیا کرنا چاہیے۔

(۹)

بھان کنور کو یقین ہوگیا کہ اب گاؤں ہاتھ سے جاتا ہے۔ بے چاری ہاتھ مل کر رہ گئی۔ رات بھر اسے نیند نہیں آئی۔ رہ رہ کر منشی ست نرائن لال پر غصہ آتا تھا۔ ظالم! ڈھول بجا کر میرا پچاس ہزار کا مال لیے جاتا ہے اور میں کچھ نہیں کرسکتی۔ آج کل کے یہ انصاف کرنے والے بالکل آنکھ کے اندھے ہیں۔ جس بات کو سارا زمانہ جانتا ہے۔ وہاں تک بھی ان کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ بس دوسروں کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ کورے کاغذوں کے غلام! انصاف کے معنی ہیں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی۔ حق دار کو ملے۔ یہ نہیں کہ

منصف صاحب خود ہی کاغذوں کے دھوکے میں آجائیں۔ اسی سے تو ایسے متفنی، جعلیے اور دغاباز آدمیوں کی ہمتیں بڑھ گئی ہیں۔ لیکن خیر! گاؤں جاتا ہے تو جائے تم تو کہیں شہر میں منھ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔

اس خیال سے بھان کنور کو کچھ تسکین ہوئی۔ دشمن کا نقصان ہمیں اپنے فائدے سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ یہ انسانی خاصہ ہے۔ تم ہمارا ایک گاؤں لے گئے، نارائن چاہیں گے تو تمھارے ہاتھ سے بھی یہ جلدی نکلے گا۔ خود نرک کی آگ میں جلو گے اور تمھارے بعد تمھارے گھر میں کوئی نام لیوا نہ رہ جائے گا!

فیصلے کا دن آگیا۔ آج اجلاس پر معمول سے زیادہ بھیڑ بھاڑ تھی۔ اس مقدمے سے ہر خاص وعام کو دلچسپی تھی۔ ایسے مقطع لوگ نظر آتے تھے جو بگلوں کی طرح سرکاری تقریبوں کے چشمۂ شیریں کے کنارے ہی نظر آتے ہیں۔ مقدمے اپنی نوعیت میں فرد تھا۔ وکیلوں، مختاروں کی کالی پلٹن کا ہجوم تماشائیوں سے کچھ ہی کم تھا۔

عین مقررہ وقت پر جج صاحب اجلاس پر نمودار ہوئے۔ وسیع ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ ہمہ تن گوش وچشم ہوگئے۔

اہلمد نے صندوق سے تجویز نکالی۔ اشتیاق نے لوگوں کو ایک ایک قدم اور آگے کھسکا دیا۔

جج نے فیصلہ سنایا۔ ''مدعی کا دعویٰ خارج۔ فریقین اپنے اپنے مصارف کے ذمّے دار ہیں۔'' ہر چند عام قیاس اس فیصلے کی جانب مائل تھا۔ تاہم آج جج کی زبان سے سن کر سارے مجمع میں ہلچل پڑگئی۔ جو اندیشہ تھا۔ وہ واقعہ ثابت ہوا، مایوسانہ انداز سے سرگوشیاں کرتے ہوئے لوگ عدالت سے باہر نکلنے لگے۔

دفعتاً بھان کنور گھونگٹ نکالے اجلاس پر آکر کھڑی ہوئی۔ جانے والے لوٹ پڑے۔ جو باہر نکل گئے تھے۔ وہ لپک کر آگئے۔ ساری جماعت دم بخود ہو کر بھان کنور کی طرف تاکنے لگی۔ ایک ساحر تھا۔ جس نے انگلی کے اشارے سے ساری جماعت پر منتر ڈال دیا تھا۔

بھان کنور نے جج صاحب سے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سرکار کا حکم ہو، تو میں ست نرائن لال سے کچھ پوچھوں؟''

یہ ایک بے ضابطہ بات تھی۔ تاہم جج نے از راہِ انسانیت اس کی اجازت دے دی۔ تب بھان کنور نے ست نرائن لال کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''لالہ جی! سرکار نے تمھاری

ڈگری تو کر ہی دی۔ گاؤں تمھیں مبارک رہے۔ مگر ایمان آدمی کا سب کچھ ہے۔ ایمان سے کہہ دو گاؤں کس کا ہے؟"

یہ سوال سن کر ہزاروں آدمی منشی جی کی طرف حیرت آمیز استفسار کی نگاہوں سے تاکنے لگے۔ منشی جی دریائے فکر میں ڈوبے، دل میں نفس اور ایمان کے درمیان داؤ پیچ ہونے لگے۔ ہزاروں آدمیوں کی آنکھیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ اصل واقعہ کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ اتنے آمیوں کے روبرو جھوٹی بات زبان سے نہ نکل سکی۔ غیرت نے زبان بند کردی۔ "میرا" کہہ دینے میں کام بنتا تھا۔ کوئی امر مانع نہ تھا۔ لیکن بدترین گناہ کی جو سزا دنیا دے سکتی ہے اس کے ملنے کا پورا خوف تھا۔ "آپ کا" کہہ دینے سے کام بگڑتا تھا۔ جیتی جتائی بازی ہاتھ سے جاتی تھی۔ لیکن بہترین فعل کے لیے دنیا جو انعام دے سکتی ہے، اس کے ملنے کی امید کامل تھی۔ اس امید نے خوف کو دبا لیا۔ میں اب اپنے ایمان کو بچا سکتا ہوں۔ اب بھی دنیا کی نگاہوں میں عزت پاسکتا ہوں۔ انھوں نے آگے بڑھ کر بھان کنور کو سلام کیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے بولے۔ "آپ کا" فتح حق کا ایک نعرہ بلند کمرے میں گونجتا ہوا عالمِ بالا تک جا پہنچا۔ جج نے کھڑے ہوکر کہا۔ "یہ قانون کا فیصلہ نہیں ایمان کا فیصلہ ہے۔"

داستان ختم ہوگئی۔ داستان نہیں امر واقعہ ہے۔ فریقین اب بھی شاید بقیدِحیات ہیں۔ ست نرائن لال سے جتنے ہی لوگ شاکی تھے، اتنے ہی اب ان کے مداح ہوگئے۔ انسانی قانون پر خدائی قانون نے جو شاندار فتح پائی تھی۔ اس کے شہر میں مہینوں چرچے ہوتے رہے۔ بھان کنور ست نرائن لال کے گھر گئی۔ انھیں منا کر لائی۔ پھر اپنا سارا کاروبار ان کے ہاتھ میں سونپا۔ اور کچھ دنوں میں وہی موضع منشی جی کے نام ہبہ کردیا۔ منشی جی نے بھی اس کو اپنے تصرف میں لانا مناسب نہ سمجھا۔ کرشن آرپن کردیا۔ اب اس کی آمدنی محتاج اور بے کسوں اور مسکین طلبا کی امداد میں صرف ہوتی ہے۔

یہ افسانہ پہلی بار ہندی ماہنامہ سرسوتی جولائی 1917 میں شائع ہوا عنوان تھا ایشوری نیائے، اردو مجموعہ پریم بتیسی اور ہندی مجموعہ مان سروور 5 میں شامل ہے۔

بیوگ اور ملاپ

بابو دینا ناتھ کے ہردے میں دیش اور سوارتھ کا سنگرام اسی سمے آرمبھ ہوا جب انھوں نے بی۔ اے پاس کیا۔ وہ بھارت سیوک سمیتی میں جانا چاہتے تھے لیکن سوارتھ نے دیش پر وجے پائی۔ انھوں نے قانون پڑھنا شروع کیا۔ دیشانُراگ (ملک کا وفادار) کہتا تھا۔ نربلوں کی سیوا کرو۔ سوارتھ کہتا تھا۔ دھن اور کرتی پیدا کرو۔ دیس کی پھر ہار ہوئی۔ دھن نے اپنی طرف کھینچا۔ سیوا بھاؤ، دھن کی لالسا کے نیچے دب گیا۔ جیسے اگنی راکھ کے نیچے دب جاتی ہے۔ لیکن دبی ہوئی آگ کے سدرس (برابر) یہ بھاؤ بھی بھیتر ہی بھیتر جاگتا رہا۔ یہاں تک کے پانچ برس بیت گئے اور ان کے نیتک گیان اور گراہیتا کی کھیاتی (شہرت) اتنی ہوئی کہ ان کا نام گورنمنٹ پلیڈری کے لیے لیا جانے لگا۔ اسی بیچ ہوم رول کا آندولن شروع ہوا۔ دیا ناتھ کے ہردے میں پھر وہی پرانا سنگرام وہ پریشرم شیل (محنت میں مشغول) تھے، چتر تھے، کاریہ کُشل تھے، اچھے وَکتا تھے، اچھے لیکھک تھے۔ اگر آبھاؤ تھا تو ساہس کا۔ یہ ان کے لیگ میں سمّلت (شامل) ہوگئے اور پہلے ہی ادھیویشن میں ان پر سبھوں کی رائے سے منتری پد کا بھار رکھ دیا گیا۔ دیا ناتھ کام تو کرنا چاہتے تھے، پر گپت طریقے سے، اس لیے نہیں کہ وہ بھیرو تھے، صرف اس لیے کہ وہ اپنے پوجیّ پتا جی کو ناخوش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سبھا سماپت ہونے پر وہ گھر پہنچے اور ابھی کپڑے اتار ہی رہے تھے کہ شہر کا کوتوال دو تھانے داروں اور دس بارہ کانسٹبلوں کے ساتھ ان کے دروازے پر آدھمکا۔ دیا ناتھ کے پتا لالہ جانکی ناتھ گھبرا کر باہر نکل آئے۔ کسی آمنگل کی آشنکا ہوئی۔ چہرہ پھیکا پڑگیا بولے۔ ”آیئے سردار صاحب، مزاج تو اچھے ہیں۔ ارے، بھکیلو پان لے آ۔“

کوتوال نے گھوڑے سے اُتر کر، چھڑی سے بوٹ کو کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔ ”اس سمے مجھے خاطر و مدارات سے معافی دیجیے۔ میں ایک سرکاری کام سے آیا ہوں۔ آپ سے میری پرانی ملاقات ہے، لیکن جناب سرکاری فرض کا کیا کروں؟ بابو دیو ناتھ ہیں؟“

جانکی ناتھ کانپتے ہوئے بولے۔ "جی ہاں، ہوں گے تو، ابھی کچہری سے آئے ہیں۔"

(دھیرے سے)

"پرماتما کی مرضی ہوگی تو چند مہینوں میں سرکاری وکیل ہوئے جاتے ہیں۔ جج صاحب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔" لیکن کوتوال اس دھمکی میں نہیں آیا۔ ہاں، جانکی ناتھ کے آنترک بھاؤ کو تاڑ گیا۔ بولا۔ "ذرا ان کو بُلا لیجیے، ان کا بیان لکھنا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک نوٹ بک اور فاؤنٹن پن نکا لا۔ جانکی ناتھ کا خون ٹھنڈا پڑ گیا۔ بولے۔ "کوئی خاص کام ہے؟"

کوتوال۔ "جی ہاں خاص کام ہے۔ آج لوگوں نے 'ہوم رول' کا بڑے زور شور کے ساتھ جلسہ کیا ہے۔ گورنمنٹ کے خلاف خوب غلط بیانیاں کی گئی ہیں۔ بابو دیا ناتھ اس کے سکریٹری مقرر ہوئے ہیں۔ ان سے حاضرین جلسہ کے نام دریافت کرنا ہے اور یہ دوستانا صلاح بھی دینی ہے کہ ہوشیار ہوجائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم کو ان کے ساتھ ضابطے کا برتاؤ کرنا پڑے۔"

جانکی ناتھ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ دوڑے ہوئے اندر گئے اور دیا ناتھ سے سروش بولا۔ "یہ تم نے کیا آگ لگا رکھی ہے؟ دیکھو تو دروازے پر کوتوال کھڑے کیا کہہ رہے ہیں؟ تمھاری بدولت جو کبھی نہ ہوا تھا، وہ آج ہوگیا۔"

دیا ناتھ باہر آئے۔ کوتوال نے ان کی طرف تیز آنکھوں سے دیکھا اور بولا۔ "آپ آج ہوم رول جلسے میں تھے؟"

"جی ہاں، تھا۔"

"آپ اس کے سکریٹری ہوئے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"جلسے میں کون کون آدمی موجود تھے؟"

"مجھے یاد نہیں۔"

"خاص خاص آدمیوں کے نام بتا سکتے ہیں؟"

"ہوم رول کے دفتر سے ممبروں کی فہرست آپ کو مل سکتی ہے۔"

(۲)

لالہ جانکی ناتھ شہر کے بڑے آدمیوں میں تھے۔ آج کئی سال سے انھوں نے وکالت چھوڑ دی تھی۔ لیکن دھن خوب سنگرہ کر لیا تھا۔ کئی گاؤں کے زمیندار بھی تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ افسروں کے کرپا پاتر (ہردل عزیز) تھے۔ ان کی جتنی جان مان تھی، اتنی ان سے بڑے آدمیوں کی بھی نہیں تھی اور یہ کھلا ہوا بھید تھا کہ سرکاری وکالت کے سنبدھ میں دیا ناتھ کی یوگیتا سے ادھک جانکی ناتھ کی وِنے شیلتا (انکساری کی ٹھنڈک) کا شریہ (امتیاز) تھا۔ یہ اپنے یُوا کال میں سویم (خود) راجنیتک کاموں میں بھاگ لیتے رہے تھے، لیکن پنڈت ایودھیا ناتھ کی مِرتیو کے بعد سے انھوں نے ان کاموں سے منہ موڑ لیا تھا۔ اب ان کا زیادہ تر وقت سوارتھ سادھن میں گزرتا تھا۔ دیا ناتھ ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ انھیں کی سبھ کانشاؤں (طالب خیر) میں مگن رہتے تھے۔ ادھیکاری ورگ کو وِدائی اور بدھائی کے جلسوں میں وہ خوب یوگ دیتے تھے۔ ایسے اوسروں پر ان کی تقریریں بڑے معرکے کی ہوتی تھیں۔ بھاؤ اور بھاشا دونوں ہی سُندر۔

حالانکہ ان کی اوستھا پچپاس سے کم نہ تھی، پھر بھی ان کا سواستھ بہت ہی اچھا تھا۔ وہ دیا ناتھ کو ان کے مِتاہری (کم خوراک) ہونے پر کبھی کبھی لجّت بھی کیا کرتے تھے۔ بل بکرم (بہادری) کی ان میں نونتا (ندرت) نہیں تھیں۔ وہ روزانہ چار پانچ میل سیر کرنے جایا کرتے تھے، پرلوک بنانے کی بھی فکر میں رہا کرتے تھے۔ لیکن ایسے کام سے ہمدردی رکھنا بھی ان کے لیے نا ممکن تھا، جس سے ادھیکاریوں کی اَپرسنتا کا بھے ہو۔

کوتوال کے چلے جانے کے بعد دیا ناتھ سے بولے۔ "تمھیں کیا سوجھی ہے؟ تم اپنے کو مجھ سے زیادہ بدھی مان سمجھتے ہوگے، لیکن میں تم سے صاف طور سے کہتا ہوں کہ دھوکا کھاؤ گے۔ سَمے پڑنے پر کوئی کام نہ آئے گا۔ میں نے ایسے کتنے ہی آدمی دیکھیں ہیں، جنھوں نے دیش کے پیچھے اپنا سب کچھ تیاگ دیا۔ لیکن جب مقدمے میں پھنسے تو ان کی طرف سے پیروی کرنے والا بھی نہ ملا۔ میں نے تمھیں پہلے بھی سمجھایا ہے اور پھر سمجھاتا

ہوں ان کاموں میں ہاتھ نہ ڈالو۔ میں مر جاؤں گا تو جو جی چاہے کرنا۔ میں منع کرنے نہیں جاؤں گا۔ لیکن جب تک جیتا ہوں میرے اوپر اتنی دَیا کرو۔"

دیا ناتھ نے نرمی سے کہا۔ "مجھے لوگ زبردستی کھینچ لے گئے اور وہاں سکریٹری بنا دیے۔ اس وقت کیا کرتا؟ انکار کرنا سب کی نظر میں کائرتا کا پریچے دینا تھا۔ میری سمجھ میں تو بھے کی بات بھی کوئی نہیں۔ دیش بھر اس معاملے میں ایک زبان ہے۔"

جانکی۔ "خیر کچھ بھی ہو۔ تم ایک پتر لکھ کر سکریٹری کے پد سے فوراً استعفا دے دو۔"

دیا۔ "یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔"

جانکی۔ "پتا کا پتر پر ادھیکار مانتے ہو یا نہیں۔"

دیا۔ "مانتا ہوں اور یہی کارن ہے کہ اب تک میں راجنِتک کاموں سے دور بھاگتا رہا ہوں۔ کِنتو (لیکن) اب دیش میں جاگرتی (بیداری) پھیل رہی ہے۔ آکرمنیتا (لڑائی) کا سمے نہیں ہے۔ اس سمے تٹستھ (غیر جانب دار) بیٹھے رہنا اپنے دیش واسیوں پر گھور اتیاچار ہوگا۔

جانکی۔ "اچھی بات ہے۔ تمھارا جو جی چاہے کرو۔ تمھارے کہنے سے مجھے گیان ہوا کہ اب مجھے تمھاری باتوں میں بولنے کا ادھیکار نہیں ہے۔ لیکن اپنے دروازے پر پولیس کو روز کھڑے دیکھنا میری سہن شکتی کے باہر ہے۔ تمھیں اگر راجنِتک پھلجھڑیاں چھوڑنی ہیں تو میرے گھر سے دور چھوڑو۔ اس میں آگ نہ لگاؤ۔"

دیا ناتھ نے اپنے پتا سے ایسی نٹھر باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ یہ کٹھور شبد ان کے ہردے میں چبھ گئے۔ بولے۔ "جیسی آپ کی اِچھا!" یہ کہہ کر دیا ناتھ گھر میں گئے اور اپنی پتنی شیاما سے بولے۔ "دادا جی نے آج مجھے گھر سے نکل جانے کی آگیا دی ہے۔ اب اپنا بوریا بندھنا سنبھالو میں دوسرا مکان ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔" شیاما نے وِسمت (متعجب) ہوکر پوچھا۔ "یہ کس بات پر؟"

دیا۔ "کچھ نہیں۔ میں آج سوراجیہ سبھا میں چلا گیا تھا اسی کے سمبدھ میں پوچھ تاچھ کرنے کے لیے شہر کوتوال یہاں آئے تھے۔ دادا صاحب اس میں اپنی مان ہانی سمجھتے ہیں وہ

کہتے ہیں۔ "یا تو ہوم رول کو تیاگو یا میرے گھر سے نکلو۔" مجھے ہوم رول اس گھر سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ میری رات آج کسی دوسرے گھر میں کٹے گی۔ کداچت (شاید) میرا بوجھ انھیں اکھرنے لگا ہے۔ نہیں تو وہ اس طرح مجھے گھر سے نکلنے کا حکم نہ دیتے۔ میں جب تک لوٹ کر آتا ہوں تم اسباب ٹھیک کر رکھنا۔"

شیاما نے کہا۔ "تمھارا سامان تو باہر ہی ہے۔"

دیا۔ "اور تمھارا؟"

شیاما (کچھ سوچ کر)۔ "میں نہ جاؤں گی۔"

دیا ناتھ نے استمبھت (حیران) ہو کر پوچھا۔ "کیا تم میرے ساتھ نہیں چلو گی؟"

شیاما۔ "نہیں۔"

دیا ناتھ اور کچھ نہ بولے۔ کرودھ میں بھرے ہوئے گھر سے چل دیے۔ شیاما نے روکا بھی۔ پر اس کی انھوں نے ایک نہ سُنی۔ دوسرے گھر کی کھوج میں نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن شیاما کی نٹھرتا (بے رحمی) ہردے میں کانٹے کے سمان کھٹک رہی تھی۔ "میں اس پر کتنا بھروسا کرتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کا من کسی سنکٹ سے وِچلت (بدلنا) نہ ہوگا۔ لیکن ہاں! آج پہلی پَریکشا میں اس نے میرا گروَ چور کر دیا۔"

(۳)

دیا ناتھ اب ایک الگ مکان میں رہتے ہیں۔ ان کی آمدنی تین سو روپے ماہانہ سے کم نہ تھی۔ یہ نئے گرہستی اُتّم ریتی سے چل رہی تھی۔ نوکر چاکر، رسوئیاں سب موجود تھے۔ ہاں، ابھی تک گھوڑا گاڑی لینے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ پیر گاڑی پر کچہری جاتے تھے۔ اس دن سے پھر وہ اپنے پتا کے گھر بھی نہیں گئے اور نہ جانکی ناتھ ہی نے کچھ سُدھ لی۔ تعجب تو یہ ہے کہ شیاما بھی ان کی طرف سے بہ اطمینان بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی سَندیشہ بھی نہیں بھیجا۔ مانو ان سے کوئی ناتا ہی نہیں ہے۔

کچھ دنوں تک وہ پتا کے سلوک پر بہت بھرے رہے۔ اسی روش میں انھوں نے

'ہوم رول لیگ' کا کام ایسے اُتساہ میں کیا کہ نگر بھر میں سوراجیہ کی چرچا پھیل گئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں نگر کی کایا پلٹ ہوگئی۔ سوراجیہ پر بیاکھیانوں (تقریروں) کا تانتا بندھ گیا۔ ہوم رول پمپھلٹ چھپتے اور بانٹے جاتے۔ محلے محلے میں چھوٹی چھوٹی سبھائیں کرائی جاتیں۔ ہوم رول کے ارتھ سمجھائے جاتے اور لوگوں کو سوراجیہ سنبدھی باتوں کے جاننے کے لیے اُتساہت کیا جاتا۔ دیا ناتھ کے ان ادھوگوں (محنت) کا پھل یہ ہوا کہ نگر کی نئی جاگرتی کا ذکر جہاں چھڑتا ان کا نام پہلے وہاں آتا اور پتا پتر کے جھگڑے کا ذکر کرتے ہوئے متر لوگ ان کے آتمِک بل کو خوب سراہتے، لیکن جیسے جیسے دن بیتتے تھے ویسے ویسے دیا ناتھ کے من کی حالت میں فرق پڑتا جاتا تھا۔ سوچھند (بے باک) ہوکر جتنے اُتساہ سے دیا ناتھ نے دیش سیوا کا وِچار کیا تھا۔ اُتنا اُتساہ اپنے میں اب نہیں پاتے تھے۔ اس اوستھا میں جن ہردے ترنگوں کے اُٹھنے کا سوپن انھوں نے شروع میں دیکھا تھا۔ وہ صرف سوپن ہی سِدھ ہوا۔

دن بھر کی وکالت اور سوراجیہ سنبدھی کاموں کے بعد چھٹی پانے پر جب رات کو بچھونے پر پڑتے تب نِدرا آنے کے پہلے گھنٹوں ان کا دل وِچار ترنگوں سے ٹکرایا کرتا۔ اپنی ورتمان اوستھا پر سوچتے اور سوچتے گئے اس گئے زمانے پر جب وہ اپنے پِتا کی نظروں کے نیچے رہتے تھے۔ "اہا! کیا ہی سُکھ مَے سَمے تھا وہ جب اپنے پِتا کی گود میں کھیلا کرتے تھے۔ ایک دن کے لیے بھی پِتا سے جدائی نہ ہوئی۔ ساتھ کھاتے اور ساتھ گھومتے۔ ساتھ بیٹھتے اور ساتھ یاترا کرتے۔ پِتا بچپن کے دوست تھے ساتھ کھیلتے اور ساتھی بن کر اسکول پہنچانے جاتے۔ پِتا یووا اوستھا کا سہارا تھے۔ اپنے ہاتھ پیر ہوجانے پر بھی جدھر دیکھتے ان آسرے (سہارا) کا ہاتھ پاتے۔ اس سَمے نہ چنتا تھی نہ بھَے۔ پِتا کی گود کیا تھی، جننی کے مِردُل سنیہ (نازک پیار) کا پانی اور دیوک سُکھ اور شانتی کی چھایا تھی۔ اس نے جننی کی یاد بھی بھلا دی۔ اس دائے متی دیوی کی جس نے مِرتوشیا (بستر مرگ) پر پڑے ہوئے ان کو اپنے پتی کو گود میں رکھ کر کہا تھا کہ اپنے اس لال کو تمھاری شرن میں چھوڑ جاتی ہوں۔ اس پر سدیو دَیا رکھنا۔"

آج وِدھی کی وِچترگتی (عجیب رفتار) سے اس سارے سُکھ سنسار پر پانی پھر گیا۔

دیا ناتھ کا ہردے ان وِچاروں سے ٹک ٹک ہو جاتا تھا۔ سوچتے کہ مجھے نمرتا سے کام لینا تھا۔ پِتا اَپرسَن ہوئے تھے تو کیا ہوا۔ ان کو منا لینا تھا۔ بڑی بھول ہوئی۔ تب نہ صحیح، اب صحیح۔ لیکن وِچاروں کی گاڑی یہیں آکر رُک جاتی۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میرے اور ان کے وِچاروں میں فرق ہے۔ یہ اس سَمے بھی تھا۔ لیکن اس سَمے ان کا اور میرا مارگ الگ الگ نہیں ہوا تھا۔ اب پیچھے پھروں گا۔ دنیا ہنسے گی اور پھر اسی چنچلتا کا شکار بنوں گا جس کا آرمبھ اور بیچ میں بن چکا ہوں۔

اِدھر لالہ جانکی ناتھ کا ہردیے بھی وِچاروں کے ویگ سے اُتھل پُتھل ہو رہا تھا۔ دیا ناتھ کا اس پرکار چلا جانا انھیں بہت اکھرا۔ وہ سمجھتے تھے کہ دیا ناتھ ان کی اَپرسنتا سے بہت دُکھی ہوگا۔ آکر چرنوں پر گرے گا اور جیسا وہ کہیں گے ویسا وہ کرے گا۔ جیسا کہ ابھی تک کرتا رہا ہے۔ لیکن اس دن جانکی ناتھ کا بھرم دور ہوگیا۔ یہ جان کر کہ پُتر دوسرے مکان میں چلا گیا۔ پِتا کے رُوش کی اَگنی اور بھی بھڑک اُٹھی۔ ”اے! دیا ناتھ اور اس کا دماغ اتنا پھر جائے! وہ پِتا کا اتنا نرادار (بے عزتی) کرے! اس پِتا کا جس نے اس کے لیے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ جس نے اپنے جیون کا آدھار اسی کو مانا اور اپنی آشاؤں اور آکانشاؤں کا کیندر اسی کو سمجھا!“

کرودھ کا پارہ بڑھتا ہی گیا۔ پِتا کے سنیہ (پیار) میں اَاِستھرتا (ناپائیداری) نہیں آئی۔ پِتا کے ادھیکار میں دھکّا لگا تھا۔ ستا کا وِرودھ کسی سے بھی سہا نہیں جاتا۔ لوگوں نے بیچ میں پڑکر منانا چاہا۔ بڑی بڑی منتیں بھی کیں۔ پر جانکی ناتھ نے کسی کی ایک نہ سُنی۔ وہ یہی کہتے ابھی تک دیا ناتھ نے پِتا کی گود کا سُکھ اُٹھایا ہے۔ اچھا ہے اب وہ ذرا اس زندگی کا مزہ بھی اُٹھا لے۔ جیسے جیسے دن بیتے ویسے ویسے بوڑھے کے کرودھ میں بھی کمی ہوتی گئی۔ اَنت میں گرم لوہے کی گرمی دور ہوئی اور اس کے دور ہونے کے پشچات اس میں ٹھنڈک آئی۔ جانکی ناتھ کے ہردے میں پشچاتاپ کا بھاؤ اُدئے (طلوع) ہوا۔ وہ اپنے اُس کرودھ پر بہت پچھتاتے۔ اس گھڑی کو کوستے جب ان کے منہ سے وہ شبد نکلے تھے۔ وہ سوچتے میں نے بہت بُرا کیا۔ کیا میں نرمی سے کام نہیں لے سکتا تھا؟ جس بچّے پر میں سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ تب کیا اس پیار کے لیے میں اپنی زبان قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ روز

بروز یہ جوالا زور پکڑتی گئی۔ وہ اپنا کھانا پینا بھول گئے۔ نیند کوسوں دور تھی۔ گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ اب بیٹے کی ایک ایک چیز کو گھنٹوں دیکھا کرتے۔ اس کے چتر کو آنکھوں کے سامنے سے الگ نہیں کرتے اور گھنٹوں چپ چاپ آنسو بہاتے۔ اس دُکھ اور چنتا نے جانکی ناتھ کو بالکل گھلا دیا۔ وہ سوچتے میں کیسا پشاچ (بدروح) ہوں۔ کیا یہ میرا گھر ہے؟ کتنے دنوں کے لیے؟ مجھے گھر لے کر کیا کرنا ہے؟ دھن لے کر کیا کرنا ہے؟ سمان، ایشورے (ثروت) اور ادھیکاریوں کی پرسنتا میرے کس کام آئے گی؟ میں مایا جال میں کس کے لیے پڑا تھا؟

جب اس کو اس سے کوئی لابھ نہیں پہنچ سکتا تو میری ترشنا ویرتھ (بیکار) ہے۔ شیاما کو دیکھ کر انھیں کچھ دھیرج ہوتا۔ وہ سوچتے۔ میرے ہی کارن دیا ناتھ پتنی وِیوگ کا دُکھ اُٹھا رہا ہے۔ میرا ہی مَن رکھنے کے لیے وہ شیاما کو یہاں چھوڑ گیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی پتی اور پتنی کے اس ویوگ پر انھیں دُکھ بھی ہوتا۔ تب وہ وِچلت ہوجاتے۔ سوچتے اس سَمے اگر نمرتا سُوشیل لڑکے کو ہاتھ سے نہ نکل جانے دیتی۔ تو کیا اس سَمے روٹھا بچّہ منایا بھی نہیں جاسکتا۔ وِنئے اور اَسنیہ کا دھارا زور مارتی، لیکن آگے بڑھ کر وہ مان کی چٹّان سے ٹکرا کر پیچھے ہٹ جائیں۔ جانکی ناتھ سوچتے۔ "پتا ہوکر میں اپنا ہاتھ کیسے جھکاؤں!"

دن بیتتے گئے۔ جانکی ناتھ کی اَشانتی بڑھتی گئی۔ ایک دن کلکٹر صاحب کا ایک پتر آیا۔ انھوں نے جانکی ناتھ کو اس راج بھکتی پر بدھائی دی تھی۔ جانکی ناتھ نے اس پتر کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک دن پولیس کے سپرنٹنڈنٹ ان سے ملنے آئے۔ جانکی ناتھ نے کہلا بھیجا۔ "میں بیمار ہوں۔"

(۴)

کچھ دن اور بیت گئے۔ جانکی ناتھ کو اب ایک ایک پل یُگ کے سَمان کٹتا تھا۔ اپنا انیائے تیورشر (تیزانی) کے سَمان ان کے دل میں چبھا کرتا۔ سوارتھ پرتا کا موٹا پردہ جو نیتّروں پر پڑا ہوا تھا۔ اب وہ ہٹنے لگا۔ دیا ناتھ کے اُنچ بھاؤ اب ان کی سمجھ میں آنے لگے۔ اب ان کی آتما کی ویدنا اور بھی بڑھنے لگی۔ میں نے بیٹے کو اس لیے نہ گھر سے نکالا

ہے کہ وہ اپنے دیش کا کلیان کرنا چاہتا ہے، اپنے جیون کو دیش پر اَرپن کرنا چاہتا ہے۔ میری طرح ادھم سوارتھ سیوی (بد ذات خود غرض خادم) نہیں بنا رہنا چاہتا۔ مجھے اس کے لیے اپنے بھاگیہ کو سراہنا چاہیے تھا۔ لیکن ہا اگیان! ہا ترشنا! میں نے اس کے بدلے میں اس کے ساتھ یہ اَتیاچار کیا۔ وہ مجھے اپنے مَن میں کیا سمجھتا ہوگا! دیش کا دروہی! بندھوؤں کا شترو، لنکا کا وبھیشن! ہاں، وہ دیوتا ہے۔ میں راکھشس ہوں۔ میں اس یوگیہ نہیں کہ وہ مجھے اپنا پِتا سمجھے۔ میں نے اس کے ساتھ اَنیائے کیا۔ گھور اَنیائے۔ مان اَپمان کے بھاؤ کو الگ رکھ کر میں اب اسے منا لاؤں گا۔ جاکر اُس کے پیروں پر گر پڑوں گا اور کہوں گا۔ ''بھگوان، میرا اَپرادھ چھما کرو۔ تمھارے وِیوگ میں تڑپ رہا ہوں اور رو رہا ہوں۔ میرے آنسو پوچھو۔ مجھے سمجھاؤ میرے دل کو ڈھارس دو۔''

سندھیا کا سَمے تھا۔ آکاش بھون سے روٹھ کر جانے والے سورج کو منانے کے لیے، تارے نکل آئے تھے۔ جانکی ناتھ بھی پُتر کو منانے چلے۔ ان کا ہردے اس سَمے اگادھ پریم سے اُمڑا ہوا تھا۔ لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتے لجّا من کو پیچھے کھینچتی۔ یہاں تک کہ انھیں دیا ناتھ کا مکان دکھائی دینے لگا۔ دیا ناتھ دروازے پر بیٹھے کوئی پتر پڑھ رہے تھے۔ جانکی ناتھ کے پیر بندھ گئے۔ ان کے مَن نے کہا۔ ''اس بھانتی مناکر لے جانے میں تمھاری کیا بڑائی ہے، کیا گورَو ہے؟ اس میں سندیہہ نہیں کہ وہ تمھاری بات نہیں ٹالے گا۔ لیکن وہ شردھا، وہ بھکتی جو پِتا کے پَرتی پُتر میں ہونی چاہیے، پھر وہ کہاں؟ نہیں، مجھے ایسا کام کرنا چاہیے کہ پھر وہ شردھا اور ابھیمان کے وَشی بھوت ہوکر آپ میرے پاس آئے اپنے کو میرا پُتر کہتے ہوئے اس کا مستک اونچا ہوجائے۔ آنکھیں گوروانّت (فخر سے اونچا) ہوجائے۔ یہی اب میرا کرتبیہ ہے۔ ایشور مجھے بل دو۔ میری آتما کو جاگرتی پروان کرو!''

پِتا پر پُتر کی جیت نہیں، پُتر کے بھاؤں کی جیت ہوئی۔

ایک دن پراتہ کال بھورے کہار نے آکر شیاما سے کہا۔ ''لالہ جی اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ تم کو کچھ معلوم ہیں کہاں گئے ہیں؟''

نو بج گئے اور جانکی ناتھ نہیں لوٹے۔ شیاما نے سمجھا کسی افسر کی ملاقات کو گئے ہوں

گے۔ لیکن جب دوپہر ہوگئی اور وہ گھر نہیں آئے، تو شیاما کو چنتا ہوئی۔ وہ ان کے کمرے میں آئی کہ دیکھوں۔ کون کون سا سامان لے کر گئے ہیں۔ پہلی ہی چیز جس پر اس کی درشٹی پڑی وہ میز پر رکھا ایک پتر تھا۔ شیاما نے لپک کر پتر کو اٹھا لیا اور پڑھتے ہی مُرچھت سی ہوگئی۔ لکھا تھا۔ "بہو جی۔ اب سنسار سے مَن ورکت (ٹوٹ) ہو گیا ہے۔ سنیاس لیتا ہوں۔ دیا ناتھ کو یہ سُوچنا دے دینا اور اگر وہ گھر نہ آئیں تو انھیں کے پاس جاکر رہنا۔ میں اب گھر نہ آؤں گا۔ کون جانے یہ ہماری انتم ملاقات ہو۔ دیا ناتھ سے کہہ دینا اپرادھ کو چھما کریں۔"

شیاما بڑی ہی ٹھنڈی سانس کھینچی۔ اس نے پتی کا بچھوہ (جدائی) اس آشا پر سہا کہ اس کے ایسا کرنے سے سُسر کے ہردے میں سنتاپ (حِدّت) کی کمی ہوگی اور پتا پُتروں کے پھٹے ہوئے ہردے آسانی سے جڑ جایں گے۔ اس چٹھی نے اُس کی آشا پر بجلی گرا دی۔

(۵)

اس گھٹنا سے دیا ناتھ کے ہردے پر زبردست ٹھیس لگی۔ پِتا کے اس ویراگیہ کا کارن وہ اپنے ہی کو سمجھنے لگی وہ من ہی من اپنا بہت ترشکار کرتی۔ جانکی ناتھ کی کھوج کرنے اور کرانے میں دیا ناتھ اور شیاما نے کوئی کمی نہیں کی۔ لیکن ان کا کہیں بھی پتہ نہیں لگا۔ کھوج کی ناکامیابی سے دیا ناتھ کی من کی گلانی اور بڑھ گئی۔

وہ بارہا سوچتے کہ یہ سب کچھ میری اَدھمتا (بد ذاتی) کا پھل ہے۔ اب سوراجیہ سبھا کے کاموں میں ان کا من نہ لگتا۔ جب سے انھوں نے اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ تب سے ان کے من کی شانتی نشٹ ہوگئی تھی۔ اس لیے اس کام سے اب ان کا لگاؤ کیسے رہتا! تو بھی سوراجیہ سبھا کا کام پہلے سے کہیں اُتم ریتی سے چل رہا تھا۔ پہلے دھن کی قلت تھی۔ چندے سے جو آتا تھا۔ اس سے بہت سے ضروری کام نہیں ہوپاتے تھے۔

نگر کے بڑے اور دھنوان آدمی سبھا کے پاس پھٹکتے تک نہیں تھے۔ لیکن اب پیسے کی کمی نہیں تھی۔ ہر مہینے پہلی تاریخ کو سبھا کے منتری کے نام پر ایک رجسٹری آجاتی تھی۔ جس میں دو سو روپے کے نوٹ ہوتے تھے۔ بھیجنے والے کے نام کے استھان پر 'بھارت داس' لکھا ہوتا تھا۔ بھیجنے کا استھان کبھی کوئی ہوتا اور کبھی کوئی۔ لیکن ادھیکانش

اوسروں پر کسی تیرتھ استھان کی مہر ہوتی۔ نوٹوں کے ساتھ ایک پتر رہتا تھا۔ جس میں لکھا رہتا تھا کہ روپے کس قسم سے خرچ کیا جائے۔ پہلے پتر میں لکھا تھا کہ اس روپے سے سوراجیہ کی بیوستھا (انتظام) پر چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ نکالے اور انھیں سبھا میں لاگت بھاؤ پر بیچیں اور غریبوں کو مفت بانٹیں۔ دوسرے ماہ کے پتر میں لکھا تھا کہ اس روپے سے ضلع کے گاؤں میں سوراجیہ کے بھاؤ کا پرچار کیا جائے۔

تیسرے میں لکھا تھا کہ گاؤں میں سوراجیہ واچنالیہ استھاپت کیا جائے اور ان میں اس روپے سے اخبار منگائیں جائیں۔ اسی پرکار ہر ماہ دو سو روپے کی رقم آتی۔ ان رقموں سے سبھا کا کام خوب بڑھا۔ دیش کی دیگر سبھاؤں میں اس سوراجیہ سبھا کا کام انوکرن (قابلِ تقلید) مانا جانے لگا۔ اس گپت سہایتا سے سبھا کے کارکن بہت خوش تھے۔ لیکن وہ داتا کا ٹھیک نام اور پتہ جاننے کے لیے بہت خواہاں تھے۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ کچھ پتہ چلے۔ لیکن وہ وِپھل (ناکام) رہے۔

کلکتہ کے ایک دینک پتر میں غریب دیش واسیوں کی دشا اور ان کی اُنّتی کے وِشے میں ایک بڑی ہی مارمِک لیکھ مالا نکل رہی تھی۔ اس کے بھاؤ اتنے سَرل اور سَرس تھے۔ اس کی بھاشا اتنی سجیو (جاندار) اور ہردے گراہنی تھی۔ غریب دیش واسیوں کا ایسا سجیو اور کرونا جنک چتر (درد بھری تصویر) کھینچا گیا تھا اور ان کی انّتی کا سندیش پہنچانے کا ایسا سادھو اور مدُھر ڈھنگ بتایا گیا تھا کہ پڑھنے والے ہردے پر لیکھک اور اس کے بھاؤ کے وِچیے کی چھاپ لگ جاتی تھی۔

لیکھک کے نام کے استھان پر لکھا رہتا تھا۔ 'بھارت داس' نگر کی سوراجیہ سبھا والوں نے اس لیکھ مالا کو پڑھتے ہوئے اس پتر میں ایک نویدن چھپنے کے لیے بھیج دیا کہ کرپا کرکے 'بھارت داس' مہاشیہ اپنا ٹھکانہ پرکٹ کر دیں۔ ایک سپتاہ کے پشچات سبھا کے منتری کو پانچ سو روپے کا نوٹ ملا۔ ساتھ ہی چٹھی بھی تھی۔ لکھا تھا۔ میرا ٹھکانہ بہت بڑا ہے، دیش کے جھونپڑے جھونپڑے میں میری آتما واس کرتی ہے۔ اس دھن سے دیش کے جھونپڑوں میں جاکر کچھ سوراجیہ کا سندیش پہنچاؤ اور سمجھو کہ مجھ سے مل رہے ہو۔

نگر کی سوراجیہ سبھا کے سامنے آج ایک بڑی ہی کٹھن سمسیا اُپستھت (موجود) ہے۔

لوک مانیہ تلک لکھنؤ کی کانگریس سے لوٹتے سمے نگر کے اسٹیشن سے گزرنے والے تھے۔ اس اَوسر پر نگر کی سوراجیہ سبھا کے کچھ لوگوں نے مل کر انھیں اپنے یہاں دعوت دیا۔ انھوں نے دعوت قبول بھی کر لیا۔ کل وہ دوپہر کو آنے والے ہیں۔ اسی سندھیا کو ان کا ایک ویاکھیان (تقریر) ہوجانا چاہیے۔ کیونکہ رات کو وہ پونا کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔

لوک تِلک مہاراج کو دعوت دینے کو تو دے آئے تھے۔ لیکن انھیں معلوم نہیں تھا کہ آگے چل کر کیا کیا دقتیں پڑیں گی۔ اس سمے تلک مہاراج کے ٹھہرانے کے لیے استھان کی چنتا تھی۔ لوگ ان کو اپنے یہاں ٹھہراتے ڈرتے تھے۔ بے چارے دیا ناتھ نگر بھر کے بڑے بڑے آدمیوں سے ملتے پھرے۔

سبھی کے ہاتھ پیر جوڑے۔ لیکن کوئی بھی لوک مانیہ تِلک کو ٹھہرانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ صاف صاف انکار کسی نے بھی نہیں کیا۔ دیش بھکتی کا اور دیش بھکت ہونے کا دعوا کسی نے بھی نہیں چھوڑا۔ ہاں، گھر خالی نہیں تھے۔ کچھ مہمان آگئے تھے یا بھاوج یا سالی بیمار تھیں۔ خیر، بڑی دوڑ دھوپ کے بعد لوک مانیہ تِلک کے ٹھہرانے کے لیے استھان مل گیا۔ لیکن اب ویاکھیان کے لیے استھان کی فکر تھی۔ چھوٹے موٹے استھان سے کام نہ چلتا۔ بڑے استھان کوئی دیتا نہیں تھا۔ شری رام مندر کے ٹرسٹی اپنا احاطہ دینے کے لیے راضی نہیں ہوئے۔ بڑی مسجد کی زمین نہیں ملی۔ بَن مالی بابو کا احاطہ بہت لمبا چوڑا تھا۔ نگر کی کچھ بڑی سبھائیں اس میں ہوئی تھیں۔ بَن مالی بابو پُرانے ڈھنگ کے رئیس تھے۔ انھیں ان نئی باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ پھر بھی وہ تھے بھلے آدمی۔ ان کی بھلمن ساہت سے ہی کچھ آشا تھی۔ دیا ناتھ اور ان کے ساتھی دوڑے ہوئے ان کے پاس گئے۔ پتا لگا کہ بَن مالی بابو شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔

یہ لوگ تو بھی نراش نہیں ہوئے۔ انھوں نے بابو کے کارندوں کو بابو کا استھان دیا۔ بولے۔ "ہمارے لیے تو جیسے بابو صاحب، ویسے ہی آپ ہیں۔ آپ ہی احاطہ میں سبھا کرانے کی آگیا دیجیے۔"

کارندے صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ جناب، بابو صاحب ہوتے تو کیا۔ نہیں ہوئے تو کیا۔ آج پندرہ دن ہوئے۔ احاطہ بیچ دیا گیا۔ اب بھی تنکے کا سہارا تھا۔ ایک

دم کتنی ہی زبانوں سے نکلا۔ ''کس نے خریدا ہے؟'' جواب ملا۔ ''ٹھیک ٹھیک نام تو بابو صاحب ہی جانیں۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ خریدنے والے سجن یہاں کے نہیں ہیں۔ پریاگ سے ان کا پتر وِوَہار ہوا تھا۔''اس بات سے ان لوگوں کی ساری آشاؤں پر پانی پھر گیا۔

(۶)

سبھا کے کاریہ کرتا بہت چنتت تھے۔ ان کی عقل کام نہیں کرتی تھی کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ دیا ناتھ کا سب سے بُرا حال تھا۔ وہ اس الجھن سے اور بھی گھبرا اُٹھے۔ انھیں آج سبھا کا کام اَسہایہ (نا قابلِ برداشت) ہو اُٹھا۔ وہ آج مَن ہی مَن اس گھڑی کو کوستے تھے جس میں انھوں نے اس مارگ میں پگ رکھا تھا۔ آج انھیں رہ رہ کر پتا کی یاد آتی تھی۔

ان کا مَن اس وِوَہار اور اس کے پَرینام (نتیجہ) پر مسوس مسوس اُٹھتا تھا جو انھوں نے اپنے پتا کے ساتھ کیا تھا۔ پتا کی یاد، گمدنی اور پشچاتاپ ان کے مَن کو اُتھل پتھل کر رہی تھی۔ وہ سوچتے تھے کسی طرح یہ دو دن کٹ جائیں اور میں اس کام کو اپنے سر سے اُتار پھینکوں۔

سندھیا ہوگئی۔ ویاکھیان کے لیے جگہ نہیں ملی۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ کے پشچات دیا ناتھ بڑے ہی اداس مَن سے گھر لوٹے۔ بیٹھک کی میز پر لیمپ ٹمٹما رہا تھا۔ تھکے ہوئے دیا ناتھ لیمپ کو قریب کھسکا کر بیٹھ گئے۔ ان کی کہنیاں میز پر تھیں اور ان کی اَدھ کھلی اداس آنکھیں مند مند ٹمٹمانے والے لیمپ پر شریر نِشچل (غیر متزلزل) تھا۔ لیکن مَن میں سنکلپ وِکلپوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ سوچتے سوچتے دیش کے لوگوں کی مانِسِک دشا ان کے سامنے آگئی۔ لوگ کہتے بھیرو (بزدل) ہیں۔ وہ دیش بھکت اور دیش بھکتی کو اچھا سمجھتے ہیں۔ لیکن کھل کر انھیں اچھا کہنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بڑے آدمیوں کا کپٹا چرن (مکاری) اور بھی بھینکر ہے۔ جہاں لابھ ہے۔ وہاں وہ دیش بھکت بن جاتے ہیں اور جہاں ذرا بھی جوکھیم ہے۔ وہاں کاوا کاٹ جاتے ہیں۔ دیش کی اس ادھ پتیت اوستھا میں کام کرنا ہی ٹھیک نہیں۔ بس اب پنڈ چھڑا کر ان جھگڑوں سے اداسین ہوجانا ہی اچھا ہے۔ اتنے میں کسی آدمی

کی آہٹ پر ان کا دھیان ٹوٹا۔ انھوں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو 'ہوم رول لیگ' کا چپراسی ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے بندگی کر کے ایک چٹھی دی۔ چٹھی سبھاپتی کی تھی۔ لکھا تھا۔ ''ترنت آیئے، ایک شبھ سنواد (اچھی خبر) ہے اور متر بھی بیٹھے ہیں۔''

دیا ناتھ جی سبھا بھون میں پہنچے۔ سبھا پتی جی نے بڑے اُتساہ سے کہا۔ ''لو بھائی، سوراجیہ کی جے! ایشور نے بیڑا پار لگا دیا۔ ہمیں استھان مل جائے گا اور نگر میں ایک بھاری کام ہوجائے گا۔'' یہ کہہ کر انھوں نے دیا ناتھ جی کو ایک پتر دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ ''کل میں اس نگر میں ہوں مجھے معلوم ہوا ہے۔ اس سمے لوک مانیہ تِلک کے ویاکھیان کے لیے استھان نہیں ملتا۔ اَب آپ استھان کی چنتا نہ کیجیے۔ آپ بَن مالی بابو کے احاطے میں ویاکھیان کرائیں۔ اس احاطے کو پندرہ ہزار روپے پر میں نے نگر میں ایک بڑے شِلپ اسکول کی استھاپنا کے لیے خرید لیا ہے۔ آج شام کو آٹھ بجے سبھا بھون میں آپ لوگوں کو درشن بھی کروں گا۔ 'بھارت داس'۔''

اس پتر سے دیا ناتھ کو پرسنتا ہوئی۔ سبھا کے سبھی کاریہ کرتا 'بھارت داس' مہاشیہ کی پرسنسا کر رہے تھے۔ وہ ان کو دیکھنے کے لیے بے حد اُتسک تھے۔ اسی لیے ان سبھی کو دِرشٹی بار بار گھڑی پر جاتی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے ایک سجن ڈھیلا گیروا کرتا پہنے، ننگے سر، اور ننگے پاؤں اس کمرے میں آئے۔ لوگ کھڑے ہوگئے۔ سبھی کی دِرشٹی ان کے چہرے پر پڑی۔ لوگ چکِت تھے۔ ''اے، یہ تو لالہ جانکی ناتھ ہیں'' چھَن بھر کے آشچریہ کے پشچات انھوں نے دُگنے پریم اور سوابھمان سے جانکی ناتھ کا 'بندے ماترم' کی دھونی کے ساتھ ابھیوادن کیا۔

دیا ناتھ پریت بھکتی اور دیش انوراگ کے مدھ سے اُنمت ہوکر آنکھوں میں پریم اور سمّان کے آنسو بھرے ہوئے بڑھے اور جانکی ناتھ کے پیروں پر گر پڑے۔ جانکی ناتھ نے انھیں اُٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔

یہ افسانہ اردو کے کسی رسالے اور مجموعے میں نہیں ہے، یہ کانپور کے پرتاپ میں ستمبر 1917 میں شائع ہوا تھا۔ یہاں ہم ہندی کے رسالے سے صرف رسم خط بدل کر شائع کر رہے ہیں۔

دُرگا کا مندر

بابو برج ناتھ قانون کے مطالعے میں مصروف تھے۔ اور ان کے دونوں بچے قانونی سیاست کی ضرورت ثابت کرنے میں۔ شیاما چلاتی تھی منو میری گڑیا نہیں دیتا۔ منو روتا تھا۔ شیاما نے میری مٹھائی کھالی۔ برج ناتھ نے ناراض ہو کر بھاما سے کہا۔ تم ان شیطانوں کو یہاں سے ہٹاتی ہو کہ نہیں۔ ورنہ میں ایک ایک کی خبر لوں گا۔ بھاما چولھے میں آگ جلا رہی تھی۔ بولی۔ ”ارے تو اب شام کو بھی کیا پڑھتے ہی رہو گے؟ ذرا دیر کے لیے تو دم لے لو۔“

برج ناتھ۔ ذرا سا اٹھا نہ جائے گا۔ بیٹھی بیٹھی وہاں سے قانون بگھار رہی ہو۔ ابھی ایک آدھ کو پٹک دوں گا تو وہاں سے گرجتی ہوئی آؤ گی کہ ہائے ہائے بچے کو مار مار کر ادھ مؤا کر دیا۔

بھاما۔ تو میں کچھ بیٹھی یا سوئی تو ہوں نہیں۔ ذرا ایک گھڑی تمھیں لڑکوں کو بہلا دو گے تو کیا ہوگا؟ کوئی میں نے ہی تو ان کی نوکری نہیں لکھائی ہے۔“

بابو برج ناتھ لاجواب ہوگئے۔ غصہ پانی کی طرح روانی کا موقع نہ پاکر اور بھی پُرزور ہوجاتا ہے۔ گو قانونی اصولوں کے ماہر تھے۔ لیکن اس وقت آئینِ انصاف کی پابندی میں خیریت نہ نظر آئی۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا۔ اور دونوں کو روتے چیختے چھوڑ، قانون شہادت بغل میں دبا، کالج پارک کی راہ لی۔

(۲)

ساون کا ن مہینہ تھا۔ آج کئی دن کے بعد بادل کھلے تھے۔ سیر و تفریح کا شوق امنگوں پر تھا۔ ہرے بھرے درخت سنہری چادریں اوڑھے کھڑے تھے۔ ہوا ساون کے راگ گاتی تھی۔ اور بگلے ڈالیوں پر بیٹھے ہنڈولے جھول رہے تھے۔

برج ناتھ ایک بنچ پر جا بیٹھے اور کتاب کھولی۔ لیکن اس مطالعہ کے مقابلے میں

صحیفۂ قدرت کا مطالعہ زیادہ دلآویز تھا۔ کبھی آسمان کو پڑھتے تھے۔ کبھی پتیوں کو، کبھی سبزے کو اور کبھی سامنے میدان میں کھیلتے ہوئے لڑکوں کو۔ دفعتاً سامنے سرخ روش پر انھیں کاغذ کی ایک پڑیا نظر آئی۔ نفس نے اشتیاق کے پردے میں کہا۔ ”دیکھیں۔ اس میں کیا ہے؟ عقل نے کہا۔ اس سے مطلب؟ پڑی رہنے دو۔“

لیکن اشتیاق غالب آیا۔ اٹھے اور پڑیا اٹھا لی۔ اس میں وزن تھا۔ شاید کسی کے پیسے پڑیا میں لپٹے ہوئے گر پڑے ہیں۔ کھول کر دیکھا۔ پیسے نہیں ساورن تھے۔ گنا۔ پورے آٹھ نکلے۔

برج ناتھ کا دل دھڑکنے لگا۔ ساورن ہاتھ میں لیے وہ سوچنے لگے۔ انھیں کیا کروں؟ اگر یہیں رکھ دوں تو نہ معلوم کسی کی نظر پڑے۔ نہ معلوم کون اٹھا لے جائے۔ یہاں رکھنا قرینِ مصلحت نہیں۔ چلوں تھانے میں اس کی اطلاع کردوں اور یہ اشرفیاں تھانے دار کی امانت میں رکھ دوں۔ جس کی ہوں گی۔ وہ آپ لے جائے گا یا اگر اسے نہ بھی ملیں تو میرے سر تو کوئی الزام نہ رہے گا۔ میں تو اپنی ذمّے داری سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔

نفس نے پردے کی آڑ سے منتر مارنا شروع کیا۔ وہ تھانے نہ گئے۔ سوچے، چلوں۔ بھاما سے یہ کیفیت بیان کروں۔ کھانا تیار ہوگا۔ کھاکر اطمینان سے تھانے جاؤں گا۔

بھاما نے دیکھا۔ سینے میں ایک گدگدی سے ہوئی۔ بولی۔ ”اس وقت جاؤ گے تو آنے میں دیر ہوگی۔ کل سویرے چلے جانا۔“

برج ناتھ نے بھی سوچا یہی زیادہ مناسب ہے۔ تھانے والے رات کو تو کوئی کاروائی کریں گے نہیں۔ جب اشرفیوں کو پڑا ہی رہنا ہے تو جیسا تھانہ ویسا ہی میرا گھر۔

اشرفیوں کو صندوق میں رکھ دیا۔ بھاما نے ہنس کر کہا ”لاؤ میں اپنے لیے گلوبند بنوالوں۔ بہت دنوں سے جی ترس رہا ہے۔ آیا دھن کیوں چھوڑوں؟“

نفس نے اعلانیہ تحریک نہ کرکے مذاق کی صورت اختیار کی تھی۔

برج ناتھ نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ ”ہاں اور کیا گلو بند کے شوق میں گلے میں پھانسی لگالو نا؟“

(۳)

علی الصباح برج ناتھ تھانے چلنے کے لیے تیار ہوئے۔ سوچا۔ قانون کا ایک لکچر اس کارِ خیر کے نذر سہی۔ وہ الہ آباد ہائی کورٹ کے مترجم تھے۔ ملازمت میں زیادہ ترقی کی امید نہ دیکھ کر سال بھر سے وکالت کی تیاری میں مصروف تھے۔ مگر ابھی کپڑے پہن ہی رہے تھے کہ ان کے ایک دوست منشی گورے لال آکر بیٹھ گئے اور اپنے خانگی تردّدات کی ایک طولانی داستان سنانے کے بعد بہت التجا کے ساتھ بولے۔ "بھائی جان اس وقت میں ان زحمتوں میں ایسا پھنس گیا ہوں کہ کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ تم بوڑھے آدمی ہو۔ اس وقت کچھ مدد کرو۔ زیادہ نہیں تیس روپے دے دو۔ کسی نہ کسی طرح کام چلا لوں گا۔ آج تیس ہے۔ کل شام کو تمھیں روپے جبراً و قہراً مل جائیں گے۔

برج ناتھ بوڑھے آدمی تو نہ تھے۔ لیکن بوڑھے پن کی ہوا باندھ رکھی تھی۔ یہ ان کی رعونت کا تقاضا تھا۔ دوستوں اور شناساؤں کی چھوٹی موٹی ضروریات پر محض اپنا وقارِ ثروت قائم کرنے کے لیے وہ اپنی واقعی ضرورتوں کو قربان کردیا کرتے تھے۔ لیکن بھاما کو اس معاملے میں ان سے ہمدردی نہ تھی۔ وہ نمودِ باطل کے لیے اس نفس کشی کی ضرورت نہ سمجھتی تھی۔ اسی وجہ سے جب برج ناتھ پر اس قسم کا کوئی تقاضا ہوتا تھا تو تھوڑی دیر کے لیے ان کے گھر میں بدمزگی کی نوبت ضرور آجاتی تھی۔ کیونکہ ان میں انکار کرنے یا ٹالنے کی ہمت نہ تھی۔

کچھ شرماتے ہوئے بھاما کے پاس آئے اور بولے۔ "تمھارے پاس تیس روپے تو نہ ہوں گے؟ منشی گورے لال مانگ رہے ہیں۔"

بھاما نے رکھائی سے کہا۔ "میرے پاس روپے نہیں ہیں"

برج ناتھ۔ "ہوں گے ضرور۔ بہانہ کرتی ہو۔"

بھاما۔ "اچھا بہانہ سہی۔"

برج ناتھ۔ "تو میں ان سے کیا کہہ دوں؟"

بھاما۔ "کہہ دو گھر میں روپے نہیں ہیں۔ تم سے نہ کہتے بنے تو میں پردے کی آڑ سے کہہ دوں۔"

برج ناتھ۔ "کہنے کو تو میں کہہ دوں۔ لیکن انھیں یقین نہ آئے گا۔ سمجھیں گے بہانہ

کررہے ہیں۔"

بھاما۔"سمجھیں گے سمجھا کریں۔ اس کا کیا علاج؟"

برج ناتھ۔"مجھ سے تو ایسی بے مروتی نہیں ہوسکتی۔ رات دن کا ساتھ ٹھہرا۔ کیسے انکار کروں؟"

بھاما۔"اچھا تو جو مزاج میں آئے کرو۔ میں ایک بار کہہ چکی۔ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔"

برج ناتھ بہت جھنجلائے۔ انھیں یقین تھا کہ بھاما کے پاس روپے ہیں۔ لیکن محض مجھے زچ اور محجوب کرنے کے لیے اس وقت انکار کررہی ہے۔ ضد نے ارادے میں استحکام پیدا کیا۔ صندوق میں سے دو اشرفیاں نکالیں اور گورے لال کو دے کر بولے۔ "بھائی کل شام کو کچہری سے آتے ہی روپے دے دینا۔ یہ ایک شخص کی امانت ہیں۔ اسی وقت دینے جارہا تھا۔ اگر کل روپے نہ پہنچے۔ تو مجھے سخت ندامت ہوگی۔ کہیں منھ دکھانے کے لائق نہ رہوں گا۔

گورے لال نے دل میں کہا۔ "امانت بیوی کے سوا اور کس کی ہوگی۔" اور اشرفیاں جیب میں رکھ کر گھر کی راہ لی۔"

(۴)

آج پہلی تاریخ کی شام ہے۔ بابو برج ناتھ دروازے پر بیٹھے ہوئے منشی گورے لال کا انتظار کررہے ہیں۔ پانچ بج گئے۔ گورے لال ابھی تک نظر نہیں آئے۔

برج ناتھ کی نگاہ راستے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں ایک اخبار تھا۔ لیکن پڑھنے میں جی نہ لگتا تھا۔ ہر تیسرے منٹ پر راستے کی طرف آنکھ اٹھ جاتی تھی۔ لیکن آج تنخواہ تقسیم ہو رہی ہے۔ اسی وجہ سے آنے میں دیر ہوئی ہے۔ آتے ہی ہوں گے۔

چھ بجے۔ گورے لال کا پتہ نہ تھا۔ کچہری کے عمال ایک ایک کرکے چلے آرہے تھے۔ برج ناتھ کو کئی بار دھوکا ہوا۔ وہ آرہے ہیں۔ ضرور ہی یہی ہیں۔ ویسی ہی اچکن ہے۔ ویسی ہی ٹوپی۔ چال بھی وہی ہے۔ ہاں! وہی ہیں۔ اسی طرف آرہے ہیں۔ دل سے ایک بوجھ سا اترتا معلوم ہوا۔ لیکن قریب آنے پر معلوم ہوا کہ یہ کوئی اور ہے۔ امید کی خیالی تصویر غائب ہوگئی۔

برج ناتھ کی طبیعت جھنجلانے لگی۔ وہ ایک بار کرسی پر سے اٹھے۔ برآمدے کے لب پر کھڑے ہوکر سڑک کے دونوں طرف نظریں دوڑائیں۔ کہیں پتہ نہیں دوتین بار دور سے آتے ہوئے یکوں کو دیکھ کر انھیں گورے لال کا وہم ہوا۔ شدتِ انتظار! سات بجے۔ چراغ جل گئے۔ سڑک پر اندھیرا چھانے لگا۔ برج ناتھ سامنے سڑک پر سراسیمگی کے عالم میں ٹہلنے لگے۔ ارادہ ہوا گورے لال کے گھر چلوں۔ ادھر قدم بڑھائے۔ لیکن سینہ لرز رہا تھا کہ کہیں وہ راستے میں آتے ہوئے مل جائیں تو سمجھیں کہ چند روپیوں کے لیے یہ اتنے بے صبر ہوگئے۔ چند ہی قدم چلے تھے کہ کسی کو آتے دیکھا۔ وہم ہوا۔ گورے لال ہیں۔ مڑے اور سیدھے برآمدے میں آکر دم لیا۔ لیکن پھر وہی دھوکا۔ وہی وہم!

تب وہ سوچنے لگے۔ اتنی دیر کیوں ہورہی ہے؟ کیا ابھی تک وہ کچہری سے نہ آئے ہوں گے؟ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ان کے دفتر والے مدت ہوئی نکل گئے۔ بس دو ہی باتیں ممکن ہے۔ یا تو انھوں نے صبح آنے کا فیصلہ کرلیا۔ سمجھے ہوں رات کو کہاں چلوں۔ یا عمداً بیٹھ رہے ہوں گے۔ اس وقت دینا منظور نہ ہوگا۔ کیوں نہ میں ہی کسی آدمی کو بھیج دوں۔ لیتے وقت ان کو غرض تھی۔ اس وقت میری غرض ہے۔ لیکن کسے بھیجوں؟ منو شاید چلا جائے۔ سڑک ہی پر تو مکان ہے۔ کمرے میں گئے۔ لیمپ جلایا۔ اور رقعہ لکھنے بیٹھے۔ مگر آنکھیں دروازے ہی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ دفعتاً کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ فوراً رقعے کو ایک کتاب کے نیچے دبا دیا۔ اور برآمدے میں چلے آئے۔ دیکھا تو پڑوس کا ایک کنجڑا ہے۔ تار پڑھانے آیا ہے۔ اس سے بولے۔ "یار اس وقت فرصت نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں آنا۔" اس نے کہا۔ "بابو جی! گھر بھر کے آدمی گھبرائے ہوئے ہیں۔ ذرا ایک نگاہ دیکھ لیجیے۔" آخر جھنجلا کر اس کے ہاتھ سے تار لے لیا۔ اور دوسری نگاہ سے دیکھ کر بولے۔ "کلکتہ سے آیا ہے۔ مال نہیں پہنچا۔" کنجڑے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ بابو جی اتنا اور دیکھ لیجیے۔ کس نے بھیجا ہے؟" اس پر برج ناتھ نے برہم ہو کر تار کا کاغذ پھینک دیا۔ اور بولے۔ "مجھے اس وقت فرصت نہیں ہے۔"

آٹھ بج گئے۔ کچھ کچھ مایوسی ہونے لگی۔ منو اتنی رات گئے نہیں جاسکتا۔ دل نے فیصلہ کیا۔ مجھے خود چلنا چاہیے۔ بلا سے برا مانے گا۔ اس کی کہاں تک پروا کروں۔ صاف

صاف کہہ دوں گا۔ میرے روپے دے دو۔ شرافت شریفوں سے نبھتی ہے۔ ایسے وعدہ فراموش سے شرافت کا برتاؤ کرنا حماقت ہے۔ اچکن پہنی۔ گھر میں جاکر بھاما سے کہا۔ ”میں ذرا ایک کام سے باہر جاتا ہوں۔ کواڑ بند کرلو۔“

چلنے کو تو چلے۔ مگر قدم قدم پر رکتے جاتے تھے۔ گورے لال کا مکان دور سے دکھائی دیا۔ لیمپ جل رہا تھا۔ ٹھٹک گئے۔ سوچنے لگے۔ چل کر کیا کہوں گا۔ کہیں انھوں نے جاتے ہی روپے نکال کر دے دئے اور معذرت کی۔ تو سخت ندامت ہوگی۔ مجھے تنگ ظرف، بے صبر، اوچھا سمجھیں گے۔ نہیں روپے کی بات چیت کروں ہی کیوں! سلام کلام کے بعد کہوں گا۔ یار گھر میں شدت سے پیٹ میں درد ہورہا ہے۔ تمھارے پاس پرانا تیز سرکہ تو نہیں ہے؟ مگر نہیں۔ یہ حیلہ کچھ بھدا سا معلوم ہوتا ہے۔ صاف پردہ فاش ہوجائے گا۔ اونہہ اس جھنجھٹ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر خود ہی سمجھ جائیں گے۔ اس معاملے پر بات چیت کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ برج ناتھ اس ادھیڑبن میں آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ ندی کی لہریں چاروں طرف چلتی ہیں۔ لیکن دھارا اپنا راستہ نہیں چھوڑتی۔

گورے لال کا گھر آگیا دروازہ بند تھا۔ برآمدے میں لالٹین جل رہی تھی۔ پکارنے کی ہمت نہ پڑی۔ سمجھے کھانا کھا رہے ہوں گے۔ دروازے کے سامنے سے نکل گئے۔ اور آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے ایک میل تک چلے گئے۔ نو بجنے کی آواز کان میں آئی۔ گورے لال کھانا کھا چکے ہوں گے۔ لوٹ پڑے۔ لیکن دروازے پر پہنچے تو اندھیرا تھا۔ وہ شعاعِ امید جو پہلے نظر آتی تھی۔ اس وقت بجھ گئی تھی۔ ایک منٹ تک دبدھے میں کھڑے رہے۔ آواز دوں؟ ہاں ابھی بہت سویرا ہے۔ اتنی جلدی تھوڑے ہی سوگئے ہوں گے۔ دبے پاؤں برآمدے پر چڑھے دروازے پر کان لگا کر سنا۔ چوروں کی طرح چونک چونک کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے کہ کہیں کسی کی نگاہ نہ پڑجائے دفعتاً کچھ بات چیت کی بھنک کان میں پڑی۔ دھیان سے سنا۔ ایک عورت کہہ رہی تھی۔ ”روپے تو سب خرچ ہوگئے۔ برج ناتھ کو کہاں سے دوگے؟ گورے لال نے جواب دیا۔ ایسی کون سی جلدی ہے۔ پھر دے دیں گے۔ آج درخواست دے دی ہے۔ کل منظور ہوجائے گی۔ گھر چل دیں گے۔ تین مہینے میں لوٹیں گے تو دیکھا جائے گا۔

برج ناتھ کو ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے منہ پر طمانچہ مار دیا۔ کچھ غصے اور کچھ مایوسی کے عالم میں برآمدے سے اتر آئے۔ گھر کی طرف چلے تو سیدھے قدم نہ پڑتے تھے۔ جیسے منزلوں کا تھکا ماندہ مسافر ہو۔

(۵)

برج ناتھ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ کبھی گورے لال کی دغا بازی اور وعدہ فراموشی پر غصہ آتا۔ کبھی اپنی حماقت پر افسوس۔ معلوم نہیں کس غریب کے روپے ہیں۔ اس پر کیا گزری ہوگی۔

مگر اب غم وغصہ سے کیا حاصل؟ روپے بہم پہنچانے کی فکر کرنی چاہیے کہاں سے آئیں گے؟ بھاما پہلے ہی انکار کرچکی ہے۔ تنخواہ میں اتنی گنجائش نہیں۔ دس پانچ روپے کی بات ہوتی تو کوئی کتربیونت کرتا۔ کیا کروں؟ کسی سے قرض لوں؟ لیکن مجھے کون دے گا۔ آج تک کسی سے مانگنے کی نوبت نہیں آئی۔ اور اپنا ایسا کوئی دوست بھی تو نہیں جو لوگ ہیں وہ مجھ ہی کو تنگ کیا کرتے ہیں۔ ہاں۔ اگر کچھ دن قانون کو بالائے طاق رکھ کر ترجمے اور نقل کے کام میں محنت کروں تو البتہ ممکن ہے۔ کم سے کم ایک مہینہ سخت محنت کرنا ہوگی۔ ان سستے مترجموں کے مارے ترجمے کا نرخ بھی تو گر گیا ہے۔ افسوس اس ظالم گورے لال نے بڑی دغا کی۔ کہیں کا نہ رکھا۔

دوسرے دن سے برج ناتھ روپے جمع کرنے کی دھن میں پڑے۔ صبح کو قانون کے لکچر میں شریک ہوتے۔ شام کو کچہری سے تجاویز کا پلندا گھر لاتے اور بارہ بجے رات تک بیٹھے ترجمے کیا کرتے۔ سر اٹھانے کی فرصت نہ ملتی۔ کبھی ایک اور کبھی دو بھی بج جاتے۔ جب دماغ بالکل کام نہ دیتا تو وہ مجبور ہو کر چار پائی پر پڑ رہتے۔ سر پر ایک جنون سا سوار تھا۔ مگر اتنی محنت کے عادی نہ تھے۔ کبھی سر میں درد ہونے لگتا۔ کبھی ہاضمے میں فتور پیدا ہوجاتا۔ کبھی حرارت آجاتی۔ تاہم وہ مشین کی طرح اپنے کام میں لگے رہتے۔ بھاما اکثر جھنجلا کر کہتی۔ "اجی لیٹ بھی رہو، بڑے دھرماتما بنے ہو۔ تمھارے ایسے دس پانچ آدمی اور ہوتے تو دنیا کا کام ہی بند ہوجاتا۔" برج ناتھ اس غصّہ انگیز مداخلت کا کوئی جواب نہ دیتے۔ علی الصباح پھر وہی چرخہ لے بیٹھتے۔

یہاں تک کہ تین ہفتے گزر گئے۔ اور بمشکل تمام پچیس روپے فراہم ہوسکے۔

برج ناتھ سوچتے تھے۔ اور دو تین دن میں بیڑا پار ہے۔ مگر اکیسویں دن انھیں شدت سے بخار چڑھ آیا۔ اور تین دن تک نہ اترا۔ رخصت لینا پڑی۔ صاحبِ فراش ہوگئے۔ بھادوں کا مہینہ تھا۔ بھاما نے سمجھا فصلی بخار کا دورہ ہے لیکن جب باوجود ایک ہفتے تک ڈاکٹر کے متواتر علاج کے بخار میں مطلق افاقہ نہ ہوا۔ تو وہ گھبرائی۔ برج ناتھ اکثر ہذیان بکنے لگتے۔ بھاما سن کر مارے خوف کے کمرے سے بھاگ جاتی۔ بچوں کو پکڑ کر دوسرے کمرے میں بند کر دیتی۔ اب اسے شبہ ہوا کہیں یہ آفت انھیں روپیوں کی بدولت تو نہیں آئی ہے؟ کون جانے روپے والے نے کچھ کر دھر دیا ہو۔ ضرور یہی بات ہے۔ ورنہ دواؤں سے فائدہ کیوں نہ ہوتا؟ مصیبت پڑنے پر انسان کچھ ضعیف الاعتقاد ہوجاتا ہے۔ دواؤں سے مایوس ہوکر ہم دیوتاؤں کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ دریا میں جب کشتی ڈگمگانے لگتی ہے تو لوگ منتیں مانتے ہیں۔ بھاما نے بھی دیوتاؤں کی منتیں مانیں۔ وہ جنم اشٹمی شیوراتری اور تیجے کے سوا اور کوئی برت نہ رکھتی تھی۔ اب کے اس نے نوراتروں کے برت رکھنا شروع کیے۔

آٹھ دن پورے ہوچکے۔ آخری دن آیا۔ صبح کا وقت تھا بھاما نے برج ناتھ کو دوا پلائی۔ اور دُرگاجی کی پوجا کرنے مندر چلی۔ اس کا دل آج درگاجی کی عقیدت سے معمور تھا۔ مندر کے صحن میں پہنچی۔ خوب رونق تھی۔ کئی پنڈت آسنوں پر بیٹھے درگا پاٹھ کررہے تھے۔ دھوپ اور اگر کی خوشبو سے ہوا معطر ہورہی تھی۔ وہ مندر میں داخل ہوئی۔ سامنے درگا جی کی مورت جلوہ افروز تھی۔ ان کے چہرے سے ایک نور برس رہا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں سے جلال کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ تقدس کا ایک سماں چھایا ہوا تھا۔ بھاما اس پرجلال مورت کے سامنے سیدھی آنکھوں سے نہ تاک سکی۔ اس پررعب احترام طاری ہوگیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”ماتا مجھ پر دیا کرو۔“

اسے ایسا معلوم ہوا گویا دیوی مسکرائیں۔ ان نوربار آنکھوں سے اک شعلہ سا نکل کر اپنے دل میں آتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے گوشِ دل میں کہیں عالمِ بالا سے ایک صدا آئی۔-”پرایا دھن لوٹا دے۔“ تیرا بھلا ہوگا۔“

بھاما اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں عقیدت کا سرور جگمگا رہا تھا۔ چہرے سے تقدس

برسا پڑتا تھا۔ دیوی نے شاید اسے اپنے جلال کے رنگ میں ڈبو دیا تھا۔

اتنے میں ایک دوسری عورت مندر میں آئی۔ سر کی سفید لٹیں زرد اور مرجھائی ہوئی چہرے کے دونوں طرف لٹک رہی تھیں۔ بدن پر صرف ایک سفید ساڑھی تھی۔ ہاتھ میں چوڑیوں کے سوا اور کوئی زیوار نہ تھا۔ سانحۂ غم کی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بھی دیوی کے سامنے سر جھکایا۔ اور دونوں ہاتھوں سے آنچل کو پھیلا کر بولی۔

"دیوی! جس نے میرا دھن لیا ہو۔ اس کا ستیاناس کرو۔"

جیسے ستار مضراب کی چوٹ کھاکر تھرتھرا اٹھتا ہے۔ اسی طرح بھاما کا دل خوف سے تھرتھرا اٹھا۔ یہ الفاظ نوکِ سناں کی طرح اس کے کلیجے میں چبھے۔ اس نے دیوی کی طرف چشمِ فریاد سے دیکھا۔ ان کا چہرہ غضب ناک تھا۔ ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کے گوشِ دل میں کہیں عالمِ بالا سے صدا آئی۔ "پرایا دھن لوٹا دے، نہیں تو تیرا ستایاناس ہوجائے گا۔" بھاما کھڑی ہوگئی۔ اور اس بوڑھی عورت سے بولی۔ "کیوں ماتا! تمھارا دھن کسی نے لے لیا ہے؟" ضعیفہ نے اس نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا۔ بولی۔ "ہاں بیٹی!"

"کتنے دن ہوئے؟"

کوئی ڈیڑھ مہینہ ہوا ہوگا"

"کتنے روپے تھے؟"

"پورے ایک سو بیس"

"کیسے کھوئے؟"

"کیا جانے کہیں گرگئے۔ میرے سوامی پلٹن میں نوکر تھے۔ آج کئی برس ہوئے۔ وہ پرلوک سدھارے۔ اب مجھے سرکار سے ساٹھ روپے سالانہ پنشن ملتی ہے۔ اب کے دوسال کی پنشن ایک ہی ساتھ ملی تھی۔ کھجانے (خزانہ) سے روپیہ لے کر آرہی تھی۔ معلوم نہیں۔ کب اور کہاں پھسل پڑے۔ آٹھوں گنیاں تھیں۔"

بھاما۔ "گر وہ تمھیں مل جائیں۔ تو کیا دوگی؟"

ضعیفہ کا زرد چہرہ یوں کھل گیا جیسے مینہ کے بعد پیڑوں کی پتیاں کھل جاتی ہیں۔ بجھی ہوی آنکھیں چمک اٹھیں۔ سمٹے ہوئے اعضا پھیل گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، کسی منتر

سے اُس کی عمر گھٹ گئی ہے۔ رخساروں کی جھریاں مٹتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ بھاما کی طرف نگاہِ احسان سے دیکھ کر بولی۔ کچھ تمھیں معلوم ہے، کس نے پائی ہیں؟"

بھاما۔ "ہاں میرے پتی کو ملی ہیں۔ وہ تمھیں اسی دن سے ڈھونڈ رہے ہیں۔"

ضعیفہ۔ "بیٹی ڈھیر نہیں، اس میں سے پچاس روپے دے دوں گی۔"

بھاما۔ "روپے کیا ہوں گے۔ کوئی ان سے اچھی چیز دو۔"

ضعیفہ۔ "بیٹی اور کیا دوں؟ جب تک جیوں گی۔ تمھارا جس گاؤں گی۔"

بھاما۔ "نہیں اس کی مجھے ضرورت نہیں۔"

ضعیفہ۔ "اس کے سوا میرے پاس اور کیا ہے؟"

بھاما۔ "مجھے اشیرواد دو۔ میرے پتی بیمار ہیں۔ وہ اچھے ہوجائیں۔ ضعیفہ گھٹنے کے بل دیوی کے روبرو بیٹھ گئی۔ اور آنچل پھیلا کر کانپتی ہوئی آواز سے بولی۔

"دیوی ان کا کلیان کرو۔"

بھاما نے دیوی کی طرف دیکھا ان کے نوارنی چہرے پر محبت کا جلوہ نظر آیا۔ آنکھوں میں رحم کی روح افزا جھلک تھی۔ اس کے دل میں کہیں عالمِ بالا سے صد آئی۔ "جا تیرا کلیان ہوگا۔"

(۶)

شام ہوگئی ہے۔ بھاما برج ناتھ کے ساتھ یکہ پر بیٹھ کر تلسی کے گھر اس کی امانت واپس کرنے جارہی ہے۔ برج ناتھ کی کڑی محنت کی کمائی ڈاکٹر کے نذر ہوچکی ہے۔ امانت میں چالیس روپیوں کی کمی تھی۔ بھاما نے اپنے ایک پڑوسی کی معرفت کانوں کے جھومک بیچ کر روپے مہیا کیے ہیں۔

جھومک جس وقت بن کر آئے تھے۔ وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ آج بیچ کر وہ اس سے کہیں زیادہ خوش ہے۔ جس وقت برج ناتھ نے آٹھوں گنیاں اسے دکھائی تھیں اس کے سینے میں ایک گدگدی ہوئی تھی۔ لیکن اس خوشی کو چہرے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ آج اس کی خوشی آنکھوں میں چمک رہی ہے۔ ہونٹوں پر ناچ رہی ہے۔ رخساروں کو رنگ رہی ہے۔ اور اعضاء پر کلیلیں کر رہی ہے۔ وہ نفس کی خوشی تھی۔ یہ روح کی خوشی ہے وہ خوشی شرم سے اندر چھپی ہوئی تھی۔ یہ خوشی غرور سے باہر نکلی ہوئی ہے۔

ضعیفہ کی دعا کا اثر شروع ہوگیا ہے۔ آج صبح کو برج ناتھ پورے تین ہفتے کے بعد تکیے کے سہارے بیٹھے۔ وہ بار بار بھاما کی طرف محبت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ وہ آج انھیں دیوی معلوم ہوتی تھی۔ اب تک انھوں نے اس کے حسنِ ظاہری کا جلوہ دیکھا تھا۔ آج اس کے حسنِ باطن کا جلوہ نظر آرہا ہے۔

تلسی کا مکان ایک گلی میں واقع تھا۔ یکہ سڑک پر جاکر ٹھہر گیا۔ برج ناتھ یکے سے اترے۔ اور اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے بھاما کے ہاتھوں کے سہارے تلسی کے گھر پہنچے۔ تلسی نے روپے لیے۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا دی۔ ''دُرگا جی تمھارا کلیان کریں۔''

برج ناتھ کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ اعضاء میں ایک چستی سی محسوس ہوئی۔ بیماری کا ضعف رخصت ہوگیا۔

وہاں سے آکر برج ناتھ دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ گورے لال بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ برج ناتھ نے نفرت سے منھ پھیر لیا۔ گورے لال نے کہا۔ بھائی صاحب اب طبیعت کیسی ہے؟''

برج ناتھ نے لاپروائی سے کہا۔ ''بہت اچھی طرح سے ہوں۔''

گورے لال۔ مجھے معاف کیجیے گا۔ میں سخت نادم ہوں کہ جلد روپے نہ دے سکا۔ پہلی مارچ کی شام ہی کو گھر سے ایک ضروری خط آگیا اور میں تین مہینے کی رخصت لے کر گھر چلا گیا۔ وہاں سخت پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ لیکن آپ کی بیماری کی خبر سن کر آج بھاگا چلا آتا ہوں۔ یہ لیجیے روپے حاضر ہیں۔ اس تاخیر کو معاف فرمایے!

برج ناتھ نادم ہوگئے۔ بولے۔ ''جی ہاں بیمار تو تھا۔ لیکن محض معمولی بخار تھا۔ آپ کو ناحق میری وجہ سے تکلیف ہوئی۔ اگر اس وقت آپ تردد میں ہوں۔ تو روپے پھر دے دیجیے گا۔ میں امانت کے بوجھ سے سبکدوش ہوگیا ہوں۔ اب کوئی جلدی نہیں ہے۔''

گورے لال جب رخصت ہوئے تو برج ناتھ روپے لیے ہوئے اندر آئے۔ اور بھاما سے بولے۔ ''آج منشی گورے لال نے روپے دیے ہیں۔ یہ لو تمھارا پورا ہوگیا۔ صرف دس روپے کی کمی اور ہے۔''

بھاما نے کہا۔ ''یہ روپے میرے نہیں ہیں۔ تلسی کے ہیں۔ ایک بار پرایا دھن لے کر سیکھ گئی۔''

"لیکن تلسی کے تو پورے روپے دے دیے گئے۔"

"تو کیا؟ یہ اس کی اشیرباد کا نیوچھاور ہے۔"

کان کے جھومک کہاں سے آئیں گے؟"

"اب جھومک نہ پہنوں گی۔ کان کا جھومک گئے تو کیا، ہمیشہ کے لیے کان تو ہو گئے۔"

پریم چند نے 11فروری 1920 کو امتیاز علی تاج کو لکھا تھا کہ درگا کا مندر 'ذخیرہ' میں چھپا تھا یہ افسانہ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ پہلی بار ہندی میں سرسوتی ستمبر1917 میں شائع ہوا ہے ہندی میں مان سرودور 7 میں شامل ہے۔

کپتان

جگت سنگھ کو کتابوں سے نفرت تھی۔ وہ سیلانی، آوارہ گرد، گھمکو نوجوان تھا۔ کبھی امرود کے باغوں کی طرف نکل جاتا اور باغبان کے ہاتھ شوق سے گالیاں کھاتا۔ کبھی دریا کی سیر کرتا اور ملاحوں کی کشتیوں میں بیٹھ کر پار نکل جاتا۔ گالیوں میں مزہ آتا تھا۔ اسے بینڈ باجا بہت پسند تھا۔ بینڈ کا کوئی دن ناغہ نہ کرتا تھا۔ آوارگی اور مسرفی دونوں ہمزاد ہیں اور مسرفی کا سرقے سے گاڑھا رشتہ ہے۔ جگت سنگھ کو جب موقع ملتا گھر سے روپیہ اڑا لے جاتا نقد نہ ملے تو برتن نکال لے جانے میں اسے دریغ نہ تھا۔ گھر میں جتنی شیشیاں اور بوتلیں تھیں وہ سب اس نے صاف کردیں۔ پُرانے وقت کی کتنی ہی چیزیں ان کے یہاں پڑی تھیں۔ جگت سنگھ نے ایک ایک کرکے ان کا خاتمہ کردیا۔ اس فن میں ایسا شاطراور ہوشیار تھا کہ اس کی جدت اور مشکل پسندی پرحیرت ہوتی تھی۔ ایک بار وہ اپنے دو منزلہ مکان کی چھت پر باہر ہی باہر سے چڑھ گیا اور اوپر ہی سے ایک پیتل کی تھالی لے کر اتر آیا۔ گھر والوں کو خبر نہ ہوئی۔

اس کے باپ ٹھاکر بھگت سنگھ اپنے محلے کے ڈاکخانے کے منشی تھے۔ بڑی کوشش اورمنتوں کے بعد افسروں نے انھیں وطن کا ڈاکخانہ دیا تھا۔ لیکن بھگت سنگھ جن ارادوں سے گھر آئے تھے، وہ ایک بھی پورا نہ ہوا۔ الٹا نقصان یہ ہوا کہ آمدنی کی وہ صورتیں جن سے مفصلات میں وہ مستفید ہوتے تھے، یہاں مسدود ہوگئیں۔ یہاں سب سے پرانے تعلقات اور رشتے تھے۔ جبر یا بے مروتی کا موقع نہ تھا۔ اس خستگی میں جگت سنگھ کی دست درازیاں حد درجہ شاق گزرتیں۔ انھوں نے اسے بارہا بڑی بے دردی سے پیٹا۔ جگت سنگھ قوی الجثہ ہونے پر بھی چپکے سے مار کھا لیا کرتا تھا۔ لیکن مار پیٹ تنبیہہ فہمائش کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

جوں ہی وہ گھر میں قدم رکھتا چاروں طرف سے کاؤں کاؤں مچ جاتی۔ ماں دور دور

کرکے دوڑتی۔ دونوں بہنیں گالیاں دینے لگتیں۔ بیچارہ اُلٹے پاؤں بھاگتا۔ کبھی کبھی وہ دو دو تین تین دن بھوکا رہ جاتا۔ گھر والے اس کی صورت سے جلتے تھے۔ آوارہ گردی نے اسے تکلیفوں کا خوگر بنا دیا تھا۔ جہاں نیند آجاتی وہیں پڑا رہتا جو کچھ مل جاتا وہی کھا لیتا۔

جوں جوں گھر والوں کو اس کی حرکتیں معلوم ہوتی جاتی تھیں وہ چوکنے ہوتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک بار کامل مہینے بھر تک جگت سنگھ کی دال نہ گلی۔ چرس والے کے کئی روپے چڑھ گئے۔ گانجے والوں نے تقاضوں کے مارے ناک میں دم کر دیا۔ حلوائی راہ چلتے کڑوی باتیں سنانے لگا۔ بیچارے کو گھر سے نکلنا مشکل ہوگیا۔ رات دن تاک جھانک میں رہتا لیکن گھات نہ ملتی۔ آخر ایک روز بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ بھگت سنگھ ڈاک خانے سے دوپہر کو چلے تو احتیاطاً ایک بیمہ کی رجسٹری جیب میں ڈال لی۔ لیکن گھر پہنچ کر اچکن اتارتے وقت اس کا خیال نہ رہا۔ دالان میں اچکن اتار کر رکھ دی۔ جگت سنگھ تو گھات لگائے ہوئے تھا ہی۔ پیسوں کی امید میں ان کی جیب ٹٹولی۔ لفافہ مل گیا۔ اس پر کئی آنے کے ٹکٹ تھے۔ ٹکٹوں کے لالچ میں اس نے لفافہ اڑا لیا۔ کئی بار وہ ٹکٹ چراکر آدھے داموں پر بیچ دیتا۔ جب لفافے پر سے ٹکٹ آسانی سے نہ ابھر سکے تو اس نے لفافہ پھاڑ ڈالا۔ اس میں سے ایک سو روپے کا نوٹ نکل پڑا۔

جگت سنگھ کی باچھیں کھل گئیں۔ بمبئی کی سیر کی اسے بہت خواہش تھی۔ اسی دن چپکے سے بمبئی چل دیا۔ گھر پر کسی سے کچھ نہ کہا۔ دوسرے دن منشی بھگت سنگھ پر سرقہ اور غبن کا مقدمہ دائر ہوگیا۔

(۲)

بمبئی میں قلعے کے میدان میں بینڈ بج رہا تھا اورراجپوت رجمنٹ کے سجیلے خوشرو جوان قواعد کررہے تھے۔ جس طرح ہوا بادلوں کو نئے روپ میں بدلتی اور بگاڑتی ہے اسی طرح افسر گھوڑے پر سوار زبان کے اشارے سے سپاہیوں کو نئی نئی تربیت سے آراستہ کرتا اور بگاڑ دیتا تھا۔

جب قواعد ختم ہوگئی تو ایک چھیریرے بدن کا جوان اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

کیا نام ہے؟

جگت سنگھ۔

کیا چاہتے ہو؟

فوج میں بھرتی کرلیجیے۔

عدن جانا پڑے گا۔

خوشی سے جاؤں گا۔

بہت محنت کا کام ہے۔

اس کا ڈر نہیں۔

مرنے سے تو نہیں ڈرتے؟

بالکل نہیں۔ راجپوت ہوں۔

جگت سنگھ فوج میں بھرتی ہوگیا۔ اس میں جرأت اور حوصلے کی کمی نہ تھی۔ پانی کی طرح بہاؤ کا راستہ نہ پاکر اس کا من چلاپن کجروی کی جانب مائل ہوتا تھا۔ لیکن یہاں اسے اپنی قابلیتوں کے اظہار کا موقع ملا۔ خلقی جوہر کھلنے لگے۔

تین ماہ بعد یہ رجمنٹ عدن چلی۔ اس وقت جگت سنگھ کو گھر کی یاد آئی۔ ماں کے نام ایک خط لکھا۔ ہم عدن جاتے ہیں، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔

عدن پہنچ کر کتنے سپاہی بے دل ہوگئے۔ لیکن جگت سنگھ کے چہرے پر ذرا بھی میل نہ آیا۔ اس کی جفاکشی اور بے خوف جرأت پر افسروں کو حیرت ہوتی تھی۔ مشکلات کے ساتھ اس کی ہمت بھی بڑھتی تھی نقلی لڑائیوں میں وہ سب سے پیش پیش رہتا جس مہم میں سب کی ہمتیں جواب دے جاتیں اسے سر کرنا اسی کا کام تھا۔ دھاوے میں جس طرح اس کا مردانہ جوش چمک اٹھتا تھا، اسی طرح ہمت میں اس کا مردانہ استقلال محال کو آسان کر دیتا تھا۔ اس کے افسر کہتے، یہ ہوشیار نوجوان ہے۔ کبھی نام کرے گا۔

جگت سنگھ کو عدن میں چار سال گزرے اس کے چہرے سے اب ایک شکوہ اور رعب ٹپکتا ہے۔ وہ اب ایک لحیم نوجوان ہے۔ اس کے جسم کے تناسب پر کسی جمناسٹ کو بھی ناز ہوسکتا ہے۔ اس کے انداز گفتگو سے ایک شانِ اہمیت برستی ہے۔ اس کے افسران کو اس پر کامل اعتبار ہے۔ اب وہ پہلے کا بے فکر آوارہ لڑکا نہیں ہے۔ ذمے داریوں کے احساس کے ساتھ اسے اب گھر کی فکر پیدا ہوگئی ہے۔ وہ کبھی سوچتا ہے، نہیں معلوم گھر کا کیا حال ہوا۔ اس کے صرف سے جو کچھ بچتا ہے وہ سب گھر بھیجتا ہے۔ لیکن گھر سے کبھی

اس کے خطوں کا جواب نہیں آتا۔ معلوم نہیں اماں جیتی ہیں یا نہیں؟ اسے بار بار بہنوں کی یاد آتی ہے۔ ان کی سخت کلامیاں اسے بالکل بھول گئی ہیں۔ کبھی کبھی بے تابی کے عالم میں اس کا جی چاہتا ہے کہ اڑ کر پہنچ جاؤں۔ جب کبھی باپ کی یاد آتی ہے تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ آہ!میری بدولت، مجھ بدنصیب ننگِ خاندان کی بدولت، آج وہ قید میں ہیں۔ اسے اپنی نادانی اور جہالت پر افسوس آتا ہے۔

ایک روز اس نے جا کر کپتان سے کہا۔ صاحب مجھے چھٹی دیجیے، گھر جانا چاہتا ہوں۔ کپتان ڈاک دیکھ رہا تھا۔ اسے دکھا کر بولا۔ بہت ضروری کام ہے۔ لڑائی چھڑ گئی ہے۔

کپتان نے دوسرا لفافہ کھولا اور خوشی سے اچھل کر بولا۔ تمھارا ترقی ہوگیا ہے۔

حوالدار ہوگیا۔ جگت سنگھ نے جھک کرسلام کیا۔

(۳)

سات برس گئے۔ شام کا وقت ہے۔ کلکتہ میں ٹھاکر بھگت سنگھ سنٹرل جیل میں سر جھکائے اداس بیٹھے ہیں۔ ان کی کمر جھک کر کمان ہوگئی ہے۔ چہرہ زرد ہے جسم لاغرو نحیف۔ سات برس کی قیدِ سخت نے بالکل نڈھال اور خستہ حال کردیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بدن میں جان ہی نہیں۔ آج میعاد ختم ہوگئی ہے۔ کل ان کی رہائی کا دن ہے۔ کل وہ آزاد ہوجائیں گے۔ کتنے ہی دیگر قیدیوں کی بھی میعاد پوری ہوگئی ہے۔ ان کے ورثا انھیں لے جانے کے لیے دور دور سے آئے ہیں یہ قیدی مارے خوشی کے ادھر ادھر چہلتے پھرتے ہیں۔ لیکن بھگت سنگھ کے چہرے پر وہی افسردگی کا گاڑھا رنگ ہے۔ تکلیفوں نے خوش ہونے کی قابلیت ہی نہیں رکھی۔

ان ایامِ قید میں متواتر ان پر مصیبتیں نازل ہوئیں۔ بیوی مری، دونوں لڑکیاں گئیں، گھر تباہ ہوگیا، اب گھر کہاں ہے جسے دیکھنے کی خوشی ہو۔ اس خانۂ ویران سے تو جیل خانہ ہی اچھا تھا۔ ہائے کیسی دردناک بے نوائی ہے۔

ایک بوڑھے لیکن توانا قیدی نے آکر اس کا شانہ ہلایا اور بولا، کہو بھگت سنگھ کوئی گھر سے آیا؟

بھگت سنگھ نے آبدیدہ ہوکر جواب دیا۔ گھر پر ہے ہی کون۔ سب تو مرگئے۔ ایک لڑکا تھا وہ پہلے ہی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

دوسرا قیدی بولا۔ بھگت سنگھ، چلو ادھر سے جگناتھ ہوتے چلیں۔

بھگت سنگھ نے کہا، بھائی میرا ٹھکانہ نہیں ہے۔ مجھے تو اب تک یہی نہیں معلوم کہ جاؤں گا کہاں۔

آج قیدیوں کی شبِ عید تھی۔ محافظِ جیل نے انھیں آزاد کر دیا تھا۔ وہ چاروں طرف خوش فعلیاں کرتے پھرتے تھے۔ کوئی گاتا تھا۔ کوئی بغلیں بجاتا تھا۔ کوئی بیوی کے ملنے کے لیے بیتاب۔ کوئی لڑکوں کو دیکھنے کے لیے بیقرار۔ سب اپنے اپنے منصوبے باندھ رہے تھے۔ سب کے سر پر ایک مسرت آمیز اضطراب کا جنون سوار تھا۔ آپس میں دھول دھپا بھی ہوجاتا تھا۔ آج ایامِ مصیبت کا خاتمہ ہے۔ کل اس کال کوٹھری سے نکلیں گے۔ آتشِ شوق دہک رہی تھی۔ لیکن بھگت سنگھ زمین پر پڑے اپنی تقدیر کو رو رہے ہیں۔ اپنی حرماں نصیبی کا انھیں آج تک ایسا جاں شکن صدمہ نہ ہوا تھا۔ گھر کی تباہی کانوں سے تو سن لی۔ لیکن آنکھوں سے کیوں کر دیکھا جائے گا۔ کسی کی موت کی خبر سننے اور اسے جانکنی کی حالت میں دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔ ہائے اب کوئی نام کو رونے والا بھی باقی نہیں۔ کیا کرنے گھر جاؤں، یہیں کہیں ڈوب مروں قصہ تمام ہوجائے۔

رات کو وہ لیٹے تو جگت سنگھ کی یاد آئی۔ سات سال تک کبھی انھوں نے اس کا خیال بھی نہیں کیا تھا۔ اسے دل سے نکال دیا تھا۔ جس کی بدولت زندگی خوار ہوئی، عزت آبرو مٹ گئی، گھر تباہ ہوگیا، اس کا خیال بھی ناقابلِ برداشت تھا۔ لیکن مایوسی اور رنج کے اتھاہ ساگر میں ڈوبتے ہوئے انھوں نے اسی تنکے کا سہارا لیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سوچا، معلوم نہیں اس بیچارے پر کیا گزری۔ لاکھ برا ہے لیکن ہے تو اپنا لڑکا ہی۔ خاندان کی نشانی تو ہے۔ مروں گا تو چار آنسو تو بہائے گا۔ گھر پر ہوتا تو چل کر اس کی شادی کردیتا۔ انھیں میں میری عمر بھی کٹ جاتی۔ نہیں تو اب کون پوچھے گا کہ مرے یا جیتے ہو۔ میں اس کے ساتھ کبھی محبت سے نہیں پیش آتا تھا۔ ذرا بھی شرارت کرتا تو اس کی گردن پر سوار ہوجاتا۔ ایک بار رسوئی میں محض بلا پیر دھوئے جانے پر میں نے الٹا لٹکا دیا تھا۔ کتنی بار محض زور سے بولنے کے لیے میں نے اسے طمانچے لگائے۔ قیمتی لال پاکر میں

نے اس کی قدر نہ کی یہ اسی کی سزا ہے۔

(۴)

صبح ہوئی، امید کا آفتاب نکلا۔ آج اس کی شعاعیں کتنی مدھم تھیں۔ ہوا کتنی خوشگوار۔ آسمان کتنا خوشنما۔ چڑیوں کی بولیاں کتنی پیاری۔ درخت کتنے سرسبز۔ سارا منظر امید کے دل فریب رنگ میں رنگا ہوا تھا۔

جیل کا افسر آیا۔ قیدی قطار باندھ کر کھڑے ہوئے۔ محافظ ایک ایک کا نام لے کر رہائی کا پراونہ دینے لگا۔ قیدیوں کے چہرے مسرتِ امید سے روشن تھے۔ جس کا نام آتا وہ خوش خوش محافظ کے پاس جاتا، پروانہ لیتا، اسے جھک کر سلام کرتا اور تب ولولۂ شادمانی سے مخمور ہوکر اپنے ایامِ مصیبت کے رفیقوں سے بغلگیر ہوجاتا۔ جوں ہی وہ دروازۂ جیل سے باہر نکلتا اس کے ورثا دوڑ کر اس سے لپٹ جاتے۔ اشکِ مسرت کا سیلاب آجاتا۔ کہیں کوئی پیسے لٹا رہا تھا۔ کہیں مٹھائیاں تقسیم ہورہی تھیں۔ کہیں جیل کے ملازموں کو انعام دیا جارہا تھا۔ آج یہ دوزخ کے دیو اخلاق اور انسانیت کے فرشتے بنے ہوئے تھے۔

آخیر میں بھگت سنگھ کا نام آیا۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ جیلر کے پاس گئے۔ اور لاپروائی سے آزادی کا پروانہ لے کر دھیرے دھیرے دروازۂ جیل کی طرف چلے، گویا سامنے کوئی سمندر حائل ہے۔ دروازے سے باہر نکل کر وہ زمین پر بیٹھ گئے۔ کہاں جائیں۔

دفعتاً انھوں نے ایک فوجی افسر کو گھوڑے پر سوار جیل کی طرف آتے دیکھا۔ جس کے جسم پر خاکی وردی تھی۔ سر پر کار چوبی خوشنما صافہ۔ ایک عجیب شان سے گھوڑے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ایک فٹن آرہی تھی۔ جیل کے سپاہیوں نے افسر کو دیکھتے ہی بندوقیں سنبھالیں اور باقاعدہ کھڑے ہوکر سلام کیا۔

بھگت سنگت نے اپنے دل میں کہا۔ ایک وہ خوش نصیب ہیں جس کے لیے فٹن آرہی ہے۔ ایک میں بدنصیب ہوں جس کا کہیں ٹھکانا نہیں۔

نوجوان نے ادھر ادھر تلاش کی نگاہوں سے دیکھا اور تب گھوڑے سے اتر کر سیدھے بھگت سنگھ کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ بھگت سنگھ نے اسے غور سے دیکھا اور تب چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے ارے جگت سنگھ!

بھگت سنگھ ایک لمحے تک خاموش کھڑے رہے۔ جذبات حواس پر غالب آگئے۔

یکایک ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چہرہ پر سرخی کی جھلک نظر آئی۔ وہ جھکے اور بیٹے کو اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور تب ایک پُرغرور نگاہ سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف تاکتے ہوئے بولے۔ نارائن! تم نے مجھ پر بڑی دیا کی۔

دوسرے قیدیوں نے دونوں آدمیوں کی طرف تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ کئی اشخاص بھگت سنگھ کو مبارک باد دینے آئے۔ لیکن وہ اس وقت دوسری ہی دنیا میں تھے۔ کسی سے مخاطب نہ ہوئے۔

ذرا دیر میں دونوں ریلوے اسٹیشن کی طرف چلے فٹن پر بھگت سنگھ تھے۔ گھوڑے پر جگت سنگھ۔ راستے میں اُنھیں لوگ دیکھ کر کہتے تھے۔ یہی کپتان جگت سنگھ ہیں جنھوں نے جرمنوں کی میگزین میں آگ لگائی تھی۔

تماشائیوں میں ایک سپاہی بھی تھا، بولا، تم لوگ میگزین ہی کے لیے رہو۔ بغداد کے قلعے پر سب سے پہلے یہی جھنڈا لے کر چڑھے تھے۔ میں نے آنکھوں سے دیکھا، ایسا سورما آج ملک میں نہیں ہے۔

تیسرا آدمی بولا۔ ابھی عمر کچھ بھی نہیں ہے لیکن کیسے کیسے کام کر دکھائے۔
یہ باتیں سن کر بھگت سنگھ کے سینے میں گدگدی ہورہی تھی۔ آنکھوں میں غرور کا نشہ جھلک رہا تھا۔

تیسرے دن جگت سنگھ اپنے باپ کے ساتھ گھر پہنچے۔ گھر مسمار ہوگیا تھا۔ دیواریں زمین سے مل گئی تھیں۔ دونوں آدمی یہ حال خوار دیکھ کر خوب روئے۔

محلے میں ہلچل مچ گئی۔ دم کے دم میں ہمدردوں اور شناساؤں کا ہجوم لگ گیا۔ لوگ تعزیت آمیز مبارکباد دے رہے تھے۔

ٹھاکر دلیپ سنگھ نے بھگت سنگھ سے کہا، بھیا تمھارے اوپر جو مصیبتیں پڑیں وہ کسی دشمن پر بھی نہ پڑیں، لیکن نارائن نے تمھاری سن لی۔

بھگت سنگھ بولے، ہاں بھائی نارائن نے سچ مچ سن لی۔ مجھے اب اس کا ذرا بھی رنج نہیں ہے۔ گھر کے آدمیوں کے مرنے کا افسوس ہے۔ لیکن ایشور کی نگاہ رہے گی تو یہ گھر پھر سے آباد ہوجائے گا۔

ایک پٹی دار نے طنزیہ لہجے میں کہا تم جیل خانے کیا گئے تمھاری تقدیر جاگ گئی۔ بھگت سنگھ نے جواب دیا۔ ہاں بھائی سچ مچ جاگ گئی۔ یہ مبارک دن دیکھنے کے لیے میں ایسی ایسی میعادیں کاٹ سکتا ہوں۔

اردو ماہنامہ زمانہ دسمبر 1917 میں شائع ہوا عنوان تھا دوا اور دارو۔ اردو مجموعہ 'خاکِ پروانہ' میں شامل ہے۔ ہندی میں 'کپتان صاحب' کے عنوان سے مان سرودر5 میں شامل ہے۔

فتح

شہزادہ مسرور کی شادی ملکۂ مخمور سے ہوئی اور دونوں آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ مسرور گلے چراتا، کھیت جوتتا، مخمور کھانا پکاتی اور چرخہ چلاتی۔ دونوں تالاب کے کنارے بیٹھے ہوئے مچھلیوں کا تیرنا دیکھتے، لہروں سے کھیلتے۔ باغیچے میں جاکر چڑیوں کے چہچہے سنتے اور پھولوں کے ہار بناتے۔ نہ کوئی فکر تھی نہ کوئی کاوش۔

لیکن بہت دن نہ گزرنے پائے تھے کہ ان کی زندگی میں ایک تغیر نمودار ہوا۔ اراکینِ دربار میں بوالہوس خان نام کا ایک فتنہ انگیز شخص تھا۔ شاہ مسرور نے اسے نظر بند کررکھا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ ملکۂ مخمور کے مزاج میں اتنا دخیل ہوگیا کہ ملکہ اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرتی۔ اس نے ملکہ کے لیے ایک ہوائی جہاز بنایا جو محض اشارے سے چلتا تھا۔ ایک سکنڈ میں ہزاروں میل اڑ جاتا اور ایک دقیقہ میں عالمِ بالا کی خبر لاتا۔ ملکہ اس جہاز پر بیٹھ کر یورپ اور امریکہ کی سیر کرتی۔ بوالہوس اس سے کہتا توسیعِ سلطنت بادشاہوں کا اولین فرض ہے۔ اس دنیائے بسیط پر قبضہ کیجیے، تجارت کے وسائل بڑھایے، معدنی دولت نکالیے، فوجیں مرتب کیجیے، ان کے لیے اسلحہ اور حرب کے سامان فراہم کیجیے، دنیا حوصلہ مندوں کے لیے ہے، انھیں کے کارنامے، انھیں کے فتوحات یادگار ہوتے ہیں۔ ملکہ اس کی باتوں کو ہمہ تن گوش ہوکر سنتی۔ اس کے دل میں حوصلے کا جوش اٹھنے لگتا۔ یہاں تک کہ اپنی سادہ پُرقناعت زندگی اسے روکھی پھیکی معلوم ہونے لگی۔

مگر شاہ مسرور قناعت کا پتلا تھا۔ اس کی زندگی کے وہ مبارک لمحے ہوتے تھے جب وہ کنجِ تنہائی میں خاموش، مستغرق ہوکر کائنات اور اس کے اسباب پر غور کرتا اور اس کی وسعتِ بیکراں اور کرشمۂ گوناگوں دیکھ کر فرطِ احترام سے چیخ اٹھتا۔ ”آہ! میری ہستی کتنی ناچیز ہے۔“ اسے ملکہ کے منصوبے اور حوصلے سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محبت اور اخلاص کی جگہ بدگمانیاں پیدا ہوئیں، اراکین میں فرقہ بندیاں ہونے لگیں۔ زندگی

کا اطمینان رخصت ہوگیا۔ مسرور ان کلفتوں کا متحمل نہ ہوسکا جو اس کی تہذیب میں مزاحم ہوتی تھیں۔ وہ ایک دن اٹھا اور سلطنت ملکہ کے سپرد کرکے، ایک کوہستانی علاقے میں جا چھپا۔ سارا دربار نئی امنگوں سے متوالا ہو رہا تھا، کسی نے بادشاہ کو روکنے کی کوشش نہ کی۔ مہینوں، برسوں، ہوگئے کسی کو ان کی خبر نہ ملی۔

(۲)

ملکہ مخمور نے ایک بڑی فوج آراستہ کی اور بوالہوس خان کو مہمات پر روانہ کیا۔ اس نے علاقے، علاقے، اور ملک پر ملک جیتنے شروع کیے۔ سیم و زر اور لعل و جواہر کے انبار ہوائی جہازوں پر لد کر دار الخلافہ کو آنے لگے۔

لیکن حیرت کا مقام یہ تھا کہ ان روز افزوں ترقیوں سے ملک کے اندرونی معاملات میں شورش ہونے لگی۔ وہ صوبے جو اب تک تابعِ فرمان تھے۔ علم بغاوت بلند کرنے لگے۔ کرن سنگھ بُندیلا ایک فوج لے کر چڑھ آیا۔ مگر عجیب فوج تھی۔ نہ کوئی سامانِ حرب، نہ اسلحے، نہ توپیں۔ سپاہیوں کے ہاتھوں میں بندوق اور سناں، تیر و تفنگ کے بجائے بربط و طنبور، سارنگیاں، بیلے، ستار اور طاؤس تھے۔ توپوں کی گھن گرج صداؤں کے بدلے طبلے اور مردنگ کی گمک تھی۔ بم گولوں کی جگہ جل ترنگ، آرگن اور آرچسٹر تھا۔ ملکہ مخمور نے سمجھا آن کی آن میں اس فوج کو پریشان کرتی ہوں، لیکن جوں ہی اس کی فوج کرن سنگھ کے مقابلے میں روانہ ہوئی، دلآویز، روح پرور صداؤں کا وہ سیلاب آیا، شیریں خوشگوار نغموں کی وہ بوچھار، اور خوشنوائیوں کی وہ یورش ہوئی کہ ملکہ کی سپاہ پتھر کی مورتوں کی طرح دم بخود کھڑی رہ گئی۔ ایک لمحے میں سپاہیوں کی آنکھیں مسرور ہوگئیں۔ انھیں ایک نشہ سا آیا، تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگے، سر ہلا ہلا کر اچھلنے اور تب سب کے سب لاشِ بیجان کی طرح گر پڑے۔ اور محض سپاہی نہیں، دارالخلافہ میں بھی جس کے کانوں میں یہ صدائیں گئیں وہ بے ہوش ہوگیا۔ سارے شہر میں کوئی زندہ نظر نہ آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سنگین مورتوں کا طلسمات ہے۔ ملکہ اپنے جہاز پر بیٹھی یہ کرشمہ دیکھ رہی تھی۔ اسنے جہاز نیچے اتارا کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے۔ پر ان آوازوں کے کان میں پہنچتے ہی اس کی بھی وہی کیفیت ہوگئی۔ وہ ہوائی جہاز پر ناچنے لگی اور بے ہوش ہوکر گر پڑی۔ جب کرن سنگھ قصر شاہی کے قریب جا پہنچا اور نغمے بند ہوگئے تو ملکہ کی آنکھیں کھلیں۔ جیسے کسی کا

نشہ ٹوٹ جائے۔ اس نے کہا "میں وہی نغمہ سنوں گی، وہی راگ، وہی الاپ، وہ لبھانے والے گیت۔ ہائے وہ آوازیں کہاں گئیں۔ کچھ پرواہ نہیں۔ میرا راج جائے پاٹ جائے میں وہی راگ سنوں گی۔"

سپاہیوں کا نشہ بھی ٹوٹا۔ انھوں نے ہم آہنگ ہوکر کہا۔ "ہم وہی گیت سنیں گے، وہی پیارے پیارے دل کش راگ، بلا سے ہم گرفتار ہوں گے۔ غلامی کی بیڑیاں پہنیں گے، آزادی سے ہاتھ دھوئیں گے، پر وہی راگ، وہی ترانے، وہی تانیں، وہی زمزمے۔"

(۳)

صوبہ دار لوچن داس کو جب کرن سنگھ کی ظفریابی کا حال معلوم ہوا تو وہ بھی آمادۂ سرکشی ہوا۔ اپنی فوج لے کر دارالخلافہ پر چڑھ دوڑا۔ ملکہ نے اب کی جان توڑ مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ سپاہیوں کو خوب للکارا، اور انھیں لوچن داس کے مقابلے میں آراستہ کیا۔ مگر واہ ری حملہ آور فوج! نہ کہیں سوار نہ پیادے، نہ توپ، نہ بندوق، نہ سامانِ حرب ضرب۔ سپاہیوں کی رقاصانِ دلنواز کے طائفے تھے اور تھیٹر کے ایکٹر۔ سواروں کی جگہ بھانڈوں اور بہروپیوں کے غول، مورچوں کی جگہ تیتروں اور بیٹروں کے جوڑ چھوٹے ہوئے تھے۔ بندوق و سناں کی جگہ سرکس اور بائیسکوپ کے خیمے ایستادہ تھے۔ کہیں لعل و جواہر اپنی آب و تاب دکھا رہے تھے۔ ایک طرف انواع و اقسام کے چرند و پرند کی نمائش کھلی ہوئی تھی۔ میدان کے ایک حصے میں صفحۂ گیتی کے عجائبات۔ آبشار و برفستانی چوٹیاں، اور برف کے پہاڑ، پیرس کا بازار، لندن کا اکسچنج، باسٹن کی منڈیاں، افریقہ کے جنگل، صحرا کے ریگستان، جاپان کی گلکاریاں، چین کے دریائی شہر، جنوبی امریکہ کے مردم خوار، قاف کی پریاں، لاپ لینڈ کے سمورپوش انسان۔ اور ایسے صدہا عجیب ودلکش مناظر چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ ملکہ کی سپاہ یہ نظارہ دیکھتے ہی بیخود ہو کر اس کی طرف دوڑی۔ کسی کو سر پیر کی سدھ نہ رہی۔ لوگوں نے بندوقیں پھینک دیں۔، تلواریں اور کرچیں اتار پھینکیں، اور بے تحاشا ان مناظر کے چاروں طرف جمع ہوگئے۔ کوئی رقاصوں کی شیریں ادائیوں اور نازک خرامیوں پر فریفتہ ہوا۔ کوئی تھیٹر کے تماشوں پر ریجھا، کچھ لوگ تیتروں اور بیٹروں کے جوڑ دیکھنے لگے۔ اور تب سب کے سب نقش دیوار کی طرح بے حس وحرکت کھڑے رہ گئے۔ ملکہ اپنے ہوائی جہاز پر بیٹھی کبھی تھیٹر کی طرف جاتی، کبھی سرکس کی طرف دوڑتی،

یہاں تک کہ وہ بھی بے ہوش ہوگئی۔

لوچن سنگھ جب مظفرو منصور قصر شاہی میں داخل ہوگیا تو ملکہ کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے کہا۔ "ہائے وہ تماشے کہاں گئے۔، وہ دلکش مناظر، وہ جانفریب نیرنگیاں، کہاں غائب ہوگئیں۔ میرا راج جائے پاٹ جائے، لیکن میں یہ سیر ضرور دیکھوں گی۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ زندگی میں کیا کیا مزے ہیں!"

سپاہی بھی بیدار ہوئے۔ انھوں نے یک زبان ہوکر کہا، ہم وہی سیرو تماشا دیکھیں گے، ہمیں جنگ سے کچھ غرض نہیں، ہم کو آزادی کی پرواہ نہیں۔ ہم غلام ہوکر رہیں گے، پیروں میں بیڑیاں پہنیں گے، پر ان دلفریبیوں کے بغیر نہیں رہ سکتے!"

(۴)

ملکہ مخمور کو اپنی سلطنت کا یہ حال دیکھ کر بہت قلق ہوتا۔ وہ سوچتی کیا اسی طرح سارا ملک میرے ہاتھ سے نکل جائے گا؟ اگر شاہ مسرور نے یوں کنارہ نہ کرلیا ہوتا تو سلطنت کی یہ حالت کبھی نہ ہوتی۔ کیا انھیں یہ کیفیتیں معلوم نہ ہوں گی۔ یہاں سے دم دم کی خبریں ان کے پاس جاتی ہیں مگر ذرا بھی جنبش نہیں کرتے۔ کتنے بے رحم ہیں۔ خیر جو کچھ سر پر آئے گی سہہ لوں گی، پر ان کی منت نہ کروں گی۔

لیکن جب وہ دلفریب نغمے سنتی اور دلکش مناظر دیکھتی تو یہ اندوہناک خیالات فراموش ہوجاتے۔ اسے اپنی زندگی نہایت پُر لطف معلوم ہوتی۔

بوالہوس خان نے لکھا میں دشمنوں سے گھر گیا ہوں۔ نفرت علی اور کین خان اور جوالا سنگھ نے چاروں طرف سے یورش شروع کردی ہے۔ جب تک اور کمک نہ آئے میں معذور ہوں۔ پر ملکہ کی سپاہ یہ سیر اور نغمے چھوڑ کر جانے پر راضی نہ ہوتی تھی۔

اتنے دن میں دوصوبے داروں نے پھر بغاوت کی۔ مرزا شمیم اور رس راج سنگھ دونوں متحد ہوکر دارالخلافہ پر چڑھے۔ ملکہ کی سپاہ میں اب نہ غیرت تھی نہ شجاعت۔ نغمہ وسیر نے انھیں آرام طلب بنا دیا تھا۔ بہ مشکل تمام سج سجا کر میدان میں نکلے۔ غنیم کی فوج منتظر کھڑی تھی۔ لیکن نہ کسی کے پاس تلوار تھی نہ بندوق۔ سپاہیوں کے ہاتھوں میں پھولوں کے خوشنما گلدستے تھے کسی کے ہاتھ میں عطر کی شیشیاں، کسی کے ہاتھ میں گلاب کے فوارے۔ کہیں لوینڈر کی بوتلیں، کہیں مشک وغیرہ کی بہار۔ سارا میدان طبلۂ عطار بنا

ہوا تھا۔ دوسری طرف رس راج کی سپاہ تھی۔ ان سپاہیوں کے ہاتھوں میں طلائی خوان تھے، زربفت کے خوان پوشوں سے ڈھکے ہوئے، کسی میں فیرنی و بالائی تھی، کسی میں قورمے اور کباب، کسی میں خوبانی و انگور، کہیں کشمیری نعمتیں سجی ہوئی تھیں۔ کہیں اطالی لوذیات کی بہار تھی۔ اور کہیں پرتگال و فرانس کی شرابیں شیشیوں میں مہک رہی تھیں۔

ملکہ کی سپاہ وہ بوئے جاں پرور سونگھتے ہی متوالی ہوگئی۔ لوگوں نے ہتھیار پھینک دیے اور ان ملذذات کی طرف دوڑے۔ کوئی حلوے پر گرا، کوئی بالائی پر ٹوٹا، کسی نے قورمے اور کباب پر ہاتھ بڑھائے۔ کوئی خوبانی وانگور چکھنے لگا۔ کوئی کشمیری لوذیات پر لپکا۔ ساری سپاہ بھک منگوؤں کی طرح ہاتھ پھیلائے یہ نعمتیں مانگتی تھی اور کمالِ اشتیاق سے کھاتی تھی۔ ایک ایک لقمہ کے لیے ایک چمچہ فیرنی کے لیے، ایک ساغر مئے کے لیے، خوشامدیں کرتے تھے، ناکیں رگڑتے تھے، سجدے کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ساری فوج پر ایک نشہ طاری ہوگیا۔ بیدم ہوکر گر پڑی۔ ملکہ بھی اطالی مطبخوں کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کر منتیں کرتی تھی اور کہتی تھی صرف ایک لقمہ اور، ایک پیالہ اور، میرا راج لو، پاٹ لو، میرا سب کچھ لو، لیکن مجھے سیر ہونے دو، یہاں تک کہ وہ بھی بے ہوش ہوکر گر پڑی۔

(۵)

ملکہ کی حالت اب نہایت درناک تھی۔ اس کی سلطنت کا ایک قلیل حصہ دشمنوں کے دست برد سے بچا ہوا تھا۔ اسے ایک دم کے لیے بھی اس غلامی سے نجات نہ ملتی۔ کبھی کرن سنگھ کے دربار میں حاضر ہوتی، کبھی مرزا شمیم کی خوشامد کرتی۔ اس کے بغیر اسے چین نہ آتا۔ ہاں جب کبھی اس سخن سازی اور ذلت سے اس کی طبیعت آزردہ ہوتی تو وہ اکیلے بیٹھ کر گھنٹوں روتی اور چاہتی کہ جاکر شاہ مسرور کو منالاؤں۔ اسے یقین تھا کہ ان کے آتے ہی باغی کافور ہوجائیں گے۔ پر ایک ہی لمحے میں اس کی طبیعت بدل جاتی۔ اسے اب کسی حالت پر قرار نہ تھا۔

ابھی تک بوالہوس خان کی اطاعت میں فرق نہ آیا تھا۔ لیکن جب اس نے سلطنت کا یہ ضعف دیکھا تو وہ بھی بغاوت کر بیٹھا۔ اسکی آزمودہ کار فوج کے مقابلے میں ملکہ کی سپاہ کیا ٹھہرتی۔ پہلے ہی حملے میں قدم اکھڑ گئے۔ ملکہ خود گرفتار ہوگئی۔ بوالہوس خان نے

اسے ایک طلمساتی قید خانے میں بند کردیا۔ محکوم سے حاکم بن بیٹھا۔

یہ قید خانہ اتنا وسیع تھا کہ کوئی قیدی کتنا ہی بھاگنے کی کوشش کرے اس کی چہار دیواری سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ وہاں محافظ اور پاسبان نہ تھے۔ لیکن وہاں کی ہوا میں ایک کشش تھی۔ ملکہ کے پیروں میں بیڑیاں تھیں نہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، لیکن جسم کا ایک ایک عضو تاروں سے بندھا ہوا تھا۔ وہ اپنی خواہش سے ہل نہ سکتی تھی۔ وہ اب دن کے دن بیٹھی ہوئی زمین پر مٹی کے گھروندے بنایا کرتی اور سمجھتی یہ محل ہیں۔ طرح طرح کے سوانگ بھرتی اور سمجھتی دنیا مجھے دیکھ کر لٹو ہوئی جاتی ہے۔ سنگریزوں سے اپنا جسم گوندھ لیتی اور سمجھتی کہ اب حوریں بھی میرے سامنے مات ہیں۔ وہ درختوں سے پوچھتی میں کتنی خوبصورت ہوں؟ شاخوں پر بیٹھی ہوئی چڑیوں سے پوچھتی اتنی دولت تونے دیکھی ہے؟

معلوم نہیں اس حالت میں کتنے دن گزر گئے۔ مرزا شمیم، لوچن داس وغیرہم ہردم اسے گھیرے رہتے تھے۔ شاید وہ اس سے خائف تھے۔ سمجھتے تھے ایسا نہ ہو یہ شاہ مسرور سے نامہ وپیام کرے۔ قید میں بھی اس پراعتبار نہ تھا۔ یہاں تک کہ ملکہ کی طبیعت اس قید سے بیزار ہوگئی۔ وہ نکل بھاگنے کی تدبیریں سوچنے لگی۔

اس حالت میں ایک دن ملکہ بیٹھی سوچ رہی تھی میں کیا تھی کیا ہوگئی؟ جو میرے اشاروں کے غلام تھے وہ میرے آقا ہیں۔ مجھے جس کل چاہتے ہیں بٹھاتے ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں گھماتے ہیں۔ افسوس! میں نے شاہ مسرور کا کہنا نہ مانا۔ یہ اسی کی سزا ہے۔ کاش ایکبار مجھے کسی طرح اس قید سے نجات ہوتی تو میں چل کر ان کے قدموں پر سر رکھ دیتی اور کہتی لونڈی کی خطا کو معاف کیجیے۔ میں خون کے آنسو روتی، اور انھیں منالاتی۔ اور پھر کبھی ان کے حکم سے انحراف نہ کرتی! میں نے اس نمک حرام بوالہوس خان کی باتوں میں پڑ کر انھیں جلاوطن کر دیا۔ میری عقل کہاں چلی گئی تھی۔

یہ سوچتے سوچتے ملکہ رونے لگی کہ یکایک اس نے دیکھا سامنے ایک شگفتہ رو، متین، سادہ پوش مرد کھڑا ہے۔ ملکہ نے متحیر ہوکر پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟ یہاں میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔"

مرد۔ "ہاں میں اس قید خانے میں بہت کم آتا ہوں۔ میرا کام ہے کہ جب قیدیوں

کی طبیعت یہاں سے بیزار ہو تو انھیں یہاں سے نکلنے میں مدد دوں۔"

ملکہ۔ "آپ کا نام؟"

مرد۔ "سنتوکھ سنگھ۔"

ملکہ۔ "آپ مجھے اس قید سے نجات دلا سکتے ہیں؟"

سنتوکھ۔ "ہاں میرا تو کام ہی یہ ہے۔ لیکن میری ہدایتوں پر چلنا ہوگا۔"

ملکہ۔"میں آپ کے حکم سے سرِ مو بھی تجاوز نہ کروں گی۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے جلد لے چلیے۔ میں تا دمِ مرگ آپ کی ممنون رہوں گی۔"

سنتوکھ۔ "آپ کہاں چلنا چاہتی ہیں؟"

ملکہ۔ "میں شاہ مسرور کی خدمت میں جانا چاہتی ہوں۔ آپ کو معلوم ہے وہ آج کل کہاں ہیں؟"

سنتوکھ۔ "ہاں معلوم ہے۔ میں ان کا خادم ہوں۔ انھیں کی طرف سے میں اس کام پر مامور ہوں۔"

ملکہ۔ "تو للہ مجھے جلد لے چلیے۔ مجھے اب یہاں ایک لمحہ رہنا بھی شاق ہے۔"

سنتوکھ۔ "اچھا تو یہ ریشمی کپڑے اور یہ جواہرات اور طلائی زیور اتار کر پھینک دو۔ بوالہوس نے انھیں زنجیروں سے تمھیں جکڑ دیا ہے۔ موٹے سے موٹا کپڑا مل سکے پہن لو۔ ان مٹی کے گھروندوں کو گرا دو۔ عطر اور گلاب کی شیشیاں، صابن کی بٹیاں اور یہ پاؤڈر کے ڈبے سب پھینک دو۔"

ملکہ نے شیشیاں اور پاؤڈر کے ٹین تڑاق تڑاق پٹک دیے۔ طلائی زیورات کو اتار کر پھینک دیا کہ اتنے میں بوالہوس خان زار و قطار روتا ہوا ہاتھ باندھ کر کہنے لگا۔ ملکۂ دوجہاں میں آپ کا ناچیز غلام ہوں۔ آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟"

ملکہ نے انتقام کے جوش میں مٹی کے گھروندوں کو پیروں سے ٹھکرا دیا۔ ٹھیکروں کے انبار کو ٹھوکریں مار کر بکھیر دیا۔ بوالہوس کے جسم کا ایک ایک عضو کٹ کٹ کر گرنے لگا۔ وہ بے دم ہوکر زمین پر گر پڑا اور دم کی دم میں واصلِ جہنم ہوگیا۔

سنتوکھ نے ملکہ سے کہا۔ "دیکھا تم نے؟ اسی دشمن کو تم کتنا خوفناک سمجھتی تھیں۔ آن کی آن میں خاک میں مل گیا۔"

ملکہ۔ ”کاش مجھے یہ حکمت معلوم ہوتی تم میں کبھی کی آزاد ہوجاتی۔ لیکن ابھی بھی اور بھی تو کتنے ہی دشمن ہیں۔“

سنتوکھ۔ ”ان کا ہلاک کرنا اس سے بھی آسان ہے۔ چلو کرن سنگھ کے پاس۔ جوں ہی وہ اپنے سُر اَلاپنے لگے اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے کانوں پر ہاتھ رکھ لو۔ دیکھو پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔“

ملکہ کرن سنگھ کے دربار میں پہنچی۔ اسے دیکھتے ہی چاروں طرف سے دھرپت اور تلانے کی وار ہونے لگے۔ پیانو بجنے لگے۔ ملکہ نے دونوں کان بند کرلیے۔ کرن سنگھ کے دربار میں آگ کا شعلہ اٹھنے لگا۔ سارے درباری جلنے لگے۔ کرن سنگھ دوڑا ہوا آیا اور نہایت عاجزی سے ملکہ کے پیروں پر گر کر بولا۔ حضور اس دیرینہ غلام پر رحم کریں۔ کانوں پر سے ہاتھ ہٹالیں ورنہ اس غریب کی جان پر بن جائے گی۔ اب کبھی حضور کی شان میں یہ گستاخی نہ ہوگی۔“

ملکہ نے کہا ۔ اچھا جا تیری جان بخشی کی۔ اب کبھی بغاوت نہ کرنا ورنہ جان سے ہاتھ دھوئے گا۔

کرن سنگھ نے سنتوکھ کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر صرف اتنا کہا۔ ”ظالم تجھے موت بھی نہیں آتی“ اور بے تحاشا گرتا پڑتا بھاگا۔ سنتوکھ سنگھ نے ملکہ سے کہا۔ دیکھا تم نے ان کا ہلاک کرنا کتنا آسان تھا۔ اب چلو لوچن داس کے پاس۔ جوں ہی وہ اپنے کرشمے دکھانے لگے دونوں آنکھیں بند کرلینا۔“

ملکہ لوچن داس کے دربار میں پہنچی۔ اسے دیکھتے ہی لوچن نے اپنی قوت کا اظہار کرنا شروع کیا۔ ڈرامے ہونے لگے۔ رقاصوں نے تھرکنا شروع کیا۔ لعل و زمرد کی کشتیاں سامنے آنے لگیں لیکن ملکہ نے دونوں آنکھیں بند کرلیں۔

آن کی آن میں وہ ڈرامے اور سرکس اور رقاصوں کے گروہ خاک میں مل گئے۔ لوچن داس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ مایوسانہ استقلال کے ساتھ چلّا چلّا کر کہنے لگا۔ ”یہ تماشا دیکھو۔ یہ پیرس کے قہوے خانے۔ یہ مس ایلن کا ناچ ہے۔ دیکھو انگریز رؤسا اس پر کتنی فیاضی سے زر و جواہر نثار کر رہے ہیں۔ جس نے یہ سیر و تماشے نہ دیکھے اس کی زندگی موت سے بدتر۔“ لیکن ملکہ نے آنکھیں نہ کھولیں۔

تب لوچن سنگھ بدحواس ومضطرب، شاخِ بید کی طرح کانپتا ہوا ملکہ کے سامنے آکھڑا ہوگیا اور دست بستہ بولا۔ "حضور آنکھیں کھولیں۔ اس دیرینہ غلام پر رحم فرمائیں۔ نہیں تو میری جان بر بن جائے گی۔ غلام کی گستاخیاں معاف فرمائیں۔ اب یہ بے ادبی نہ ہوگی۔"

ملکہ نے کہا۔ "اچھا جا تیری جان بخشی کی ۔ لیکن خبردار اب سر نہ اٹھانا۔ نہیں تو واصلِ جہنم کردوں گی۔"

لوچن داس یہ سنتے ہی گرتا پڑتا جان لے کر بھاگا۔ پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔ سنتوکھ نے ملکہ سے کہا۔ "اب چلو مرزا شمیم اور رس راج کے پاس۔ وہاں ایک ہاتھ سے ناک بند کرلینا اور دوسرے ہاتھ سے خوانِ لطیف کو زمین پر گرا دینا۔"

ملکہ اور سنتوکھ سنگھ، رس راج اور شمیم کے دربار میں پہنچے۔ انھوں نے جو سنتوکھ سنگھ کو ملکہ کے ساتھ دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ مرزا شمیم نے مشک اور زعفران کی روح پرور لپٹیں اڑانا شروع کیں۔ رس راج ملذذ نعمتوں کے خوان سجا سجا کر ملکہ کے سامنے لانے لگا اور ان کی تعریف کرنے لگا۔ یہ پرتگال کی سہ آتشہ ہے۔ اسے پیے تو پیر جوان ہوجائے۔" یہ فرانس کا شامپین ہے۔ اسے پیے تو مردہ زندہ ہوجائے۔ یہ متھرا کے پیڑے ہیں۔ انھیں کھائے تو بہشت کی نعمتوں کو بھول جائے۔" لیکن ملکہ نے ایک ہاتھ سے ناک بند کرلی اور دوسرے ہاتھ سے ان خوانوں کو زمین پر گرا دیا۔ اور بوتلوں کو ٹھوکر مار مار کر چور کر دیا۔ جوں جوں اس کے ٹھوکر پڑتے تھے دربار کے درباری چیخ چیخ کر بھاگتے تھے۔ آخر مرزا شمیم اور رس راج دونوں خستہ اور بے حال، سر سے خون جاری اعضا شکستہ آکر ملکہ کے سامنے کھڑے ہوگئے اور گڑ گڑا کر بولے۔ "حضور غلاموں پر رحم کریں، حضور کی شان میں جو گستاخیاں ہوئی ہیں انھیں معاف فرمائیں۔ اب پھر ایسی بے ادبی نہ ہوگی۔"

ملکہ نے کہا۔ راس راج کو میں جان سے مارنا چاہتی ہوں۔ اس کے باعث مجھے ذلیل ہونا پڑا۔ لیکن سنتوکھ سنگھ نے منع کیا۔ "نہیں اسے جان سے نہ ماریے۔ اس کا سا خادم ملنا دشوار ہے۔ یہ آپ کے سب صوبے دار اپنے کام میں یگانۂ روزگار ہیں۔ صرف انھیں قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔"

ملکہ نے کہا۔ "اچھا جاؤ تم دونوں کی بھی جان بخشی کی۔ لیکن خبردار اب فتنہ و فساد نہ کرنا ورنہ تم جانو گے۔"

دونوں گرتے پڑتے بھاگے اور دم کی دم میں نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

ملکہ کی رعایا اور سپاہ نے نذریں گزاریں۔ گھر گھر شادیانے بجنے لگے۔ چاروں باغی صوبے دار شہر پناہ کے پاس چھاپہ مارنے کی گھات میں بیٹھ گئے۔ لیکن سنتوکھ سنگھ جب رعایا اور سپاہ کو مسجد میں شکریہ کی نماز ادا کرنے کے لیے گیا تو باغیوں کو کوئی امید نہ رہی۔ وہ مایوس ہوکر چلے گئے۔

جب ان مراسم سے فرصت ہوئی تو ملکہ نے سنتوکھ سنگھ سے کہا۔ "میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اور نہ الفاظ میں اتنی طاقت ہے کہ میں آپ کے احسانوں کا شکریہ ادا کرسکوں۔ آپ نے مجھے غلامی سے نجات دی۔ میں دمِ آخر آپ کا جَس گاؤں گی۔ اب شاہ مسرور کے پاس مجھے لے چلیے۔ میں ان کی خدمت کرکے اپنی عمر بسر کرنی چاہتی ہوں۔ ان سے منحرف ہوکر میں نے بہت ذلت اور مصیبت جھیلی۔ اب کبھی ان کے قدموں سے جدا نہ ہوں گی۔

سنتوکھ سنگھ۔ "ہاں ہاں چلیے میں تیار ہوں۔ لیکن منزل سخت ہے۔ گھبرانا مت۔"

ملکہ نے ہوائی جہاز منگوایا، پھر سنتوکھ سنگھ نے کہا۔ "وہاں ہوائی جہاز کا گزر نہیں ہے پیدل چلنا پڑے گا۔" ملکہ نے مجبور ہوکر ہوائی جہاز واپس کردیا اور یکہ وتنہا اپنے آقا کو منانے چلی۔

وہ دن بھر بھوکی پیاسی پیادہ پا چلتی رہی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ کانٹوں سے پیر چھلنی ہوگئے۔ اس نے اپنے رہنما سے پوچھا "ابھی کتنی دور ہے؟"

سنتوکھ۔ ابھی بہت دور ہے۔ چپ چاپ چلی آؤ۔ یہاں باتیں کرنے سے منزل کھوٹی ہوجاتی ہے" رات ہوئی۔ آسمان پر بادل چھا گئے۔ سامنے ایک دریا پڑا کشتی کا پتہ نہ تھا۔ ملکہ نے پوچھا "کشتی کہاں ہے؟"

سنتوکھ نے کہا۔ "دریا میں چلنا پڑے گا۔ یہاں کشتی کہاں۔"

ملکہ کو خوف معلوم ہوا۔ لیکن وہ جان پر کھیل کر دریا میں چل پڑی۔ معلوم ہوا کہ

صرف آنکھ کا دھوکا تھا۔ وہ ریتیلی زمین تھی۔ ساری رات سنتوکھ سنگھ نے ایک لمحے کے لیے دم نہ لیا۔ جب ستارۂ صبح نکل آیا ملکہ نے رو کر کہا ابھی کتنی دور ہے؟ میں تو مری جاتی ہوں۔"

سنتوکھ سنگھ نے جواب دیا۔ چپ چاپ چلی آؤ۔

ملکہ نے ہمت کر کے پھر قدم بڑھائے۔ اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ راستے میں مر ہی کیوں نہ جاؤں پرناکام نہ لوٹوں گی۔ اس قید سے بچنے کے لیے وہ کڑی سے کڑی مصیبتیں جھیلنے کو تیار تھی۔ آفتاب طلوع ہوا۔ سامنے ایک عمودی پہاڑ نظر آیا جس کی چوٹیاں آسمان میں گھسی ہوئی تھیں۔ سنتوکھ سنگھ نے پوچھا اسی پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر شاہ مسرور ملیں گے۔چڑھ سکو گی؟"

ملکہ نے استقلال سے کہا۔ "ہاں چڑھنے کی کوشش کروں گی۔"

بادشاہ کی ملاقات ہونے کی امید نے اس کے بے جان پیروں میں پر لگادیے۔ وہ تیزی سے قدم اٹھا کر پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ کمر کوہ تک آتے آتے وہ تھک کر بیٹھ گئی۔ غش آگیا۔ معلوم ہوا کہ دم نکل رہا ہے اس نے مایوسانہ نگاہوں سے اپنے رفیق کو دیکھا سنتوکھ سنگھ نے کہا ایک دفعہ اور ہمت کرو۔ دل میں خدا کی یاد کرو۔"

ملکہ نے خدا کی یاد کی۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ پھرتی سے اٹھی اور ایک ہی ہلے میں چوٹی پر جا پہنچی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ وہاں پاکیزہ ہوا میں سانس لیتے ہی ملکہ کو جسم میں ایک نئی زندگی کا احساس ہوا۔ اس کا چہرہ روشن ہوگیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ میں چاہوں تو ہوا میں اڑ سکتی ہوں۔ اس نے خوش ہوکر سنتوکھ سنگھ کی طرف دیکھا اور دریائے حیرت میں غرق ہوگئی۔ جسم وہی تھا پر چہرہ شاہ مسرور کا تھا۔ ملکہ نے پھر اس کی طرف استعجاب کی نگاہ سے دیکھا۔ سنتوکھ سنگھ کے جسم پر سے ایک بادل کا پردہ ہٹ گیا اور ملکہ کو وہاں شاہ مسرور کھڑے نظر آئے۔ وہی ہلکا زرد کرتہ، وہی گیروے رنگ کی تہمد۔ ان کی صورت سے جلال برستا تھا۔ پیشانی ستارہ کی طرح درخشاں تھی۔ ملکہ ان کے قدموں پرگر پڑی۔ شاہ مسرور نے اسے سینہ سے لگا لیا۔

اردو ماہنامہ زمانہ میں اپریل 1918میں شائع ہوا۔ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں 'وجے' کے عنوان سے 'گپت دھن' 1 میں شامل ہے۔

قربانی

انسان کی حیثیت کا سب سے زیادہ اثر غالباً اس کے نام پر پڑتا ہے۔ منگرو ٹھاکر جب سے کانسٹبل ہوگئے ہیں، ان کا نام منگل سنگھ ہوگیا ہے۔ اب انھیں کوئی منگرو کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ کلو اہیر نے جب سے تھانے دار صاحب سے دوستی کی ہے اور گاؤں کا مکھیا ہوگیا ہے، اس کا نام کالکادین ہوگیا ہے، اب کوئی کلو کہے تو وہ آنکھیں لال پیلی کرتا ہے۔ اسی طرح ہرکھ چند کورمی اب ہرکھو ہوگیا ہے۔ آج سے بیس سال پہلے اس کے یہاں شکر بنتی تھی۔ کئی ہل کی کھیتی ہوتی تھی۔ کاروبار خوب پھیلا ہوا تھا۔ لیکن بدیسی شکر کی آمد نے اُسے اتنا نقصان پہنچایا کہ رفتہ رفتہ کارخانہ ٹوٹ گیا۔ ہل ٹوٹ گئے۔ کاروبار ٹوٹ گیا۔ زمین ٹوٹ گئی۔ اور وہ خود ٹوٹ گیا۔ ستر برس کا بوڑھا ایک تکیہ دار ماچے پر بیٹھا ہوا ناریل پیا کرتا تھا۔ اب سر پر ٹوکرا لے کر کھاد پھینکنے جاتا ہے۔

لیکن اس کے انداز میں اب بھی ایک خود داری، چہرہ پر اب بھی متانت، گفتگو میں اب بھی ایک شان ہے۔ جس پر گردشِ ایام کا اثر نہیں پڑا۔ رسی جل گئی پر بل نہیں ٹوٹا۔ ایام نیک انسان کے اطوار پر ہمیشہ کے لیے اپنی مہر چھوڑ جاتے ہیں، ہرکھو کے قبضے میں اب صرف پانچ بیگھہ زمین ہے، صرف دو بیل ہیں، ایک ہل کی کھیتی ہوتی ہے۔ لیکن پنچائتوں میں، باہمی نزاع کے فیصلوں میں اس کی رائیں اب بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ وہ جو بات کہتا ہے بے لاگ کہتا ہے، اس گاؤں کے نو بڑھے اس کے مقابلے میں زبان نہیں کھولتے۔"

ہرکھو نے اپنی زندگی میں کبھی دوا نہیں کھائی، وہ بیمار ضرور پڑتا تھا۔ کنوار کے مہینہ میں جب ملیریا بخار کا دورہ ہوتا تو سب سے پہلے اس کا اثر ہرکھو ہی پر ہوتا۔ لیکن ہفتہ عشرہ میں وہ بلا دوا کھائے ہی چنگا ہوجاتا تھا۔ اب کے بھی وہ حسبِ معمول بیمار پڑا اور دوا نہ کھائی۔ لیکن بخار اب کی موت کا پروانہ لے کر چلا تھا۔ ہفتہ گزرا، دو ہفتے گزرے، مہینہ

گزر گیا اور ہرکھو چارپائی سے نہ اٹھا۔ اب اسے دوا کی ضرورت معلوم ہوئی۔ اس کا لڑکا گردھاری کبھی نیم کے سینکے پلاتا، کبھی گرچ کا عرق، کبھی گت بورنا کی جڑ۔ لیکن اس کو کچھ فائدہ نہ ہوتا تھا۔ ایک دن منگل سنگھ کانسٹبل ہرکھو کے پاس بیمار پرسی کے لیے گئے۔ غریب ٹوٹی کھاٹ پر بیٹھا رام نام جپ رہا تھا۔ منگل سنگھ نے کہا۔ بابا کوئی دوا کھائے بغیر بیماری نہ جائے گی۔ کونین کیوں نہیں کھاتے؟ ہرکھو نے توکلانہ انداز سے کہا۔"تو لیتے آنا۔"

دوسرے دن کالکادین نے جا کر کہا۔ "بابا دوچار دن کوئی دوا کھالو اب تمھارے بدن میں وہ بوتا تھوڑے ہی ہے کہ بنا دوا درپن کے اچھے ہوجاؤ۔"

ان سے بھی ہرکھو نے سائلانہ انداز سے کہا "تو لیتے آنا۔"

لیکن یہ رسمی عیادتیں تھیں۔ ہمدردی سے خالی۔ نہ منگل سنگھ نے خبر لی، نہ کالکادین نے، نہ کسی دوسرے نے۔ ہرکھو اپنے برآمدے پر کھاٹ پر پڑا معلوم نہیں کس خیال میں غرق رہتا۔ منگل سنگھ کبھی نظر آجاتے تو کہتا بھیا وہ دوا نہیں لائے۔ منگل سنگھ کترا کر نکل جاتے۔ کالکادین دکھائی دیتے تو ان سے بھی یہی سوال کرتا۔ لیکن وہ بھی نظر بچا جاتے۔ یا تو اسے یہ سوجھتا ہی نہیں تھا کہ دوا دارو بغیر پیسوں کے نہیں آتی یا وہ پیسے کو جان سے بھی سوا عزیز سمجھتا تھا۔ یا اس کا فلسفہ دوا دارو میں مانع تھا کہ جب بھوگ پورا ہوجائے گا تو بیماری خود بخود چلی جائے گی۔ اس نے کبھی قیمت کا ذکر نہیں کیا اور دوا نہ آئی۔ اس کی حالت ردی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ پانچ مہینے تک دکھ جھیلنے کے بعد وہ عین ہولی کے دن اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ گردھاری نے لاش بڑی دھوم دھام سے نکالی۔ کریاکرم بڑے حوصلے سے کیا، کئی گاؤں کے براہمنوں کو بھوج دیا، سارے گاؤں نے ماتم منایا۔ ہولی نہ منائی گئی۔ نہ عبیر اور گلال اڑی، نہ دف کی صدا بلند ہوئی، نہ بھنگ کے پرنالے چلے، کچھ لوگ دل میں بڈھے کو کوستے ضرور تھے کہ اسے آج ہی مرنا تھا، دو ایک دن بعد مرتا۔ لیکن اتنا بے غیرت کوئی نہ تھا کہ غم میں جشن کرتا۔ وہ شہر نہیں تھا جہاں کوئی کسی کا شریک نہیں ہوتا۔ جہاں ہمسائے کے نالہ و زاری کی صدا ہماری کانوں تک نہیں پہنچتی۔

(۲)

ہرکھو کے کھیت گاؤں والوں کی آنکھوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ پانچوں بیگہ زمین

کنوئیں قریب، زر خیز، کھاد پانس سے لدی ہوئی، مینڈ باندھ سے درست تھی۔ اس میں تین تین فصلیں پیدا ہوتی تھیں۔ ہرکھو کے مرنے سے ان پر چاروں طرف سے یورش ہونے لگی۔ گردھاری کریاکرم میں مصروف تھا، اور گاؤں کے متمول کاشتکار، لالہ اونکار ناتھ کو چین نہ لینے دیتے تھے، نذرانے کی بڑی بڑی رقمیں پیش کی جاتی تھیں، کوئی سال بھر کا لگان پیشگی ادا کرنے کو تیار تھا، کوئی نذرانہ کی دوگنی رقم کا دستاویز لکھنے کو آمادہ۔ لیکن اونکارناتھ ان سبھوں کو لطائف الحیل سے ٹالتے رہتے تھے ان کا خیال تھا کہ گردھاری کے باپ نے ان کھیتوں کو بیس سال تک جوتا ہے اور ان پر گردھاری کا حق سب سے زیادہ ہے۔ وہ اگر دوسروں سے کم نذرانہ بھی دے تو یہ زمین اسی کے نام رہنی چاہیے چنانچہ جب گردھاری کریا کرم سے فرصت پاچکا اور چیت کا مہینہ ختم ہونے کو آیا تو اونکارناتھ نے گردھاری کو بلوایا اور اس سے پوچھا ”کھیتوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“

گردھاری نے رو کرکہا۔ ”حضور انھیں کھیتوں کا تو آسرا ہے، جوتوں گا نہ تو کیا کروں گا۔“

اونکارناتھ۔ ”نہیں تو میں تم سے کھیت نکالنے کو تھوڑے ہی کہتا ہوں۔ ہرکھو نے بیس سال تک انھیں جوتا۔ اور کبھی ایک پیسہ باقی نہیں رکھا۔ تم ان کے لڑکے ہو اور تمھارا اس زمین پر حق ہے، لیکن تم دیکھتے ہو اب زمین کا در کتنا بڑھ گیا ہے، تم آٹھ روپیہ بیگہ پر جوتتے تھے۔ مجھے دس روپے بیگہ مل رہے ہیں، اور نذرانہ کے سو روپے الگ۔ میں تمھارے ساتھ رعایت کرکے لگان وہی رکھتا ہوں، لیکن نذرانے کے روپے تمھیں دینے پڑیں گے۔“

گردھاری۔ ”سرکار میرے گھر میں تو اس وقت روٹیوں کا بھی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اتنے روپے کہاں سے لاؤں گا، جو کچھ جمع جتھا تھی، وہ دادا کے کریا کرم میں خرچ ہوگئی، اناج کھلیان میں ہے، لیکن دادا کے بیمار ہوجانے سے اب کی ربیع بھی اچھی نہیں ہوئی۔ میں روپیہ کہاں سے لاؤں۔“

اونکار ناتھ۔ ”ہاں زیر بار تو تم ہو رہے ہو، تم نے کریا کرم خوب دل کھول کرکیا، لیکن یہ تو دیکھو کہ میں اتنا نقصان کیسے برداشت کرسکتا ہوں۔ میں تمھارے ساتھ دس روپے سال کی رعایت کررہا ہوں یہ کیا کم ہے۔“

گردھاری۔ ’’نہیں سرکار آپ ہماری بڑی پرورش کررہے ہیں، تم نے سدا سے ہمارے اوپر دیا کی ہے، لیکن اتنا بخزانہ میرا کیا نہ ہوگا۔ میں آپ کا گریب اسامی ہوں، ویس میں رہوں گا تو جنم بھر آپ کی گلامی کرتا رہوں گا، بیل بدھیا بیچ کر پچاس روپے حاجر کروں گا۔ اس سے بیشی کی میری ہمت نہیں پڑتی، آپ کو نارائن نے بہت کچھ دیا ہے، اتنی پرورش اور کیجیے۔‘‘

اونکارناتھ کو گردھاری کا یہ انکار ناگوار گزرا۔ وہ اپنی دانست میں اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ رعایت کرچکے تھے، کوئی دوسرا زمیندار اتنی رعایت بھی نہ کرتا۔ ’’بولے۔ تم سمجھتے ہوگے کہ یہ روپے لے کر ہم اپنے گھر میں رکھ لیتے ہیں اور خوب چین کی بنسی بجاتے ہیں، لیکن ہمارے اوپر جو کچھ گزرتی ہے وہ ہمیں جانتے ہیں، کہیں چندہ، کہیں نذرانہ، کہیں انعام، کہیں اکرام، ان کے مارے ہمارا کچومر نکلا جاتا ہے، پھر ڈالیاں علاحدہ دینی پڑتی ہیں۔ جسے ڈالی نہ دو وہی منھ پھلاتا ہے، ہفتوں اسی فکر میں پریشان رہتا ہوں، صبح سے شام تک بنگلوں کا چکر لگاؤ، خانساماؤں اور اردلیوں کی خوشامد کرو، جن چیزوں کے لیے لڑکے ترس کر رہ جاتے ہیں، وہ منگا منگا کے ڈالیوں میں لگاتا ہوں، اگر نہ کروں تو مشکل ہوجائے، کبھی قانون گو آگئے، کبھی تحصیلدار آگئے، کبھی ڈپٹی صاحب کا لشکر آگیا، ان سب کی مہمانی نہ کروں تو نکو بنوں۔ سال میں ہزار بارہ سو روپے انھیں باتوں میں خرچ ہوجاتے ہیں، یہ سب کہاں سے آئے۔ اس پر اپنے گھر کا خرچ، بس یہی جی چاہتا ہے کہ گھر چھوڑ کے نکل جاؤں، یہ زمین کیا ہے جی کا جنجال ہے، ساری زندگی عملوں کی خوشامد اور خاطر داری میں کٹی جاتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تو کہیں چلاجاتا! چار پیسے کماتا اور بے فکری کی نیند سوتا۔‘‘

ہم زمینداروں کو غریبوں کا گلا دبانے کے لیے ایشور نے اپنا پیادہ بنایا ہے، یہی ان کا کام ہے۔ ادھر گلادبا کے لینا، ادھر رو رو کے دینا۔ لیکن تم لوگ یہی سمجھتے ہو کہ سب ہمارے ہی گھر میں آتا ہے۔ تمھارے ساتھ اتنی رعایت کررہا ہوں لیکن تم اتنے پر بھی خوش نہیں ہوتے توبھئی تمھیں اختیار ہے۔‘‘

’’نذرانے میں ایک پیسے کی بھی رعایت نہ ہوگی۔ چیت ختم ہو رہا ہے اگرایک ہفتے کے اندر روپے داخل کرو گے تو کھیت جوتنے پاؤگے نہیں تو میں کوئی دوسرا بندوبست کروں گا۔

(۴)

گردھاری اداس اور مایوس گھر آیا۔ سو روپے کا انتظام اس کے قابو سے باہر تھا۔ سوچنے لگا کہ اگر دونوں بیل بیچ دوں تو کھیت ہی لے کر کیا کروں گا۔ گھر بیچوں تو یہاں اُسے لینے والا ہی کون ہے؟ اور پھر باپ داداؤں کا نام جاتا ہے، چار پانچ پیڑ ہیں، لیکن انھیں بیچ کر یہاں پچیس تیس روپے ملیں گے، اس سے زیادہ نہیں۔ قرض مانگوں تو دیتا ہی کون ہے۔ ابھی برہم بھوج کے آٹے گھی کے پچاس روپے بنئے کے آتے ہیں، وہ ایک پیسہ بھی اور نہ دے گا، اس کے پاس گہنے بھی تو نہیں ہیں، نہیں وہی بیچ کر روپے لاتا۔ لے دے کے ایک ہنسلی بنوائی تھی وہ بھی بنیئے کے گھر پڑی ہوئی ہے۔ سال بھر بیت گئے۔ چھڑانے کی نوبت نہ آئی۔ گردھاری اور اس کی بیوی سہاگی دونوں ہی اسی فکر میں رات دن غلطاں و پیچاں رہتے ہیں لیکن کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی۔

گردھاری کو کھانا پینا اچھا نہ لگتا۔ راتوں کو نیند نہ آتی۔ ہر دم دل پر ایک بوجھ سا رکھا رہتا۔ کھیتوں کے نکلنے کا خیال کرتے ہی اس کے جگر میں ایک آگ سی لگ جاتی تھی۔ ہائے وہ زمین جسے ہم نے بیس برس جوتا۔ جسے کھاد سے پاٹا، جس میں میڑیں رکھیں جس کی میڈیں بنائیں ان کا مزہ اب دوسرا اٹھائے گا۔

کھیت اس کی زندگی کا جزو بن گئے تھے۔ اس کی ایک ایک انگل زمین اس کے خونِ جگر سے رنگی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ایک ذرہ اس کے پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ ان کے نام اس کی زبان پر اس طرح آتے تھے، جیسے اپنے تینوں بچوں کے۔ کوئی چوبیسو تھا، کوئی بائیسو تھا، کوئی نالے پر والا، کوئی تلیا والا۔ ان ناموں کے آتے ہی کھیتوں کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی وہ ان کھیتوں کا اس طرح ذکر کرتا تھا گویا وہ ذی روح ہیں۔ گویا وہ جان دار ہستیاں ہیں۔ اس کی ہستی کے سارے منصوبے، سارے ہوائی قلعے، ساری من کی مٹھائیاں، ساری آرزوئیں، سارے حوصلے انھیں کھیتوں سے وابستہ تھے۔ ان کھیتوں کے بغیر وہ اپنی زندگی کا خیال ہی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اب ہاتھ سے نکلے جاتے ہیں۔ وہ گھر سے ایک حسرتناک وحشت کے عالم میں نکل جاتا۔ اور گھنٹوں کھیتوں کی مینڈ پر بیٹھا ہوا رویا کرتا۔ گویا ان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہے۔

اس طرح ایک پوار ہفتہ گزر گیا۔ اور گردھاری روپیہ کا کوئی انتظام نہ کرسکا۔

آٹھویں دن اسے معلوم ہوا کہ کالکادین نے انھیں سو روپے نذرانہ دے کر دس روپیہ بیگہ پر لے لیا ہے۔

گردھاری نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ ایک لمحے کے بعد اپنے دادا کا نام لے کر زار و قطار رونے لگا۔ گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔

اس دن گھر میں چولھا نہیں جلا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہرکھو آج ہی مرا ہے۔ اس کی موت کا صدمہ آج ہورہا تھا۔

(۴)

لیکن سبھاگی یوں تقدیر پر شاکر ہونے والی عورت نہ تھی وہ خانہ جنگیوں میں اکثر زبان کے تیر وتضحیک سے غالب آجایا کرتی تھی۔ اس اسلحے کی تاثیر کی وہ قائل تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہر ایک میدان میں وہ یکساں کاٹ کرتے ہیں۔ اس میں وہ متانت نہیں تھی جو خطرے کو اپنی قوت سے باہر دیکھ کر توکل کی پناہ لیتی ہے۔ وہ غصے میں بھری ہوئی کالکادین کے گھر گئی اور اس کی بیوی کو خوب صلاوتیں سنائیں۔ "کل کا بانی آج کا سیٹھ۔ کھیت جوتنے چلے ہیں۔ دیکھوں گی کون میرے کھیت میں ہل لے جاتا ہے۔ اپنا اور اس کا لہو ایک کردوں۔ روپے کا گھمنڈ ہوا ہے تو میں یہ گھمنڈ توڑ دوں گی۔"

پڑوسیوں نے اس کی حمایت کی۔ "سچ تو ہے آپس میں یہ چڑھا اوپری نہیں چاہیے۔ نارائن نے دھن دیا ہے تو کیا گریبوں کو کچلتے پھریں گے۔" سبھاگی نے سمجھا میں نے میدان مار لیا۔ لیکن وہی ہوا جو پانی میں تلاطم پیدا کرتی ہے، درختوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالتی ہے۔ سبھاگی توپڑوسیوں کے گھر میں بیٹھی ہوئی اپنے دکھڑے روتی اورکالکادین کی بیوی سے چھیڑ چھیڑ کرلڑتی اورگردھاری اپنے دروازے پر اداس بیٹھا ہوا سوچتا کہ اب میرا کیا حال ہوگا۔ اب یہ زندگی کیسے پار لگے گی۔ یہ لڑکے کس دروازے پر جائیں گے۔ مزدوری کے خیال ہی سے اس کے دل میں ایک درد اٹھنے لگتا تھا۔ مدتوں آزادانہ باعزت زندگی بسر کرنے کے بعد مزدوری اس کی نگاہ میں موت سے بدتر تھی۔ وہ اب تک گرہست تھا۔ گاؤں میں اس کا شمار بھلے آدمیوں میں ہوتا تھا۔ اسے گاؤں کے معاملات میں بولنے کا حق حاصل تھا۔ اس کے گھر میں دولت نہ ہو لیکن وقار تھا۔ نائی اوربڑھئی اورکہار اور پروہت اور چوکیدار سب کے سب اس کے اس خوار تھے۔ اب یہ عزّت کہاں، اب کون اس کی

بات پوچھے گا؟ کون اس کے دروازے پر آئے گا؟ اب اسے کسی کے برابر بیٹھنے کا کسی کے بیچ میں بولنے کا حق نہیں ہے! اب اسے پیٹ کے لیے دوسروں کی غلامی کرنے والا مزدور بننا پڑے گا۔ اب پھر رات رہے کون بیلوں کو نادیں لگائے گا۔ کون ان کے لیے چھانٹا کٹائے گا؟ وہ دن اب کہاں جب گیت گا گا کر ہل جوتتا تھا۔ چوٹی سے پسینہ ایڑی تک آتا تھا۔ لیکن ذرا بھی تھکن نہ معلوم ہوتی تھی۔ اپنے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا۔ کھلیان میں اناج کے انبار سامنے رکھے ہوئے وہ سنسار کا راجہ معلوم ہوتا تھا۔ اب کھلیان سے اناج کو ٹوکرے بھر بھر کرکون لائے گا۔ اب کھانے کہاں بکھار کہاں، اب یہ دروازہ سونا ہوجائے گا۔ یہاں گرد اڑے گی اورکتے لوٹیں گے۔ دروازے پر بیلوں کی پیاری پیاری صورت دیکھنے کو آنکھیں ترس جائیں گی۔ ان کو آرزو مند آنکھیں کہاں دیکھنے کو ملیں گی۔ دروازے کی سوبھا نہ رہے گی۔

اس حسرتناک خیال کے آتے ہی گردھاری کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ اس نے دوسروں کے گھر آنا جانا چھوڑ دیا۔ بس حسرت اور ملال میں محو بیٹھا رہتا۔ گاؤں کے دو چار آدمی جو کالکادین سے حسد رکھتے تھے اس کے ساتھ ہمدردی کرنے آتے، پر وہ ان سے بھی کھل کر نہ بولتا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں سب کی نگاہوں میں گر گیا ہوں۔ اگر کوئی اسے سمجھاتا کہ تم نے کریا کرم میں ناحق اتنے روپے اڑا دیے تو اسے بہت ناگوار گزرتا تھا۔ وہ اپنی اس حرکت پر ذرا بھی نہ پچھتاتا تھا۔ کہتا میرے بھاگ میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہوگا۔ لیکن دادا کے رِن سے تو اُرِن ہوگیا۔ ان کی آتما کو تو کوئی دکھ نہیں ہوا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں تو چار کو کھلا کر کھایا۔ کیا مرنے کے بعد انھیں پنڈے پانی کو ترساتا۔"

اسی طرح تین مہینے گزر گئے اور اساڑھ آپہنچا۔ آسمان میں گھٹائیں آئیں۔ پانی گرا، زمین میں ہریالی آگئی۔ تال اور گڈھے لہرانے لگے۔ بڑھئی سب کسانوں کے دروازے پر آآکر ہلوں کی مرمت کرتا تھا۔ جوئے بناتا تھا۔ گردھاری دل میں مسوس کر رہ جاتا۔ پاگلوں کی طرح کبھی اندر جاتا۔ کبھی باہر۔ اپنے ہلوں کو نکال نکال کر دیکھتا۔ اس کی مُٹھیا ٹوٹ گئی ہے اس کی پھار ڈھیلی ہوگئی ہے۔ جوئے میں سیل نہیں ہے۔ یہ دیکھتے دیکھتے وہ ایک لمحے کے لیے اپنے کو بھول گیا۔ دوڑا ہوا بڑھئی کے پاس گیا اور بولا۔ رجّو! میرے ہل

بھی بگڑے ہوئے ہیں آج انھیں بنا دینا۔ رجّو نے اس کی طرف رحم اور تعجب کی نگاہ سے دیکھا اور اپنا کام کرنے لگا۔ گردھاری کو بھی ہوش ہوگیا۔ نیند سے چونک پڑا۔ شرم سے اس کا سر جھک گیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ چپ چاپ گھر چلا آیا۔ گاؤں میں چاروں طرف ہل چل مچی ہوئی تھی۔ کوئی سن کے بیج ڈھونڈھتا پھرتا تھا کوئی زمیندار کے چوپال سے دھان کے بیج لیے آتا تھا۔ کہیں صلاح ہوتی تھی کہ کھیت میں کیا بونا چاہیے۔ کہیں چرچے ہوتے تھے کہ پانی بہت برس گیا۔ دوچار دن ٹھہر کے بونا چاہیے۔ گردھاری سارے تماشے دیکھتا تھا۔ سارے چرچے سنتا تھا۔ اورماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔

(۵)

ایک دن شام کے وقت گردھاری کھڑا اپنے بیلوں کو کھجا رہا تھا۔ آج کل اس کا بہت سا وقت بیلوں ہی کی داشت میں صرف ہوتا تھا کہ منگل سنگھ آئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرکے بولے۔ "اب گوئیں کو باندھ کر کب تک کھلاؤ گے۔ نکال کیوں نہیں دیتے۔" گردھاری نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "ہاں کوئی گاہک آجائے تو نکال دوں گا۔"
منگل سنگھ۔ "ہمیں کو دے دو۔"

گردھاری نے آسمان کی طرف تاک کرکہا۔ "تمھیں لے جاؤ اب یہ میرے کس کام کے ہیں۔"

ان الفاظ میں کتنی مایوسی، کتنی حسرت تھی۔ اب تک گردھاری نے ایک موہوم امید پر کسی غیبی امداد کے بھروسے پرانھیں باندھ کر کھلایا تھا۔ آج امید کا وہ خیالی تار بھی ٹوٹ گیا۔ مول بول ہوا۔ گردھاری نے دونوں بچھڑے چالیس روپے میں لیے تھے۔ اب وہ اسّی سے کم کے نہ تھے۔ منگل سنگھ نے صرف پچاس روپے لگائے لیکن گردھاری اسی پر راضی ہوگیا۔ اس کے دل نے کہا جب گرہستی ہی لٹ رہی ہے۔ تو کیا دس سے زیادہ کیا دس سے کم۔ منگل سنگھ نے منہ مانگی مراد پائی دوڑ کر گھر سے روپے لائے۔

وہ گردھاری کے کھاٹ پر بیٹھے ہوئے روپے گن رہے تھے اور گردھاری بیلوں کے پاس کھڑا دردناک انداز سے ان کے منھ کی طرف تاکتا تھا۔ یہ میرے کھیتوں کے کمانے والے میرا ارمان رکھنے والے۔ میری امیدوں کی دو آنکھیں، میری آرزوؤں کے دو تارے، میرے اچھے دنوں کی دو یادگاریں، یہ میرے دو ہاتھ اب مجھ سے رخصت ہو رہے ہیں،

اور مٹھی بھر روپیوں کے لیے!

آخر منگل سنگھ نے روپے گن کر رکھ دیے اور بیلوں کو کھول کر لے چلے تو گردھاری ان کے کندھوں پر باری باری سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ جیسے میکے سے بدا ہوتے وقت لڑکی ماں باپ کے پیروں کو نہیں چھوڑتی اس طرح گردھاری ان بیلوں سے چمٹا ہوا تھا، جیسے کوئی ڈوبتا ہوا آدمی کسی سہارے کو پاکر اس سے چمٹ جائے۔ سبھاگی بھی دالان میں کھڑی روتی تھی۔ اور چھوٹا لڑکا جس کی عمر پانچ سال کی تھی منگل سنگھ کو ایک بانس کی چھڑی سے مار رہا تھا۔

رات کو گردھاری نے کچھ نہیں کھایا اور چارپائی پر پڑا رہا۔ لیکن صبح کو اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اِدھر مہینوں سے وہ کسی کے گھر نہ جاتا تھا۔ سبھاگی کو اندیشہ ہوا، تاہم وہ امید کے خلاف امید کرتی رہی کہ آتے ہوں گے۔ لیکن جب آٹھ نو بجے اور وہ نہ لوٹا تو اس نے رونا دھونا شروع کیا۔ گاؤں کے بہت سے آدمی جمع ہوگئے۔ چاروں طرف کھوج ہونے لگی۔ لیکن گردھاری کا پتہ نہ چلا۔ لیکن ابھی تک آس میں کچھ جان تھی۔ اس لیے چوڑیاں نہ توڑیں ماتم نہ کیا۔ شام ہوگئی تھی اندھیرا چھا رہا تھا۔ سبھاگی نے دیا لاکر گردھاری کی چارپائی کے سرہانے رکھ دیا تھا اور بیٹھی دروازے کی طرف تاک رہی تھی۔ گود کی لڑکی سورہی تھی اور چھوٹا لڑکا ضد کررہا تھا کہ دادا کو بلا دے وہ کہاں گیا ہے۔ کیوں نہیں آتا؟ کہ یکایک سبھاگی کو پیروں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ سبھاگی کے کلیجے میں مسرّت کا دھاکا ہوا۔ دروازے کی طرف دوڑی۔ لیکن چارپائی خالی تھی۔ اس نے باہر جھانکا۔ اس کا کلیجہ دھک دھک کرتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ گردھاری بیلوں کی ناند کے پاس چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رو رہا ہے۔ سبھاگی بول اٹھی۔ ”گھر میں آؤ وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ سارے دن حیران کر ڈالا۔“ یہ کہتی ہوئی وہ گردھاری کی طرف تیزی سے چلی، گردھاری نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ پیچھے ہٹنے لگا اور تھوڑی دور جاکر غائب ہوگیا۔ سبھاگی نے ایک چیخ ماری اور غش کھاکر گرپڑی۔

اسی دن نور کے تڑکے کالکادین مہتو ہل لے کر اپنے ایک نئے کھیت میں پہنچے۔ ابھی کچھ اندھیرا تھا۔ وہ بیلوں کو ہل میں لگا رہے تھے کہ یکایک انھوں نے دیکھا کہ کھیت کی مینڈ پر گردھاری کھڑا ہے۔ وہی مرزائی، وہی پگڑی۔ وہ سر جھکائے ہوئے تھا۔ کالکادین نے

کہا ارے گردھاری! مرد آدمی تم یہاں کھڑے ہو اور بے چاری سہاگی حیران ہو رہی ہے۔ کہاں سے آ رہے ہو؟ یہ کہتا ہوا وہ بیلوں کو چھوڑ کر گردھاری کی طرف چلا، مگر گردھاری پیچھے ہٹنے لگا۔ اور جاتے جاتے پیچھے کی طرف والے کنوئیں میں کود پڑا۔ کالکادین نے چیخ ماری۔ ہل وَل چھوڑ کر بے تحاشا گھر کی طرف بھاگے۔

لیکن انھوں نے اپنے ہلواہوں سے یہ راز نہ بتلایا۔ دوسرے دن اپنے ایک جھینگر ہلواہے کو اس کھیت میں بھیجا۔ شام ہوگئی، سب کے ہل بیل آگئے لیکن جھینگر کھیت سے نہ لوٹا۔ گھڑی رات ہوئی۔ اس کا کہیں پتہ نہیں۔ کالکادین گھبرائے گاؤں کے دو تین آدمیوں کے ساتھ کھیت میں آئے۔ دیکھا کہ دونوں بیل ایک طرف گرے ہوئے ہیں۔ اور جھینگر دوسری طرف بے سدھ پڑا ہوا ہے۔ اُسے بہت سہلایا بلایا لیکن اسے ہوش نہ آیا۔ دو تین آدمی اُسے لاد کر گھر لائے۔ بیلوں کو دیکھا تو ان کے پیروں سے خون نکل رہا تھا۔ لوگ سمجھ گئے جب جھینگر گر پڑا ہوگا تو دونوں بیل آپس میں کھینچا تانی کرنے لگے ہوں گے۔ ہل میں جتے تھے ہی۔ پھال پیروں میں لگ گئی ہوگی۔ جھینگر رات بھر ہذیان بکتا رہا۔ صبح کو جاکر اسے ہوش آیا۔ اسنے کہا میں نے پورب والے کنوئیں کے پاس گردھاری کو کھڑے دیکھا۔ کئی بار بلایا لیکن وہ نہ بولا، تب میں اس کی طرف چلا، بس وہ کنوئیں میں کود پڑا، پھر مجھے ہوش نہیں کہ کیا ہوا۔ سارے گاؤں میں مشہور ہوگیا، طرح طرح کے چرچے ہونے لگے۔ لیکن اس دن سے پھر کالکادین کو ان کھیتوں کے قریب جانے کی ہمت نہ پڑی۔ شام ہوتے ہی اُدھر کا راستہ بند ہوجاتا تھا۔

(٦)

اس واقعے کو آج چھ ماہ ہوگئے ہیں۔ گردھاری کا بڑا لڑکا اب اینٹ کے بھٹے پر کام کرتا ہے۔ اور روزانہ دس بارہ آنے گھر لاتا ہے۔ وہ اب قمیض اور انگریزی جوتا پہنتا ہے۔ گھر میں ترکاری دونوں وقت پکتی ہے اور جوار کی جگہ گیہوں اور چاول خرچ ہوتا ہے، لیکن گاؤں میں اب اس کا کچھ وقار نہیں ہے وہ مجورا ہے۔

سہاگی کی تیزی اور تمکنت رخصت ہوگئی ہے۔ آگ کی چنگاری راکھ ہوگئی ہے۔ اب وہ کسی کو جلا نہیں سکتی۔ اسے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا منتشر کرسکتا ہے۔ پرائے گاؤں میں آئے ہوئے کتے کی طرح دبکی پڑی ہے۔ وہ اب پنچایتوں میں نظر نہیں آتی۔ اب نہ اس کا

دربار لگتا ہے نہ اسے کسی دربار میں دخل ہے۔ وہ اب مجبوری کی ماں ہے۔ لیکن ابھی تک گردھاری کا کریا کرم نہیں ہوا۔ آس مرگئی ہے لیکن اس کی یاد باقی ہے۔ کالکادین نے اب گردھاری کے کھیتوں سے استعفا دے دیا ہے کیوں کہ گردھاری کی روح ابھی تک اپنے کھیتوں کے چاروں طرف منڈلاتی رہتی ہے وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی اپنے کھیتوں کو دیکھ کر اُسے تسکین ہوتی ہے۔ انکار ناتھ بہت کوشش کرتے ہیں کہ زمین اٹھ جائے۔ لیکن گاؤں کے لوگ اب اس کی طرف تاکتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

پہلی بار ہندی ماہنامہ سرسوتی مئی 1918 میں 'بلیدان' کے عنوان سے شائع ہوا۔اردو مجموعہ 'پریم بتیسی' میں شامل ہے۔ مان سرودر8 میں شامل ہے۔

بازیافت

جب میں سسرال آئی تو بالکل غیرمہذب تھی۔ مجھے نہ پہننے اور نہ اوڑھنے کا سلیقہ تھا۔ نہ بات چیت کرنے کی تمیز۔ میں آنکھیں سامنے کرکے کسی سے بات نہیں کرسکتی تھی۔ وہ خود بخود جھک جاتیں۔ مجھے کسی کے سامنے گاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ مجھے عورتوں کے روبرو بے نقاب آنے میں بھی عار تھا۔ میں کچھ تھوڑی سی ہندی پڑھی ہوئی تھی۔ لیکن مجھے ناولوں کے پڑھنے میں لطف نہ آتا تھا۔ مجھے فرصت ملتی تو رامائن پڑھتی۔ اس میں میرا جی بہت لگتا تھا۔ میں اسے کوئی انسانی تصنیف نہ سمجھتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اسے کسی دیوتا نے بنایا ہوگا۔ انسانی تخیل کی بلندپروازی کا مجھے مطلق اندازہ نہ تھا۔ میں سارے دن گھر کا کوئی نہ کوئی کام کرتی رہتی۔ اپنی بوڑھی ساس سے تھرتھر کانپتی تھی۔ ایک دن دال میں نمک زیادہ ہوگیا۔ سسر جی نے کھاتے وقت صرف اتنا کہا۔ ''نمک ذرا اندازے سے ڈالا کرو۔'' اتنا سن کر کلیجہ دہل گیا۔ مجھے کوئی اس سے زیادہ سخت سزا نہیں دے سکتا تھا۔

لیکن میری یہ دہقانیت، میری بدتمیزی اور پھوہڑپن میرے بابو جی(شوہر) کو پسند نہ آتی تھی۔ وہ وکیل تھے۔ انھوں نے اونچی سے اونچی علمی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ اور گو وہ مجھ سے محبت ضرور کرتے تھے، لیکن اس میں سرگرمی کے بجائے رحم کا حصہ زیادہ ہوتا تھا۔ عورتوں کی تعلیم اور معاشرت کے متعلق ان کے خیالات بہت اعلیٰ تھے۔ وہ مجھے اس معیار سے بدرجہا نیچے دیکھ کر غالباً دل ہی دل میں افسوس کرتے تھے۔ لیکن اس میں میری کوئی خطا نہ دیکھ کر وہ رسم و رواج پر جھنجلاتے تھے۔ انھیں میرے ساتھ بیٹھنے یا باتیں کرنے میں مطلق لطفِ صحبت حاصل نہ ہوتا تھا۔ وہ سونے بھی آتے تو کوئی نہ کوئی انگریزی کتاب لے آتے اور اسے گھنٹوں پڑھا کرتے۔ اگر پوچھتی کیا پڑھتے ہو؟ تو نگاہِ رحم سے دیکھ کر کہتے ''تم کو کیا بتلاؤں۔ یہ آسکروائلڈ کی بہترین تصنیف ہے۔'' میں اپنی خامی

پر دل میں حد درجہ نادم تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا۔ کہ میں ایسے بیدار مغز، روشن خیال آدمی کے قابل نہیں ہوں مجھے تو کسی دہقان کے گھر پڑنا تھا۔ بابو جی مجھے ذلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ میرے لیے یہی ہزار غنیمت تھی۔

ایک دن شام کے وقت میں رامائن پڑھ رہی تھی۔ بھرت رام چندر جی کی تلاش میں نکلے تھے۔ ان کی درد اور حسرت میں بھری ہوئی باتیں میرے دل میں چٹکیاں لے رہی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ دل پاکیزہ جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ کہ بابو جی کمرے میں آئے۔ میں نے فوراً کتاب بند کردی۔ ان کے سامنے اپنی دہقانیت کو حتی الامکان چھپاتی لیکن انھوں نے کتاب دیکھ لی۔ پوچھا۔ "رامائن ہے نا؟"

میں نے خطاوار نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "ہاں ذرا دیکھ رہی تھی۔"

بابو جی۔ "کتاب بے شک بہت اچھی ہے اور جذبات کے پہلو خوب دکھائے گئے ہیں۔ لیکن انسانی فطرت پر وہ غائر نگاہ نہیں ڈالی گئی۔ جو انگریزی یا فرانسیسی مصنفوں کی خصوصیت ہے۔ تمھاری سمجھ میں تو نہ آئے گا۔ لیکن یورپ میں آج کل رئیل اِزم (REALISM) کا دورہ ہے۔ وہ انسانی جذبات کی ابتدا ونشوونما ایسی تحقیق سے بیان کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ اس امر میں اخلاق یا مذہب کے قیود کے پابند نہیں ہوتے۔ لیکن ہمارے یہاں شاعر کو قدم قدم پر اخلاق اور مذہب پر نگاہ رکھنا پڑتی ہے، اس لیے اکثر اس کے جذبات غیر فطری ہوجاتے ہیں۔ یہی نقص تلسی داس میں بھی ہے۔"

میری سمجھ میں اس وقت کچھ بھی نہ آیا۔ بولی۔ "میرے لیے تو یہی بہت ہے۔ انگریزی کتابیں کیسے سمجھوں؟"

بابو جی۔ کچھ مشکل نہیں ہے۔ تم ایک گھنٹہ روز بھی صرف کرو تو کافی استعداد ہوسکتی ہے۔ لیکن تم نے تو گویا میری باتیں نہ ماننے کی قسم کھالی ہے۔ تم کو کتنا سمجھایا کہ مجھ سے شرمانے کی ضرورت نہیں۔ تم نے کان نہ دیا۔ کتنا کہتا ہوں کہ ذرا صاف ستھری رہا کرو۔ پرماتما حسن دیتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کی ساخت و پرداخت بھی ہوتی رہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے، تمھاری نگاہ میں اس کی قدر نہیں ہے۔ یا شاید تم سمجھتی ہو کہ میرے جیسے کم رو آدمی کے لیے تم جیسے بھی رہو، ضرورت سے زیادہ اچھی ہو۔ یہ گویا مجھ پر ظلم ہے۔ تم مجھے جبراً ویراگ سکھانا چاہتی ہو۔ جب میں شب و روز محنت کرکے

روپے پیدا کرتا ہوں تو فطرتاً میری خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بہترین صرف ہو اس سے بہترین حظ اٹھایا جائے۔ لیکن تمھارا دقیانوسی پن میری محنت پر پانی پھیر دیتا ہے۔ عورت محض کھانا پکانے، بچے جننے، شوہر کی خدمت کرنے اور ایکادشی کے برت رکھنے کے لیے نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد اس سے بہت اعلیٰ ہے۔ وہ انسان کی تمام مجلسی، ذہنی ترقیوں میں برابر کا حصہ لینے کی مستحق ہے۔ وہ انسانی آزادی کی مساوی حق دار ہے۔ مجھے تمھاری یہ قیدیوں کی سی حالت دیکھ کر نہایت ملال ہوتا ہے۔ بیوی انسان کا نصف بہتر مانی گئی ہے۔ لیکن تم میری ذہنی، مجلسی، جذباتی غرض ایک ضرورت بھی نہیں پوری کر سکتیں۔ میرا اور تمھارا مذہب جدا، طور و طریق جدا، مشاغل جدا، خیالات جدا۔ زندگی کے کسی شعبے میں مجھے تم سے ہمدردی اور مدد نہیں مل سکتی۔ تم خود سوچ سکتی ہو کہ ان حالات میں میری زندگی کتنی بے لطفی سے کٹ رہی ہے۔"

بابو جی کا کہنا حرف بحرف صحیح تھا۔ میں ان کے گلے میں ایک زنجیر کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس دن سے میں نے ان کے اشاروں پر چلنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اپنے دیوتا کو کیوں کر ناراض کرتی؟

(۲)

یہ کیسے کہوں کہ مجھے بناؤ سنگار سے نفرت تھی۔ نہیں، اس کا مجھے بھی اتنا ہی شوق تھا جتنا ہر ایک عورت کو ہوتا ہے۔ جب مرد اور بچے بھی نمائش پر جان دیتے ہیں تو میں تو عورت ہی ہوں۔ اب تک جو میں اس سے محترز رہتی تھی وہ اپنے اوپر بہت جبر کرکے۔ میری اماں اور دادی نے ہمیشہ مجھ سے یہی کہا کہ بناؤ سنگار کی عادت اچھی نہیں۔ وہ مجھے کبھی آئینے کے سامنے کھڑے دیکھ پاتیں تو لعن طعن کرنے لگتیں۔ لیکن اب بابو جی کے اصرار نے میری وہ جھجک دور کردی۔ اماں جان اور نندیں میرے بناؤ چناؤ پر ناک بھوں سکوڑتیں۔ لیکن مجھے ان کی پروا نہ تھی۔ بابو جی کی ان مخمور نشہ محبت سے لبریز نگاہوں کے لیے میں جھڑکیاں برداشت کر سکتی تھی۔ وہ میرے لیے خوش وضع ساڑیاں، خوش نما جاکٹیں، سجیلے گاؤن، چمکتے ہوئے جوتے، کامدار سلیپریں لایا کرتے۔ لیکن میں ان چیزوں کو پہن کر کسی کے سامنے نہ نکلتی۔ یہ لباس صرف بابو جی کے لیے مخصوص تھے۔ وہ مجھے یوں بنی ٹھنی دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے دیکھ کر اب ان

کو زیادہ خوشی حاصل ہوتی تھی۔ بیوی اپنے شوہر کو خوش رکھنے کے لیے کیا نہیں کر سکتی؟ گھر کے دھندے میں اب مجھے مطلق دل چسپی نہ تھی۔ میرا وقت یا تو اپنے بناؤسنگار میں صرف ہوتا تھا یا پڑھنے لکھنے میں۔ کتابوں سے مجھے ایک عشق سا ہونے لگا تھا۔

اگرچہ ابھی تک میں اپنے سسر کا ادب کرتی تھی۔ ان کے سامنے گاؤن اور بوٹ پہن کر نکلنے کا مجھے کبھی حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب مجھے ان کا تحکمانہ انداز اور برتاؤ ناگوار معلوم ہوتا۔ میں سوچتی جب میرا شوہر سیکڑوں روپے ماہوار کماتا ہے تو میں گھر میں لونڈی بن کر کیوں رہوں؟ یوں میں اپنی مرضی سے جو کچھ چاہے کروں، لیکن وہ مجھے حکم دینے والے کون ہوتے ہیں؟ مجھے اپنی شخصیت کا احساس ہونے لگا۔ اماں کوئی کام کرنے کو کہتیں تو میں اسے ادبدا کے ٹال جاتی۔ ایک روز انھوں نے کہا۔ صبح کے ناشتے کے لیے تھوڑی دال موٹ بنا لو۔" میں سن کر اَن سنی کر گئی۔ اماں نے تھوڑی دیر تک میری راہ دیکھی۔ لیکن جب میں اپنے کمرے سے نہ نکلی تو انھیں غصہ آگیا۔ وہ بہت زود رنج تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتی تھیں۔ اپنے رتبے اور خودداری کا انھیں اتنا غرور تھا کہ مجھے بالکل لونڈی سمجھتی تھیں۔ حالانکہ اپنی لڑکیوں کے ساتھ وہ ہمیشہ نرمی سے پیش آتیں بلکہ میں تو کہوں گی، انھیں سر چڑھا رکھا تھا۔ وہ غصے میں بھری ہوئی میرے دروازے پر آئیں۔ اور بولیں۔ "تم سے میں نے دال موٹ بنانے کے لیے کہا تھا۔ بنایا؟" میں نے کسی قدر ترش ہو کر کہا۔ "ابھی فرصت نہیں ملی۔"

اماں۔ تو تمھارے نزدیک دن بھر پڑے رہنا ہی بڑا کام ہے۔ یہ آج کل تمھیں کیا ہوگیا ہے؟ کس گھمنڈ میں ہو؟ کیا یہ سوچتی ہو کہ میرا شوہر کماتا ہے تو میں کام کیوں کروں؟ تو اس گھمنڈ میں نہ آنا۔ تمھار شوہر لاکھ کمائے، لیکن گھر میں میرا ہی راج رہے گا۔ آج وہ چار پیسے کمانے لگا ہے تو تمھیں مالکن بننے کا دعویٰ ہو رہا ہے۔ لیکن اسے پالنے پوسنے تم نہیں آئی تھیں۔ میں نے ہی اسے پڑھا لکھا کے اس لائق بنایا ہے۔ وا! کل کی چھوکری اور ابھی سے یہ مزاج؟"

میں رونے لگی۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ بابو جی اس وقت اوپر کمرے میں بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ یہ سب باتیں انھوں نے بھی سنیں۔ انھیں نہایت صدمہ ہوا۔ رات کو جب وہ گھر میں آئے تو بولے۔ "دیکھا تم نے آج اماں کا غصہ؟ یہی سختیاں

اور زیادتیاں ہیں، جن سے عورتوں کی زندگی تلخ ہوجاتی ہے۔ ایسی باتوں سے کتنی روحانی کلفت ہوتی ہے، اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ زندگی وبال ہوجاتی ہے۔ کلیجہ چھلنی ہوجاتا ہے۔ اور انسان کا ذہنی نشو و نما اسی طرح رک جاتا ہے جیسے ہوا اور دھوپ کے نہ ملنے سے پودے افسردہ ہوجاتے ہیں۔ یہ ہماری معاشرت کا نہایت تاریک پہلو ہے اور اس نے ہماری قومی نکبت میں خاص حصہ لیا ہے۔ اب میں تو ان کا لڑکا ٹھہرا۔ ان کے سامنے زبان نہیں کھول سکتا۔ ان کے حقوق مجھ پر اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی شان میں ایک سخت کلمہ بھی میری زبان سے نہیں نکل سکتا۔ اور یہی قیود تمھارے اوپر عاید ہیں۔ اگر تم نے ان کی باتیں خموشی سے نہ سن لی ہوتیں تو مجھے بے حد ملال ہوتا۔ میں شاید زہر کھالیتا۔ ایسی حالت میں دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو ہمیشہ ان کی گھڑکیاں جھڑکیاں سہے جاؤ۔ یا اپنے لیے کوئی دوسرا راستہ نکالو۔ اب اس عمر میں اماں سے یہ امید کرنا کہ وہ اپنا وطیرہ چھوڑ دیں گی محال کو ممکن سمجھنا ہے۔ بولو۔ کیا منظور ہے؟"

میں نے خائف ہوکر کہا۔ "آپ جو کہیے، وہ کروں۔ آئندہ سے نہ پڑھوں لکھوں گی، جو کچھ وہ کہیں گی وہی کروں گی۔ اگر وہ اسی میں راضی ہیں تو یہی سہی۔ مجھے پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے؟"

بابو جی۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا۔ اماں نے آج شروعات کی ہے۔ اب وہ روزبروز اور بھی سخت ہوتی جائیں گی۔ میں تمھاری تہذیب و تربیت کی جتنی بھی کوشش کروں گا، اتنا ہی انھیں ناگوار ہوگا۔ اور وہ تمھیں پر اپنا غصہ نکالیں گی۔ انھیں یہ خیال کہاں کہ جس آب و ہوا میں انھوں نے پرورش پائی تھی، اب وہ نہیں رہی۔ ترقی اور آزادی اور اصلاح کے خیالات ان کے نزدیک کفر سے کم نہیں۔ میں نے ایک حکمت سوچی ہے۔ چل کر کسی دوسرے شہر میں اپنا ڈیرا جماؤں۔ میری پریکٹس بھی یہاں نہیں چلتی۔ دوسری جگہ جانے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے اس تجویز کی زیادہ مخالفت نہیں کی۔ گو اکیلے رہنے کا خیال کرکے کچھ طبیعت سہمتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آزادیوں کے خیال سے دل میں ایک ولولۂ مسرت پیدا ہوتا تھا۔

(۳)

اسی دن سے اماں نے مجھ سے بولنا چالنا ترک کردیا۔ وہ مہریوں سے، میری نندوں سے، پڑوسنوں سے میرا مضحکہ اڑایا کرتیں۔ یہ مجھے حد درجہ شاق گزرتا تھا۔ وہ اس کے بدلے مجھے سخت سست کہہ لیتیں، تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ ان کی عزت میرے دل سے کم ہونے لگی۔ کسی کی تضحیک کرنا۔ اس کی نگاہ میں اپنا وقار کھو دینے کا نہایت آسان نسخہ ہے۔ میرے اوپر سب سے سنگین الزام یہ لگایا جاتا تھا کہ میں نے بابو جی پر کوئی موہنی منتر ڈال دیا ہے۔ وہ میرے اشاروں پر چلتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی۔

ساون کے دن تھے۔ جنم اشٹمی کا تہوار آیا، گھر میں سب نے برت رکھا۔ میں نے حسبِ عادت برت رکھا۔ ٹھاکر جی کا جنم رات کے بارہ بجے ہونے والا تھا۔ ہم سب بیٹھی گاتی بجاتی رہیں۔ بابو جی کو یہ بیہودہ رسمیں ذرا بھی نہ بھاتی تھیں۔ وہ ہولی کے دن رنگ نہ کھیلتے۔ گانے بجانے کا تو ذکر ہی کیا۔ جب رات کو ایک بجے میں ان کے کمرے میں گئی تو سمجھانے لگے۔ ”یوں جسم کو ایذا پہنچانے سے کیا فائدہ؟ کرشن ضرور قابلِ تعظیم بزرگ تھے اور ان کی عزت کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس برت اور گانے بجانے سے کیا حاصل؟ اس نمائش کا نام مذہب نہیں۔ مذہب کا تعلق ایمان سے ہے نہ کہ نمود سے۔ بابو جی خود اسی پر عمل کرتے تھے۔ وہ بھگوت گیتا کی بہت تعظیم کرتے لیکن اسے کبھی پڑھتے نہ تھے۔ اپنشدوں کی تعریف میں ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے لیکن میں نے انھیں اپنشد کھولتے نہیں دیکھا۔ وہ ہندو مذہب کے فلسفیانہ خیالات پر شیدا تھے۔ لیکن انھیں موجودہ زمانے کے لیے ناموزوں سمجھتے تھے۔ بالخصوص وہ ویدانت کو ہندوستان کی تباہی کا خاص سبب خیال کرتے تھے۔ کہتے، اسی ویدانت نے ہم کو چوپٹ کردیا۔ ہم دنیا کی نعمتوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ اور اس کا خمیازہ اب تک اٹھا رہے ہیں۔ یہ مقابلہ اور سرگرمی کا دور ہے۔ ترک اور توکل کا اس زمانے میں نباہ نہیں ہوسکتا۔ قناعت نے ہندوستان کو فقیر بنا دیا۔“ اس وقت مجھے ان کا جواب دینے کی لیاقت کہاں تھی۔ ہاں اب سوچتی ہوں کہ وہ نئی تہذیب کے طلسم میں پھنسے ہوئے تھے۔ اب وہ خود ایسی باتیں نہیں کرتے۔ مدہوشی کا اثر کچھ زائل ہوچکا ہے۔

(۴)

اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہم الہ آباد چلے آئے۔ بابو جی نے پہلے ہی سے ایک دو منزلہ مکان لے رکھا تھا۔ تمام کمرے فرش سے آراستہ تھے۔ مختلف قسم کی کرسیاں اور میزیں اور آرائشی سامان جابجا سجے ہوئے تھے۔ یہاں ہمارے پانچ نوکر تھے۔ دو عورتیں، دو مرد اور ایک مہراج۔ اب میں گھر کے کام کاج سے بالکل آزاد ہوگئی۔ بیکاری سے جی گھبراتا تو کوئی نہ کوئی ناول پڑھنے لگتی۔

یہاں پھول اور پتیل کے برتن بہت کم تھے۔ چینی کی رکابیاں اور پیالے الماریوں میں سجے ہوئے تھے۔ کھانا میز پر آتا تھا۔ بابو جی بڑے شوق سے کھاتے۔ رفتہ رفتہ میں بھی میز پر کھانے کی عادی ہوگئی۔ حالانکہ پہلے مجھے بہت شرم آتی تھی۔ ہمارے پاس ایک خوبصورت ٹینڈم بھی تھی۔ اب ہم پیدل بالکل نہ چلتے۔ کسی سے ملنے کے لیے دس قدم بھی جانا ہوتا تو گاڑی تیار کرائی جاتی۔ بابو جی کہتے۔ ''یہی فیشن ہے''

بابو جی کی آمدنی ابھی بہت کم تھی۔ خرچ کا بار نہ سنبھلتا تھا۔ میں انھیں اکثر متفکر دیکھتی۔ اور سمجھاتی۔ کہ ''جب آمدنی کافی نہیں ہوتی ہے تو لازمہ اتنا کیوں بڑھا رکھا ہے؟ کوئی چھوٹا سا مکان لے لو۔ دو نوکروں سے بھی کام چل سکتا ہے۔'' لیکن بابو جی میری باتوں پر ہنس دیتے۔ وہ کہتے ہم اپنے افلاس کا اعلان کیوں کریں۔ صورتِ افلاس افلاس سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ بھول جاؤ کہ ہم غریب ہیں۔ اور دولت ہمارے پاس خود آئے گی۔ خرچ کا زیادہ ہونا ضرورتوں کا بڑھنا۔ یہی حصولِ دولت کا پہلا زینہ ہے۔ اس سے ہماری پوشیدہ قوتیں ظاہر ہوتی ہیں اور ہم میدانِ ہمت میں قدم بڑھانے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ قناعت افلاس کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے ہمارے مصارف روز بروز بڑھتے جاتے تھے۔ ہم ہفتے میں کم سے کم تین دن ضرور تھیٹر دیکھنے جاتے۔ ہفتے میں کم سے کم ایک دن ضرور ہی دوستوں کی دعوت ہوتی۔ اب مجھے معلوم ہوا۔ کہ زندگی کا مقصد زندگی سے لطف اٹھانا ہے۔ ایشور ہماری بندگی اور عبادت سے بے نیاز ہے۔ اس نے ہم کو نعمتیں دی ہیں کہ ان سے حظ اٹھائیں۔ یہی اس کی بہترین عبادت ہے۔ مجھے ایک عیسائی لیڈی انگریزی پڑھانے اور گانا سکھانے آنے لگی۔ گھر میں ایک پیانو بھی آگیا۔ ان دل چسپیوں میں پڑ کر میں رامائن بھگت مال کو بھول گئی وہ کتابیں مجھے دقیانوسی معلوم ہوتیں۔ دیوتاؤں

پر سے بھی میرا اعتقاد اٹھ گیا۔

رفتہ رفتہ یہاں لوگوں سے تعلقات پیدا ہونے لگے۔ یہ ایک بالکل نئی سوسائٹی تھی۔ اس کا طرزِ گفتگو، طرزِ معاشرت، طرزِ خیال میرے لیے بالکل انوکھا تھا۔ اس سوسائٹی میں میں ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے موروں میں کوا۔ ان لیڈیوں کی بات کبھی تھیٹر پر ہوتی، کبھی گھوڑ دوڑ، کبھی ٹینس پر، کبھی انگریزی مصنفین کے کلام پر، کبھی اخباروں کے مضامین پر، ان کی پھرتی و چستی، ذکاوت و فراست پر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ علم و روشنی کی پتلیاں ہیں۔ وہ بے نقاب باہر نکلتیں۔ مجھے بھی بار بار اپنے ساتھ کھینچ لے چلنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن میری غیرت اور حیا کبھی مجھے ان کے ساتھ نہ جانے دیتی۔ میں ان لیڈیوں کو کبھی اداس یا متفکر نہ دیکھتی۔ مسٹر داس نہایت سخت بیمار تھے۔ لیکن مسز داس کی پیشانی پر ذرا بھی میل نہ تھا۔ مسٹر باگڑا نینی تال میں تپ دق کا علاج کراتے تھے۔ لیکن مسز باگڑا روزانہ ٹینس کھیلنے جاتی تھیں۔ ایسی حالت میں میری کیا حالت ہوتی؟ اسے میں ہی جانتی ہوں۔

ان لیڈیوں کے حرکات وسکنات میں ایک جادو تھا۔ جو مجھے بے اختیار ان کی طرف کھینچتا تھا۔ میں انھیں ہمیشہ تفریح و مشاغل پر آمادہ دیکھتی اور میرا بھی جی چاہتا تھا کہ انھیں کی طرح بے باک ہوتی۔ ان کی انگریزی باتیں سن کر مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیویاں ہیں۔ میں اپنی ان خامیوں کے پورا کرنے میں بہ دل و جان کوشاں تھی۔

کچھ دنوں کے بعد مجھے ایک ناگوار تجربہ ہونے لگا۔ بابو جی اب اگرچہ بظاہر پہلے سے بھی زیادہ میری خاطر کرتے۔ مجھے ہمیشہ ''ڈیری'' یا ''ڈالنگ'' کہہ کر پکارتے۔ لیکن مجھے ان کی باتوں میں ایک قسم کا تصنع نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا، یہ باتیں ان کے دل سے نہیں، زبان سے نکل رہی ہیں۔ ان کی محبت میں سچائی کی بہ نسبت نمود کا حصہ زیادہ ہوتا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ اب مجھے بھی بابو جی پر وہ کامل عقیدت نہ رہی تھی۔ اب ان کے ذرا سر دُکھنے پر میرا دل نہ دُکھتا تھا۔ میری شخصیت کا نشوونما ہونے لگا۔ اب میں بناؤسنگار اس لیے کرتی تھی کہ یہ میرا دنیاوی فرض ہے۔ اس لیے نہیں کہ میں کسی فردِ واحد کی پابند ہوں۔ مجھ میں اپنے نشہ حسن سے مخمور ہونے کا مادہ پیدا ہونے لگا تھا۔ جو نمودِ حُسن کی پہلی منزل ہے۔ منشائے زندگی کی جو تعلیم بچپن

سے دی گئی تھی۔ وہ اب دل سے محو ہونے لگی تھی۔ میں اب کسی دوسرے کے لیے نہ جیتی تھی۔ اپنے لیے جیتی تھی۔ بے نفسی اور قربانی کی اسپرٹ مجھ میں سے مفقود ہو چلی تھی۔

میں اگرچہ اب بھی پردہ کرتی تھی۔ لیکن دادِ حُسن کی ایک نہایت بے تاب کن خواہش مجھے بے چین کیا کرتی تھی۔ ایک روز مسٹر داس اور کئی احباب بابو جی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے اور ان کے درمیان صرف ایک پردہ حائل تھا۔ بابو جی میری اس جھجک سے بہت نادم ہوتے تھے۔ اسے وہ اپنی شانِ تہذیب میں ایک داغ سمجھتے تھے۔ شاید وہ دکھانا چاہتے تھے کہ میری بیوی اس لیے پردے میں نہیں ہے کہ وہ حسن یا لباس میں کسی سے کم ہے۔ بلکہ محض اس لیے کہ ابھی اسے شرم دامن گیر ہے۔ وہ کسی حیلے سے مجھے بار بار پردے کے پاس بلاتے۔ تاکہ ان کے دوست میری شکل اور لباس کو دیکھ سکیں۔ آخر کار شوقِ نمود کچھ دنوں کے بعد حیا پر غالب آیا۔ اور الہ آباد آنے کے پورے دو سال بعد میں بے نقاب سیر کرنے نکلی۔ سیر کے بعد ٹینس کی نوبت پہنچی اور آخر میں نے کلب میں جاکر دم لیا۔ پہلے یہ ٹینس اور کلب مجھے ایک تماشا سا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ لوگ ورزش کے لیے نہیں بلکہ فیشن کے لیے ٹینس کھیلتے تھے۔ وہ کبھی نہ بھولتے تھے کہ ہم ٹینس کھیل رہے ہیں۔ ان کے حرکات میں جھکنے میں، اچکنے میں، دوڑنے میں، ایک تصنع تھا۔ جو ظاہر کرتا تھا کہ اس کھیل سے ورزش نہیں محض نمود مقصود ہے۔

کلب میں اس سے بھی بدتر حال تھا۔ وہ نقالی تھا۔ خالص بے میل نقالی۔ لوگ انگریزی کے چنے ہوئے فقرے بولتے تھے۔ نقلی ہنسی ہنستے تھے جس کا کوئی محل نہ ہوتا تھا۔ عورتوں کی وہ پھوہڑ بے پردگی، مردوں کی وہ بھونڈی نسواں پرستی۔ مجھے ایک دل لگی سی معلوم ہوتی تھی۔ سارا منظر انگریزی معاشرت کا ایک مرقع تضحیک تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ میں بھی وہی رنگ پکڑنے لگی اور وہی پارٹ ادا کرنے لگی۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ شوقِ نمود میں کتنی زبردست قوت ہے۔ میں اب نت نئے سنگار کرتی، نت نئے روپ بھرتی، محض اس لیے کہ کلب میں میں ہی سب کی نگاہوں کا مرکز بن جاؤں۔ اب مجھے بابو جی کی آرام و آسائش اور ضرورت کے مقابلے میں اپنے سجاؤ، بناؤ کا زیادہ خیال رہتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ شوق ایک نشہ سا ہوگیا۔ اتنا ہی نہیں۔ دادِ حسن کے ملنے سے مجھے ایک غرور آمیز

مسرت حاصل ہونے لگی۔ میرے احساسِ غیرت میں بھی ایک عجیب وسعت اور لچک پیدا ہوگئی۔ وہ نگاہیں جو کبھی میرے جسم کا ایک ایک رویاں کھڑا کردیتیں۔ وہ کنائے اور بذلہ سنجیاں جو کبھی مجھے زہر کھالینے پر آمادہ کردیتیں۔ ان سے اب مجھے ایک شورش انگیز مسرت حاصل ہوتی تھی۔ لیکن جب کبھی کبھی میں اپنی حالت پر غور کرتی تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔ یہ ناؤ کس گھاٹ لگے گی۔ ارادہ کرتی کہ اب کلب نہ جاؤں گی مگر وقت آتے ہی اضطراری طور پر پھر تیار ہوجاتی تھی۔ ارادہ نیک بالکل کمزور ہو گیا تھا۔

بابو جی کے مزاج میں ایک اور تغیر نظر آنے لگا۔ وہ زیادہ تر خاموش اور متفکر رہنے لگے۔ مجھ سے کم بولتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یا تو انھیں کوئی سخت تردد لاحق ہے۔ یا خدا نخواستہ کوئی مرض ہوگیا ہے۔ ان کا چہرہ پژمردہ رہتا تھا۔ نوکروں سے ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوجاتے اور باہر بہت کم جاتے۔ ابھی ایک مہینے پہلے وہ سو کام چھوڑ کر کلب جاتے تھے۔ وہاں گئے بغیر انھیں کل نہ پڑتی تھی۔ لیکن اب زیادہ تر اپنے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹے ہوئے اخبار اور کتابیں دیکھا کرتے۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا معاملہ ہے۔

ایک دن انھیں شدت سے بخار آیا۔ وہ دن بھر بے ہوش پڑے رہے۔ لیکن مجھے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ایک وحشت ہوتی تھی۔ میری طبیعت ایک ناول میں لگی ہوئی تھی۔ ان کے پاس جاتی اور ایک منٹ کے بعد لوٹ آتی۔ ٹینس کا وقت آیا۔ تو میں پس و پیش میں پڑی۔ کہ جاؤں یا نہ جاؤں؟ بہت دیر تک دل میں یہی کشاکش ہوتی رہی۔ آخر میں نے فیصلہ کیا۔ میرے یہاں رہنے سے یہ اچھے تو ہوئے نہیں جاتے۔ اس لیے یہاں بیٹھے رہنا فضول ہے۔ میں نے اچھے سے اچھے کپڑے پہنے۔ اور ریکٹ لے کر کلب گھر جاپہنچی۔ وہاں میں نے مسز داس اور مسز باگڑا سے بابو جی کا حال بیان کیا اور آنکھوں میں آنسو بھرے خاموش بیٹھی رہی۔ جب سب لوگ کورٹ میں جانے لگے اور مسٹر داس نے مجھ سے چلنے کے لیے کہا۔ تو میں ایک آہِ سرد بھر کے کورٹ میں جاپہنچی اور کھیلنے میں مصروف ہوگئی۔

آج سے تین سال پہلے ایک دن اسی طرح بابو جی کو بخار آگیا تھا۔ میں ساری رات بیٹھی انھیں پنکھا جھلتی رہی۔ ایسا جی چاہتا تھا کہ ان کے بدلے کا مجھے بخار آجائے

لیکن یہ اٹھ بیٹھیں۔ مگر اب دل نمائش کا خوگر ہوگیا تھا۔ اکیلے رونے کی قابلیت مجھ میں باقی نہ رہی تھی۔ میں حسبِ معمول رات کو نو بجے لوٹی۔ بابو جی کی طبیعت ہلکی تھی۔ انھوں نے مجھے صرف دبی نگاہ سے دیکھا۔ کروٹ بدل لی۔ لیکن میں لیٹی تو میرا دل بہت دیر تک اس خود غرضی و خودپروری پر مجھے کوستا رہا۔

مجھے اب انگریزی ناولوں کے سمجھنے کی استعداد ہوگئی تھی۔ ہماری گفتگو زیادہ تنقید آمیز ہوتی تھی۔ ہمارا معیارِ تہذیب اب بدرجہا اونچا ہوگیا تھا۔ ہم کو اب اپنے طبقے سے باہر کسی سے ملنے میں عار ہوتا تھا۔ ہم اب اپنے سے کم رتبہ، کم حیثیت آدمیوں سے بولنا کسر شان سمجھتے تھے۔ نوکروں سے بات کرنے میں ہمارا لہجہ بہت تحکمانہ ہوتا تھا۔ ہم انھیں اپنا نوکر سمجھتے تھے اور بس۔ ہم کو ان کے ذاتی معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ہم ان سے الگ تھلگ رہ کر ان پر اپنا رعب قائم کرنا چاہتے تھے کہ وہ ہم لوگوں کو صاحب سمجھیں۔ ہندوستانی عورتوں کو دیکھ کر مجھے ان سے نفرت ہوتی تھی۔ وہ مجھے انسانیت سے گری ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ خیر بابو جی کی طبیعت دوسرے دن بھی نہ سنبھلی۔ میں کلب نہ گئی۔ لیکن جب متواتر تین دن انھیں بخار آتا گیا، اور مسز داس نے مجھ سے بار بار اصرار کیا کہ ایک نرس بلا لو۔ تو میں راضی ہوگئی۔ اس دن تیمارداری کے بار سے سبکدوش ہوکر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ اگرچہ دو دن میں کلب نہ گئی تھی۔ لیکن میرا دل وہیں رہتا تھا۔ بلکہ اپنی اس بزدلانہ نفس کشی پر غصہ آتا تھا۔

ایک دن سہ پہر کے وقت میں آرام کرسی پر لیٹی ہوئی ایک انگریزی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہیں بابو جی کا بخار مہلک ثابت ہوا ہوتو؟ لیکن اس خیال سے مجھے ذرا بھی دہشت نہ ہوئی۔ میں اس ملالِ تخیل کا مزہ اٹھانے لگی۔ مسز داس، مسز نائڈو، مسز سریواستویہ، مس کھرے، مسز شرغہ، مس گھوش ضرور تعزیت کرنے آئیں گی۔ انھیں دیکھتے ہی میں آنکھوں میں آنسو بھرے اٹھوں گی۔ اور کہوں گی۔ "بہنو! میں لٹ گئی! ہاں میں لٹ گئی۔ اب میری زندگی اندھیری رات ہے۔ یا ہولناک جنگل یا شمعِ مزار! لیکن میری حالت پرغم کا اظہار مت کرو۔ مجھ پر جو کچھ گزرے گی میں اس کامل انسان کی نجات کے خیال سے بخوشی سہہ لوں گی۔ میں نے ایک طوالانی ماتمی تقریر کا مسودہ دل میں تیار کیا۔ یہاں تک کہ میں نے اس ماتمی لباس کا بھی فیصلہ کرلیا۔ جو میں پہنے ہوئے جنازہ کے ساتھ

جاؤں گی۔ اس سانحے کا سارے شہر میں چرچا ہوجائے گا۔ سارے کنٹونمنٹ کے لوگ تعزیت کے خطوط بھیجیں گے۔ تب میں اخباروں میں ایک خط چھپوا دوں گی کہ فرداً فرداً اپنے ہمدردوں کے تعزیت ناموں کا جواب دینے سے معذور ہوں۔ دل پارہ پارہ ہوگیا ہے۔ اسے رونے کی سوا اور کسی کام کی فرصت نہیں ہے۔ میں اس ہمدردی کے لیے ان کی تہ دل سے مشکور ہوں اور ان سے التجا کرتی ہوں کہ وہ مرنے والے کے حق میں دعائے مغفرت کریں۔"

میں انہی خیالات میں محو تھی۔ کہ نرس نے آکر کہا آپ کو صاحب یاد کرتے ہیں۔ یہ میرے کلب جانے کا وقت تھا۔ مجھے ان کا بلانا ناگوار گزرا۔ لیکن طوعاً و کرہاً گئی۔ بابوصاحب کو بیمار ہوئے ایک ماہ کے قریب ہوگیا تھا۔ وہ بہت نحیف ہو رہے تھے۔ مجھے ان پر رحم آگیا۔ بیٹھ گئی۔ اور ہمدردانہ انداز سے بولی۔ "کیا کروں؟ کوئی دوسرا ڈاکٹر بلاؤں؟

بابو صاحب۔ نے آنکھیں نیچی کرکے نہایت مستمدانہ انداز سے کہا۔ "میں یہاں ہرگز اچھا نہ ہوں گا۔ مجھے اماں کے پاس پہنچا دو۔"

میں نے کہا۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہاں آپ کا علاج یہاں سے اچھا ہوگا؟"

بابو جی بولے۔ "کیا جانے کیوں میرا جی اماں کو دیکھنے کو چاہتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں وہاں بلا دوا کے اچھا ہوجاؤں گا۔"

میں۔ "یہ آپ کا محض خیال ہے۔"

بابو جی۔ "شاید خیال ہی ہو۔ لیکن میری عرض قبول کرو۔ میں اس بیماری سے نہیں اس زندگی سے بیزار ہوں۔ مجھے اب معلوم ہو رہا ہے کہ میں جس درخشاں لہراتے ہوئے تختۂ آب کی طرف دوڑا جاتا تھا، وہ اصل میں سراب ہے۔ وہ جھلسی ہوئی ریگ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میں اس معاشرت کے ظاہری لوازمات پر شیدا تھا۔ لیکن اب مجھے اس کی اصلی صورت نظر آرہی ہے۔ ان دو سالوں میں میں نے اس باغیچے کی خوب سیر کی اور اسے اول سے آخر تک خار زار پایا۔ یہاں نہ اطمینانِ قلب ہے نہ روحانی مسرت۔ یہ ایک ہیجان ہلچل، ذلت، غلامی، بے رحمی، خودغرضی، ریاکاری، نقالی، خودستائی اور تن پروری کی زندگی ہے۔ یہاں نہ اخلاق ہے نہ مذہب، نہ ہمدردی، نہ شرافت۔ پرماتما کے لیے مجھے اس آگ سے بچاؤ۔ اگر اور کچھ نہ ہوسکے تو اماں کے پاس ایک خط لکھ دو۔ وہ ضرور آئیں گی۔

اپنے بدنصیب لڑکے کی مصیبت ان سے نہ دیکھی جائے گی۔ انھیں ابھی اس معاشرت کی ہوا نہیں لگی ہے۔ وہ مادرانہ شفقت سے بھری ہوئی نگاہ، ان کی محبت آمیز دل جوئی و تیمارداری میرے لیے سو دواؤں کا کام کرے گی۔ ان کے چہرے پر وہ نور نظر آئے گا جس کے لیے میری آنکھیں ترس رہی ہیں۔ ان کے دل میں محبت ہے۔ ایمان ہے۔ عقیدت ہے۔ ان کی آغوش میں میں مر بھی جاؤں گا تو میری روح کو تسکین ہوگی۔"

میں نے سمجھا۔ یہ بخار کا ہذیان ہے۔ نرس سے بولی۔ "ذرا ان کا ٹمپریچر تو لو۔ میں ابھی ڈاکٹر کے پاس جاتی ہوں، میرا دل ایک نامعلوم خوف سے کانپنے لگا۔ نرس نے تھرمامیٹر نکالا۔ لیکن جوں ہی وہ بابو جی کے قریب گئی۔ انھوں نے اس کے ہاتھ سے وہ آلہ چھین کر زمین پر پٹک دیا۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ اور میری طرف ملامت آمیز انداز سے دیکھ کر کہا۔ "صاف صاف کیوں نہیں کہتی ہو کہ میں کلب گھر جا رہی ہوں۔ جس کے لیے تم نے یہ لباس زیب تن کیا ہے اور گاڑی تیار کرائی ہے۔ لیکن اگر ادھر سے گھومتی ہوئی ڈاکٹر کے یہاں جاؤ تو کہہ دینا کہ یہاں حرارت اس نقطے پر ہے جہاں آگ لگ جاتی ہے۔"

میرا خوف اور بھی زیادہ ہوگیا اور دل پر ایک رقت سی طاری ہوگئی۔ گلا بھر آیا۔ بابو جی نے آنکھیں بند کرلی تھیں اور ان کی سانس زور سے چل رہی تھی۔ میں دروازے کی طرف چلی کہ کسی کو ڈاکٹر کے پاس بھیجوں۔ یہ لتاڑ سن کر خود کیسے جاتی۔ کہ بابو جی اٹھ بیٹھے اور منت آمیز انداز سے بولے۔ "شیاما! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ دو ہفتوں سے ارادہ کر رہا ہوں کہ کہوں۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی۔ پر آج میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ کہہ ہی ڈالوں۔ میں اب پھر اپنے گھر جاکر وہی پہلے کی سی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اب اس زندگی سے نفرت ہوگئی ہے اور یہی میری بیماری کا خاص سبب ہے۔ میرا عارضہ جسمانی نہیں روحانی ہے۔ میں پھر تمھیں وہی پہلے کی سی شرمیلی نیچا سر کرکے چلنے والی، پوجا کرنے والی، رامائن پڑھنے والی، گھر کے کام کاج کرنے والی، ایشور سے ڈرنے والی، حیادار عورت دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہ کروگی میں تمھیں سولھوں آنہ اپنا بنانا چاہتا ہوں۔ اور سولھوں آنہ تمھارا بننا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ اسی سادہ پاک اور بے تکلف زندگی میں میری نجات ہے۔ بولو منظور ہے؟ تم نے ہمیشہ میری باتیں

مانی ہیں۔ اس وقت مایوس نہ کرنا۔ اگر تمھیں میری جان پیاری ہے تو ضرور ماننا۔ ورنہ معلوم نہیں۔ اس کوفت اور کلفت کا کیا انجام ہو۔"

میں یکایک کوئی جواب نہ دے سکی۔ سوچنے لگی۔ اس آزادانہ زندگی میں کتنا لطف تھا۔ یہ دل چسپیاں وہاں کہاں؟ کیا اتنے دنوں آزادی سے ہوا میں اڑنے کے بعد پھر اسی قفس میں جاؤں؟ وہی لونڈی بن کر رہوں؟ کیوں؟ مجھے اس وقت بابو جی سے ہمدردی نہ ہوئی۔ ان پر طبیعت جھنجلائی۔ یہ تلونِ طبعی کیوں؟ انھیں نے مجھے برسوں آزادی کا سبق پڑھایا۔ برسوں تک دیوتاؤں کی، رامائن کی، گنگا کی، پوجا پاٹ کی، برت کی ہجو کی، ہنسی اڑائی اور اب جب کہ میں ان باتوں کو بھول گئی، انھیں وہم باطل سمجھنے لگی۔ تو پھر مجھے اس زندان خانے میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ کیوں؟ میں انھیں کی مرضی پر چلتی ہوں۔ اس دائرے میں دوسری عورتیں جو کچھ کرتی ہیں۔ وہی میں کرتی ہوں۔ پھر شکایت کا کیا موقع؟ لیکن بابو جی کے چہرے پر ایسی ترحم انگیز لجاجت تھی کہ میں علانیہ انکار نہ کر سکی۔ بولی۔ "آخر آپ کو یہاں کیا تکلیف ہے؟" میں ان کے دل کی بات جاننا ان کے خیالات کے مخزن کا پتہ لگانا چاہتی تھی۔

بابو جی پھر اٹھ بیٹھے اور میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ "بہتر ہوتا کہ تم یہ سوال مجھ سے پوچھنے کے بدلے اپنے دل سے پوچھتیں۔ کیا اب میں تمھارے لیے وہی ہوں جو آج سے تین سال قبل تھا؟ جب میں تم سے زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ سمجھ دار، زیادہ واقف کار ہو کر تمھارے لیے وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔ تم نے اسے چاہے محسوس نہ کیا ہو۔ لیکن میں خود سمجھ رہا ہوں۔ تو میں یہ کیونکر باور کروں کہ وہی اثرات تمھارے دل پر نہ غالب آئے ہوں گے۔ نہیں بلکہ علامات ظاہر کر رہی ہیں کہ تمھارے دل پر یہ اثر اور بھی زیادہ ہوا۔ تم نے اپنے تئیں نمائش، تکلف اور خود پرستی کے بھنور میں ڈال دیا اور اپنے انجام سے بالکل بے خبر ہو۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ مہذب آزادی کا بھوت عورت کے کمزور دل پر زیادہ آسانی سے غالب آ سکتا ہے۔ کیا ممکن تھا کہ تین سال قبل بھی تم مجھے اس حالت میں چھوڑ کر کسی پڑوسی کے گھر گانے بجانے چلی جاتیں؟ میں بستر پر پڑا کراہا کرتا اور تم کسی کے گھر جا کر خوش گپیاں کرتیں۔ عورت کی طبیعت انتہا پسند واقع ہوئی ہے۔ لیکن اس نئی انتہا کی بہ نسبت مجھے وہ پرانی انتہا بدرجہا بہتر نظر آتی ہے۔ اس انتہا کا

نتیجہ ہے روحانی و جسمانی نشو و نما اور قلب کی صفائی اس انتہا کا نتیجہ ہے چھچھوراپن، بے شرمی، بے حیائی، اور خود روی۔ اس وقت اگر تم مسٹرداس کے روبرو یوں بیباکی سے ہنستیں۔ تو میں یا تو تمھیں مار ڈالتا۔ یا خود زہر کھا لیتا۔ لیکن بے غیرتی اس زندگی کا خاص عنصر ہے۔ میں سب کچھ دیکھتا ہوں اور برداشت کرتا ہوں اور غالباً سہہ جاتا اگر اس بیماری نے میری آنکھیں نہ کھول دی ہوتیں۔ اب اگرتم یہاں بیٹھی رہو۔ تو مجھے تسکین نہ ہوگی۔ کیونکہ مجھے یہ خیال ستاتا رہے گا کہ تمھارا دل یہاں نہیں ہے۔ میں نے اپنے تئیں اس طلسم سے نکالنے کا فیصلہ کرلیا ہے، جہاں دولت کا نام عزت ہے، تکلف کا نام تہذیب ہے اور نخوت کا نام شرافت! بولو منظور ہے؟"

میرے دل پر ایک بجلی سی کوند گئی۔ بابو جی کا منشا ذہن میں آگیا۔ ابھی دل میں کچھ پرانی غیرت باقی تھی۔ بے شرمی کا الزام قوتِ تحمل سے باہر تھا۔ حیا کا احساس زندہ ہوگیا۔ نگاہ باطن کی طرف گئی۔ اس پر پردہ تھا۔ مگر خفیف۔ دل نے کہا۔ بے شک! میں اب وہ نہیں ہوں۔ جو پہلے تھی۔ اس وقت یہ میری نگاہوں میں دیوتا تھے۔ میں ان کی مرضی کو مقدم سمجھتی تھی۔ اب یہ میری نگاہوں میں ایک بہت معمولی درجے کے انسان ہیں۔" مسٹر کراس کی تصویر نگاہ کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ آہ! کل اس ظالم کی باتوں سے میرے دل پر کیسا نشہ چھا گیا تھا۔ یہ یاد کرکے میری آنکھیں ندامت سے جھک گئیں۔ بابوجی کے دل پر جو کچھ گزر رہی تھی، ان کے چہرے سے صاف عیاں تھا۔ تمام خود غرضانہ خیالات میرے دل سے محو ہوگئے۔ اور وہاں یہ الفاظ جلی حروف میں لکھے ہوئے نظر آئے۔ "تو نے فیشن اور لباس میں ضرور ترقی کی ہے۔ تجھ میں اپنے حقوق کا احساس زیادہ ہوگیا ہے۔ تجھ میں زندگی کی مسرتوں سے حظ اٹھانے کی قابلیت زیادہ ہوگئی ہے۔ تو اب زیادہ دلیر، زیادہ مستقل مزاج۔ زیادہ باعلم ہوگئی ہے۔ لیکن تیری روحانی ہستی کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ کیونکہ تو اپنے فرائض بھول گئی ہے۔"

میں نے دونوں ہاتھ جوڑے اور بابو جی کے پیروں پر گرپڑی۔ میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ آنسو کی جھڑی لگ گئی۔

(۵)

اب میں پھر اپنے گھر پر آگئی ہوں۔ اماں جان اب میری زیادہ عزت اور خاطر کرتی

ہیں۔ بابو جی اب بہت زیادہ مطمئن نظر آتے ہیں۔ وہ اب خود بھی روزانہ سندھیا کرتے ہیں۔

مسز داس کی چٹھیاں کبھی کبھی آتی ہیں۔ ان میں الہ آبادی سوسائٹی کے متعلق اتہام آمیز افواہیں اڑ رہی ہیں۔ میں ان خطوط کا جواب تو دے دیتی ہوں۔ پر چاہتی ہوں کہ وہ نہ آتے تو اچھا ہوتا۔ وہ ان دنوں کی یاد تازہ کردیتے ہیں۔ جنھیں میں بھول جانا چاہتی ہوں۔

کل بابو جی نے بہت سی پرانی ردی جلائی۔ ان میں امیلی زولا اور آسکووائلڈ کی کئی کتابیں تھیں۔ وہ اب انگریزی کتابیں کم پڑھتے ہیں۔ کارلائل، رسکن اور ایمرسن کے سوا میں انھیں کوئی دوسری کتاب نہیں پڑھتے دیکھتی۔ اور مجھے تو اپنی رامائن اور مہابھارت میں پھر وہی لطف آنے لگا ہے۔

پہلی بار تہذیب نسواں (لاہور) میں مئی 1918 میں پھر پریم بتیسی میں شائع ہوا۔ ہندی میں 'شانتی' کے عنوان سے مان سروور 7 میں شامل ہے۔

راہِ خدمت

تارا نے بارہ سال تک دُرگا تپسیا کی نہ پلنگ پر سوئی نہ سر میں تیل ڈالا، نہ آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ زمین پر سوتی تھی۔، گیروے کپڑے پہنتی تھی اور روکھی روٹیاں کھاتی تھی۔ اس کا چہرہ مرُجھائی ہوئی کلی تھی، آنکھیں بجھا ہوا چراغ، اور دل ایک بیہڑ میدان، سبزہ اور نزہت سے خالی۔ اسے صرف ایک آرزو تھی کہ درگا کے درشن پاؤں۔ جسم شمع کی طرح گھلتا جاتا تھا۔ لیکن یہ آرزو دل سے نہ نکلتی تھی۔ یہی اس کی روح تھی، یہی اس کا مدارِ حیات۔ گھر کے لوگ سمجھتے اسے جنون ہے۔ ماں سمجھاتی بیٹی تجھے کیا ہوگیا ہے؟ کیا ساری زندگی یوں ہی رو رو کر کاٹے گی؟ اس زمانے کے دیوتا پتھر کے ہوتے ہیں۔ پتھر کو بھی کبھی کسی نے پگھلتے دیکھا ہے۔ دیکھ تیری سہیلیاں پھول کی طرح کھل رہی ہیں، ندی کی طرح بڑھ رہی ہیں۔ کیا تجھے مجھ پر بھی رحم نہیں آتا؟" تارا کہتی، اماں اب تو جو لگن لگی وہ لگی۔ یا تو دیوی کے درشن پاؤں گی، یا یہی آرزو لیے دنیا سے رخصت ہوجاؤں گی۔ تم سمجھ لو میں مرگئی۔

اس طرح پورے بارہ سال گزر گئے اورتب دیوی خوش ہوئیں۔ رات کا وقت تھا چاروں طرف خموشی چھائی ہوئی تھی۔ مندر میں ایک دھندھلا سا گھی کا چراغ جل رہا تھا۔ تارا دُرگا کے پیروں پر سر رکھے التجائے صادق میں غرق تھی۔ کہ یکایک اسے دیوی کے تنِ جامد میں ایک جنبش محسوس ہوئی۔ تارا کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ دھندھلا چراغ گنبدِ نور ہوگیا، مندرمیں ایک روح افزا خوشبو پھیل گی۔ ہوا میں ایک جاں بخش تازگی محسوس ہوئی۔ دیوی کا سفید چہرہ ماہِ کامل کی طرح چمکنے لگا۔ بے نور آنکھیں جگمگانے لگیں، ہونٹ کھل گئے۔ آواز آئی۔ "تارا میں تجھ سے خوش ہوں، مانگ کیا مانگتی ہے۔"

تارا کھڑی ہوگئی۔ اس کا جسم اس طرح کانپ رہا تھا جیسے صبح کے وقت کی اذان کی صدا دور سے کانپتی ہوئی آتی ہے۔ اسے معلوم ہو رہا تھا میں ہوا میں ہوں۔ اسے اپنے دل

میں ایک پرواز، ایک تموجِ نور، کا احساس ہورہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”دیوی، تم نے میری بارہ سال کی تپسیا پوری کی، کس منہ سے تمھارا جس گاؤں! مجھے دنیا کی وہ برکات عطا ہوئی جو ہماری خواہشات کی انتہا اور ہماری تمناؤں کا معراج ہیں۔ میں وہ دولت چاہتی ہوں جو ہوس کو بھی سیر کر دے۔“

دیوی نے مسکرا کر کہا۔ ”منظور ہے۔“

تارا۔ ”وہ ثروت جو قضا کو بھی شرمندہ کردے۔“

دیوی نے مسکرا کر کہا ”منظور ہے۔“

تارا۔ ”وہ حسن جس کا کوئی ثانی نہ ہو۔“

دیوی نے مسکرا کر کہا ”منظور ہے۔“

تارا کنور نے باقی رات آنکھوں میں کاٹی۔ صبح کے وقت ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں جھپک گئیں جاگی تو دیکھا کہ سر سے پاؤں تک ہیرے و جواہرات سے لدی ہوئی ہے اس کا مکان ایک عالی شان سر بفلک مینار تھا۔ بالکل سنگ مرمر کا بنا ہوا۔ بیش قیمت سنگریزوں سے بھرا ہوا، دروازے پر نوبت بج رہی تھی۔ اس کی شمع نواز صدائیں ہوا میں گونج رہی تھیں اور دروازے پر میلوں تک سبزہ زار تھا۔ سرو اور مولسری کی قطاریں، چمن وخیابان اور روش کی گلکاریاں بہت ہی خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ کنیزیں سونے میں لدی ہوئی زرق برق کپڑے پہنے چاروں طرف دوڑتی پھرتی تھیں۔ تارا کو دیکھتے ہی وہ سونے کے لوٹے اور کٹورے لے کر دوڑیں۔ تارا نے دیکھا کہ میرا پلنگ ہاتھی دانت کا ہے۔ زمین پر نہایت نرم غالیچے بچھے ہوئے ہیں۔ اس کے سرہانے کی طرف ایک قدِآدم شیشہ تھا۔ تارا نے اس میں اپنی صورت دیکھی تو دنگ رہ گئی۔ اس کا حسن چاند کو بھی شرماتا تھا۔ دیواروں پر صدہا تصویریں آویزاں تھیں۔ جادو طراز مصوروں کی بنائی ہوئی۔ لیکن حسن کی دلآویزی میں ایک بھی تارا کو نہ پہنچتی تھی۔ تارا کو غرورِ حسن کا احساس ہوا۔ وہ کئی کنیزوں کے ساتھ باغیچے میں گئی۔ وہاں کا سماں دیکھ کر اس کی روح پر سرور چھا گیا۔ ہوا میں عنبر اور زعفران گھلی ہوئی تھی۔ انواع و اقسام کے پھول ہوا کے مدھم جھونکوں سے متوالوں کی طرح جھوم رہے تھے۔ تارا نے ایک گلاب کا پھول توڑ لیا اور اس کے رنگ و نزاکت کا اپنے ہونٹوں سے مقابلہ کرنے لگی۔ گلاب میں وہ دلآویزی نہ تھی۔ عین وسطِ باغ

میں ایک بلوریں حوض تھا۔ اس میں ہارل، ہنس اور بط خوش فعلیاں کررہے تھے۔ یکایک تارا کو خیال آیا، میرے گھر کے اور لوگ کہاں ہیں؟ کنیزوں سے دریافت کیا۔ انھوں نے کہا حضور وہ لوگ پرانے مکان میں ہیں۔ تارا نے اپنے بالاخانے پر جاکر دیکھا۔ اسے اپنا پہلا مکان ایک بوسیدہ جھونپڑی کی طرح نظر آیا۔ اس کی بہنیں اس کی ادنیٰ کنیزوں سے بھی میل نہ کھاتی تھیں۔ ماں کو دیکھا۔ وہ آنگن میں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ تارا پہلے سوچا کرتی تھی کہ جب میرے دن چمکیں گے تو ان لوگوں کو بھی اپنے ساتھ رکھوں گی اور ان کی خوب خدمت کروں گی۔ پر اس وقت غرورِ ثروت نے اس کے لطیف جذبات کو مردہ کردیا تھا۔ اس نے گھر والوں کو ایک حقارت آمیز رحم کی نگاہ سے دیکھا اور تب ان نغموں کا لطف اٹھانے میں محو ہوگئی جس کی روح افزا صدائیں اس کے کان میں آرہی تھیں۔

دفعتاً زور سے ایک کڑاکا ہوا، بجلی کوندی اور برقی لہروں میں سے ایک شعلہ رو نوجوان نکل کر تارا کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوگیا۔ تارا نے پوچھا تم کون ہو۔ نوجوان نے کہا ”حضور مجھے برق خان کہتے ہیں۔ میں حضور کا فرماں بردار ہوں۔

اس کے رخصت ہوتے ہی ہوا کے محرور جھونکے چلنے لگے، ایک شعلہ آسمان میں نظر آیا اور دم کے دم میں وہ اتر کر تارا کنور کے قریب ٹھہر گیا۔ اس میں سے ایک آتشیں صورت کے مُسِن پرُتناور آدمی نے نکل کر تارا کے قدموں کا بوسہ لیا۔ تارا نے پوچھا تم کون ہو مُسِن آدمی نے جواب دیا۔ ”حضور میرا نام اگن سنگھ ہے میں حضور کا فرماں بردار غلام ہوں وہ ابھی جانے نہ پایا تھا کہ دفعتاً سارا محل روشنی سے بقعہ نور بن گیا معلوم ہوتا تھا سیکڑوں بجلیاں مل کر چمک رہی ہیں، ضوء فگن ہوائیں چلنے لگیں ایک جگمگاتا ہوا تخت آسمان پر نظر آیا وہ تیزی سے زمین کی طرف چلا اور تارا کنور کے پاس آکر ٹھہر گیا اس میں ایک نورانی صورت کا کمسن لڑکا جس کے چہرے سے متانت برس رہی تھی نکل کر تارا کے سامنے مؤدبانہ انداز سے کھڑا ہوگیا تارا نے پوچھا تم کون ہو؟ لڑکے نے جواب دیا حضور مجھے مسٹر ریڈیم کہتے ہیں۔ حضور کا پروردہ ہوں۔

اربابِ ثروت تارا کے خوف سے تھرانے لگے۔ اس کے عالم فریب حسن نے ایک ہنگامہ برپا کردیا۔ بڑے بڑے تاجدار اس کے آستانے پر سجدے کرنے لگے۔ جس کی طرف

اس کی آنکھیں اٹھ جاتی تھیں وہ ہمیشہ کے لیے اس کا بندۂ بے دام بن جاتا تھا۔ اسے پھر تقدیر بھی اس آستانے سے جدا نہ کرسکتی تھی۔ عداوت اور رقابت، کینہ وحسد، قتل وخون کا بازار گرم ہوا، بدگمانیوں نے زور پکڑا۔ مگر تارا ان عشاق کو خیال میں بھی نہ لاتی تھی۔ وہ محض تفریح کے لیے، محض تماشے کے لیے ان جانبازوں کو کھلاتی رہتی تھی۔

ایک روز تارا اپنے پُر فضا باغیچے میں سیر کررہی تھی کہ ناگاہ اس کے کان میں کسی کے گانے کی آواز آئی۔ تارا بیتاب ہوگئی۔ اس کے دربار میں دنیا کے اچھے اچھے گویےّ موجود تھے۔ لیکن وہ بیخودی، وہ جذبہ، وہ تاثیر، جو ان سروں میں تھی اسے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی، اس نے گویےّ کو بلا بھیجا۔''

ایک لمحے کے بعد باغیچے میں ایک سادھو داخل ہوا۔ اس کے سر پر جٹائیں تھیں، جسم خاک آلودہ، ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک ٹوٹا بین تھا۔ اسی سے وہ صدائے درد نکلتی تھی۔ جو ٹوٹے ہوئے دل کی صداؤں سے کہیں درد ناک تھی۔ سادھو آکر حوض کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس نے تارا کے سامنے سرِ تعظیم نہیں جھکایا۔ حیرت سے اِدھر اُدھر اسی عالمِ محویت میں اپنا سُر اَلاپنے لگا۔ تارا پر بیخودی کا ایک سرور طاری ہوگیا۔ دل میں ایک درد کا احساس ہوا۔ بیتابانہ جوش کے ساتھ ٹہلنے لگی۔ سادھو کے نغمے سے چڑیاں مگن ہوگئیں۔ پانی میں لہریں اٹھنے لگیں۔ شجر جھومنے لگے۔ تارا نے ان دلکش سرُوں سے ایک تصویر بنتے ہوئی دیکھی۔ رفتہ رفتہ تصویر واضح ہونے لگی، اس میں حرکت پیدا ہوئی، تب وہ کھڑی ہوکر ناچنے لگی۔ اس کا انداز کتنا مستانہ، ادائیں کتنی دلربا تھیں۔ دفعتاً تارا چونک پڑی۔ اس نے دیکھا کہ یہ میری ہی تصویر ہے۔ نہیں۔ میں ہی ہوں۔ میں ہی بین کے تالوں پر ناچ رہی ہوں۔ اسے حیرت ہوئی کہ میں برکاتِ دنیا کی ملکہ ہوں یا ایک وجودِ خیال، ایک نغمۂ مصور۔ وہ سر دھننے لگی۔ اور ایک عالمِ دیوانگی میں دوڑ کر سادھو کے پیروں سے چمٹ گئی۔ اس کے آلاتِ بصر میں ایک عجیب تغیر پیدا ہوا۔ سامنے کے پھلے پھولے درخت ، اور لہریں مارتا ہوا حوض اور خوشنما روشیں، سب غائب ہوگئیں۔ ایک وسیع فضا تھی اور صرف وہی سادھو بیٹھا ہوا بین بجا رہا تھا۔ اور وہ خود یا اپنا نقشِ ثانی اس کے تالوں پر تھرک رہی تھی۔ وہ اب خاک آلود فقیر نہ تھا۔ نہیں وہ مرادنہ جلال کا درخشاں ستارہ اور عارفانہ حسن کا شگفتہ پھول بن گیا تھا۔ جب نغمہ بند ہوا

تو تارا ہوش میں آئی۔ اس کا دل ہاتھ سے جا چکا تھا۔ وہ اس باکمال درویش کے ہاتھوں بک چکی تھی۔

تارا بولی۔ ”سوامی جی، یہ محل اور ثروت، شان اور شکوہ سب آپ کے قدموں پر نثار ہے اس خانۂ تاریک کو اپنے قدموں سے روشن کیجیے۔“

سادھو۔ ”فقیروں کو محل اور دھن دولت سے کیا کام۔ میں اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا۔“

تارا۔ ”دنیا کی ساری نعمتیں آپ کے لیے حاضر ہیں۔“

سادھو۔ ”مجھے نعمتوں کی ضرورت نہیں۔

تارا۔ ”میں تا دمِ آخر آپ کی کنیز بنی رہوں گی۔“

یہ کہہ کر تارا نے آرسی میں اپنے حسن تاباں کا جلوہ دیکھا اور غرور سے اس کی آنکھوں میں نشہ آگیا۔

سادھو۔ ”نہیں تاراکنور، میں اس لائق نہیں ہوں۔“

یہ کہہ کر سادھو نے بین اٹھایا اور دروازے کی طرف چلا۔ تارا کا غرور پامال ہوگیا۔ ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اور وہ بے ہوش ہوکر گر پڑی۔ میں جو ثروت میں، دولت میں، حسن میں، اپنا نظیر نہیں رکھتی، ایک فقیر کی نگاہوں میں اتنی ناچیز ہوں!!

تارا کو اب کسی پہلو قرار نہ تھا۔ اسے اپنے محل اور اسباب عیش سے وحشت ہوتی۔ سادھو کا پرجلال چہرہ آنکھوں میں بسا رہتا اور اس کے بہشتی نغمے کانوں میں گونجا کرتے۔ اس نے اپنے مخبروں کو بلا کر سادھو کا سراغ لگانے کا حکم دیا۔ بہت تلاش کے بعد اس کی کٹی کا پتہ ملا۔ تارا روز اپنے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر سادھو کے پاس جاتی تھی۔ اس پر لعل و جواہر لٹاتی، کبھی اپنے ثروت کے کرشمے دکھاتی تھی۔ کبھی برق خان کبھی اگن سنگھ۔ کبھی مسٹر ریڈیم اس کے جلو میں ہوتے۔ وہ نت نئے روپ بھرتی، اور اپنے زاہد فریب، جہاں سوز حسن، کے جلوے دکھاتی۔ لیکن سادھو اس سے ذرا بھی مخاطب نہ ہوتا تھا۔ اس کے نالۂ بیتاب اور نغانِ درد اس پر مطلق اثر نہ کرتے۔

تب تارا کنور پھر دُرگا کے مندر میں گئی اور دیوی کے پیروں پر سر رکھ کر بولی ”ماتا۔ تم نے مجھے دنیا کی سب نعمتیں عطا کیں، لیکن مجھے وہ بے خلل عیش نصیب نہ ہوا

جس کی میں نے امید کی تھی۔ میں نے سمجھا تھا ثروت میں دنیا کو رام کرنے کی طاقت ہے، حُسن میں پتھر کو پگھلانے کی قدرت ہے، دولت میں تسخیر کا جادو ہے، پر مجھے اب معلوم ہوا کہ محبت پر دولت اور حسن اور ثروت کا مطلق بس نہیں ہے۔ اب ایک بار مجھ پر پھر وہی نگاہِ کرم ہو۔ کچھ ایسا کیجیے کہ جس بے رحم کے پریم میں مری جاتی ہوں وہ بھی مجھ پر دیوانہ ہوجائے، اسے بھی مجھے دیکھے بغیر چین نہ آئے، اس کی آنکھوں میں بھی نیند حرام ہوجائے۔ وہ بھی میری الفت کے نشے سے سرشار ہو۔"

دیوی کے ہونٹ کھلے، مسکرائیں۔ غنچے کو شعاعِ زریں نے بوسہ دیا۔ آواز آئی "تارا۔ میں دنیا کی سب نعمتیں عطا کرسکتی ہوں، لیکن جنت کی نعمتیں میری بس کی نہیں۔ "پریم" جنت کی اعلیٰ ترین نعمت ہے۔"

تارا۔ "دنیا کی سب نعمتیں میرے لیے وبالِ جان ہیں۔ میں اپنے پیارے کو کیسے پاؤں گی؟"

دیوی۔ "اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ مگر وہ بہت کٹھن ہے۔ تم اس پر چل سکو گی؟"

تارا۔ "وہ کتنا ہی کٹھن ہو میں اس پر چلوں گی۔"

دیوی۔ "وہ خدمت کا راستہ ہے۔ خدمت کرو۔ پریم، خدمت ہی سے مل سکتا ہے۔"

تارا نے اپنے بیش بہا کپڑے اور مرصع زیورات اتار دیے۔ کنیزوں سے بدا ہوئی۔ اسبابِ عیش اور قصرِ شاہی کو خیرباد کہا اور یکہ وتنہا سادھو کی کٹی میں چلی آئی۔ اسے راہِ خدمت پر چلنے کی لگی ہوئی تھی۔ وہ کچھ رات رہے اٹھتی، کٹی میں جھاڑو دیتی، سادھو کے لیے گنگا سے پانی لاتی۔ جنگلوں سے پھول چنتی، سادھو نیند میں ہوتے تو وہ ان کے پاس بیٹھی ہوئی آنچل سے پنکھا جھلتی۔ جنگلی پھل توڑ لاتی اور کیلے کے پتّل بنا کرسادھو کے سامنے رکھتی۔ سادھو ندی میں اشنان کرنے جایا کرتے تھے۔ تارا راستے سے کنکر چنتی۔ اس نے کٹی کے چاروں طرف پھول لگائے۔ گنگا سے پانی لالاکر انھیں سینچتی۔ انھیں ہرا بھرا دیکھ کر خوش ہوتی۔ اس نے مدار کی روئیاں بٹوریں اور سادھو کے لیے نرم گدے تیار کیے۔ اسے کسی صلے کی خواہش نہ تھی۔ خدمت آپ ہی اپنا صلہ، اپنا انعام تھی۔

تارا کو کئی کئی دن فاقے کرنا پڑتے۔ ہاتھوں میں گھٹے پڑگئے، پیر کانٹوں سے چھلنی ہوگئے۔ دھوپ سے گلِ عارض مرجھا گئے۔ گلاب سا جسم سوکھ گیا، مگر اس دل میں اب خود پرستی اور غرور کی حکومت نہ تھی۔ وہاں اب پریم کا راج تھا۔ وہاں خدمت کی بو تھی،

جس سے تلخیوں میں شیرینی آجاتی ہے اور کانٹے پھول بن جاتے ہیں۔ جہاں کے پتھر روئی سے زیادہ نرم ہیں اور لؤ نسیم سے زیادہ روح پرور۔ تارا بھول گئی کہ میں حسن میں یکتائے روزگار ہوں، دولت اور ثروت میں لاثانی وہ اب پریم کی لونڈی تھی!

سادھو کو جنگل کے چرند پرند سے عشق تھا۔ وہ کٹی کے آس پاس جمع ہوجاتے۔ تارا انھیں پانی پلاتی۔ دانے چگاتی۔ گود میں لے کر پیار کرتی۔ زہریلے سانپ اور خونخوار درندے اس کی محبت کے اثر سے رام ہوگئے۔

سادھو کی دعا سے شفا پانے کے لیے اکثر مریض آتے رہتے تھے۔ تارا مریضوں کی تیمارداری کرتی۔ جنگل سے جڑی بوٹیاں ڈھونڈ کر لاتی، ان کے لیے دوائیں بناتی۔ ان کے زخم دھوتی، زخموں پر مرہم رکھتی۔ رات بھر بیٹھی انھیں پنکھا جھلتی۔ سادھو کی دعا اور دوا اس کی خدمت سے اور بھی پرُ تاثیر ہوجاتی تھی۔

اس طرح کتنے ہی دن گزر گئے۔ گرمی کے دن تھے۔ آگ کے جھونکے چل رہے تھے۔ زمین توے کی طرح جلتی تھی۔ ہرے بھرے درخت سوکھے جاتے تھے۔ سانپ بانبی سے نکل کر موروں کے پروں کے نیچے پناہ لیتے تھے۔ گنگا گرمی سے پھیلنے کے بجائے سمٹ گئی تھی۔ تارا کو پانی لانے کے لیے بہت دور ریت میں چلنا پڑتا۔ اس کا نازک جسم چور چور ہوجاتا۔ جلتے ہوئے ریت میں تلوے بھن جاتے۔ اسی حالت میں ایک دن وہ بے دم ہوکر ایک درخت کے نیچے ذرا دم لینے کے لیے بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اس نے دیکھا کہ دیوی اس کے سامنے کھڑی نگاہِ رحم سے اس کی طرف تاک رہی ہیں۔ تارا نے دوڑ کر ان کے قدموں کو بوسہ دیا۔

دیوی نے پوچھا۔ ”تارا تیری مراد پوری ہوئی؟“

تارا۔ ”ہاں ماتا۔ میری مراد پوری ہوگئی۔“

دیوی۔ ”تجھے پریم مل گیا؟“

تارا۔ نہیں ماتا۔ مجھے اس سے بھی بڑی نعمت مل گئی۔ مجھے پریم کے ہیرے کے بدلے خدمت کا پارس مل گیا۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ پریم، خدمت کا چاکر ہے۔ خدمت کے سامنے سرجھکا کراب میں پریم کی آرزومند نہیں۔ اب مجھے کسی دوسری نعمت کی خواہش نہیں۔ خدمت نے مجھے محبت، عزت، آرام، سب سے بے نیاز بنا دیا۔

دیوی اب کی بار اندازِ تمسخر سے مسکرائیں نہیں۔ انھوں نے تارا کو گلے لگا لیا اور نظروں سے غائب ہو گئیں۔

شام کا وقت تھا۔ شفق میں تارے یوں چمکتے تھے جیسے کمل پر پانی کی بوند چمکتی ہے۔ ہوا میں ایک دلکش خنکی آگئی تھی۔ تارا ایک درخت کے نیچے کھڑی چڑیوں کو دانہ چگا رہی تھی کہ یکایک سادھو نے آکر اس کے قدموں پر سر جھکا دیا اور بولا۔ تارا تم نے مجھے جیت لیا۔ تمھاری دولت اور ثروت، تمھارا حسن اور انداز جو کچھ نہ کرسکا وہ تمھاری خدمت نے کر دکھایا۔ تم نے مجھے اپنا دیوانہ بنا دیا۔ اب میں تمھارا خادم ہوں۔ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ تمھارے اشاروں پر میں اپنا یوگ اور ویراگ ترک اور زہد سب کچھ نثار کروں گا۔"

تارا۔ "سوامی جی۔ مجھے اب کوئی ہوس نہیں ہے۔ میں صرف خدمت کی اجازت چاہتی ہوں۔"

سادھو۔ "میں دکھا دوں گا کہ جوگ سادھ کر بھی انسان کا دل مردہ نہیں ہوتا۔ میں بھونرے کی طرح تمھارے حسن پر منڈلاؤں گا۔ پپیہے کی طرح تمھاری پریم کی رٹ لگاؤں گا۔ ہم دونوں الفت کی ناؤ پر بیٹھ کر دولت اور ثروت کے ندی کی سیر کریں گے۔ محبت کے کنجوں میں بیٹھ کر پریم کے دور چلائیں گے، آنند کے راگ گائیں گے۔"

تارا نے کہا۔ "سوامی جی راہِ خدمت پر چل کر میں منزلِ مقصود پر پہنچ گئی۔ اب دل میں کوئی آرزو کوئی ہوس نہیں ہے۔

سادھو نے پھر تارا کے قدموں پر سر جھکایا اور گنگا کی طرف چل دیا۔

اردو ماہنامہ زمانہ میں جون 1918میں شائع ہوئی۔ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں 'سیوا مارگ' کے عنوان سے مان سروور8 میں شامل ہے۔

زنجیرِ ہوس

جری اور جوان بخت قاسم، ملتان کی مہم سر کرکے بادۂ غرور سے مخمور چلا آتا تھا۔ شام ہوگئی تھی۔ لشکر کے لوگ فرودگاہ کی تلاش میں نظریں دوڑاتے تھے۔ لیکن قاسم کو اپنے آقائے نامدار کی خدمت میں باریابی کا شوق اڑائے لیے آتا تھا۔ ان تیاریوں کا خیال کرکے جو اس کے استقبال کے لیے دلی میں کی گئی ہوں گی، اس کا دل امنگوں سے لبریز ہو رہا تھا۔ سڑکیں، بیرقوں اور بندن داروں سے آراستہ ہوں گی۔ چوراہوں پر نوبت خانے اپنا سہانا راگ الاپیں گے۔ جوں ہی میں شہر پناہ کے اندر داخل ہوں گا، سارے شہر میں ایک غلغلہ برپا ہوجائے گا۔ توپیں خیر مقدم کے پر شور نالے بلند کریں گی۔ بالاخانوں پر ماہ رویانِ شہر پرُغور نگاہوں سے مجھے دیکھیں گے اور مجھ پر پھولوں کی بارش کریں گے۔ اراکینِ دربار جواہر نگار عماریوں میں بیٹھے ہوئے میری پیشوائی کو آئیں گے۔ اس شان سے دیوانِ خاص تک جانے کے بعد جب میں حضور انور کی خدمت میں پہنچوں گا تو وہ آغوش کھولے ہوئے مجھے سینے سے لگانے کے لیے اٹھیں گے اور میں فرطِ احترام سے ان کے قدموں کو بوسہ دوں گا۔ آہ! وہ مبارک وقت کب آئے گا؟ قاسم متوالا ہوگیا۔ اس نے شوقِ بے خودی میں گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

قاسم لشکر کے عقب میں تھا۔ گھوڑا ایڑ پاتے ہی آگے بڑھا۔ قیدیوں کا غول پیچھے چھوٹ گیا۔ زخمی سپاہیوں کی ڈولیاں پیچھے چھوٹیں۔ سواروں کا دستہ پیچھے رہا۔ سواروں کے آگے فرماں روائے ملتان کی بیگمات اور شہزادیوں کے محافے اور سکھپال تھے۔ ان سواروں کے پس و پیش مسلح خواجہ سراؤں کی ایک کثیر جماعت تھی۔ قاسم اپنے رو میں گھوڑا بڑھائے چلا آتا تھا۔ دفعتاً اسے ایک مکلف پالکی میں سے دو آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں۔ قاسم ٹھٹک گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ میرے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ اسے اپنے جگر میں ایک لرزش، دل میں ایک ضعف، حواس میں ایک وحشت سی محسوس ہوئی۔ اس کا آسن

خود بخود ڈھیلا پڑگیا۔ تنی ہوئی گردن جھک گئی۔ نظریں نیچی ہوئیں۔ وہ دونوں آنکھیں، وہ منور رقصاں ستاروں کی طرح، جن میں ساحرانہ کشش تھی، اس کے گوشۂ دل میں آبیٹھیں۔ وہ جدھر تاکتا تھا وہی دونوں جذبۂ نور سے روشن تارے نظر آتے تھے۔ اسے برچھی نہیں لگی، کٹار نہیں لگی، کسی نے اس پرجادو نہیں کیا، تسخیر نہیں کی، نہیں اسے اپنے دل میں اس وقت ایک پُر مزہ رمیدگی، ایک مصوّر لذت درد، ایک کیفیتِ شیریں، ایک دلآویز پرخلش رقت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا رونے کو جی چاہتا تھا۔ کسی کا نعرۂ درد سن کر شاید وہ روپڑتا، بے تاب ہوجاتا۔ اس کا احساسِ درد جاگ اٹھا تھا۔ جو عشق کی پہلی منزل ہے۔

ایک لمحے کے بعد اس نے حکم دیا۔ "آج ہمارا یہیں قیام ہوگا۔"

(۲)

آدھی رات گزر چکی تھی۔ لشکر کے آدمی میٹھی نیند سو رہے تھے۔ چاروں طرف مشعلیں جلتی تھیں اور طلایہ کے جوان جابجا بیٹھے جمائیاں لیتے تھے۔ لیکن قاسم کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ اپنے وسیع پرلطف خیمے میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ کیا اس نازنین کو ایک نظر دیکھ لینا کوئی بڑا گناہ ہے؟ مانا کہ وہ فرماں روائے ملتان کی شہزادی ہے اور میرے آقائے نامدار اپنے حرم کو اس سے روشن کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میری آرزو تو صرف اتنی ہے کہ اسے صرف ایک نگاہ دیکھ لوں اوروہ بھی اس طرح کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ بس۔ اور بالفرض یہ گناہ بھی ہو تو میں اس وقت یہ گناہ کروں گا۔ ابھی ہزاروں بے گناہوں کو انھیں ہاتھوں سے قتل کر آیا ہوں۔ کیا خدا کے دربار میں ان گناہوں کی معافی محض اس لیے ہوجائے گی کہ وہ بادشاہ کے حکم سے کیے گئے۔ کچھ بھی ہو؟ کسی نازنین کو ایک نظر دیکھ لینا، کسی کی جان لینے سے بڑا گناہ نہیں۔ کم سے کم میں ایسا نہیں سمجھتا۔

قاسم دیندار نوجوان تھا۔ وہ دیر تک اس فعل کے اخلاقی پہلو پر غور کرتا رہا۔ تسخیرِ ملتان کا ہیرو دیگر موانعات کو کیوں کر خیال میں لاتا۔

اس نے اپنے خیمے سے باہر نکل کر دیکھا۔ بیگمات کے خیمے تھوڑی ہی دور نصب تھے۔ قاسم نے قصداً اپنا خیمہ ان کے قریب لگایا تھا۔ ان خیموں کے چاروں طرف کئی مشعلین جل رہی تھیں۔ اور پانچ حبشی خواجہ سرا برہنہ شمشیر لیے ٹہل رہے تھے۔ قاسم

آکر مسند پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔ ان کم بختوں کو کیا نیند نہ آئے گی۔ اور چاروں طرف اتنی مشعلیں کیوں جلا رکھی ہیں۔ ان مشعلوں کا گل ہونا ضروری ہے۔ اس لیے پکارا۔ ''مسرور۔''

''حضور۔ ارشاد؟''

''مشعلیں بجھادو۔ مجھے نیند نہیں آتی۔''

''حضور رات اندھیری ہے۔''

''کوئی خوف نہیں۔ طلایہ کے جوان ہوشیار ہیں۔''

''سب کی سب گل کردی جائیں؟''

''ہاں!''

''جیسی مرضیٔ والا۔''

خواجہ سرا چلا گیا۔ اور ایک لمحے میں سب کی سب مشعلیں گل ہو گئیں۔ اندھیرا چھا گیا۔

تھوڑی دیر میں ایک عورت نے شہزادی کے خیمے سے نکل کر پوچھا۔ ''مسرور سرکار پوچھتی ہیں، یہ مشعلیں کیوں بجھ گئیں؟''

مسرور بولا۔ پہرے دار صاحب کی مرضی۔ تم لوگ ہوشیار رہنا۔ مجھے ان کی نیت صاف نہیں معلوم ہوتی۔''

(۳)

قاسم بے تابیٔ اشتیاق کے عالم میں کبھی لیٹتا تھا۔ کبھی اٹھ بیٹھتا تھا۔ کبھی ٹہلنے لگتا تھا۔ بار بار دورازے پر آکر دیکھتا۔ لیکن پانچوں خواجہ سرا دیووں کی طرح کھڑے نظر آتے تھے۔ قاسم کو اس وقت یہی دھن تھی کہ شہزادی کا دیدار کیوں کر ہو؟ انجام کی فکر، ننگ و ناموس کا خوف اور عتابِ شاہی کا خطرہ، اس پرزور خواہش کے نیچے دب گیا تھا۔

گھڑیال نے ایک بجایا۔ قاسم یوں چونک پڑا گویا کوئی اَن ہونی بات ہوگئی۔ جیسے کچہری میں بیٹھا ہوا مستغیث اپنے نام کی پکار سن کر چونک پڑتا ہے۔ او ہو۔ تین ہی گھنٹوں میں صبح ہوجائے گی۔ خیمے اکھڑ جائیں گے۔ لشکر کوچ کردے گا۔ وقت تنگ ہے۔ اب تاخیر اور تامل کی گنجائش نہیں۔ کل دلی پہنچ جائیں گے۔ ارمان دل میں کیوں رہ جائے؟

کسی طرح ان حرام خور خواجہ سراؤں کو دم دینا چاہیے۔ اس نے باہر نکل کر آواز دی
"مسرور!"

"حضور۔ ارشاد۔"

"ہوشیار ہو نا۔"

"حضور پلک تک نہ جھپکی۔"

"نیند تو آتی ہی ہو گی۔ کیسی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔"

"جب حضور ہی نے ابھی تک آرام نہیں فرمایا تو غلاموں کو کیوں کر نیند آتی۔"

"میں تمھیں کچھ تکلیف دینا چاہتا ہوں۔"

"ارشاد۔"

"تمھارے ساتھ پانچ آدمی ہیں۔ انھیں لے کر ذرا ایک بار لشکر کا چکر لگا آؤ۔ دیکھو۔ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ اکثر سپاہی رات کو جوا کھیلتے ہیں۔ بعض قرب و جوار کے علاقوں میں جا کر خرمستی کیا کرتے ہیں۔ ذرا ہوشیاری سے کام کرنا۔

مسرور۔ "مگر یہاں میدان خالی ہو جائے گا۔"

قاسم۔ "میں تمھارے آنے تک خبردار رہوں گا۔"

مسرور۔ "جو مرضیٔ والا۔"

قاسم۔ "میں نے تمھیں معتبر سمجھ کر یہ خدمت سپرد کی ہے۔ اس کا معاوضہ انشاء اللہ تمھیں سرکار سے عطا ہو گا۔"

مسرور نے دبی زبان سے کہا۔ "بندہ آپ کی یہ چالیں سب سمجھتا ہے۔ انشاء اللہ سرکار سے آپ کو بھی ان کا صلہ ملے گا۔" اور تب بہ آواز بلند بولا۔ "یہ عین نوازش مخدومانہ ہے۔"

ایک لمحے میں پانچوں خواجہ سرا لشکر کی طرف چلے۔ قاسم نے انھیں جاتے دیکھا مطلع صاف ہو گیا۔ اب وہ بے خوف خیمے میں جاسکتا تھا۔ لیکن اب قاسم کو معلوم ہوا کہ اندر جانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا وہ سمجھتا ہے۔ گناہ کا پہلو اس کی نظر سے غائب ہو گیا تھا۔ اب صرف ظاہری مشکلات پر نگاہ تھی۔

(۴)

قاسم دبے پاؤں شہزادی کے خیمے کے پاس آیا۔ حالانکہ دبے پاؤں آنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سناٹے میں وہ اگر دوڑتا ہوا چلتا تو بھی کسی کو خبر نہ ہوتی۔ اس نے خیمے سے کان لگا کر سنا۔ کسی کی آہٹ نہ ملی۔ اطمینان ہوگیا۔ تب اس نے کمر سے چاقو نکالا، اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خیمے کی دو تین رسیاں کاٹ ڈالیں۔ اندر جانے کا راستہ نکل آیا۔ اس نے اندر کی طرف جھانکا۔ ایک فتیلہ سوز جل رہا تھا۔ دو کنیزیں فرش پر لیٹی ہوئی تھیں اور شہزادی ایک مخملی گدے پر خواب ناز میں محو تھی۔ قاسم کی ہمت زیادہ ہوئی۔ وہ سرک کر اندر چلا گیا، اور دبے پاؤں شہزادی کے قریب جاکر اس کے دل فریب حسن کا امرت پینے لگا۔ اسے اب وہ ہراس نہ تھا جو خیمے میں آتے وقت ہوا تھا۔ اس نے ضرورت پڑنے پر اپنی راہِ فرار سوچ لی تھی۔

قاسم ایک منٹ تک مورت کی طرح کھڑا شہزادی کو دیکھتا رہا۔ سیاہ زلفیں کھل کر اس کے رخساروں کو چھپائے ہوئے تھیں۔ گویا سیاہ حرفوں میں ایک روشن دلآویز شاعرانہ خیال پنہاں تھا۔ وجودِ خاکی میں یہ لطافت، یہ ملاحت، یہ ضیا کہاں؟

قاسم کی آنکھیں اس نظارے سے مخمور ہوگئیں۔ اس کے دل پر ایک ولولہ انگیز شوریدگی کا اثر ہونے لگا جو نتائج سے بے خوف تھی۔ اشتیاق نے آرزو کی صورت اختیار کی۔ اشتیاق میں بے صبری تھی، اور ہیجان۔ آرزو میں ایک مدہوشی اور لطفِ درد، اس کے دل میں اس حسینہ کے پیروں پر سر ملنے کی، اس کے سامنے رونے کی، اس کے قدموں پر جان دینے کی، اظہار الفت کی، بیان غم کی، ایک لہر سی اٹھنے لگی۔ ہوس کے بھنور میں پڑگیا۔

(۵)

قاسم آدھ گھنٹے تک اس ملکۂ حسن کے پیروں کے پاس سر جھکائے بیٹھا سوچتا رہا کہ اسے کیوں کر بیدار کروں۔ جوں ہی وہ کروٹ بدلتی، وہ مارے خوف کے تھرتھرا جاتا۔ وہ شجاعت جس نے ملتان کو تسخیر کیا تھا، اس کا ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔

دفعتاً قاسم کی نگاہ ایک طلائی گلاب پاش پر پڑی۔ جو قریب ہی ایک چوکی پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے گلاب پاش اٹھا لیا۔ اور ایک منٹ کھڑا سوچتا رہا کہ شہزادی کو جگاؤں یا نہ

جگاؤں؟ سونے کی ڈلی پڑی ہوئی دیکھ کر ہمیں اس کے اٹھانے میں جو پس وپیش ہوتا ہے، وہی اس وقت اسے ہورہا تھا۔ بالآخر اس نے کلیجہ مضبوط کرکے شہزادی کے رخ انور پر گلاب کے کئی چھینٹے دیے۔ شمع موتیوں کی لڑی سے آراستہ ہوئی۔

شہزادی نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اور قاسم کو سامنے کھڑا دیکھ کر فوراً منھ پر نقاب کھینچ لی اور آہستہ سے بولی۔ ''مسرور۔''

قاسم نے کہا۔ 'مسرور تو یہاں نہیں ہے۔ لیکن مجھے بھی اپنا ادنیٰ جانباز خادم سمجھیے۔ جو ارشاد ہوگا اس کی تعمیل میں سر مو عذر نہ ہوگا۔''

شہزادی نے نقاب اور کھینچ لی۔ اور خیمے کے ایک گوشے میں جاکر کھڑی ہوگئی۔

قاسم کو اپنی قوتِ بیان کا آج پہلی بار تجربہ ہوا۔ وہ بہت کم سخن اور متین آدمی تھا۔ اپنے جذباتِ دل کے اظہار میں اسے ہمیشہ جھجک ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت الفاظ قطرۂ باراں کی طرح اس کی زبان پر آنے لگے۔ گہرے پانی کے بہاؤ میں ایک نوائے درد پیدا ہوجاتی ہے۔ بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ میری یہ گستاخی طبعِ نازک پر ناگوار گزری ہے۔ مزاجِ عالی میں اس کی جو سزا معلوم ہو، اس کے لیے یہ سر تسلیم خم ہے۔ آہ! میں ہی وہ بدنصیب کور نفس انسان ہوں جس نے آپ کے پدر بزرگور اور پیارے بھائیوں کے خون سے اپنا دامن ناپاک کیا ہے۔ میرے ہی ہاتھوں ملتان کے ہزاروں جوان ہلاک ہوئے۔ سلطنت تباہ ہوگئی۔ خاندان شاہی پر ادبار آیا اور آپ کو یہ روزِ سیاہ دیکھنا پڑا۔ لیکن اس وقت آپ کا یہ مجرم آپ کے سامنے دست بستہ حاضر ہے۔ آپ کے ایک اشارے پر وہ آپ کے قدموں پر نثار ہوجائے گا۔ اور اس کے وجودِ ناقص سے دنیا ناپاک ہوجائے گی۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ نفس، شجاعت کے پردہ میں، انسان سے کیسی کیسی بدعتیں کرواتا ہے۔ یہ محض آتشِ حرص ہے، راکھ میں چھپی ہوئی۔ محض زہر قاتل ہے، خوشنما شیشے میں بند۔ کاش میری آنکھیں پہلے کھلی ہوتیں، تو ایک نامور شاہی خاندان یوں خاک میں نہ مل جاتا۔ پر اس شمعِ الفت نے، جو کل شام کو میرے سینے میں روشن ہوئی، اس گوشۂ تاریک کو منور کردیا۔ یہ ان روحانی جذبات کا فیض ہے، جو کل میرے دل میں پیدا ہوئے۔ جنھوں نے مجھے قیدِ حرص سے آزاد کردیا۔''

اس کے بعد قاسم نے اپنی بے قراری اور دردِ دل اور صدمۂ شوق کا نہایت

رقت انگیز الفاظ میں ذکر کیا۔ یہاں تک کہ اس کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہوگیا۔ اظہارِ حال کی ہوس جز و کل پوری ہوگئی۔

(۶)

لیکن وہ پابندِ ہوس وہاں سے ہلا نہیں۔ اس کی آرزوؤں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ میری اس رام کہانی کا حاصل کیا؟ اگر محض دردِ دل ہی سنانا تھا، تو کسی کو سنا سکتا تھا۔ وہ تصویر اس سے زیادہ توجہ اور خموشی سے میرا ماجرائے غم سنتی۔ کاش میں بھی اس ملکۂ حسن کی صدائیں شیریں سنتا۔ وہ مجھ سے کچھ اپنا حالِ دل کہتی۔ یہ معلوم ہوتا کہ میرے اس قصۂ درد کا اس کے دل پر کیا اثر ہوا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا میں آتشِ سوز میں پھنکا جارہا ہوں، کچھ اس کی آنچ اُدھر بھی پہنچتی ہے یا نہیں۔ کون جانے یہ سچ ہو کہ محبت پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ صبر شکن نگاہ مجھ پر پڑتی ہی کیوں؟ آہ اس پیکرِ حسن کی نوا سنجیوں میں کتنا لطف آئے گا۔ نغمۂ عندلیب سبھی سنتے ہیں۔ پر نغمۂ گل کس نے سنا ہے۔ کاش میں وہ نغمہ سنتا۔ اُس کی آواز کتنی دل کش ہوگی۔ کتنی پاکیزہ، کتنی نوارنی۔ آبِ حیات میں ڈوبی ہوئی۔ اور کہیں وہ بھی مجھ پر مائل ہو تو پھر مجھ سے زیادہ خوش نصیب دنیا میں اور کون ہوگا۔

اس خیال سے قاسم کا دل اچھلنے لگا۔ رگوں میں ایک حرکت سی محسوس ہوئی۔ باوجودیکہ کنیزوں کے جاگ جانے اور مسرور کی واپسی کا دھڑکا لگا ہوا تھا، تاہم شوقِ تکلم نے اسے بے تاب کردیا۔ بولا۔ ملکۂ حسن، یہ سینہ فگار نظرکرم کا مستحق ہے۔ کچھ اس کے حالِ زار پر رحم نہ کیجیے گا؟

شہزادی نے نقاب کی آڑ سے اس کی طرف تاکا۔ اور بولی۔ ”جو خود رحم کا مستحق ہو۔ دوسروں کے ساتھ کیا رحم کرسکتا ہے؟ قفس میں تڑپتے ہوئے طائرِ بے پر و بال سے اس کی ہوس رکھنا عبث ہے۔ میں جانتی ہوں کہ کل شام کو دہلی کے ظالم بادشاہ کے روبرو کنیزوں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑی ہوں گی۔ میری عزت، میرے رتبہ اور میرے وقار کا مدار، خاندانی اعزاز پر نہیں بلکہ میری صورت پر ہوگا۔ پا درافتادگی کا حق پورا ہوجائے کون ایسا بشر ہے جو اس زندگی کی آرزو رکھے گا؟ آہ ملتان کی شہزادی آج ایک جفا، ریا کار، حرام کار انسان کی ہوس رانیوں کا شکار بننے پر مجبور ہے۔ جایئے مجھے میرے

حال پر چھوڑ دیجیے۔ میں بدنصیب ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے ساتھ آپ پر بھی شاہی عذاب نازل ہوجائے۔ دل میں کتنی ہی باتیں ہیں۔ مگر کیا کہوں؟ کیا حاصل؟ اس راز کا سربستہ رہنا ہی بہتر ہے۔ آپ میں سچی شجاعت اور حمیت کا جوہر ہے آپ دنیا میں نام ونمود پیدا کریں گے۔ بڑے بڑے کام انجام دیں گے۔ خدا آپ کے ارادوں میں برکت دے۔ اس ستم نصیب کی دعا ہے۔ میں صدق دل سے کہتی ہوں کہ مجھے آپ سے کوئی ملال نہیں ہے۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ محبت کینہ اور پرخاش سے کتنی بے لوث ہوتی ہے۔ وہ اُس دامن میں منھ چھپانے سے بھی گریز نہیں کرتی، جو اس کے عزیزوں کے خون سے آلود ہورہا ہو۔ آہ! یہ کم بخت دل ابلا پڑتا ہے۔ اپنے کان بند کرلیجیے۔ وہ اپنے آپے میں نہیں ہے۔ اس کی باتیں نہ سنیے۔ صرف آپ سے یہی التجا ہے کہ اس غریب کو بھول جائیے گا۔ میرے دل میں اس خوابِ شیریں کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ قیدِ حرم میں خوابِ دل کو تسکین دیتا رہے گا۔ اس خواب کو پریشان نہ کیجیے گا۔ اب للہ یہاں سے جائیے۔ ایسا نہ ہو کہ مسرور آجائے۔ وہ ایک ہی سفاک ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس نے آپ کو دھوکہ دیا، عجیب نہیں کہ کہیں یہیں بیٹھا ہو۔ اس سے ہوشیار رہیے گا۔ اب رخصت!

(۷)

قاسم پر ایک بے خودی کی حالت طاری ہوگئی۔ جیسے روحانی نغمہ سننے کے بعد کسی مجذوب کی ہوتی ہے۔ اسے خواب میں بھی جو امید نہ ہوسکتی تھی، وہ پوری ہوگئی۔ غرور سے اس کی گردن کی رگیں تن گئیں۔ اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ نصیب دوسرا نہیں ہے۔ چاہوں تو اس گلزارِ حسن کی بہار لوٹ سکتا ہوں۔ اس ساغر سے مست ہوسکتا ہوں۔ آہ! وہ کتنی سرور انگیز، کتنی مبارک زندگی ہوگی۔ اب تک قاسم کی محبت گوالے کا دودھ تھی، پانی سے ملی ہوئی۔ شہزادی کے سوزِ دل نے پانی کو جلا کر خلوص کا رنگ پیدا کر دیا۔ اس کے دل نے کہا۔ میں اس ملکۂ حسن کے لیے کیا کچھ نہیں کرسکتا۔ کوئی ایسی مصیبت نہیں، جو جھیل نہ سکوں۔ کوئی ایسی آگ نہیں، جس میں کود نہ سکوں۔ مجھے خوف کس کا ہے! بادشاہ کا؟ میں بادشاہ کا غلام نہیں، اس کا دستِ نگر نہیں، محتاج نہیں۔ میرے جوہر کی ہر ایک دربار میں قدر ہوسکتی ہے۔ میں آج اس زنجیرِ اطاعت کو توڑ ڈالوں گا۔ اور اس دیس میں جا بسوں گا جہاں بادشاہ کے فرشتے بھی پر نہیں مار سکتے۔

نعمتِ حسن پاکر اب مجھے اور کوئی خواہش نہیں۔ اب اپنی آرزوؤں کا کیوں گلا گھونٹوں؟ ارمانوں کو کیوں نامرادی کا نوالہ بننے دوں؟ اس نے ایک عالمِ وحشت میں کمر سے تلوار نکالی اور جوش کے ساتھ بولا۔ جب تک میرے بازوؤں میں دم ہے، کوئی آپ کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ چاہے وہ دلی کا تاجدار ہی کیوں نہ ہو۔ میں دلی کے کوچہ و بازار میں خون کی ندی بہا دوں گا۔ سلطنت کی جڑیں ہلا دوں گا۔ تختِ شاہی کو زیر و زبر کردوں گا، اور کچھ نہ کرسکوں گا۔ تو مرمٹوں گا۔ پر آپنی آنکھوں سے آپ کی یہ تحقیر نہ دیکھوں گا۔"

شہزادی آہستہ آہستہ اس کے قریب آئی۔ اور بولی۔ "مجھے آپ کے اوپر کامل اعتماد ہے۔ لیکن آپ کو میری خاطر سے ضبط اور صبر کرنا ہوگا۔ آپ کے لیے میں محل سرا کی تکلیفیں اور جفائیں سب سہ لوں گی۔ آپ کی محبت ہی میری زندگی کا سہارا ہوگی۔ یہ یقین کہ آپ مجھے اپنی کنیز سمجھتے ہیں، مجھے ہمیشہ سنبھالتا رہے گا۔ کون جانے تقدیر ہمیں پھر ملائے۔"

قاسم نے اکڑ کر کہا۔ "آپ دلی کا کیوں رخ کریں؟ ہم صبح ہوتے ہوتے بھرت پور پہنچ سکتے ہیں۔"

شہزادی۔ مگر ہندوستان کے باہر تو نہیں جاسکتے۔ دلی کے بداندیش بن کر ممکن ہے ہم دشت و بیابان میں زندگی کے دن کاٹیں۔ پر عافیت نہ نصیب ہوگی۔ واقعات کی طرف سے آنکھیں نہ بند کیجیے۔ خدا نے آپ کو شجاعت عطا کی ہے۔ پر تیغِ اصفہانی بھی تو پہاڑ سے ٹکرا کر ٹوٹ ہی جائے گی۔

قاسم کا جوش کچھ دھیما ہوا۔ تعلّی کا پردہ نظروں سے ہٹ گیا۔ عالمِ غیظ میں بڑھ بڑھ کر باتیں کرنا انسانی خاصہ ہے۔ قاسم کو اپنی معذوری صاف نظر آنے لگی۔ بے شک میری یہ لن ترانیاں مضحکہ خیز ہیں۔ شاہ دہلی کے مقابلے میں میری کیا ہستی ہے؟ ان کا ایک اشارہ میری ہستی کو مٹا سکتا ہے۔ حسرت ناک لہجے میں بولا۔ "بالفرض ہم کو دشت و بیابان ہی میں زندگی کے دن کاٹنے پڑیں تو کیا؟ اہلِ محبت گوشۂ تاریک میں بھی سیر چمن کا لطف اٹھاتے ہیں۔ محبت میں وہ درویشانہ بے نیازی ہے جو دنیا کی نعمتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔"

شہزادی۔ مگر مجھ سے یہ کب ممکن ہے کہ اپنی بہتری کے لیے آپ کو ان خطروں میں ڈالوں؟ میں شاہِ دہلی کی ستم شعاریوں کی داستانیں سن چکی ہوں۔ انھیں یاد کرکے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ میری وجہ سے آپ کا بال بھی بیکا ہو۔ آپ کی مہم آرائیوں کے چرچے، آپ کی خیریت مزاج کی خبریں، اس کنجِ قفس میں میری تسکین اور تقویت کا باعث ہوں گی۔ میں مصیبتیں جھیلوں گی اور ہنس ہنس کر آگ میں جلوں گی اور پیشانی پر میل نہ آنے دوں گی۔ ہاں میں شاہِ دہلی کے دل کو اپنا بناؤں گی۔ صرف آپ کی خاطر سے۔ تاکہ آپ کے لیے موقع پڑنے پر چند کلماتِ خیر کہہ سکوں۔

(۸)

لیکن قاسم اب بھی وہاں سے نہ ہلا۔ اس کی آرزوئیں امید سے بڑھ کر پوری ہوتی جاتی تھیں۔ پھر ہوس بھی اسی انداز سے بڑھتی جاتی تھی۔ اس نے سوچا۔ اگر ہماری محبت کی بہار محض چند لمحوں کی مہمان ہے۔ تو پھر ان مبارک لمحوں کو فکرِ مآل سے کیوں مکدر کریں۔ اگر تقدیر میں اس نعمتِ حسن سے بہرہ ور ہونا نہیں لکھا ہے، تو اس موقع کو ہاتھ سے کیوں دوں؟ کون جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔ یہ محبت رہے یا نہ رہے۔ بولا۔ ”شہزادی اگر آپ کا یہی آخری فیصلہ ہے تو میرے لیے بجز حسرت اور یاس کے اور کیا چارہ ہے؟ قلق ہوگا۔ کڑھوں گا۔ پر صبر کروں گا۔ اب ایک دم کے لیے یہاں آکر میرے پہلو میں بیٹھ جایے تاکہ اس دلِ بے قرار کو تسکین ہو۔ آیئے۔ ایک لحظہ کے لیے بھول جائیں کہ جدائی کی گھڑی ہمارے سر پر کھڑی ہے۔ کون جانے یہ دن کب آئیں۔ ثروت غریبوں کی یاد بھلا دیتی ہے۔ آیئے ایک ساعت مل کر بیٹھیں۔ اپنی عنبریں زلفوں کی خوش بوئے تر سے اس روحِ سوزاں کو طراوت پہنچایئے۔ یہ باہیں گلوں کی زنجیریں بن جائیں۔ اپنے کفِ بلوریں سے پریم کے پیالے بھر بھر کے پلایے۔ ساغر کے ایسے دور چلیں کہ ہم چھک جائیں۔ دلوں پر سرور کا ایسا گاڑھا رنگ چڑھے جس پر فراق کی ترشیوں کا اثر نہ ہو۔ وہ مئے احمر پلایئے۔ جو جھلسے ہوئے کشتِ آرزو کو سیراب کردے اور روحِ تشنہ ہمیشہ کے لیے شاد کام ہوجائے۔“

مئے ارغونی کے دور چلنے لگے۔ شہزادی کے کفِ بلوریں سے مئے ارغواں کا پیالہ ایسا

معلوم ہوتا تھا جیسے بلوریں تختۂ آب پر کنول کا پھول کھلا ہوا۔ قاسم دنیا ومافیہا سے بے
پیالے پر پیالے چڑھاتا جاتا تھا۔ جیسے کوئی رہزن مالِ غنیمت پر ٹوٹا ہوا ہو۔ یہاں
اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ گردن جھک گئی۔ بلانوشی نے مدہوش کردیا۔ شہزادی
طرف ہوس ناک نگاہوں سے تاکتا ہوا آغوش کھولے بڑھا کہ گھڑیال نے چار بجائے
نقارۂ کوچ کی دل دوز صدائیں کان میں آئیں۔ آغوش کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کنیزیں
بیٹھیں۔ شہزادی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور حرماں نصیب قاسم دل کی آرزوئیں لیے خیمے سے
باہر نکلا۔ جیسے تقدیر کے پنجۂ فولاد نے اسے دھکیل کر باہر نکال دیا ہو۔ جب اس خیمے میں
آیا تو دل آرزوؤں سے پرُ تھا۔ کچھ دیر کے بعد آرزوؤں نے ہوس کا روپ بھرا۔ اور اب
باہر نکلا تو دل حسرتوں سے پامال تھا۔ ہوس کا تارِ عنکبوت اس کی روح کے لیے زنجیر آہن
بنا ہوا تھا۔

گوارا

(۹)

شام کا سہانا وقت تھا۔ بحرِ نسیم میں دھیرا دھیرا تلاطم ہورہا تھا۔ جری اور جوان بخت
قاسم ملتان کی مہم سر کرکے بادۂ غرور سے مخمور چلا آتا تھا۔ دہلی کی سڑکیں، بیرقوں اور
جھنڈیوں سے سجی ہوئی تھیں۔ گلاب اور کیوڑے کی خوشبو چاروں طرف اڑ رہی تھی۔ جابجا
نوبت خانے اپنا سہانا راگ الاپ رہے تھے۔ شہر پناہ کے اندر داخل ہوتے ہی سارے شہر
میں ایک غلغلہ سا ہوگیا۔ توپوں نے خیرمقدم کے گھن گرج نالے بلند کیے۔ بالا خانوں پر
ماہ رویانِ شہرستاروں کی طرح چمکنے لگیں۔ قاسم پر پھولوں کی برکھا ہونے لگی۔ وہ قصر شاہی
کے قریب پہنچا تو امرائے عالی مقام اس کی پیشوائی کے لیے پاپیادہ صف بہ صف ایستادہ
تھے۔ اس شان سے وہ دیوانِ خاص تک پہنچا۔ اس کا دماغ اس وقت عرشِ معلیٰ پر تھا۔
مشتاق آرزومند نگاہوں سے تاکتا ہوا بار گاہِ عالی میں پہنچا۔ اور تختِ شاہی کو بوسہ دیا۔
بادشاہ مسکرا کر تخت سے اترے اور آغوش کھولے ہوئے قاسم کو سینے سے لگانے کے لیے
بڑھے۔ قاسم فرطِ احترام سے ان کے قدموں کو بوسہ دینے کے لیے جھکا کہ یکایک اس کے
سر پر ایک بجلی سی گری۔ بادشاہ کا خنجر خارا شگاف اس کی گردن پر پڑا اور سر تن سے جدا
ہوکر الگ جا گرا۔ خون کے فوارے بادشاہ کے قدموں کی طرف، تخت کی طرف اور تخت
کے پیچھے کھڑے ہونے والے مسرور کی طرف لپکے۔ گویا کوئی جھلایا ہوا مارِ آتشیں ہے۔

تنِ بسمل ایک لمحے میں ٹھنڈا ہوگیا۔ مگر دونوں آنکھیں حسرتِ کشتہ کی دو مورتوں
رح دیر تک دیواروں کی طرف تاکتی رہیں۔ آخر وہ بھی بند ہوگئیں۔ ہوس نے اپنا
پورا کردیا۔ اب صرف حسرت باقی تھی جو برسوں تک دیوانِ خاص کے در و دیوار پر
ی رہی۔ اور جس کا پرتو ابھی تک قاسم کے مزار پر خس و خاشاک کی صورت میں نظر
تا ہے۔

اردو ماہنامہ کہکشاں ستمبر اکتوبر 1918میں شائع ہوئی۔ پریم بتیسی میں شامل ہے ہندی میں 'واسنا کی کڑیاں' کے عنوان سے 'گپت دھن ا' میں شامل ہے۔

حج اکبر

منشی صابر حسین کی آمدنی کم تھی۔ اور خرچ زیادہ۔ اپنے بچّہ کے لیے دایہ رکھنا گوارا نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن ایک تو بچہ کی صحت کی فکر اور دوسرے اپنے برابر والوں سے ہیٹے بن کر رہنے کی ذلت اس خرچ کو برداشت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ بچہ دایہ کو بہت چاہتا تھا۔ ہردم اس کے گلے کا ہار بنا رہتا۔ اس وجہ سے دایہ اور بھی ضروری معلوم ہوتی تھی۔ مگر شاید سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ مروت کے باعث دایہ کو جواب دینے کی جرأت نہ کرسکتے تھے۔ بڑھیا اُن کے یہاں تین سال سے نوکر تھی۔ اس نے ان کے اکلوتے بچے کی پرورش کی تھی۔ اپنا کام دل و جان سے کرتی تھی۔ اسے نکالنے کا کوئی حیلہ نہ تھا اور خواہ مخواہ کھچڑ نکالنا صابر جیسے حلیم شخص کے لیے غیر ممکن تھا۔ مگر شاکرہ اس معاملہ میں اپنے شوہر سے متفق نہ تھی۔ اسے شک تھا کہ دایہ ہم کو لوٹے لیتی ہے۔ جب دایہ بازار سے لوٹتی تو وہ دہلیز میں چھپی رہتی کہ دیکھوں آٹا چھپاکر تو نہیں رکھ دیتی۔ لکڑی تو نہیں چھپا دیتی۔ اس کی لائی ہوئی چیز کو گھنٹوں دیکھتی۔ پچھتاتی، باربار پوچھتی اتنا ہی کیوں؟ کیا بھاؤ ہے؟ کیا اتنا مہنگا ہوگیا؟ دایہ کبھی تو ان بدگمانیوں کا جواب ملائمت سے دیتی۔ لیکن جب بیگم زیادہ تیز ہوجاتیں، تو وہ بھی کڑی پڑ جاتی تھی۔ قسمیں کھاتی۔ صفائی کی شہادتیں پیش کرتی۔ تردید اور حجت میں گھنٹوں لگ جاتے۔ قریب قریب روزانہ یہی کیفیت رہتی تھی اور روز یہ ڈراما دایہ کی خفیف سی اشک ریزی کے بعد ختم ہوجاتا تھا۔ دایہ کا اتنی سختیاں جھیل کر پڑے رہنا شاکرہ کے شکوک کی آب ریزی کرتا تھا۔ اسے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ بڑھیا محض بچے کی محبت سے پڑی ہوئی ہے۔ وہ دایہ کو ایسے لطیف جذبہ کا اہل نہیں سمجھتی تھی۔

(۲)

اتفاق سے ایک روز دایہ کو بازار سے لوٹنے میں ذرا دیر ہوگئی۔ وہاں دو کنجڑنوں میں بڑے جوش و خروش سے مناظرہ تھا۔ ان کا مصوّر طرز ادا۔ ان کا اشتعال انگیز استدلال۔ ان

کی متشکل تضحیک۔ ان کی روشن شہادتیں اور منور روائتیں ان کی تعریض اور تردید سب بے مثال تھیں۔ زہر کے دو دریا تھے۔ یا دو شعلے۔ جو دونوں طرف سے اُمڈ کر باہم گتھ گئے تھے۔ کیا روانی زبان تھی۔ گویا کوزے میں دریا بھرا ہوا۔ ان کا جوش اظہار ایک دوسرے کے بیانات کو سُننے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ان کے الفاظ کی ایسی رنگینی، تخیل کی ایسی نوعیت۔ اسلوب کی ایسی جدّت، مضامین کی ایسی آمد، تشبیہات کی ایسی موزونیت۔ اور فکر کی ایسی پرواز پر ایسا کون سا شاعر ہے۔ جو رشک نہ کرتا۔ صفت یہ تھی۔ کہ اس مباحثہ میں تلخی یا دلآزاری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ دونوں بلبلیں اپنے اپنے ترانوں میں محو تھیں۔ ان کی متانت۔ ان کا ضبط۔ ان کا اطمینانِ قلب حیرت انگیز تھا۔ ان کے ظرف دل میں اس سے کہیں زیادہ کہنے کی اور بدرجہا زیادہ سننے کی گنجائش معلوم ہوتی تھی۔ الغرض یہ خالص دماغی۔ ذہنی مناظرہ تھا۔ اپنے اپنے کمالات کے اظہار کے لیے۔ ایک خالص زورآزمائی تھی اپنے اپنے کرتب اور فن کے جوہر دکھانے کے لیے۔

تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ وہ مبتذل کنایات و اشارے جن پر بے شرمی کو شرم آتی۔ وہ کلمات رکیک جن سے عفونت بھی دُور بھاگتی۔ ہزاروں رنگین مزاجوں کے لیے محض باعثِ تفریح تھے۔

دایہ بھی کھڑی ہوگئی کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے۔ پر تماشا اتنا دلآویز تھا۔ کہ اُسے وقت کا مطلق احساس نہ ہوا۔ یکایک نو بجنے کی آواز کان میں آئی تو سحر ٹوٹا۔ وہ لپکی ہوئی گھر کی طرف چلی۔

شاکرہ بھری بیٹھی تھی۔ دایہ کو دیکھتے ہی تیور بدل کر بولی۔ کیا بازار میں کھوگئی تھیں؟ دایہ نے خطا وارانہ انداز سے سر جھکا لیا۔ اور بولی۔ "بیوی ایک جان پہچان کے ماما سے ملاقات ہوگئی۔ اور باتیں کرنے لگی۔

شاکرہ جواب سے اور بھی برہم ہوئی۔ یہاں دفتر جانے کو دیر ہورہی ہے تمھیں سیر سپاٹے کی سُوجھی ہے۔ مگر دایہ نے اس وقت دبنے میں خیریت سمجھی۔ بچہ کو گود میں لینے چلی۔ پر شاکرہ نے جھڑک کر کہا۔ "رہنے دو۔ تمھارے بغیر بے حال نہیں ہوا جاتا۔"

دایہ نے اس حکم کی تعمیل ضروری نہ سمجھی۔ بیگم صاحبہ کا غصہ فرو کرنے کی اس سے زیادہ کارگر کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی۔ اس نے نصیر کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

وہ دونوں ہاتھ پھیلائے لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ دایہ نے اسے گود میں اُٹھا لیا۔ اور دروازہ کی طرف چلی۔ لیکن شاکرہ باز کی طرح جھپٹی اور نصیر کو اس کی گود سے چھین کر بولی۔ ''تمھارا یہ مکر بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ یہ تماشے کسی اور کو دکھایئے۔ یہاں طبیعت سیر ہوگئی۔

دایہ نصیر پر جان دیتی تھی اور سمجھتی تھی کہ شاکرہ اس سے بے خبر نہیں ہے اس کی سمجھ میں شاکرہ اور اس کے درمیان یہ ایسا مضبوط تعلق تھا۔ جسے معمولی تُرشیاں کمزور نہ کرسکتی تھیں۔ اسی وجہ سے باوجود شاکرہ کی سخت زبانیوں کے اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ واقعی مجھے نکالنے پر آمادہ ہے۔ پر شاکرہ نے یہ باتیں کچھ اس بے رُخی سے کیں اور بالخصوص نصیر کو اس بے دردی سے چھین لیا کہ دایہ سے ضبط نہ ہوسکا۔ بولی۔ ''بیوی مجھ سے کوئی ایسی بڑی خطا تو نہیں ہوئی۔ بہت ہوگا۔ تو پاؤ گھنٹہ کی دیر ہوئی ہوگی۔ اس پر آپ اتنا جھلا رہی ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ دوسرا دروازہ دیکھو۔ اللہ نے پیدا کیا ہے۔ تو رزق بھی دے گا۔ مزدوری کا کال تھوڑا ہی ہے۔''

شاکرہ۔ تو یہاں تمھاری کون پروا کرتا ہے۔ تمھاری جیسی مامائیں گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

دایہ۔ ہاں خدا آپ کو سلامت رکھے۔ مامائیں دائیاں بہت ملیں گی۔ جو کچھ خطا ہوئی ہو۔ معاف کیجیے گا۔ میں جاتی ہوں۔

شاکرہ۔ جاکر مردانے میں اپنی تنخواہ کا حساب کرلو۔

دایہ۔ میری طرف سے نصیر میاں کو اس کی مٹھائیاں منگوا دیجیے گا۔

اتنے میں صابر حسین بھی باہر سے آگئے۔ پوچھا کیا ہے؟

دایہ۔ ''کچھ نہیں۔ بیوی نے جواب دے دیا ہے۔ گھر جاتی ہوں''

صابر حسین خانگی تردداّت سے یوں بچتے تھے۔ جیسے کوئی برہنہ پا کانٹوں سے بچے۔ انھیں سارے دن ایک ہی جگہ کھڑے رہنا منظور تھا۔ پر کانٹوں میں پیر رکھنے کی جرأت نہ تھی۔ چیں بہ جبیں ہوکر بولے۔ ''بات کیا ہوئی؟''

شاکرہ۔ کچھ نہیں۔ اپنی طبیعت۔ نہیں جی چاہتا نہیں رکھتے۔ کسی کے ہاتھوں بک تو نہیں گئے۔

صابر۔ تمھیں بیٹھے بٹھائے ایک نہ ایک کھچڑ سوجھتی رہتی ہے۔

شاکرہ ۔ ہاں مجھے تو اس بات کا جنون ہے۔ کیا کروں خصلت ہی ایسی ہے تمھیں یہ بہت پیاری ہے۔ تو لے جاکر گلے باندھو ! میرے یہاں ضرورت نہیں ہے۔

دایہ گھر سے نکلی۔ تو اس کی آنکھیں لبریز تھیں۔ دل نصیر کے لیے تڑپ رہا تھا کہ ایک بار بچے کو گود میں لے کر پیار کرلوں۔ پر یہ حسرت لیے اُسے گھر سے نکلنا پڑا۔

(۳)

نصیر دایہ کے پیچھے پیچھے دروازے تک آیا۔ لیکن جب دایہ نے دروازہ باہر سے بند کردیا تو مچل کر زمین پر لیٹ گیا۔ اور انا انا کہہ کر رونے لگا۔ شاکرہ نے چمکارا۔ پیار کیا۔ گود میں لینے کی کوشش کی۔ مٹھائی کا لالچ دیا۔ میلہ دکھانے کا وعدہ کیا۔ اس سے کام نہ چلا تو بندر اور سپاہی اور لولو اور ہوّا کی دھمکی دی۔

مگر نصیر پر مطلق اثر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ شاکرہ کو غصہ آگیا۔ اس نے بچے کو وہیں چھوڑ دیا۔ اور آکر گھر کے دھندوں میں مصروف ہوگئی۔ نصیر کا منہ اور گال لال ہوگئے۔ آنکھیں سُوج گئیں۔ آخر وہ وہیں زمین پر سسکتے سسکتے سوگیا۔

شاکرہ نے سمجھا تھا۔ تھوڑی دیر میں بچہ رو دھوکر چپ ہوجائے گا۔ پر نصیر نے جاگتے ہی پھر انا کی رٹ لگائی۔ تین بجے صابرحسین دفتر سے آئے اور بچے کی یہ حالت دیکھی۔ تو بیوی کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر اسے گود میں اُٹھا لیا۔ اور بہلانے لگے۔ آخر نصیر کو جب یقین ہوگیا کہ دایہ مٹھائی لینے گئی ہے تو اسے تسکین ہوئی۔ مگر شام ہوتے ہی اس نے پھر چیخنا شروع کیا۔ "انا مٹھائی لائی؟"

اس طرح دو تین دن گزرگئے۔ نصیر کو انا کی رٹ لگانے اور رونے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ وہ بے ضرر کتا جو ایک لمحہ کے لیے اس کی گود سے جُدا نہ ہوتا تھا۔ وہ بے زبان بلّی جسے طاق پر بیٹھے دیکھ کر وہ خوشی سے پھُولا نہ سماتا تھا۔ وہ طائرِ بے پرواز جس پر وہ جان دیتا تھا۔ سب اس کی نظروں سے گر گئے۔ وہ ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ انا جیسی جیتی جاگتی پیار کرنے والی۔ گود میں لے کر گھمانے والی۔ تھپک تھپک کر سُلانے والی گا گاکر خوش کرنے والی چیز کی جگہ ان بے جان۔ بے زبان چیزوں سے پُر نہ ہوسکتی تھی۔ وہ اکثر سوتے سوتے چونک پڑتا۔ اور انا انا پکار کر رونے لگتا۔ کبھی دروازہ پر

جاتا اور انّا انّا پکار کر ہاتھوں سے اشارہ کرتا۔ گویا اسے بُلا رہا ہے۔ انّا کی خالی کوٹھڑی میں جاکر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اُسے امید ہوتی تھی کہ انّا یہاں آتی ہوگی۔ اس کوٹھڑی کا دروازہ بند پاتا۔ تو جاکر کواڑ کھٹکھٹاتا۔ کہ شاید لنّا اندر چُھپی بیٹھی ہو۔ صدر دروازہ کھلتے سنتا۔ تو لنّا لنّا کہہ کر دوڑتا۔ سمجھتا کہ انّا آگئی۔ اس کا گدرایا ہوا بدن گُھل گیا۔ گلاب کے سے رخسار سُوکھ گئے۔ ماں اور باپ دونوں اس کی موہنی ہنسی کے لیے ترس ترس کر رہ جاتے۔ اگر بہت گُدگدانے اور چھیڑنے سے ہنستا بھی۔ تو ایسا معلوم ہوتا دل سے نہیں محض دل رکھنے کے لیے ہنس رہا ہے۔ اسے اب دودھ سے رغبت تھی نہ مصری سے۔ نہ میوہ سے نہ میٹھے بسکٹ سے۔ نہ تازی امرتیوں سے، اُن میں مزہ تھا۔ جب لنّا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھی۔ اب ان میں مزہ نہ تھا۔ دو سال کا ہونہار لہلہاتا ہوا شاداب پودا مرُجھاکر رہ گیا۔ وہ لڑکا جسے گود میں اُٹھاتے ہی نرمی گرمی اور وزن کا احساس ہوتا تھا۔ اب استخواں کا ایک پُتلا رہ گیا تھا۔ شاکرہ بچہ کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کُڑھتی اور اپنی حماقت پر پچتاتی۔ صابر حسین جو فطرتاً خلوت پسند آدمی تھے اب نصیر کو گود سے جدا نہ کرتے تھے۔ اسے روز ہوا کھلانے جاتے۔ نت نئے کھلونے لاتے۔ پر مرُجھایا ہوا پودا کسی طرح نہ پنپتا تھا۔ دایہ اس کی دُنیا کا آفتاب تھی۔ اس قدرتی حرارت اور روشنی سے محروم ہوکر سبزی کو بہار کیوں کر دکھاتا؟ دایہ کے بغیر اسے چاروں طرف اندھیرا سناٹا نظر آتا تھا۔ دوسری انّا تیسرے ہی دن رکھ لی تھی۔ پر نصیر اس کی صورت دیکھتے ہی منہ چُھپا لیتا تھا۔ گویا وہ کوئی دیونی یا بھُتنی ہے۔

عالمِ وجود میں دایہ کو نہ دیکھ کر نصیر اب زیادہ تر عالمِ خیال میں رہتا۔ وہاں اس کی اپنی لنّا چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ اس کی وہی گود تھی۔ وہی محبت۔ وہی پیاری باتیں۔ وہی پیارے پیارے گیت۔ وہی مزے دار مٹھائیاں۔ وہی سہانا سنسار وہی دل کش لیل و نہار۔ اکیلے بیٹھے انّا سے باتیں کرتا۔ انّا کتا بھونکے لنّا گائے دودھ دیتی۔ انّا اُجلا اُجلا گھوڑا دوڑتا۔ سویرا ہوتے ہی لوٹا لے کر دایہ کی کوٹھڑی میں جاتا اور کہتا۔"انّا پانی پی۔" دودھ کا گلاس لے کر اس کی کوٹھڑی میں رکھ آتا۔ اور کہتا۔ "انّا دودھ پلا۔" اپنی چارپائی پر تکیہ رکھ کر چادر سے ڈھانک دیتا۔ اور کہتا۔"انّا سوتی۔" شاکرہ کھانے بیٹھتی تو رکابیاں اُٹھا اُٹھا انّا کی کوٹھڑی میں لے جاتا اور کہتا انّا کھانا کھائے گی" انّا اس کے لیے اب ایک آسمانی وجود تھی۔ جس کی واپسی کی اُسے مطلق اُمید نہ تھی۔ وہ محض گذشتہ خوشیوں کی دل کش یادگار تھی۔

جس کی یاد ہی اس کا سب کچھ تھی۔ نصیر کے انداز میں رفتہ رفتہ طفلانہ شوخی اور بے تابی کی جگہ ایک حسرتناک توکل ایک مایوسانہ خوشی نظر آنے لگی۔ اس طرح تین ہفتے گزر گئے۔ برسات کا موسم تھا۔ کبھی شدت کی گرمی۔ کبھی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے۔ بخار اور زکام کا زور تھا۔ نصیر کی نحافت ان موسمی تغیرات کو برداشت نہ کرسکی۔ شاکرہ احتیاطاً اسے فلالین کا کرتا پہنائے رکھتی۔ اُسے پانی کے قریب نہ جانے دیتی ننگے پاؤں ایک قدم نہ چلنے دیتی۔ مگر رطوبت کا اثر ہو ہی گیا۔ نصیر کھانسی اور بخار میں مبتلا ہوگیا۔

(۴)

صبح کا وقت تھا۔ نصیر چارپائی پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کا علاج بے سود ہورہا تھا۔ شاکرہ چارپائی پر بیٹھی اس کے سینہ پر تیل کی مالش کر رہی تھی۔ اور صابر حسین صورت غم بنے ہوئے بچہ کو پُر درد نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس طرف وہ شاکرہ سے بہت کم بولتے تھے۔ انھیں اُس سے ایک نفرت سی ہوتی تھی۔ وہ نصیر کی اس بیماری کا سارا الزام اسی کے سر رکھتے تھے۔ وہ ان کی نگاہوں میں نہایت کم ظرف۔ سفلہ مزاج بے حس عورت تھی۔

شاکرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔"آج بڑے حکیم صاحب کو بُلا لیتے۔ شاید انھیں کی دوا سے فائدہ ہو۔" صابر حسین نے کالی گھٹاؤں کی طرف دیکھ کر ترشی سے جواب دیا "بڑے حکیم نہیں۔ لقمان بھی آئیں تو اُسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

شاکرہ۔"تو کیا اب کسی کی دوا ہی نہ ہوگی؟"

صابر۔ بس اس کی ایک ہی دوا ہے اور وہ نایاب ہے۔

شاکرہ۔ تمھیں تو وہی دُھن سوار ہے۔ کیا عباسی امرت پلادے گی؟

صابر۔ ہاں وہ تمھارے لیے چاہے زہر ہو۔ لیکن بچے کے لیے امرت ہی ہوگی۔

شاکرہ۔ میں نہیں سمجھتی کہ اللہ کی مرضی میں اسے اتنا دخل ہے۔

صابر۔ اگر نہیں سمجھتی ہو۔ اور اب تک نہیں سمجھا تو روؤ گی۔ بچے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

شاکرہ۔ چپ بھی رہو۔ کیسا شگون زبان سے نکالتے ہو۔ اگر ایسی جلی کٹی سُنانی ہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔

صابر۔ ہاں تو میں جاتا ہوں۔ مگر یاد رکھو یہ خون تمھاری گردن پر ہوگا۔ اگر لڑکے کو پھر

تندرست دیکھنا چاہتی ہو۔ تو اس عباسی کے پاس جاؤ۔ اس کی منت کرو۔ التجا کرو۔ تمھارے بچے کی جان اسی کے رحم پر منحصر ہے۔

شاکرہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

صابر حسین نے پوچھا۔ ''کیا مرضی ہے۔ جاؤں اسے تلاش کروں؟''

شاکرہ۔ تم کیوں جاؤگے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔

صابر۔ نہیں۔ معاف کرو۔ مجھے تمھارے اوپر اعتبار نہیں ہے۔ نہ جانے تمھارے منہ سے کیا نکل جائے کہ وہ آتی بھی ہو۔ تو نہ آئے۔

شاکرہ نے شوہر کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھ کر کہا۔ ''ہاں اور کیا۔ مجھے اپنے بچے کی بیماری کا قلق تھوڑے ہی ہے۔ میں نے شرم کے مارے تم سے کہا نہیں لیکن میرے دل میں باربار یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ اگر مجھے دایہ کے مکان کا پتہ معلوم ہوتا تو میں اسے کب کی منا لائی ہوتی۔ وہ مجھ سے کتنی ہی ناراض ہو۔ لیکن نصیر سے اُسے محبت تھی۔ میں آج ہی اس کے پاس جاؤں گی۔ اس کے قدموں کو آنسوؤں سے تر کردوں گی۔ اور وہ جس طرح راضی ہوگی اُسے راضی کروں گی۔''

شاکرہ نے بہت ضبط کرکے یہ باتیں کہیں۔ مگر اُمڈے ہوئے آنسو اب نہ رُک سکے۔ صابر حسین نے بیوی کی طرف ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا اور نادم ہوکر بولے۔ ''میں تمھارا جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں خود ہی جاتا ہوں۔''

(۵)

عباسی دنیا میں اکیلی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا خاندان گلاب کا سرسبز شاداب درخت تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خزاں نے سب پتیاں گرادیں۔ باد حوادث نے درخت کو پامال کردیا۔ اور اب یہی ایک سُوکھی ٹہنی ہرے بھرے درخت کی یادگار باقی تھی۔

مگر نصیر کو پاکر اس کی سوکھی ٹہنی میں جان سی پڑگئی تھی۔ اس میں ہری ہری پتیاں نکل آئی تھیں۔ وہ زندگی جو اب تک خشک اور پامال تھی۔ اس میں پھر رنگ و بُو کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ اندھیرے بیابان میں بھٹکے ہوئے مسافر کو شمع کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اب اس کا جوئے حیات سنگ ریزوں سے نہ ٹکراتا تھا۔ وہ اب ایک گلزار کی آبیاری کرتا تھا۔ اب اس کی زندگی مہمل نہیں تھی۔ اس میں معنی پیدا ہوگئے تھے۔

عباسی نصیر کی بھولی بھولی باتوں پر نثار ہوگئی۔ مگر وہ اپنی محبت کو شاکرہ سے چھپاتی تھی۔ اس لیے کہ ماں کے دل میں رشک نہ ہو۔ وہ نصیر کے لیے ماں سے چھپ کر مٹھائیاں لاتی اور اُسے کھلاکر خوش ہوتی۔ وہ دن میں دو دو تین تین بار اُسے ابٹن ملتی۔ کہ بچہ خوب پروان چڑھے۔ وہ اسے دوسروں کے سامنے کوئی چیز نہ کھلاتی۔ کہ بچے کو نظر نہ لگ جائے۔ ہمیشہ دوسروں سے بچے کی کم خوری کا رونا رویا کرتی۔ اسے نظربد سے بچانے کے لیے تعویز اور گنڈے لاتی رہتی۔ یہ اس کی خالص مادرانہ محبت تھی۔ جس میں اپنے روحانی احتظاظ کے سوا اور کوئی غرض نہ تھی۔

اس گھر سے نکل کر آج عباسی کی وہ حالت ہوگئی۔ جو تھیٹر میں یکایک بجلیوں کے گُل ہوجانے سے ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی صورت ناچ رہی تھی۔ کانوں میں وہی پیاری پیاری باتیں گونج رہی تھیں۔ اسے اپنا گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ اس کال کوٹھڑی میں دم گھٹا جاتا تھا۔

رات جوں توں کرکے کٹی۔ صبح کو وہ مکان میں جھاڑو دے رہی تھی۔ یکایک تازے حلوے کی صدا سُن کر بے اختیار باہر نکل آئی۔ معاً یاد آگیا۔ آج حلوہ کون کھائے گا؟ آج گود میں بیٹھ کر کون چہکے گا؟ وہ نغمۂ مسرت سُننے کے لیے جو حلوا کھاتے وقت نصیر کی آنکھوں سے ہونٹوں سے اور جسم کے ایک ایک عضوسے برستا تھا۔ عباسی کی رُوح تڑپ اُٹھی۔ وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلی کہ چلوں۔ نصیر کو دیکھ آؤں۔ پر آدھے راستہ سے لوٹ گئی۔

نصیر عباسی کے دھیان سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں اُترتا تھا۔ وہ سوتے سوتے چونک پڑتی۔ معلوم ہوتا۔ نصیر ڈنڈے کا گھوڑا دبائے چلا آتا ہے۔ پڑوسنوں کے پاس جاتی تو نصیر ہی کا چرچا کرتی۔ اس کے گھر کوئی آتا۔ تو نصیر ہی کا ذکر کرتی۔ نصیر اس کے دل اور جان میں بسا ہوا تھا۔ شاکرہ کی بے رُخی اور بدسلوکی کے ملال کے لیے اس میں جگہ نہ تھی۔

وہ روز ارادہ کرتی کہ آج نصیر کو دیکھنے جاؤں گی۔ اس کے لیے بازار سے کھلونے اور مٹھائیاں لاتی۔ گھر سے چلتی۔ لیکن کبھی آدھے راستہ سے لوٹ آتی۔ کبھی دوچار قدم سے آگے نہ بڑھا جاتا۔ کون منہ لے کر جاؤں؟ جو محبت کو فریب سمجھتا ہو۔ اُسے کون منہ

دکھاؤں۔ کبھی سوچتی کہیں نصیر مجھے نہ پہچانے تو بچوں کی محبت کا اعتبار کیا؟ نئی دایہ سے پرچ گیا ہو۔ یہ خیال اس کے پیروں پر زنجیر کا کام کرجاتا تھا۔

اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔ عباسی کا دل ہردم اچاٹ رہتا۔ جیسے اُسے کوئی لمبا سفر درپیش ہو۔ گھر کی چیزیں جہاں کی تہاں پڑی رہتیں۔ نہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی۔ بدنی ضروریات بھی خلاء دل کو پُر کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اسی اثنا میں حج کے دن آگئے۔ محلّہ میں کچھ لوگ حج کی تیاریاں کرنے لگے۔ عباسی کی حالت اس وقت پالتو چڑیا کی سی تھی۔ جو قفس سے نکل کر پھر کسی گوشہ کی تلاش میں ہو۔ اُسے اپنے تئیں بُھلا دینے کا یہ ایک بہانہ مل گیا۔ آمادہ سفر ہوگئی۔

(۶)

آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی تھیں۔ دہلی اسٹیشن پر زائرین کا ہجوم تھا۔ کچھ گاڑیوں میں بیٹھے تھے۔ کچھ اپنے گھروالوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ چاروں طرف ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ دنیا اس وقت بھی جانے والوں کے دامن پکڑے ہوئے تھی۔ کوئی بیوی سے تاکید کر رہا تھا۔ دھان کٹ جائے تو تالاب والے کھیت میں مٹر بو دینا اور باغ کے پاس گیہوں۔ کوئی اپنے جوان لڑکے کو سمجھا رہا تھا۔ اسامیوں پر بقایا لگان کی نالش کرنے میں دیر نہ کرنا اور دو روپیہ سیکڑہ سُود ضرور مجرا کرلینا۔ ایک بوڑھے تاجر صاحب اپنے منیم سے کہہ رہے تھے۔ مال آنے میں دیر ہوتو خود چلے جائیے گا۔ اور چلتو مالِ لیجیے گا۔ ورنہ روپیہ پھنس جائے گا۔ مگر خال خال ایسی صُورتیں بھی نظر آتی تھیں جن پر مذہبی ارادت کا جلوہ تھا۔ وہ یا تو خاموش آسمان کی طرف تاکتی تھیں یا محوِ تسبیح خوانی تھیں۔ عباسی بھی ایک گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ان بھلے آدمیوں کو اب بھی دنیا کی فکر نہیں چھوڑتی۔ وہی خرید و فروخت لین دین کے چرچے نصیر اس وقت یہاں ہوتا تو بہت روتا۔ میری گود سے کسی طرح نہ اُترتا۔ لوٹ کر ضرور اسے دیکھنے جاؤں گی۔ یا اللہ کسی طرح گاڑی چلے۔ گرمی کے مارے کلیجہ بھُنا جاتا ہے۔ اتنی گھٹا امڈی ہوئی ہے۔ برسنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ معلوم نہیں۔ یہ ریل والے کیوں دیر کر رہے ہیں؟ جھوٹ موٹ اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں یہ نہیں۔ کہ چٹ پٹ گاڑی کھول دیں۔ مسافروں کی جان میں جان آئے۔ یکایک اس نے صابر حسین کو بائیسکل لیے پلیٹ فارم پر آتے دیکھا۔ ان کا چہرہ

اُترا ہوا تھا اور کپڑے تر تھے۔ وہ گاڑیوں میں جھانکنے لگے۔ عباسی محض یہ دکھانے کے لیے کہ میں بھی حج کرنے جا رہی ہوں۔ گاڑی سے باہر نکل آئی۔ صابر حسین اُسے دیکھتے ہی لپک کر قریب آئے اور بولے۔"کیوں عباسی تم بھی حج کو چلیں؟"

عباسی نے فخریہ انکسار سے کہا۔"ہاں! یہاں کیا کروں؟ زندگی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہوجائیں۔ خدا کے یہاں منہ دکھانے کے لیے بھی تو کوئی سامان چاہیے۔ نصیر میاں تو اچھی طرح ہیں؟"

صابر۔ اب تو تم جا ہی رہی ہو۔ نصیر کا حال پُوچھ کر کیا کروگی۔ اس کے لیے دُعا کرتی رہنا۔

عباسی کا سینہ دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر بولی۔"کیا دشمنوں کی طبیعت اچھی نہیں ہے؟"

صابر۔"اس کی طبیعت تو اسی دن سے خراب ہے۔ جس دن تم وہاں سے نکلیں۔ کوئی دو ہفتہ تک تو شب و روز لنا لنا کی رٹ لگاتا رہا۔ اور اب ایک ہفتہ سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے۔ ساری دوائیں کرکے ہار گیا۔ کوئی نفع ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ارادہ کیا تھا۔ چل کر تمھاری منت سماجت کرکے لے چلوں۔ کیا جانے تمھیں دیکھ کر اس کی طبیعت کچھ سنبھل جائے۔ لیکن تمھارے گھر پر آیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ تم حج کرنے جا رہی ہو۔ اب کس منہ سے چلنے کو کہوں۔ تمھارے ساتھ سلوک ہی کون سا اچھا کیا تھا؟ کہ اتنی جرأت کرسکوں اور پھر کارِ ثواب میں رخنہ ڈالنے کا بھی خیال ہے۔ جاؤ ! اس کا خدا حافظ ہے۔ حیات باقی ہے۔ تو صحت ہو ہی جائے گی۔ ورنہ مشیت ایزدی سے کیا چارہ؟"

عباسی کی آنکھوں میں اندھیرا چھاگیا۔ سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا۔ دل سے دعا نکلی۔"اللہ میری جان کے صدقے۔ میرے نصیر کا بال بیکا نہ ہو۔" رقت سے گلا بھر آیا۔ میں کیسی سنگ دل ہوں۔ پیارا بچہ رو رو کر ہلکان ہوگیا۔ اور میں اُسے دیکھنے تک نہ گئی۔ شاکرہ بدمزاج سہی۔ بدزبان سہی۔ نصیر نے میرا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے ماں کا بدلہ نصیر سے لیا۔ یاخدا میرا گناہ بخشیو ! پیارا نصیر میرے لیے ہُڑک رہا ہے (اس خیال سے عباسی کا کلیجہ مسوس اُٹھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے) مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے مجھ سے اتنی محبت ہے۔ ورنہ شاکرہ کی جُوتیاں کھاتیں اور گھر سے

قدم نہ نکالتی۔ آہ ! نہ معلوم بچارے کی کیا حالت ہے؟ اندازِ وحشت سے بولی۔"دودھ تو پیتے ہیں نا؟"

صابر۔ تم دودھ پینے کو کہتی ہو۔ اس نے دو دن سے آنکھیں تو کھولیں نہیں۔

عباسی۔ یا میرے اللہ! ارے او قُلی قلی ! بیٹا !! آکے میرا اسباب گاڑی سے اُتار دے۔ اب مجھے حج وج کی نہیں سُوجھتی۔ ہاں بیٹا ! جلدی کر۔ میاں دیکھیے کوئی یکہ ہو تو ٹھیک کرلیجیے !

یکہ روانہ ہوا۔ سامنے سڑک پر کئی بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ عباسی بار بار جھنجلاتی تھی۔ اور یکہ بان سے کہتی تھی۔ بیٹا جلدی کر! میں تجھے کچھ زیادہ دے دوں گی۔ راستے میں مسافروں کی بھیڑ دیکھ کر اُسے غصہ آتا تھا اس کا جی چاہتا تھا۔ گھوڑے کے پر لگ جاتے۔ لیکن جب صابر حسین کا مکان قریب آگیا۔ تو عباسی کا سینہ زور سے اُچھلنے لگا۔ باربار دل سے دعاء نکلنے لگی۔ خدا کرے۔ سب خیر و عافیت ہو۔

یکہ صابر حسین کی گلی میں داخل ہوا۔ دفعتہً عباسی کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس کا کلیجہ مُنہ کو آگیا۔ سر تیورا گیا۔ معلوم ہوا۔ دریا میں ڈوبی جاتی ہوں جی چاہا۔ یکہ سے کود پڑوں۔ مگر ذرا دیر میں معلوم ہوا کہ عورت میکہ سے بدا ہو رہی ہے۔ تسکین ہوئی۔

آخر صابر حسین کا مکان آپہنچا۔ عباسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تاکا۔ جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا یتیم لڑکا شام کو بھُوکا پیاسا گھر آئے۔ اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے۔ دروازہ پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ باورچی بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ عباسی کو ذرا ڈھارس ہوئی۔ گھر میں داخل ہوئی۔ تو دیکھا کہ نئی دایہ بیٹھی پولٹس پکا رہی ہے۔ کلیجہ مضبوط ہوا۔ شاکرہ کے کمرے میں گئی۔ تو اس کا دل گرما کی دوپہری دُھوپ کی طرح کانپ رہا تھا۔ شاکرہ نصیر کو گود میں لیے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی۔ غم اور یاس کی زندہ تصویر۔

عباسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پُوچھا۔ نصیر کو اس کی گود سے لے لیا۔ اور اس کے منہ کی طرف چشمِ پرنم سے دیکھ کر کہا۔"بیٹا ! نصیر آنکھیں کھولو۔"

نصیر نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحہ تک دایہ کو خاموش دیکھتا رہا۔ تب یکایک دایہ کے

گلے سے لپٹ گیا۔ اور بولا۔ ’’انا آئی۔انا آئی۔‘‘

نصیر کا زرد مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہوگیا۔ جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل جائے۔ ایسا معلوم ہوا۔ گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا۔ صابر حسین نے آکر اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ اور پیار کرکے بولے۔ ’’تمھاری انا کو مار کر بھگا دیں؟‘‘

نصیر نے مُنہ بنا کر کہا۔ ’’نہیں روئے گی۔‘‘

عباسی بولی۔ ’’کیوں بیٹا ! مجھے تو تونے کعبہ شریف نہ جانے دیا۔ میرے حج کا ثواب کون دے گا؟‘‘

صابر حسین نے مسکرا کر کہا۔ ’’تمھیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہوگیا۔ اس حج کا نام حجِ اکبر ہے۔‘‘

اردو ماہنامہ کہکشاں نومبر 1918 میں شائع ہوئی۔ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں ’مہاتیر تھ‘ کے عنوان سے مان سرودر نمبر7 میں شامل ہے۔

خنجر وفا

جے گڈھ اور بجے گڈھ دو نہایت سرسبز، مہذب، وسیع اور مستحکم سلطنتیں تھیں۔ دونوں ہی میں علم وہنر کی گرم بازاری تھی۔ دونوں کا مذہب ایک، معاشرت ایک، رسم رواج ایک، فلسفہ ایک، اصولِ ترقی ایک، معیارِ زندگی ایک، اور زبان میں بھی برائے نام فرق تھا۔ جے گڑھی شعرا کے کلام پر بجے گڈھ والے سر دھنتے، اور بجے گڈھی فلسفیوں کے مسائل جے گڈھ کا ایمان تھے۔ جے گڈھی حسینوں سے بجے گڈھ کے خانوادے روشن ہوتے اور بجے گڈھ کی دیویاں جے گڈھ میں پجتی تھیں۔ تاہم دونوں سلطنتوں میں ہمیشہ چشمک رہتی تھی۔ چشمک ہی نہیں بلکہ مغائرت، کدورت، سوئے ظن، اور حسد۔ دونوں ہی ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف خنجر بکف رہتی تھیں۔ جے گڈھ میں اگر کوئی ملکی اصلاح عمل میں آتی تو بجے گڈھ میں واویلا مچ جاتا کہ ہماری زندگی معرضِ خطر میں ہے۔ علیٰ ہذا بجے گڈھ میں کوئی تجارتی ترقی صورت پذیر ہوتی تو جے گڈھ میں شورِ محشر برپا ہوجاتا تھا۔ جے گڈھ اگر ریلوے کی کوئی شاخ نکالتا تو بجے گڈھ اسے اپنے لیے مارِ سیاہ سمجھتا اور بجے گڈھ میں کوئی نیا جہاز تیار ہوتا تو جے گڈھ کو وہ نہنگِ خون آشام نظر آتا تھا۔ اگر یہ بدگمانیاں جہلا یا عوام میں پیدا ہوتیں تو ایک بات تھی۔ لطف یہ تھا کہ یہ کدورتیں علم اور بیداری، ثروت اور وقار کی سرزمین ہی میں نشوونما پاتی تھیں۔ جہالت اور جمود کی اوسر زمین ان کے لیے موافق نہ تھی۔ بالخصوص تدبر اور آئین کے زرخیز علاقے میں تو اس تخم کی بالیدگی خیال کی سبک روی کو بھی مات کر دیتی تھی۔ ننھا سا بیج چشم زدن میں تناور درخت ہوجاتا تھا۔ دارالعواموں میں آہ وزاری کی صدائیں گونجنے لگتیں، ملکی انجمنوں میں ایک زلزلہ سا آجاتا، جرائد اور اخبارات کے نغانِ دل سوز قلمرو کو زیر و زبر کردیتے۔ کہیں سے آواز آتی۔ "جے گڈھ، پیارے جے گڈھ، مقدس جے گڈھ، کے لیے یہ سخت آزمائش کا موقع ہے۔ رقیب نے جو نصابِ تعلیم تیار کیا ہے وہ ہمارے لیے پیامِ مرگ

ہے۔ اب ضرورت اور اشد ضرورت ہے کہ ہم کمر ہمت چست باندھیں اور ثابت کریں کہ جے گڈھ لافانی ہے۔ ان حملوں سے جانبر ہوسکتا ہے، نہیں ان کا دنداں شکن جواب دے سکتا ہے۔ اگر ہم اس وقت بیدار نہ ہوئے تو جے گڈھ، پیارا جے گڈھ پردۂ ہستی سے محو ہوجائے گا۔ اور روایتیں بھی اسے فراموش کردیں گی۔ دوسری جانب سے صدا آتی "بجے گڈھ کے بیخبر سونے والوں، ہمارے مہربان پڑوسیوں نے اپنے اخباروں کی زبان بند کرنے کے لیے جو نئے قواعد نافذ کیے ہیں ان پر ناراضگی کا اظہار کرنا ہمارا فرض ہے۔ ان کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہمیں وہاں کے معاملات سے بیخبر رکھا جائے اور اس تاریکی کے پردے میں ہمارے اوپر دھاوے کیے جائیں، ہمارے گلوں پر پھیرنے کے لیے نئے نئے اسلحے تیار کیے جائیں اور بالآخر ہمارا نام ونشان مٹا دیا جائے۔ لیکن ہم اپنے دوستوں کو جتا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اگر انھیں آلۂ شر کی ایجاد میں یدِ طولیٰ ہے تو ہمیں بھی دفعیہ بلیات میں کمال ہے۔ اگر شیطان ان کا مددگار ہے تو ہم کو بھی تائید ربانی حاصل ہے اور اگر اب تک ہمارے دوستوں کو نہیں معلوم ہے تو اب معلوم ہوجانا چاہیے کہ تائیدِ ایزدی ہمیشہ شیطان پر غالب آتی ہے۔"

(۲)

جے گڈھ باکمال کلاونتوں کا اکھاڑا تھا۔ شیریں بائی اس اکھاڑے کی سبز پری تھی۔ اس کے کمال کا دور دور شہرہ تھا۔ قلمرو نغمہ کی ملکہ تھی۔ جس کے آستانے پر بڑے بڑے نامور آکر سرجھکاتے تھے۔ چاروں طرف فتح کا نقارہ بجا کر اس نے بجے گڈھ کا رخ کیا جس سے اب تک اسے خراجِ تحسین نہ حاصل ہوا تھا۔ اس کے آتے ہی بجے گڈھ میں ایک انقلاب سا برپا ہوگیا۔ تعصب اور تکبر اور تفاخرِ بیجا ہوا سے اڑنے والی سوکھی پتیوں کی طرح منتشر ہوگئے۔ بازارِ حسن و نشاط میں خاک اڑنے لگی، تھیٹروں اور رقص گاہوں میں ایک ویرانی کا عالم نظر آنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ساری خلقت مسحور ہوگئی۔ شام ہوتے ہی بجے گڈھ کے صغیر و کبیر، برنا و پیر شیریں بائی کے مجلسِ عام کے طرف دوڑتے تھے۔ سارا ملک شیریں کے نشۂ عبودیت میں مخمور ہوگیا۔

بجے گڈھ کے باخبر حلقے میں اہلِ وطن کے اس جنون سے ایک اضطراب کی حالت پیدا ہوئی محض یہی نہیں کہ ان کے ملک کی دولت زائل ہورہی تھی۔ بلکہ ان کا قومی وقار

اور غرور خاک میں ملا جاتا تھا۔ جے گڈھ کی ایک رقاصہ ایک معمولی فنیاگر خواہ وہ کتنی ہی شیریں ادا کیوں نہ ہو، بجے گڈھ کی دلچسپیوں کا مرکز بن جائے۔ یہ ستم تھا، قہر تھا۔ باہم مشورے ہوئے اور قاضیانِ وطن کی جانب سے وزارئے ملک کی خدمت میں اس خاص امر کے متعلق ایک وفد حاضر ہوا۔ بجے گڈھ کے اراکینِ نشاط کی جانب سے بھی محضر نامے پیش ہونے لگے۔ اخباروں نے قومی ذلت اور نکبت کے ترانے چھیڑے۔ دارالعوام میں سوالات کی یورش ہونے لگی۔ یہاں تک کہ وزراء مجبور ہوگئے۔ شیریں بائی کے نام شاہی فرمان پہنچا۔ ''چونکہ تمھارے قیام سے ملک میں ایک شورش پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لیے تم فی الفور بجے گڈھ سے رخصت ہوجاؤ۔'' مگر یہ حکم سراسر آئینِ بین الاقوام، باہمی عہد نامے اور اصولِ تمدن کے خلاف تھا۔ جے گڈھ کے سفیر نے جو بجے گڈھ میں متعین تھا اس حکم سے تعریض کی، اور شریں بائی نے بالآخر اس کی تعمیل سے انکار کیا کیونکہ اس سے اس کی آزادی اور خودداری، اور اس کے وطن کے حقوق اور وقار پر حرف آتا تھا۔

(۳)

جے گڈھ کے کوچہ و بازار خاموش تھے، سیر گاہیں خالی، تفریح و تماشے در بستہ، قصر شاہی کے وسیع صحن اور دارالعوام کے پُر فضا سبزہ زار میں آدمیوں کا ہجوم تھا۔ مگر ان کی زبانیں بند تھیں اور آنکھیں سرخ۔ بشرے تند اور سخت، تیوریاں چڑھی ہوئی، ماتھے پر شکن۔ اڈی ہوئی کالی گھٹا تھی، ہیبتناک، خاموش اور سیلاب کو دامن میں چھپائے ہوئے۔

مگر دارالعوام میں ایک ہنگامۂ عظیم برپا تھا۔ کوئی صلح کا حامی تھا، کوئی جنگ کا طالب، کوئی مصالحت کا معین، کوئی تحقیقاتی کمیشن کا محرک۔ معاملہ نازک تھا، موقع تنگ۔ تاہم باہمی ردوکد، تعریض و تردید، ذاتی حملے اور بدگمانیوں کا بازار گرم تھا۔ آدھی رات گزر گئی۔ مگر کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ سرمایہ کی متفق طاقت، اس کا رسوخ اور وقار اور رعب فیصلہ کی زبان بند کیے ہوئے تھا۔

تین پہر رات جاچکی تھی۔ ہوا نیند سے متوالی ہوکر انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اور درختوں کی آنکھیں جھپکی جاتی تھیں۔ آسمان کی شمعیں بھی جھلملانے لگی تھیں۔ اراکینِ دربار بھی دیواروں کی طرف تاکتے تھے، کبھی سقف کی طرف۔ لیکن مفر نہ سوجھتا تھا۔

دفعتاً باہر سے آواز آئی۔ ''جنگ! جنگ! دارالعوام اس صدائے بلند سے گونج اٹھا۔

دیواروں نے زبانِ خاموش سے جواب دیا "جنگ! جنگ!"

یہ نعرۂ غیب تھا جس نے جامد میں حرکت پیدا کردی۔ اب ساکن میں تموج پیدا ہوگیا۔ اراکین گویا خوابِ غفلت سے چونک پڑے۔ جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آتے ہی اچھل پڑے۔ وزیرِ جنگ سید عسکری نے فرمایا۔ "کیا اب بھی آپ لوگوں کو اعلانِ جنگ میں تامل ہے۔ زبانِ خلق حکمِ خدا ہے اور اس کی صدا ابھی آپ کے کانوں میں آئی۔ اس کی تعمیل ہمارا فرض ہے۔ ہم نے آج اس طولانی نشست میں یہ ثابت کیا ہے کہ ہم زبان کے دھنی ہیں پر زبان تلوار ہے سپر نہیں ۔ ہمیں اس وقت سپر کی ضرورت ہے۔ آیئے ہم اپنے سینوں کو سپر بنالیں اور ثابت کردیں کہ ہم میں ابھی وہ جوہر باقی ہے جس نے ہمارے بزرگوں کا نام روشن کیا۔ غیرت قومی زندگی کی روح ہے۔ وہ نفع ونقصان سے بالاتر ہے، وہ ہنڈی اور روکڑ، وصول اور باقی، تیزی ومندی، کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ سارے کانوں کی چھپی ہوئی دولت، ساری دنیا کی منڈیاں، ساری دنیا کی صنعتیں، اس کے پاسنگ ہیں۔ اسے بچایئے ورنہ آپ کا یہ سارا نظام منتشر ہوجائے گا۔ شیرازہ بکھر جائے گا۔ آپ فنا ہوجائیں گے۔ ہمارا اہلِ زر سے سوال ہے۔ کیا اب بھی آپ کو اعلانِ جنگ میں تامل ہے؟"

باہر سے صدہا آوازیں آئیں۔ "جنگ! جنگ!"

ایک سیٹھ صاحب نے فرمایا۔ "آپ جنگ کے لیے تیار ہیں؟"

عسکری۔ ہمیشہ سے زیادہ۔"

خواجہ صاحب۔ "آپ کو فتح کا یقین ہے؟"

عسکری۔ "کامل یقین ہے۔"

دور و قریب سے جنگ جنگ کی گرجتی ہوئی پیہم صدائیں آنے لگیں۔ گویا ہمالے کے کسی اتھاہ غار سے ہتھوڑوں کی جھنکار آرہی ہو۔ دار العوام کانپ اٹھا۔ زمین تھرانے لگی۔ رایوں کی تقسیم شروع ہوئی اراکین نے بالاتفاق جنگ کا فیصلہ کیا۔ غیرت جو کچھ نہ کرسکتی تھی۔ وہ نعرۂ خلق نے کر دکھایا۔

(۴)

آج سے تیس سال پہلے ایک زبردست انقلاب نے جے گڈھ کو ہلا ڈالا تھا۔

برسوں تک خانہ جنگیوں کا دور رہا۔ ہزاروں خاندان مٹ گئے۔ سیکڑوں قصبے ویران ہوگئے۔ باپ بیٹے کے خون کا پیاسا تھا۔ بھائی بھائی کی جان کا گاہک۔ جب بالآخر حریت کی فتح ہوئی تواس نے فدائیانِ تاج کو چن چن کر مارا۔ ملک کے زنداں خانے سیاسی فدائیوں سے پر ہوگئے۔ انھیں جانبازوں میں ایک مرزا منصور بھی تھا۔ اسے قنوج کے قلعے میں قید کیا گیا جس کے تین طرف اونچی دیواریں تھیں اور ایک طرف گنگا ندی۔ منصور کو سارے دن ہتھوڑے چلانا پڑتے ۔ صرف شام کو آدھ گھنٹہ کے لیے نماز کی فرصت ملتی تھی۔ اس وقت منصور گنگا کے کنارے آبیٹھتا اور ابنائے وطن کی حالت پر روتا۔ وہ سارا ملکی اور معاشرتی نظام جو اس کے خیال میں قومی نشو و نما کا جزوِ اعظم تھا اس شورش کے سیلاب میں غارت ہورہا تھا۔ وہ ایک آہ سرد بھر کر کہتا۔ جے گڈھ! اب تیرا خدا ہی حافظ ہے۔ تونے خاک کو اکسیر بنایا اور اکسیر کو خاک۔ تونے کسب و جواہر، آداب و اخلاق کو، علم وکمال کو مٹا دیا، پامال کر دیا۔ اب ہم تیرے عناندار ہیں، چرواہے تیرے پاسبان، اور یہے تیرے اراکینِ دربار۔ مگر دیکھ لینا یہ ہوا ہے اور چراوہے اور ساہوکار ایک دن تجھے خون کے آنسو رلائیں گے۔ ثروت اپنی رفتار نہ چھوڑے گی، حکومت اپنا رنگ نہ بدلے گی۔ اشخاص چاہے بدل جائیں لیکن نظام وہی رہے گا۔ یہ تیرے نئے چارہ گر جو اس وقت مجسم انکسار اور حق و انصاف کے پتلے بنے ہوئے ہیں ایک دن نشہ ثروت میں متوالے ہوں گے۔ ان کی سختیاں تاج کی سختیوں سے کہیں زیادہ سخت ہوں گی اور ان کے مظالم اس سے کہیں زیادہ شدید!

انھیں خیالوں میں ڈوبے ہوئے منصور کو اپنے وطن کی یاد آجاتی۔ گھر کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا، معصوم بچے عسکری کی پیاری پیاری صورت آنکھوں میں پھرجاتی جسے تقدیر نے ماں کے ناز و پیار سے محروم کردیا تھا۔ تب منصور ایک آہِ سرد کھینچ کر اٹھ کھڑا ہوتا اور وحشتِ اشتیاق میں اس کا جی چاہتا کہ گنگا میں گود کر پار نکل جاؤں۔

رفتہ رفتہ اس خواہش نے ارادے کی صورت اختیار کی۔ گنگا اُمڈی ہوئی تھی۔ اور چھور کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تند اور گرجتی ہوئی لہریں دوڑتے ہوئے پہاڑوں کے مشابہ تھیں۔ پاٹ دیکھ کر سر میں چکر سا آجاتا تھا۔ منصور نے سوچا ندی اترنے دوں۔ لیکن ندی اترنے کی جگہ کسی ہولناک مرض کی طرح بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ منصور کو یارائے صبر نہ

رہا۔ ایک دن وہ رات کو اٹھا اور اس پُرشور متموج تاریکی میں کود پڑا۔

منصور ساری رات لہروں کے ساتھ زیر وزبر ہوتا رہا، جیسے کوئی ننھا سا طائر طوفان میں تھپیڑے کھا رہا ہو۔ کبھی لہروں پر سوار اچھلتا، جھولتا۔ کبھی ان کی گود میں چھپا ہوا۔ کبھی ایک ریلے میں دس قدم آگے، کبھی ایک دھکے میں دس قدم پیچھے۔ زندگی نقش بر آب کی زندہ مثال! جب وہ ندی کے پار ہوا تو لاشۂ بے جان تھا۔ صرف سانس باقی تھی اور سانس کے ساتھ شوقِ دیدار۔

اس کے تیسرے دن منصور بجے گڈھ جا پہنچا۔ ایک گود میں عسکری تھا اور دوسرے ہاتھ میں اپنی بینوائی کا بقچہ۔ وہاں اس نے اپنا نام مرزا جلال بتلایا۔ وضع وقطع بھی تبدیل کرلی تھی۔ تناور اور سجیلا جوان تھا۔ چہرے پر شرافت اور نجابت کا نور جھلکتا تھا۔ ملازمت کے لیے کسی مزیدسفارش کی ضرورت نہ تھی۔ سپاہیوں میں داخل ہوگیا۔ اور پانچ سال میں اپنے حسنِ خدمات اور اعتماد کی بدولت مندور کے سرحدی کوہستانی قلعہ کا قلعہ دار بنادیا گیا۔

لیکن مرزا جلال کو وطن کی یاد ہمیشہ ستایا کرتی۔ وہ عسکری کو گود میں لے لیتا اور فصیلوں پر چڑھ کر اسے جے گڈھ کے وہ مسکراتے ہوئے سبزہ زار اورمتوالے چشمے اور حلیم بستیاں دکھاتا جن کے سواد قلعے سے نظر آتے تھے۔ اس وقت بے اختیار اس کے جگر سے ایک آہِ سرد نکل جاتی اورآنکھیں آبگوں ہوجاتیں۔ وہ عسکری کو گلے لگا لیتا اور کہتا! بیٹا وہ تمھارا دیس ہے۔ وہی تمھارا اور تمھارے بزرگوں کا آشیانہ ہے۔ تم سے ہوسکے تو اس کا نام روشن کرنا۔ اس کی خدمت کرنا۔ اور کچھ نہ ہو سکے تواس کے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے اپنی عمر ختم کر دینا۔ مگر کبھی اس کی آن میں بٹہ نہ لگانا۔ کبھی اس سے دغا مت کرنا، کیونکہ تم اسی کے آب وگل سے پیدا ہوئے ہو۔ اور تمھارے بزرگوں کی پاک روحیں اب بھی وہاں منڈلا رہی ہیں۔" اس طرح بچپنے سے عسکری کے دل پر وطن کی خدمت اور محبت کا نقش ہوگیا تھا۔ وہ جوان ہوا تو جے گڈھ پر جان دیتا تھا۔ اس کے وقار کا دلدادہ، اس کی ہیبت و شان کا چلہ کش، اس کی سرسبزی کا عامل، اس کے پھریرے کو نئی سرزمینوں میں نصب کرنے کا فدائی۔ بیس سال کا جوانِ رعنا تھا۔ ارادہ مضبوط، حوصلے بلند، ہمت وسیع، قوا آہنی، آکر جے گڈھ کی فوج میں داخل ہوگیا۔ اور اس وقت جے گڈھ سپاہ کا مہر درخشاں بنا ہوا تھا۔

(۵)

جے گڈھ نے الٹی میٹم دے دیا۔ "اگر ۲۴ گھنٹوں کے اندر شیریں بائی جے گڈھ نہ پہنچ جائے گی تو اس کے استقبال کے لیے جے گڈھ کی فوج روانہ ہوگی۔" بجے گڈھ نے جواب دیا۔ "جے گڈھ کی فوج آئے ہم اس کی پیشوائی کے لیے حاضر ہیں۔ شریں بائی جب تک یہاں کی عدالت سے حکم عدولی کی سزا نہ پائے وہ رہا نہیں ہوسکتی۔ اورجے گڈھ کو ہمارے اندورنی معاملات میں دخل دینے کا کوئی مجاز نہیں۔"

عسکری نے منہ مانگی مراد پائی۔ خفیہ طور پر ایک قاصد مرزا جلال کی خدمت میں روانہ کیا اور خط لکھا۔

"آج بجے گڈھ سے ہماری جنگ چھڑ گئی۔ اب خدا نے چاہا تو دنیا جے گڈھ کی تلوار کا لوہا مان جائے گی۔ عسکری ابن منصور بزمِ فاتحان، حاشیہ نشین بن سکے گا۔ اور شاید میری وہ دلی تمنا بھی برآئے جو ہمیشہ میری روح کو تڑپایا کرتی ہے۔ شاید مرزا منصور کو پھر جے گڈھ کے دار العوام میں ایک ممتاز درجے پر بیٹھے ہوئے دیکھ سکوں۔ ہم مندور سے نہ بولیں گے۔ اور آپ بھی ہمیں نہ چھیڑیے گا۔ لیکن اگر خدا نخواستہ کوئی افتاد آہی پڑے تو آپ یہ مہر جس سپاہی یا افسر کو دیکھا دیں گے وہ آپ کی تعظیم کرے گا اور آپ کو بخیریت تمام میرے کیمپ میں پہنچا دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو اس جے گڈھ کے لیے جو آپ کو اتنا پیارا ہے اور اس عسکری کی خاطر جو آپ کا لختِ جگر ہے، آپ تھوڑی سی تکلیف سے (ممکن ہے وہ روحانی تکلیف ہو) دریغ نہ فرمائیں گے۔"

اس کے تیسرے دن جے گڈھ کی فوج نے بجے گڈھ پر حملہ کیا۔ اور مندور سے پانچ میل کے فاصلے پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ بجے گڈھ کو اپنے جہازوں، زہریلے غاروں، دور انداز توپوں کا غرور تھا۔ جے گڈھ کو اپنے سپاہ کی شجاعت اور جفا کشی، فہم اور ادراک کا بھروسہ۔ بجے گڈھ کی سپاہ حکم اور رضا کی غلام تھی۔جے گڈھ والے ذمےّ داری اور تمیز کے قائل۔

ایک مہینے تک شب و روز کشت و خون کے معرکے ہوتے رہے۔ ہمیشہ آگ اور فلزات اور زہریلی ہواؤں کا طوفان سا اٹھا رہتا۔ انسان تھک جاتا تھا، پر کلیں اتھک تھیں۔ جے گڑھیوں کے حوصلے پست ہوگئے۔ متواتر زکیں کھائیں۔ عسکری کو معلوم ہوا کہ

ذمہّ داری فتح میں چاہے معجزے کر دکھائے پر شکست میں میدان حکم ہی کے ہاتھ رہتا ہے۔

جے گڈھ کے اخباروں نے ارباب حل و عقد پر حملے کرنے شروع کیے۔ عسکری ساری قوم کا تودۂ ملامت بن گیا۔ وہی عسکری جس پر جے گڈھ فدا ہوتا تھا سب کی نظروں میں خار ہوگیا۔ یتیموں کے آنسو، بیواؤں کی آہیں، مجروحوں کی جانکاہیاں، تاجروں کی تباہی، قوم کی ذلت، ان سب کا سبب وہی ایک فرد واحد، عسکری تھا۔ قوم کی امامت تختِ زرنگار چاہے ہو، پر پھولوں کا سیج ہرگز نہیں۔

اب جے گڈھ کی جاں بری کی بجز اس کے اور کوئی صورت نہ تھی کہ کسی طرح مخالف سپاہ کا تعلق مندور کے قلعہ سے قطع کر دیا جائے جو سامانِ جنگ و رسد اور رسائل نقل وحرکت کا مرکز تھا۔ مہم دشوار تھی۔ نہایت خطرناک۔ کامیابی کی امید موہوم، ناکامی کا اندیشہ غالب، کامیابی اگر سوکھے دھان کا پانی تھی! تو ناکامی سوکھی دھان کی آگ۔ مگر نجات کی اور کوئی دوسری تدبیر نہ تھی۔ عسکری نے مرزا جلال کو لکھا۔

"پیارے ابا جان! اپنے سابق نیاز نامے میں میں نے جس ضرورت کا اشارہ کیا تھا بدقسمتی سے وہ ضرورت آ پڑی۔ آپ کا پیارا جے گڈھ پنجۂ گرگ میں پھنسا ہوا ہے اور آپ کا پیارا عسکری ورطۂ یاس میں۔ دونوں آپ کی طرف نگاہِ التجا سے تاک رہے ہیں۔

آج ہماری آخری کوشش ہے۔ ہم مخالف سپاہ کو مندور کے قلعہ سے علاحدہ کرنا چاہتے ہیں۔ نصف شب کے بعد یہ معرکہ شروع ہوگا۔ آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ اگر ہم سربکف ہوکر قلعہ کے مقابل تک پہنچ سکیں تو ہمیں آہنی دروازے سے سر ٹکراکر واپس نہ ہونا پڑے۔ ورنہ آپ اپنی قوم کی عزت اور اپنے بیٹے کی لاش کو اسی مقام پر تڑپتے دیکھیں گے۔ اورجے گڈھ آپ کو کبھی معاف نہ کرے گا۔ اس سے آپ کو کتنی ہی ایذا پہنچی ہو مگر آپ اس کے حقوق سے سبکدوش نہیں ہوسکتے۔"

شام ہوچکی تھی۔ میدانِ جنگ ایسا نظر آتا تھا گویا جنگل آگ سے جل گیا ہو۔ بجے گڈھی سپاہ ایک خوں ریز معرکے کے بعد خندقوں میں آرہی تھی۔ مجروحین قلعہ مندور کے شفاخانے میں پہنچائے جارہے تھے۔ توپیں تھک کر چپ ہوگئیں تھیں۔ اسی وقت جے گڈھی سپاہ کے ایک افسر بجے گڈھی وردی پہنے ہوئے عسکری کے خیمے سے

نکلا۔ شکستہ توپیں، سرنگوں طیارے، گھوڑوں کی لاشیں، اوندھی پڑی ہوئی ہوا گاڑیاں اور متحرک پر اعضا شکستہ قلعے اس کے لیے پردے کا کام کرنے لگے۔ ان کی آڑ میں چھپتا ہوا وہ بجے گڈھی مجروحوں کی صف میں جا پہنچا اور چپ چاپ زمین پر لیٹ گیا۔

(۲)

نصف شب گزر چکی تھی۔ مندور کا قلعہ‌دار مرزا جلال قلعے کی فیصیل پر بیٹھا ہوا میدانِ جنگ کا تماشہ دیکھ رہا تھا اور سوچتا تھا کہ عسکری کو مجھے ایسا خط لکھنے کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ اُسے سمجھنا چاہیے تھا کہ جس شخص نے اپنے اصول و عقائد پر اپنی زندگی نثار کردی۔ جلاوطن ہوا اور غلامی کا طوق گردن میں ڈالا، وہ اب اپنے حیات کے دورِ آخر میں جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہوگا، اپنے اصولوں کو نہ توڑے گا۔ خدا کے دربار میں وطن اور فرزند، اور اہلِ وطن ایک بھی ساتھ نہ دیں گے۔ اپنے اعمال کی سزا وجزا آپ ہی بھگتنی پڑے گی۔ روزِ حساب سے کوئی نہ بچا سکے گا۔"

"توبہ! بجے گڑھیوں سے پھر وہی حماقت ہوئی۔ خواہ مخواہ گولہ باری کرکے دشمن کو خبردار کر دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اب ادھر سے بھی جواب دیا جائے گا۔ اور ہزاروں جانیں ضائع ہوں گی۔ شبخوں کے معنی تو یہ ہیں کہ غنیم سر پر آجائے اور کانوں کان خبر نہ ہو، چوطرفہ کھلبلی پڑ جائے۔ مانا کہ موجودہ حالات میں اپنے حرکات کو پوشیدہ رکھنا دشوار ہے۔ اس کا علاج غارِ تاریک سے کرنا چاہیے تھا۔ مگر آج شاید ان کی گولہ باری معمول سے زیادہ شدید ہے۔ بجے گڈھ کی صفوں کو اور متعدد استحکامات کو چیر کر بظاہر ان کا یہاں تک آنا تو محال معلوم ہوتا ہے، لیکن بفرض محال آہی جائیں تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس مسئلے کو طے کیوں نہ کرلوں۔ خوب! اس میں طے کرنے کی بات ہی کیا ہے۔ میرا راستہ صاف ہے۔ میں بجے گڈھ کا نمک خوار ہوں، میں جب خانماںبرباد، خستہ حال، آوارہ وطن تھا تو بجے گڈھ نے مجھے اپنے دامن میں پناہ دی اور میری خدمات کا مناسب اعتراف کیا۔ اس کی بدولت تیس سال تک میری زندگی نیک نامی سے گزری۔ اس سے دغا کرنا حد درجے کی نمک فراموشی ہے، ایسا گناہ جس کی کوئی سزا نہیں، وہ اوپر شور ہورہا ہے۔ ہوائی جہاز ہوں گے۔ وہ گولہ گرا مگر خیریت ہوئی۔ کوئی نہیں تھا۔

"مگر کیا دغا ہر ایک حالت میں گناہ ہے؟ ایسی حالتیں بھی تو ہیں جب دغا وفا سے

بھی زیادہ مستحسن ہوجاتی ہے۔ اپنے دشمن سے دغا کرنا کیا گناہ ہے؟ اپنی قوم کے دشمن سے دغا کرنا کیا گناہ ہے؟ کتنے ہی فعل جو ذاتی حیثیت سے ناقابلِ عفو ہیں، قومی حیثیت سے عین ثواب ہوجاتے ہیں۔ وہی خون بے گناہ جو ذاتی حیثیت سے سخت ترین سزا کا مستوجب ہے، مذہبی حیثیت سے شہادت کا درجہ پاتا ہے اور قومی حیثیت سے فدائیت کا۔ کتنی بے رحمیاں اور سفاکیاں، کتنی دغائیں اور روباہ بازیاں قومی اور مذہبی نقطۂ نگاہ سے محض روا نہیں، فرائض میں داخل ہوجاتی ہیں۔ حال کے یورپی معرکۂ عظیم میں اس کی کتنی ہی مثالیں مل سکتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ ایسی دغاکاریوں سے پرُ ہے۔ اس نئے دور میں ذاتی احساس نیک و بد قومی مصلحت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ قومیت نے ذات کو مٹا دیا ہے۔ ممکن ہے یہی منشائے ایزدی ہو اور خدا کے دربار میں بھی ہمارے افعال قومی معیار ہی پر کسے جائیں۔ یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا میں سمجھتا تھا۔

”پھر عالمِ بالا میں شور ہوا۔ مگر شاید یہ ادھر ہی کے طیارے ہیں۔ آج جے گڈھ والے بڑے دم خم سے لڑ رہے ہیں ادھر والے دبتے نظر آتے ہیں آج یقیناً میدان انھیں کے ہاتھ رہے گا۔ جان پر کھیلے ہوئے ہیں۔ جے گڑھی دلآوروں کے جوہر مایوسی ہی میں خوب کھلتے ہیں، ان کی شکست فتح سے بھی شاندار ہوتی ہے۔ بلاشک عسکری نقل وحرکت کا استاد ہے۔ کس خوبصورتی سے اپنی فوج کا رخ بابِ قلعہ کی طرف پھیر دیا، مگر سخت غلطی کر رہے ہیں، اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہے ہیں۔ سامنے کا میدان دشمن کے لیے خالی کیے دیتے ہیں۔ وہ چاہے توبلا روک ٹوک بڑھ سکتا ہے اور صبح تک جے گڈھ کی سرزمین میں داخل ہوسکتا ہے۔ جے گڑھیوں کے لیے واپسی یا تو غیر ممکن ہے یا نہایت خطرناک، قلعے کا دروازہ نہایت مستحکم ہے۔ فصیلوں کی شگافوں سے ان پر بے شمار بندوقوں کے نشانے پڑیں گے۔ ان کا اس آگ میں ایک گھنٹہ بھی ٹھہرنا ممکن نہیں۔ کیا اتنے ہم وطنوں کی جانیں محض ایک اصول پر، محض روزِ حساب کے خوف پر، محض اپنے اخلاقی احساس پر، قربان کردوں؟ اور محض جانیں ہی کیوں؟ اس سپاہ کی تباہی جے گڈھ کی تباہی ہے۔ کل جے گڈھ کی پاک سرزمین غنیم کے نقارۂ فتح کی صداؤں سے گونج اٹھے گی۔ میری مائیں اور بہنیں اور بیٹیاں اس کی حیا سوز بدعتوں کا شکار ہوں گی، سارے ملک میں قتل اور غارت گری کے ہنگامے برپا ہوں گے، پرانی عداوت اور کدورت کے شعلے بھڑکیں

گے، کنج مرقد میں سوئی ہوئی روحیں دشمن کے قدموں سے پامال ہوں گی، وہ تعمیرات جو ہماری گذشتہ عظمت کی زندہ روایتیں ہیں، وہ یادگاریں جو ہمارے بزرگوں کی تبرکات ہیں، جو ہمارے کارناموں کا دفتر، ہمارے کمالات کا خزانہ، اور ہمارے اکتسابات کی روشن شہادتیں ہیں، جن کی آرائش اور ترتیب اور جامعیت کی دنیا کو قومیں رشک کی نگاہوں سے دیکھتی ہیں وہ نیم وحشی، کندۂ ناتراش لشکریوں کا فرود گاہ بنیں گی اور ان کے جوش انہدام کا شکار۔ کیا اپنی قوم کو ان ستم شعاریوں کا تختۂ مشق بننے دوں؟ محض اس لیے کہ میرا پیمانِ وفا نہ ٹوٹے!

"اف! یہ قلعے میں زہریلے گیس کہاں سے آگئے۔ کسی جے گڑھی طیارے کی حرکت ہوگی۔ سر میں چکر سا آرہا ہے۔ یہاں سے کمک بھیجی جارہی ہے۔ فصیل کی روزنوں میں بھی توپیں چڑھائی جارہی ہیں۔ جے گڑھ والے قلعہ کے سامنے آگئے۔ ایک دھاوے میں وہ بابِ ہمایوں تک آپہنچیں گے۔ بجے گڑھ والے اس سیلاب کو اب نہیں روک سکتے۔ جے گڑھ والوں کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔ یا اللہ کسی طرح دروازہ خود بخود کھل جاتا، کوئی جے گڑھی ہوا باز آکر مجھ سے بزور کنجی چھین لیتا، مجھے ہلاک کر ڈالتا۔ آہ! میرے اتنے عزیز ہم وطن، پیارے بھائی، ایک آن میں تودۂ خاک ہوجائیں گے۔ اور میں بے بس ہوں۔ ہاتھوں میں زنجیر ہے، پیروں میں بیڑیاں، ایک ایک رویاں رسیوں سے جکڑا ہوا ہے۔ کیوں نہ اس زنجیر کو توڑ دوں، ان بیڑیوں کے ریزے ریزے کردوں، اور دروازے کے دونوں بازو اپنے عزیز فاتحوں کے خیرمقدم کے لیے کھول دوں۔ بالفرض یہ گناہ سہی۔ پر یہ موقع گناہ سے ڈرنے کا نہیں۔ جہنم کے مارِ آتشیں، اور خون آشام بہائم اور لپکتے ہوئے شعلے میری روح کو تڑپائیں، کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر محض میری روح کی تباہی میرے قوم اور وطن کو قعرِ ہلاکت سے بچا سکے تو وہ مبارک ہے۔ بجے گڑھ نے زیادتی کی ہے۔ اس نے محض جے گڑھ کو ذلیل کرنے کے لیے، محض اس کے اشتعال کے لیے شیریں بائی کو شہر بدر ہونے کا حکم جاری کیا۔ جو سراسر ناروا تھا۔ ہائے افسوس! میں نے اسی وقت استعفا کیوں نہ دے دیا۔ اور اس قفسِ اطاعت سے کیوں نہ نکل گیا۔

ہائے غضب جے گڑھی سپاہ خندقوں تک پہنچ گئی۔ خدا ان جانبازوں پر رحم کر ان کی مدد کر کلدار توپوں سے گولے کیسے برس رہے ہیں گویا آسمان کے بیشمار تارے ٹوٹے

پڑتے ہیں۔ اُلاماں باب ہمایوں پر گولوں کی کیسی ضربیں پڑرہی ہیں۔ کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ کاش دروازہ ٹوٹ جاتا۔ ہائے میرا عسکری، لختِ جگر، وہ گھوڑے پر سوار دوڑا آرہا ہے۔ کیسا شجاع، کیسا جانباز، کیسا قوی ہمت، آہ! مجھ روسیاہ کو موت کیوں نہیں آجاتی، میرے سر پر کوئی گولہ کیوں نہیں آگرتا۔ جس پودے کو اپنے خون جگر سے پالا۔ جو میری خزاں نصیب زندگی کا سدا بہار تھا۔ ہائے جو میرے شبِ تار کا چراغ، میری زندگی کی امید، میرے وجودِ کائنات، میری آرزو کی انتہا تھا۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے آگ کے بھنور میں پڑا ہوا ہے اور میں حرکت نہیں کرسکتا۔ اس قاتل زنجیر کو کیونکر توڑوں؟ اس دلِ سرکش کو کیونکر سمجھاؤں؟ مجھے روسیاہ بننا منظور ہے۔ مجھے دوزخ کی عقوبتیں سہنی منظور ہیں، میں ساری دنیا کے گناہ کا بار سر پر لینے کو تیار ہوں۔ صرف اسوقت مجھے گناہ کرنے کی، پیمانِ وفا توڑنے کی، نمک حرام بننے کی توفیق عطا کر، ایک لمحے کے لیے مجھے گنہ گار بنادے۔ مجھے مدہوش کردے، نیک و بد کا احساس میرے دل سے مٹا دے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شیطان کے حوالے کردے۔ میں نمک حرام بنوں گا، دغاباز بنوں گا، پرقوم فروش نہیں بن سکتا!

"آہ! ظالم سرنگیں اڑانے کی تیاری کررہے ہیں۔ سپہ سالار نے حکم دے دیا۔ وہ تین آدمی تہہ خانے کی طرف چلے۔ جگر کانپ رہا ہے۔ جسم میں رعشہ آرہا ہے، یہ آخری موقع ہے۔ ایک لمحہ اور بس! پھر تاریکی ہے اور تباہی، ہائے ان منحرف اعضا میں اب بھی حرکت نہیں ہوتی، یہ خون اب بھی نہیں گرم ہوتا، آہ! وہ دھماکے کی آواز ہوئی۔ خدا کی پناہ زمین میں لرزہ آگیا۔ ہائے عسکری عسکری! رخصت، میرے پیارے بیٹے رخصت! اس ظالم بے رحم باپ نے تجھے اپنی وفا پر قربان کردیا۔ میں تیرا باپ نہ تھا۔ تیرا دشمن تھا۔ میں نے تیرے گلے پر چھری چلائی۔ اب دھواں صاف ہوگیا۔ آہ! وہ فوج کہاں ہے جو سیلاب کی طرح بڑھتی آئی تھی اور ان دیواروں سے ٹکرارہی تھی؟ خندقیں لاشوں سے بھری پڑی ہیں۔ اور وہ جس کا میں دشمن تھا، جس کا قاتل، وہ بیٹا، وہ میرا دُلارا عسکری کہاں ہے؟ کہیں نظر نہیں آتا...... آہ! آہ!

اردو ماہنامہ زمانہ نومبر 1918 میں شائع ہوئی۔ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں 'وفا کا خنجر' کے عنوان سے گپت دھن 1 میں شامل ہے۔

سچائی کا اُپہار

تحصیل مدرسہ براؤں کے پرتھم ادھیاپک منشی بھوانی سہائے کو باغبانی کا کچھ زیادہ وِیسن (شوق) تھا۔ کیاریوں میں بھانتی بھانتی کے پھول اور پتیاں لگا رکھی تھیں۔ دروازوں پر لتائیں چڑھادی تھیں۔ اس سے مدرسے کی شوبھا ادھیک ہو گئی تھی۔ وہ مڈل ککشا کے لڑکوں سے بھی اپنے باغیچے کے سینچنے اور صاف کرنے میں مدد لیا کرتے تھے۔ ادھیکانش لڑکے اس کام کو روچی پوروک (رغبت کے ساتھ) کرتے۔ اس سے ان کا منورنجن ہوتا تھا۔ کِنتو (لیکن) درجے میں چار پانچ لڑکے زمینداروں کے تھے۔ ان میں کچھ ایسی دُرجنتا (کمینگی) تھی کہ یہ منورنجک کاریہ بھی انھیں بے گار پرتیت (معلوم) ہوتا۔ انھوں نے بالیہ کال سے آلسیہ (کاہلیت) میں جیون وتیت (بسر) کیا تھا۔ امیری کا جھوٹا ابھیمان دل میں بھرا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ سے کوئی کام کرنا نِندا کی بات سمجھتے تھے۔ انھیں اس باغیچے سے گھرنا (نفرت) تھی۔ جب ان کے کام کرنے کی باری آتی تو کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اُڑ جاتے۔ اتنا ہی نہیں دوسرے لڑکوں کو بھی بہکاتے اور کہتے واہ! پڑھیں فارسی بیچیں تیل۔ یدی (اگر) کھرپی، کدال ہی کرنا ہے تو مدرسے میں کتابوں سے سر مارنے کی کیا ضرورت؟ یہاں پڑھنے آتے ہیں کچھ مزدوری کرنے نہیں آتے۔ منشی جی اس اوگیاں (نافرمانی) کے لیے انھیں کبھی کبھی ڈنڈ دے دیتے تھے۔ اس سے ان کا دِویش (عداوت) اور بڑھتا تھا۔ اَنت میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دن ان لڑکوں نے صلاح کر کے اس پُشپ واٹیکا (باغیچہ) کو وِدھونس (برباد) کرنے کا نشچیہ (ارادہ) کیا۔ دس بجے مدرسہ لگتا تھا۔ کِنتو (لیکن) اس دن وہ آٹھ ہی بجے آ گئے اور باغیچے میں گھس کر اسے اجاڑنے لگے۔ کہیں پودے اکھاڑ پھینکے، کہیں کیاریوں کو روند ڈالا۔ پانی کی نالیاں توڑ ڈالیں۔ کیاریوں کی میڑیں کھود ڈالیں۔ مارے بھئے کے چھاتی دھڑک

رہی تھی کہ کوئی دیکھتا نہ ہو۔ لیکن ایک چھوٹی سی پھلواری کو اجاڑتے کتنے دیر لگتی ہے۔ دس منٹ میں ہرا بھرا باغ نشٹ ہو گیا۔ تب یہ لڑکے شیگھر تا (جلدی) سے نکلے۔ لیکن دروازے تک آئے تھے کہ انھیں اپنے ایک سہہ پاٹھی کی صورت دکھائی دی۔ یہ ایک دبلا پتلا دریدر (مفلس) اور چتر (چالاک) لڑکا تھا۔ اس کا نام باج بہادر تھا۔ بڑا گمبھیر شانت لڑکا تھا۔ اُدھم پارٹی کے لڑکے اس سے جلتے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ان کا رقت (خون) سوکھ گیا۔ وِشواس ہو گیا کہ اس نے ضرور دیکھ لیا۔ یہ منشی جی سے کہے بنا نہ رہے گا۔ بُرے پھنسے، آج کشل نہیں ہے۔ یہ راکشش اس سمے یہاں کیا کرنے آیا تھا۔ آپس میں اشارے ہوئے۔ یہ صلاح ہوئی کہ اسے مِلا لینا چاہیے۔ جگت سنگھ ان کا مکھیا تھا۔ آگے بڑھ کر بولا۔ باج بہادر سویرے کیسے آ گئے؟ ہم نے تو آج تم لوگوں کے گلے کی پھانسی چھُوڑا دی۔ لالا بہت دق کیا کرتے تھے۔ یہ کرو۔ وہ کرو۔ مگر یار دیکھو کہیں منشی جی سے جڑمت دینا نہیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

جے رام نے کہا۔ کہہ کیا دیں گے اپنے ہی تو ہیں۔ ہم نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ سب کے لیے کیا ہے۔ کیول (صرف) اپنی بھلائی کے لیے نہیں۔ چلو یار تمھیں بازار کی سیر کرا دوں منھ میٹھا کرا دیں۔

باج بہادر نے کہا۔ نہیں مجھے آج گھر پر پاٹھ یاد کرنے کا اوکاش (موقعہ) نہیں ملا۔ یہیں بیٹھ کر پڑھوں گا۔

جگت سنگھ۔ اچھا منشی جی سے کہو گے تو نہ؟

باج بہادر۔ میں سویم (خود) کچھ نہ کہوں گا لیکن انھوں نے مجھ سے پوچھ لیا تو؟

جگت سنگھ۔ کہہ دینا مجھے نہیں معلوم۔

باج بہادر۔ یہ جھوٹ مجھ سے نہ بولا جائے گا۔

جے رام۔ اگر تم نے چغلی کھائی اور ہمارے اوپر مار پڑی تو ہم تمھیں پیٹے بنا نہ چھوڑیں گے۔

باج بہادر۔ ہم نے کہہ دیا کہ چغلی نہ کھائیں گے لیکن منشی جی نے پوچھا تو جھوٹ بھی نہ بولیں گے۔

جے رام۔ تو ہم تمہاری ہڈیاں بھی توڑ دیں گے۔

باج بہادر۔ اس کا تمھیں ادھیکار ہے۔

(۲)

دس بجے جب مدرسہ لگا اور منشی بھوانی سہائے نے باغ کی یہ دُردَشا دیکھی تو کرودھ سے آگ ہو گئے۔ باغ کے اُجڑنے کا اتنا کھید (دکھ) نہ تھا جتنا لڑکوں کی شرارت کا۔ یدی (اگر) کسی سانڈ نے یہ دشکرتیہ (تباہی) کیا ہوتا تو وہ کیول (صرف) ہاتھ مل کر رہ جاتے۔ کِنتو (لیکن) لڑکوں کے اس آتیاچار کو سہن نہ کرسکے۔ جوں ہی لڑکے درجے میں بیٹھ گئے۔ وہ تیور بدلے ہوئے آئے اور پوچھا۔ یہ باغ کس نے اجاڑا ہے؟

کمرے میں سناٹا چھاگیا۔ اَپرادھیوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ مڈل ککشا (درجہ) کے پچیس ودھیارتھیوں (طالب علموں) میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس گھٹنا کو نہ جانتا ہو۔ کِنتو (لیکن) کسی میں یہ ساہس (جرأت) نہ تھی کہ اٹھ کر صاف صاف کہہ دے۔ سب سر جھکائے مون دھارن کیے بیٹھے تھے۔

منشی جی کا کرودھ (غصہ) اور بھی پرچنڈ (تیز) ہوا۔ چلّا کر بولے۔ مجھے وشواس ہے کہ تمھیں لوگوں میں کسی کی شرارت ہے۔ جسے معلوم ہوئے اسپشٹ (ظاہر) کردے۔ نہیں تو میں ایک سرے سے پیٹنا شروع کروں گا پھر کوئی یہ نہ کہے کہ ہم نرپرادھ (بے قصور) مارے گئے۔

ایک لڑکا بھی نہ بولا وہی سناٹا۔

منشی۔ دیوی پرساد تم جانتے ہو؟

دیوی۔ جی نہیں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔

شیوداس۔ تم جانتے ہو؟

جی نہیں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔

باج بہادر تم کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔

باج بہادر کھڑا ہوگیا اس

نیتروں (آنکھوں) میں ساہس جھلک رہ

اَپرادھیوں نے باج بہادر کی اُور ر

میں کہا۔ اچھا۔

بھوانی سہائے بڑے دھیریہ وان منش تھے۔ یتھا شکتی (حسبِ طاقت) لڑکوں کو یاتنا (سزا) نہیں دیتے تھے۔ کِنتو ایسی دُشٹتا (رذالت) کا ڈنڈ دینے میں وہ لیش ماتر (تھوڑا سا) بھی دَیا (رحم) نہ دکھاتے تھے۔ چھڑی منگا کر پانچوں اَپرادھیوں کو دس دس چھڑیاں لگائیں۔ سارے دن بینچ پر کھڑا رکھا اور چال چلن کے رجسٹر میں ان کے نام کے سامنے کالے چِنہ بنا دیئے۔

باج بہادر سے شرارت پارٹی والے لڑکے یونہی جلا کرتے تھے۔ آج اس کی سچائی کے کارن اس کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ یِنترنا (دکھ) میں سہانوبھوتی (ہمدردی) پیدا کرنے کی شکتی ہوتی ہے۔ اس سمے درجے کے اَدھیکانش (زیادہ) لڑکے اَپرادھیوں کے مِتر ہو رہے تھے۔ ان میں شڈینتر (سازش) رَچا جانے لگا کہ آج باج بہادر کی خبر لی جائے۔ ایسا مارو کہ پھر مدرسہ میں منھ نہ دکھاوے۔ یہ ہمارے گھر کا بھیدی ہے۔ دغاباز بڑا سچے کی دُم بنا ہے۔ آج سچائی کا حال معلوم ہوجائے گا۔ بے چارے باج بہادر کو اس گُپت لیلا کی ذرا بھی خبر نہ تھی۔ وِدْروہیوں (باغیوں) نے اسے اندھکار میں رکھنے کا پورا یَتن (کوشش) کیا تھا۔ چھٹی ہونے کے بعد باج بہادر گھر کی طرف چلا۔ راستے میں ایک امرود کا باغ تھا۔ وہاں جگت سنگھ اور جے رام کئی لڑکوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ باج بہادر چونکا۔ سمجھ گیا کہ یہ لوگ مجھے چھیڑنے پر اُتارو ہیں۔ کِنتو بچنے کا کوئی اُپائے نہ تھا۔ کچھ ہچکتا ہوا آگے بڑھا۔ جگت سنگھ بولا۔ آؤ لالا! بہت راہ دکھائی۔ آؤ سچائی کا انعام لیتے جاؤ۔

باج بہادر۔ راستے سے ہٹ جاؤ۔ مجھے جانے دو!

جے رام۔ ذرا سچائی کا مزہ تو چکھتے جایئے۔

باج بہادر۔ میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ جب میرا نام لے کر پوچھیں گے تو میں بتا دوں گا۔

جے رام۔ ہم نے بھی تو کہہ دیا تھا کہ تمھیں اس کام کا انعام دیئے بنا نہ چھوڑیں گے۔

یہ کہتے ہی وہ باج بہادر کی طرف گھونسا تان کر بڑھا جگت سنگھ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑنے چاہے۔ جے رام کا چھوٹا بھائی شیورام اُمرود کی ایک ہینٹ لے کر جھپٹا۔ شیش (باقی) لڑکے چاروں طرف کھڑے ہوکر تماشہ دیکھنے لگے۔ یہ ریزرو (زائد) سینا تھی جو

آوشیکتا (ضرورت) پڑنے پر مترِدل کی سہایتا کے لیے تیار تھی۔ باج بہادر دُربل (کمزور) لڑکا تھا۔ اس کی مرمت کرنے کو وہ تین مضبوط لڑکے کافی تھے۔ سب لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ چھن (لمحہ) بھر میں یہ تینوں اسے گرالیں گے۔ باج بہادر نے جب دیکھا کہ شترُوں نے ششتر پرہار (اسلحے سے حملہ) کرنا شروع کردیا تو اس نے کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا تب تیزی سے جھپٹ کر شیورام کے ہاتھ سے اُمرود کی ٹہنی چھین لی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر ٹہنی تانے ہوئے بولا۔ تم مجھے سچائی کا انعام یا سزا دینے والے کون ہوتے ہو؟

دونوں اُور سے داؤں پیچ ہونے لگا۔ باج بہادر تھا تو کمزور پر اَتینت چپل (انتہائی تیز) اور سترک (ہوشیار) اس پر ستیہ کا وشواس ہردیے کو اور بھی بلوان بنائے ہوئے تھا۔ ستیہ چاہے، سر کٹا دے لیکن قدم پیچھے نہیں ہٹاتا۔ کئی منٹ تک باج بہادر اچھل اچھل کر وار کرتا اور ہٹاتا رہا۔ لیکن اُمرود کی ٹہنی کہاں تک تھام سکتی۔ ذرا دیر میں اس کی دھجّیاں اُڑ گئیں۔ جب تک وہ اس کے ہاتھ میں رہی تلوار رہی کوئی اس کے نِکٹ آنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ نہتھا (خالی ہاتھ) ہونے پر وہ ٹھوکروں اور گھونسوں سے جواب دیتا رہا۔ مگر اَنت میں اَدھِیک (زیادہ) سنکھیا نے وِجے پائی۔ باج بہادر کی پسلی میں شیورام کا ایک گھونسا ایسا پڑا کہ وہ بے دم ہوکر گر گیا پڑا۔ آنکھیں پتھرا گئیں اور مورچھا (غشی) سی آگئی۔ شترُوں (دشمنوں) نے یہ دَشا دیکھی تو ان کے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے۔ سمجھے اس کی جان نکل گئی بے تحاشا بھاگے۔

کوئی دس منٹ کے پیچھے باج بہادر سچیت ہوا۔ کلیجے پر چوٹ لگ گئی! گھاؤ اُوچھا پڑا تھا۔ تِس پر بھی کھڑے ہونے کی شکتی نہ تھی۔ ساہس کرکے اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا گھر کی اُور چلا۔

ادھر یہ وِجے دَل بھاگتے بھاگتے جئے رام کے مکان پر پہنچا۔ راستے ہی میں سارا دَل تتر۔بیتر ہوگیا۔ کوئی ادھر سے نکل بھاگا۔ کوئی اُدھر سے۔ کٹھن سمسیا (مشکل مسئلہ) آ پڑی تھی۔ جئے رام کے گھر تک کیول (صرف) تین سُدرڑھ (مستحکم) لڑکے پہنچے۔ وہاں پہنچ کر ان کی جان میں جان آئی۔

جے رام۔ کہیں مر نہ گیا ہو۔ میرا گھونسا بیٹھ گیا تھا۔

جگت سنگھ۔ تمھیں پسلی میں نہیں مارنا تھا۔ اگر تلّی پھٹ گئی ہوگی تو نہ بچے گا۔

جے رام۔ یار میں نے جان کے تھوڑے ہی مارا تھا۔ سنیوگ ہی تھا۔ اب بتاؤ کیا کیا جائے؟
جگت۔ کرنا کیا ہے چپ چاپ بیٹھے رہو۔
جے رام۔ کہیں میں اکیلا تو نہ پھنسوں گا۔
جگت۔ اکیلے کون پھنسے گا۔ سب کے ساتھ چلیں گے۔
جے رام۔ اگر باج بہادر مرا نہیں ہے تو اُٹھ کر سیدھے منشی جی کے پاس جائے گا۔
جگت۔ اور منشی جی کل ہم لوگوں کی کھال اَوشیہ (یقیناً) اودھڑیں گے۔
جے رام۔ اسی لیے میری صلاح ہے کہ کل مدرسے جاؤ ہی نہیں۔ نام کٹا کے دوسری جگہ چلے چلیں۔ نہیں تو بیماری کا بہانہ کرکے بیٹھے رہیں۔ مہینے مہینے دو مہینے کے بعد جب معاملہ ٹھنڈا پڑجائے گا تو دیکھا جائے گا۔
شیورام۔ اور جو پریکشا ہونی والی ہے۔
جے رام۔ او۔ ہو۔ اس کا تو خیال ہی نہ تھا۔ ایک ہی مہینہ تو اور رہ گیا ہے۔
جگت۔ تمھیں اب کی ضرور وظیفہ ملتا۔
جے رام۔ ہاں میں نے بہت پریشرم کیا تھا۔ تو پھر؟
جگت۔ کچھ نہیں ترقی تو ہو ہی جائے گی۔ وظیفے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔
جے رام۔ باج بہادر کے ہاتھ لگ جائے گا۔
جگت۔ بہت اچھا ہوگا بے چارے نے مار بھی تو کھائی ہے۔

دوسرے دن مدرسہ لگا۔ جگت سنگھ، جے رام اور شیو رام تینوں غائب تھے۔ ولی محمد پیر میں پٹّی باندھے آئے تھے۔ لیکن بھئے کے مارے بُرا حال تھا۔ کل درشک گن بھی تھرتھرا رہے تھے کہ کہیں ہم لوگ بھی گیہوں کے ساتھ گھُن کی طرح نہ پس جائیں۔ باج بہادر نیما نوسار (حسبِ معمول) اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ مانو اسے کل کی باتیں یاد ہی نہیں ہیں۔ کسی نے ان کی چرچا نہ کی۔ ہاں آج وہ اپنے سوبھاؤ کے پرتی کول (برعکس) کچھ پرسنّ چیت (خوش دل) دکھ پڑتا تھا۔ وشیشتہ (خاص کر) کل کے یودھاؤں (جنگجوؤں) سے وہ ادھیک ہلا ملا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ لوگ میری اُور سے نہہ سنک ہوجائیں رات بھر کی وِیویچنا (تفتیش) کے پشچات (بعد) اس نے یہی نشچے کیا تھا۔ اور جب سندھیا کے وہ گھر چلا تو اسے اپنی اُودارتا (رواداری) کا پھل مل چکا تھا۔ اس کے شترو لجّیت

(شرمندہ) تھے اور اس کی پُرشنسا (تعریف) کرتے تھے۔

مگر وہ تینوں اَپرادھی دوسرے دن بھی نہ آئے۔ تیسرے دن بھی ان کا کہیں پتہ نہ تھا وہ گھر سے مدرسے کو چلتے لیکن دیہات کی طرف نکل جاتے۔ وہاں دن بھر کسی بریکچھ (درخت) کے نیچے بیٹھے رہتے۔ اَتھوا (یا) گلّی ڈنڈے کھیلتے۔ شام کو گھر چلے آتے۔

انھوں نے یہ پتہ لگا لیا تھا کہ اس سَمر (جنگ) کے اَنیہ (دیگر) سبھی یودھاگن (جنگجو گروہ) مدرسے آتے ہیں اور منشی جی ان سے کچھ نہیں بولتے۔ کِنتو (لیکن) چِت سے شنکا دور نہ ہوتی تھی۔ باج بہادر نے ضرور کہا ہوگا۔ ہم لوگوں کے جانے کی دیر ہے۔ گئے اور بے بھاؤ کی پڑی۔ یہی سوچ کر مدرسے آنے کا ساہس (ہمّت) نہ کرسکتے۔

(۴)

چوتھے دن پراتہ کال تینوں اپرادھی بیٹھے سوچ رہے تھے کہ آج کدھر چلنا چاہیے۔ اتنے میں باج بہادر آتا ہوا دکھائی دیا۔ ان لوگوں کو آشچریہ (تعجب) تو ہوا۔ پرنتو (مگر) اسے اپنے دوّار پر آتے دیکھ کر کچھ آشا بندھ گئی۔ یہ لوگ ابھی بولنے بھی نہ پائے تھے کہ باج بہادر نے کہا۔ کیوں مِترو تم لوگ مدرسے کیوں نہیں آتے؟ تین دن سے غیر حاضری ہورہی ہے۔

جگت۔ مدرسے کیا جائیں جان بھاری پڑی ہے؟ منشی جی ایک ہڈی بھی نہ چھوڑیں گے۔

باج بہادر۔ کیوں ولی محمد، دُرگا سبھی تو جاتے ہیں۔ منشی جی نے کسی سے بھی کچھ کہا؟

جے رام۔ تم نے ان لوگوں کو چھوڑ دیا ہوگا۔ لیکن ہمیں بھلا تم کیوں چھوڑنے لگے۔ تم نے ایک ایک کی تین تین جڑی ہوگی۔

باج بہادر۔ آج مدرسے چل کر اس کی پریکشا ہی کرلو۔

جگت۔ یہ جھانسے رہنے دیجیے۔ ہمیں پٹوانے کی چال ہے۔

باج ۔ تو میں کہیں بھاگا تو نہیں جاتا؟ اس دن سچائی کا سزا دی تھی۔ آج جھوٹ کا انعام دے دینا۔

جے رام۔ سچ کہتے ہو تم نے شکایت نہیں کی۔

باج۔ شکایت کی کون بات تھی۔ تم نے مجھے مارا۔ میں نے تمھیں مارا۔ اگر تمھارا گھونسا نہ پڑتا تو میں تم لوگوں کو رَن چھیتر (میدانِ جنگ) سے بھگا کر دم لیتا۔ آپس کے

جھگڑوں کی شکایت کرنے کی میری عادت نہیں ہے۔
جگت۔ چلوں تو یار لیکن وشواس نہیں آتا۔ تم ہمیں جھانسے دے رہے ہو کچومر نکلوا لوگے۔
باج۔ تم جانتے ہو جھوٹ بولنے کی میری بان نہیں ہے۔

یہ شبد باج بہادر نے ایسی وشواسوتپادک (اعتماد پیدا کرنے والا طریقہ) سے کہے کہ ان لوگوں کا بھرم دور ہوگیا۔ باج بہادر کے چلنے آنے کے پشچات (بعد) تینوں دیر تک اس کی باتوں کی وِیوچنا (تفتیش) کرتے رہے۔ انت میں یہی نشچے ہوا کہ آج چلنا چاہیے۔

ٹھیک دس بجے تینوں مِتر مدرسے پہنچ گئے۔ کِنتو (لیکن) چت میں آشنکِت تھے۔ چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ منشی جی کمرے میں آئے۔ لڑکوں نے کھڑے ہوکر ان کا سواگت کیا انھوں نے تینوں مِترو کی اُور تیبر درِشٹی (تیز نظر) سے دیکھ کر کیول (صرف) اتنا کہا۔ تم لوگ تین دن سے غیر حاضر ہو۔ دیکھو درجے میں جو امتحان سوال ہوئے ہیں انھیں نقل کرلو۔ پھر پڑھنے میں مگن ہوگئے۔

(۵)

جب پانی پینے کے لیے لڑکوں کو آدھے گھنٹے کا اوکاش (وقفہ) ملا تو تینوں مِتر اور ان کے سہہ یوگی جمع ہوکر باتیں کرنے لگے۔
جے رام۔ ہم تو جان پر کھیل کر مدرسے آئے تھے۔ مگر باج بہادر ہے بات کا دھنی۔
ولی محمد۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے وہ آدمی نہیں دیوتا ہے۔ یہ آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے کبھی اس پر وشواس نہ آتا۔
جگت۔ بھلمنسی (ملنسار) اسی کو کہتے ہیں ہم سے بڑی بھول ہوئی کہ اس کے ساتھ ایسا اَنیائے کیا۔
دُرگا۔ چلو اس سے چھما مانگیں۔
جے رام۔ ہاں، یہ تمھیں خوب سوجھی۔ آج ہی۔

جب مدرسہ بند ہوا تو درجے کے سب لڑکے مل کر باج بہادر کے پاس گئے۔ جگت سنگھ ان کا نیتا بن کر بولا۔ بھائی صاحب۔ ہم سب کے سب تمھارے اَپرادھی ہیں تمھارے ساتھ ہم لوگوں نے جو اَتیاچار (زیادتی) کیا ہے۔ اس پر ہم ہردیئے (دل) سے لجت (شرمندہ) ہیں۔ ہمارا اَپرادھ چھما کرو تم سجّنتا (شرافت) کی مورتی ہو۔ ہم لوگ اُجڈّھ، گنوار

اور مورکھ (بے وقوف) ہیں۔ ہمیں اب چھما پردان (عطا) کرو۔

باج بہادر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولا میں پہلے بھی تم لوگوں کو اپنا بھائی سمجھتا تھا اور اب بھی وہی سمجھتا ہوں۔ بھائیوں کے جھگڑے میں چھما کیسی؟

سب کے سب اس کے گلے ملے۔ اس کی چرچا سارے مدرسے میں پھیل گئی۔ سارا مدرسہ باج بہادر کی پوجا کرنے لگا۔ وہ اپنے مدرسے کا مکھیا، نیتا اور سرمور (سردار) بن گیا۔

پہلے اسے سچائی کا دنڈ ملا اب کی سچائی کا اُپہار ملا۔

ہندی میں پہلی بار، ہندی مجموعہ پریم پورنما میں شائع ہوا اور مان سروور 8 میں شامل ہے اردو کے کسی مجموعے میں نہیں ہے۔یہاں ہندی سے رسم خط بدل کر پیش کیا جا رہا ہے۔

بینک کا دیوالہ

لکھنؤ انڈسٹریل بینک کے وسیع دفتر میں لالہ سائیں داس آرام کرسی پر لیٹے ہوئے اِنوسٹرس ریویو کا مطالعہ کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب کے معاملہ داروں کو منافع کہاں سے دیا جائے گا۔ چائے، کوئلے یا جوٹ کے حصے خریدنے یا چاندی سونے اور روئی کا سٹہ کرنے کا ارادہ کرتے۔ مگر نقصان کا اندیشہ کوئی فیصلہ قائم نہ ہونے دیتا تھا۔ غلے کے کاروبار میں اب کے بڑا خسارہ رہا۔ حصہ داروں کی تشفی و اطمینان کے لیے فرضی حسابات تیار کرنا پڑے اور منافع اصل روپے سے دینا پڑا۔ اس وجہ سے پھر غلے کے کام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے روح کانپتی تھی۔

مگر روپے کا بے کار رکھنا غیر ممکن تھا۔ دو ایک روز میں اس کے استعمال کی کوئی نہ کوئی صورت نکالنی لازمی تھی۔ کیونکہ ڈائرکٹروں کا سہ ماہی اجلاس ایک ہی ہفتے میں ہونے والا تھا اور اگر اس وقت تک کوئی فیصلہ نہ ہوسکا تو پھر آئندہ تین ماہ تک کچھ نہ ہوسکے گا۔ اور ششماہی تقسیمِ منافع کے موقع پر پھر وہی فرضی کاروائی کرنا پڑے گی جس کا متواتر متحمل ہونا بینک کے لیے دشوار تھا۔ بہت دیر تک اسی خلجان میں پڑے رہنے کے بعد سائیں داس نے گھنٹی بجائی اور بغل کے دوسرے کمرے سے ایک بنگالی بابو نے سر نکال کر جھانکا۔

سائیں داس۔ ''ٹاٹا اسٹیل کمپنی کو ایک خط لکھ دیجیے کہ وہ اپنا حال کا بیلنس شیٹ بھیج دیں۔''

بابو۔ ''ان لوگوں کو روپے کا گرج نہیں۔ چٹھی کا جباب نہیں دیتا۔''

سائیں داس۔ ''اچھا ناگپور کے سودیشی مل کو لکھیے۔''

بابو۔ ''اس کا کاروبار اچھا نہیں ہے۔ ابھی اس کے مجوروں نے ہڑتال کیا تھا۔ دو مہینہ تک مل بند رہا۔''

سائیں داس۔ "اجی تو کہیں لکھو بھی۔ تمھارے خیال میں تو ساری دنیا بے ایمانوں سے بھری ہوئی ہے۔"

بابو۔ "بابا لکھنے کو تو ہم سب جگہ لکھ دیں۔ مگر کھالی لکھ دینے سے کچھ فائدہ تو نہیں ہوتا۔"

لالہ سائیں داس اپنے خاندانی رسوخ کے باعث بینک کے مینجنگ ڈائرکٹر ہوگئے تھے۔ مگر کاروباری دنیا سے بہت واقفیت نہ رکھتے تھے۔ یہی بنگالی بابو ان کے مشیر خاص تھے۔ اوربابو صاحب کو کسی کارخانے یا کمپنی پر اعتماد نہ تھا۔ انھیں کی بزدلانہ احتیاط کے باعث پچھلے سال بینک کا روپیہ صندوق سے باہر نہ نکل سکا تھا۔ اور اب وہی صورت درپیش تھی۔ سائیں داس کو اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی تدبیر نہ سوجھی تھی اور نہ اتنی ہمت تھی کہ اپنی ذمہ داری پر کسی کاروبار میں بے خوف ہوکر کود پڑیں۔ پریشانی کے عالم میں اٹھ کرکمرے میں ٹہلنے لگے کہ دربان نے آکر خبر دی کہ "برہل کی رانی صاحبہ کی سواری آئی ہے۔"

(۲)

لالہ سائیں داس چونک پڑے۔ برہل کی رانی صاحبہ کو لکھنؤ آئے تین چار دن ہوئے تھے اورہر ایک زبان پر انھیں کے چرچے تھے۔ کوئی ان کی سادگی اور نفاست پر قربان تھا، کوئی ان کے حسنِ صورت پر، کوئی ان کی آزاد روی پر۔ یہاں تک کہ ان کی کنیزیں، باڈی گارڈ سپاہی وغیرہ بھی اس عام توجہ کے شریک تھے۔ رائل ہوٹل کے دروازے پر تماشائیوں کا ایک ہجوم سا لگا رہتا۔ کتنے ہی دیدہ باز بے فکرے لوگ عطر فروش، بزاز، تمباکوگر کا روپ بھربھرکے ان کی خدمت میں باریاب ہوچکے تھے۔ جس طرف سے رانی صاحبہ کی سواری نکل جاتی، تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے ہوجاتے تھے۔ واللہ کیا شان ہے! ایسی عراقی جوڑی لاٹ صاحب کے سوا اور کسی راجا رئیس کے ہاں تو شاید ہی نکلے۔ اور کیا سجاوٹ ہے! سبحان اللہ۔ بھئی ایسے گورے چٹے آدمی تو یہاں کبھی نظر نہیں آتے۔ یہاں تو روساء بیضۂ مرغ اور کشتہ شنگرف اور ماء الحم اور خدا جانے کیا کیا خاک بلا کھاتے رہتے ہیں۔ پر کسی کے چہرے پر سرخی یا تازگی کا نام نہیں۔ یہ لوگ نہ جانے کیا کھاتے ہیں اور کس کنوئیں کا پانی پیتے ہیں کہ جسے دیکھیے تازہ سیب بنا ہوا ہے۔

یہ سب آب و ہوا کی برکت ہے۔

برہل شمال کی طرف نیپال کے قریب انگریزی عملداری میں ایک ریاست تھی اور اگرچہ اس کے محاصل کی نسبت عوام میں مبالغہ آمیز روایتیں مشہور تھیں مگر فی الواقع اس ریاست کی آمدنی دو لاکھ سالانہ سے زائد نہ تھی۔ ہاں اس کا رقبہ بہت وسیع تھا۔ زیادہ تر زمین غیر آباد تھی۔ آباد حصہ بھی کوہستانی اور کم زراعت تھا اور زمین بہت سستی اٹھتی تھی۔

لالہ سائیں داس نے فوراً الگنی سے اتار کر ریشمی سوٹ پہن لیا اور میز پر آکر اس شان سے بیٹھ گئے گویا راجا رانیوں کا یہاں آنا غیر معمولی بات نہیں ہے۔ دفتر کے کلرک بھی ہوشیار ہوگئے۔ سارے بینک میں وہ خاموش ہلچل پیدا ہوگئی جو ہمیشہ غیر معمولی آمدوں کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ دربان نے پگڑی سنبھالی۔ چوکی دار نے تلوار نکالی اور اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ پنکھا قلی بھی خوابِ خرگوش سے چونکا، اور بنگالی بابو رانی صاحبہ کی پیشوائی کے لیے دفتر سے باہر نکلے۔

سائیں داس نے بے نیازی کی شان تو بنا رکھی تھی۔ مگر دل امید وبیم سے کانپ رہا تھا۔ ایک والیِ ملک سے معاملہ کرنے کا یہ پہلا سابقہ تھا۔ گھبراتے تھے کہ بات کرتے بنے یا نہ بنے۔ رئیسوں کا مزاج عرش پر ہوتا ہے۔ معلوم نہیں میری کون سی بات ناگوار گزرے۔ انھیں اس وقت اپنے میں ایک خامی محسوس ہورہی تھی۔ وہ والیانِ ملک کے آدابِ مجلس سے واقف نہ تھے۔ ان کی تعظیم کس انداز سے ہونی چاہیے؟ ان سے ہم کلام ہونے میں کس قسم کا لحاظ کرنا چاہیے؟ انھیں سخت تشویش ہورہی تھی اور جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس امتحان سے جلد نجات ہوجائے۔ تاجروں اور معمولی زمین داروں یا رئیسوں سے معاملہ کرنے میں وہ بے رعایت صفائی کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اور تعلیم یافتہ معزز آدمیوں سے اخلاق اور شرافت کا۔ ان موقعوں پر انھیں کسی مزید احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس وقت انھیں وہ پریشانی ہو رہی تھی جو لنکا کے باشندے کو تبت میں ہو۔ جہاں کے رسم و رواج، رفتار و گفتار کا اسے علم نہ ہو۔

دفعتاً ان کی نگاہ گھڑی پر پڑی۔ سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔ پر گھڑی ابھی قیلولہ کر رہی تھی۔ تاریخ کی سوئی نے تیزروی میں وقت کو مات کر دیا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھے

کہ گھڑی کو ٹھیک کر دیں کہ اتنے میں رانی صاحبہ نے کمرے میں قدم رکھا۔ سائیں داس نے گھڑی کو چھوڑا۔ اور رانی صاحبہ کے قریب پہلو میں کھڑے ہوگئے۔ تصفیہ نہ کرسکے کہ ہاتھ ملاؤں۔ اس فروگذاشت کا اثر ایک اضطراب کی صورت میں ان کے چہرے پر نمودار ہوگیا۔ بارے رانی صاحبہ نے خود ہاتھ بڑھاکر انھیں اس الجھن سے نجات دی۔

رانی صاحبہ کا لباس بہت سادہ تھا۔ جُثہ نحیف۔ اس رعب اور تحکم کا شائبہ بھی نہ تھا جو ثروت کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں سے ایک بے کسی سی جھلکتی تھی۔ چہرہ درد اور التجا کی تصویر تھا۔ اور اس پر حسرت کا وہ شوخ رنگ تھا جو دوسروں کو جبراً رعایت، احسان، اعانت پر مائل کرتا تھا۔ کوئی انسان جس کے پہلو میں دل ہو اس کے جادو سے بے اثر نہ رہ سکتا تھا۔ ایک پیکرِ تالیف تھا جس پر حزن و یاس کی تاثیر منقوش تھی۔ شامِ غم تھی۔ خاموش، زرد اور بے ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا زمانے کے جور و ستم نے اس میں شکوۂ ستم کی آرزو بھی نہیں باقی رکھی۔ جذباتِ دل فنا ہوگئے۔ اور تسلیم و توکل کے سوا اور کوئی سہارا باقی نہیں رہا۔

جب لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے تو رانی کے پرائیوٹ سکریٹری نے معاملے کی بات چیت شروع کی۔ پہلے برہل کی پرانی عظمت کا قصہ کہنے کے بعد اس نے ان ترقیوں کا ذکر کیا جو رانی صاحبہ کی ذات سے عمل میں آئیں۔ چنانچہ فی الحال نہروں کی ایک شاخ نکالنے کے لیے دس لاکھ روپے کی ضرورت درپیش تھی۔ اور باوجودیکہ رانی صاحبہ کسی انگریزی بینک سے معاملہ کرسکتی تھیں، مگر انھوں نے ایک ہندوستانی بینک کے حق کو مرجح سمجھا۔ اب یہ فیصلہ انڈسٹریل بینک کے اختیار میں تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے یا نہیں؟

بنگالی بابو۔ "ہم روپے دے سکتا ہے۔ مگر کاگد پتر دیکھے بنا کچھ نہیں کرسکتا۔"

سکریٹری۔ "آپ کوئی ضمانت چاہتے ہیں؟"

سائیں داس۔ فیاضانہ انداز سے بولے۔ "جناب ضمانت کے لیے آپ کی زبان کافی ہے۔"

بنگالی بابو۔ "آپ کے پاس ریاست کا کوئی حساب کتاب ہے؟"

لالہ سائیں داس کو اپنے ہیڈ کلرک کی یہ دنیاداری سخت ناگوار گزری۔ وہ اس وقت فیاضی کے نشے میں مخمور تھے۔ رانی صاحبہ کی صورتِ التجا کافی ضمانت تھی۔ ان کے سامنے

کاغذ اور حساب کتاب کا ذکر سفلہ پن معلوم ہو رہا تھا۔ صنف لطیف کے سامنے ہم فیاضی اور شرافت کے پتلے بن جاتے ہیں۔ بنگالی بابو کی طرف کڑی نگاہ سے دیکھ کر بولے۔

"کاغذات کی جانچ کوئی لازمی امر نہیں ہے۔ شرط صرف ہمارا اطمینان ہے۔"

بنگالی بابو۔ "ڈائرکٹر لوگ کبھی نہ مانے گا۔"

سائیں داس۔ "ہم کو اس کی پروا نہیں۔ ہم اپنی ذمہ داری پر روپے دے سکتے ہیں۔"

رانی نے سائیں داس کی طرف نگاہِ تشکر سے دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم نظر آیا۔ اس میں کچھ کامیابی کی مسرت تھی۔ کچھ صیاد کی سفاکی اور کچھ سودائے خام کی حقارت۔

(۳)

مگر ڈائرکٹروں نے حساب کتاب، آمدنی اور خرچ دیکھنا ضروری سمجھا، اور یہ کام لالہ سائیں داس کے سپرد ہوا۔ کیونکہ اور کسی کو اپنے کاموں سے اتنی فرصت نہ تھی کہ ایک پورے دفتر کا معائنہ کرتا۔ سائیں داس نے ضابطے کی پابندی کی۔ تین چار دن تک کاغذات جانچتے رہے اور اپنے اطمینان کی رپورٹ پیش کی۔ معاملہ طے ہوگیا۔ دستاویز مرتب ہوئی۔ روپے دیا گیا۔ شرح سود نو فی صدی قرار پایا۔

تین سال تک بینک کے کاروبار کو خوب فروغ ہوا۔ چھٹے مہینے بے طلب و تقاضا پینتالیس ہزار کی رقم یک مشت دفتر آجاتی تھی۔ معاملہ داروں کو پانچ فیصدی منافع دے دیا جاتا تھا۔ حصہ داروں کو سات فی صدی۔ اس طرح اس نفع کی کسر پوری ہوجاتی تھی جو دوسرے وسائل سے حاصل ہوتا تھا۔ سائیں داس سے سب لوگ خوش تھے۔ سب ان کی معاملہ فہمی کے مداح۔ یہاں تک کہ بنگالی بابو بھی رفتہ رفتہ ان کے قائل ہوتے جاتے تھے۔ سائیں داس ان سے کہا کرتے۔ "بابو جی! اعتبار دنیا سے کبھی عنقا نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ نیکی پر عقیدہ رکھنا ہر ایک انسان کا فرض ہے۔ جس شخص کے دل سے یہ عقیدہ اٹھ جاتا ہے اسے زندہ درگور سمجھنا چاہیے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ میں چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوں۔ بڑے سے بڑا کامل فقیر اسے رنگا ہوا سیار معلوم ہوتا ہے۔ سچے سے سچا محب وطن اسے بندۂ شہرت نظر آتا ہے۔ اسے دنیا دغا اور فریب سے پر دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے دل سے پرماتما کی عزت اور عظمت غائب ہوجاتی ہے۔

ایک مشہور فلاسفر کا قول ہے کہ ہر ایک انسان کو شریف سمجھو تاوقت کہ اس کے خلاف کوئی صریح ثبوت نہ ہو۔ موجودہ قوانینِ سیاست اسی معرکتہ‌الآراء اصول پر قائم ہیں اور نفرت تو کسی سے کرنی ہی نہ چاہیے۔ ہماری روحیں پاک ہیں۔ ان سے نفرت کرنا پرماتما سے نفرت کرنے کے برابر ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا میں دغا اور فریب نہیں ہے، ہے اور بہت کثرت سے ہے۔ مگر اس کا علاج بدگمانی نہیں، قیافہ شناسی ہے۔ اور یہ خاص عطیہ ہے جو ایشور کے دربار سے خاص خاص آدمیوں کو عطا ہوتا ہے۔ میں اس کا دعویٰ نہیں کرتا۔ پر مجھے یقین ہے کہ انسان کی صورت دیکھ کر میں اس کے ضمیر کی تہ تک پہنچ جاتا ہوں۔ کوئی کتنا ہی بھیس بدلے۔ رنگ روپ بھرے۔ پر میری نگاہ باطن کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ یہ بھی خیال رکھیے کہ اعتبار سے اعتبار پیدا ہوتا ہے۔ اور بے اعتباری سے بے اعتباری۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ جس شخص کو ابتدا ہی سے شاطر، حریف، فتنہ باز سمجھ لیں گے وہ کبھی آپ سے صفائی اور خوش معاملگی نہ برتے گا۔ وہ ضداً آپ کو زک دینے کی کوشش کرے گا۔ اس کے برعکس آپ ایک چور پر بھی اعتماد کریں تو وہ آپ کا غلام ہوجائے گا۔ ساری دنیا کو لوٹے، پر آپ کو دغا نہ دے گا۔ وہ کتنا ہی بدکار، سیاہ کار، حرام کار کیوں نہ ہو، پر آپ اس کے گلے میں اعتبار کی زنجیر ڈال کر اسے جس طرف چاہیں لے جاسکتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ آپ کے ہاتھوں میں نیکی کا آلہ بن سکتا ہے۔"

بنگالی بابو کے پاس ان فلسیانہ دلیلوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

(۴)

چوتھے سال ششماہی کی آخری تاریخ تھی۔ لالہ سائیں داس اس بینک کے دفتر میں بیٹھے ہوئے ڈاکیے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ آج برہل سے پینتالیس ہزار روپے آئیں گے۔ اس لیے ششماہی منافع کا تخمینہ مرتب کرچکے تھے۔ اب کے ان کا ارادہ تھا کہ کچھ فرنیچر اور خرید لیں۔ اب تک بینک میں ٹیلی فون نہیں تھا۔ اس کا تخمینہ بھی طلب کرلیا تھا۔ امید کی مسرت چہرے پر جھلک رہی تھی۔ مذاقاً کبھی بنگالی بابو سے کہتے، اس تاریخ کو میرے ہاتھوں میں خوامخواہ کھجلی ہونے لگتی ہے۔ آج بھی ہتھیلی کھجلا رہی ہے۔ کبھی دفتری سے کہتے۔ ارے میاں شفقت ذرا استخارہ تو کرو۔ محض سود ہی سود آرہا ہے یا دفتر والوں کے لیے کچھ نذرانہ شکرانہ بھی ہے۔ امید کا اثر شاید در و دیوار پر بھی ہوتا ہے بینک آج

شگفتہ نظر آتا تھا۔

ڈاکیہ عین وقت پر آیا۔ سائیں‌داس نے ایک شان استغنا سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے تھیلے سے کئی رجسٹرڈ لفافے نکالے۔ سائیں داس نے ان لفافوں کو اڑتی ہوئی نگاہ سے دیکھا۔ برہل کا کوئی لفافہ نہ تھا۔ نہ بیمہ، نہ مہرنہ تحریر۔ کچھ مایوسی سی ہوئی جی میں آیا ڈاکیے سے پوچھیں، کوئی اور رجسٹری رہ تو نہیں گئی؟ پر ضبط کیا۔ دفتر کے کلرکوں کے روبرو اتنی بے صبری شان کے خلاف تھی۔ مگر ڈاکیہ چلنے لگا تو ان سے نہ رہا گیا۔ پوچھ ہی بیٹھے۔ ارے بھئی کوئی بیمہ لفافہ تو نہیں رہ گیا؟ آج اُسے آنا چاہیے تھا۔ ڈاکیے نے کہا۔ سرکار بھلا ایسی بات ہے۔ اور کہیں بھول چوک ہوجائے پر حضور کے کام میں ایسی بھول ہوسکتی ہے؟

سائیں داس کا چہرہ اتر گیا۔ جیسے کچے رنگ پر پانی پڑجائے۔ ڈاکیہ چلا گیا توبنگالی بابو کی طرف خطا وار نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ یہ دیر کیوں ہوئی؟ پہلے توکبھی ایسا نہ ہوتا تھا۔"

بنگالی بابو نے نا ہمدردانہ انداز سے جواب دیا۔ "کسی سبب دیری ہوگیا ہوگا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

مایوسی محال کو ممکن بنا دیتی ہے۔ سائیں داس کو اس وقت یہ خیال ہوا کہ شاید پارسل سے روپے آتے ہوں۔ ہوسکتا ہے تین ہزار اشرفیوں کا پارسل کر دیا ہو۔ اگرچہ وہ کسی سے اس خیال کو ظاہر کرنے کی جراٗت نہ کرسکے پر انھیں یہ امید اس وقت تک لگی رہی جب تک کہ پارسل والا پوسٹ مین واپس نہ گیا۔ آخر شام کو وہ ایک پریشانی کی حالت میں اٹھ کر گھر چلے گئے۔ اب خط یا تار کا انتظار تھا۔ دو تین بار جھنجلا کر اٹھے کہ ڈانٹ کر ایک خط لکھوں اور صاف صاف کہہ دوں کہ ایسے معاملات میں وعدہ خلافی سخت معاملگی کا ثبوت دیتی ہے۔ ایک دن کی تاخیر بھی بینک کے لیے مہلک ہوسکتی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ایسی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر نہ لکھا۔

شام ہوگئی تھی۔ کئی احباب آگئے۔ گپ شپ ہونے لگی کہ پوسٹ مین نے آکر شام کی ڈاک سائیں داس کو دی۔ یوں وہ پہلے اخبار کو کھولا کرتے تھے۔ پر آج چٹھیاں کھولیں۔ مگر برہل کا کوئی خط نہ تھا۔ تب بے دلی کے ساتھ ایک انگریزی اخبار کھولا اور پہلے

ہی تار کا عنوان دیکھ کر ان کا خون سرد ہوگیا۔

کل شام کو رانی صاحبہ برہل نے تین دن کی بیماری کے بعد وفات پائی۔ اس کے آگے ایک مختصر نوٹ میں یہ مضمون درج تھا۔

"رانی صاحبہ برہل کی مرگِ بے ہنگام صرف اس ریاست کے لیے نہیں بلکہ کل صوبے کے لیے ایک افسوناک سانحہ ہے۔ حکمائے حاذق مرض کی تشخیص بھی نہ کرسکے تھے کہ موت نے قصہ تمام کر دیا۔ رانی صاحبہ کو اپنی ریاست کی بہتری کا خیال ہمیشہ مدِ نظر رہتا تھا۔ ان کے مختصر دورانِ حکومت میں ان کی ذات سے ریاست کو جو فیوض حاصل ہوئے ہیں، وہ عرصے تک یادگا رہیں گے۔ اگرچہ یہ مسلمہ امر تھا کہ ریاست ان کے بعد دوسرے ہاتھوں میں جائے گی مگر یہ خیال رانی صاحبہ کے ادائے فرض میں کبھی مخل نہیں ہوا۔ قانوناً انھیں ریاست کی کفالت پر کسی قسم کے مالی معاملہ کرنے کا مجاز نہ تھا مگر رعایا کے فلاح و اصلاح نے کئی موقعوں پر اس پابندی کو نظر انداز کرنے پر مجبور کیا۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر ان کی زندگی نے چند سال اور وفا کی ہوتی تو ریاست ان کی کفولتیوں سے سبکدوش ہوجاتی۔ انھیں شب و روز اس کی فکر تھی۔ قانونی پیچیدگیوں سے مغالطہ دینے کا گمان بھی انھیں کبھی نہیں ہوا۔ مگر بے وقت موت نے اب فیصلہ دوسرے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ دیکھنا چاہیے ان کفولتیوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ ہمیں معتبر وسائل سے معلوم ہوا ہے کہ نئے راجا صاحب نے جو آج کل لکھنؤ میں رونق افروز ہیں اپنے وکلاء کے مشورے کے مطابق مرحومہ کے مالی مواخذات سے انکار کر دیا ہے۔ ہمیں خوف ہے کہ عنقریب لکھنؤ کے مالی حلقے میں ایک زبردست ہلچل پیدا ہوگی۔ اور کتنے ہی اصحابِ زر کو سبق مل جائے گا کہ سود کی ہوس حزم و احتیاط کی قیدوں سے آزاد ہوکر کتنی مضرت کا باعث ہوتی ہے۔"

لالہ سائیں داس نے اخبار میز پر رکھ دیا اور آسمان کی طرف تاکا۔ مایوسی کا آخری سہارا ہے۔ دوسرے احباب نے یہ خبر پڑھی۔ باہم اس مسئلے کے قانونی پہلو پر گفتگو ہونے لگی۔ نوبت تکرار و حجت تک پہنچی۔ سائیں داس پر چاروں طرف سے بوچھاڑ پڑنے لگی۔ سارا الزام اس کے سر منڈھا گیا۔ اور ان کی ایک مدت کی کاروائی، معاملہ فہمی اور مآل اندیشی خاک میں مل گئی۔ بینک کے لیے اتنا زبردست نقصان برداشت کرنا غیر ممکن

تھا۔ اور اب یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اس کا وجود کیوں کر قائم رہے۔

(۵)

اس کے بعد ہفتوں تک متواتر صبح سے شام تک بینک میں بازکش معاملہ داروں کا تانتا لگا رہا۔ جن لوگوں کی رقمیں بغیر مدت کی قید کے جمع تھیں وہ ان کی واپسی پر بضد تھے۔ اور کوئی عذر نہ سنتے تھے۔ معلوم نہیں یہ اسی اخبار کے نوٹ کا اثر تھا یا رقیبوں کی خفیہ ریشہ دوانیوں کا کہ انڈسٹریل بینک کے خلاف سارے شہر میں بدگمانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر لوگ صبر سے کام لیتے تو ایسی صورتیں پیدا ہوجاتیں کہ بینک اس صدمہ سے جانبر ہوجاتا۔ مگر شورش اور طوفان میں کون سی کشتی ساکت رہ سکتی ہے؟ آخر خزانچی نے انکاری جواب دینے شروع کردیے۔ بینک کی رگوں سے خون کی اتنی دھاریں نکلیں کہ وہ بے جان ہوگیا۔

دوماہ گزر گئے تھے۔ احاطے میں ہزاروں سوداگرانِ بنک جمع تھے۔ مگر مرنے والے کی آنکھیں بند تھیں۔ نبض ساکت، زبان خاموش، آہ و بکا کی دل دوز صدائیں اٹھ رہی تھیں۔ پر یہ صدائے ماتم اس کے کانوں تک نہ پہنچتی تھیں۔ بینک کے دروازے پر مسلح سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ دم دم پر طرح طرح کی افواہیں اڑتی تھیں اور ہر ایک افواہ اس مجمع کثیر کو ہمہ تن گوش و ہمہ تن چشم بنا دیتی تھی۔ کبھی خبر اڑتی تھی کہ لالہ سائیں داس نے زہر کھا لیا۔ کوئی ان کی گرفتاری کی خبر لاتا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ ڈائرکٹر صاحبان زیر حراست ہوگئے۔

اور یہ کیفیت احاطے ہی تک محدود نہ تھی۔ شہر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ رونے والوں سے زیادہ دردناک حالت ان کی تھی جن کی آنکھیں شرمندۂ غم نہ ہوسکتی تھیں۔ جنھیں خاندانی وقار خودداری پر مجبور کیے ہوئے تھا۔

آفتاب غروب ہوگیا۔ صبر میں انتظار کی طاقت نہ رہی۔ ڈوبنے والے آفتاب کی طرح وہ بھی مایوسی کی تاریکی میں ڈوب گیا۔ مجمع رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔ دفعتاً سڑک پر سے ایک موٹر نکلا اور بینک کے سامنے آکر رُک گیا۔ کسی نے کہا۔ برہل کے راجا صاحب کا موٹر ہے۔ اتنا سنتے ہی سیکڑوں آدمی وحشت کے عالم میں موٹر کی طرف دوڑے۔ مگر شکوۂ بے داد کے لیے نہیں۔ صرف اس شخص کی صورت دیکھنے کے لیے جو

ان کے کشتِ امید کا شرر تھا۔ جس کے ہاتھوں ان کی قسمتیں پامال ہورہی تھیں۔

نوجوان کنور سنگھ رانی صاحبہ کی وفات کے بعد وکیلوں سے قانونی مشورہ لینے کے لیے لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ رئیسانہ لوازمات کی خرید بھی ضروری تھی۔ وہ آرزوئیں جو ایک مدت سے اسی موقع کی منتظر تھیں اب بندھے ہوئے پانی کی طرح راہ پاکر ابلی پڑتی تھیں۔ یہ موٹر آج ہی لیا تھا۔ شہر میں ایک بنگلے کے متعلق بات چیت ہورہی تھی۔ بیش قیمت فرنیچر اور شیشہ آلات کی ایک گاڑی برہل روانہ ہوچکی تھی۔ انگریزی جوہری بھی ان کی قدر دانیوں سے محروم نہ تھے۔ اربابِ نشاط کی مجلسیں روزانہ آراستہ ہوتیں۔ یہاں سے فرصت ملتی تو تھیٹر کی باری آتی۔ چڑیا قفس سے آزاد ہوکر ہر ایک ڈالی پر چہکتی پھرتی تھی۔ یہ مجمع دیکھا تو خیال کیا کہ کوئی نیا تماشا ہونے والا ہے۔ موٹر روک دیا کہ اتنے میں صدہا آدمیوں نے آکر موٹر کو گھیر لیا۔

کنور صاحب نے پوچھا۔ ''یہاں آپ لوگ کیسے جمع ہیں؟ کوئی تماشا ہونے والا ہے کیا؟''

ایک صاحب جو وضع سے کوئی بگڑے رئیس معلوم ہوتے تھے۔ بولے۔ ''جی ہاں! بڑا دلچسپ تماشا ہے۔''

کنور۔ ''کس کا تماشا ہے؟''

''قسمت کا''

کنور صاحب کو اس جواب پر حیرت تو ہوئی مگر سنتے آئے تھے کہ لکھنؤ والے بات بات پر شاعری کیا کرتے ہیں۔ اس لیے اسی انداز سے جواب دینا بھی ضروری معلوم ہوا۔ بولے۔ ''قسمت کا تماشا دیکھنے کے لیے یہاں آنا توضروری نہیں۔''

لکھنوی حضرت نے فرمایا۔ جناب کا فرمانا بجا ہے۔ مگر دوسری جگہ یہ لطف کہاں؟ یہاں آج صبح سے شام تک قسمت نے کتنوں ہی کو امیر سے غریب اور کتنوں ہی کو غریب سے فقیر بنا دیا۔ صبح کو جو لوگ محلوں میں بیٹھے تھے، اس وقت انھیں درخت کی چھاؤں بھی میسر نہیں۔ جن کے دروازے پر زکوٰۃ بٹتی تھی، اس وقت روٹیوں کو محتاج ہیں۔ ابھی ایک ہفتہ قبل جو لوگ شکوۂ روزگار اور نیرنگیٔ تقدیر اور جورِ فلک کو شاعرانہ استعارات سمجھا کرتے تھے۔ اس وقت ان کی آہ و زاری، نالۂ عشق کو بھی شرمندہ کر رہی

ہے۔ ایسے عبرت خیز تماشے اور کہاں دیکھنے میں آئیں گے؟"

کنور صاحب اب اپنی حیرت کو نہ چھپاسکے۔ پوچھا۔ "جناب آپ نے تو معمے کو اور بھی پیچیدہ کردیا۔ میں دہقانی آدمی ہوں۔ مجھ سے نثر میں بات کیجیے۔"

اس پر ایک جنٹلمین نے فرمایا۔ "حضرت! یہ انڈسٹریل بینک ہے۔ اس کا دیوالہ ہوگیا ہے۔ آداب عرض ہے۔ بندہ کو پہچانا؟ کنور صاحب نے ان کی طرف دیکھا تو موٹر سے اچھل پڑے اور نیچے آکر ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے۔ "ارے مسٹر نسیم؟ تم یہاں کہاں؟ یار تم سے مل کر روح تازہ ہوگئی۔"

مسٹر نسیم کنور صاحب کے ساتھ دہرادون کالج میں پڑھتے تھے۔ دونوں ساتھ ساتھ دہرادون کی پہاڑیوں کی سیر کرنے جایا کرتے۔ مگر جب سے کنور صاحب نے خاندانی حالات سے مجبور ہوکر کالج چھوڑا، دونوں دوستوں میں ملاقات نہ ہوئی تھی۔ نسیم بھی ان کے آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد اپنے وطن لکھنؤ چلے آئے تھے۔

نسیم نے جواب دیا۔ "شکر ہے۔ آپ نے پہچانا تو۔ کہیے اب تو پو بارہ ہیں۔ کچھ دوستوں کی بھی خبر ہے؟"

کنور۔ "یار مبالغہ نہیں۔ تمھاری یاد ہمیشہ آیا کرتی تھی۔ کہو آرام سے تو ہو؟ میں رائل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ آج آؤ تو اطمینان سے باتیں ہوں۔"

نسیم۔ "جناب اطمینان تو انڈسٹریل بینک کے ساتھ رخصت ہوا۔ اب تو فکرِ معاش سر پر سوار ہے۔ جو کچھ جمع جتھا تھی وہ آپ کے نذر ہوئی۔ اس دیوالہ نے فقیر بنا دیا۔ اب آپ کے آستانوں پر آکر دھرنا دوں گا۔"

کنور۔ "یار تمھارا گھر ہے۔ بے تکلف آؤ۔ میرے ساتھ ہی کیوں نہ چلو؟ کیا بتاؤں مجھے مطلق معلوم نہ تھا کہ میری دست کشی کا یہ اثر ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے بینک نے بہتیروں کو تباہ کر دیا۔"

نسیم۔ "گھر گھر کہرام مچا ہوا ہے۔ میرے پاس اس جسم پر کے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔"

اتنے میں ایک تلک دھاری پنڈت جی آگئے اور بولے۔ "مہاراج! آپ کے جسم پر کپڑے تو ہیں۔ یہاں تو دھرتی آکاش کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ میں راگھو جی پاٹ سالا کا

ادھیاپک ہوں۔ پاٹ سالا کا سب روپیہ بینک میں جمع تھا۔ پچاس ودیارتھی اس کی بدولت سنسکرت پڑھتے تھے، اور بھوجن پاتے تھے۔ کل سے پاٹ سالہ بند ہو جائے گا۔ دور دور کے ودیارتھی ہیں۔ وہ اپنے گھر کیسے پہنچیں گے، یہ ایشور ہی جانے۔"

ایک صاحب جن کے سر پر پنجابی وضع کی پگڑی تھی۔ گاڑھے کا کوٹ اور چمرودھا جوتا پہنے ہوئے تھے، آگے بڑھ آئے اور ایک شانِ نیابت سے بولے۔ "جناب اس بینک کے فیلیور نے کتنے ہی انسٹی ٹیوشنوں کا خاتمہ کردیا۔ لالہ دیناناتھ کا یتیم خانہ اب ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ اس کا ایک لاکھ روپے ڈوب گیا۔ ابھی پندرہ دن ہوئے ہیں۔ ڈیپوٹیشن سے لوٹا تو پندرہ ہزار روپے یتیم خانے کے فنڈ میں جمع کیے گئے تھے۔ مگر اب کہیں کوڑی کا بھی ٹھکانا نہیں۔"

ایک کہن سال بوڑھے نے کہا۔ "صاحب میری تو عمر بھر کی کمائی مٹی میں مل گئی۔ اب کفن کا بھی بھروسہ نہیں۔"

رفتہ رفتہ اور لوگ جمع ہوگئے۔ اور عام گفتگو ہونے لگی۔ ہر شخص اپنے قریب کے آدمی کو اپنی مصیبت کی داستان سنانے لگا۔ کنورصاحب آدھ گھنٹے تک نسیم کے ساتھ کھڑے یہ فسانۂ غم سنتے رہے۔ جوں ہی موٹر پر بیٹھے اور ہوٹل کی طرف چلنے کا حکم دیا، ان کی نگاہ ایک خستہ حال آدمی کی طرف گئی جو زمین پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ یہ ایک اہیر تھا۔ کنورصاحب کے ساتھ بچپن میں کھیلا تھا۔ اس وقت ان میں رتبے کی یہ تمیز نہ تھی۔ کنورصاحب نے بار بار اس کی دھولیں کھائی تھیں۔ اس کی گالیاں سنی تھیں۔ دونوں ساتھ کبڈی کھیلتے تھے۔ ساتھ پیڑوں پر چڑھ کر چڑیوں کے بچے چُراتے تھے۔ جب کنورصاحب دہرادون پڑھنے گئے۔ تو یہ اہیر کا لڑکا شیوداس اپنے باپ کے ساتھ لکھنؤ چلا آیا۔ جس نے یہاں ایک دودھ کی دکان کھول لی تھی۔ کنورصاحب نے اسے پہچانا اور زور سے پکارا۔ "ارے شیو داس! ادھر دیکھو۔" شیوداس نے آواز سنی مگر سر اوپر نہ اٹھایا۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا کنورصاحب کو دیکھ رہا تھا۔ بچپنے کے وہ دن یاد آرہے تھے جب وہ جگدیش کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا تھا۔ جب دونوں بڈھے غفور میاں کا منھ چڑا کر گھر میں چھپ جاتے تھے۔ جب وہ اشارے سے جگدیش کو ماسٹر کے پاس سے بلالیا کرتا اور دونوں رام لیلا دیکھنے چلے جاتے۔ اسے یقین تھا کہ کنورصاحب مجھے بھول گئے ہوں گے۔ وہ بچپن کی باتیں اب

کہاں؟ کہاں میں اور کہاں وہ! لیکن جب کنور صاحب نے اس کا نام لے کر پکارا تو بجائے اس کے کہ وہ خوش ہو کر ان سے ملے، اس نے اور بھی سر جھکا لیا اور وہاں سے سرک جانا چاہا۔ کنور صاحب کا اخلاق اب اس خلیج پر حاوی نہیں ہوسکتا جو ان کے اور اس کے درمیان حائل تھی۔ مگر کنور صاحب اسے کھسکتے دیکھ کر موٹر سے اتر کر اس کے پاس گئے۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ "ارے شیوداس کیا مجھے بھول گئے؟"

شیوداس کو اس آواز میں پرانی بے تکلفی کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کنور صاحب کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا۔ "بھولا تو نہیں۔ پر آپ کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

کنور۔ "یہاں دودھ کی دکان کرتے ہو کیا؟ مجھے معلوم ہی نہ تھا۔ نہیں تو ایک ہفتے سے پانی پیتے پیتے زکام کیوں ہوتا؟ آؤ اس موٹر پر بیٹھ جاؤ۔ میرے ساتھ ہوٹل تک چلو۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تمھیں بر ہل لے چلوں گا۔ اور ایک بار پھر گلی ڈنڈے کھیلیں گے۔"

شیوداس۔ "ایسا نہ کیجیے۔ نہیں تو دیکھنے والے ہنسیں گے۔ میں ہوٹل میں آجاؤں گا۔ وہی حضرت گنج والے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں نا۔"

کنور۔ "ضرور آؤ گے نا؟"

شیوداس۔ "آپ بلائیں گے اور میں نہ آؤں گا؟"

کنور۔ "یہاں کیسے بیٹھے ہو؟ دکان تو چل رہی ہے نا؟"

شیوداس۔ "آج صبح تک تو چلتی تھی۔ پر آگے کا حال تو نہیں معلوم۔"

کنور۔ "تمھارے روپے بھی بینک میں جمع تھے کیا؟"

شیوداس۔ "اب آؤں گا تو بتاؤں گا۔"

کنور صاحب موٹر پر آبیٹھے۔ اور شوفر سے کہا۔ "ہوٹل کی طرف چلو۔"

شوفر۔ "حضور نے وہائٹ وے کمپنی کی دکان پر چلنے کا حکم دیا تھا۔"

کنور۔ "اب اُدھر نہ جاؤں گا۔"

شوفر۔ "جیکب صاحب بالشٹر کے یہاں بھی نہ چلو؟"

کنور۔ "(جھنجلا کر) نہیں کہیں مت چلو۔ مجھے سیدھے ہوٹل پہنچادو۔"

یاس و درد کے ان نظاروں نے جگدیش سنگھ کے دل میں سوال پیدا کر دیا تھا۔
"اب میرا فرض کیا ہے؟"

(۲)

آج سے سات برس پہلے جب برہل کے راجا صاحب نے عین عالم شباب میں گھوڑے سے گر کر وفات پائی اور وراثت کا مسئلہ پیش ہوا تو راجا صاحب کے کوئی اولاد نہ تھی۔ خاندانی سلسلہ میں ان کے حقیقی چچازاد بھائی ٹھاکررام سنگھ کو وراثت کا حق پہنچتا تھا۔ انھوں نے دعویٰ کیا۔ مگر عدالتوں نے راجا صاحب کی بیوی کے حق میں فیصلہ کیا۔ ٹھاکرصاحب نے اپیلیں کیں۔ پریوی کونسل تک گئے۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔ مقدمے بازی میں لاکھوں روپے صرف ہوگئے۔ اپنے حصے کی جائداد بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ مگر مقدمہ ہارنے پر بھی وہ اطمینان سے نہیں بیٹھے۔ بیوہ رانی صاحبہ کو چھیڑتے رہتے۔ کبھی اسامیوں کو بھڑکاتے۔ کبھی حکام کو رانی صاحبہ سے بدظن کرتے۔ کبھی فرضی مقدمات میں پھنسانے کی کوشش کرتے۔ مگر رانی صاحبہ بھی بڑے جیوٹ کی عورت تھیں۔ وہ ٹھاکرصاحب کے ہر ایک وار کا دنداں شکن جواب دیتیں۔ ہاں اس کشمکش میں انھیں یا تو اس قانونی پیچد گی کو چھپانا پڑتا تھا۔ یا سود کی بہت اونچی شرح قبول کرنا پڑتی تھی۔

کنور جگدیش سنگھ کا زمانۂ طفولیت تو ناز و نعمت میں کٹا تھا۔ مگر جب ٹھاکر رام سنگھ ان مقدمہ بازیوں سے بہت برباد ہوگئے اور یہ اندیشہ بھی ہوا کہ کہیں رانی صاحبہ کی سازشوں سے کنورصاحب کی جان خطرے میں نہ پڑجائے تو انھوں نے مجبور ہوکر کنورصاحب کو دہرادون بھیج دیا۔ کنورصاحب وہاں دو سال تک آرام سے رہے۔ لیکن جوں ہی وہ کالج کی پہلی جماعت میں داخل ہوئے ٹھاکرصاحب راہیٔ ملکِ عدم ہوگئے۔ کنورصاحب کو سلسلۂ تعلیم قطع کرنا پڑا۔ برہل چلے آئے۔ سرپرخاندان کی پرورش اور رانی صاحبہ سے پرانی عدوات نبھانے کا بار آپڑا۔ اس وقت سے رانی صاحبہ کی وفات تک ان کی حالت بہت ابتر رہی۔ آمدنی کا ذریعہ یا تو قرض تھا یا مستورات کے زیور۔ اس پر خاندانی وقار کے قائم رکھنے کی فکر۔ یہ تین سال ان کے لیے سخت آزمائش کے دن تھے۔ ساہوکاروں سے آئے دن سابقہ رہتا تھا۔ ان کے تیرِ ستم سے جگر میں ناسور پڑ گیا تھا۔ حکام کی سخت گیریاں اور بدعتیں بھی برداشت کرنا پڑتیں۔ مگر سب سے دل خراش اپنے

عزیزوں اور یگانوں کا برتاؤ تھا۔ جو سامنے وار نہ کرکے بغلی چوٹیں کرتے تھے۔ دوستی اور یگانگت کے پردے میں دغا کے ہاتھ چلاتے تھے۔ ان تجرباتِ تلخ نے کنور صاحب کو اختیار اور ثروت اور دولت کا جانی دشمن بنا دیا تھا۔ وہ نہایت ذکی الحس آدمی تھے اور یگانوں کی بے مہریاں اور ابنائے وطن کی بے وفائیاں ان کے دل پر داغِ سیاہ بنتی جاتی تھیں۔ ادبیات کے ذوق نے انھیں انسانی فطرت کے مطالعہ کا خوگر بنا دیا تھا اور یہ مطالعہ جہاں انھیں روزبروز مہذب طبقے سے دور لیے جاتا تھا، وہاں ان کے دل میں جمہوریت اور غریب دوستی کے خیالات راسخ کرتا جاتا تھا۔ ان پر روشن ہوگیا تھا کہ سچی انسانیت اگر زندہ ہے تو جھونپڑوں میں اور افلاس میں۔ یہیں اس مصیبت کے زمانے میں جب چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، انھیں کبھی کبھی سچی ہمدردی اور خلوص کی روشنی نظر آجاتی تھی۔ اسی طبقے میں وفادار اور غم گسار دوست ملتے تھے۔ دولت اور ثروت ان کی نگاہ میں ظاہرداری اور تکلف کا مترادف تھی۔ وہ اسے نعمت عظمیٰ کے بجائے قہر الٰہی سمجھتے تھے۔ جو انسان کے دل سے انسانیت اور محبت کے جذبات مٹا دیتی ہے۔ وہ ابرِ سیاہ ہے جو دل کے روشن تاروں پر چھا جاتی ہے۔

مگر رانی صاحبہ کی وفات کے بعد جوں ہی دولت اور ثروت نے ان پر وار کیا، فلسفیانہ خیالات کی یہ سپر پاش پاش ہوگئی۔ دل پر ایک خودفراموشی کا نشہ چھا گیا۔ تحقیقِ باطن کی قوت زائل ہوگئی۔ وہ لوگ دوست ہوگئے جنھیں وہ دشمن سمجھتے تھے۔ اور جو سچے ہمدرد اور دوست تھے وہ تغافل اور سرد مہری کی زد میں آگئے۔ جمہوریت کے دلائل میں حیرت انگیز ترمیم شروع ہوئی۔ اور متحملانہ روا داری کا احساس رونما ہوا۔ فلسفۂ یاس نے فلسفۂ امید کو جگہ دی۔ حفظِ وقار اور مناسبتِ حال کی زنجیر گلے میں پڑی۔ شعلۂ دردانگیز قفسِ بلوریں میں روپوش ہوا۔ دولت اور ثروت کے مینارِ بلند نے افلاس کے جھونپڑوں کو نظر سے پوشیدہ کردیا۔ آئین و مراسم نے زبان پر مہرِ احتیاط لگا دی۔ وہ اربابِ اختیار جنھیں دیکھ کر ان کے تیور بدل جاتے تھے، اب ان کے مشیر ہوگئے۔ بے نوائی اور برہنگی اور قناعت جو ان کی دل سوزیوں کی منظورِ نظر تھی۔ اب اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں جھک جاتی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کنور صاحب اب بھی جمہوریت کے قائل تھے۔ مگر ان

کے اظہار میں وہ پہلے کی سی آزادی نہ تھی۔ قول اب فعل سے قریب تر ہوجانے کے باعث باہر نکلتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وہ پہلے کی سی طرار و تیز شمشیر برہنہ نہ تھی۔ اس میں اب زنگ لگ گیا تھا۔ قول کے عملی پہلو کو اب وہ نظر انداز نہ کرسکتے تھے اور میدانِ عمل انھیں دشواریوں سے پرُنظر آتا تھا۔ بیگار کے وہ جانی دشمن تھے۔ مگر بیگار کو بند کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ صحت و صفائی کے زبردست موید تھے۔ مگر اب خرچ سے قطعِ نظر باشندوں ہی کی طرف سے انحراف کا گمان ہوتا تھا۔ اسامیوں کے ساتھ لگان کے لیے سختی و جبر کو وہ شرک سمجھتے تھے۔ مگر اب وہ ضروری نظر آتی تھی۔ غرض کتنے ہی اصول جو پہلے جزوِ ایمان بن چکے تھے اب دائرۂ عمل سے خارج ہوتے جاتے تھے۔

مگر آج بینک کے احاطے میں جو دردناک نظارے ان کی نگاہ سے گزرے، ان کے خفیہ جذبات درد کے لیے بانگِ سحر کا کام کر گئے۔ بے کسی اور مجبوری کے وہ دل فگار نالے گوشۂ جگر میں چبھ گئے۔ اس شخص کی سی حالت ہوگئی جو کشتی پر بیٹھا دریا کے پرُفضا ساحل کی سیر کرتا ہوا یکایک مرگھٹ کے سامنے آجائے۔ چتا پر لاشیں جلتے ہوئے دیکھے۔ سوگواروں کی آہ و زاریاں سنے اور کشتی سے اتر کر سوگواروں کے ماتم میں شریک ہو جائے۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ کنور صاحب پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ احاطۂ بینک کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ وہی صدائیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ دل میں سوال ہورہا تھا، کیا اس تباہی کا باعث میں ہوں؟ میں نے وہی کیا جس کا مجھے قانوناً اور اخلاقاً پورا مجاز تھا۔ یہ بینک کے کارکن لوگوں کی غلطی ہے کہ انھوں نے بغیر کافی ضمانت کے اتنی بڑی رقم قرض دے دی۔ معاملہ داروں کو انھیں کی گردن پکڑنی چاہیے۔ میں کوئی خدائی فوجدار نہیں ہوں کہ دوسرں کی حماقتوں کا خمیازہ اٹھاؤں۔ ناحق اس ہوٹل میں ٹھہرا۔ چالیس روپے روز دینے پڑیں گے۔ کوئی چار سو روپے کے متھے جائے گی۔ اتنا سامان بھی بیکار لیا۔ کیا ضرورت تھی؟ مخملی گدے کی کرسیوں سے یا شیشہ آلات کی سجاوٹ سے میری حقیقی شان نہیں بڑھ سکتی۔ کوئی معمولی مکان پانچ روپے روزانہ پر لے لیتا تو کیا کام نہ چلتا؟ میں اور ساتھ کے سب آدمی آسائش سے نہ رہتے۔ یہی ہوتا نا کہ لوگ بد نام کرتے۔ اس کی کیا پروا۔ جن لوگوں کے ماتھے پر ٹھاٹ کر رہا ہوں وہ غریب تو روٹیوں کو بھی محتاج ہیں۔ یہ دس بارہ ہزار روپے لگا کر اگر کنویں بنوا دیتا تو ہزاروں غریبوں کا بھلا

ہو جاتا۔ اب آئندہ سے لوگوں کے چکمے میں نہ آؤں گا۔ یہ موٹرکار بالکل فضول ہے۔ میرا وقت اتنا قیمتی نہیں ہے کہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی کفایت کی خاطر دو سو روپے خرچ بڑھالوں۔ فاقہ کش آسامیوں کے سامنے موٹر دوڑانا ان کی چھاتیوں پر مونگ دلنا ہے۔ مانا کہ وہ رعب میں آجائیں گے، جدھر سے نکل جاؤں گا سینکڑوں بچے اور عورتیں تماشا دیکھنے کے لیے گھروں سے نکل آئیں گی۔ پر محض اتنی سی تسکینِ نخوت کے لیے اتنا خرچ بڑھانا حماقت ہے۔ اگر دوسرے رؤسا ایسا کرتے ہیں تو کریں۔ میں ان کی ریس کیوں کروں۔ اب تک دو ہزار روپے سالانہ میں میرا گزر ہوجاتا تھا۔ اب دو کے بدلے چار ہزار بہت ہیں۔ اور پھر مجھے دوسروں کی کمائی کو یوں اڑانے کا مجاز ہی کیا ہے؟ میں کوئی محنت نہیں کرتا، کوئی تجارت کوئی کاروبار نہیں کرتا، جس کا یہ نفع ہو۔ اگر میرے بزرگوں نے اپنی ہٹ دھرمی اور زبردستی سے کچھ علاقہ اپنے قبضے میں کر لیا تو مجھے ان کے مالِ غنیمت میں شریک ہونے کا کیا حق ہے؟ جو لوگ محنت کرتے ہیں۔ انھیں اپنی محنت کا پوار ثمرہ ملنا چاہیے۔ سلطنت انھیں صرف دوسروں کی دست برد سے بچاتی ہے۔ اس خدمت کا اسے مناسب معاوضہ ملنا چاہیے۔ بس میں تو سلطنت کی طرف سے یہ معاوضہ وصول کرنے کے لیے مامور ہوں۔ اس کے سوا میرا ان غریبوں کی کمائی میں اور کوئی حق نہیں ہے۔ یہ بے چارے مفلس ہیں۔ جاہل ہیں۔ بے زبان ہیں۔ اس لیے فی الحال ہم انھیں جتنا چاہیں ستا لیں۔ انھیں اپنے حقوق کی خبر نہیں۔ اپنی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ ہم انھیں جتنا چاہیں پامال کرلیں۔ پر ایک دن ضرور آئے گا جب ان کے منہ میں بھی زبان ہوگی۔ اپنے حقوق سمجھیں گے اور تب وائے بر حالِ ما۔ یہ تکلفات مجھے اپنی اسامیوں سے دور کیے دیتے ہیں۔ میری شان اسی میں ہے کہ انھیں میں رہوں۔ انھیں کی معاشرت اختیار کروں اور ان کی مدد کروں۔

ہاں تو اسی بینک کو کیا کروں؟ کوئی چھوٹا موٹا معاملہ ہوتا تو کہتا، لاؤ جہاں اور سر پر بہت سے بوجھ ہیں، وہاں اتنا اور سہی۔ پر دس لاکھ بہت ہوتے ہیں۔ پچاس ہزار سود کے الگ ہوئے۔ اور پھر مہاجنوں کے بھی تو تین لاکھ روپے آتے ہیں۔ ریاست کی آمدنی ڈیڑھ دو لاکھ روپے سالانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ میں اتنا بڑا حوصلہ کروں بھی تو کس برتے پر؟ ہاں اگر فقیری اختیار کرلوں تو البتہ شاید میری زندگی میں (بشرطیکہ ناگہانی موت نہ

آجائے) یہ قضیہ پاک ہوسکے۔ آرزوؤں کو خاکستر کرنا ہے۔ آہ! اس دن کے انتظار میں ہم نے کیا کیا مصیبتیں نہیں جھیلیں۔ والد صاحب نے اسی کوفت میں جان دی۔ یہ روزِ سعید ہمارے ایامِ تاریک کی دور افتادہ مشعل تھی۔ ہم اسی کے سہارے زندہ تھے۔ سوتے جاگتے ہمیشہ اسی کے چرچے رہتے تھے۔ اس سے دل کو کتنی تقویت، کتنا غرور تھا۔ فاقہ کشی میں بھی ہمارے تیور نہ میلے ہوتے تھے۔ جب صبر و انتظار کے بعد ایامِ نیک آئے تو میں اس سے بے رخی کیونکر کروں؟ زندگی کی تمناؤں پر پانی کیونکر پھیروں؟ اور کچھ اپنی ذاتی تمناؤں تک تو خاتمہ نہیں۔ ریاست کی ترقی اور اصلاح کی کتنی تجویزیں دل میں قائم کرچکا ہوں۔ کیا اپنی تمناؤں کے ساتھ ان تجویزوں کو بھی ڈبو دوں؟ اس کم بخت رانی نے مجھے بری طرح پھانسا ہے۔ جب تک وہ زندہ رہی، کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ مری تو تباہی کا سامان کر گئی۔ مگر میں افلاس سے اتنا ڈرتا کیوں ہوں؟ افلاس کوئی گناہ نہیں۔ اگر میری آرزوؤں کا خون، اگر میری زندگی کی قربانی ہزاروں خاندانوں کو تباہی اور خستہ حالی سے بچا لے تو مجھے اس قربانی سے دریغ نہ ہونا چاہیے۔ آسائش سے زندگی بسر کرنا ہی تو ہماری زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ کیا یہ تسکین کا باعث نہیں کہ میری خانہ ویرانی صدہا گھروں کی آبادی کا وسیلہ ہو؟ ہماری عزت اور شہرت اور یادگار ہماری تن آسانیوں سے نہیں ہوا کرتی۔ محلوں میں رہنے والے اور دنیا کی نعمتوں کا لطف اٹھانے والے رانا پرتاپ کو کون جانتا؟ یہ اس کی تکلیفیں، اس کی قربانیاں، اس کی فاقہ کشیاں ہیں جنھوں نے اسے ہماری قوم کا آفتاب بنا دیا ہے۔ رام چندر نے اگر اپنے زندگی عیش و عشرت میں بسر کی ہوتی تو آج ہم ان کا نام بھی نہ جانتے۔ ان کی قربانیوں ہی نے انھیں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ ہماری عظمت، ہماری دولت اور ہمارے سامانِ عیش سے بے نیاز ہے۔ میں موٹر پر سوار ہوا تو کیا اور ٹٹو پر سوار ہوا تو کیا؟ ہوٹل میں ٹھہرا تو کیا اور کسی معمولی مکان میں ٹھہرا تو کیا؟ بہت ہوگا تو میرے تعلقہ دار بھائی مجھ سے کنارہ کش رہیں گے۔ میرے حوالی موالی مجھ سے الگ ہوجائیں، اس کی مجھے پروا نہیں ہے۔ میں تو دل سے چاہتا ہوں کہ ان لوگوں سے الگ تھلگ رہوں۔ اگر محض اپنی تکلیف سے صدہا خاندانوں کا بھلا ہوجائے۔ تو میں انسان نہیں ہوں، اگر اسے شوق سے قبول نہ کروں۔ اگر اپنے گھوڑے اور فٹن، سیروشکار، نوکرچاکر اور زمانہ ساز اعزہ وآتش خواروں سے محروم ہوکر میں ہزاروں امیرو

غریب خاندانوں کا، بیواؤں کا، یتیموں کا بھلا کرسکوں تو مجھے اس میں مطلق تامل نہ ہونا چاہیے۔ ہزاروں خاندانوں کی قسمت اس وقت میری مٹھی میں ہے۔ میری تن پروری ان کا زہر قاتل اور میری نفس کشی ان کا آبِ حیات ہے۔ میں آبِ حیات بن سکتا ہوں تو زہر قاتل کیوں بنوں؟ اور پھر اسے نفس کشی سمجھنا بھی میری زیادتی ہے۔ یہ بالکل نااتفاقی امر ہے کہ میں آج اس جائداد پر قابض ہوں۔ میں نے اسے کمایا نہیں۔ حاصل نہیں کیا۔ اس کے لیے خون نہیں گرایا۔ پسینہ نہیں گرایا۔ اگر مجھے یہ جائداد نہ ملتی تو آج اپنے لاکھوں بھائیوں کی طرح میں بھی فکرِ معاش میں مصروف ہوتا۔ میں کیوں نہ بھول جاؤں کہ میں اس ریاست کا مالک ہوں۔ ایسی ہی آزمائشوں میں انسانیت کی پہچان ہوتی ہے۔ میں نے برسوں کتب بینی کی۔ برسوں انسانی فلاح کے اصول کا قائل رہا۔ یقیناً یہ میری انتہا درجے کی بزدلی، نفس پرستی ہے اگر اس موقع پر میں ان تمام اصولوں کو بھلا دوں۔ خودغرضی کو انسانیت اور اخلاق پر غالب آجانے دوں۔ خودغرضی کا سبق سیکھنے کے لیے مجھے گیتا اورمل اور انسیں اور ارسطو کے شاگرد بننے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ سبق تو مجھے اپنے دوسرے بھائیوں سے مفت مل جاتا۔ عام رواج سے بہتر اور کون استاد تھا؟ عام آدمیوں کی طرح میں بھی خودغرضی اور ہوس پرستی کے آگے سر جھکا دوں تو پھر خصوصیت کہاں رہی؟ نہیں، میں کنونشن (رواج) کی غلامی نہ کروں گا۔ جہاں ثواب کرسکتا ہوں، عذاب نہ کروں گا۔ جہاں دعا مل سکتی ہے، آہ نہ لوں گا۔ ایشور تم میری مدد کرو۔ تم نے مجھے راجپوت کے گھر پیدا کیا ہے۔ میری ذات سے اس جانباز قوم کو شرمندہ مت کرو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ گردن خود غرضی کے آگے نہیں جھکے گی۔ میں رام اور بھشیم اور پرتاپ کا جانشین ہوں۔ تن پروری کا غلام نہ بنوں گا۔ نفس کی اطاعت نہ کروں گا۔

کنورجگدیش سنگھ کو اس وقت ایسا احساس ہوا گویا وہ کسی اونچے مینار پر چڑھ گئے ہیں۔ دل میں امنگ آگئی۔ آنکھیں روشن ہوگئیں۔ مگر ایک ہی لمحے کے بعد اس امنگ کا اتار ہونے لگا۔ اونچے مینار سے نیچے کی طرف آنکھیں گئیں۔ سارا جسم کانپ اٹھا۔ سر میں چکر سا آگیا۔ اس آدمی کی سی حالت ہوئی جو کسی ندی کے کنارے بیٹھا ہوا اس میں کودنے کا ارادہ کررہا ہو۔

انھوں نے سوچا۔ کیا میرے گھر کے لوگ مجھ سے متفق ہوں گے؟ اور اگر وہ

میری خاطر سے متفق ہو بھی جائیں تو مجھے مجاز ہے کہ اپنے ساتھ ان کی تمناؤں کا بھی خون کروں؟ اور تو اور ماتا جی کبھی نہ مانیں گی۔ اور غالبًا بھائی لوگ بھی گریز کریں۔ ریاست کی حیثیت کے لحاظ سے وہ کم سے کم دس ہزار سالانہ کے مستحق ہیں۔ اوران کے حق کو میں کسی طرح نظر انداز نہیں کرسکتا۔ میں صرف اپنی ذات کا مختار ہوں۔ مگرمیں بھی تو تنہا نہیں ہوں۔ ساوتری آپ چاہے میرے ساتھ آگ میں کودنے کو تیار ہوجائے مگر اپنے پیارے لختِ جگر کو کبھی اس آنچ کے قریب نہ آنے دے گی۔

کنورصاحب نہایت خطرناک زمین پر قدم رکھ رہے تھے اور ہر ایک قدم انھیں بلاتا تھاکہ آگے مت بڑھو۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بچے کو بڑے ناز ونعمت سے پالا تھا۔ نکبت وادبار کے زمانے میں بھی اس کی پرورش میں کوئی کمی نہ ہونے پائی تھی۔ کنورصاحب خود چاہے بیل گاڑیوں پر بیٹھنے کے لیے مجبور ہوں مگر یہ نوبت کبھی نہیں آئی کہ لڑکے کی سواری میں ٹانگن نہ رہا ہو۔ امارت و ریاست کا غرور اس کے دل میں کوٹ کوٹ کربھرا گیا تھا۔ ساوتری اسے ہمیشہ راجا صاحب کہا کرتی۔ چار سال کا نادان بچہ غرور اور تمکنت کا پتلا بن گیا تھا۔ اس کی پیشانی سے اقبال کا نور جھلکتا تھا۔ اس کے انداز میں ایک تحکم اور باتوں سے ایک خودسری کی شان ٹپکتی تھی۔ کیا باغِ ریاست کی اس زینت کو بادِحوادث کا نشانہ بننے دوں؟ کون سا منھ لے کر ساوتری سے یہ باتیں کہوں گا۔ جب سے شادی ہوئی ہے، اس غریب کو کبھی آرام نہ نصیب ہوا۔ اب تک یہ امید تھی کہ شبِ غم کی کبھی نہ کبھی سحر ہوگی۔ اور جب کہ سحر ہوگئی، سوئی ہوئی خواہشیں بے دار ہوئیں، خوشیوں نے چہکنا شروع کیا، تو یہ کتنا بڑا ستم ہے کہ وہ سحر شبِ غم سے بھی زیادہ تاریک ہو۔ جہاں امید کے ستارے بھی نہیں چمکتے۔ جہاں وہ رات کی ٹھنڈک نہیں، شبنم نہیں، وہ جاں بخش نیند نہیں۔ وہ پُرمزہ خواب نہیں۔ وہ کیفیت انگیز سکوت نہیں۔ یہ ستم ہے۔ قہر ہے۔

کنورصاحب اور زیادہ نہ سوچ سکے۔ وہ ایک سراسیمگی کی حالت میں پلنگ پر سے اٹھ بیٹھے اورکمرے میں ٹہلنے لگے۔ ذرا دیر کے بعد انھوں نے جنگلے سے باہر کی طرف جھانکا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ ان کی پریشانیوں کی طرح۔ بے انتہا اور عمیق۔ سامنے گومتی ندی بہتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ندی کے کنارے چلے گئے اور دیر تک وہاں ٹہلتے رہے۔ دلِ مضطر کو امواجِ دریا سے کوئی مناسبت ہے شاید اس لیے

کہ لہریں بھی مضطرب ہیں۔

انھوں نے اپنے بھٹکتے ہوئے خیالات کو پھر مجتمع کیا۔ اگر ریاست کی خالص آمدنی سے یہ وثیقے دیے جائیں گے تو قرض کا سود نکلنا بھی دشوار ہوجائے گا۔ اصل کا ذکر ہی کیا۔ کیا آمدنی میں اضافہ نہیں ہوسکتا؟ ابھی اصطبل میں بیس گھوڑے ہیں۔ میرے لیے ایک کافی ہے۔ ملازموں کی تعداد سو سے کم نہ ہوگی۔ میرے لیے دو کافی سے زیادہ ہوسکتے ہیں۔ یہ انسانیت سے بعید ہے کہ اپنے ہی بھائیوں سے ذلیل خدمتیں کرائی جائیں ان آدمیوں کو میں اپنی سیر کی زمین دے دوں گا آرام سے کھیتی کریں گے۔ اور مجھے دعائیں دیں گے۔ باغیچوں کے پھل اب تک ڈالیوں اور تھنوں کی نذر ہوجاتے تھے۔ اب انھیں فروخت کردوں گا۔ اور سب سے بڑی رقم تو بیعائی کی ہے۔ صرف مہیش گنج کے بازار سے دس ہزار روپے وصول ہوتے ہیں۔ یہ سب رقم مہنت جی ہضم کر جاتے ہیں۔\ان کے لیے ایک ہزار روپے سال کافی ہونے چاہئیں۔ اب کی اس بازار کا ٹھیکہ کردوں گا۔ آٹھ ہزار سے کم نہ ملیں گے۔ ان مدوں سے پچیس ہزار سالانہ کی نکاسی ہوسکتی ہے۔ ساوتری اور للاّ(لڑکا) کے لیے ایک ہزار روپے ماہوار بہت ہے۔ میں ساوتری سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ یا تو ہزار روپے ماہوار لو، اور میرے ساتھ رہو۔ یا ریاست کی نصف آمدنی لے لو اور مجھے چھوڑ دو۔ رانی بننے کی ہوس ہے تو شوق سے رانی بنو۔ مگر میں راجا نہ بنوں گا۔

دفعتاً کنور صاحب کے کانوں میں آواز آئی۔ ”رام نام ست ہے“ انھوں نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کئی آدمی سڑک پر ایک لاش لیے آتے تھے۔ ان لوگوں نے ندی کے کنارے چتا بنائی۔ اور آگ لگادی۔ دو عورتیں بین کرکے رو رہی تھیں۔ اس بین کا کنور صاحب کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ دل میں شرمندہ ہو رہے تھے اور میرا دل ذرا بھی نہیں پسیجا۔ پتھر کی مورت کی طرح کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ یکایک ایک عورت نے روتے ہوئے کہا۔ ”ہائے میرے راجا! تمھیں بس کیسے میٹھا لگا۔“ یہ دل خراش بین سنتے ہی کنور صاحب کے جگر میں ایک ٹھیس سی لگ گئی۔ بے اثری کا برف پھٹ گیا۔ رقت اٹھ آئی۔ اور آنکھیں آب گوں ہوگئیں۔ غالباً اس غریب نے زہر کھاکر جان دی ہے۔ ہائے اسے زہر کیسے میٹھا لگا؟ اس میں کتنا درد ہے۔ کتنی حسرت کتنی حیرت! زہر توکڑوی چیز ہے۔ وہ کیوں کر میٹھی ہوگئی؟ زہر تلخ کے بدلے جس شخص نے جانِ شیریں دے دی، اس

پر کوئی بڑا سانحہ آیا ہوگا۔ ایسی ہی حالت میں زہر میٹھا ہوسکتا ہے۔ ان چند لفظوں میں تاثیر درد کا ایسا جادو بھرا ہوا تھا کہ کنور صاحب تڑپ گئے۔ یہی صدائیں بار بار ان کے تارِ جگر میں گونجتی تھیں۔ ان میں انھیں معنی و جذبات کا ایک دفتر چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب ان سے وہاں کھڑا نہ رہا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ان سوگواروں کے پاس آئے اور ایک آدمی سے پوچھا۔ کیا بہت دنوں سے بیمار تھے؟ اس آدمی نے کنورصاحب کی طرف ایک حسرت ناک انداز سے دیکھا اور بولا۔ نہیں صاحب کہاں کی بیماری۔ ابھی آج شام تک مزے میں باتیں کررہے تھے۔ معلوم نہیں شام کو کیا کھالیا کہ خون کی قے آنے لگی۔ جب تک حکیم صاحب کے یہاں جائیں تب تک آنکھیں الٹ گئیں۔ نبض چھوٹ گئی۔ حکیم صاحب نے آکر دیکھا تو کہا اب کیا ہوسکتا ہے۔ اس نے زہر کھا لیا۔ بس صاحب گھر میں رونا پیٹنا ہونے لگا۔ ابھی کل بائیس تئیس سال کی عمر تھی۔ ایسا پٹھا سارے لکھنؤ میں نہیں تھا۔

کنور۔ ”کچھ معلوم نہیں، زہر کیوں کھایا؟“

اس آدمی نے مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ صاحب اور تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب سے یہ بڑا بینک ٹوٹا ہے بہت اداس رہتے تھے۔ کئی ہزار روپے بینک میں جمع کیے تھے۔ گھی دودھ ملائی کی بڑی دکان تھی۔ برادری میں مان تھا۔ وہ ساری جمع ڈوب گئی۔ ہم لوگ منع کرتے تھے کہ بینک میں روپے نہ رکھو۔ مگر صاحب ہون ہار تو یہ تھی کہ کسی کی نہیں سنی۔ آج صبح کو بیوی سے گہنے مانگتے تھے کہ گرو رکھ کر اہیروں کو دودھ کا دام دیں۔ اس سے باتوں باتوں میں تکرار ہوگئی۔ بس صاحب، نہ جانے کہاں سے زہر لا کے کھا لیا۔

کنورصاحب کے جگر میں ایک رعشہ سا آگیا۔ معاً خیال گزرا، شیو داس تو نہیں ہے؟ پوچھا۔ کیا ان کا نام شیو داس تو نہیں تھا؟ اس آدمی نے حیرت سے دیکھ کر کہا۔ ہاں صاحب یہی نام تھا۔ آپ سے جان پہچان تھی کیا؟

کنور۔ ”ہاں ہم اور وہ بہت دنوں تک برہل میں ساتھ ساتھ کھیلے تھے۔ آج شام کو وہ ہم سے بینک گھر کے احاطے میں ملے تھے۔ مگر انھوں نے مجھ سے ذرا بھی ذکر کیا ہوتا تو میں حتی الامکان ان کی مدد کرتا۔ افسوس!“

اس آدمی نے اب کنور صاحب کو غور سے دیکھا اور جاکر عورتوں سے بولا۔ چپ ہوجاؤ۔ برہل کے راجا صاحب آئے ہیں۔ اتنا سنتے ہی شیو داس کی ماں نے زور زور سے سر پیٹا۔ اور روتی ہوئی کنور صاحب کے پیروں پر گرپڑی۔ اس کی زبان سے صرف یہ الفاظ نکلے۔ ''بیٹا! بچپن میں تم اسے بھیا کہا کرتے تھے......'' اور گلا پھنس گیا۔ کنور صاحب کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ شیو داس کی تصویر ان کے سامنے کھڑی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر دوستانہ بے تکلفی اور خلوص کی جگہ ایک شکوۂ بے کس تھا۔ جو زبان حال سے کہہ رہا تھا۔ ''تم نے دوست ہوکر میری جان لی!''

(۷)

صبح ہوگئی۔ مگر کنور صاحب کی آنکھیں خواب سے آشنا نہ ہوئیں۔ جب سے وہ گومتی کے کنارے سے لوٹے تھے، ان کے دل پر ایک ویراگ سا چھایا ہوا تھا۔ وہ رقت انگیز نظارہ نفس کی خودغرضانہ دلیلوں کے لیے دیوارِ آہن بنا ہوا تھا۔ اس نے تزلزل کو استحکام کی صورت میں تبدیل کردیا تھا۔ ساوتری کی دل شکنی، للا کی مایوسانہ ضد اور ماں کی زبان جیسے ارادہ شکن اسلحہ اس دیوارِ آہن سے ٹکرا کر ناکام چلے جاتے تھے۔ ساوتری کڑھے گی۔ کڑھے۔ للا کو کشمکشِ حیات میں کودنا پڑے گا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ اماں جان دینے پر آجائیں گی۔ بہتر ہے۔ میں اپنے زن و فرزند، خویش و برادر کے لیے ہزاروں خاندانوں کا خون نہ کروں گا۔ آہ! شیو داس کو زندہ رکھنے کے لیے میں ایسی ایسی کئی ریاستیں نثار کرسکتا ہوں۔ ساوتری کو فاقہ کرنا پڑے۔ للا کو مزدوری کرنا پڑے۔ مجھے دربدر بھیک مانگنا پڑے۔ تب بھی دوسروں کا گلا نہ دباؤں گا۔ اب دیر کرنے کا موقع نہیں۔ معلوم نہیں آج کل میں یہ خانہ بربادیاں کون سے پہلو اختیار کریں۔ کیا کیا ستم ڈھائیں...... مجھے اتنا پس و پیش کیوں ہورہا ہے؟ محض نفس کی کمزوری ہے۔ ورنہ کوئی ایسا بڑا کام نہیں جو کسی نے نہ کیا ہو۔ آئے دن لوگ لاکھوں روپیے خیرات کرتے رہتے ہیں۔ ابھی ابھی بہار کے ایک راجا نے اپنی بارہ لاکھ سالانہ نفع کی جائداد تعلیم نسواں کے لیے وقف کردی ہے۔ میں اتنا پست ہمت کیوں ہوجاؤں؟ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس سے کیوں منھ موڑوں۔ جو کچھ ہو، چاہے سر پر جو کچھ پڑے۔ اس کی کیا فکر؟ (گھنٹی بجائی) ایک لمحے میں اردلی آنکھیں ملتا ہوا حاضر ہوا۔

کنورصاحب بولے۔ "ابھی جیکب صاحب بالسٹر کے پاس جا کر میرا سلام دو۔ جاگ گئے ہوں گے۔ کہنا نہایت ضروری کام ہے۔ نہیں۔ یہ رقعہ لیتے جاؤ۔ موٹر تیار کرا لو۔"

(۸)

مسٹر جیکب نے کنورصاحب کو بہت سمجھایا کہ آپ اس دلدل میں قدم نہ رکھیے، ورنہ نکلنا محال ہوجائے گا۔ معلوم نہیں ابھی اور کتنی ایسی رقمیں ہیں جن کی آپ کو خبر نہیں ہے۔ آپ کی جانب سے اعلان ہوتے ہی سب اپنے اپنے دعوے پیش کریں گے۔ اور آپ کو سبھی دعوے تسلیم کرنے پڑیں گے۔ اس وقت آپ کسی کو مستثنیٰ کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ مگر دل میں قائم ہونے والا فیصلہ چونے کا فرش ہے جسے فہمائش کے تھپیڑے کمزور کرنے کے بجائے اور بھی مضبوط کر دیتے ہیں۔ کنورصاحب اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ اور دوسرے دن اخباروں میں اعلان کردیا کہ ہم برہل کی رانی صاحبہ مرحومہ کی کل مالی ذمے داریوں کو تسلیم کرتے ہیں اور معیاد وعدہ کے اندر انھیں ادا کریں گے۔

اس اعلان کے شائع ہوتے ہی سارے لکھنؤ میں ہلچل ہوگئی۔ باخبر لوگوں کی رائے میں یہ کنورصاحب کی صریح حماقت تھی۔ اور جو لوگ قانون سے بے خبر تھے، انھوں نے خیال کیا کہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے۔ ایسے بہت کم آدمی تھے جنھوں نے کنورصاحب کی نیتِ صفائی اور اخلاقی احساس کی داد دی ہو۔ مگر داد چاہے نہ ملی ہو، دعاؤں کی کمی نہ تھی۔ بینک کے ہزاروں غریب معاملہ دار سچے دل سے کنورصاحب کو دعائیں دے رہے تھے۔

ایک ہفتے تک کنورصاحب کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملی۔ مسٹر جیکب کا خیال درست نکلا۔ مطالبات کی فہرست روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کتنے ہی پرونوٹ ایسے ملے جن کا انھیں مطلق علم نہیں تھا۔ جوہریوں اور دوسرے بڑے بڑے دکانداروں کی یافتنی بھی کم نہ تھی۔ تخمینہ تیرہ چودہ لاکھ کا تھا۔ میزان بیس لاکھ کے قریب جا پہنچا۔ کنورصاحب گھبرائے۔ اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو، مجھے اپنے بھائیوں کو بھی وثیقہ سے محروم کرنا پڑے، جس کا انھیں کوئی مجاز نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ساتویں دن انھوں نے کئی دکان داروں کو سخت سست کہہ کر سامنے سے دور کردیا۔ جہاں شرح سود زیادہ تھی۔ اس کی تخفیف کروائی۔ اور انقضائے میعاد کی قید سے فائدہ اٹھانے میں مطلق تامل نہ کیا۔ انھیں مہاجنوں

کی سخت گیری پر غصہ آتا تھا۔ ان کے خیال میں مہاجنوں کو ڈوبتی ہوئی رقم کا ایک حصہ مل جانے پر بھی اپنی تقدیر کا مشکور ہونا چاہیے تھا۔ ان جز رسیوں کے باوجود کل مطالبات کی میزان انیس لاکھ سے کم نہ ہوگی۔

کنورصاحب ان کاموں سے فرصت پاکر ایک روز انڈسٹریل بینک کی طرف جا نکلے۔ بینک کھلا ہوا تھا۔ تن مردہ میں جان آگئی تھی۔ اس کا تنفس جاری ہوگیا تھا۔ بازکش معاملہ داروں کا ہجوم تھا۔ لوگ خوش خوش واپس جارہے تھے۔ کنورصاحب کو دیکھتے ہی صدہا آدمی فرطِ عقیدت سے ان کی طرف دوڑے اور کسی نے رو کر، کسی نے ان کے قدموں کو بوسہ دے کر، کسی نے زیادہ مہذب طریق سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بینک کے عملوں سے بھی ملے۔ لوگوں نے کہا کہ اس اعلان نے بینک کو زندہ کردیا۔ بنگالی بابو نے سابق منیجر لالہ سائیں داس پر گل افشانی شروع کی۔ "وہ سمجھتا تھا۔ دنیا میں سب آدمی بھلا مانس ہے۔ ہم کو نصیحت کرتا تھا۔ اب اس کا آنکھ کھل گیا ہے۔ اکیلا گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔ کسی کو منھ نہیں دکھاتا۔ ہم سنتا ہے، وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ پر بڑا صاحب بولا۔ بھاگے گا تو ہم لوگ تمھارے اوپر وارنٹ جاری کردے گا۔" اب سائیں داس کی جگہ بنگالی بابو منیجر ہوگئے تھے۔

اس کے بعد کنورصاحب برہل آئے۔ بھائیوں نے یہ قصہ سنا تو بگڑے۔ اور قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی۔ ماتاجی کو ایسا صدمہ ہوا کہ وہ اسی دن بیمار ہوگئیں اور ایک ہی ہفتے میں مایوس و الم زدہ اس دنیائے اسباب سے رخصت ہوگئیں۔ ساوتری کو بھی چوٹ لگی۔ پر اس نے محض صبر ہی نہیں کیا بلکہ شوہر کی فیاضی اور ایثار کی تعریف کی۔ رہ گئے لال صاحب۔ اس نے جب دیکھا کہ اصطبل سے گھوڑے نکلے جاتے ہیں، ہاتھی مکن پور کے میلے میں بکنے کے لیے بھیج دیے گئے، کہار برخاست کیے جارہے ہیں تو گھبرایا ہوا کنور صاحب کے پاس آکر بولا۔ "بابوجی یہ سب آدمی گھوڑے ہاتھی کہاں لے جارہے ہیں؟"

کنورصاحب زہر خندہ سے بولے۔ "یہ ایک راجا صاحب کے نوید میں شریک ہونے جارہے ہیں۔"

لال صاحب۔ "کون سے راجا ہیں؟"

کنور۔ "ان کا نام راجا غریب سنگھ۔"

لال صاحب۔ "کہاں رہتے ہیں؟"

کنور۔ ''بے کس گنج میں۔''
لال صاحب۔ ''تو ہم بھی جائیں گے۔''
کنور۔ ''تمھیں بھی لے چلیں گے۔ مگر اس بارات میں پیدل چلنے والوں کی عزت سواروں سے زیادہ ہوگی۔''
لال صاحب۔ ''تم ہم بھی پیدل چلیں گے۔''
کنور۔ ''وہاں محنتی آدمی کی تعریف ہوتی ہے۔''
لال صاحب۔ ''تو ہم خوب محنت کریں گے۔''

کنور صاحب کے دونوں بھائی پانچ پانچ ہزار روپے سالانہ لے کر الگ ہوگئے۔ کنور صاحب اپنے اور اپنے عیال کے لیے بہ مشکل تمام ایک ہزار روپے سالانہ کا انتظام کرسکے۔ مگر یہ رقم ایک رئیس کی شان اور وقار کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہے۔ حاجت مند لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ ان سب کی خاطر کرنی پڑتی ہے۔ بڑی مشکل سے گزر ہوتی ہے۔ ادھر ایک سال سے شیو داس کے خاندان کا بار بھی سر پر آپڑا ہے۔ مگر کنور صاحب کبھی اپنے فیصلے پر افسوس نہیں کرتے۔ انھیں کبھی کسی نے ملول نہیں دیکھا۔ ان کا چہرہ مرادنہ قناعت اور غرورِ صادق سے منور نظر آتا ہے۔ ادبیات کا شوق پہلے ہی سے تھا۔ اب باغبانی سے الفت ہوگئی ہے۔ اپنے باغ میں صبح اور شام پودوں کی دیکھ بھال کیا کرتے ہیں اور لال صاحب تو پکّے کسان ہوتے نظر آتے ہیں۔ ابھی نو دس سال سے زیادہ عمر نہیں ہے۔ لیکن منھ اندھیرے کھیتوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ کھانے پینے کی بھی سدھ نہیں رہتی۔ان کا گھوڑا موجود ہے۔ مگر ہفتوں اس پر سوار نہیں ہوتے۔ ان کی یہ دھن دیکھ کر کنور صاحب بہت خوش ہوتے ہیں اور کہا کرتے ہیں۔ اب میں ریاست کے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہوں۔ لال صاحب اس سبق کو کبھی فراموش نہ کریں گے۔ گھر میں دولت رہتی تو عیش اور شکار اور شرارت کے سوا اور کیا سوجھتی؟ دولت بیچ کر ہم نے محنت اور قناعت خریدلی اور یہ سودا برا نہیں ہے۔ مگر ساوتری اتنی قانع نہیں۔ کنور صاحب کی ممانعت کے باوجود اسامیوں سے چھوٹے موٹے تحفے لے لیا کرتی ہے۔ اور خاندان کے رعب میں فرق نہیں آنے دیتی۔

اردو ماہنامہ کہکشاں فروری 1919 میں شائع ہوا۔ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سرودر 7 میں شامل ہے۔

سوتیلی ماں

بیوی کی وفات کے تین ہی ماہ بعد دوسری شادی کرلی۔ مرنے والی کے ساتھ ایسی بے وفائی اور اس کی روح پر ایسا ستمِ ناروا ہے، کہ اس کی تاویل عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ میں یہ نہ کہوں گا کہ یہ مرحومہ کی آخری وصیت تھی اور نہ شاید میرا یہ عذر ہی قابلِ پذیرائی سمجھا جائے کہ ہمارے کم سن بچے کے لیے ماں ایک لازمی کیفیت تھی۔ پر اس معاملے میں میرا ضمیر بالکل صاف ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ برزخ میں میرا یہ فعل زیادہ سرزنش کے قابل نہ سمجھا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ میں نے شادی کی۔ اور باوجودیکہ ایک نویلی دلہن پر مادرانہ فرائض کی تلقین، صدائے بے ہنگام اور اس کی ناشگفتہ تمناؤں کے لیے ہوائے گرم تھی۔ پر میں نے پہلے ہی دن امبا سے صاف کہہ دیا کہ میں نے تم سے شادی صرف اس لیے کی ہے کہ تم میرے بھولے بچے کی ماں بنو۔ اور ماں کا غم اس کے دل سے بھلادو۔

(۲)

دوماہ گزر گئے۔ میں شام کو منو کو ساتھ لے کر ہواخوری کے لیے جایا کرتا تھا۔ لوٹتے وقت بعض احباب سے ملاقات بھی کرلیا کرتا تھا۔ ان صحبتوں میں منو بلبل کی طرح چہکتا۔ دراصل ان ملاقاتوں کی غرض لطفِ صحبت نہیں، منو کے طفلانہ کمالات کی نمائش تھی۔ جب احباب اسے پیار کرتے، اس کی ذہانت اور فطری فراست کو سراہتے، تو مجھ پر ایک نشہ طاری ہوجاتا تھا۔ خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا۔

ایک روز میں منو کے ساتھ بابو جوالا سنگھ کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ میرے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ میرے اور ان کے درمیان کوئی راز نہ تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اپنی کمزوریاں اور خامیاں اپنے خاندانی تنازعے اور مالی پریشانیاں بیان کرتے تھے۔ نہیں۔ ہم ان بے تکلفی کے تذکروں میں بھی حفظِ وقار کو مدِ نظر رکھتے تھے۔ اپنی شکستوں کی داستانیں کبھی ہماری زبان پر نہ آتیں۔ سیاہ داغوں کو ہمیشہ چھپاتے تھے۔

رازداری میں بھی راز تھا۔ بے تکلفی میں تکلف۔

دفعتاً بابو جوالا سنگھ نے منو سے پوچھا۔ کیوں منو! تمھاری نئی اماں تمھیں خوب پیار کرتی ہیں نا؟

میں نے مسکرا کر منو کی طرف دیکھا۔ اس کے جواب کی طرف سے مجھے کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں خوب جانتا تھا کہ امبا اسے دل سے پیار کرتی ہے۔ مگر مجھے کتنا تعجب ہوا جب منو نے اس سوال کا جواب زبان سے نہیں آنکھوں سے دیا۔ آنسو کے کئی قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

مجھ پر شرم سے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ان چند قطروں نے امبا کے اس خوشنما اور دلآویز تصور کو مٹا دیا جو میں نے ان دو مہینوں میں تیار کیا تھا۔ جوالا سنگھ نے میری طرف ناہمدردانہ انداز سے دیکھ کر منو سے کہا۔ کیوں روتے ہو بیٹا؟

منو نے برجستہ کہا۔ ”روتا نہیں ہوں۔ آنکھ میں دھواں لگ گیا تھا۔“

جوالا سنگھ کا سوتیلی ماں کی ماممتا پر شک کرنا ایک قدرتی امر تھا۔ مگر حق یہ ہے کہ میں بھی شبہے سے خالی نہ تھا۔ مجھے یقین آگیا تھا کہ امبا وہ رحم اور محبت کی دیوی نہیں ہے جسے سراہتے میری زبان نہ تھکتی تھی۔ جب یہاں سے اٹھا تو میرا دل بھرا ہوا تھا اور خفت سے گردن نہ اٹھتی تھی۔

(۳)

میں مکان کی طرف چلا تو سوچنے لگا کہ کیونکر اپنے غصے کا اظہار کروں؟ کیوں نہ منھ ڈھانپ کر لیٹ رہوں؟ امبا پوچھے۔ تو ترش ہو کر کہہ دوں۔ ”سر“ میں درد ہے۔ مجھے دق مت کرو۔“ کھانا کھانے کو اٹھائے۔ تو کرخت لہجے میں جواب دوں۔ امبا ضرور سمجھ جائے گی کہ کوئی بات میری طبیعت کے خلاف ہوئی ہے۔ خوشامد کرنے لگے گی۔ اس وقت طنز وطعن سے اس کا کلیجہ چھلنی کردوں گا۔ ایسا رُلاؤں گا کہ وہ بھی یاد کرے۔ پھر خیال آیا۔ اس کا ہنس مکھ چہرہ دیکھ کر مجھے اپنے دل پر قابو بھی رہے گا؟ اس کی ایک متبسم نگاہ، ایک میٹھی بات، ایک پُرمزہ چٹکی، میرے اس سنگِ گراں کے ریزے کر سکتی ہے۔ پر اس کمزوری پر میری طبیعت جھنجلائی۔ یہ میری کیا حالت ہے؟ کیا اتنی جلدی ہوا کا رخ بدل گیا؟ مجھے دعویٰ تھا کہ میں شیریں اداؤں کے طوفان اور سخن ہائے دلآویز کے سیلاب میں بھی اٹل رہ سکتا ہوں۔ کہاں اب یہ کیفیت ہے کہ ان ہلکے جھونکوں کا بھی

متحمل ہونے کی تاب نہیں۔ اس ملامت نے میرے دل کو مضبوط لیا۔ تاہم ایک ایک قدم پر غصے کی باگ ڈھیلی ہوتی جاتی تھی۔ آخر میں نے طبیعت پر زور ڈال کر ایک فرضی، نقلی غصے کی کیفیت پیدا کی اور ارادہ کیا کہ چلتے ہی چلتے برس پڑوں گا۔ ایسا نہ ہو کہ تاخیر کی ہوائیں اس ابرِ خشک کو اڑا کر لے جائیں۔

مگر جوں ہی گھر پہنچا تو امبا نے دوڑ کر منو کو گود میں اٹھا لیا اور پیار کر کے بولی۔ ”تم آج اتنی دیر تک کہاں گھومتے رہے؟ چلو چلو دیکھو میں نے تمھارے لیے کیسی اچھی اچھی پھلوریاں بنائی ہیں۔

اس کے انداز میں ایسا نورانی خلوص تھا کہ میرے نقلی غصے کی دھندلی تاریکی بھی غائب ہوگئی۔ میں نے سوچا۔ اس دیوی پر بدگمانی کرنا انتہا درجے کا ظلم ہے۔ منو نادان بچہ ہے۔ ممکن ہے کہ ماں کو یاد کر کے رو پڑا ہو۔ امبا کی بے اعتنائی یا بے مہری ہرگز اس کی خطاوار نہیں۔

ہمارے جذبات پیش بندیوں کے مطیع نہیں ہوتے۔ ہم ان کے اظہار کے لیے کیسے کیسے الفاظ گھڑتے ہیں۔ کیسے کیسے انداز اختراع کرتے ہیں۔ مگر عین موقع پر ہمارے فقرے اور الفاظ دغا دے جاتے ہیں۔ اور جذبہ اپنے فطری اور طبعی رنگ میں نمودار ہوجاتا ہے۔ میں نے امبا کو نہ طعنے دیے۔ نہ اس پر بگڑا۔ نہ غصے سے منھ لپیٹ کر سویا۔ بلکہ اس سے بہت ملائم لہجے میں بولا۔ ”منو نے آج مجھے بہت شرمندہ کیا خزانچی صاحب نے اس سے پوچھا۔ کہ تمھاری نئی اماں تمھیں پیار کرتی ہیں یا نہیں؟ تو وہ رونے لگا۔ میں شرم کے مارے گڑ گیا۔ مجھے اس کا تو گمان بھی نہیں ہوسکتا کہ تم نے اسے کچھ کہا ہوگا۔ پر یتیم بچوں کا دل اس تصویر کی طرح ہے جس پر ہلکا پردہ پڑا ہو۔ ہوا کی ہلکی سی جنبش بھی پردہ کو ہٹا دیتی ہے۔ اور خوشنما تصویر آنکھوں کے سامنے کھل جاتی ہے۔“

یہ باتیں کتنی ملائم تھیں۔ تاہم امبا کا کھلا ہوا چہرہ کچھ افسردہ ہوگیا۔ وہ آبدیدہ ہوکر بولی۔ ”اس کا لحاظ تو مجھ سے جہاں تک ہوسکا پہلے ہی دن سے رکھا ہے۔ پر یہ غیر ممکن ہے کہ میں منو کے دل سے ماں کا غم مٹا دوں۔ میں چاہے جان ہی دے دوں پر میرے نام پر سوتیلی کا داغ لگا ہوا ہے اسے نہیں مٹا سکتی۔“

(۴)

مجھے خوف تھا کہ اس گفتگو کا کہیں معکوس اثر نہ ہو۔ مگر دوسرے ہی دن سے مجھے

امبا کے مزاج میں ایک نمایاں تغیر نظر آنے لگا۔ میں اسے صبح سے شام تک منّو ہی کی نازبرداریوں میں مصروف دیکھتا۔ یہاں تک کہ اس دھن میں اسے میری آسائش کا بھی خیال نہ رہتا۔ لیکن میں ایسا بے نفس نہ تھا کہ اپنی فرمائشوں کو منّو پر قربان کردیتا۔ کبھی کبھی مجھے امبا کی بے اعتنائی ناگوار گزرتی۔ پر اس کا ذکر زبان پر نہ لاتا۔

ایک روز میں معمول سے قبل دفتر سے لوٹا تو منو کو دروازے پر دیوار کی طرف منھ کیے کھڑے دیکھا۔ مجھے اس وقت آنکھ مچولی کھیلنے کی شرارت سوجھی۔ میں نے دبے پاؤں جاکر پیچھے سے منو کی آنکھیں بند کردیں۔ پر آہ! اس کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ میں نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔ گویا سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ منو کو گود میں لے کر بولا۔ ”منو کیوں رو رہے ہو؟“

یہ کہتے کہتے میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ منو آنسو پی کر بولا۔ جی نہیں روتا تو نہیں ہوں۔“

میں نے اسے گلے سے لگا کر کہا۔ ”اماں نے کچھ کہا تو نہیں؟“

منو نے سسک کر کہا۔ ”جی نہیں۔ وہ تو مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔“

مجھے یقین نہ آیا۔ پوچھا۔ ”وہ پیار کرتیں تو تم روتے کیوں؟ اس دن خزانچی صاحب کے گھر بھی تم روتے تھے۔ تم مجھ سے چھپاتے ہو۔ شاید تمھاری اماں خفا ہوتی ہیں۔“ منو میری طرف طفلانہ متانت سے دیکھ کر بولا۔ جی نہیں۔ وہ مجھے پیار کرتی ہیں۔ اسی لیے مجھے بار بار رونا آتا ہے۔ میری ماں مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ نئی اماں اس سے بھی زیادہ پیار کرتی ہیں۔ اس لیے مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ بھی اسی طرح مجھے چھوڑ کر نہ چلی جائیں۔“

یہ کہہ کر منو پھر زور زور سے سسکنے لگا۔ میرے آنسو بھی نہ رک سکے۔ امبا کے پیار نے اس ننھی سی معصوم جان پر کتنا ستم ڈھایا تھا۔ ذرا دیر کے لیے میں بھی سہم اٹھا۔ کسی شاعر کا یہ خیال یاد آیا کہ نیک روحیں اس مکروہ دنیا میں زیادہ دنوں تک نہیں ٹھہرتیں۔ کہیں تقدیر تو اس بھولے بچے کی زبان سے یہ الفاظ نہیں کہلا رہی ہے؟ ایشور نہ کرے کہ وہ روزِ بد دیکھنا پڑے۔ مگر میں نے استدلال سے اس اندیشے کو دل سے دور کردیا۔ ماں کی موت نے پیار اور جدائی میں ایک ذہنی تعلق پیدا کردیا ہے اور کوئی بات نہیں۔

منو کو گود میں لیے ہوئے امبا کے پاس آیا اور مسکرا کر بولا۔ ان سے پوچھو۔ کیوں رو رہے ہیں؟ ”امبا چونک پڑی۔ اس کے تیور چڑھ گئے۔ بولی تمھیں پوچھو۔

میں نے کہا۔ ”یہ اس لیے روتے ہیں کہ تم انھیں بہت پیار کرتی ہو۔ اور ڈرتے ہیں کہ تم بھی پہلی اماں کی طرح چھوڑ کر نہ چلی جاؤ۔“

جس طرح گرد صاف ہوتے ہی آئینہ چمک اٹھتا ہے، اسی طرح امبا کا چہرہ روشن ہوگیا۔ اس نے منو کو میری گود سے چھین لیا۔ اور شاید پہلی بار سچی مادرانہ محبت سے اس کے رخساروں کا بوسہ لیا۔

(۵)

افسوس! کیا خبر تھی کہ منو کے اندیشے اتنی جلد پورے ہوں گے؟ شاید وہ معصوم نگاہیں پردۂ غیب کی محرم تھیں۔ شاید ان معصوم کانوں میں قضا کے فرشتے سرگوشیاں کرتے تھے۔ چھ مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ امبا بیمار پڑی اور انفلوانزا نے دیکھتے دیکھتے اسے ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔ پھر وہ باغ ویران ہوگیا۔ پھر وہ بسا ہوا گھر اجڑ گیا۔ امبا منو پر قربان ہوگئی۔ ہاں اس نے مادرانہ الفت کا حق ادا کردیا۔ جاڑے کے دن تھے اور وہ گھڑی رات رہے منو کے لیے ناشتہ پکانے اٹھتی تھی۔ اس کی روز افزوں دل جوئیوں نے منو پر اپنا قدرتی اثر پیدا کردیا تھا۔ وہ ضدی اور شریر ہوگیا تھا۔ جب تک امبا کھلانے نہ بیٹھے منھ میں لقمہ نہ ڈالتا۔ جب تک پنکھا نہ جھلے چارپائی پر بیٹھ نہ سکتا۔ اسے چھیڑتا۔ چڑاتا۔ دق کرتا۔ پر امبا کو ان شرارتوں میں کوئی روحانی لطف آتا۔ انفلوانزا سے کراہ رہی تھی۔ کروٹ لینے کی سکت نہ تھی۔ بدن توا ہو رہا تھا۔ پر منو کے ناشتے کی فکر سوار تھی۔ ہائے وہ بے نفس مادرانہ خاطر داریاں اب افسانے ہوگئے۔ مگر ان افسانوں کی یاد اب بھی دل کو تڑپاتی ہے۔ امبا کے ساتھ منو کی طفلانہ شوخی اور شرارت اور ہنسی بھی رخصت ہوگئی۔ اب وہ یاس اور حزن کی زندہ تصویر ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اب وہ کبھی روتا نہیں۔ مامتا کی نعمت کھو کراب اسے کوئی اندیشہ، کوئی خوف نہیں۔

اردو ماہنامہ کہکشاں جون 1919میں شائع ہوا۔ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں ’ویماتا‘ کے عنوان سے مان سروور 8 میں شامل ہے۔

خوابِ پریشاں

چاندنی رات ہوا کے خوشگوار جھونکے۔ پرُفضا باغ۔ کنور امرناتھ اپنی مہتابی پر لیٹے ہوئے منورما سے کہہ رہے تھے۔ "تم گھبراؤ نہیں۔ میں جلد آؤں گا۔"

منورما نے ان کی طرف سائلانہ انداز سے دیکھ کرکہا۔ "مجھے بھی ساتھ کیوں نہیں لے چلتے؟"

امرناتھ۔ "تمھیں وہاں تکلیف ہوگی۔ میں کبھی یہاں رہوں گا، کبھی وہاں۔ سارے دن مارا مارا پھروں گا۔ کوہستانی علاقہ ہے۔ صحرا و بیابان کے سوا آبادی کا کہیں کوسوں پتا نہیں۔ اس پر درندوں کا خوف۔ آسائش کی چیزیں نایاب ہوں گی۔ تم ان تکلیفوں کی عادی نہیں ہو۔"

منورما۔ "لیکن تم بھی ان تکلیفوں کے عادی نہیں ہو۔"

امرناتھ۔ "میں مرد ہوں۔ موقع اور ضرورت پر ہر ایک تکلیف کا سامنا کرسکتا ہوں۔"

منورما۔ "(غرور سے) میں بھی عورت ہوں۔ موقع اور ضرورت پر آگ میں کود سکتی ہوں۔ عورتوں کی نزاکت مردوں کا تخیل ہے۔ انھیں نازک کہہ کر زبردستی نازک بنایا جاتا ہے۔ ان کا جسم کمزور ہو، پر دل، ارادہ اور ہمت کا وہ باندھ ہے جس پر زمانہ کے حادثات کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔"

امرناتھ نے منورما کو ارادت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور بولے۔ "یہ میں مانتا ہوں۔ لیکن جو تخیل مدت دراز سے ہمارا ایمان ہورہا ہے۔ وہ یک لخت محو نہیں ہوسکتا۔ تمھاری تکلیف مجھ سے نہ دیکھی جائے گی۔ مجھے صدمہ ہوگا۔ اور تکلیفوں کو چاہے دیکھ بھی سکوں۔ لیکن تمھارے توکل کا نظارہ ان سے کہیں دردناک ہوگا۔ دیکھو! اس وقت کی چاندنی میں کتنی بہار ہے۔ مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ چاندنی میں ایک کثافت اور غلاظت ہوتی ہے، جس پر طمع کا گمان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آفتاب کی روشنی رقیق اور لطیف ہوتی ہے۔

منورما۔ مجھے بہلاوا مت دو۔ میں تمھارے ساتھ چلوں گی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم سے الگ رہ کر مجھے کم تکلیف ہوگی؟ مجھے تو کوئی ایسی تکلیف نہیں معلوم ہوتی جو جدائی سے زیادہ سخت ہو۔ کیا روحانی اضطراب جسمانی تکلیف سے کم جانکاہ ہوتا ہے؟

امرناتھ۔ تم اپنی تکلیف کا نہیں، میری تکلیف کا خیال کرو۔ وہاں مجھے تمھاری آسائش کی فکر ہر دم پریشان رکھے گی۔ تمھارے لیے مکان کی فکر، سواریوں کی فکر، دل بستگی کے سامان کی فکر، غرض کہاں تک کہوں۔ جس کام کے لیے جاتا ہوں وہ بالکل نہ ہوسکے گا۔

منورما مایوسانہ انداز سے بولی۔ ''خیر جیسی تمھاری مرضی۔ میں ضد نہیں کرتی۔ مگر یہاں میری زندگی اپاڑھ ہوجائے گی۔ معلوم نہیں کیا گزرے گی۔ مجھے تو اس کے خیال ہی سے وحشت ہوتی ہے۔ میرا دل کچھ عجیب بدسگال واقع ہوا ہے۔ تمھیں اپنے سامنے نہ دیکھ کر مجھے طرح طرح کے اوہام ستانے لگتے ہیں۔ شاید دل کے کسی نامعلوم گوشے میں خیال چھپا ہوا ہے کہ میں تمھاری عافیت کی ضامن ہوں۔ چاہے جو کچھ ہو، میں ہمیشہ انھیں وسوسوں میں پڑی رہتی ہوں۔ تم ہاکی کھیلنے جاتے ہو تو مجھے یہ اندیشہ رہتا ہے کہ تمھیں چوٹ نہ لگ گئی ہو۔ یہاں تک کہ اس چاندنی رات اور کھلے ہوئے صحن میں بھی مجھے اطمینان نہیں ہوتا۔ ایک موہوم سا انتشار دل پر غالب رہتا ہے۔ کیا کروں۔ میری طبیعت ہی ایسی ہے۔

امرناتھ یہ باتیں سن کر کانپ اٹھے۔ سوچا یہ دلِ نازک ایسی جانکاہ، ایسی جگر سوز محبت کا بوجھ کیونکر اٹھائے گا؟ کہیں یہ نازک تار مضراب کی ان چوٹوں سے ٹوٹ نہ جائے۔ کتنا غم نصیب دل ہے! چاروں طرف درد اور سوز اور خلش سے گھرا ہوا۔ کہیں نسیم کا گزر نہیں۔ کہیں فضا کا تبسم نہیں۔ ایک قیدی ہے، گوشۂ تاریک میں زنجیروں سے جکڑا ہوا۔ متین انداز سے بولے۔ ''لیکن منورما، میں ہرگز اس محبت کے قابل نہیں ہوں۔ مجھ جیسے ظاہر پرست آدمی کے لیے یہ جذبۂ صادق؟ تم اپنے اوپر ظلم کرتی ہو۔ مجھے خوف ہوتا ہے کہ تم نے میری نسبت اپنے دل میں غلط قیاس قائم کرلیا ہے۔ میں بالکل معمولی جذبات کا آدمی ہوں۔ اتنا ہی خود غرض، اتنا ہی حریص اور زمانہ ساز، اتنا ہی سفلہ اور تن پرور۔ میرے لیے جسمانی آسائش محبت سے کہیں زیادہ اطمینان کا باعث ہے۔ صحبتِ احباب، سیر و

شکار، تفریح و تفنن کے بغیر میرا ایک دن بھی زندہ رہنا مشکل ہے۔ درد اور سوز سے میں بالکل بیگانہ ہوں۔ محبت میرے لیے حالاتِ زندگی کا ایک جزو ہے اور وہ بھی جزوِ ضعیف!

منورما نے امرناتھ کو بدگمان نظروں سے دیکھا۔ جو کہہ رہی تھیں، میں تم کو تم سے زیادہ پہچانتی ہوں۔

(۲)

کنور امرناتھ مجموعۂ اضداد تھے۔ وہ آزاد تھے پر محتاط۔ صاحبِ ثروت تھے پر بیدارمغز۔ رئیس تھے پر منکسر۔ ذی اثر تھے پر غریب دوست۔ والدین بچپن ہی میں رحلت کرچکے تھے۔ ان کی پرورش و پرداخت کا بار ملازموں پر پڑا۔ محبت کی نعمت سے محروم رہ گئے۔ وہ جس وقت کوئی چیز مانگتے فوراً مل جاتی۔ انھیں رونے اور مچلنے کے موقعے نہ ملتے تھے۔ وہ اپنے ہم جولیوں کو مچلتے دیکھ کر مچلنا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی مار کھانے کے لیے گھڑکے جانے کے لیے ان کا دل بے اختیار ہوجاتا تھا۔ ان کے ذہن میں پیار اور مار لازم و ملزوم تھے۔ اس پیار کے لیے وہ مار اور پھٹکار سب کچھ چاہتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ لڑکے مار کھاکر بھی ماں کے پیچھے دوڑتے ہیں اور جب ماں کام سے فارغ ہوکرانھیں گود میں اٹھا لیتی ہے تو وہ کیسے نہال ہوجاتے ہیں۔ کیسے مگن ہوکر آنچل میں منہ چھپانا چاہتے تھے۔ مگر نہ وہ گود تھی، نہ وہ آنچل۔ وہ اگر روتے نہ تھے تو ہنسنے کا بھی انھیں موقع نہ ملتا تھا۔ ان کا بچپن خشک، بے مزہ اور یادہائے شیریں سے خالی تھا۔

جب وہ سنِ شعور کو پہنچے تو چاروں طرف سے شادی کے تقاضے ہونے لگے۔ راجوں اور رئیسوں کے یہاں سے پیغام آنے لگے۔ جہیز میں علاقے اور بیش قرار رقمیں پیش کی جانے لگیں۔ مگر کنورصاحب کا دل محبت کا بھوکا تھا۔ انھیں اسی میوۂ جنت کی تلاش تھی۔ برسوں سرگرمِ طلب رہے۔ حسن ملا، ناز و ادا ملی، حسنِ مذاق اورحسنِ انتظام سے بھی دوچار ہوئے۔ مگر محبت کہیں نہ مل سکی۔

تب محلوں سے مایوس ہوکروہ جھونپڑوں کی طرف جھکے۔ اور یہاں ان کی مراد پوری ہوئی۔ منورما ایک غریب ٹھاکر کی لڑکی تھی۔ اس کا باپ کنور صاحب کے دربار کا چپراسی تھا۔ وہ بچپن ہی سے کنورصاحب کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ مگر شاید غیب کو بھی نہ معلوم تھا کہ وہ ایک دن رانی بنے گی۔ کنورصاحب کی نظرِ انتخاب اسی پر پڑی۔ خویش و اقارب

نے اختلاف کیا۔ مگر امرناتھ اپنی دھن کے پورے تھے۔ منورما کو رانی بنا کر گھر میں لائے۔

(۳)

بندیل کھنڈ میں سخت قحط تھا۔ لوگ درختوں کی چھال نکال نکال کر کھاتے تھے۔ جڑیں کھود کھود کر پیٹ بھرتے تھے۔ فاقہ کشی نے دلوں سے دھرم اور مذہب کا احساس فنا کردیا تھا۔ حلال اور حرام کی تمیز غائب ہوگئی تھی۔ جانورں کا تو ذکر ہی کیا۔ انسان کے بچے کوڑیوں کے مول بکتے تھے۔ ماں کی مامتا مٹھی بھر دانوں پر قربان ہوجاتی تھی۔ حتیٰ کہ بچہ خوری کی دل ہلادینے والی وارداتیں بھی کبھی کبھی سننے میں آجاتی تھیں۔ کنورامرناتھ نے اخباروں میں یہ خبریں دیکھیں تو ان کا دردِ قوم تڑپ اٹھا۔ وہ بنارس سیوا سمیتی کے سکریٹری تھے۔ فوراً چند نوجوانوں والنٹیروں کا دستہ تیار کیا۔ اور بندیل کھنڈ میں جا پہنچے۔ چلتے وقت منورما بہت روئی، لیکن اسے ساتھ لانا دقت طلب تھا۔ ہاں یہ وعدہ کیا کہ روزانہ خط لکھیں گے اور جلد واپس آئیں گے۔

ایک ہفتے تک تو امرناتھ نے وعدہ پورا کیا۔ لیکن روزافزوں مصروفیتوں کے ساتھ خطوط میں تاخیر ہونے لگی۔ اکثر علاقے ڈاک خانوں سے منزل پر تھے وہاں سے روزانہ خط بھیجنے کا انتظام کرنا مشکل تھا۔

منورما صبح سے شام تک انتظار کرتی۔ اس کی تسکین کا یہی ایک سہارا تھا۔ لیکن جب خطوط میں دیر ہونے لگی۔ تو اس کا اضطراب ضبط کے قابو سے باہر ہوگیا۔ وہ بار بار پچتاتی کہ میں ناحق ان کے کہنے میں آگئی۔ مجھے ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ وحشت کے عالم میں کبھی نیچے آتی تھی کبھی اوپر جاتی تھی، کبھی باغیچے میں جا بیٹھتی ہر ایک چیز اسے غم کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی تھی۔ مینا کی بولیوں میں اب وہ شیرینی نہ تھی۔ نہ ستار کے سرُوں میں وہ دل آویزی۔ ہرن کی کلیلیں اب شتر غمزوں سے بھی زیادہ مکروہ معلوم ہوتیں۔ چوہے اور خرگوش کتے اور بلیاں سب کاٹنے دوڑتے تھے۔ الماریوں میں اچھی اچھی کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ امرناتھ کو کتابوں کا ذوق تھا۔ لیکن منورما کبھی ان کی طرف آنکھ اٹھاکر نہ دیکھتی۔ جب تک خط نہ آجاتا، وہ اسی طرح مضطرب اور مضمحل رہتی۔ خط ملتے ہی سوکھے دھانوں میں پانی پڑجاتا۔ چہرہ شگفتہ ہوجاتا۔ اسے چومتی چھاتی سے لگاتی۔ اور بار بار پڑھتی۔

مگر دوسرے دن سے پھر وہی پریشانی اور انتظار۔ وہ امرناتھ کی تصویر کو گھنٹوں دیکھا کرتی۔ صرف اسی کام میں اس کا جی لگتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اس کا دل دردِ ہجر کا عادی ہونے لگا۔ پہلے امرناتھ کے کمرے میں آتے ہوئے اس کے پیر من من بھر کے ہوجاتے تھے۔ وہ ان کی خالی کرسی کی طرف آنکھ نہ اٹھاسکتی تھی۔ مگر اب اس کا بے قرار دل وجود سے مایوس ہوکر خیال کی طرف مڑا۔ جن نظاروں سے کوفت ہوتی تھی، اب ان سے دل بستگی ہونے لگی۔ ان کی کتابوں کو قرینے سے سجاتی۔ ان کی تصویروں پر سے گرد جھاڑتی۔ ان کے اسلحوں کو صاف کرتی۔

اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک روز اس نے رات کو خواب دیکھا کہ امرناتھ دروازے پر برہنہ سر، برہنہ پا کھڑے رو رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور اسی سراسیمگی کے عالم میں بالاخانے کے دروازے تک آئی۔ یہاں کا سناٹا دیکھ کر اسے ہوش آگیا۔ اس نے اسی وقت امرناتھ کے نام ارجنٹ تار بھیجا۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔ سارا دن گزر گیا۔ مگر کوئی جواب نہیں۔ دوسری رات بھی گزری، پر جواب کا پتہ نہ تھا۔ منورما بے آب و دانہ خستہ حال، نیم جان اپنے کمرے میں فرش پر پڑی رہتی۔ جسے دیکھتی اس سے پوچھتی۔ جواب آیا؟ پتا بھی کھڑکتا تو فوراً وہ دروازے پر جاکھڑی ہوتی۔ اور پوچھتی۔ جواب آیا؟

اس کے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہوتے۔ کنیزوں سے خواب کی تعبیر پوچھتی۔ خواب کے وجود اور اسباب پر کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مگر عقدہ نہ کھلا۔ لونڈیاں اسے دلاسہ دینے کے لیے کہتیں، وہ بہت خیریت سے ہیں۔ خواب کا رونا اصلی ہنسنا ہے۔ خواب کی برہنہ پائی گھوڑے کی سواری ہے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ لیکن منورما کو ان باتوں سے تسکین نہ ہوتی۔ اسے تار کے جواب کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ چار دن گزر گئے۔

(۴)

کسی محلے میں مداری کا آنا بچوں کے لیے ایک بڑا واقعہ ہے۔ اس کے ڈمرو کی آواز میں خوانچے کی صدائے مرغوب سے بھی زیادہ کشش ہوتی ہے۔ اسی طرح محلے میں کسی جوتشی کا آنا مستورات کے لیے معرکے کی بات ہے۔ دم زدن میں اس کی خبر گھر گھر

پھیل جاتی ہے۔ ساسیں اپنی تاخیر المراد بہوؤں کو لیے آجاتی ہیں۔ مائیں اپنی حسرت نصیب بیٹیوں کو لیے جمع ہوجاتی ہیں۔ جوتشی جی شادی و غم کی خاطر خواہ تقسیم کرنے لگتے ہیں۔ ان کی غیب گوئیوں میں کنایہ و مجاز کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ ان کی تقدیر خوانی تقدیر سے بھی زیادہ مبہم اور ان کے الفاظ مبالغے سے بھی زیادہ وسیع المفہوم۔ ممکن ہے موجودہ تعلیم نے جوتش کی قدر کم کردی ہو۔ لیکن جوتشی کی قدر میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی۔ ممکن ہے اس کی باتوں پر کسی کو یقین نہ ہو۔ مگر سننا سب چاہتے ہیں۔ اس کے ایک ایک لفظ میں امید وبیم کو برانگیختہ کرنے کی ساحرانہ قوت پوشیدہ ہوتی ہے۔ بالخصوص اس کی خبر بد تو خلش افزا ہے اور سوہانِ روح اور پیکانِ جگر۔

تار بھیجے ہوئے آج پانچواں دن تھا کہ امرناتھ کے دروازے پر ایک جوتشی جی وارد ہوئے۔ ان کے وسیع برآمدے میں فوراً محلے کی عورتوں کا مجمع ہوگیا۔ جوتشی جی غیب کے نوشتے کھولنے لگے۔ منورما کو بھی خبر ملی۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا کوئی فرشتۂ غیب آگیا۔ انھیں فوراً اندر بلا بھیجا، اور اپنے خواب کی تعبیر پوچھی۔

جوتشی جی نے ادھر ادھر دیکھا۔ پترے کے ورق الٹے۔ انگلیوں پر کچھ گنا۔ پر کچھ فیصلہ نہ کرسکے کہ کس قسم کے جواب کی ضرورت ہے۔ بولے کیا سرکار نے یہ خواب دیکھا ہے؟

منورما بولی۔ ”نہیں میری ایک سکھی نے دیکھا ہے۔ میں کہتی ہوں منحوس خواب ہے۔ وہ کہتی ہیں۔ اس کا پھل بہت اچھا ہے۔ آپ اس کی کیا تعبیر کرتے ہیں؟“

جوتشی جی پھر بغلیں جھانکنے لگے۔ انھیں امرناتھ کے پردیس جانے کا حال نہ معلوم تھا اور نہ اتنی مہلت ہی ملتی تھی کہ یہاں آنے کے قبل وہ معلومات فراہم کرلیتے، جو قیافہ اور قیاس کے ساتھ مل کرعرف عام میں جوتش کے نام سے مشہور ہیں۔ اپنے سوال کے جواب سے جو امید تھی وہ بھی جاتی رہی۔ مایوس ہوکر منورما کی تائید ہی میں خیریت سمجھی۔ بولے سرکار جو کچھ کہتی ہیں وہی ٹھیک ہے۔ سپنا اچھا نہیں ہے۔

منورما کو رعشہ آگیا۔ تھرتھر کانپنے لگی۔

جوتشی جی نے اسی سلسلے میں کہا۔ ”ان کے پتی پر کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ ان کا گھر اجڑ جائے گا۔ وہ دیس بدیس مارے مارے پھریں گے۔ کوئی ایسا سنکٹھ پڑے گا،

جس سے وہ بہت دکھی ہوں گے۔"

منورما نے زور سے چیخ کر کہا۔ "بھگوان! میری رکشا کرو۔" اور زمین پر گرپڑی۔

جوتشی جی اب چیتے۔ سمجھ گئے کہ سخت دھوکا ہوا۔ دلاسا دینے لگے۔ مگر کوئی چنتا کی بات نہیں۔ اس کا میں اتار کرسکتا ہوں۔ سرکار مجھے تھوڑا سا تیل، کچا دھاگا، اور ایک نئی ہانڈی منگوا دیں، ایک بکرا بھی چاہیے میں ابھی اس کا نوارن (دفع بلا) کرسکتا ہوں جب وہاں سے خیر و عافیت کا سماچار مل جائے تو سرکار جو دکشنا چاہیں دے دیں۔ کام کٹھن ہے۔ پر بھگوان کی دیا سے میں کرسکتا ہوں۔ سرکار دیکھیں مجھے بڑے بڑے حاکموں نے کیسے کیسے سائِنک پھِنک دیے ہیں۔ ابھی ڈپٹی صاحب کی لڑکی بیمار تھی۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ میں نے جنتر دیا۔ بیٹھے بیٹھے آنکھیں کھل گئیں۔ کل کی بات ہے۔ سیٹھ چندومل کے یہاں روکڑ کی ایک تھیلی اڑگئی تھی۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ میں نے جاکر شگون دیکھا۔ اور بات کی بات میں چور پکڑ لیا۔ ان کے منیم کا کام تھا۔ ان کے پاس تھیلی جوں کی توں نکل آئی......"

جوتشی جی اپنے کمالات کا اظہار کررہے تھے۔ مگر منورما بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ زہر رگوں میں سرایت کرگیا تھا۔ منتروں سے اب کیا اثر ہوسکتا۔

دفعتاً وہ اٹھی اور لونڈی کو حکم دیا۔ سفر کا سامان کرو۔ میں شام کی گاڑی سے مہوبے جاؤں گی۔ جوتشی جی کو منیم جی سے کچھ دلوا دو۔

(۵)

منورما نے سٹیشن پر آکر امرناتھ کو تار دیا۔ "میں آرہی ہوں۔" ان کے آخری خط سے معلوم ہوا تھا کہ وہ کبرئی میں ہیں۔ کبرئی کا ٹکٹ لیا۔ گاڑی میں بیٹھی۔ لیکن کئی دنوں کی متواتر شب بیداری تھی۔ گاڑی پر بیٹھنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اسے نیند آگئی۔ اور نیند آتے ہی پریشان خیالات کا نیرنگ پیشِ نظر ہوگیا۔ متوحش نظارے دکھائی دینے لگے۔

اس نے دیکھا کہ ایک بڑا وسیع دریا ہے۔ اس میں ایک شکستہ کشتی ہلکورے کھاتی بہتی چلی جاتی ہے۔ اس پر نہ کوئی آدمی ہے نہ ملاح۔ نہ پال۔ نہ ڈانولے۔ موجیں اسے کبھی اچھالتی ہیں۔ کبھی زیر کرتی ہیں۔ دفعتاً کشتی پر ایک آدمی نظر آیا۔ یہ امرناتھ تھے۔ برہنہ سر، برہنہ پا، آنکھوں سے آنسو جاری۔ منورما خوف سے تھرتھر کانپ رہی تھی۔

معلوم ہوتا تھا۔ کشتی اب ڈوبی اور اب ڈوبی۔ اس نے زور سے چیخ ماری۔ آنکھیں کھل گئیں۔ سارا جسم پسینے سے تر تھا۔ سینہ دھک دھک کررہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ منہ ہاتھ دھویا اور قصد کیا۔ اب نہ سوؤں گی۔ مگر آہ! کیسا ڈراؤنا خواب تھا۔ پرماتما اب تمھارا ہی بھروسہ ہے۔ ان پر کوئی حادثہ نہ آنے پائے۔

اس نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ آسمان پر تارے دوڑ رہے تھے۔ گھڑی دیکھی۔ بارہ بجے تھے۔ اس کو تعجب ہوا کہ میں اتنی دیر تک سوئی۔ ابھی تو ایک جھپکی بھی پوری نہ ہونے پائی۔ اس نے ایک کتاب اٹھائی اور خیالات کو سمیٹ کر پڑھنے لگی۔ اتنے میں الہ آباد آگیا۔ گاڑی تبدیل ہوئی۔ دوسری گاڑی میں جا بیٹھی جو پلیٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ اگرچہ رات کا وقت تھا، پر اسے یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ اس نے پھر کتاب کھولی اور اسے باآواز بلند پڑھنے لگی۔ گاڑی روانہ ہوگئی۔ لیکن کئی دنوں کی جاگی آنکھیں ارادے کی مطیع نہیں ہوتیں۔ بیٹھے بیٹھے اس پر پھر غنودگی کا غلبہ ہوا۔ اس نے تکیہ پر سر رکھ لیا۔ آنکھیں بند ہوگئیں۔ ایک دوسرا منظر سامنے آگیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بڑا اونچا پہاڑ ہے۔ اس کی چوٹیاں آسمان سے جاملی ہیں۔ اوپر والے درخت بالکل چھوٹے چھوٹے پودوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ سیاہ گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور بجلی اتنی زور سے گرج رہی ہے کہ کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ کبھی یہاں گرتی ہے۔ کبھی وہاں۔ اس ہولناک پہاڑ کی چوٹی پر ایک آدمی برہنہ سر بیٹھا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ بہت بلندی پر ہے مگر اس کی آنکھوں سے آنسو گرتے ہوئے صاف نظر آرہے ہیں۔ منورما دہل اٹھی۔ یہ امرناتھ تھے۔ وہ پہاڑی سے اترنا چاہتے تھے۔ لیکن کہیں راستہ نظر نہ آتا تھا۔ ان کا چہرہ خوف سے زرد تھا۔ یکایک ایک بار بجلی زور سے کوندی۔ ایک شعلہ زور سے نکلا۔ اور امرناتھ کا پتہ نہ تھا۔ منورما نے پھر زور سے چیخ ماری۔ اور جاگ پڑی۔ اس کا سینہ بانسوں اچھل رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور دونوں ہاتھ باندھ کرآسمان کی طرف تاکتے ہوئے بولی۔ یا ایشور مجھے ایسے ایسے برے برے سپنے دکھائی دے رہے ہیں۔ نہ جانے ان پر کیا گزر رہی ہے؟ تم غریبوں پر رحم کرتے ہو۔ میں بھی ابھاگنی غریب ہوں۔ مجھ پر رحم کرو۔ مجھے محل اور دولت کی ضرورت نہیں۔ میں جھونپڑی میں خوش رہوں گی۔ میں صرف ان کی سلامتی چاہتی ہوں۔ میری اتنی بنتی سن لو!

پھر وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ طلوعِ سحر کی سرخی نظر آرہی تھی۔ اسے گونہ تسکین ہوئی کہ کسی طرح رات کٹ گئی۔ اب تو نیند نہ آئے گی۔ تھوڑی دیر میں گاڑی مانک پور پہنچی۔ یہاں گاڑی پھر بدلی۔ اب کہسار کے دل کش مناظر دکھائی دینے لگے۔ کہیں پہاڑوں پر بھیڑوں کے گلے، کہیں دامنِ کوہ میں ہرنوں کے جھنڈ، کہیں کنول کے پھولوں سے رنگین تال۔ منورما ایک خودفراموشی کے عالم میں ان منظروں کی طرف تاکتی رہی۔ گویا اسے گلکاریٔ فطرت کا مطلق احساس نہیں ہے۔ مگر پھر نہ معلوم کب اس کی آنکھیں جھپک گئیں۔ اس نے دیکھا کہ امرناتھ گھوڑے پر سوار ایک پل پر سے چلتے جاتے ہیں۔ نیچے دریا امڈا ہے۔ پل بہت تنگ ہے۔ گھوڑا رہ رہ کرشرارت کرتا ہے۔ منورما کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ زور سے چلا چلا کر کہنے لگی۔ گھوڑے سے اتر پڑو۔ گھوڑے سے اتر پڑو۔ یہ کہتے کہتے وہ ان کی طرف لپکی۔ آنکھیں کھل گئیں۔ گاڑی کسی اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے سن سن کرتی چلی جاتی تھی۔ امرناتھ برہنہ سر، برہنہ پا، پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ منورما کی آنکھوں میں ابھی تک اسی ہولناک خواب کا نظارہ سمایا ہوا تھا۔ کنورصاحب کو دیکھ کر اسے گمان ہوا کہ وہ گھوڑے سے گر پڑے۔ اور نیچے دریا میں گرا چاہتے ہیں۔ اس نے فوراً انھیں پکڑنے کو ہاتھ پھیلایا اور جب وہ انھیں نہ پاسکی۔ تو اسی نیم بیداری کے عالم میں اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور کنورصاحب کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے گاڑی سے کود پڑی۔ تب وہ چونکی۔ معلوم ہوا کسی نے آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔ جسم کی ایک ایک رگ میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ پھر زور سے ایک دھکا لگا۔ اور بے سدھ ہوگئی۔

یہی کبرئی اسٹیشن تھا۔ کنور امرناتھ تار پاکر اسٹیشن پر آئے تھے۔ مگر یہ میل تھا۔ یہاں نہ ٹھہرتا تھا۔ منورما کو گاڑی پر سے ہاتھ پھیلائے گرتے دیکھ کر وہ ہاں ہاں کرتے بجلی کی طرح لپکے۔ مگر نوشتۂ تقدیر پورا ہوچکا تھا۔ منورما اس دیس میں پہنچ چکی تھی جہاں محبت کا آنند ہے۔ مگر فراق کا غم نہیں۔

امرناتھ منورما کی لاش پر بیٹھے روتے رہے۔ چند روزہ بہارِ زندگی ختم ہو گئی۔ دل کی بستی پھر ویران ہوگئی۔ مسرت کا خواب پریشان ہوگیا۔

تیسرے دن وہ برہنہ سر، برہنہ پا، چشمِ نم مکان پر پہنچے۔ منورما کا خواب سچّا ہوا۔ اس ویرانے میں اب کون رہتا؟ اشک ریزی کی آرزو انھیں یہاں تک لائی تھی۔ وہ ایک

ہفتے تک مکان پر رہے اور خوب روئے۔ منورما کی روح کو خوش کرنے کا اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس کے بعد وہ یکہ وتنہا بے ساز و سامان گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ کل جائداد کاشی سیوا سمیتی کے نام وقف کردی اور اب دیس بدیس گھومتے رہتے ہیں۔ برہنہ سر، برہنہ پا، چشمِ نم۔ جوتشی کی تعبیر بھی سچی نکلی۔

اردو ماہنامہ کہکشاں اگست 1919میں شائع ہوا۔ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں 'انشٹ شنکا' کے عنوان سے مان سرووَر 8 میں شامل ہے۔

خونِ حُرمت

میں نے افسانوں اور تاریخوں میں نیرنگئ تقدیر کی عجیب و غریب داستانیں پڑھی ہیں۔ شاہ کو گدا اور گدا کو شاہ بنتے دیکھا ہے۔ تقدیر ایک سربستہ راز ہے۔ گلیوں میں ٹکڑے چُنتی ہوئی عورتیں تختِ زریں پر متمکن ہوگئی ہیں اور وہ نشہ ثروت کے متوالے جن کے اشارے پر تقدیر بھی سر جھکاتی تھی۔ آن واحد میں زاغ و زغن کا شکار بن گئے ہیں۔ پر میرے سر پر جو کچھ بیتی اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ آہ ان واقعات کو آج یاد کرتی ہوں۔ تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ اب تک میں کیوں اور کیوں کر زندہ ہوں۔ حُسن تمناؤں کا مخرج ہے۔ میرے دل میں کیاکیا تمنائیں نہ تھیں۔ پر آہ! دست بیداد کے ہاتھوں مر مٹیں۔ میں کیا جانتی تھی۔ کہ وہی شخص جو میری ایک ایک ادا پر قربان ہوتا تھا۔ ایک دن مجھے یوں ذلیل و خوار کرے گا۔

آج تین سال ہوئے۔ جب میں نے اس گھر میں قدم رکھا۔ اس وقت یہ ایک شگفتہ چمن تھا۔ میں اس چمن کی بلبل تھی۔ ہوا میں اُڑتی تھی۔ ڈالیوں پر چہکتی تھی۔ پھولوں پر سوتی تھی۔ سعید میرا تھا۔ میں سعید کی تھی۔ اس حوض بلوریں کے کنارے ہم محبت کے پانسے کھیلتے تھے۔ انھیں روشوں میں الفت کے ترانے گاتے تھے۔ اسی چمن میں ہماری رازونیاز کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ مستیوں کے دور چلتے تھے۔ وہ مجھ سے کہتے تھے۔ ”تم میری جان ہو۔“ میں ان سے کہتی تھی۔ ”تم میرے دلدار ہو۔“ ہماری جائداد وسیع تھی۔ زمانہ کی کوئی فکر۔ زندگی کا کوئی غم نہ تھا۔ ہمارے لیے زندگی ایک لطف مجسم۔ ایک شوق گرسنہ۔ ایک طلسم بہار تھی۔ جس میں مرادیں کھلتی تھیں اور خوشیاں ہنستی تھیں۔ زمانہ ہمارا ہوا خواہ تھا۔ آسمان ہمارا دم ساز اور بخت ہمارا ساعد۔

ایک دن سعید نے آکر کہا۔ ”جانِ من! میں تم سے ایک التجا کرنے آیا ہوں۔ دیکھنا مسکراتے ہوئے لبوں پر حرفِ انکار نہ آئے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی ساری ملکیت۔ ساری

جائداد تمھارے نام منتقل کردوں۔ میرے لیے تمھاری محبت کافی ہے یہی میرے لیے نعمت عظمیٰ ہے۔ میں اپنی حقیقت کو مٹا دینا چاہتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ تمھارے دروازے کا فقیر بن کر رہوں۔ تم میری نورجہاں بن جاؤ۔ میں تمھارا سلیم بنوں گا۔ اور تمھارے کفِ مرجاں کے پیالوں پر عمر بسر کروں گا۔ میری آنکھیں پُرآب ہو گئیں۔ مسرتیں اپنے انتہائے عروج پر پہنچ کر قطرۂ اشک بن گئیں۔

(۲)

پر ابھی پورا سال بھی نہ گزرا تھا کہ مجھے سعید کے مزاج میں کچھ تغیر نظر آنے لگا۔ ہمارے درمیان کوئی شکررنجی کوئی بدمزگی نہ ہوئی تھی۔ مگر اب وہ سعید نہ تھا۔ جسے ایک لمحہ کے لیے بھی میری جدائی شاق گزرتی تھی۔ وہ اب رات کی رات غائب رہتا۔ اس کی آنکھوں میں اشتیاق نہ تھا۔ نہ اندازوں میں وہ تشنگی۔ نہ مزاج میں وہ گرمی۔

کچھ دنوں تک اس بے التفاتی نے مجھے خُوب رُلایا۔ محبت کے مزے یاد آکر تڑپا دیتے۔ میں نے پڑھا تھا کہ محبت لازوال ہوتی ہے۔ کیا وہ سرچشمہ اتنی جلدی خشک ہوگیا؟ آہ نہیں۔ وہ اب بھی موجزن تھا۔ پر اس کا بہاؤ اب کسی دوسری جانب تھا۔ وہ اب کسی دوسرے چمن کو شاداب کرتا تھا۔ آخر میں بھی سعید سے آنکھیں چرانے لگی۔ بے دلی سے نہیں۔ صرف اسُ لیے کہ اب مجھے اس سے آنکھیں ملانے کی تاب نہ تھی۔ اُسے دیکھتے ہی محبت کے ہزاروں کرشمے نظروں کے سامنے آجاتے۔ اور آنکھیں بھر آتیں۔ میرا دل اب بھی اس کی طرف کھنچتا تھا۔ کبھی کبھی بے اختیار جی چاہتا کہ اس کے پیروں پر گروں۔ اور کہوں۔ میرے دلدار! یہ بے رحمی کیوں؟ یہ سردمہری۔ مجھ سے کیا خطا ہوئی ہے؟ لیکن اس خودداری کا بُرا ہو۔ وہ دیوار حائل بن جاتی تھی۔

یہاں تک کہ رفتہ رفتہ میرے دل میں بھی محبت کی جگہ حسرت نے لے لی۔ صبرِ مایوس نے دل کو تسکین دی۔ میرے لیے سعید اب گزشتہ بہار کا ایک بُھولا ہوا نغمہ تھا۔ سوزِ دل ٹھنڈا ہوگیا۔ شمع محبت بُجھ گئی۔ یہی نہیں۔ اس کی عزت بھی میرے دل سے رخصت ہوگئی۔ جو شخص محبت کے پاک مندر میں کدورت سے پُر ہو۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ میں اس کے لیے گھلوں اور مروں۔

ایک روز شام کے وقت میں اپنے کمرہ میں پلنگ پر پڑی ایک قصہ پڑھ رہی تھی۔

دفعتہً ایک حسین عورت میرے کمرہ میں داخل ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا۔ کہ گویا کمرہ جگمگا اُٹھا۔ نورِحُسن نے در و دیوار کو روشن کردیا۔ گویا ابھی سفیدی ہوئی ہے۔ اس کی مرصع نفاست۔ اس کی دلربا شگفتگی۔ اس کی سرور انگیز ملاحت۔ کس کی تعریف کروں! مجھ پر ایک رُعب سا چھاگیا۔ میرا غرورِحُسن خاک میں مِل گیا۔ میں متحیر تھی۔ کہ یہ کون نازنین ہے اور یہاں کیوں کر آئی؟ بے اختیار اُٹھی کہ اس سے مصافحہ کروں کہ سعید بھی مسکراتا ہوا کمرہ میں آیا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ نازنین اس کی معشوقہ ہے۔ میرا غرور جاگ اُٹھا۔ میں اُٹھی ضرور۔ پر شان سے گردن اُٹھاتے ہوئے آنکھوں میں رُعب حسن کی جگہ حقارت آ بیٹھی۔ میری نگاہ میں اب وہ نازنین حُسن کی دیوی نہیں۔ ڈسنے والی ناگن تھی۔ میں پھر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اور کتاب کھول کر سامنے رکھ لی۔ وہ نازنین ایک لمحہ تک کھڑی میری تصویروں کا ملاحظہ کرتی رہی۔ تب کمرہ سے نکلی۔ چلتے وقت اُس نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے انگارے نکل رہے تھے۔ جن کی شعاعوں میں قاتلانہ انتقام کی سرخی جھلک رہی تھی۔ میرے دل میں سوال پیدا ہوا۔ سعید اسے یہاں کیوں لایا؟ کیا میرا غرور توڑنے کے لیے؟

(۳)

اگرچہ ملکیت پر میرا نام تھا۔ پر یہ محض شعبدہ تھا۔ سعید کا تصرف کامل تھا۔ ملازمین بھی اسی کو اپنا آقا سمجھتے تھے۔ اور اکثر میرے ساتھ گستاخی سے پیش آتے۔ میں صبر وتوکل کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ جب دل میں تمنائیں نہ رہیں تو خلش کیوں ہوتی؟

ساون کا مہینہ تھا۔ کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اور رِم جھم بوندیں پڑ رہی تھیں۔ باغیچہ پر حسرت کی تاریکی اور سیہ پوش درختوں پر شب تاب کیڑوں کی چمک ایسی معلوم ہوتی تھی۔ گویا ان کے منہ سے آہ شرر بار نکل رہی ہے۔ میں دیر تک یہ تماشائے حسرت دیکھتی رہی۔ کیڑے ایک ساتھ چمکتے تھے اور ایک ساتھ بند ہوجاتے تھے۔ گویا روشنی کی باڑھیں چھوٹ رہی ہیں۔ مجھے بھی جھولا جھولنے اور گانے کا شوق ہوا۔ موسمی کیفیات حسرت زدہ دلوں پر بھی اپنا جادو کرجاتی ہیں۔ باغیچہ میں ایک گول بنگلہ تھا۔ میں اس میں آئی اور برآمدہ کی ایک کڑی میں جھولا ڈلوا کر جھولنے لگی۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ حسرت

میں بھی ایک روحانی حظ ہوتا ہے۔ جس سے بامراد دل ناآشنا ہوتے ہیں۔ میں وفورِ شوق سے ایک ملار گانے لگی۔ ساون فراق اور غم کا مہینہ ہے۔ گیت میں ایک دل مہجور کی داستان ایسے دردناک لفظوں میں بیان کی گئی تھی کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اتنے میں باہر سے ایک لالٹین کی روشنی نظر آئی۔ سعید کا ملازم عقب دروازے سے داخل ہوا۔ اس کے پیچھے وہی حسینہ اور سعید دونوں چلے آرہے تھے۔ حسینہ نے میرے پاس آکر کہا۔ ''آج یہاں مجلسِ نشاط آراستہ ہوگی اور شراب کے دَور چلیں گے۔'' میں نے اندازِ حقارت سے کہا۔ ''مبارک ہو!''

حسینہ۔ بارہ ماسے اور ملار کی تانیں اُڑیں گی۔ سازندے آرہے ہیں۔

میں۔ شوق سے۔

حسینہ۔ تمھارا سینہ حسد سے چاک ہوجائے گا۔

سعید نے مجھ سے کہا۔ ''زبیدہ تم اپنے کمرہ میں چلی جاؤ۔ یہ اس وقت آپے میں نہیں ہیں۔''

حسینہ نے پھر میری طرف لال لال آنکھیں نکال کرکہا۔ ''میں تمھیں اپنے پیروں کی دُھول کے برابر بھی نہیں سمجھتی۔ مجھے یارائے ضبط نہ رہا۔ اکڑ کر بولی۔ ''اور میں تجھے کیا سمجھتی ہوں۔ ایک کُتیا دوسروں کی اُگلی ہوئی ہڈیاں چچوڑتی پھرتی ہے۔

اب سعید کے بھی تیور بدلے۔ میری طرف غضب ناک آنکھوں سے دیکھ کر بولے۔ ''زبیدہ تمھارے سر پر شیطان تو نہیں سوار ہے؟''

سعید کا یہ جُملہ میرے جگر میں چُبھ گیا۔ تڑپ اُٹھی۔ جن لبوں سے ہمیشہ الفت و پیار کی باتیں سُنی ہوں۔ انھیں سے یہ زہر نکلے اور بالکل بے خطا! کیا میں ایسی ناچیز و حقیر ہوگئی ہوں کہ ایک بازاری عورت بھی مجھے چھیڑ کر گالیاں دے سکتی ہے۔ اور میرا زبان کھولنا منع! میرے دل میں سال بھر سے جو بخار جمع ہو رہا تھا۔ وہ اُبل پڑا۔ میں جھولے سے اُتر پڑی۔ اور سعید کی طرف پُرملامت نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ ''شیطان! میرے سر پر سوار ہے یا تمھارے سر پر۔ اس کا فیصلہ تم خود کرسکتے ہو۔ سعید! میں تم کو اب تک شریف اور غیور سمجھتی تھی۔ تم نے میرے ساتھ بے وفائی کی۔ اس کا ملال مجھے ضرور تھا۔ مگر میرے خواب وخیال میں کبھی یہ نہ آیا تھا۔ کہ تم غیرت سے اتنے عاری ہو۔ تم ایک

حیا فروش عورت کے پیچھے مجھے یوں ذلیل و خفیف کروگے۔ اس کا بدلہ تمھیں خدا سے ملے گا!"

حسینہ نے تیز ہو کر کہا۔ "تو مجھے حیا فروش کہتی ہے؟"

میں۔ بے شک کہتی ہوں۔

سعید۔ "اور میں بے غیرت ہوں۔"

میں۔ بے شک! بے غیرت ہی نہیں۔ شعبدہ باز۔ مکار۔ فاسق سب کچھ ہو۔ یہ الفاظ بہت کریہہ ہیں۔ لیکن میرے غصّے کے اظہار کے لیے کافی نہیں۔

میں یہ باتیں کہہ ہی رہی تھی۔ کہ یکایک سعید کے قوی ہیکل ملازم نے میری دونوں باہیں پکڑ لیں۔ اور دم زدن میں حسینہ نے جھولے کی رسیاں اتار کر مجھے برآمدے کے ایک آہنی ستون سے باندھ دیا۔

اس وقت میرے دل میں کیا خیالات آرہے تھے وہ یاد نہیں۔ پر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تینوں انسان نہیں جہنم کے فرشتے ہیں۔ غصّہ کی جگہ دل میں ایک ہیبت سما گئی تھی۔ اس وقت اگر کوئی غیبی طاقت میری بندشوں کو کاٹ دیتی۔ میرے ہاتھوں میں آب دار خنجر دے دیتی۔ تو بھی میں زمین پر بیٹھ کر اپنی ذلت اور بے کسی پر آنسو بہانے کے سوا اور کچھ نہ کرسکتی تھی۔ مجھے خیال آتا تھا۔ شاید خدا کی طرف سے مجھ پر یہ قہر نازل ہوا ہے۔ شاید میری بے نمازی اور بے دینی کی یہ سزا مل رہی ہے۔ میں اپنی گذشتہ زندگی پر نگاہ ڈال رہی تھی کہ مجھ سے کون سی خطا سرزد ہوئی ہے۔ جس کی یہ پاداش ہے۔

مجھے اسی حالت میں چھوڑکر تینوں صورتیں کمرہ میں چلی گئیں۔ میں نے سمجھا میری سزا ختم ہوئی۔ لیکن کیا یہ سب مجھے یوں ہی بندھا رکھیں گے کنیزیں مجھے اس ہیئت کذائی میں دیکھ لیں تو کیا کہیں؟ نہیں اب میں اس گھر میں رہنے کے قابل ہی نہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ رسیاں کیوں کر کھولوں۔ مگر افسوس! مجھے نہ معلوم تھا کہ ابھی تک میری جو گت ہوئی ہے۔ وہ آنے والی بے رحمیوں کا صرف بیعانہ ہے۔ میں اب تک نہ جانتی تھی کہ نوع خفیف کتنا سفاک۔ کتنا قاتل ہے۔ میں اپنے دل سے بحث کر رہی تھی کہ اپنی تحقیر کا الزام مجھ پر کہاں تک ہے۔ اگر میں حسینہ کی ان جگر خراش باتوں کا جواب نہ دیتی۔ تو کیا یہ

نوبت نہ آتی! آتی اور ضرور آتی۔ وہ کالی ناگن مجھے ڈسنے کا ارادہ کرکے چلی تھی۔ اسی لیے اس نے دل آزار لہجے میں گفتگو شروع کی تھی کہ میں غصہ میں آکر اُس کو لعن وطعن کروں۔ اور اسے مجھے ذلیل کرنے کا بہانہ مل جائے۔

پانی زور سے برسنے لگا تھا۔ بوچھاڑوں سے میرا سارا جسم تر ہوگیا تھا سامنے گہرا اندھیرا تھا۔ میں کان لگائے سن رہی تھی۔ کہ اندر کیا مسکوٹ ہورہی ہے۔ مگر مینہ کی سنناہٹ کے باعث آوازیں صاف نہ سُنائی دیتی تھیں۔ اتنے میں لالٹین پھر کمرہ سے برآمدہ میں آئی۔ اور تینوں ہیبت ناک صورتیں پھر سامنے آکر کھڑی ہوگئیں۔ اب کی اس خونی پری کے ہاتھوں میں ایک پتلی سی قمچی تھی۔ اس کے تیور دیکھ کر میرا خون سرد ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خون آشام وحشت۔ ایک سفاکانہ جنون نمودار تھا۔ میری طرف شرارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ”بیگم صاحبہ! میں تمھاری بدزبانیوں کا ایسا سبق دینا چاہتی ہوں۔ جو تمھیں ساری عمر یاد رہے۔ اور میرے مرشد نے بتلایا ہے کہ قمچی سے زیادہ دیرپا اور کوئی سبق نہیں ہوتا۔“

یہ کہہ کر اس ستم شعار نے میری پیٹھ پر ایک قمچی زور سے ماری، میں تلملا گئی۔ معلوم ہوا کہ کسی نے پیٹھ پر آگ کی چنگاری رکھ دی۔ مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ والدین نے کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارا تھا۔ زور سے چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ خود داری کا غرور۔ غیرت کا احساس سب غائب ہوگیا۔ قمچی کی خوفناک اور روشن حقیقت کے سامنے سب جذبات فنا ہوگئے۔ ان ہندو دیویوں کے جگر شاید آہن کے ہوتے ہوں گے جو اپنی آن پر آگ میں کود پڑتی تھیں۔ میرے دل پر تو اس وقت یہی خیال مسلط تھا کہ اس عذاب سے کیوں کر نجات ہو۔ سعید خاموش صورت تصویر کھڑا تھا۔ میں اس کی طرف چشم فریاد سے دیکھ کر نہایت عاجزی سے بولی۔ ”سعید۔ للہ۔ مجھے اس ظالم سے بچاؤ۔ میں تمھارے پیروں پڑتی ہوں۔ مجھے زہر دے دو۔ خنجر سے گردن کاٹ لو۔ لیکن یہ کرب سہنے کی مجھ میں تاب نہیں۔ ان دلجوئیوں کو یاد کرو۔ میری محبت کو یاد کرو۔ اسی کے صدقے۔ اس وقت مجھے اس عذاب سے بچاؤ۔ خدا تمھیں اس کا اجر دے گا۔“

سعید ان باتوں سے کچھ پگھلا۔ حسینہ کی طرف خائف نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ ”زرینہ میرے کہنے سے اب جانے دو۔ میری خاطر سے ان پر رحم کرو۔ زرینہ تیور

بدل کر بولی۔ ''تمھاری خاطر سے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ گالیاں نہیں برداشت کر سکتی۔''

سعید۔ کیا ابھی تمھارے خیال میں گالیوں کی کافی سزا نہیں ہوئی؟

زرینہ۔ تب تو آپ نے میری عزت کی خوب قدر کی۔ میں نے رانیوں سے چاپلیاں اٹھوائی ہیں۔ یہ بیگم صاحبہ ہیں۔ کِس خیال میں۔ اسے اگر کند چھری سے کاٹوں۔ تب بھی ان کی بد زبانیوں کی کافی سزا نہ ہوگی۔

سعید۔ مجھ سے اب یہ ستم نہیں دیکھا جاتا۔

زرینہ۔ آنکھیں بند کرلو۔

سعید۔ زرینہ غصہ نہ دلاؤ۔ میں کہتا ہوں۔ اب انھیں معاف کرو۔

زرینہ نے سعید کو ایسی حقارت آمیز نگاہ سے دیکھا۔ گویا وہ اس کا غلام ہے۔ خدا جانے اُس پر اس نے کیا منتر مار دیا تھا۔ کہ اس میں خاندانی غیرت اور وقار اور انسانی حمیت کا ذرا بھی جِس باقی نہ رہا تھا۔ وہ شاید اسے غصہ جیسے مردانہ جذبہ کے قابل ہی نہ سمجھتی تھی۔ اہلِ قیافہ ظاہر سے باطن پر حکم لگانے میں کتنی غلطی کرتے ہیں۔ ایسے دلفریب ظاہر کے پردہ میں اتنی شقاوت اور قساوت! کوئی شک نہیں۔ حُسن قیافہ کا دشمن ہے۔ بولی۔''اچھا تو اب آپ کو مجھ پر غصہ آنے لگا۔ کیوں نہ ہو۔ آخر منکوحہ بیگم ہی تو ہیں۔ میں تو حیا فروش کُتیا ہی ٹھہری!''

سعید۔ تم طعنے دیتی ہو۔ اور مجھ سے یہ خون نہیں دیکھا جاتا۔

زرینہ۔ تو یہ قمچی ہاتھ میں لو۔ اور اسے پوری سو ضربیں لگاؤ۔ غصہ اُتر جائے گا۔ اس کا یہی علاج ہے۔

سعید۔ پھر وہی مذاق!

زرینہ۔ نہیں میں مذاق نہیں کرتی۔

سعید نے قمچی لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ مگر معلوم نہیں زرینہ کو کیا شبہ پیدا ہوا۔ اس نے سمجھا۔ شاید یہ قمچی کو توڑ کر پھینک دیں گے۔ قمچی ہٹالی۔ اور بولی۔''اچھا مجھ سے یہ دغا! تو لو اب میں ہی ہاتھوں کی صفائی دکھاتی ہوں'' یہ کہہ کر اس بے درد نے مجھے بے تحاشہ قمچیاں مارنا شروع کیں۔ میں کرب سے اینٹھ اینٹھ کر چیخ رہی تھی۔ اس کے پیروں پڑتی تھی۔ منتیں کرتی تھی۔ اپنے فعل پر نادم تھی۔ دعائیں دیتی تھی۔ پیر اور پیغمبر کا واسطہ دیتی تھی۔

پر اس قتالہ کو ذرا بھی رحم نہ آتا تھا۔ اور سعید کاٹھ کے پُتلے کی طرح یہ نظارہ درد و ستم آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کو جوش نہ آتا تھا۔ شاید میرا بڑے سے بڑا دشمن بھی میری گریہ و زاری پر ترس کھاتا۔ میری پیٹھ چھِل کر لہولہان ہوگئی۔ زخم پڑتے تھے۔ ہر ایک ضرب آگ کے شعلے کی طرح بدن پر لگتی تھی۔ معلوم نہیں اس نے میرے کتنے دُرّے لگائے۔ یہاں تک کہ قچی کو مجھ پر رحم آگیا۔ وہ پھٹ کر ٹوٹ گئی۔ لکڑی کا کلیجہ پھٹ گیا۔ مگر انسان کا دل نہ پگھلا۔

(۴)

مجھے یوں خوار و تباہ کر کے تینوں ارواح خبیثہ وہاں سے رخصت ہوگئیں۔ سعید کے ملازم نے چلتے وقت میری رسّیاں کھول دیں۔ لیکن میں کہاں جاتی؟ اس گھر میں کیوں کر قدم رکھتی۔

میرا سارا جسم ناسور ہورہا تھا۔ لیکن دل کے آبلے اس سے کہیں جاں گزا تھے۔ سارا دل آبلوں سے پُر ہوگیا تھا۔ جذبات حسنہ کی جگہ بھی باقی نہ رہی تھی۔ اس وقت میں کسی اندھے کو کنوئیں میں گرتے دیکھتی تو مجھے ہنسی آتی۔ کسی یتیم کا گریہ دردناک سُنتی۔ تو اس کا منہ چڑاتی۔ دل کی حالت میں ایک زبردست انقلاب ہوگیا تھا۔ مجھے غصہ نہ تھا۔ غم نہ تھا۔ موت کی آرزو نہ تھی۔ یہاں تک کہ جذبۂ انتقام بھی نہ تھا۔ اس انتہا کی ذلت نے انتقام کی خواہش کو بھی فنا کردیا تھا۔ حالانکہ میں چاہتی تو قانوناً سعید کو شکنجہ میں لاسکتی تھی۔ لیکن یہ بے حرمتی۔ یہ بے آبروئی یہ پامالی انتقام کے دائرہ اثر سے خارج تھی۔ بس صرف ایک حِس باقی تھا۔ اور وہ حِسّ ذلت تھی۔ میں ہمیشہ کے لیے ذلیل ہوگئی۔ کیا یہ داغ کسی طرح مِٹ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ ہاں وہ چھپایا جاسکتا تھا۔ اور اس کی ایک ہی صورت تھی کہ ذلت کے قعرسیاہ میں گر پڑوں۔ تاکہ سارے پیرہن کی سیاہی اس داغ سیاہ کو چھپادے۔ کیا اس گھر سے بیابان اچھا نہیں جس کی دیواریں مسمار ہوگئی ہوں۔ اس کشتی سے کیا سطح آب اچھی نہیں۔ جس کے پیندے میں ایک بڑا شگاف ہوگیا ہو؟ اس حالت میں یہی دلیل مجھ پر غالب آئی۔ میں نے اپنی تباہی کو اور بھی مکمل۔ اپنی ذلت کو اور بھی مرفع۔ اپنی روسیاہی کو اور بھی مطلی کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ میں نادانستہ طور پر سعید سے اخلاقی انتقام لینے پر آمادہ ہوگئی۔ رات بھر میں وہیں پڑی کبھی درد سے کراہتی اور کبھی انھیں خیالات میں الجھتی رہی۔

یہ مہلک اِرادہ لمحہ بہ لمحہ اور بھی مضبوط ہوتا جاتا تھا۔ گھر میں میری کسی نے خبر نہ لی۔ پَو پھٹتے ہی میں باغیچہ سے باہر نکل آئی۔ معلوم نہیں میرا حجاب کہاں غائب ہوگیا تھا جو شخص سمندر میں غوطہ کھا چکا ہو۔ اُسے تال تلیوں کا کیا خوف؟ میں جو در و دیوار سے شرماتی تھی۔ اس وقت شہر کی گلیوں میں بے حجابانہ چلی جارہی تھی۔ اور کہاں؟ وہیں جہاں ذلت کی قدر ہے۔ جہاں کسی پر کوئی ہنسنے والا نہیں جہاں رسوائی کا بازار آراستہ ہے۔ جہاں حیا بکتی ہے اور شرم لُٹتی ہے!

اس کے تیسرے دن بازارِ حُسن کے ایک نمایاں حصہ میں ایک اُونچے بالاخانہ پر بیٹھی ہوئی میں بازار کی سیر کررہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ نیچے سڑک پر آدمیوں کا ایسا ہجوم تھا کہ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ آج ساون کا میلہ تھا۔ لوگ صاف ستھرے کپڑے پہنے جوق جوق دریا کی طرف جارہے تھے۔ ہمارے بازار کی بیش قیمت جنس بھی دریا کے کنارے آراستہ تھی۔ کہیں حسینوں کے جھولے تھے۔ کہیں ساون کے گیت۔ لیکن مجھے اس بازار کی سیر کنارِ دریا سے پُرلطف معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر کی اور سب شاہراہیں بند ہوگئی ہیں۔ صرف یہی تنگ گلی کھلی ہوئی ہے۔ اور سب کی نگاہیں بالاخانوں ہی کی طرف لگی تھیں۔ گویا وہ زمین پر نہیں چل رہے ہیں۔ ہوا میں اُڑنا چاہتے ہیں۔ ہاں تعلیم یافتہ آدمیوں کو میں نے اتنا بے باک نہیں پایا۔ وہ بھی گھورتے تھے مگر کنکھیوں سے۔ ادھیڑ عمر کے لوگ سب سے زیادہ بے باک معلوم ہوتے تھے۔ شاید اُن کی منشاء جوش جوانی کی نمود تھی۔ بازار کیا تھا۔ ایک وسیع تھیٹر تھا۔ لوگ بذلہ سنجیاں کرتے تھے۔ لُطف اُٹھانے کے لیے نہیں۔ حسینوں کو سُنانے کے لیے۔ روئے سخن دوسری طرف تھا۔ نگاہ کسی دوسری طرف۔ بس بھانڈوں اور نقالوں کی مجلس تھی۔

دفعتاً سعید کی فٹن نظر آئی۔ میں اس پر بارہا سیر کرچکی تھی۔ سعید پُرلطف لباس پہنے۔ اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ ایسا خوش وضع۔ ایسا بانکا وجیہہ جوان سارے شہر میں نہ تھا۔ بشرہ سے مردانہ پن برستا تھا۔ اس کی نگاہ ایک بار میرے بالاخانہ کی طرف اُٹھی۔ اور نیچے جھک گئی۔ اس کے چہرے پر مُردنی سی چھا گئی۔ جیسے زہریلے سانپ نے کاٹ کھایا ہو۔ اس نے کوچبان سے کچھ کہا۔ دم زدن میں فٹن ہوا ہوگئی۔ اس وقت اسے دیکھ کر مجھے جو حاسدانہ مسرت ہوئی۔ اس کے سامنے اس درد جان گزا کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ میں نے ذلیل ہوکر

اُسے ذلیل کر دیا۔ یہ کٹار فقیچیوں سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ اس کی جرأت نہ تھی کہ اب مجھ سے آنکھ ملاسکے۔ نہیں۔ میں نے اسے محبوس کر دیا۔ اسے قیدِ عمر میں ڈال دیا۔ اس قیدِ تنہائی سے اب اس کا نکلنا غیر ممکن تھا۔ کیونکہ اسے اپنی خاندانی وجاہت کا غرور تھا۔

دوسرے دن علی الصباح خبر ملی۔ کہ کسی قاتل نے مرزا سعید کا کام تمام کردیا۔ اس کی لاش اسی باغیچہ کے گول کمرہ میں ملی۔ سینہ میں گولی لگ گئی تھی۔ نو بجے دوسری خبر سُنائی دی۔ زرینہ کو بھی کسی نے رات کے وقت قتل کر ڈالا تھا۔ اس کا سر تن سے جدا کردیا گیا تھا۔ بعد کو تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں وارداتیں سعید ہی کے ہاتھوں وقوع میں آئیں۔ اس نے پہلے زرینہ کو اس کے مکان پر قتل کیا۔ اور تب اپنے گھر آکر اپنے سینہ میں گولی ماری۔ اس مردانہ غیرت مندی نے سعید کی محبت میرے دل میں تازہ کردی۔

شام کے وقت میں اپنے مکان پر پہنچ گئی۔ ابھی مجھے یہاں سے گئے ہوئے صرف چار دن گزرے تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کے بعد آئی ہوں۔ در و دیوار پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔ میں نے گھر میں قدم رکھا۔ تو بے اختیار سعید کی متبسم صورت آنکھوں کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ وہی مردانہ حُسن۔ وہی بانکپن۔ وہی نگاہِ التجا۔ بے اختیار آنکھیں بھر آئیں۔ اور دل سے ایک آہ سرد نکل آئی۔ غم اس کا نہ تھا کہ سعید نے کیوں جان دے دی۔ نہیں اس کی مجرمانہ بے حسی اور مردانہ حُسن پرستی کو میں قیامت تک نہ معاف کروں گی۔ غم یہ تھا کہ یہ سودا اس کے سر میں کیوں سمایا۔ اس وقت دل کی جو کیفیت ہے۔ اس سے قیاس کرتی ہوں کہ چند دنوں میں سعید کی بیوفائی اور بے رحمی کا زخم پُر ہوجائے گا۔ اپنی ذلت کی یاد بھی شاید مٹ جائے۔ مگر اس کی چند روزہ محبت کا نقش باقی رہے گا۔ اور اب یہی میری زندگی کا سہارا ہے۔

پہلی بار صبح امید کے ستمبر 1919 کے شمارہ میں (صفحہ 18- 9) شائع ہوا، ہندی میں عزت کا خون کے عنوان سے گپت دھن 2 میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر گوینکا نے اسے اپراپیہ ساہتیہ میں پرتشٹھا کی ہتیہ کے عنوان سے پیش کیا ہے۔

دفتری

رفاقت حسین میرے دفتر کا دفتری تھا۔ دس روپیہ ماہوار مشاہرہ تھا۔ اور دو تین روپے متفرق جلد بندیوں سے مل جاتے تھے۔ یہی اس کی کائنات تھی۔ مگر وہ اپنی حالت پر قانع و شاکر تھا۔ اندر کے حال کا تو علم نہیں۔ پر وہ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنتا۔ اور شگفتہ وخنداں رہتا۔ قرض سے جو اس طبقے کے آدمیوں کی ایک لازمی صفت ہے، اس کا دامن پاک تھا۔ اس کے سلام بھی تملق آمیز انکسار سے پاک ہوتے تھے۔ اس کی باتوں میں عمال کی نازبرداری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس میں متانت اور خودداری کی ایک شان تھی۔ جس نے اسے اس کی حیثیت سے زیادہ ممتاز بنا رکھا تھا۔ اس میں بے باکانہ صاف گوئی کی ایک خاص صفت تھی۔ عمال میں جو عیوب نظر آتے صاف کہہ دیتا۔ اور کسی قدر تکبر کی شان سے۔ گویا وہ اپنے تئیں ان سے بہتر سمجھتا تھا۔ اسے جانوروں سے خاص انس تھا۔ ایک گھوڑی پال رکھی تھی۔ ایک گائے، دو تین بکریاں، ایک بلی، ایک کتا، چند مرغے مرغیاں۔ ان جانوروں پر جان دیتا تھا۔ بکریوں کے لیے پتیاں توڑ لاتا۔ گھوڑے کے لیے گھاس کھودتا۔ اور باوجودیکہ اسے ہرماہ مویشی خانے کی زیارت کرنا پڑتی تھی۔ اور اکثر لوگ اس کے اس خبط کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ پر وہ اپنی طرزِ زندگی میں کوئی تغیر وضعداری کے خلاف سمجھتا تھا۔ اور اس کا یہ شوق منافع یا تجارت کے خیال پر مبنی نہ تھا۔ کسی نے اسے مرغیوں کے انڈے بیچتے نہیں دیکھا۔ اس کی بکریوں کے بچے کبھی بغدہ قصاب کے چھرے کے نیچے نہیں گئے۔ اور اس کی گھوڑی نے کبھی چارجامہ یا لگام کی صورت نہیں دیکھی۔ اس سے اس کی منشا بجز افزونیِ نسل کے اور کچھ نہ معلوم ہوتی تھی۔ خالص بے غرضانہ محبت تھی۔ مرغیوں کی ایک خاصی ٹولی ہوگئی تھی۔ بکریوں کا ایک خاصا گلہ، گھوڑی اور گائے بھی اس کارِ خیر میں بقدر ہمت شریک تھیں۔ گائے کا دودھ کتا پیتا تھا۔ بکری کا دودھ بلی۔ جو کچھ بچتا تھا۔ وہ اپنے صرف میں لاتا۔ حق یہ ہے کہ اس کا دل وسیع تھا۔ اور

وسائل کے ظرفِ تنگ میں نہ سماتا تھا۔

خوش قسمتی سے اس کی بیوی بھی نیک بخت عورت تھی۔ اور کمتر درجے کی عورتوں کے عیوب سے مبرا۔ اگرچہ اس کا مکان نہایت مختصر تھا۔ پر کسی نے دروازے پر اس کی آواز نہیں سنی۔ کسی نے اسے دروازے پر کھڑے جھانکتے نہیں دیکھا۔ وہ زیور اور کپڑے کے تقاضوں سے شوہر کی نیند حرام نہ کرتی تھی۔ ''اور! اور!!'' کی دھن میں موجودہ عافیت اور اطمینان کا خون نہ کرتی تھی۔ دفتری اس عورت کا عاشق تھا۔ اس کی پرستش کرتا تھا۔ اس اہلی مسرت میں اس کی شگفتہ طبعی کا راز پوشیدہ تھا۔ دفتری نیک کرے یا بد۔ اس کی بیوی اس کے ہر ایک کام میں اس سرگرمی سے شریک ہوتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا، یہ اسی کی تحریک ہے۔ وہ گائے کا گوبر اٹھاتی، گھوڑی کو گھاس ڈالتی، بکری کے بچوں کے ساتھ کھیلتی، بلی کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاتی، یہاں تک کہ کتے کو نہلانے سے بھی اسے پرہیز نہ تھا۔ معلوم نہیں یہ اس کا تقاضائے طبعی تھا یا شعارِ وفا؟ پر دفتری اسے اس کی عصمت شعاری ہی سمجھتا تھا۔

(۲)

برسات کے دن تھے۔ ندیوں میں باڑھ آئی ہوئی تھی۔ دفتر کے اہلکار مچھلیوں کا شکار کھیلنے چلے۔ شامت کا مارا رفاقت بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ دن بھر لوگ شکار کھیلا کیے۔ شام کو زور کی بارش ہوئی۔ اہلکاروں نے ایک موضع میں رات کاٹی۔ دفتری گھر چلا گیا۔ پر اندھیری رات تھی۔ راستہ میں گھٹنوں تک پانی۔ کچھ دور چل کر وہ بھول گیا۔ اور ساری رات بھٹکتا پھرا۔ بیوی کی تنہائی اتنی پریشانیوں سے زیادہ تشویش ناک تھی۔ اس کے دل پر ایک موہوم اضطراب حاوی تھا۔ صبح کو جب گھر پہنچا۔ تو ابھی اندھیرا ہی تھا۔ لیکن دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اس کا کتا دم دبائے اور دردناک انداز سے کراہتا ہوا آکر اس کے پیروں پرلوٹنے لگا۔ حالانکہ اس کی بیوی منہ اندھیرے اٹھا کرتی تھی۔ پرآج دروازوں کو کھلا ہوا دیکھ کر اس کا کلیجہ سن سے ہوگیا۔ گھر میں قدم رکھا تو بالکل سناٹا تھا۔ دو تین بار بیوی کو پکارا۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ در و دیوار پر ایک حسرت سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ گھر بھائیں بھائیں کررہا تھا۔ اس نے دونوں کوٹھریوں میں جاکر دیکھا۔ جب وہ وہاں نظر نہ آئی تو گھبرایا ہوا جانوروں کی کوٹھریوں میں گیا۔ اور قدم رکھتے

ہوئے اسے وہی بے معنی مہمل ہراس ہورہا تھا، جو کسی اندھیرے غار میں جاتے ہوئے ہوتا ہے۔

اسے دیکھتے ہی گھوڑی ہنہنائی۔ گائے اور اس کا بچھڑا تڑپھڑائے بکریوں نے میں میں شروع کی۔ ان کی صداؤں میں ایک خاص درد تھا۔ وہیں بیچ زمین پر اس کی بیوی چت پڑی ہوئی تھی۔ منہ پر مکھیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہونٹ نیلے پڑگئے تھے، آنکھیں پتھراگئی تھیں۔ رفاقت نے زور سے ایک چیخ ماری۔ اور چھاتی پیٹنے لگا۔ دفعتاً ایک کالا سانپ اندھیرے گوشے سے نکل کر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف جاتا نظر آیا۔ دفتری کے ہاتھ میں کوئی لکڑی نہ تھی۔ مگر انتقام کے جوش میں اس نے لکڑی کی پروا نہ کی۔ لپک کر سانپ کی دم پکڑلی۔ اور اسے اتنے زور سے گھما کر زمین پر پٹکا۔ کہ وہ وہیں مرگیا۔ اس کی آہ و زاری سن کر محلے کے لوگ جمع ہوگئے۔ تابوت وکفن کا انتظام ہونے لگا۔ دفتری دم بخود مبہوت اس طرح بیٹھا ہوا تھا۔ گویا اب اسے زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ باحیا عورت شاید جانوروں کو باندھنے کے لیے اندھیری کوٹھری میں آئی تھی۔ سانپ نے کاٹا۔ اور وہیں تڑپ تڑپ کر مرگئی۔ حیا کے مارے پڑوسیوں کو بھی خبر نہ دی یا ممکن ہے۔ مینہ کے شور میں اس کی گریہ و زاری کی آواز کسی کے کانوں میں نہ پہنچی ہو۔

دوسرے دن رفاقت دفتر آیا تو اسے پہچاننا مشکل تھا۔ گویا برسوں کا مریض ہے۔ صورت زرد، چہرے پر مردنی چھائی ہوئی، آنکھوں میں ایک وحشت آمیز نقشہ سا نظر آتا تھا۔ بالکل کھویا ہوا۔ گم صم بیٹھا رہا۔ گویا کسی دوسری دنیا میں ہے۔ شام ہوتے ہی وہ اٹھا اور بیوی کے مزار پر جاکر بیٹھ گیا اندھیرا ہوگیا۔ دوتین چار گھڑی رات گزر گئی۔ پر وہ چراغ کی ٹمٹاتی ہوئی روشنی میں۔ اسی مزار پر یاس و اندوہ کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ گویا موت کا انتظار کر رہا ہے۔ یا شہر خموشاں کی مدھم صداؤں کی طرف کان لگائے ہوئے ہے۔

معلوم نہیں کب گھر آیا۔ اب یہی اس کا روزانہ معمول ہوگیا۔ صبح اٹھ کر مزار پر جاتا۔ جاروب کشی کرتا۔ پھولوں کے ہار چڑھاتا، لوبان جلاتا، اور تب دو زانو بیٹھ کر نو بجے تک قرآن کی تلاوت کرتا۔ مغرب کے وقت پھر مزار پر جا بیٹھتا۔ اور پھر وہی جاروب کشی۔ وہی تلاوتِ قرآن ۔ وہی شمعِ مزار۔ اور پھر وہی پھولوں کے ہار۔ اب یہی اس کی زندگی کا نظام تھا۔ وہ اب عالمِ ارواح میں بستا تھا۔ جہاں ملائک اس کے انیس و غمگسار تھے۔

دنیائے ظاہر سے اس نے منھ پھیر لیا تھا۔ جہاں رنج و محن کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کی باتوں سے روحانیت ٹپکتی تھی۔ اور بشرے سے ایک تقدس کی شان نمایاں تھی۔ غم نے مجذوب بنا دیا تھا۔

(۳)

کئی ماہ تک یہی کیفیت رہی۔ اہلکاروں کو اس سے ایک خاص ہمدردی ہوگئی تھی۔ اس کے کام بھی اکثر لوگ اپنے ہاتھوں کرلیتے۔ اسے تکلیف نہ دیتے۔ اس کی وفاپرستی پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ اور گو کتنے ہی حضرات دل میں اسے حماقت سمجھتے تھے۔ پر یہ خیال ان کی زبان تک نہ آتا تھا۔ یہ حماقت ہی سہی۔ لیکن کتنی پاکیزہ، کتنی علوی تھی۔

مگر انسان عالمِ ارواح میں مستقل سکونت اختیار نہیں کرسکتا۔ وہاں کی آب و ہوا اس کے موافق نہیں۔ وہاں مادی، مرئی، قابلِ احساس کیفیات کہاں؟ اجتہاد میں وہ خوشیاں، وہ فکریں، وہ مشغلے، وہ دل بستگیاں کہاں؟ دفتری کو آدھی رات تک مزار کی جاروب کشی کے بعد چولھا جلانا پڑتا۔ علی الصباح جانوروں کی خدمت کرنا پڑتی۔ حقیقت نے جذبات پر فتح پائی۔ ریگستان کے پیاسے مسافر کی طرح رفاقت پھر متاہل زندگی کے چشمۂ شیریں کی طرف دوڑا۔ وہ پھر زندگی کا وہی دلچسپ ڈراما دیکھنا چاہتا تھا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر وہ ایکٹرس نہ تھی۔ ایکٹرس کے خط و خال، ناز و ادا، لے اور دھن کی تصویر آنکھوں کے سامنے تھی۔ مگر جوں جوں زمانہ گزرتا تھا۔ تماشے کا لطف ایکٹرس کے حسن و ادا سے بے نیاز ہوتا جاتا تھا۔ بیوی کی یاد اہلیت کے مزوں کی صورت میں قائم ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ چھ مہینہ میں تجربے نے اپنا عمل پورا کردیا۔ بیوی کی محبت تاہل کی خوشیوں کی یاد میں فنا ہوگئی۔

اس محلے کے دوسرے سرے پر بڑے صاحب کا ایک اردلی رہتا تھا۔ اس کے یہاں سے شادی کی بات چیت شروع ہوئی۔ میاں رفاقت پھولے نہ سمائے۔ اردلی صاحب محلے میں کسی وکیل سے کم ممتاز نہ تھے۔ سارے محلے پر ان کا رعب حاوی تھا۔ ان کے وسائلِ آمدنی لال بجھکڑوں کے لیے بھی ایک عقدہ تھے۔ اس پر صرف ''غیر محدود'' کا اطلاق کیا جاسکتا تھا۔ اور اس کی عامیانہ زبان میں تفسیریں کی جاتی تھی کہ جو کچھ مل جائے گا، وہ تھوڑا ہے۔ اردلی صاحب خود اپنی زبانِ مبارک سے فرماتے تھے کہ تکاوی کے موسم میں

انھیں جیب کی جگہ تھیلیاں رکھنا پڑتی تھیں۔ دفتری نے سمجھا سونے کی چڑیا پھنس گئی۔ اس طرح ٹوٹا جیسے بچے کھلونے پر ٹوٹتے ہیں۔ ایک ہفتے میں سارے مرحلے طے ہوگئے۔ اور بیوی گھر میں آگئی۔ جو شخص ابھی ایک ہفتے قبل دنیا سے منھ موڑے ہوئے اعتکاف میں بیٹھا ہو، ابھی اسے منھ پر سہرا ڈالے۔ گھوڑے پر سوار دیکھنا خواصِ انسانی کا ایک دلچسپ مطالعہ تھا۔ لیکن دفتری اس وقت ایسا شاداں وخنداں تھا گویا قیدِ تاریک سے نکل آیا ہو۔ نقد وجنس بھی جہیز میں اس قدر ملا تھا جو اردلی صاحب کو چاہے گراں نہ گزرا ہو پر رفاقت کے پیمانۂ امید سے کہیں زیادہ تھا۔ چنانچہ کئی دن تک خوب جشن رہے۔ اہلکاروں کی دعوت ہوئی۔ فقراء کو کھچڑی کھلائی گئی۔ سارے محلے میں فیرینی تقسیم ہوئی۔ چشمۂ حیات پاکر بھی انسان اس سے زیادہ شاد کام نہیں ہوسکتا۔

(۴)

مگر ایک ہی ہفتہ میں نئی بیوی کے جوہر کھلنے شروع ہوئے۔ خدا نے اسے نگاہِ ظاہر کے بدلے نگاہِ باطن عطا کی تھی۔ اس کا ثبوت اس کی وہ روانیِ بیان تھی۔۔ جو اب اکثر پڑوسیوں کو محظوظ اور رفاقت کو منکوب کیا کرتی تھی۔ قناعت کی جیتی جاگتی مورت تھی۔ کملی کے باہر تو کیا۔ اس کے اندر بھی پاؤں نہ پھیلاتی۔ گھسٹ گھسٹ کرچلتی۔ ایک مجسمہ فروتنی تھا، جو کھڑے ہونے کو بھی گردن کشی سمجھتا تھا۔ اس نے ایک ہفتے تک فلسفیانہ بصیرت کے ساتھ دفتری کے عادت و اطوار کا مطالعہ کیا۔ اور تب اس کی تنبیہہ و تلقین شروع کی۔

"تم بھی عجیب طرح کے آدمی ہو۔ انسان جانور پالتا ہے۔ اپنے آرام کے لیے۔ نہ کہ محض دردِ سر کے لیے۔ یہ کیا کہ گائے کا دودھ کتے پییں۔ بکریوں کا دودھ بلیاں چٹ کرجائیں۔ اور گھر کے آدمی ترسیں۔ آج سے سب دودھ گھر میں لایا کرو۔ اور ان موزیوں کو میرے سامنے سے دفان کرو۔ مسلمان کا گھر ہے۔ یا کوئی سرائے۔ آخر دین بھی تو کوئی چیز ہے۔ جس کا سایہ پڑنا شرع میں منع ہے۔ اسے پال کرمیں عذاب نہ لوں گی۔"

دفتری لاجواب ہوگیا۔ دوسرے دن سے گھوڑی کا دانہ بند ہوگیا۔ وہ اب بھاڑ میں بھنتا اور نمک مرچ سے کھایا جاتا تھا۔ صبح کو تازہ دودھ کا ناشتا ہوتا۔ آئے دن کھیر پکتی۔ اور لوازمات بھی بڑھے۔ بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ زردے اور پان بغیر کیونکر رہتی۔ گھی،

گوشت، مسالہ بھی ضروری مدیں تھیں۔ اور خادمہ کے بغیر تو زندہ رہنا محال تھا۔ پہلے ہی مہینے میں دفتری کو معلوم ہوگیا کہ موجودہ آمدنی گزارے کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ اس کی حالت اس آدمی کی سی تھی۔ جو شکر کے دھوکے میں کونین پھانک گیا ہو۔ معلوم نہیں اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ مگر ماتھے پر شکن نہ تھی۔ دو چار منچلے اہلکاروں نے ایک دن اس سے مزاح آمیز ہمدردی ظاہر کی تو وہ بڑی متانت سے بولا۔ "آخر اس اللہ کی بندی کا بھی کہیں گزر ہونا چاہیے تھا۔ اس کا کون پرسانِ حال ہوتا۔ اور پھر بلا خدا کی مرضی کے کچھ ہوتا نہیں۔ میں اس کی مرضی میں دخل دینے والا کون؟"

مردانہ توکل کا نظارہ کتنا دردناک ہے۔ یہ وہ نغمۂ درد ہے جسے سن کر دل ہل جاتا ہے۔ یہ وہ سرخیٔ چشم ہے۔ جو سوزِ دروں کا پتہ دیتی ہے۔ یہ تبسم بشاشتِ قلب کی نہیں، سوزِ دل کی خبر دیتا ہے۔ اس شفق کی اوٹ میں شبِ تار چھپی ہوتی ہے۔ ڈراؤنی اور سنسان۔

وہ دفتری جو افلاس میں تمول کا لطف اٹھاتا تھا۔ اب آشفتہ حالی کی ایک زندہ تصویر تھا۔ کپڑے میلے، سر کے بال پریشان، چہرے پر اُداسی چھائی ہوئی۔ شب و روز فکرِ معاش کی چکّی جتا ہوا۔ "اور! اور!!" کی فکر میں پریشان اسے دیکھ کر آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ اس کی گائے اب ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ گھوڑی نیم جان، بلی پڑوسیوں کے چھینکوں پر الجھتی، اور کتا گھوروں اور کوڑے کے ڈھیروں پر اپنا آذوقہ تلاش کرتا۔ سڑک پر پڑی ہوئی ہڈیاں چچوڑتا۔ مگر اب بھی وہ ہمت کا دھنی ان رفقائے قدیم کو الگ نہ کرتا تھا۔ ان سب مصیبتوں پر مزید یہ کہ اسے دونوں وقت چولھے کی آنچ میں جلنا پڑتا تھا۔ مگر سب سے بڑی مصیبت بیوی کی وہ زبان درازی تھی۔ جس کے سامنے کبھی کبھی اس کا مردانہ استقلال اس کا دلیرانہ توکل، اس کی ستم ظریفانہ خندہ جبینی رخصت ہوجاتی۔ اور وہ اندھیری کوٹھری کے ایک گوشے میں بیٹھ کر خوب پھوٹ پھوٹ کر روتا۔ لطفِ قناعت سے محروم ہوکر رفاقت کا دل پر داغِ لاپروائی اور وار فتگی کی جانب مائل ہوگیا۔ وہ فکرِ فردا سے آزاد ہوگیا۔ خودداری جو قناعت کی برکت ہے۔ اس کے دل سے محو ہوگئی۔ شمعِ سوزاں کے بجھنے کے بعد وہ جگنو کی طرف لپکا۔ اس نے فاقہ مستی کی روش اختیار کی۔ چونکہ اب پانی رکھنے کے لیے کوئی برتن نہ تھا۔ وہ اسے کنوئیں سے کھینچ کر اسی وقت پی جانا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ زمین

پر نہ بہہ جائے۔ تنخواہ پاکر اب وہ مہینے بھر کا سامان نہ جمع کرتا۔ نانِ گرم اور آبِ سرد سے اب اسے تسکین نہ ہوتی تھی۔ بازار سے فیرنی کی پیالیاں لاتا۔ سیخ کے کباب اور بالائی کے دونے اور قلمی آم کی طرف لپکتا۔ دس روپے کی بساط ہی کیا۔ ایک ہفتے میں غائب ہوجاتے۔ تب جلد بندیوں کے پیشگی روپوں پر گزراں ہوتی۔ بعد ازاں ایک دن فاقہ کشی کی نوبت آتی۔ تب قرض مانگنے لگتا۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ تنخواہ کے روپے قرض خواہوں ہی کے ہاتھوں میں چلے جاتے۔ اور وہ پہلے ہی دن سے پھر اسی فکر میں پریشان دوڑنے لگتا۔ وہ پہلے دوسروں کو کفایت شعاری کے وعظ سنایا کرتا تھا۔ اب لوگ اسے سمجھاتے۔ پر وہ فقیرانہ بے نیازی سے کہتا۔ "صاحب! آج ملتا ہے۔ کھاتے ہیں۔ کل خدا حافظ ہے۔ ملے گا تو کھائیں گے۔ نہیں پڑکر سو رہیں گے۔" اس کی حالت اب اس مریض کی سی ہوگئی تھی جو شفا سے مایوس ہوکر ایک قسم کی بدپرہیزی اور بے احتیاطی کرنے لگے۔ تاکہ موت کے آنے تک وہ نعمت ہائے دنیا سے سیر ہوجائے۔

مگر شاید ابھی تک وضعداری کا احساس باقی تھا۔ لوگوں کے بہت اصرار کرنے پر وہ گھوڑے یا گائے کے بیچنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ خریدار آآکراس کے دروازے سے لوٹ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک ہفتے تک روپے کی فکر میں سرگرداں رہا۔ خوراک اور تاوان کے روپے بڑھتے گئے۔ اور بالآخر دونوں جانور سرکاری قاعدے کے مطابق نیلام ہوگئے۔ دفتری نے کئی دن تک ان کا ماتم کیا۔ بکریاں بھی گرگ قرض کا شکار ہوگئیں۔ زردہ اور پلاؤ، فیرنی، اورکباب کے چسکے نے نانبائی کا مقروض بنا دیا تھا۔ جب اس نے نقد وصولی کی کوئی صورت نہ دیکھی: تو ایک دن دفتری کے دروازے پر آکرساری بکریاں ہانک لے گیا۔ بیچارہ منھ تاکتا رہ گیا۔ بلی نے بھی اب رسمِ وفا کو ترک کیا۔ گائے اور بکریوں کے جانے کے بعد اسے دودھ کے برتنوں کو چاٹنے کی بھی آس نہ رہی جو اس کی وفاداری کا آخری رشتہ تھا۔ ہاں کتا ابھی تک عنایاتِ قدیم کو یاد کرکے رفاقت کا دم بھرتا تھا۔ مگر اس کی زندہ دلی رخصت ہوگئی تھی۔ یہ وہ کتا نہ تھا، جس کے سامنے دروازے پر سے کسی اجنبی آدمی یا کتے کا نکل جانا محال تھا۔ وہ اب بھی بھونکتا تھا۔ لیکن لیٹے لیٹے اور بسا اوقات پہلو میں سر چھپائے ہوئے، گویا موجودہ بے اعتنائیوں اور نیرنگئ فلک کا گلہ کر رہا ہو۔ یا تو اس میں اب اٹھنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی یا وہ نوازش ہائے دیرینہ کا اتنا ہی تشکر کافی سمجھتا

تھا۔ اگرچہ رفاقت کی وہ صاف گوئی ابھی تک باقی تھی لیکن اب اس کی کسی کی نگاہ میں کچھ وقعت نہ تھی۔ وہ ہرزہ سرائی سمجھی جاتی تھی۔ جیسے کسی بیوہ کی گالیاں۔ ایک روز چند پڑوسیوں نے اس پر نئی بیوی کے متعلق کوئی پھبتی کہی۔ زود رنجی بینوائی کی ایک خاص صفت ہے۔ دفتری جامہ سے باہر ہوگیا۔ نیم برہنہ ایک پھٹا پاجامہ پہنے ہوئے وہ تندوگرم ہورہا تھا۔ گلے کی رگیں تنی جاتی تھیں۔ پنڈلیوں میں رعشہ تھا۔ منہ میں پھکوڑ۔ مگر اہلِ خطاب بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ گویا کوئی کتا بھونک رہا ہو۔ وہ ذلت کی اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ لوگ اس کے غصے کو بھی حقیر سمجھنے لگے تھے۔

ایک بار میری تحریک سے دفتر کے اہلکاروں نے از راہِ ہمدردی اس کے لیے مہینے بھر کی جنس خرید کر رکھ دی۔ مگر مہینے بھر کی جنس ایک ہفتے میں غائب ہوگئی۔ چاول کے بدلے آم لیے گئے۔ دال کے بدلے جامن۔ دن میں تین تین بار چولھا جلا۔ اور پھر وہی فاقہ مستی اور تنگدستی شروع ہوگئی۔ انجام کار لوگوں کے دل اس کی طرف سے سخت ہوگئے۔ کوئی اسے ایک پیسہ قرض نہ دیتا۔ وہ سامنے کھڑا عاجزانہ صورت بنائے منتیں کرتا۔ دعائیں دیتا پر کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔

(۵)

شام کا وقت تھا۔ میں دفتر سے آکر دروازے پر بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اور تفریح کے طور پر حقے کے کش بھی لیتا جاتا تھا۔ معلوم نہیں اوروں کا کیا خیال ہے۔ پر مجھے تو تمباکو تکان و دماغ کا بہترین مصلح معلوم ہوتا ہے۔ کہ دفعتاً میں نے میاں رفاقت کو آتے ہوئے دیکھا۔ شاید کوئی دہقانی آدمی سمن والے چپراسی سے بھی اس قدر خائف نہ ہوتا ہوگا۔ لڑکے ٹیکا لگانے والے سے بھی اس قدر نہ ڈرتے ہوں گے۔ میں ایک عالمِ وحشت میں کرسی سے اٹھا اور چاہا کہ اندر جاکر دروازہ بند کرلوں۔ مگر بدقسمتی سے چلم اس پریشانی میں دامن سے الجھ کر زمین پر گرپڑی اور میں اسے اٹھانے میں مصروف ہوگیا۔ اتنے میں دفتری دروازے کے سامنے آگیا۔ اب میرے لیے راہِ فرار بند تھی۔ کرسی پر بیٹھ گیا۔ پر ناک بھوں چڑھائے ہوئے۔ دفتری کس لیے آرہا ہے، اس میں مجھے ذرہ بھر بھی شک نہ تھا۔ استقراء اس میں میرا مشیر تھا۔ قرض گیروں کی غرض ان کے چہرے پر۔ ان کے حرکات و سکنات پر۔ جلی خطوں میں۔ روشن رنگوں سے کھنچی ہوتی ہے۔ وہ ایک خاص

قسم کی خفت آمیز لجاجت ہوتی ہے۔ جسے ایک بار دیکھ کر پھر نہیں بھلایا جاسکتا۔

دفتری نے آتے ہی آتے بغیر کسی دیباچے یا تمہید کے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ جس کا مجھے پہلے ہی سے علم تھا۔

میں نے ترشی سے جواب دیا۔ "میرے پاس روپے نہیں ہیں۔"

دفتری نے سلام کیا۔ اور اُلٹے قدم لوٹا۔ اس کے چہرے پر ایسی حسرت، ایسی بے کسی چھائی ہوئی تھی کہ مجھے بے اختیار اس پر رحم آیا۔ اس کا اس طرح لوٹنا کتنا پُرمعنی تھا۔ اس میں تقصیر کا اعتراف، گزشتہ کی ندامت، اپنی معذوری کا اظہار یہ سب جذبات چھپے ہوئے تھے۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ لیکن اس کا چہرہ مجسم بیان ہو کر کہہ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آپ مجھے یہی جواب دیں گے۔ اس میں مجھے ذرہ بھر بھی شک نہ تھا۔ لیکن باوجود اس یقین کے میں یہاں تک آیا۔ معلوم نہیں کیوں؟ خود میری سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید آپ کی درد رسی کا خیال، آپ کی نگاہِ ترحم کی امید، مجھے یہاں تک لائی۔ اب جاتا ہوں۔ وہ منھ ہی نہیں رہا کہ عرض حال کروں۔ اس تکلیف دہی کے لیے معاف فرمایئے گا۔

میں نے دفتری کو آواز دی۔ "ذرا سنو تو۔ کیا ضرورت ہے؟"

دفتری کی امید کچھ تازہ ہوگئی۔ بولا۔ "حضور کیا عرض کروں۔ دو دن سے لگاتار فاقہ ہو رہا ہے۔" میں نے بہت ملائم انداز سے سمجھایا۔ مگر اس طرح قرض دام لینے سے کتنے دنوں تک کام چلے گا؟ اپنا خرچ سمیٹتے کیوں نہیں ہو؟ جتنا پاتے ہو۔ اس سے کم خرچ کرو۔ خواہ کتنی ہی ضرورت کیوں نہ درپیش ہو۔ پھر روزِ اول سے کیوں قرض کی فکر سوار ہو۔ اسی خیال سے میں نے ایک بار تمھارے لیے مہینے بھر کے خرچ کا انتظام کر دیا تھا۔ مگر تم نے پھر وہی پرانی روش اختیار کی۔ تم سمجھ دار آدمی ہو۔ جانتے ہو کہ اس زمانہ میں کسی کے پاس ہر وقت روپے موجود نہیں رہتے۔ ہر شخص اپنی اپنی فکروں میں مبتلا ہے۔ اور بالفرض کسی کے پاس ہوں بھی تو وہ قرض دادن اور دردِ سر خریدن، کے مصداق کیوں عمل کرنے لگا۔ دس دروازوں کا چکر لگاتے ہو۔ تب کہیں ایک جگہ مراد بر آتی ہے۔ بتلاؤ یہ کتنی شرمناک بات ہے! آخر معاملہ کیا ہے؟ تمھاری یہ حالت میں دو ڈھائی سال سے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے قبل تو تم بہت فارغ البال نظر آتے تھے۔"

دفتری نے متوکلانہ انداز سے کہا۔ ”حضور تقدیر کی گردش ہے۔ اور کیا عرض کروں۔ آپ پر تو سب روشن ہے۔ میں اپنی اہلیہ کے ہاتھوں خستہ اور خوار ہوں۔ میں حلفیہ کہتا ہوں مجھے اس کے اندھی اور لنگڑی ہونے کا شمہ بھر بھی ملال نہیں ہے۔ یہ تو مولیٰ کی مرضی ہے۔ افسوس مجھے اس کے چٹورے پن کا ہے۔ میری تقدیر کی گردش، میری بدنصیبی، میری خانہ بربادی، میرے نحس ستارے۔ سب کچھ اس شکم پرستی کے نام ہیں۔ یہی میری نحوست کی گھٹا ہے۔ میں نے کئی بار چاہا کہ ماہوار انتظام کروں۔ پر جو چیز مہینے بھر کے لیے لاتا ہوں۔ وہ ایک دن میں اڑ جاتی ہے۔ اگر ایک دن دودھ نہ ملے تو جناب مہنا متھ مچا دے۔ صبح کو ناشتے کے لیے امرتیاں نہ لاؤں تو گھرمیں قیامت برپا ہوجائے۔ اگر گوشت نہ پکے تو میری بوٹیاں نوچ کھائے۔ خاندان کا شریف ہوں۔ یہ بے حرمتی نہیں برداشت ہوتی کہ کھانے پینے کے لیے بیوی سے بم چخ کروں۔ اس کی بدزبانی کے خوف سے تھرتھر کانپتا رہتا ہوں۔ اس کی جو کچھ الٹی سیدھی فرمائش ہوتی ہے سر کے بل بجا لاتا ہوں۔ جناب ایسی تندمزاج ہے کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ بس اب خدا سے یہی دعا ہے کہ مجھے دنیا سے اٹھالے۔ اور اس عذاب سے نجات دے۔ اس کے سوا مجھے تو کوئی اور صورت نہیں نظر آتی۔ میں سب کچھ کرکے ہار گیا۔“

میں لاجواب ہوگیا۔ صندوق سے پانچ روپے نکالے۔ اور اسے دے کر بولا۔ ”یہ لو! یہ تمھاری غیرت مندانہ مستقل مزاجی کا انعام ہے۔ قرض نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمھارا دل اتنا وسیع ہے۔“

دفتری نے زمین دوز سلام کیا۔ اور چلا گیا۔

لاہور کے اردو ماہنامہ کہکشاں اکتوبر 1919 میں شائع ہوا۔ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سرو ور8 میں شامل ہے

اشکِ ندامت

یہ کہانی دستیاب نہیں ہے۔ مگر میرے کاغذوں میں اس کہانی کا لب لباب ہے جسے میں نے برٹش کاؤنسل کو لکھ کر دیا تھا۔ کہانی یوں ہے۔ رچرڈ ایک روز شراب کے نشے میں اپنی معشوقہ کے والدین کو تلخ باتیں کہہ دیتا ہے۔ معشوقہ اس سے وعدہ کرواتی ہے کہ وہ آگے سے شراب نہیں پیے گا۔ مگر رچرڈ شراب نہیں چھوڑتا۔ منگنی ٹوٹ جاتی ہے اور رچرڈ فوج میں بھرتی ہوجاتا ہے۔ اس کا افسر ٹاٹن اس سے بہت خوش ہے اور رچرڈ اس کا بھگت بن جاتا ہے۔ ٹاٹن کی رجمنٹ ہندوستان میں لڑائی میں حصہ لیتی ہے۔ 1813 میں ایک فرانسیسی ٹاٹن کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اور رچرڈ تہیہ کرتا ہے کہ وہ اس فرانسیسی افسر کو مار کر ہی دم لے گا۔ وہ ٹاٹن کی ماں کے گھر آتا ہے۔ وہ اس سے بہت خوش ہوتی ہے اور اس سے اپنے لڑکے کی طرح پیش آتی ہے۔ والٹرلو کی جنگ کے بعد وہ فرانس جاتی ہے اور اس گھر میں وہ مہمان بن کر ٹھہرتی ہے اور رچرڈ کی اتنی تعریف کرتی ہے کہ رچرڈ کو فرانس جانے کی دعوت ملتی ہے۔ وہ جب وہاں پہنچتا ہے تو ٹاٹن کی ماں کے میزبان کے گھر ایک پارٹی ہوتی ہے۔ میزبان نہایت ہی شریف اور ملنسار ہے اور وہ رچرڈ کا استقبال کرتا ہے۔ رچرڈ دیکھتا ہے کہ یہ تو ٹاٹن کو موت کے گھاٹ اتارنے والا شخص ہے جس کو مار ڈالنے کی اس نے قسم کھائی تھی۔ مگر اب وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ اسے ندامت ہے۔

میں نے اپنی پریم چند ایک لٹریری بائیگرافی (1944) میں (صفحہ 134)، میں لکھا تھا کہ یہ قصہ چارلس ڈکنس کی ایک کہانی کا اردو ترجمہ ہے اشک ندامت لاہور کے ماہنامہ کہکشاں صفحہ (39-32) جنوری 1920 میں شائع ہوا۔ کہانی کا عنوان تھا 'اِسٹوری آف ڈبل ڈک'۔ یہ ہاؤس ہولڈورکس کے کرسمس شمارہ میں شائع ہوئی۔ بعد میں "سیون ٹریولرز" کے عنوان سے یہ کہانی ایک مجموعہ میں شائع ہوئی۔

اس کہانی کی کاپی میرے پاس تھی۔ میں نے اسے تیس غیر شائع شدہ کہانیوں کے ایک مجموعہ میں مکتبہ جامعہ کو 1977 میں اشاعت کے لیے دیا تھا۔ کاپی رائٹ کے جھنجھٹوں سے بچنے کے لیے جامعہ نے اسے شائع نہیں کیا۔ پھر میں نے اسے اسٹار پبلیکشنز کو دیا۔ ان کے یہاں سے یہ مسودہ گم ہوگیا۔ محققین نے میری کتاب پڑھی اور حوالہ بھی دیا ہے مگر اس امر کو نظر انداز کیا ہے۔ ایک محقق نے لکھا ہے کہ یہ العصر1917 میں شائع ہوا اور پریم پچیسی میں شامل ہے یہ صحیح نہیں ہندی کے ایک محقق نے لکھا کہ پریم چند کے پرابت رسالہ میں شامل ہے مگر وہاں بھی ندارد ہے۔

عبرت

پنڈت چندر دھر نے ایک اپر پرائمری مدرسہ کی مدرسی کر تو لی تھی۔ مگر ہمیشہ پچھتایا کرتے کہ ناحق اس جنجال میں آ پھنسے۔ اگر کسی اور صیغہ میں ہوتے تو اب تک ہاتھ میں چار پیسے ہوتے۔ آرام سے نیند بسر ہوتی۔ یہاں تو مہینہ بھر کے انتظار کے بعد کہیں پندرہ روپے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ بھی ادھر آئے اُدھر غائب! نہ کھانے کا سکھ، نہ پہننے کا آرام۔ ان کے پڑوس میں دو آدمی اور رہتے تھے۔ ایک ٹھاکر رتی بل سنگھ ہیڈ کانسٹیبل دوسرے منشی بیج ناتھ سیاہ نویس۔ ان دونوں آدمیوں کی تنخواہ منشی جی سے زیادہ نہ تھی۔ تب بھی ان کی آرام سے کٹتی تھی شام کو کچہری سے آتے۔ اپنے بچوں کے لیے مٹھائیاں لاتے۔ دونوں صاحبوں کے پاس خدمت گار تھے۔ گھر میں کرسیاں۔ میز۔ فرش سب ہی سامان موجود تھا۔ ٹھاکر صاحب شام کو آرام کرسی پر لیٹ کر خوشبودار تمباکو پیتے۔ منشی جی اپنے کمرہ میں بیٹھ کر شیشہ و ساغر سے شوق کرتے۔ جب کچھ سرور آتا تو ہارمونیم بجاتے سارے محلّہ میں ان کا رعب غالب تھا۔ انھیں آتے جاتے دیکھ کر بنیے اُٹھ کر سلام کرتے۔ ان کے لیے بازار میں خاص نرخ تھے۔ آنے سیر کی چیز ٹکے سیر پر لیتے۔ لکڑی ایندھن مفت۔ شام سویرے ان کے یہاں آدمیوں کا مجمع رہتا۔ پنڈت جی ان کے یہ ٹھاٹھ دیکھ کر کُڑھتے۔ اور اپنی تقدیر کو کوستے۔ علم و لیاقت میں وہ لوگ ان کے پاسنگ بھی نہیں تھے۔ انھیں اتنا علم بھی نہ تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یا آفتاب زمین کے گرد۔ تاہم وہ چین کرتے تھے وہ لوگ کبھی کبھی از راہِ ترحم پنڈت جی کے ساتھ ہمسائیگی کے حق ادا کیا کرتے۔ کبھی سیر آدھ سیر دودھ بھیجوا دیتے کبھی ترکاریاں۔ مگر اس کے عوض پنڈت جی کو ٹھاکر صاحب کے دو اور منشی جی کے تین لڑکوں کی نگرانی کرنا پڑتی۔ ٹھاکر صاحب فرماتے۔ پنڈت جی یہ لڑکے ہردم کھیلا کرتے ہیں۔ ذرا ان کی تنبیہ کرتے رہیے۔ منشی جی کہتے۔ یہ لونڈے آوارہ ہوئے جاتے ہیں۔ ذرا ان کی نگرانی کیا کیجیے۔ یہ فرمائشیں ایسی مربیانہ لہجہ میں کی جاتی تھیں۔ گویا

پنڈت جی ان کے زر خرید غلام ہیں۔ پنڈت جی دل کو مسوس کر رہ جاتے۔ مگر انھیں ناراض نہ کرسکتے تھے۔ ان کی بدولت کبھی کبھی دودھ کے درشن تو ہوجاتے تھے۔ محض اتنا ہی نہیں ان کی بدولت وہ بازار سے خاص نرخ پر جنس لاتے۔ اس لیے بیچارے اس تحکم کو زہر کے گھونٹ کی طرح پیتے تھے انھوں نے اس صیغہ سے نکلنے کے لیے کوئی بات اُٹھا نہ رکھی تھی۔ درخواستیں دیں۔ افسروں کی خوشامدیں کیں۔ مگر مُراد پوری نہ ہوئی۔ ہاں اتنا تھا کہ اس بد دلی کا اثر اپنے منصبی کاموں پر نہ ہونے دیتے۔ تعلیم میں غفلت نہ کرتے۔ دل لگا کر پڑھاتے اس سے ان کے افسر خوش ہوتے۔ سال میں کچھ انعام دیتے تھے اور ترقی کا جب کبھی موقع ملتا ان کا خاص خیال رکھتے لیکن اس صیغہ کی ترقی اوسر کی کھیتی ہے بڑے بھاگ سے ہاتھ لگتی ہے۔ وہاں قصبہ کے لوگ ان سے خوش تھے اور مدرسہ کے لڑکے تو ان پر جان دیتے تھے۔ کوئی ان کے آکر پانی بھر دیتا کوئی ان کی بکری کے لیے پتیاں توڑ لاتا۔ پنڈت جی اسی کو غنیمت سمجھتے تھے۔

(۲)

ایک بار ساون کے مہینہ میں منشی جی اور ٹھاکرصاحب نے اجودھیا کے جاترا کی صلاح کی۔ دُور کا سفر تھا۔ مع عیال کے جانا چاہتے تھے۔ دونوں اصحاب نے ایک ایک ہفتہ کی رخصت لی اور پنڈت جی کو ساتھ لے چلنے پر مجبور کیا یہ کچھ دُبدھے میں تھے۔ لیکن جب ان لوگوں نے سفر خرچ کا ذمہ لیا۔ تب انکار کی گنجائش نہ رہی اجودھیا کی جاترا کا ایسا اچھا موقع پاکر کیوں کر رُکتے۔ بلھور سے ایک بجے رات کو گاڑی چھوٹتی تھی۔ آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اسی لیے سرشام ہی سے اسٹیشن پر آگئے۔ یہاں آج میلہ کے سبب سے بڑی بھیڑ تھی۔ جب گاڑی آئی تو دھکم دھکا شروع ہوا۔ کوئی آگے گیا۔ کوئی پیچھے۔ پنڈت جی اور ٹھاکرصاحب آگے نکل گئے۔ منشی جی پیچھے رہ گئے۔ اس آفت میں کون کس کا راستہ دیکھتا ہے الگ الگ گاڑیوں میں جا بیٹھے۔

جس کمرہ میں ٹھاکر اور پنڈت جی گھُسے اس میں صرف چار آدمی تھے ان میں دو بیٹھے تھے، دو لیٹے ہوئے تھے۔ ٹھاکرصاحب نے ایک آدمی سے کرخت لہجہ میں کہا۔ اُٹھ بیٹھو جی۔ دیکھتے نہیں ہو۔ ہم لوگ کھڑے ہیں۔

مسافر لیٹے لیٹے بولا۔ کیوں اُٹھ بیٹھیں جی۔ کچھ تمھارے بیٹھنے کا ٹھیکہ لیا ہے۔

ٹھاکر صاحب۔ کیا ہم نے کرایہ نہیں دیا ہے۔

مسافر جسے کرایہ دیا ہو اس سے جاکر جگہ مانگو۔

ٹھاکر۔ ذرا ہوش سے باتیں کرو۔ اس ڈبے میں دس آدمیوں کے بیٹھنے کا حکم ہے۔

مسافر۔ یہ تھانہ نہیں ہے۔ ذرا زبان سنبھال کرباتیں کیجیے۔

ٹھاکر نے غور سے دیکھ کر پوچھا۔ تم کون ہو؟

مسافر۔ ہم وہی ہیں جس پر آپ نے خفیہ فروشی کا الزام لگایا تھا اور جس کے دروازے سے آپ پچیس روپے لے کر ٹلے تھے۔

ٹھاکر۔ آہا! اب پہچانا۔ مگر میں نے تو رعایت کی تھی۔ اگر چالان کردیتا تو تم سزایاب ہو جاتے۔

مسافر۔ میں نے بھی تمھارے ساتھ رعایت کی ہے۔ اگر دھکیل دیتا تو تم گاڑی سے نیچے چلے جاتے۔

دوسرا لیٹا ہوا مسافر زور سے قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا۔ کیوں جناب داروغہ جی؟ مجھے کیوں نہیں اُٹھاتے۔

ٹھاکر صاحب غصّہ سے لال ہو رہے تھے۔ مگر اس وقت بُرے پھنسے تھے حالانکہ وہ مضبوط آدمی تھے لیکن وہ دونوں بھی قوی ہیکل تھے۔ سختی سے کام نہ نکلتے دیکھ کر ملائمیت سے بولے۔ تمھیں اُٹھ جاؤ۔ صندوق بنچ پر رکھا ہے اسے نیچے رکھ دو۔ بس جگہ ہوجائے۔

مسافر۔ اور آپ ہی کیوں نہ نیچے بیٹھ جائیں اس میں کون سی مشیخت ماری جاتی ہے۔ یہ تھانہ تھوڑا ہے کہ رعب میں فرق آجائے گا۔

ٹھاکر۔ کیا تمھیں بھی مجھ سے کوئی عداوت ہے۔ میں نے تو تمھاری صورت بھی نہیں دیکھی۔

مسافر۔ آپ نے میری صورت نہ دیکھی ہوگی۔ لیکن آپ کے ڈنڈے نے دیکھی ہے۔ اسی میلے میں آپ نے مجھے کئی ڈنڈے رسید کیے۔ اس وقت آپ کے ساتھ کانسٹیبلوں کی ایک فوج تھی۔ میں مار کھاکر ضبط کرگیا۔ لیکن زخم ابھی دل پر تازہ ہے اس کی دوا کی تلاش اسی دن سے کر رہا ہوں۔ بارے آج موقعہ ملا ہے۔ میں بھی ٹھاکر ہوں۔ آپ سے عزّت میں۔ حیثیت میں، خاندان میں ہیٹا نہیں۔ خاموش بیٹھ جایئے ورنہ

شاید میرے سر پر شیطان سوار ہوجائے۔

پنڈت جی اب تک خاموش تھے۔ دل میں کانپ رہے تھے کہ کہیں مار پیٹ نہ ہوجائے تو گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔ موقع پاکر ٹھاکر صاحب کو سمجھایا ٹھاکر نے طرح دینے ہی میں خیریت سمجھی۔ جونہی تیسرا اسٹیشن آیا انھوں نے اس کمرہ سے بیوی بچوں کو نکالا۔ ان دونوں شیطانوں نے ان کے اسباب اُٹھا اُٹھاکر پھینک دیے۔ جب ٹھاکرصاحب گاڑی سے اُترنے لگے تو ایک نے انھیں ایسا دھکہ دیا کہ بیچارے اوندھے منھ پلیٹ فارم پر گر پڑے۔ گارڈ سے فریاد کرنے دوڑے تھے کہ اتنے میں انجن نے سیٹی دی، جاکر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

(۳)

اُدھر منشی بیج ناتھ کی اس سے بھی بُری حالت تھی۔ ساری رات جاگتے گذر گئی۔ ذرا پیر پھیلانے کی بھی جگہ نہ تھی۔ جیب میں شراب کی بوتل رکھ لی تھی۔ ہراسٹیشن پر اسٹیم تیز کرلیتے تھے۔ معمول سے زیادہ پی گئے۔ ایک تو شراب کا نشہ۔ اس پر جگہ کی تنگی۔ ہاضمہ میں فتور پڑ گیا۔ پیٹ میں درد ہونے لگا۔ بیچارے بڑی مشکل میں پھنسے۔ کہیں ہلنے کی جگہ نہ تھی۔ اسہال کے آثار نظر آنے لگے۔ لکھنؤ تک انھوں نے کسی طرح ضبط کیا۔ مگر اور آگے چل کر یارائے ضبط نہ رہا۔ ایک سٹیشن پر اُتر پڑے۔ کھڑے نہ ہوسکتے تھے۔ پلیٹ فارم پر لیٹ گئے۔ بیوی بھی گھبراکر اُتر پڑی۔ کھینچ کھانچ کر اسباب اُتارا۔ جلدی میں ٹرنک اُتارنا بھی بھول گئی۔ داروغہ نے زمین پر لیٹے دیکھا تو سمجھ گئے حضرت زیادتی کرگئے۔ مروّت نے اُترنے پر مجبور کیا۔ سب نے یہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ دیکھا تو منشی جی کی حالت ابتر تھی۔ بخار۔ تشنج۔ پیٹ میں مروڑ، قے اور دست۔ بڑی تشویش ہوئی۔ اسٹیشن ماسٹر نے سمجھا ہیضہ ہوگیا ہے۔ حکم دیا مریض کو ابھی باہر لے جاؤ۔ داروغہ جی نے ہرچند منت سماجت کی۔ مگر انھوں نے ایک نہ سُنی۔ مجبوراً لوگ منشی جی کو اسٹیشن کے احاطے سے باہر ایک درخت کے نیچے لائے۔ منشائن رونے لگیں۔ اب حکیم صاحب اور ڈاکٹرصاحب کی تلاش ہوئی۔ وہاں ڈسٹرکٹ بورڈ کا ایک شفاخانہ تھا۔ مگر ڈاکٹر کا کام کمپونڈر سے لیا جاتا ہے۔ اسٹیشن کے ملازموں سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹرصاحب بھی بلھور ہی کے رہنے والے ہیں۔ لوگوں کو تسکین ہوئی۔ داروغہ جی شفا خانے کی طرف دوڑے۔ کمپونڈر سے ساری کیفیت بیان کی۔ اور کہا کہ

آپ ذرا چل کر انھیں دیکھ لیجیے۔ ان کا نام تھا چوکھے لال، رُکھائی سے بولے۔ صبح کے وقت باہر جانے کا حکم نہیں ہے۔

داروغہ جی۔ تو کیا منشی جی کو یہاں لائیں۔

چوکھے لال۔ آپ کا جی چاہے لائیے۔

ٹھاکر صاحب نے دوڑ دھوپ کر کے ایک ڈولی کا بندوبست کیا۔ منشی جی کو لاد کر شفاخانہ لائے۔ جوں ہی برآمدے میں قدم رکھا۔ چوکھے لال نے ڈانٹ کر کہا۔ ڈولی نیچے رکھو۔ ہیضے کے مریض کو اُوپر لانے کا حکم نہیں ہے۔ بیج ناتھ بے ہوش تو تھے نہیں۔ آواز سُنی۔ پہچانا۔ ارے یہ تو چوکھے لال ہیں۔ کیوں بھئی مجھے پہچانتے ہو۔

چوکھے لال۔ جی ہاں۔ خوب پہچانتا ہوں۔

بیج ناتھ۔ پہچان کر بھی اتنی بے مروّتی۔ میری جان نکل رہی ہے۔ دیکھیے تو مجھے کیا ہو گیا ہے؟

چوکھے لال۔ دیکھ لوں گا۔ میرا کام ہی کیا ہے۔ فیس نکالیے۔

داروغہ جی غصہّ سے بولے۔ شفا خانہ میں کیسی فیس جنابِ من۔

چوکھے لال۔ ویسی ہی۔ جیسی ان منشی صاحب نے مجھ سے وصول کی تھی۔ جنابِ من۔

داروغہ۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟ یہ غریب یہاں کیا کرنے آئے۔

چوکھے لال۔ جی آپ نہیں سمجھے۔ میرا وطن بلھور ہے۔ وہاں میری تھوڑی سی زمین ہے۔ اس کا لگان داخل کرنے جب تحصیل میں جاتا ہوں۔ تو منشی جی ڈانٹ کر اپنا حق وصول کر لیتے ہیں۔ تو جناب کبھی ناؤ گاڑی پر۔ کبھی گاڑی ناؤ پر اس وقت میری باری ہے۔ میری فیس کے دس روپے نکالیے ورنہ اپنی راہ لیجیے۔

داروغہ جی نے منشائن سے روپے مانگے۔ تب اُسے اپنے بکس کی یاد آئی۔ چھاتی پیٹ لی۔ روپے اسی میں رکھے تھے۔ داروغہ جی بھی واجبی خرچ لے کر چلے تھے۔ کسی طرح دس روپے نکال چوکھے لال کی نذر کیے۔ انھوں نے دوا دی۔ دن بھر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ مگر رات کو کچھ طبیعت سنبھلی۔ دوسرے دن پھر دوا کی ضرورت ہوئی۔ داروغہ نے بہت منت کی۔ لیکن چوکھے لال نے ایک نہ سُنی۔ آخر منشائن کا ایک زیور جو چوبیس روپے سے کم نہ تھا

بازار میں بیچا گیا تب چوکھے لال نے دوا دی۔ شام تک منشی جی چنگے ہوگئے۔

(۴)

اجودھیا میں پہنچ کر لوگ قیام گاہ کی تلاش کرنے لگے۔ پنڈوں کے یہاں مطلق جگہ نہ تھی۔ ساری بستی میں گھومے۔ مگر کہیں جگہ نہ ملی۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ کسی درخت کے نیچے ڈیرہ جمانا چاہیے۔ لیکن درختوں کے نیچے بھی جہاں جاتے تھے جاتری لوگ پڑے ملتے تھے۔ مجبور ہوکر کھلے میدان میں ریت پر بستر وغیرہ لگائے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ لیکن لیٹنے بھی نہ پائے تھے کہ بادل گھر آئے۔ موسلادھار پانی برسنے لگا۔ بجلی کوندنے لگی۔ گرج سن کر لڑکے چیخنے لگے۔ عورتوں کا کلیجہ کانپنے لگا۔ کسی جائے پناہ کی تلاش ہوئی۔ تینوں آدمی اِدھر اُدھر مجبور نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ تاریکی میں کچھ نہ سُوجھتا تھا۔ پچھتا رہے تھے کہ ناحق آئے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔

دفعتاً ایک آدمی لالٹین لیے ندی کی طرف سے آتا نظر آیا۔ وہ قریب پہنچا تو پنڈت جی اس کے پاس جاکر بولے۔ کیوں بھائی صاحب، یہاں کہیں مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ نہ ملے گی۔

وہ آدمی رُک گیا۔ غور سے پنڈت جی کی طرف دیکھ کر بولا۔ آپ پنڈت چندر دھر تو نہیں۔

پنڈت جی خوش ہوکر بولے۔ جی ہاں۔ مگر آپ مجھے کیوں کر جانتے ہیں۔ اس آدمی نے آداب سے پنڈت جی کے پیروں پر سر جھکایا۔ اور بولا میں آپ کا پُرانا شاگرد ہوں۔ میرا نام کرپاشنکر ہے۔ میرے والد کچھ دنوں بلھور میں ڈاک منشی رہے تھے۔ اُنھیں دنوں میں آپ کی خدمت میں تھا۔

پنڈت جی کو بھی فوراً یاد آگئی، بولے۔ اوہو۔ اوہو! تم کرپاشنکر۔ اس وقت تو تم دُبلے پتلے لڑکے تھے۔ کوئی آٹھ نو سال کے ہوں گے؟

کرپا شنکر۔ جی ہاں۔ نواں سال ہے۔ میں نے وہاں سے آکر انگریزی پڑھی۔ اب یہاں میونسپلٹی میں نوکر ہوں۔ کہیے آپ تو اچھی طرح رہے۔ بڑی خوش نصیبی ہے آپ کے درشن ہوگئے۔ کیا آپ کے بال بچّے ساتھ ہیں؟

پنڈت جی۔ نہیں میں تو اکیلا ہی ہوں۔ لیکن میرے ساتھ داروغہ جی اور سیاہ نویس صاحب

بال بچوں کے ساتھ ہیں۔

کرپاشنکر۔ کل کتنے آدمی ہوں گے؟

پنڈت جی۔ دس آدمی ہیں۔ اگر تھوڑی سی جگہ مل جائے تو گذر کرلیں گے۔

کرپاشنکر۔ نہیں جناب بہت سی جگہ لیجیے۔ میرا بڑا سا مکان خالی پڑا ہے۔ چلیے آرام سے رہیے۔ یہ تو میری عین خوش نصیبی ہے کہ آپ کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔ چھتریاں تو کافی ہیں نا؟ چلیے میرے ساتھ۔

لوگ پانی میں لت پت چھتریاں لگائے، بسترے سروں پر اُٹھائے چلے۔ کرپاشنکر کا مکان قریب تھا۔ وسیع، صاف ستھرا۔ اس نے جاتے ہی آگ جلوا دی پلنگ بچھوا دیے۔ لوگ آرام سے بیٹھے۔ گھر میں پوریاں پکنے لگیں۔ کرپاشنکر ہاتھ باندھے ہوئے چاکروں کی طرح پنڈت جی کے ذرا سے اشارے پر دوڑتا تھا۔ ایک گھنٹہ میں کھانا تیار ہوگیا۔ کھا پی کر لوگ لیٹے۔ خدا کا شکر کر رہے تھے کہ کرپا شنکر مل گیا ورنہ آج جان بچنی مشکل تھی۔

اور سب لوگ تو نیند میں غافل ہوگئے۔ مگر پنڈت چندر دھر کو نیند نہ آئی اس سفر کے واقعات کا ایک نقشہ ان کے سامنے کھچا ہوا تھا۔ اور قوتِ امتیاز ان کا موازنہ کر رہی تھی۔ گاڑی کی رگڑ جھگڑ اور شفاخانہ کی نوچ کھسوٹ کے مقابلہ میں کرپاشنکر کی شرافت اور مہمان نوازی کا دل پر خاص اثر ہو رہا تھا۔ وہ آج اپنے پیشے کی عظمت کو سمجھے۔ آج اس کی اہمیت کے قائل ہوئے۔

یہ لوگ تین دن اجودھیا میں رہے۔ کسی بات کی تکلیف نہ ہوئی۔ کرپاشنکر نے خاطر مدارات میں کوئی بات اُٹھا نہ رکھی۔ تیسرے دن یہ لوگ چلنے لگے تو وہ اسٹیشن تک پہنچانے آیا۔ جب گاڑی نے سیٹی دی تو اس نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے پنڈت جی کے قدم چھوئے۔ اور کہا کبھی کبھی مجھے یاد کیا کیجیے گا۔

پنڈت جی گھر پہنچے تو ان کے مزاج میں تغیر ہوگیا تھا۔ انھوں نے پھر کسی دوسرے صیغے میں جانے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ پھر اپنی تقدیر کا شکوہ کیا۔

اردو میں 1920 سے پہلے کسی رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ خواب و خیال مجموعہ میں شامل ہے۔ ہندی میں 'بودھ' کے عنوان سے مان سروور 8 میں درج ہے۔

بانسری

رات زیادہ آگئی تھی اشٹمی کا چاند خواب گاہ میں جا چکا تھا۔ دوپہر کے کنول کی طرح صاف و شفاف آسمان میں ستارے کھلے ہوئے تھے۔ کسی کھیت کے رکھوالے کی بانسری کی آواز جیسی دوری نے تاثیر، سناٹے نے سرُیلاپن اور تاریکی نے رومانیت کی دلکشی بخشی تھی۔ یوں کانوں میں آرہی تھی گویا کوئی مبارک روح ندی کے کنارے بیٹھی ہوئی پانی کی لہروں کو یا دوسرے ساحل کے خاموش و پرُکشش درختوں کو اپنی زندگی کی داستانِ غم سُنا رہی ہے۔

اردو ماہنامہ کہکشاں جنوری 1920 کے شمارے میں شائع ہوا۔ شاید یہ کسی کہانی کا جز ہے مگر کہکشاں کے شمارہ میں فہرست میں درج ہے کہانی 'بانسری'۔

آتما رام

موضع بیندو میں مہادیو سُنار ایک نمایاں وجود تھا۔ وہ اپنے کھپریل کے بوسیدہ سائبان میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھا ہوا صبح سے پہر رات تک ہتھوڑا لیے کھٹ کھٹ کیا کرتا تھا۔ اِس صدائے پیہم کے لوگ اِس قدر عادی ہوگئے تھے کہ جب کسی وجہ سے یہ آوازیں بند ہوجاتیں تو ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی چیز غائب ہوگئی ہے۔ وہ روز ایک بار صبح کو اپنے توتے کا پنجرہ لیے، کوئی بھجن گاتا ہوا، تالاب کی طرف جاتا تھا۔ اُس وقت اندھیرے میں اُس کی جُھکی ہوئی کمر، اور اِس کا جسمِ نحیف دیکھ کر کسی اجنبی شخص کو اُس پر شیطانی وجود کا دھوکا ہوسکتا تھا۔ اُس کے یہ بھجن تعیّن وقت کے اعتبار سے صدائے مرغ کا کام دیتے تھے۔ جوں ہی کانوں میں آواز آتی "ست گُردت شیودت داتا" لوگ سمجھ جاتے کہ سویرا ہوگیا۔ اُس کی یہی حرکت اس کے تکمیل اعضا کا ثبوت تھی ورنہ طلوع سحر کے بعد پھر اُسے ایک متحرک بت خیال کرنے میں اگر کوئی امر مانع تھا تو یہ وہی ست گُردت کا کلمۂ وحدت تھا۔ جیسے وہ اپنے توتے کو عبادت کی تلقین کیا کرتا تھا۔ فی الواقع مہادیو پیکارِ ہستی کا ایک نادر مجسمہ تھا جو شکستوں اور ناکامیوں سے بے خبر، زخموں اور چرکوں سے بے پرواہ، ابھی تک شمشیر بہ کف میدان میں مردانہ وار کھڑا تھا۔ حواس کا میسرہ منتشر، دانتوں کا دستہ پامال، کمر کا میمنہ متزلزل، خون کا قلب پریشان، ہوچکے تھے۔ مگر ہمت وہی تھی، استقلال وہی، استحکام وہی۔ جس پر شباب کو رشک ہوسکتا تھا۔

مہادیو خوش نصیب بھی تھا اور کم نصیب بھی۔ خوش نصیب اس لیے کہ اُس کے تین لڑکے تھے۔ تین بہوئیں تھیں۔ اور بہوؤں کے لڑکے تھے۔ کم نصیب اِس لیے کہ لڑکے سعادت مند تھے وہ از راہِ سعادت مندی اُس کے بزرگانہ اختیار و اقتدار میں مزاحم نہ ہوتے تھے۔ کہتے اجی جب تک دادا جیتے ہیں تب تک۔ تو زندگی کا لطف اُٹھالیں پھر تو یہ ڈھول گلے پڑے ہی گی۔ ممکن تھا کہ لڑکے اپنے باپ کی کچھ مدد کرتے۔ لیکن چونکہ مہادیو

اپنے بزرگانہ اختیارات سے مستعفی نہ ہوتا تھا اس لیے لڑکے اُس کی ذمہ داریوں میں مخل ہونے کی ضرورت بھی نہ سمجھتے تھے۔ اور اِس لازم و ملزوم کی چکّی میں پڑا ہوا وہ نیم جان، خستہ حال، بڈّھا پِسا جاتا تھا۔ اُس پر لطف یہ کہ انقضاء عمر کے ساتھ ان ذمہ داریوں کی نسبت معکوس تھی، دائرۂ کفالت روز بروز وسیع اور وسائلِ معاش روز بروز تنگ ہوتے جاتے تھے۔ پہلے کوزہ کا ذوق مہادیو کی ذات خاص تک محدود تھا۔ پر اب سعادت مند بیٹے بھی باپ کے نقشِ قدم پر چلنے لگے تھے۔ روز پہر رات کے بعد مئے سرُخ کی بوتل آتی اور کوزوں کے دَور چلنے لگتے۔ مہادیو کو ساقی، اور بسا اوقات ساقیٔ ناکام کا پارٹ ادا کرنا پڑتا تھا۔ بیٹے اس وقت جذبات حرّیت اور مساوات کے ایسے پرُشور مناظرے کرتے کہ کبھی کبھی یہ جوشِ فرزندانہ سعادت مندی پر بھی غالب آجاتا تھا۔ اور اُس وقت تک فرو نہ ہوتا جب تک کہ ماکولات کی مساوی مقدار اُن کی تسکین قلب کے لیے نہ پہنچ جاتی۔ بے چارہ مہادیو کبھی کبھی اِس شورِ قیامت سے تنگ آکر بھوکا اُٹھ آتا اور اپنے غمگسار حقّے کا نغمۂ شریں سُنتا سُنتا سوجاتا۔ افسوس یہی ہے کہ باہر بھی اُسے اِن باغیانہ مناظروں سے نجات نہ تھی۔ باوجودیکہ وہ اپنے فن میں یگانہ روزگار تھا۔ اُس کی کٹائی اوروں سے کہیں زیادہ دیر اثر تھی، اُس کی صفائی کہیں زیادہ دقّت طلب، اور اُس کے کیمیائی عمل کہیں زیادہ قوی التاثیر، تاہم اُسے بے صبر اور وہمی اشخاص کی بد زبانیوں کا آئے دن نشانہ بننا پڑتا تھا۔ پر مہادیو عابدانہ توکل کے ساتھ سر جھکائے ہوئے چاروں طرف کی بوچھاریں سہا کرتا۔ اُس کے کان روزانہ نفریں اور دُشنام، طعن و تشنیع، کے اس قدر عادی ہوگئے تھے کہ اُسے اب اُن کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ جوں ہی یہ طوفان فرو ہوتا وہ اپنے توتے کی طرف دیکھ کر پکار اُٹھتا۔ "ست گردت شیودت داتا' 'اِس اسم اعظم کا وِرد اُس کی تشفیٔ کامل کا وسیلہ بن جاتا تھا۔ یہ جھونکے اِس کی زندگی کے ایک جزو لازم بن گئے تھے۔ اِن سے اس کے سکون میں مطلق فرق نہ پڑتا تھا۔

(۲)

ایک روز اتفاق سے کسی لڑکے نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ توتا اُڑ گیا۔ مہادیو نے سر اُٹھا کر پنجرے کی طرف دیکھا اور اُس کا کلیجہ سُن سے ہوگیا۔ ایں! توتا کہاں گیا! اُس نے پھر پنجرے کی طرف دیکھا۔ توتا غائب تھا۔ وہ گھبرا کر اُٹھا اور اِدھر اُدھر کھپریلوں

پر نظر دوڑانے لگا۔ اُسے دُنیا میں اگر کوئی چیز پیاری تھی تو یہ توتا تھا۔ لڑکے بالوں، ناتی پوتوں سے اُس کی طبیعت آسودہ ہوگئی تھی۔ وہ کبھی کسی بچّہ کو گود میں نہ لیتا۔ بچّوں کی شرارت سے اُس کے کام میں ہرج ہوتا تھا۔ کوئی ہتھوڑا چھولیتا، کوئی سنسی اُٹھا لیتا۔ اس لیے وہ انھیں اپنے قریب بھی نہ آنے دیتا تھا۔ بیٹوں سے اُسے مطلق اُنس نہ تھا۔ نہ اس لیے کہ وہ کاہل وجود تھے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اُس کے شریک کوزہ ہوجاتے تھے۔ محلّہ کے آدمیوں سے اُسے چڑھ تھی اس لیے کہ وہ اس کی بھٹّی سے آگ نکال لے جاتے تھے۔ اس تمام مجمع شر سے اس کے لیے کوئی پناہ تھی تو وہ یہی توتا تھا جس کی ذات سے اُسے کوئی تکلیف، کوئی اُلجھن، کوئی پریشانی نہ ہوتی تھی۔ وہ اب زندگی کے اُس منزل پر پہنچ گیا تھا جب انسان کی نگاہوں میں عافیت کی، گوشۂ امن کی، وقعت دنیا کی اور سب چیزوں سے زیادہ ہوجاتی ہے۔

توتا ایک کھپریل پر بیٹھا تھا۔ مہادیو نے پنجرا اُتار لیا اور اُسے دکھا کر کہنے لگا۔ آ۔ آ۔ ست گُردت شیودت داتا، آ۔ آ۔ لیکن گاؤں اور گھر کے کئی لڑکے جمع ہوکر چلّانے اور تالیاں بجانے لگے۔ اوپر سے کوؤں نے کاؤں کاؤں شروع کی توتا اُڑا اور گاؤں سے باہر نکل کر ایک درخت پر جا بیٹھا۔ مہادیو بھی خالی پنجرا لیے اُس کی طرف دوڑا۔ ہاں دوڑا! لوگ اُس کی تیزگامی پر عش عش کرتے تھے۔ ہَوس کی اس سے بہتر، اس سے جامع، اس سے زندہ تصویر شاید کسی مصوّر کے خیال میں نہیں آسکتی۔ پشتِ دوتا اور سرُعت گام میں کوئی نفاق نہیں ہے اس کی تصدیق ہوگئی۔

دوپہر ہوگیا تھا کسان پرُ چھوڑ چھوڑکر چلے آتے تھے۔ اس موقع تفریح کو کون ہاتھ سے جانے دیتے۔ مہادیو کی دل آزاری میں ہر شخص کو مزہ آتا تھا۔ بالخصوص اُس کی تگاپوِ پرُخم کا نظارہ نہایت فرحت انگیز تھا۔ لوگوں نے کنکر پھینکے، تالیاں بجائیں۔ توتا پھر اُڑا۔ اور اُس درخت سے دور، آم کے گھنے باغ میں ایک درخت کی چوٹی پر جا بیٹھا۔ مہادیو پھر خالی پنجرا لیے۔ آ۔ آ۔ کرتا، توتے کی طرف ٹکٹکی لگائے، مینڈھک کی طرح اُچکتا ہوا چلا۔ کسانوں کا غول بھی ہوحق مچاتا ہوا اُس کے پیچھے دوڑا۔ مگر اُس کی سرگرمیٔ طلب اُن کے شوقِ تفریح پر غالب آئی۔ جب وہ اُس گھنے باغ میں پہنچا تو اکیلا تھا۔ اُس نے سایہ میں ذرا دم لیا۔ پیر کے تلوؤں سے آگ نکل رہی تھی۔ سر چکرّ کھارہا تھا۔ جب ہوش بجا

ہوئے تو اُس نے پھر پنجرا اُٹھایا اور پھر کہنے لگا۔ ست گُردت شیودت داتا۔ آ۔آ۔

توتا پھنگی سے اُتر کر نیچے کی ایک شاخ پر آبیٹھا۔ مگر مہادیو کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر پھر اُڑا اور دوسری شاخ پر جا بیٹھا۔ مہادیو نے سمجھا مجھ سے ڈر رہا ہے۔ وہ پنجرے کو چھوڑکر آپ ایک دوسرے درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ توتے نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ اُسے یقین ہوگیا کہ اب کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اُترا اور آکر پنجرے کے اوپر بیٹھ گیا۔ مہادیو کا کلیجہ اُچھلنے لگا۔ ست گُردت شیودت کا ورد کرتا ہوا آہستہ آہستہ توتے کے قریب آیا اور تب ایک جست مار کر لپکا کہ توتے کو پکڑلے۔ مگر توتا ہاتھ نہ آیا۔ پھر اُڑکر درخت پر جا بیٹھا۔

شام تک یہی کیفیت رہی۔ توتا کبھی اس شاخ پر جاتا، کبھی اُس شاخ پر۔ کبھی پنجرے پر آتا، کبھی پنجرے کے دروازہ پر بیٹھ کر اپنے دانہ پانی کی پیالیوں کو دیکھتا۔ مگر جوں ہی مہادیو اُس کی طرف آتا وہ پھر اُڑجاتا۔ بڈّھا اگر پیکر ہوَس تھا تو توتا طائرِ آرزو۔ یہاں تک کہ شامِ سیاہ نے ہوَس اور آرزو کی اس کشمکش پر پردہ ڈال دیا۔

(۳)

رات ہوگئی، چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ توتا معلوم نہیں پتّوں میں کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ مہا دیو خوب جانتا تھا کہ رات کو توتا کہیں اُڑکر نہیں جاسکتا اور نہ پنجرے میں آسکتا ہے۔ تاہم وہ اس درخت کے نیچے سر جھکائے پنجرے کو پہلو میں رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ آج اُس نے دِن بھر کچھ نہیں کھایا۔ رات کے کھانے کا وقت بھی نکل گیا۔ ایک بوند پانی بھی اُس کے حلق میں نہیں گیا۔ لیکن اُسے نہ بھوک تھی نہ پیاس۔ توتے کے بغیر اُسے اپنی زندگی ویران، خشک، دشوار معلوم ہوتی تھی۔ وہ شب و روز مشقّت کرتا تھا۔ اس لیے کہ یہ اُس کی تحریک طبعی تھی۔ زندگی کے اور سب کام اس لیے کرتا تھا کہ اُس کی عادت تھی۔ اِن کاموں میں اُسے حیات کا مطلق احساس نہ ہوتا تھا۔ توتا ہی ایک ایسی چیز تھا جو اُسے اُس کے حیات کی یاد دلاتا تھا۔ عملاً وہ ایک مردہ وجود تھا، کوئی شوق نہیں، کوئی آرزو نہیں، کوئی فکر نہیں، کوئی ہوَس نہیں، اِس حیات مطلق میں یہی طائر خوش رنگ و خوشنوا اُسے علائق زیست کی خبر دیتا تھا۔ اُس تاریکی میں یہی ایک روشنی تھی، اُس سنّاٹے میں یہی ایک صدا۔ اُس کا ہاتھ سے جانا اپنے وجود سے بے خبر ہونا تھا۔

مہادیو دن بھر کا بھوکا پیاسا، تھکا ماندہ، رہ رہ کر جھپکیاں لے لیتا تھا۔ مگر ذرا ہی دیر میں وہ چونک کر پھر آنکھیں کھول دیتا۔ اور اُس فضائے تاریک میں اُس کی آواز سُنائی دیتی ست گُردت شیو دت داتا!

آدھی رات گذر گئی تھی۔ یکبارگی وہ کوئی آہٹ پاکر چونکا تو دیکھا کہ ایک دوسرے درخت کے نیچے ایک دُھندلا سا چراغ جل رہا ہے اور کئی آدمی بیٹھے ہوئے آپس میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کررہے ہیں۔ وہ سب شاید چلم پی رہے تھے۔ تمباکو کی مہک نے مہادیو کو بیتاب کردیا۔ بلند آواز سے بولا۔ ست گُردت شیودت داتا۔ اور اُن آدمیوں کی طرف چلا۔ مگر جس طرح بندوق کی آواز سُنتے ہی ہرن بھاگ جاتے ہیں اُسی طرح وہ سب کے سب اُٹھ کر بھاگے۔ کوئی اِدھر گیا کوئی اُدھر۔ مہادیو نے زور زور سے پکارنا شروع کیا ٹھہرو! ٹھہرو۔ دفعتاً اُسے خیال آگیا کہ یہ سب چور ہیں۔ وہ زور سے چلّانے لگا چور! چور! پکڑو پکڑو! چوروں نے پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔

مہادیو چراغ کے پاس گیا تو اُسے ایک کلسا رکھا ہوا ملا۔ وہ زنگ سے سیاہ ہورہا تھا۔ مہادیو کا سینہ اُچھلنے لگا۔ اُس نے کلسے میں ہاتھ ڈالا تو اشرفیاں تھیں۔ اُس نے ایک اشرفی باہر نکالی اور چراغ کے اُجالے میں غور سے دیکھا ہاں اشرفی تھی اُس نے کلسا اُٹھا لیا۔ چراغ بجھا دیا اور درخت کے نیچے چھپ کر بیٹھ رہا۔ مالِ حرام نے ساہ سے چور بنا دیا۔

اُسے پھر اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو چور واپس آجائیں اور مجھے تنہا دیکھ کر کلسا چھین لیں۔ اُس نے کچھ اشرفیاں نکال کر کمر میں باندھیں۔ پھر ایک سوکھی لکڑی سے زمین کی مٹی ہٹاکر کئی جگہ گڈھے بنائے اور اُنھیں اشرفیوں سے بھر کر مٹی سے ڈھانک دیا۔ اور حالانکہ ابھی زیادہ تعداد کلسوں ہی میں تھی لیکن اس کی کمر اور گڈھوں میں دوسو سے کم نہ تھیں۔

(۴)

مہادیو کی نظروں کے سامنے اب ایک دوسری دنیا تھی، نامی، روشن، ذی حیات فکریں، تمنائیں، اور ارادے اُگے، بڑھے اور لہرانے لگے۔ افلاس کی سیاہ گھٹا ہٹتے ہی بزم انجم آراستہ نظر آئی۔ حالانکہ ابھی خزانہ کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ باقی تھا۔ پر نامیہ کو مقراض گلچیں کی کیا پروا! ایک پختہ مکان بن گیا۔ صرافہ کی ایک شاندار دوکان کھُل

گئی، عزیز و بیگانے گلوگیر ہوگئے، بادۂ گلگوں کے دور چلنے لگے۔ عیش و تکلف کے سامان فراہم ہوگئے۔ پسر تیرتھ جاترا کو چلے اور واپسی پر فیاضانہ دعوتِ عام ہونے لگی۔ اس کے بعد ایک شوالہ اور پختہ کنواں تعمیر ہوگیا۔ اور وہ روز شام کو بیٹھ کر وہاں کتھا پُران سُننے لگا۔ سادھو سنتوں کی محفل سج گئی۔ دورۂ زندگی کا نقشہ مکمّل ہوگیا۔ ''آیندہ'' کا ساز نغمہ ریز ہوگیا۔

دفعتاً اُسے خیال آیا کہ کہیں چور آجائیں تو میں یہ کلسا لے کر بھاگوں گا کیوں کر۔ اُس نے امتحاناً کلسے کو بغل میں دبا لیا اور ایک دوسو قدم تک بے تحاشا دوڑا ہوا چلا گیا۔ معلوم ہوتا تھا اُس کے پیروں میں پَر لگ گئے ہیں۔ اطمینان ہوگیا۔

اِنھیں منصوبوں میں رات ختم ہوگئی۔ سفیدۂ صبح نمودار ہوگیا۔ ہَوا جاگی۔ سوئے ہوئے درخت بیدار ہوئے۔ چڑیاں گانے لگیں۔ ناگاہ مہادیو کے کانوں میں آواز آئی۔

ست گُردت شیودت داتا　　　رام کے چرن میں چت لاگا

یہ بول ہمیشہ مہادیو کے وِردِ زبان رہتا تھا۔ دن میں ہزاروں بار یہ الفاظ اُس کی زبان سے نکلتے تھے پر اُس کی باطنی کیفیت نے اُس کے دل پر کبھی اثر نہ کیا تھا۔ جیسے کسی باجے سے آواز نکلتی ہے اُسی طرح یہ پد اُس کی زبان سے نکلتا تھا بے معنی اور بے اثر۔ اس کا دل بے برگ و بار اِس ہوائے لطیف سے بے حس رہتا تھا۔ لیکن اب اُس میں پتّیاں اور کوپلیں نکل آئی تھیں۔ اِس ہَوا سے جھوم اُٹھا۔ محوِ ترنّم ہوگیا۔

ایک طرف طلوعِ سحر کی معرفت خیز تنویر تھی، دوسری طرف دریا کا روحانی نغمہ اور سطحِ آب کا عارفانہ سکون۔ فضائے محیط ایک نورانی راگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ عین اُسی وقت توتا شاخِ بلند سے پروں کو جوڑے ہوئے اُترا، جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے، اور آکر پنجرے میں بیٹھ گیا۔ مہادیو فرطِ مسرت سے دوڑا اور پنجرے کو اُٹھاکر بولا ''آؤ آتما رام! اب تمھیں چاندی کے پنجرے میں رکھوں گا اور سونے سے مڑھ دوں گا۔ احسان اور تشکر سے اُس کا سینہ لبریز ہوگیا۔ پرماتما کتنا دیاوان ہے! کتنا بیکس نواز۔ یہ اُس کی عین رحمت ہے، ورنہ مجھ جیسا عاصی، سرتاپا گناہوں میں ڈوبا ہوا، کب اس عطائے بیکراں کے قابل تھا۔ ہاں یہ اُس کا فضل و کرم ہے۔ اِن خیالات سے اُس کا دل اُمڈ گیا۔ اُس پر ایک سرور کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ ایک خود مستی کے عالم میں بول اُٹھا۔

ست گردت شیودت داتا　　　رام کے چرن میں چت لاگا

اُس نے ایک ہاتھ میں پنجرا لٹکایا۔ بغل میں کلسا دبایا اور گھر چلا۔

(۵)

مہادیو اپنے مکان پر پہنچا تو ابھی کچھ اندھیرا تھا۔ گھر کے لوگ خوابِ سحر کا لطف اُٹھا رہے تھے۔ راستے میں بجز ایک کُتّے کے اور کسی سے اُس کی مُڈبھیڑ نہ ہوئی۔ اور کتّے کو اشرفیوں سے کوئی خاص رغبت نہیں ہوتی۔ گھر پہنچتے ہی اُس نے کلسے کو ایک مٹّی کی ناند میں چھپا دیا اور اُسے کوئلہ سے اچھی طرح ڈھانک کر اُس کوٹھری میں رکھ دیا جس میں اُس کے اوزار اور نیم مرتب زیورات رکھے جاتے تھے۔ جب ذرا دن نکل آیا تو وہ سیدھے پروہت جی کے مکان پر جا پہنچا۔ پروہت جی پوجا پر بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے کل ہی مقدمہ کی پیشی ہے اور ابھی تک روپیہ کی کوئی سبیل نہ کرسکا۔ کیوں کر کام چلے گا۔ جمانوں میں کوئی سانس ہی نہیں لیتا۔ کہ اتنے میں مہادیو نے پہنچ کر پا لاگن کیا۔ پروہت جی نے اُسے دیکھ کر مُنہ پھیر لیا۔ یہ اپنی منحوس صورت لے کر یہاں کیوں آکھڑا ہوا !معلوم نہیں آج دانہ بھی میسّر ہوگا یا نہیں۔ کچھ ترش ہوکر پوچھا! کیا ہے جی! کیا کہتے ہو! کیا جانتے نہیں کہ ہم اس بکھت پوجا پر رہتے ہیں! مہادیو نے کہا مہاراج آج میرے یہاں ستھ نارائن کی کتھا ہے۔

پروہت جی متحیّر ہوگئے۔ اِنھیں اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ مہادیو کے گھر کتھا کا ہونا اتنی ہی غیر معمولی بات تھی جتنی اپنے گھر سے کسی بھکھاری کے لیے بھیکھ کا نکلنا۔ پوچھا آج کیا ہے؟ مہادیو بولا، کچھ نہیں۔ ایسا ہی جی میں آیا کہ آج بھگوان کی کتھا سُن لوں۔

صبح ہی سے تیّاریاں ہونے لگیں۔ بیندو اور قرب و جوار کے دوسرے موضعوں میں نوید پھری ہر کس و ناکس خاص و عام کی دعوت تھی۔ جو سُنتا تھا تعجب کرتا تھا۔ لیکن تیاریاں اتنے وسیع پیانہ پر ہورہی تھیں کہ کسی کو شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ شام کو جب سب لوگ جمع ہوگئے اور پنڈت جی آکر سنگھاسن پر رونق افروز ہوئے تو مہادیو کھڑا ہوکر بلند آواز سے بولا ”بھائیو! میری ساری عمر چھل کپٹ میں بیت گئی۔ میں نے نہ جانے کتنے آدمیوں کو دگا دی۔ کتنا کھرے کو کھوٹا کیا۔ یہاں تک کہ آپ لوگ صبح کو میرا مُنہ دیکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔ پر اب بھگوان نے مجھ پر دیا کی ہے۔ وہ میرے منہ کے کالکھ کو دور کرنا

چاہتے ہیں۔ میں آپ سب بھائیوں سے للکار کر کہتا ہوں کہ جس کا میرے جمے کچھ نکلتا ہو، جس کی جمع میں نے مار لی ہو۔ جس کے گہنے دبا لیے ہوں، جس کے چوکھے مال کو کھوٹا کردیا ہو، وہ اپنے ایمان دھرم سے آکر مجھ سے اپنی ایک ایک کوڑی چکالے۔ اگر کوئی یہاں نہ آسکا ہو تو آپ لوگ اُس سے کہہ دیجیے کہ وہ کل سے ایک مہینے تک جب جی چاہے آوے اور اپنا حساب چکتا کرلے۔ کوئی گواہی ساکھی درکار نہیں۔ بس لوگ اپنے ایمان دھرم سے جو کچھ کہہ دیں گے وہ میں نکال کر دے دوں گا۔

اس تقریر نے مجمع پر سکوت کی کیفیت طاری کردی۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کوئی پُرمعنی انداز سے سر ہلاکر کہتا تھا ''ہم کہتے نہ تھے! کوئی حاسدانہ انداز سے کہتا تھا۔ کوئی دفینہ ہاتھ آگیا۔ کوئی بدگمانی سے کہتا تھا۔ کیا کھاکے دے گا۔ ہزاروں کا ٹوٹل ہوجائے گا۔

ایک زندہ دل ٹھاکر نے مُسکرا کر مہادیو سے پوچھا۔ اور جو لوگ مرگئے۔

مہادیو نے جواب دیا۔ اُن کے گھر والے تو ہوں گے۔ وہ آکر ایمان دھرم سے جو کچھ نکلتا ہو لے لیں۔

مگر اس وقت کسی کو وصولی کی اتنی فکر نہ تھی جتنی یہ جاننے کی کہ اُسے اتنے روپے مِل کہاں سے گئے۔ کچھ دیر تک یہی عالمِ سکوت رہا۔ لوگ ایک دوسرے کا مُنہ تاکتے تھے۔ ہر کسی کو مہادیو کے پاس آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ دیہات کے آدمی تھے۔ جس نقصان کو ایک بار صبر کرچکے اُس کی یاد تازہ کرنا اُن کا خاصہ نہ تھا۔ پھر اکثر آدمیوں کو یاد بھی نہ تھا کہ اُن کا کتنا نقصان ہوا۔ اور ایسے مقدس موقعہ پر غلط بیانی کا خوف اُن کی زبان بند کیے ہوئے تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مہادیو کی علو ہمتی اور نیک نیتی نے اُنھیں مرعوب کرلیا تھا۔ بحرِ سکوت میں ایک موج بھی نہ اُٹھی۔ دفعتاً پروہت جی بولے، تمھیں یاد ہے کہ میں نے تمھیں ایک کنٹھا بنانے کے لیے سونا دیا تھا۔ اور تم نے کئی ماشے تول میں اُڑا دیئے تھے۔ سونا بھی خراب کر دیا تھا؟

مہادیو۔ ہاں یاد ہے۔ آپ کا کتنا نُکسان ہوا ہوگا؟

پروہت جی۔ پچاس روپے سے کم نہ ہوگا۔

مہادیو نے کمر سے دو اشرفیاں نکالیں اور جاکر پروہت جی کے سامنے رکھ دیں۔

پنڈت جی کی سخت گیری پر پھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ یہ ظلم ہے۔ زیادتی ہے۔

زیادہ سے زیادہ دوچار روپے کا نقصان ہوا ہوگا۔ اُس کے پچاس روپے اینٹھ لیے۔ کچھ نارائن کا بھی ڈر نہیں ہے۔ بننے کو پنڈت پر نیت ایسی خراب! رام رام!!

ہرایک دل میں مہادیو سے وہ ہمدردی پیدا ہوگئی جو عقیدت سے مشابہہ ہوتی ہے۔ اشرفیوں کی خوش آیند آواز نے بعض کمزور دلوں کو گدگدایا ضرور۔ پر عام ہمدردی اور خوفِ پشیمانی نے اِس گدگدی کو سینہ ہی میں دبا دیا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پر ہزاروں نفوس کے مجمع میں ایک شخص بھی نہ کھڑا ہوا۔ تب مہادیو نے پھر کھڑے ہوکر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ لوگ اپنا اپنا حساب بھول گئے ہیں۔ اس لیے آج کتھا ہونے دیجیے۔ میں ایک مہینہ تک آپ لوگوں کی راہ دیکھوں گا۔ اس کے بعد تیرتھ کرنے چلا جاؤں گا۔ آپ سب بھائیوں سے بنتی ہے کہ میرا اُدّھار کریں۔"

مہادیو کے چہرہ پر ایک غیر معمولی جلال تھا۔ اور اندازِ گفتگو میں ایک شانِ توقیر۔ کتھا شروع ہوئی اور ختم ہوگئی۔ مہادیو کی داد و دہش اور فیاضانہ سرگرمی نے لوگوں کی عقیدت کو احترام کی حدتک پہنچا دیا۔

مہادیو صبح سے شام تک اہلِ تقاضا کی راہ دیکھا کرتا۔ رات کو چوروں کے خوف سے نیند نہ آتی۔ اب وہ کوئی کام نہ کرتا۔ شراب کا چسکا بھی چھوٹا۔ ہاں سادھو فقیر جو دروازہ پر آجاتے اُن کی خاطرخواہ تواضع و تکریم کرتا۔ قرب و جوار میں اُس کے بدل و ایثار کا شہرہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ پورا ایک مہینہ گذرگیا۔ اور ایک داد خواہ بھی نظر نہ آیا۔ اب مہادیو کو اندازہ ہوگیا کہ دُنیا میں کتنا تحمل، کتنی پاک ہمتی ہے، اب اُسے معلوم ہوا کہ دنیا بُروں کے لیے بُری ہے پر اچھوں کے لیے اچھی ہے۔

(۶)

اس واقعہ کو گزرے پچاس سال سے زائد ہوگئے۔ بیندو میں آپ جائیے تو دور ہی سے ایک رفیع اور طلائی کنگرہ نظر آتا ہے۔ یہ ٹھاکر دوآرہ کا کلس ہے۔ اس کے متصل ایک وسیع اور پختہ تالاب ہے جس میں ہمیشہ کنول کھلے رہتے ہیں۔ اس کی مچھلیاں کوئی نہیں پکڑتا۔ تالاب کے کنارے ایک عالیشان مقبرہ ہے۔ یہی آتما رام کی یادگار ہے۔ اس جگہ وہ اپنے نقرئی پنجرے میں بیٹھے ہوئے محو خواب ہیں۔ ان کے نسبت مختلف روائتیں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے انھوں نے توتے سے انسان کا قالب اختیار کیا تھا۔ کوئی کہتا ہے وہ بیٹھے

بیٹھے نظروں سے غائب ہوگئے۔ پرحقیقت یہ ہے کہ مہادیو جب تیرتھ سے واپس آیا تو ایک دن کسی گربۂ مسکین نے آتما رام کو لقمۂ دہن بنا لیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب بھی آدھی رات کو تالاب کے کنارے آواز آتی ہے۔

ست گُردت شیودت داتا　　　رام کے چرن میں چت لاگا

مہادیو داس کی نسبت بھی طرح طرح کے قصے مشہور ہیں۔ جن میں سب سے قرین قیاس یہ ہے کہ وہ آتما رام کے قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے بعد چند سنیاسیوں کے ساتھ ہمالہ کی طرف چلے گئے اور وہاں سے واپس نہ آئے۔ اُن کا نام آتما رام مشہور ہوگیا۔

ابھی گاؤں میں وہ بڈھے موجود ہیں جنھوں نے مہادیو کو آخری ایّام میں دیکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اُن کا چہرہ پرُجلال تھا۔ اور اُن کی زبان سے جو کچھ نکلتا وہ ضرور پورا ہوتا تھا۔ اُن کے کشف و کرامات کی صدہا داستانیں زبان زد خاص عام ہیں۔

خدا کے کتنے گنہگار بندے محض ایک صدائے غیب کی بدولت، محض ایک اتفاقی وجد کے اثر سے، محض ایک الہامی تحریک سے درجہ کمال کو پہنچ گئے ہیں۔

اردو ماہنامہ زمانہ جنوری 1920 میں شائع ہوا۔ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں مان سرودر7 میں اسی عنوان سے شامل ہے۔

روئے سیاہ

عالم گیر قحط کا سامنا تھا۔ سال بھر سے پانی کی ایک بوند نہ گری تھی کھیتوں میں خاک اُڑتی تھی۔ گھاس تک جل گئی تھی نہ کہیں دانہ تھا نہ پانی۔ لوگ درختوں کی چھالیں کوٹ کوٹ کر کھاتے تھے۔ آدھی رات کو لُو چلتی تھی اور دوپہر کو تو زمین سے آگ کے شعلے نکلتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کوہ آتشیں ہے۔ لوگوں کے دل تک خشک ہوگئے تھے۔ کوئی کسی کی بات نہ پوچھتا تھا۔ سب اپنی اپنی مصیبتوں میں گرفتار تھے۔ روزانہ مندروں اور مسجدوں میں خلقت جمع ہوتی تھی لوگ روتے ہائے ہائے کرتے۔ مگر اس نالہ سیون کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ شاید اربابِ قضا کے دل میں بھی رطوبت باقی نہ رہی تھی۔ جوتشیوں اور نجومیوں کے دروازے پر شب و روز نیازمندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ بازاروں میں لڑکے برہنہ تن لوٹتے پھرتے تھے اور گاتے تھے۔

کالی کلوٹی اُجلی دھوتی۔ میگھا دادا پانی دو

ایک عالم طبیعات نے شگوفہ چھوڑا کہ میں کیمیاوی ترکیب سے پانی برسا سکتا ہوں۔ رعایا نے لاکھوں روپے چندے دیے۔ ڈاکٹر صاحب نے بادلوں پر مقناطیسی اثر ڈالنے کی خوب کوششیں کیں۔ لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ نہ اندر پسیجے نہ پانی برسا۔ اور رعیت کی حالت روز بروز زبوں ہوتی گئی۔

لاچار ایک دن لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس مصیبت میں اولیاء اور مہاتماؤں کے دربار میں فریاد کرنی چاہیے۔ آخر وہ کس دن کام آئیں گے۔ لاکھوں ہندو جمع ہوکر بابا دُرلبھ داس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی کُٹی کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھے۔ مسلم رعایا خواجہ رشید جلالی کے رفعت نشان آستانے پر ماتھے رگڑنے لگی۔ دونوں بزرگوں کو رعایا کے حالِ زار پر ترس آیا۔ بابا جی نے ملک کے سادھو سنتو کو مدعو کیا۔ خواجہ صاحب نے اطراف و اکناف کے برگزیدانِ خدا سے امداد طلب کی۔ ایک ہفتے میں چاروں طرف سے سادھوؤں اور

فقیروں کے غول کے غول اور جتھے کے جتھے آنے لگے۔ دار الخلافہ میں کبھی اہلِ تقدس کا ایسا نورانی مجمع نظر نہ آیا۔ یہ حضرات معجزات و خوارق کے لیے مشہور تھے۔ لوگوں کو کامل اعتماد تھا کہ اگر یہ لوگ اَبروٗں کا اشارہ بھی کردیں گے تو اِندر کی مجال نہیں کہ وہ نافرمانی کرسکے۔ بالآخر ایک روز دُرلبھ داس ان تمام کمالوں کے ساتھ شہر سے نکلے۔ جلوس شاندار تھا۔ آگے آگے اونٹوں پر نقارے تھے۔ اس کے بعد مختلف قسم کے عَلَم اور نشان، پیچھے شنکھ اور گھنٹے بج رہے تھے۔ سب سادھوؤں کے دَل تھے۔ کوئی سنہری جُھول سے آراستہ ہاتھی پر سوار تھا۔ کوئی سجے ہوئے گھوڑے پر، کوئی مُغرق پالکیوں پر، چیلے چھتری لگائے چنْور ہلاتے جاتے تھے۔ اس جلوس سے کئی قدم پر اولیاء کی قطار تھی۔ یہاں وہ شاہانہ کرّوفر تو نہ تھا۔ ہاں ان کی وضع و قطع سے ایک فقیرانہ جلال ٹپک رہا تھا۔ سارے شہر کا چکر لگانے کے بعد یہ جلوس ایک اونچے ٹیلے پر جا پہنچا۔ یہاں لوگ اپنے اپنے آسن جمع کر بیٹھے۔ اور خدا سے التجا کرنے لگے۔ کسی نے سمادھی (مراقبہ) لی۔ کوئی جوگ کے آسن دکھانے لگا۔ کسی نے رامائن پڑھنا شروع کیا۔ کرشن کے بھکتوں نے کرتن کرنا ہی کافی سمجھا۔ فقراء تسبیح خوانی کرنے لگے۔ کوئی ورد سے سن ہوا کوئی حال مین۔ اور یہ کیف و نعیم کا دور تین گھنٹے تک جاری رہا۔ لاکھوں آدمی پیچھے کھڑے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے اور وہ رہ رہ کر آسمان کی طرف تاکتے تھے کہ بادل اُٹھا یا نہیں۔ جب دوپہر ہوا آفتاب سر پر جا پہنچا۔ تمازت سے چہرے سرخ ہونے لگے۔ اور ابر کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہ آیا تو لوگ مایوس ہوکر نیچے اُتر آئے۔ خواجہ رشید جلالی نے با آواز بلند کہا۔ "ملک کی یہ حالت تمھارے راجا کی بے انصافی کا نتیجہ ہے۔ جب تلک راجا صاحب خدا کے دربار میں آہ و زاری نہ کریں گے، یہ خدا کا قہر دور نہ ہوگا۔ تم لوگ جاکر انھیں کے قدموں پر گرو۔ انھیں کی شفاعت سے تمھارے نجات ہوسکتی ہے۔"

راجا پرتھوی پتی سنگھ ایک نفس پرست آدمی تھے۔ اپنے عیش و نشاط کے سوا انھیں اور کوئی کام نہ تھا۔ مہینوں محلوں سے باہر نہ آتے تھے۔ ہمیشہ راگ و رنگ کا چرچا رہتا تھا۔ تمام شہر کے بھانڈ و بھانڈوے، لوچّے اور شہدے ان کے مقربین میں تھے۔ روزانہ نئی نئی شرابیں کھینچی جاتی تھیں۔ انواع و اقسام کے لذیذ کھانے تیار ہوتے تھے۔ انھیں صرف شاعری سے اُنس تھا۔ اور وہ بھی اس شاعری سے جس سے آتشِ عشق تیز ہوتی ہے۔ وہ

خود ٹھمریاں اور دادرے (دُھن) بناتے تھے اور اکثر نشے میں مست ہوکر حسینوں کے ساتھ ناچتے تھے۔ انھیں اب تک اس عالم گیر قحط کی خبر نہ تھی۔ ان کے وزراء بھی خود غرض تھے۔ ملک کی اصلی حالت کا اخفاء ان کا مفید مطلب تھا۔ ملک پر خواہ کیسی ہی مصیبت کیوں نہ نازل ہو۔ شاہی دربار کے خرچے کے لیے روپے کہیں نہ کہیں سے نکل ہی آتے تھے۔ رعایا کی یہ مجال کہاں تھی کہ وہ معاملات شاہی میں دخل درمعقولات کرسکے۔ وہ راجا سے مایوس ہو رہی تھی۔ جو مصیبت آپڑی تھی وہ اُسے برداشت کرتی تھی۔ پر راجا کے عیش و عشرت میں مُخل ہونے کے جرأت نہ کرسکتی تھی۔

مگر جب خواجہ رشید جلالی نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس آفتِ سماوی کا علاج بغیر راجا صاحب کے اور کسی سے نہ ہوگا۔ تب لوگ مجبوراً شاہی محل کے سامنے آکر میدان میں جمع ہوگئے۔ اور جان پر کھیل کر با آواز بلند آہ و زاری شروع کی۔ دربانوں اور سپاہیوں نے انھیں وہاں سے بزور ہٹانا چاہا ڈرایا، ڈانٹا، مارنے کی دھمکی دی۔ پر لوگ اس وقت جان دینے پر آمادہ تھے۔ کسی طرح وہاں سے نہ ٹلے۔ ان کی صدائیں بے داد ہوگئیں۔ یہاں تک کہ راجا کے عیش میں خلل پڑگیا۔ انھوں نے غصّے میں آکر دربان سے پوچھا۔ ”یہ کون لوگ شور مچا رہے ہیں؟“ ایک دربان نے خوف زدہ ہوکر عرض کی۔ ”غریب پرور، اہلِ شہر کا کثیر مجمع شاہی محل کے سامنے کھڑا ہے اور کسی طرح نہیں ٹلتا۔“

راجا۔ وہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟

ایک وزیر نے آواز دیا۔ حضور، کچھ معلوم نہیں کہ ان کی کیا خواہشیں ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم حضور کی زیارت کے مشتاق ہیں۔

راجا۔ آج انھیں میری زیارت کا شوق کیوں ہوا ہے؟“

وزیر۔ حضور، میں نے انھیں بہت سمجھایا، مگر وہ کہتے ہیں کہ ہم بغیر شرف یابی حاصل کیے ہرگز نہ واپس ہوں گے۔

راجا۔ تو انھیں گولی مار کر بھگا دو۔ انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں ان کا راجا ہوں۔ وہ میرے راجا نہیں۔ وہ میرے محکوم ہیں، میں ان کا محکوم نہیں۔

وزیر۔ عالی جاہ! میں سب کچھ کرکے مجبور ہوگیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر گولی بھی چلائی گئی تو سب کے سب جان دے دیں گے۔ مگر اپنے ارادے سے باز نہ

آئیں گے۔

راجا نے کچھ سوچ کر کہا۔ تو ضرور ان کو کوئی تکلیف ہے۔ لاؤ سواری حاضر کرو۔

ایک لمحے میں تام زان (رتھ) حاضر ہوا۔ راجا صاحب بغیر سواری کے ایک قدم بھی نہ چل سکتے تھے۔ شاید ان کے پیروں کا مقصود صرف اعضا کی تکمیل تھا۔ سواری پر بیٹھ کر وہ رعایا کے سامنے موجود ہوئے انھیں دیکھتے ہی جے جے کا نعرہ بلند ہوا۔ گو تمام رعایا راجا کی شاکی تھی۔ پر ان کی اس نگاہِ ترحّم سے ان کے دل شاد ہوگئے۔ علاوہ بریں وہ صاحب غرض تھے۔ اس وقت ترشی بے موقع تھی۔ لیکن دراصل ان کے جوش کا سبب یہ تھا کہ راجا کو دیکھتے ہی ان کے دل میں ارادت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ جس نے بے دلی اور شکوہ پروری کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا۔ جے جے کی آوازیں بلند ہوئی۔ لوگوں نے عرض کی۔ مہاراج ہم سخت مصیبت میں گرفتار ہیں۔ آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔ اگر ہمیں آپ نہ بچائیں گے تو ہم سب دانہ پانی بغیر تڑپ تڑپ کر مرجائیں گے۔

راجا نے متعجب ہوکر پوچھا۔ تم پر کون سی مصیبت ہے؟

رعایا۔ غریب پرور سال بھر سے ایک بوند پانی نہیں برسا۔ تمام ملک میں کہرام مچا ہوا ہے۔ تالابوں میں پانی نہیں۔ کنوئیں سوکھ گئے۔ دریا کا پانی بھی جواب دے چکا آپ ہمارے مالک ہیں۔ آپ ہی کی نظر رحم سے اب ہماری مصیبت دور ہوگی۔

راجا۔ مجھے تو آج یہ کیفیت معلوم ہوئی۔ کیا دراصل پانی نہیں برسا؟

رعایا۔ غریب پرور آپ خود چل کر ہماری حالت ملاحظہ فرما لیں۔ دانہ پانی بغیر ہماری حالت بہت نازک ہو رہی ہے۔

راجا۔ کیا تم لوگوں نے دیوتاؤں کی پرستش نہیں کی اور جگ نہیں کیے۔

رعایا۔ حضور! ہم سب کرکے تھک گئے۔

راجا۔ تم نے مہاتماؤں اور فقیروں کے آستانوں پر جبیں سائی کی ہوتی، مہاتما دُرلبھ داس کو گھیرا ہوتا۔ خواجہ رشید جلالی سے کیوں نہیں کہا؟ وہ خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ چاہیں تو ابھی چشم زدن میں جل تھل ایک کردیں۔

رعایا۔ حضور! بزرگانِ خدا نے بڑی کوشش کی، ہزاروں باخداؤں کو لے کر آہ وزاری میں مصروف ہوئے۔ پر کسی سے کچھ نہ ہوسکا۔

راجا۔ سچ؟

رعایا۔ حضور! بالکل سچ۔

راجا۔ میں نے تو ان کے معجزات کی عجیب عجیب داستانیں سُنی ہیں۔

رعایا۔ غریب پرور! ان لوگوں نے تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ تم لوگ اپنے راجا کی پناہ میں جاؤ۔ وہی تمھاری اس مصیبت کو رفع کریں گے۔ یہ عتابِ الٰہی بغیر راجا کی آہ و زاری کے دور نہ ہوگا۔

راجا نے ہنس کر کہا۔ جب ایسے ایسے اہلِ کمال کچھ نہ کرسکے تو میری کیا ہستی۔

رعایا۔ حضور! آپ اس ملک کے مالک ہیں۔ بادشاہ ہیں۔ آپ ہماری عرض داشت کو اگر دربار ایزدی تک پہنچا دیں تو ہمیں یقین ہے کہ ہماری تکلیف دور ہوجائے گی۔

راجا نے لرز کر کہا۔ مجھے امید نہیں۔ آپ مصیبت میں گرفتار ہیں۔ مجھے سخت رنج ہے۔ مگر جو راجا ہوس رانیوں میں اس قدر محو ہو کہ اسے اپنی رعایا کی حالت کی ذرہ برابر خبر نہ ہو، جو ہمیشہ شراب کے نشے میں چور پڑا رہتا ہو، جو ہمیشہ خواہش نفسانی کا شکار رہا ہو اس کی ذات سے تمھاری کیا بھلائی ہوسکتی ہے؟ مگر میں تم لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ تمھاری مصیبت کو اپنی بے نیازی سے بڑھانا نہیں چاہتا۔ میں ایشور سے کوئی التجا کرنے کے نا قابل ہوں۔ مجھے ان سے التجا کرتے ہوئے شرم آتی ہے پر میں تمھارے نفع کے لیے بے حیا بن کر ان کے سامنے جاؤں گا اطمینان رکھو۔

دوپہر کا وقت تھا۔ آفتاب کی تیز شعاعیں تیر آتش بن کر زمین پر گر رہی تھیں اور زمین خوف سے لرزہ تھی۔ جھلتی ہوئی ریت سے بھانپ نکلتی تھی۔ گویا بے کس زمین کی آہ کا دھواں تھا۔ اسی وقت راجا پرتھوی سنگھ محل سے برآمد ہوئے۔ ان کے جسم پر ایک پتلی سی لنگوٹی کے علاوہ اور کوئی لباس یا زیور نہیں تھا۔ خوبصورت بال مڑے ہوئے تھے اور منہ میں کالک لگی ہوئی تھی۔ اس سیاہی میں ان کی سرخ آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا سیاہ بانات پر سرخ ریشم کے پھول بنے ہیں۔ ان کا چہرہ اداس اور افسردہ تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس طرح ننگے سر و ننگے۔ پیر درد مایوسی غیرت کی تصویر بنے ہوئے آکر محل کے سامنے جلتی ہوئی زمین پر کھڑے ہوگئے۔ وزیروں اور مصاحبوں نے راجا کو روکنے کی بہتری فکریں کیں۔ مگر انھوں نے کوئی مضبوط عہد کیا تھا۔ اس سے نہ ڈگے۔

اہلِ شہر نے جب یہ کیفیت سُنی تو دوڑے ہوئے اس مقام پر جمع ہوگئے۔ ایسا کوئی دل نہ تھا جو راجا کی اس صورتِ درد و یاس سے تڑپ نہ گیا ہو۔ انھوں نے نہایت عاجزی سے کہا۔ خداوند! آپ اس سیاہی کو دھو ڈالیے اس سے ہمارے دلوں پر چوٹ لگتی ہے۔

راجا نے نہایت استقلال سے جواب دیا۔ بھائیو! یہ سیاہی اب ایشور کے بارانِ رحمت سے دُھلے گی۔ یوں نہیں!

ایک گھنٹہ گزر گیا، راجا کا چہرہ تو سیاہ توے کی طرح تپ رہا تھا۔ آنکھوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ چوٹی کا پسینہ ایڑی تک پہنچ گیا۔ پیروں کے نیچے کی زمین تر ہوگئی۔ دماغ گرم پانی کی طرح کھولنے لگا۔ لوگوں کو ہر لمحہ اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں غش کھا کر گر نہ پڑیں۔ لوگ عاجزانہ طریقے سے عرض کرتے تھے کہ غریب پرور آپ اپنے جسم نازک کو اس طرح تکلیف نہ دیں۔ ہمیں دانہ پانی بغیر مرجانا قبول، پر آپ کی یہ تکلیف دیکھنا قبول نہیں۔ پر راجا کا چہرہ التجا صادق اور استقلال کے نور سے معمور تھا۔ حواس ظاہرہ تو ساکن تھے مگر موئے بدن ہمہ تن زبان بن کر کہہ رہا تھا کہ اے معبود میری رعایا آلام میں مبتلا ہے اسے پناہ دے۔ میں گنہ گار ہوں۔ نافرمابردار ہوں۔ سیہ کار ہوں۔ مجھے آپ سے التجا کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میری خطاؤں کی سزا مجھے ملنی چاہیے۔ میری رعایا بے قصور ہے۔ اس پر رحم کر۔ میں سخت سے سخت عذاب کے لیے تیرنے دربار میں سر تسلیم خم کیے ہوں۔ اگر میری دعا مستجاب نہ ہوگی تو میں یہیں کھڑے کھڑے جان دے دوں گا۔ پر رعایا کو اپنا منہ نہ دکھاؤں گا میں تیرا بندہ ہوں۔ تجھ سے اپنی مصیبت کہنے میں کوئی بے عزتی نہیں۔ لیکن جو رعایا مجھے اپنا مالک تصور کرتی ہے اس کے سامنے میں کون سا منہ لے کر جاؤں؟

دو گھنٹے گزر گئے۔ آفتاب کی شعاعیں اور بھی تیز ہوگئی۔ زمین پہلے سے کہیں زیادہ جلنے لگی۔ تمام رعایا آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی۔ مگر بادل کا نام نہ تھا۔

تمام شہر یہ عجیب و غریب نظارہ دیکھنے کے لیے اُمڈا چلا آتا تھا۔ ہر ایک سینے میں حقیقت اور وفا کی موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ ہزاروں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ عورتیں بے چین ہوکر نالہ و فریاد کرتی تھیں۔ راج محل سے درد انگیز صدائیں بلند ہوکر دلوں کو اور بھی پاش پاش کرتی تھیں۔

تین بج گئے تھے۔ مگر سورج کی تپش میں ذرہ بھر بھی کمی نہ تھی۔ راجا پرتھوی سنگھ کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ماتھا سکڑ گیا تھا۔ جسم کو سنبھالنے اور حواس کو اور بھی قابو میں رکھنے کی مستقل کوشش کے باعث لب ہائے نازک پھولوں کی کلیوں کے مانند بند ہوگئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بدن میں خون کی حرکت نہیں ہے۔ جان نہیں ہے صرف ایک مایوسانہ استقلال ہے جو ان کو پیروں تک کھڑا کیے ہوئے ہے۔ لوگوں کو ہر وقت یہی گمان تھا کہ راجا اب گرے تب گرے۔ کتنے ہی آدمیوں کو یقین تھا کہ گو راجا کھڑے ہیں مگر یہ صرف ان کی لاش بے جان ہے۔ جس تپش اور گرمی کو گھر میں بیٹھ کر برداشت کرنا مشکل تھا۔ جس دھوپ میں چیل انڈے چھوڑتی تھی اور حشرات زمین سے نکل نکل کر مرجاتے تھے۔ کرۂ نار میں کسی ذی روح کا ایک لمحہ کھڑا رہنا نا ممکن تھا۔ اس دہکتی ہوئی آگ میں راجا جیسا نازک بدن اور ناز پرور شخص اتنی دیر تک کیسے کھڑا رہ سکتا ہے۔

یکایک جے جے کا نعرہ بلند ہوا۔ زمین تھرائی، آسمان ہلا۔ گویا کوئی زلزلہ زمین پر آگیا ہو۔ دو پہاڑوں نے ٹکر کھایا ہو۔ لاکھوں آدمی خوشی سے دیوانے ہوکر اچھلنے کودنے لگے۔ ساری خلقت میں ہلچل سی مچ گئی۔ بے شمار انگلیاں پورب کی جانب اُٹھ گئیں۔ ایک چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا افق پر اس طرح نظر آرہا تھا جیسے فضائے تاریک میں کوئی چراغ ٹمٹما رہا ہو۔ قلعے سے توپیں چھوٹنے لگیں۔ عورتوں نے منگل گانا شروع کیا۔ دروازے شاہی پر غربا و مساکین کو رانیوں کی طرف سے خیرات دی جانے لگیں۔ مگر رعایا اس وقت ایک سکون کی حالت میں تھی۔ مسرت و شادمانی کی پہلی لہر نے اسے بے خبر بنا دیا تھا۔ اب وہ اپنے جذبات کو روکے ہوئے امید و بیم کی نگاہ سے بادل کے ٹکڑے کو دیکھنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس ٹکڑے نے پھیلنا شروع کیا اور بارود کے دھوئیں کی طرح آن واحد میں تمام آسمان پر چھا گیا۔ بجلی چمکنے لگی۔ ہوائیں چلنے لگیں۔ گرجنے کی کرخت آواز سنائی دی۔ مگر یہ کرخت آواز لوگوں کو بہشتی نغمے سے بھی کہیں زیادہ پیاری معلوم ہوئی۔ اس آواز کے سننے کے لیے آدمی بہت دنوں سے بے چین تھے۔ آفتاب نہایت تیزی سے مغرب کی جانب بھاگ رہا تھا۔ گویا وہ بادل کی فوج سے خائف ہوکر اپنی جان چھپانا چاہتا تھا۔ مگر اس کا بھاگنا بے کار ہوگیا۔ چشم زدن میں وہ بادلوں کے دل میں چھپ گیا۔ دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ یہ اندھیرا مخلوق خدا کی امیدوں کا آفتاب تھا۔

بادل پھر گرجنے لگا اور بوندیں پڑنی شروع ہوئیں۔ لوگ اعتقاد اور محبت کے ساتھ راجا کی طرف دوڑے اور ان کے قدموں پر گر پڑے۔ راجا ابھی تک ہمہ تن تصویر کھڑے تھے۔ ان کے منہ کی سیاہی ڈھل ڈھل کر چھوٹتی جاتی تھی۔ اور ان کا روشن چہرہ اس تاریکی میں بادل کے چاند کی مانند روشن ہوتا جاتا تھا۔ ان کے چہرے پر ایک روحانی جلال جلوہ افروز تھا اور آنکھوں سے نورانی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ انھوں نے عہد کیا تھا کہ منہ کی یہ سیاہی بارانِ رحمت سے ڈھلے گی اور ویسا ہی ہوا۔ کیونکہ استقلال تھا روحانی طاقت تھی اور ایشور کی دست گیری کا یقین تھا۔ ملک کو اس سے پہلے کبھی اتنی خوشی اتنا اطمینان اور اتنی فراغت نصیب نہ ہوئی تھی۔

ہندی میں پہلی بار پرتگیا کے عنوان سے مارچ 1920 میں شری شاردا میں شائع ہوا۔ اور کسی اردو ہندی کے مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ اپراپیہ ساہتیہ میں شامل ہے۔ اردو ماہنامہ 'صبح امید' (لکھنؤ) کے نومبر 1920 کے شمارے میں شائع ہوا۔

اِنسان کا مقدس فرض

ہولی کا دن ہے۔ لڈو کے شیدائی اور رس گلّے کے فدائی پنڈت موٹے رام شاستری اپنے صحن میں ایک ٹوٹی چارپائی پر سر جھکائے، فکر و غم کا مجسمہ بنے بیٹھے ہیں۔ ان کی اہلیہ ان کے قریب بیٹھی ہوئی ان کی جانب سچی ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ اور اپنی شیریں کلامی سے شوہر کے آتشِ غم کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

پنڈت جی نے بہت دیر تک فکر میں غرقاب رہنے کے بعد مایوسانہ لہجہ میں کہا۔

نصیبا سسرُا نہ جانے کیوں جا کر سوگیا۔ ہولی کے دن بھی نہ جاگا۔

پنڈتانی۔ دن ہی بُرے آگئے ہیں۔ یہاں تو جون دن سے تمھارا حکم پاوا وہی گھری سے سانجھ سبیرے دونوں جون سورج نارائن سے یہی بردان مانگا کرت ہے۔ کہ کہوں سے بلاوا آوے۔ سیکڑوں دیا تُلسی مائی کو چڑھاوا مدا سب سوئے گئے۔ گاڑھ پرے پر وہ کام نہیں آوت ہے۔

موٹے رام۔ کچھ نہیں، یہ دیوی دیوتا سب نام کے ہیں۔ ہمارے بکھت (وقت) پر کام آویں تب ہم جانیں کہ ہیں کوئی دیوی دیوتا۔ مفت میں مال پوا اور حلوا کھانے والے تو بہت ہیں۔

پنڈتانی۔ کا سہر بھر، اب کوؤ بھلامانس ناہیں رہا؟ سب مرگئے؟

موٹے رام۔ سب مرگئے بلکہ سڑگئے۔ دس پانچ ہیں تو سال بھر میں دو ایک بار جیتے ہیں۔ وہ بھی بہت ہمت کی تو روپے کی تین سیر مٹھائی کھلا دی۔ میرا بس چلتا تو سبوں کو سیدھے کالے پانی بھجوا دیتا۔ یہ سب اسی آریہ سماج کی کرنی ہے۔

پنڈتانی۔ تم ہوتو گھرماں بیٹھے رہت ہو۔ اب ای (اس) جمانہ (زمانہ) میں ایسا کوئی دانی ناہیں ہے کہ گھر بیٹھے نیوتا بھیج دے۔ کبھوں کبھوں (کبھی کبھی) جبان (زبان) لڑا دیا کرو۔

موٹے رام۔ تم کیسے جانتی ہو کہ میں نے زبان نہیں لڑائی۔ ایسا کون رئیس اس شہر میں ہے۔ جس کے یہاں جاکر میں نے آشیرباد نہ دیا ہو۔ مگر کون سسرُا سنتا ہے۔ سب

اپنے اپنے رنگ میں مست ہیں۔

اتنے میں پنڈت چنتامن نے قدم رنجہ فرمایا۔ یہ پنڈت موٹے رام جی کے خاص دوست تھے۔ ہاں عمر کچھ کم تھی۔ اور اسی کے مطابق ان کی توند بھی اتنی بارونق اور خوشنما نہ تھی۔

موٹے رام۔ کہو دوست، کہا سماچار (خبر) لائے؟

چنتا من۔ ڈول نہیں اپنا سر ہے۔ اب وہ نصیبا ہی نہیں رہا۔

موٹے رام۔ گھر ہی سے آرہے ہو۔

چنتا من۔ بھائی، ہم تو سادھو ہوجائیں گے۔ جب اس جینے میں کوئی سکھ ہی نہیں رہا تو جی کر کیا کریں گے؟ اب بتاؤ کہ آج کے دن جب بڑھیا چیزیں نہ ملیں تو کوئی کیسے جیے؟

موٹے رام۔ ہاں بھائی، بات تو واجبی کہتے ہو۔

چنتا من۔ تو اب تمھارا کیا کچھ نہ ہوگا؟ صاف صاف کہو۔ ہم سنیاس لے لیں۔

موٹے رام۔ نہیں یار، گھبراؤ مت۔ جانتے نہیں ہوکہ مرے بنا (بغیر) سُورگ نہیں ملتا۔ تر مال کھانے کے لیے کٹھن تپیا (ریاضت) کرنی پڑتی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ چلو ابھی گنگا کنارے چلیں اور وہاں بیاکھیان (لکچر) دیں۔ کون جانے کسی بھلے مانس کی آتما جاگ پڑے۔

چنتامن۔ ہاں، بات تو اچھی ہے۔ چلو چلیں۔

دونوں اٹھ کر گنگا جی کی طرف چلے۔ صبح کا وقت تھا۔ ہزاروں آدمی نہا رہے تھے۔ کوئی پوجا پاٹ کرتا تھا۔ کتنے ہی لوگ پنڈوں کی چوکیوں پر بیٹھے تلک لگا رہے تھے۔ کوئی کوئی تو بھیگی دھوتی ہی پہنے گھر جارہے تھے۔

دونوں مہاتماؤں کو دیکھتے ہی چاروں طرف سے نمسکار، پرنام اور پالاگن کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں ساتھی ان آوازوں کا مناسب جواب دیتے ہوئے گنگا کے کنارے پر جا پہنچے اور اشنان وغیرہ میں مشغول ہوئے۔ اس کے بعد ایک پنڈا جی کی چوکی پر بیٹھ کر بھجن گانے لگے۔ یہ ایک ایسی عجیب بات تھی۔ کہ سیکڑوں آدمی وہاں آکر جمع ہوگئے۔ جب سامعین کی تعداد کئی سو تک پہنچ گئی تو پنڈت موٹے رام جی فخریہ لہجے میں بولے۔ اے

لوگو! آپ کو معلوم ہے کہ جب برہما جی نے اس مٹ جانے والے سنسار کو بنایا تو برہمنوں کو اپنے منہ سے پیدا کیا۔ کسی کو اس بات میں سُبھا (شبہ) تو نہیں ہے؟

سامعین۔ نہیں مہاراج، آپ بالکل سچ کہتے ہو۔ آپ کی بات کون کاٹ سکتا ہے؟

موٹے رام۔ تو برہمن برہماجی کے مُنہ سے نکلے، یہ بالکل ٹھیک ہی ہے۔ اس لیے مُنہ آدمی کے بدن کا سب سے اچھا انگ (حصہ) ہے۔ اس لیے مُنہ کو سکھ پہنچانا ہر آدمی کا خاص کام ہے۔ ہے یا نہیں؟ کوئی کاٹتا ہے ہماری بات کو؟ سامنے آئے۔ ہم اُسے شاستر میں دکھاسکتے ہیں۔

سامعین۔ مہاراج! آپ گیانی پرُش (آدمی) ہو۔ آپ کی بات کاٹنے کی ہمت کون کرسکتا ہے؟

موٹے رام۔ اچھا تو جب یہ بات پکی ہوگئی۔ کہ منہ کو سکھ پہنچانا ہر آدمی کا دھرم ہے۔ تو کیا یہ دیکھنا کٹھن ہے کہ جو لوگ منہ سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ انھیں دُکھ ملے گا۔ کوئی کاٹتا ہے اس بات کو؟

سامعین۔ مہاراج! آپ دھنیہ ہو! آپ نیائے شاستر کے پورے پنڈت ہو۔

موٹے رام۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ مُنہ کو سکھ کیسے دیا جائے؟ ہم کہتے ہیں۔ جیسی تم میں بھگتی ہو۔ جیسی تم میں سکت ہو۔ اس کے بہت سے ڈھنگ ہیں۔ دیوتاؤں کے گُن گاؤ۔ ایشور کی پوجا کرو۔ اچھی سنگت کرو۔ اور کٹھور بچن (سخت بات) نہ بولو۔ ان باتوں سے منہ کو سکھ ملے گا۔ کسی کو مصیبت میں دیکھو تو اُسے ڈھارس دو۔ اس سے منہ کو سکھ ملے گا۔ مگر ان سب سے بڑھیا۔ سب سے اچھا۔ ایک اور ہی ڈھنگ ہے۔ کوئی آپ میں ایسا ہے جو اُسے بتلادے؟ ہے کوئی؟ بولے۔

سامعین۔ مہاراج! آپ کے سامنے کون منہ کھول سکتا ہے۔ آپ ہی اُسے بھی بتائیے۔

موٹے ۔ اچھا تو ہم چلا چلا کر، گلا پھاڑ پھاڑ کر کہتے ہیں۔ کہ وہ ان سب ڈھنگوں سے بڑھ ہے۔ اُسی طرح جیسے چندرماں سب تاروں سے بڑھ ر ہے۔

سامعین۔ ہاراج! اب دیر نہ کیجیے۔ یہ کون سا ڈھنگ ہے؟

موٹے ۔ اچھا سنئے، اچھی طرح سنئے۔ وہ ڈھنگ ہے۔ منہ کو بڑھیا کھانے کھلانا۔ اُسے ں اچھی چیزیں دینا۔ کوئی کاٹتا ہے۔ ماری بات کو؟ آئیے۔ ہم اُسے ویدوں سے

ثابت کر دیں۔

ایک شخص نے اعتراض کیا۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سچ بولنے سے مٹھائیاں کھانا کیوں کر منہ کے لیے زیادہ سکھ پہنچانے والا ہو سکتا ہے؟

کئی آدمیوں نے کہا۔ ہاں ہاں، ہمیں بھی یہی شک ہے مہاراج! اس شک کو مٹائیے۔

موٹے رام۔ اور کسی کو کچھ پوچھنا ہے۔ ہم بہت خوشی سے بتلائیں گے۔ آپ پوچھتے ہیں۔ کہ بڑھیا چیزوں کو کھانا کس طرح سچ بولنے سے زیادہ سکھ دینے والا ہے۔ میرا جواب ہے۔ کہ پہلا روپ پرگٹ (ظاہر) ہے۔ اور دوسرا چھپا ہوا ہے۔ مثلاً مان لو کہ میں نے کوئی جرم کیا نہیں تھا۔ تو اس کا یہ ڈنڈ مجھے اچھی راہ پر نہ لاسکے گا۔ میں کوئی رشی نہیں ہوں۔ میں مایا میں پھنسا ہوا کم درجہ کا آدمی ہوں۔ مجھ پر اس سزا کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ میں حاکم کے سامنے سے ہٹتے ہی پھر اسی بُری راہ پر چلنے لگوں گا۔ میری بات سمجھ میں آتی ہے؟ کوئی اسے کاٹتا ہے؟

سامعین۔ مہاراج! آپ ودیا کے ساگر ہو۔ آپ پنڈتوں کے سرتاج ہو۔ آپ کو دھنیہ ہے۔

موٹے رام۔ اچھا، اب اسی بات کو لے کر پھر دیکھو۔ حاکم نے مجھے بلاکر جلد ہی جیل میں ڈال دیا۔ اور وہاں مجھے طرح طرح کے کشٹ (تکلیف) دیئے گئے۔ اب جب میں چھوٹوں گا۔ تو برسوں تک تکلیفوں کو یاد کرتا رہوں گا۔ اور شاید بُری راہ پر چلنا چھوڑ دوں گا۔ آپ پوچھیں گے۔ کہ ایسا کیوں ہے ڈنڈ (سزا) دونوں ہی ہیں تو کیوں ایک کا اثر پڑتا ہے۔ اور دوسری کا نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ ایک کا روپ دکھلاتا ہے۔ اور دوسرے کا چھپا ہوا ہے۔ سمجھے آپ لوگ۔

سامعین۔ دھنیہ ہو۔ مہاراج! آپ کو ایشور نے بڑی بدھی دی ہے۔

موٹے رام۔ اچھا تو اب آپ پوچھیں گے۔ کہ بڑھیا چیز کہتے کس کو ہیں؟ میں اسے بتلاتا ہوں۔ جیسے بھگوان نے طرح طرح کے رنگ آنکھوں کے لیے بنائے۔ اسی طرح منہ کے لیے بھی بہت سے ذائقوں کو بنایا۔ مگر ان سب میں بڑھیا کون ہے؟ یہ اپنی اپنی پسند ہے۔ لیکن ویدوں اور شاستروں میں میٹھا ذائقہ سب سے اچھا مانا گیا ہے۔ دیوتا لوگ اسی پر مست ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ سب کے مالک نارائن بھی میٹھی

چیزوں ہی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کوئی ایسے دیوتا کا نام بتا سکتا ہے۔ جو نمکین چیزیں کھاتا ہو؟ ہے کوئی جو ایسے ایک بھی دیوتا کا نام بتاسکے؟ کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح کھٹے، کڑوے، کسیلے، ذائقے بھی دیوتاؤں کو پسند نہیں۔

سامعین۔ مہاراج! آپ کی بدھی کا پاراوار نہیں۔

موٹے رام۔ تو یہ ثابت ہوگیا کہ میٹھی چیزیں سب میں بڑھیا ہیں۔ اب آپ پھر پوچھیں گے۔ کہ کیا سبھی میٹھی چیزوں سے منہ کو ایک ہی طرح کا مزہ ملتا ہے۔ اگر میں "ہاں" کہوں۔ تو آپ چلاّ اُٹھو گے۔ کہ پنڈت جی، تم باؤلے ہو۔ اس لیے میں کہوں گا۔ "نہیں" اور باربار "نہیں" سب مٹھائیاں ایک۔ سی اچھی نہیں ہوتیں۔ گڑ اور شکر میں بہت فرق ہے۔ اس لیے منہ کو سکھ دینے کے لیے ہمارا دھرم ہے کہ ہم بڑھیا سے بڑھیا مٹھائیاں کھائیں اور کھلائیں۔ میرا اپنا خیال ہے۔ کہ آپ کے تھال میں جونپور کی امرتیاں۔ آگرہ کے موتی چور کے لڈو، متھرا کے پیڑے۔ بنارس کی قلاقند، لکھنؤ کے رس گلے۔ اجودھیا کے گلاب جامن۔ اور دلی کا حلوا سوہن ہو۔ وہ ایشور کے بھوگ کے لائق ہے۔ دیوتا لوگ اُن پر مست ہوجائیں گے۔ اور جو دل اور ہمت والا آدمی ایسے بڑھیا تھال براہمنوں کو کھلائے گا۔ اُسے ضرور سورگ ملے گا۔ اگر آپ کا ایسا وشواس ہے۔ تو ہم آپ سے ہٹ کے ساتھ کہیں گے۔ کہ اپنا دھرم ضرور نبھائے۔ نہیں تو آدمی بننے کا نام نہ لیجیے۔

پنڈت موٹے رام کی تقریر ختم ہوگئی۔ تالیاں بجنے لگیں۔ لوگوں نے اس دھرم اور گیان بھرے اُپدیش سے خوش ہوکر ان پر پھول برسائے۔ اس وقت چنتامن نے بھی یوں گلفشانی کی۔

دھرماتما لوگو! آپ نے میرے دلی دوست پنڈت موٹے رام جی کی بڑھیا باتیں سُنیں اور اب میرے کھڑے ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر جہاں میں ان کی اور سبھی باتوں کو مانتا ہوں۔ وہاں میں ان کی کچھ باتوں کو نہیں بھی مانتا۔ میری رائے میں اگر آپ کے تھال میں صرف جونپور کی امرتیاں ہوں تو وہ "پنچ میل" مٹھائیوں سے کہیں بڑھ کر سکھ اور سواد دینے والی ہوں گی۔ اسے میں شاستر سے ثابت کرسکتا ہوں۔

موٹے رام جی نے ناراض ہوکر کہا۔ تمھاری یہ رائے ٹھیک نہیں۔ آگرہ کے موتی

چور اور دلی کے حلوا سوہن کے سامنے جونپور کے امرتیوں کی کوئی گنتی ہی نہیں ہے۔

چنتامن۔ ثابت کیجیے۔

موٹے رام۔ آنکھوں دیکھی بات کا ثابت کرنا کیا؟

چنتامن۔ یہ تمھارا مورکھ پن ہے۔

موٹے رام۔ تم جنم بھر کھاتے ہی رہے مگر کھانا نہ آیا۔

اس پر چنتامن نے موٹے رام پر اپنی آسنی کا وار کیا۔ شاستری جی نے وار خالی دیا۔ اور چنتامن کی طرف مست ہاتھی کی طرح دوڑ پڑے۔ مگر حاضرین نے دونوں مہاتماؤں میں بیچ بچاؤ کرا دیا۔

ہندی میں سودیش (گورکھ پور) کے مارچ 1920 کے شمارہ میں شائع ہوا، منشیہ کا پرم دھرم کے عنوان سے مان سروور 3 میں شامل ہے۔ پریم چالیسی میں شامل ہے۔

اِصلاح

دُرگا مالی ڈاکٹر عرفان علی بارایٹ لا کے یہاں نوکر تھا۔ پانچ روپیہ تنخواہ تھی۔ گھر میں بیوی کے علاوہ دو تین چھوٹے بچے تھے۔ بیوی پڑوسیوں کے لیے گیہوں پیس دیا کرتی تھی۔ دو بچّے جو ذرا ذی شعور تھے اِدھر اُدھر سے لکڑیاں اُپلے وغیرہ چُن لاتے تھے۔ مگر تاہم ان کی بڑی تکلیف سے بسر ہوتی تھی۔ دُرگا ڈاکٹر صاحب کی نظر بچا کر باغیچہ سے پھول چُن لیا کرتا۔ اور بازار میں پجاریوں کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دستِ غنیمت پھلوں پر بھی جا پڑتا تھا۔ یہ اس کی بالائی آمدنی تھی۔ اس سے روزانہ نمک تیل کا خرچ نِکل آتا تھا۔ اس نے کئی بار ڈاکٹر صاحب سے اضافہ تنخواہ کی التجا کی تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں اضافہ کی کوئی معقول وجہ نہ آتی تھی۔ وہ صاف کہہ دیا کرتے تھے۔ ”بھئی میں تمھیں جبراً تو نہیں روکتا۔ تمھارا یہاں نباہ نہیں ہوتا۔ کہیں اور تلاش کرو۔ میرے لیے مالیوں کا قحط نہیں ہے۔“ درگا میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ لگا ہوا روزگار چھوڑکر دوسری نوکری ڈھونڈنے نکلتا۔ اس سے زیادہ تنخواہ ملنے کی اسے امید بھی کم تھی۔ اس لیے قہرِ درویش بر جانِ درویش پڑا دن کاٹتا تھا۔ اور اپنی تقدیر کو روتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو باغبانی کا خاص ذوق تھا۔ انواع و اقسام کے پھول پتے لگا رکھے تھے۔ اچھے اچھے پھلوں کے درخت ملیح آباد۔ سہارن پور۔ دربھنگہ وغیرہ مقامات سے منگوا کر لگائے تھے۔ درختوں کو پھل سے لدا ہوا دیکھ کر انھیں دلی مسرت ہوتی تھی۔ اپنے احباب کے یہاں اکثر گل دستے اور سبزیاں وغیرہ تحفتہً بھجواتے رہتے تھے۔ انھیں خود کھانے کا شوق نہ تھا۔ مگر کھلانے میں انھیں خاص لطف آتا تھا۔ ہر ایک پھل کے موسم میں دوستوں کی دعوت اثمار کرتے۔ پکنک پارٹیاں۔ ان کے مشغلہ تفریح کا ایک خاص جزو تھیں۔

ایک بار گرمیوں میں انھوں نے اپنے کئی ہم مشرب دوستوں کو آم کی دعوت دی۔ ایک ملیح آبادی سفیدے میں کئی پھل لگے ہوئے تھے۔ انھیں وہ روزانہ چہل قدمی کرتے

ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ اس خیال سے انھیں وہی خوشی ہوتی تھی۔ جو کسی پہلوان کو اپنے پٹھوں کے کرتب دکھانے سے ہوتی ہے۔ اتنے بڑے خوش رنگ پھل خود ان کی نگاہ سے کبھی نہ گزرے تھے۔ پھلوں کی شیرینی کا انھیں اتنا کامل یقین تھا کہ وہ چکھ کر اپنا اطمینان کرنا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ بالخصوص اس لیے کہ اس خود پروری سے وہ اپنے کسی ایک دوست کو لُطفِ ذائقہ سے محروم کردیں گے۔

شام کا وقت تھا۔ چیت کا مہینہ۔ احباب باغیچہ میں آکر حوض کے کنارے کرسیوں پر بیٹھے۔ برف اور دودھ کا انتظام پہلے ہی سے کرلیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے پھلوں کو درخت میں لگے ہوئے دکھلاکر تب انھیں تڑوانا چاہتے تھے۔ تاکہ کسی کو یہ شک کرنے کا موقع نہ ملے۔ کہ پھل اس باغ کے نہیں ہیں۔ جب سب حضرات جمع ہوگئے۔ تو انھوں نے کہا۔ "آپ لوگوں کو تکلیف تو ہوگی۔ مگر ذرا چل کر پھلوں کو درخت میں لٹکے ہوئے ملاحظہ فرمائیے۔ کتنے خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ گلاب میں بھی ایسی دلآویز سرخی نہ ہوگی۔ رنگ سے ملاحت ٹپکی پڑتی ہے۔ ان کی رنگت اور صورت اس درجہ رغبت انگیز ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ میں نے یہ قلم خاص ملیح آباد سے منگوایا تھا اور اس کی خاص طور پر نگہداشت کی گئی ہے۔"

احباب اُٹھے۔ ڈاکٹر صاحب میزبان کی حیثیت سے آگے آگے چلے۔ روشوں کے دونوں طرف گلاب کے تختے تھے۔ ان کی بہار دکھلاتے ہوئے وہ بالآخر سفیدہ کے درخت کے سامنے آگئے۔ مگر وہاں ایک پھل بھی نہ تھا۔ انھوں نے خیال کیا۔ شاید یہ درخت نہیں ہے۔ دو قدم اور آگے چلے۔ دوسرا درخت مل گیا۔ اور آگے بڑھے۔ کٹہل کا درخت آگیا۔ پھر پیچھے لوٹے اور تعجب کرتے ہوئے سفیدہ کے درخت کے سامنے رُک گئے۔ پھل کیا ہوئے؟ درخت تو یہی ہے۔ اس میں مطلق شبہ نہیں۔ مگر پھل کہاں گئے؟ دوستوں کی طرف خطا وارانہ انداز سے دیکھا۔ اور معافی طلب لہجہ میں بولے۔"ضرور مالی کی شرارت ہے۔ دیکھیے میں کم بخت کو ابھی بلاتا ہوں۔ میں حد درجہ نادم ہوں کہ آپ صاحبوں کو ناحق تکلیف ہوئی۔ واللہ مجھے اس وقت جتنا ملال ہے۔ اس کا اظہار نہیں کرسکتا۔ ایسے خوش ذائقہ۔ خوش رنگ۔ خوشنما پھل میں نے اپنی زندگی میں نہ دیکھے تھے۔ ان کے یوں تلف ہونے کا مجھے بے انتہا قلق ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ایک انداز شہادت سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ احباب نے کہا۔"جناب آپ ہم لوگوں کی تکلیف کا خیال نہ فرمائیں۔ وہ نہ سہی۔ دوسرے پھل سہی۔" ایک رنگین طبع صاحب بولے۔ "جناب مجھے تو سب آم ایک ہی سے لگتے ہیں۔ سفیدے۔ موہن بھوگ۔ لنگڑے۔ بمبئ۔ فجری۔ دسہری۔ اس میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ معلوم نہیں کیوں کر آپ لوگوں کو ان کی لذتوں میں امتیاز معلوم ہوتا ہے"۔

دوسرے صاحب نے فرمایا۔"یہاں بھی وہی کیفیت ہے۔ اس وقت جو موجود ہوں وہی منگوایئے! جو گئے۔ ان کا افسوس بے سُود ہے۔"

عرفان علی۔ حضرات آموں کی کیا کمی ہے۔ سارا باغ بھرا ہوا ہے۔ خوب شوق سے کھایئے۔ مگر وہ لطافت اور نزاکت کہاں؟ آپ کو یقین نہ آئے گا۔ واللہ سفیدوں پر ایسا نکھار تھا کہ بالکل سیب معلوم ہوتے تھے۔ سیب خوشنما ضرور ہوتا ہے۔ مگر اس میں وہ رغبت انگیز لطافت کہاں؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شجر آرزو میں وصال کے پھل لگے ہوئے ہیں۔ واللہ سخت افسوس ہے۔ کمال افسوس ہے۔ اس مالی نے آج وہ حرکت کی ہے کہ جی چاہتا ہے۔ نمک حرام کو گولی مار دوں۔ اس وقت سامنے آجائے۔ تو اَدھ موا کردوں، (مسکرا کر) اگر خدا نخواستہ کل مجھ پر ضرب شدید کا کوئی استغاثہ ہو۔ تو آپ لوگ شاہد رہیے گا کہ مجھے کس قدر روحانی اشتعال ہوا ہے۔

مالی کا پتہ نہ تھا۔ ڈاکٹرصاحب نے سائیس سے آم تڑوائے۔ دوستوں نے آم کھائے۔ دودھ پیا۔ ڈاکٹرصاحب کا شکریہ ادا کرکے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ انھیں ڈاکٹرصاحب کے نقصانِ عظیم کا مطلق احساس نہ ہوا۔ مگر ڈاکٹرصاحب وہیں حوض کے کنارے ڈنڈا ہاتھ میں لیے مالی کے انتظار میں قطب از جا نمی جنبد بنے بیٹھے رہے۔

(۲)

دُرگا شام کو بازار سے لوٹا۔ وہ چوکنی نظروں سے اِدھراُدھر تاکتا آتا تھا۔ جوں ہی اس نے ڈاکٹر کو حوض کے کنارے ڈنڈا ہاتھ میں لیے بیٹھے دیکھا۔ اس کے ہوش اُڑگئے۔ سمجھ گیا۔ کہ چوری پکڑلی گئی۔ اس خوف سے آج اس نے آنے میں عمداً دیر کی تھی۔ اس نے سمجھا تھا۔ ڈاکٹرصاحب کہیں سیر کرنے گئے ہونگے میں کٹھل کے درخت کے نیچے اپنے جھونپڑے میں چپکے سے جا بیٹھوں گا۔ صبح کو پوچھ پاچھ ہوئی بھی تو مجھے صفائی دینے کا موقعہ

رہے گا۔ سرکار میری تلاشی لے لیں۔ اس طرح معاملہ دب جائے گا۔ چور وقت کو اپنی بریت کی بہترین دلیل سمجھتا ہے۔ ایک ایک لمحہ اسے دلیر بناتا جاتا ہے۔ لیکن رنگے ہوئے ہاتھوں پکڑے جانا۔ اس کے لیے قہر ہے۔ وہ بے زبان ہوجاتا ہے۔ اس کی سینہ زوری سلب ہوجاتی ہے۔ خون کے سوکھے رنگ کے داغ بن سکتے ہیں۔ لیکن تازہ خون آپ ہی آپ پکارتا ہے۔ اس میں زبان ہوتی ہے۔ دُرگا کے پَیر تھم گئے۔ سینہ دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ اس پر پڑگئی تھی۔ اب واپسی کا ارادہ بے کار تھا۔ ڈاکٹرصاحب دور سے دیکھتے ہی اُٹھے کہ چل کر خوب مرمت کروں۔ لیکن بیرسٹر تھے۔ خیال آگیا کہ اس کا بیان لینا ضروری ہے۔ اشارہ سے قریب بلایا۔ اور پُوچھا۔"سفیدہ میں کئی پھل لگے ہوئے تھے۔ ان میں ایک بھی نظر نہیں آتا۔ کیا ہوئے؟ دُرگا نے معصومانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ ہجور ابھی میں بجار گیا ہوں تو آم جوں کے توں تھے۔ اتنی دیر میں کوئی توڑلے گیا ہو۔ تو میں نہیں کہہ سکتا۔"

عرفان علی۔ تمھارا کس پر شبہ ہے؟

مالی۔ ہجور اب میں کسے بتاؤں؟ اتنے نوکر چاکر ہیں۔ نہ جانے کس کی نیت بگڑی ہو۔

عرفان علی۔ مگر میرا شبہ تمھارے ہی اوپر ہے۔ اگر توڑکر رکھے ہوں۔ تو لاکر دے دو۔ یا صاف صاف کہہ دو۔ کہ میں نے توڑے ہیں۔ ورنہ میں بُری طرح پیش آؤں گا۔

چور محض سزا سے نہیں بچنا چاہتا۔ وہ بدنامی سے بھی بچنا چاہتا ہے۔ وہ سزا سے اتنا نہیں ڈرتا۔ جتنا بدنامی سے۔ جب اسے سزا سے بچنے کی ساری امید منقطع ہوجاتی ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے جرم کا اقبال نہیں کرتا۔ دُرگا اس وقت اپنے فعل کا اعتراف کرکے سزا سے بچ سکتا تھا۔ پر اس نے کہا۔ 'ہجور مالک ہیں۔ جو چاہیں کریں۔ پر میں نے آم نہیں توڑے۔ سرکار ہی بتا دیں کہ اتنے دن آپ کی تابے داری کرتے ہوگئے۔ کبھی ایک ٹہنی بھی چھوئی ہے؟"

عرفان علی۔ "تم قسم کھا سکتے ہو؟"

دُرگا۔ ہجور گنگا کی کسم جو میں نے آموں ٹیں ہاتھ بھی لگایا ہو۔

عرفان علی۔ اس قسم کی سند نہیں۔ تم لوٹے میں پانی لاؤ۔ اس میں تلسی کے پتے رکھو۔ اور تب قسم کھا کر کہو۔ کہ اگر میں نے آم توڑے ہوں تو میرا لڑکا میرے کام نہ

آئے۔ تب مجھے تمھارے اوپر اعتماد ہوگا۔

دُرگا۔ ہجور سانچ کو آنچ کیا۔ جیسے کہیئے کسم کھا جاؤں۔ جب میں نے کام ہی نہیں کیا۔ تب مجھ پر کسم کیا پڑے گی؟

عرفان علی۔ باتیں نہ بناؤ۔ جاکر پانی لاؤ۔

ڈاکٹر صاحب قیافہ شناس آدمی تھے۔ رات دن مجرموں سے سابقہ رہتا تھا۔ دُرگا اگرچہ زبان سے دلیرانہ باتیں کر رہا تھا۔ پر اس کے دل میں خوف سمایا ہوا تھا۔ وہ اپنے جھونپڑے میں آیا۔ لیکن لوٹے میں پانی لے کر پھر جانے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے ہاتھ تھرتھرانے لگے۔ کئی ایسے واقعے یاد آگئے۔ جب کہ جھوٹی گنگا اٹھانے والوں پر آسمانی بلائیں نازل ہوگئی تھیں۔ بھگوان کے حاضر و ناظر ہونے کا ایسا یقین آج تک اُسے نہ ہوا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ میں جھوٹی گنگا نہ اُٹھاؤں گا۔ یہی ہوگا نا۔ کہ برخاست ہوجاؤں گا۔ کچھ جُرمانہ ہوجائے گا۔ یہ منظور ہے۔ نوکری بھی کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی اور نوکری بھی نہ ملے۔ تو مزدوری تو کہیں نہیں گئی ہے۔ کدال بھی چلاؤں گا تو چار پانچ آنے روز پاجاؤں گا۔

وہ آہستہ آہستہ خالی ہاتھ ڈاکٹر صاحب کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

ڈاکٹر صاحب نے تند لہجہ میں کہا۔ "پانی لاؤ۔"

دُرگا۔ ہجور میں گنگا نہ اُٹھاؤں گا۔

ڈاکٹر۔ تو ثابت ہوگیا کہ تم نے ضرور آم توڑے۔

دُرگا۔ اب سرکار جو چاہیں۔ سمجھیں۔ مان لیجیے میں نے ہی توڑ لیے تو آپ کا گلام ہوں۔ رات دن تابے داری کرتا ہوں۔ بال بچے آموں کے لیے روئیں تو کہاں جاؤں۔ اب کے جان بکسی کی جائے۔ پھر ایسی کھتا نہ ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب اتنے فیاض نہ تھے۔ انھوں نے یہی احسان کیا کہ درگا کو پولیس کے سپُرد نہ کیا۔ اور نہ اسے ہنٹر لگائے۔ اس کے مذہبی اعتقاد نے انھیں کچھ نرمی کی جانب مائل کردیا تھا۔ مگر ایسے بد نیت شخص کو اپنے یہاں رکھنا غیر ممکن تھا۔ انھوں نے اسی دم درگا کو معزول کردیا۔ اور اس کی باقی تنخواہ جرمانہ میں ضبط کرلی۔

(۴)

کئی ماہ گزرنے کے بعد ایک روز ڈاکٹر عرفان علی مسٹر پریم شنکر کے باغیچہ کی سیر کرنے گئے۔ وہاں سے چند اچھی قلمیں لانے کا ارادہ تھا۔ پریم شنکر کو بھی باغبانی کا شوق تھا۔ اور دونوں آدمیوں کے درمیان یہی ایک مناسبت تھی۔ ورنہ دونوں بالکل متضاد تھے۔ پریم شنکر قناعت پسند۔ سادہ مزاج۔ غریب دوست آدمی تھے۔ وہ کئی سال امریکہ رہ چکے تھے۔ وہاں زراعت اور فلاحت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور اب یہاں آکر اسی فن کو ذریعہ معاش بنا لیا تھا۔ انسانی خاصہ اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق ان کے عجیب خیالات تھے۔ جن کے باعث شہر کے مہذب طبقہ کے لوگ انھیں مراقی فاتر العقل سمجھتے تھے۔ ان کے خیالات سے لوگوں کو ایک قسم کی فلسفیانہ ہمدردی ضرور تھی۔ مگر اس میں لوگوں کو شک تھا کہ ان پر عمل بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ عمل کی دُنیا ہے۔ فلسفہ کی دُنیا نہیں ہے۔ یہاں فلسفہ ہمیشہ فلسفہ ہی رہے گا۔ اُسے واقعات زندگی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب باغیچہ میں داخل ہوئے تو پریم شنکر کو کیاریاں سینچتے ہوئے پایا۔ کنوئیں پر ایک سفیدپوش آدمی کھڑا پمپ سے پانی نکال رہا تھا۔ وہ دُرگا مالی تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے دل میں اس وقت درگا کی جانب سے ایک بغض للہ سا پیدا ہوا۔ جس شخص کو انھوں نے سزا دے کر اپنے یہاں سے علیحدہ کردیا تھا۔ اسے اس قدر خوش باش ہونے کا کیا حق تھا اگر دُرگا اس وقت پھٹے حال۔ رونی صورت بنائے نظر آتا۔ اور انھیں دیکھتے ہی ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوجاتا۔ تو شاید ڈاکٹر صاحب کو اس پر رحم آجاتا۔ وہ اسے غالباً کچھ انعام دیتے۔ اور پریم شنکر سے اس کی نسبت چند کلمات خیر کہنے کی تکلیف گوارا کرتے۔ وہ خاصۂ نیک آدمی تھے اور اپنے ملازموں سے مہربانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مگر ان کی اس مہربانی اور اس التفات میں مطلق فرق نہ تھا۔ جو انھیں اپنے کتوں یا گھوڑوں کے ساتھ تھی۔ اس مہربانی کی بنیاد انصاف پر نہیں، رحم پر تھی۔ درگا نے انھیں دیکھا۔ کنوئیں پر کھڑے کھڑے ادب سے سلام کیا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اس کی یہ خود داری ڈاکٹر صاحب کے جگر میں کانٹے کی طرح چُبھی۔ انھیں اس خیال سے غصہ آیا کہ میرے یہاں سے نکلنا اس کے حق میں اکسیر ہوگیا۔ پریم شنکر جوں ہی ان سے مصافحہ کرکے انھیں چند نئے تختوں کی طرف لے چلے تو ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ "یہ آدمی آپ کے یہاں کتنے دنوں سے ہے؟"

پریم شنکر۔ چار پانچ مہینے ہوئے ہوں گے۔

عرفان علی۔ کچھ نوچ کھسوٹ تو نہیں کرتا۔ اس سے پہلے یہ میرے یہاں مالی تھا۔ اس کی دست درازیوں سے تنگ آکر میں نے اسے نکال دیا تھا۔ کبھی پھول توڑکر بیچ لیتا۔ کبھی پودے اکھاڑ لے جاتا۔ اور پھولوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ایک بار میں نے چند احباب کی دعوت کی تھی۔ ملیح آبادی سفیدہ خوب پھلا ہوا تھا۔ جب سب لوگ آکر بیٹھ گئے اور میں درخت کے پاس گیا۔ تو سارے پھل غائب۔ کچھ نہ پوچھیے۔ اس وقت کتنی خفت ہوئی۔ میں نے اسی وقت ان حضرت کو دھتکار بتائی۔ بڑا ہی دغاباز بد نیت آدمی ہے اور ایسا شاطر کہ اسے گرفتار کرنا محال ہے۔ کوئی وکیل ہی جیسا کائیاں آدمی ہو۔ تو اُسے پکڑ سکتا ہے۔ ایسی صفائی اور دلیری سے انکار کرتا ہے کہ اس کا منہ تکتے رہ جائیے۔ آپ کو تو کبھی چرکا نہیں دیا؟

پریم شنکر۔ جی مطلق نہیں۔ مجھے اس نے شکایت کا کبھی موقع نہیں دیا۔ یہاں تو خوب محنت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کی چھٹی میں بھی آرام نہیں کرتا۔ مجھے تو اس پر اتنا بھروسہ ہوگیا ہے کہ سبزی۔ پھل۔ پودے۔ بیج سب اسی کے ہاتھوں میں چھوڑ دیے ہیں۔ دن بھر میں جو کچھ آمدنی ہوتی ہے وہ شام کو مجھے دے دیتا ہے اور کبھی ایک پائی کا بھی فرق نہیں ہوتا۔

عرفان علی۔ جناب یہی تو اس کی مشاقی کی تعریف ہے کہ آپ کو اُلٹے استرے سے مونڈے اور آپ کو مطلق خبر نہ ہو۔ آپ اسے کیا تنخواہ دیتے ہیں؟

پریم شنکر۔ یہاں کسی کو تنخواہ نہیں دی جاتی۔ سب آدمی نفع میں برابر شریک ہوتے ہیں۔ مہینہ میں ضروری اخراجات نکالنے کے بعد جو کچھ آمدنی ہوتی ہے اس پر دس فی صدی کارخیر کے لیے الگ کرلیا جاتا ہے۔ باقی روپے برابر تقسیم کردیئے جاتے ہیں۔ پچھلے ماہ ایک سو چالیس روپیہ کی آمدنی ہوئی تھی۔ مجھے ملاکر کل سات آدمی ہیں۔ ہر ایک کے حصہ میں بیس بیس روپے آئے تھے۔ اب کی ماہ میں جوار ہوگئی ہے۔ امرود اچھے آئے ہیں۔ زیادہ آمدنی کی امید ہے۔

عرفان علی نے تعجب سے پوچھا۔ کیا آپ اس قدر قلیل آمدنی پر بسر کرلیتے ہیں؟

پریم شنکر۔ جی ہاں! بہت آسانی سے۔ میں ان مصنوعی ضروریات کا پابند نہیں ہوں۔ جسے

آج کل داخل تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ میں وہی کپڑے پہنتا ہوں وہی کھانا کھاتا ہوں۔ اور اسی طرح رہتا ہوں۔ زیادہ کی ضرورت ہی کیوں ہو؟ دس بیس روپیہ ماہوار ادویات کا صرفہ ہے جو غربا کو تقسیم کی جاتی ہیں۔ یہ رقم مشترکہ آمدنی سے وضع کی جاتی ہے اور سب کے سب آدمی اس ثواب میں شریک ہوتے ہیں۔ سائیکل جو آپ کو نظر آرہی ہے وہ مشترکہ رقم سے لی گئی ہے، جسے ضرورت ہوتی ہے اس پر سوار ہوتا ہے۔ چونکہ ان آدمیوں کو مجھ پر زیادہ اعتبار ہے اس لیے وہ مجھے اپنا مُکھیا سمجھتے ہیں اور میرے علم اور تجربہ کے باعث میرا دباؤ مانتے ہیں۔ جو کچھ کہتا ہوں اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ کوئی یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی کا نوکر ہوں۔ سب کے سب ساجھے دار ہیں۔ اس لیے سب جان توڑکر محنت کرتے ہیں اور کامل ایمانداری کے ساتھ۔ جب ایک شخص مالک اور دوسرا اس کا نوکر ہوتا ہے تو فوراً رقابت شروع ہوجاتی ہے۔ مالک چاہتا ہے کہ میں اس محنت سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کروں۔ نوکر چاہتا ہے کہ میں کم سے کم کام ...... کروں۔ ان کے درمیان ذرا بھی ہمدردی یا برادرانہ تعلق نہیں ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ کام چھوٹا ہو یا بڑا۔ اس رقیبانہ کشمکش کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔ اس نے دنیا میں دولت اور افلاس کے دو جُدا جُدا فرقے قائم کر دیئے ہیں اور ان میں خونریز جنگ ہو رہی ہے۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ رقابت کا دور اب نزع کی حالت میں ہے اس کی جگہ اب باہمی امداد اور ہمدردی کا دور شروع ہونے والا ہے۔ میں نے دوسرے ملکوں میں رقابت کے نظارے خوب دیکھے ہیں اور ان سے سیر ہوگیا۔ باہمی امداد میں نجات کی صورت نظر آتی ہے۔ اب ہمیں زبردستی کو خیرباد کہہ کر ایثار سے کام لینا پڑے گا۔

عرفان علی۔ تو یہ کہیے کہ آپ سوشلسٹ ہیں۔

پریم شنکر۔ جی نہیں میں سوشلسٹ یا ڈیماکریٹ کچھ نہیں ہوں۔ میں صرف حق اور انصاف کا خادم ہوں۔ میں اخلاق کو علم سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ علم اور ذہانت۔ فہم اور فراست یا دیگر ذہنی اور دماغی اوصاف کو ہوس اور زر پرستی کا غلام نہیں بنانا چاہتا۔ مجھے موجودہ تعلیم اور تہذیب پر مطلق اعتماد نہیں ہے۔ علم کا کام ہے، تہذیب اخلاق

اور تہذیب اخلاق کا نتیجہ فیاضی۔ فراخدلی۔ ایثار۔ بے نفسی۔ ہمدردی۔ غریب دوستی اور انصاف پسندی ہے۔ وہ تعلیم جو ہمیں ثروت و جاہ کا غلام بنا دے، جو ہمیں زیر دست آزاری پر مائل کرے۔ جو ہمیں تکلفات کا مطیع بنائے جو ہمیں دوسروں کا خون پی کر فربہ ہونے کی تحریک کرے۔ تعلیم نہیں شیطنت ہے۔ جہلا حرص و طمع کے بس میں ہوجائیں تو قابل معافی ہیں۔ مگر مدعیانِ علم و تہذیب کے لیے نفس پرستی حد درجہ شرمناک ہے۔ علم و فضیلت کو ہم نے بامِ ثروت کا زینہ بنا لیا۔ حالانکہ وہ خدمت کا وسیلہ تھا۔ اونچی سے اونچی تعلیم پائے ہوئے لوگ زیادہ سے زیادہ حریص نظر آتے ہیں۔ بس زبردستی ہماری تعلیم و تہذیب کا معیار ہے۔ میں اس تعلیم سے جہالت کو بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں۔ ہمارے پروفیسر صاحب ایک ہزار سے کم تنخواہ پائیں تو ان کا منہ نہیں سیدھا ہوتا۔ ہمارے دیوانی اور مال کے حکام دو ہزار ماہوار پانے پر بھی شکوۂ تقدیر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ ساری دنیا مریض ہوجائے اور میں سونے کی دیوار کھڑی کرلوں اور ہمارے وکیل صاحب (معاف کیجیے گا) اپنی قانون دانی کو ہیرے کے تول بیچنا چاہتے ہیں۔ سب کے سب "وقت دولت ہے" کے کلیہ کے غلام بنے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کی روزی غصب کرلیتا ہے اور پھر بھی خادمِ قوم بننے کا دعویٰ کرتاہے۔ رعایا فاقہ کشی کرے۔ برہنہ رہے۔ طاعون سے مرے۔ ہمارا دماغی گروہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ پیدا دوسرے کریں کھانا ہمارا کام ہے۔ میں اس گروہ کو محض وجود معطل نہیں بلکہ شر دائر سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر عرفان علی نے بہت تحمل سے کام لے کر پوچھا۔"تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم سب مزدوری کریں؟"

پریم شنکر۔ جی نہیں۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتو میں اسے نوع انسان کے لیے مایۂ خیر و برکت سمجھوں۔ مجھے صرف حالات میں اس درجہ تفاوت سے اعتراض ہے۔ اگر ایک غریب آدمی پانچ روپے ماہوار میں گزار سکتا ہے تو ایک دماغی کام کرنے والے آدمی کے لیے اس کی دوگنی چوگنی رقم کافی ہونی چاہیے۔ مگر پانچ اور پانچ ہزار۔ پچاس اور پچاس ہزار کا بعد المشرقین کیوں ہو؟ انتظامِ سلطنت قانونی فیصلہ۔ قانون کی حمایت۔

طبابت۔ تصویر کشی۔ رقاصی۔ معلمی۔ دلالی۔ تجارت اور صدہا دیگر پیشے ایسے ہیں جن میں ایک بھی کسب دولت نہیں کرتا۔ ان سب کا مدار دوسروں کی کمائی پر ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ پیشے جو ضروریات زندگی پیدا کریں۔ قیام حیات کے لیے سامان بہم پہنچائیں۔ آج دنیا کے سارے مدبر۔ سارے وکیل۔ سارے دلال۔ سارے پروفیسر۔ معرضِ فنا میں آجائیں تو دُنیا آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ گرائے گی۔ بلکہ خوشی سے گھی کے چراغ جلائے گی۔ اس کے سر سے ایک بوجھ اتر جائے گا۔ کاشتکار اپنا ہل چلائے گا اور اپنے گوشۂ قناعت اور عافیت میں بیٹھا ہوا آرام سے زندگی بسر کرے گا۔ آپ فرمائیں گے۔ یہ تو تمدن کے دور اولین کا نقشہ ہے۔ انسان نے قرنوں اور صدیوں میں جو ترقیاں کی ہیں۔ ان کو ہٹاکر پھر اسی دور توحش کی طرف واپس جاتا ہے۔ آپ فنون لطیفہ کی ترقی کو انسان کے جذباتی اور روحانی عروج کا لازمہ قرار دیں گے۔ علیٰ ہذا آپ کو موجودہ تہذیب کا ہرایک پہلو حیاتِ انسانی کے لیے ضروری نظر آئے گا۔ کیونکہ انسان محض چوپایہ نہیں ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تہذیب اور ترقی خودغرضی اور جفا شعاری کی ایک مستور صورت ہے اور کچھ نہیں۔ ہندوستان کا کاشتکار چین کے مزارع سے لڑنے نہیں جاتا۔ اسی تعلیم یافتہ گروہ نے اپنے مطلب کے لیے قوم کا سوانگ کھڑا کیا۔ قومی حقوق کی حفاظت کے لیے فوجیں بنائیں۔ انصرام سلطنت کا نقشہ کھینچا۔ مسائل بین الاقوام کی ایجاد تجارت اور صنعت کے لاینحل عقدے اختراع کیے اور اب اپنی فتوحات پر ناز کرتا ہے۔ اپنی تہذیب پر پھولا نہیں سماتا۔

عرفان علی۔ آپ اقتصادیات کے مسئلہ تقسیم محنت کو بالکل نظر انداز کر رہے ہیں قدرت نے افراد کو خاص خاص قابلیتیں عطا کی ہیں۔ ان کے بہترین استعمال کے لیے خاص موقعوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

پریم شنکر۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ ہر فرد مزدوری کرنے پر مجبور ہو۔ نہیں جسے پرماتما نے غور و فکر کی قوت عطا کی ہے۔ وہ فلسفیانہ مسائل کی تحقیق کرے۔ جس کے جذبات مضبوط اور عمیق ہوں۔ وہ شعر و سخن میں طبع آزمائی کرے۔ علیٰ ہذا میری دلیل صرف یہ ہے کہ پیشوں میں اس قدر امتیاز نہ رہنا چاہیے۔ دماغ سے تعلیم و تہذیب

اور درس و تدریس کا کام لینا چاہیے۔ جذبات سے اخلاقی اور روحانی اصلاح کا۔ مگر ان روحانی یا دماغی کمالات کو ذریعہ ثروت نہ بنانا چاہیے۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہاتھوں سے کسب معاش کرے اور دل و دماغ صرف قوم کی اصلاح و فلاح روحانی مسائل کی تحقیق و تدقیق۔ علمی معلومات کی اشاعت اور ترویج کے لیے وقف ہوں لیکن تاوقتیکہ ہم اس اعلیٰ معیار تک نہ پہنچ سکیں۔ ہم کو ذہنی اور حرفتی پیشوں میں اس غیر فطری امتیاز کو مٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ یہ آئین قدرت کا بالکل خلاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ لازمی پیشوں کو تفوق ہو۔ بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ اس تسویہ سے اہل کمال بد دل ہوجائیں گے اور دنیا ان کے انوارِ فیض سے محروم ہوجائے گی۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے بڑے سے بڑے حکماء بڑے سے بڑے شعراء۔ بڑے سے بڑے موجد۔ بڑے سے بڑے ارباب فنون لطیفہ۔ مال و زر سے بے نیاز تھے۔ اس وقت کمال کا معاوضہ اپنے قلب کی تسکین تھی۔ نوع کی ضرورت محرک کہاں تھی۔ جب سے کمال نے دولت کا دامن پکڑا۔ اسی وقت سے تہذیب کا انحطاط شروع ہوا۔

ڈاکٹرعرفان علی اب زیادہ صبر نہ کرسکے۔ بولے۔"آپ کا مجوزہ نظام معاشرت فرشتوں کی دنیا کے لیے چاہے موزوں ہو۔ لیکن اس عملی دُنیا کے لیے اور اس عملی دَور میں ہرگز موزوں نہیں ہے۔"

پریم شنکر۔ محض اسی لیے کہ ابھی تک سرمایہ داروں کا اور مہذب جماعت کا عوام پر اقتدار ہے؟ مگر اس کے قبل بھی بارہا اس اقتدار کو زک ہوچکی ہے اور قرائن بتلا رہے ہیں کہ زمانہ قدیم میں اب اسے پھر زک پہنچنے والی ہے۔ شاید اب کے یہ شکست فیصلہ کن ہوگی۔ تہذیب کا دور جمہوریت سے شروع ہوکر جمہوریت ہی پر ختم ہوتا ہے۔ شاہی حکومت روساء کا اقتدار سرمایہ داروں کی بالادستی یہ درمیانی منازل ہیں۔ موجودہ دور نے درمیانی منزلیں طے کر لی ہیں اور اپنی آخر منزل تک آپہنچا ہے۔ مگر ہم ابھی تک اپنی ثروت اور اختیار کے نشہ میں اس قدر مخمور ہیں کہ ہم کو آثار اور قرائن بالکل نہیں نظر آتے۔ اطراف عالم سے جمہور کی گھنگھور صدائیں ہمارے کانوں میں پہنچ رہی ہیں۔ مگر ہم ابھی تک ایسے بے خبر ہیں۔ گویا عالمِ خواب میں

ہوں۔ ہم اپنی یونیورسٹی ایجوکیشن اپنے قانونی انہاک۔ اپنے ڈراما اور تھیئٹر اپنے مِل اور کارخانوں اور اسی قسم کے دوسرے مشاغل میں محو ہیں۔ جن کا منشا دوسروں کی کمائی اور مشقت پر موٹا ہونا ہے۔ موجودہ گرانی ضروریات پر سارے عالم میں واویلا مچا ہوا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ اس سے ہماری تہذیب کے تاریک پہلو پر کیسی صاف روشنی پڑتی ہے اب مہذب دُنیا کو تجربہ ہو رہا ہے کہ تھیئٹر کا وہ ایکٹر جو پانچ ہزار روپیہ ماہوار پیدا کرتا ہے۔ معاشرت کا ضروری جزو ہے۔ یا وہ غریب کندۂ ناتراش کاشتکار جسے ہم حیوان مطلق سمجھنے کے عادی ہیں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ دُرگا مالی ایک ڈالی میں کچھ پھل چند جوار کی بالیں چند آم سجا کر لایا۔ اس کے انداز اور بشرہ سے ایک خود دارانہ متانت برس رہی تھی گویا اب وہ ذاتی اہمیت سے باخبر ہوگیا ہے۔ وہ سلام کرکے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ ”آپ کو کن چیزوں کی قلمیں چاہئیں۔ آپ بابو جی کو آرڈر دیجیے۔ میں کل آپ کے مکان پر پہنچا دوں گا۔ بال بچے تو اچھی طرح ہیں؟“

عرفان علی نے کسی قدر محجوب ہوکر کہا۔ ”ہاں لڑکے اچھی طرح ہیں۔ تم یہاں آرام سے ہو؟“

دُرگا۔ جی ہاں۔ سب حضور کی مہربانی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک کاغذ پر چند قلموں کے نام لکھ کر رکھ دیئے۔ اور رخصت مانگی۔ پریم شنکر ان کے ساتھ ساتھ پھاٹک تک آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے دروازہ پر متانت سے مسکرا کر کہا۔ حضرت میں آپ کے اصولوں کا قائل تو نہیں ہوا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آپ نے ایک کمینہ اور شیطان آدمی کو انسان بنا دیا یہ آپ کی صحبت کا فیض ہے۔ میں ذات کا قائل ہوں۔ انسٹی ٹیوشنوں کا قائل نہیں لیکن معاف فرمایئے گا۔ میں پھر بھی کہوں گا کہ آپ اس سے ہوشیار رہیے گا۔“ ”ایجو ٹیکس“ کا علم ابھی تک کوئی ایسا نسخہ ایجاد نہیں کرسکا۔ جو تخم کی تاثیر کو مٹا دے۔

اردو ماہنامہ کہکشاں میں اپریل 1920 میں شائع ہوا پریم بتیسی میں شامل ہے۔ پہلی بار ہندی ماہنامہ پربھا میں فرورر1920 میں شائع ہوا۔ یہ ’پشو سے منشیہ‘ کے عنوان سے مان سرودر8 میں شامل ہے۔

مہرِ پدر

منشی اُلفت رائے اقتصادیات کے ماہر تھے۔ اور بحد امکان اُس کے اُصولوں پر عمل بھی کرتے تھے۔ وہ وکیل تھے۔ کئی مواضعات میں اُن کے حصّے تھے۔ بینک میں بھی کچھ روپیہ تھے۔ یہ سب اِسی علم اقتصاد کا نتیجہ تھا۔ جب صرف زر کی کوئی صورت در پیش ہوتی تھی تو فطرتاً اِن کے دل میں سوال پیدا ہوتا تھا اس سے میرا نفع ہوگا یا کسی غیر کا۔ اگر دونوں میں سے کسی کا کچھ نفع نہ ہوتا ہو تو وہ بڑی بے دردی سے اُس خرچ کا گلا گھونٹ دیتے تھے۔ "فضول" کو وہ مارِ سیاہ سمجھتے تھے۔ علم الکفایت کے اصول اُن کی زندگی کے جزو بن گئے تھے۔

منشی جی کے دو لڑکے تھے۔ بڑے کا نام پربھو داس تھا، چھوٹے کا شیو داس۔ دونوں کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ دونوں میں صرف ایک جماعت کا فرق تھا۔ دونوں ہی ذہین، خوش اخلاق، ہونہار نوجوان تھے۔ مگر پربھو داس باپ کا منظورِ نظر تھا۔ اُس کی طبیعت میں اولوالعزمی تھی۔ اور خاندان کو اُس کی ذات سے بڑی بڑی اُمیدیں تھیں۔ منشی جی اِسے تکمیلِ تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیجنا چاہتے تھے۔ اُسے بیرسٹری کے حلۂ سعید سے آراستہ دیکھنا اُن کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی۔

(۲)

مگر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ پربھو داس کو بی۔ اے۔ کے امتحان کے بعد بخار آنے لگا۔ ڈاکٹروں کی دوا شروع ہوئی۔ ایک مہینہ تک متواتر ڈاکٹر صاحب آتے رہے پر بخار میں مطلق افاقہ نہ ہوا۔ لاچار دوسرے ڈاکٹر کا معالجہ شروع ہوا۔ مگر اس سے بھی کچھ نفع نہ ہوا۔ پربھو داس روز بروز کمزور ہوتا چلا جاتا تھا۔ اُٹھنے بیٹھنے کی بھی طاقت نہ رہی وہ ہمیشہ مغموم رہتا۔ یہاں تک کہ بی۔ اے میں آنرز کے ساتھ پاس ہونے کی خوشخبری بھی اس کے چہرہ پر خوشی کی کوئی علامت نہ پیدا کرسکی۔ وہ ہمیشہ کسی گہری فکر میں ڈوبا رہتا تھا

زندگی وبال ہوگئی تھی۔

ایک روز منشی اُلفت رائے نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ یہ بات کیا ہے کہ دو مہینے علاج کرتے ہوگئے اور ابھی تک دوا کا کوئی اثر نہیں ہوا؟

ڈاکٹر صاحب نے اندازِ تشویش سے جواب دیا۔ میں آپ کو وحشت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ پر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تپِ دق ہے۔

منشی جی نے گھبرا کر کہا۔ تپِ دق!

ڈاکٹر۔ جی ہاں۔ اس کی ساری علامتیں نظر آرہی ہیں۔

منشی جی نے اندازِ حیرت سے کہا۔ تپِ دق ہوگیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے افسوسناک لہجے میں کہا۔ یہ مرض نہایت خفیہ طور پر جسم میں سرایت کرتا ہے۔

اُلفت رائے۔ میرے خاندان میں تو یہ مرض کسی کو نہ تھا۔

ڈاکٹر۔ ممکن ہے دوستوں سے اس کے جرم ملے ہوں۔

منشی جی کئی منٹ کی تفکر آمیز خموشی کے بعد بولے اب کیا کرنا چاہیے؟

ڈاکٹر۔ دوا جاری رہنی چاہیے۔ ابھی پھیپھڑوں تک اثر نہیں ہوا ہے۔ صحت کی امید ہے۔

منشی جی۔ آپ کے خیال میں کب تک دوا کا اثر ہوگا؟

ڈاکٹر۔ قطعی طور پر تو کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ لیکن تین چار مہینوں میں کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔ جاڑوں میں اس کا زور کچھ کم ہوجایا کرتا ہے۔

منشی جی۔ اچھے ہوجانے پر تو یہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں گے؟

ڈاکٹر۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اب یہ دماغی محنت کے قابل شاید ہی ہوں۔

منشی۔ کسی سینٹوریم (Sanatorium) (دارالصحت) میں بھیج دوں تو کیسا؟

ڈاکٹر۔ بہت ہی مناسب ہے۔

منشی۔ تب تو اِنھیں کامل صحت ہوجائے گی۔

ڈاکٹر۔ ممکن ہے۔ لیکن اِس مرض کو دَبا رکھنے کے لیے ان کا دماغی محنت سے محترز رہنا ہی بہتر ہے۔

منشی جی۔ مایوسانہ انداز سے بولے۔ تب تو ان کی زندگی ہی تباہ ہوگئی۔

(۴)

گرمی کا موسم گذر گیا۔ برسات شروع ہوئی۔ پربھو داس کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی۔ وہ پڑے پڑے اسی مرض کے لٹریچر کا مطالعہ کیا کرتا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کی تشریحیں پڑھتا۔ اور اُن کے تجربات کا اپنی حالت سے موازنہ کرتا۔ پہلے کچھ دنوں تک تو وہ امید و بیم کی حالت میں رہا۔ دو چار دن بھی طبیعت سنبھل جاتی تو اپنی کتابیں سنبھالنے لگتا۔ سفرِ انگلستان کی تیاریاں شروع کرتا۔ اِسی طرح دوچار دن بھی حرارت زیادہ ہوجاتی تو زندگی سے مایوس ہوجاتا۔ دوسرے ہی سفر کی تیاریاں ہونے لگتیں۔ مگر کئی ماہ کے بعد جب اُسے یقین ہوگیا کہ اس موذی مرض سے نجات پانا غیر ممکن ہے تو اُس نے زندگی کی فکر ہی ترک کردی۔ اکثر بد پرہیزی کر بیٹھتا۔ گھر والوں کی نظر بچاکر دوائیں زمین پر لنڈھا دیتا۔ اگر کوئی استفسارِ حال کرتا تو اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیتا۔ اس کے اندازوں میں ایک زاہدانہ توکّل اور باتوں میں ایک عالمانہ متانت آگئی تھی۔ موجودہ رسم و رواج اور معاشرت پر بڑی بے باکی سے رائے زنی کیا کرتا۔ اُسے اب کسی کی خوشی یا ناخوشی کی پروا نہ تھی۔ یہاں تک کہ مذہبی مسائل پر بھی اُسے اعتقاد نہ رہا تھا۔ اُسے یہ سارا نظامِ تمدن، سارا فلسفہ، تمام مذہبی عقائد، خامیوں اور بے انصافیوں سے پرُ نظر آتا تھا۔ منشی اُلفت رائے کے دل میں اگرچہ کبھی کبھی یہ خیال آتا تھا کہ جب نتیجہ ظاہر ہی ہے تو یوں معالجہ پر دولت ضائع کرنا بے سود ہے۔ لیکن کچھ تو لڑکے کی محبت اور کچھ زبانِ خلق کے خوف سے وہ صبر کے ساتھ دوا کرتے جاتے تھے۔

جاڑوں کے دن تھے۔ منشی اُلفت رائے مریض کے سرہانے بیٹھے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی طرف مستفسر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب ٹمپریچر لے کر کرسی پر بیٹھے تو منشی جی نے پوچھا۔ اب تو جاڑا آگیا۔ آپ کو کچھ فرق نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ندامت کے انداز سے کہا، بالکل نہیں۔ بلکہ مرض اور بھی لاعلاج ہوتا جاتا ہے۔ اُلفت رائے نے سخت ہوکر کہا، تب آپ لوگ کیوں مجھے اس دھوکے میں ڈالے ہوئے تھے کہ جاڑوں میں اِنھیں شفا حاصل ہوگی۔ اِس طرح دوسروں کے اعتماد کا مضحکہ اُڑانا شرافت اور انسانیت سے بعید ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ملائم لہجہ میں کہا۔ ایسے حالات میں ہم صرف قیاس کرسکتے ہیں اور

قیاسات ہمیشہ پورے نہیں اُترتے۔ آپ کو زیر باری ضرور ہوئی۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ پر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا مقصود آپ کو مغالطہ دینا نہ تھا۔

شیو داس بڑے دنوں کی تعطیل میں گھر آیا ہوا تھا۔ عین اُسی وقت کمرہ میں آگیا اور دونوں آدمیوں کی باتیں سُن کر بولا۔ ڈاکٹرصاحب۔ فادر کے الفاظ ضرور ناملائم ہیں لیکن آپ اُن کی مشکلات کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔ اگر ناگوارِ خاطر گذرے ہوں تو معاف فرمائیے گا۔

منشی جی نے شیو داس کی طرف نگاہِ محبت سے دیکھ کر کہا۔ تمھارے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تم سے کتنی بار کہہ چکا کہ اس کمرہ میں مت آیا کرو۔ یہ مرض متعدی ہے۔ لیکن تمھیں خبر ہی نہیں ہوتی۔

شیو داس نے نادم ہوکر کہا۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں آپ ناراض نہ ہوں۔ میں صرف ڈاکٹرصاحب سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ بھائی صاحب کے لیے اب کیا کرنا چاہیے۔

ڈاکٹرصاحب نے جواب دیا۔ اب صرف ایک ہی تدبیر باقی ہے۔ اِنھیں اِٹلی کے کسی سینی ٹوریم (Sanatorium) میں بھیج دینا چاہیے۔

منشی اُلفت رائے ایسے چونک پڑے گویا نیند سے جاگے ہوں اور پوچھا کتنا صرفہ ہوگا؟

"زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار"

"آپ کو کامل یقین ہے کہ یہ وہاں سے اچھے ہوکر آئیں گے"

"ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک خوفناک مرض ہے۔ معمولی بیماریوں میں بھی قطعی طور پر کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔

"اتنا خرچ کرنے پر بھی یہ وہاں سے جوں کے توں لوٹ آئے تو؟"

"تو پرماتما کی مرضی۔ آپ کو صرف یہ تسکین ہوجائے گی کہ اِن کے لیے آپ جو کچھ کرسکتے تھے اِس سے زیادہ کسی انسان کے امکان میں نہ تھا۔"

(۴)

گھر میں آدھی رات تک پربھو داس کو اِٹلی بھیجنے کے مسئلہ پر ردّ و کد ہوتی رہی۔ منشی جی کی دلیل تھی کہ ایک مشتبہ نتیجہ کے لیے پانچ ہزار روپے خرچ کرنا۔ آئینِ دانشمندی کے خلاف ہے۔ شیو داس بھی ان کا ہم خیال تھا۔ لیکن اُس کی ماں بڑے شدّ و مد سے اس تجویز کی معاونت کر رہی تھی۔ آخر ماں کی لعن و طعن کا یہ نتیجہ ہوا کہ شیو داس شرمندہ ہوکر اُس سے متفق ہوگیا۔ منشی جی تنہا رہ گئے۔ تپیسری نے دلیلوں سے کام لیا۔ اُلفتِ پدری کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کی۔ دولت اور دنیا کی بے ثباتی کے ضرب المثل سُنائے اور جب ان اسلحوں سے کوئی اثر نہ ہوا تو رونے لگی۔

منشی جی اِس سیلاب کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ بولے، اچھا بھئی روؤ مت جو تم کہتی ہو وہی ہوگا۔

تپیسری نے پوچھا، تو کب؟

"روپے ہاتھ میں آنے دو"

"تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ بھیجنا منظور نہیں"

"بھیجنا منظور ہے مگر آج کل ہاتھ خالی ہے۔ کیا تمھیں معلوم نہیں؟

"بینک میں تو روپے جمع ہیں؟ جائداد تو ہے؟

اُلفت رائے نے بی بی کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا اُسے کھا جائیں گے اور ایک لمحہ کے بعد بُولے بالکل بے وقوف ہو۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اِٹلی میں کوئی دوسرا خدا ہے۔ یا وہاں کوئی آبِ حیات کا چشمہ ہے۔ جب وہاں بھی تقدیر کا امتحان ہی کرنا ہے تو اطمینان سے کرلیں گے۔ بزرگوں کی جائداد اور بینک کی امانت ایک موہوم اُمید کے لیے تلف نہیں کرسکتا۔

تپیسری نے ڈرتے ڈرتے کہا، آخر اس میں نصف حصہ پربھو داس کا بھی تو ہے؟

منشی جی نے اُس کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھ کر کہا، آدھا نہیں میں اُس پر اپنا سب کچھ نثار کردیتا اگر اس سے کچھ امید فلاح ہوتی، وہ خاندان کی حیثیت اور وقار میں کچھ اضافہ کرتا۔ کچھ خاندان کا نام روشن کرتا۔ محض جذبات کی رو میں آکر میں اتنے روپے پانی میں نہیں ڈال سکتا۔

تپسری لاجواب ہوگئی۔ جیت کر بھی اُس کی ہار ہوئی۔

اِس واقعہ کے چھؔ مہینے بعد شیو داس بی ۔ اے ۔ پاس ہوا۔ تو منشی جی نے اپنی موروثی جائداد کے دوؔ آنے رہن کرکے اُسے تحصیل قانون کے لیے انگلینڈ بھیجا۔ اُسے بمبئی تک خود پہنچانے گئے۔ وہاں سے لوٹے تو ان کا دل بڑے بڑے ارادوں سے بھرا ہوا تھا۔ اُنھوں نے ایک ایسے چلتے ہوئے کام میں روپے لگائے تھے جس سے بے اندازہ نفع ہونے کی امید تھی۔

اُن کی واپسی کے ایک ہفتہ بعد بدنصیب پربھو داس اپنی آرزوئیں لیے دنیا سے رخصت ہوگیا۔

(۵)

منشی اُلفت رائے اپنے عزیزوں کے ساتھ من کرنکا گھاٹ پر بیٹھے ہوئے چتا کے شعلوں کی طرف تاک رہے تھے۔ آنکھوں سے جوئے اشک جاری تھا۔ بیٹے کا غم ایک لمحہ کے لیے اصولِ کفایت پر غالب آگیا تھا۔ اِس عالمِ یاس میں اُنھیں یہ خیال ستا رہا تھا۔ کہ شاید پربھو داس اِٹلی جاکر اچھا ہوجاتا۔ افسوس! میں نے پانچ ہزار کا مُنہ دیکھا اور اپنے لال بے بہا کو ہاتھ سے کھو دیا۔ لمحہ بہ لمحہ یہ خیال ایک درد کی صورت اختیار کرتا جاتا تھا اور ان کے دل کو غم اور تاسف کے تیروں سے چھید رہا تھا۔ ان کے اندر کی آگ اِس چتا کے شعلہ سے کم جان سوز نہ تھی۔

دفعتاً اُن کے کانوں میں شہنائیوں کی آواز آئی، آنکھیں اوپر اُٹھائیں تو آدمیوں کا ایک انبوہ ایک میت کے ساتھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سب ڈھول بجاتے گاتے پھولوں کی بوچھار کرتے ہوئے چلے آتے تھے۔ گھاٹ پر پہنچ کر انھوں نے جنازہ اُتار کر رکھ دیا۔ اور لکڑیوں کی چتا بنانے لگے۔ اُن میں سے ایک شخص منشی جی کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ نوجوان تھا لیکن منشی جی کو اُس کے چہرہ پر ہمدردی کی جھلک دکھائی دی۔ پوچھا کس محلّہ میں رہتے ہو؟

نوجوان نے جواب دیا۔ ہمارا گھر دیہات میں ہے۔ کل شام کو چلے تھے۔ یہ ہمارے باپ تھے۔ ہم لوگ گنگا کنارے بہت کم آتے ہیں لیکن دادا نے مرتے دم کہا تھا کہ ہمیں من کرنکا گھاٹ لے جانا۔ تو اُن کی بات کیسے ٹالتے!

اُلفت رائے۔ یہ سب آدمی تمھارے ہی ساتھ ہیں؟

نوجوان۔ جی ہاں اور لوگ پیچھے آرہے ہیں کوئی دوسو آدمی ساتھ ہیں۔ یہاں تک آنے میں سیکڑوں روپے اُٹھ گئے۔ پر سوچتا ہوں بوڑھے باپ کی مُکت تو بن گئی۔ دھن دولت اور ہے ہی کس لیے؟

اُلفت رائے۔ انھیں کیا بیماری تھی؟

نوجوان نے بڑی سادگی سے کہا گویا وہ اپنے کسی عزیز سے باتیں کر رہا ہو۔ اس کی باتوں میں حجاب یا پردہ داری کو مطلق دخل نہ تھا۔ بیماری کا تو کسی کو کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ کوئی کچھ کہتا تھا۔ کوئی کچھ۔ آٹھوں پہر بخار چڑھا رہتا۔ سوکھ کر کانٹا ہوگئے تھے۔ تین سال تک کھاٹ پر پڑے رہے۔ جس نے جو دوا بتائی وہ کی۔ جہاں بتایا وہاں لے کر گئے۔ چترکوٹ۔ ہردوآر، رشی کیش۔ پراگ۔ سبھی تیرتھوں میں لیے لیے پھرے۔ حکیموں۔ بیدوں نے جو کچھ کہا اُس میں کسر نہیں رکھی۔ پر بھاگ میں جو لکھا تھا وہ کیسے ٹلتا۔

اتنے میں اُس کا ایک دوسرا ساتھی آگیا اور بولا، صاحب مُنہ دیکھی بات نہیں کہتا۔ نارائن لڑکا دے تو ایسا دے۔ اِس نے دوا درپَن میں روپیوں کو ٹھیکری سمجھا۔ گھر کی ساری پونجی خرچ کردی۔ یہاں تک کہ جگہ زمین کی بھی پرواہ نہ کی۔ اب ایک اُنگل بھر جگہ نہیں رہی۔ لیکن موت سے کیا قابو۔

نوجوان نے آبدیدہ ہوکر کہا۔ بھیّا روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ کہاں آتا ہے کہاں جاتا ہے لیکن گھر کا آدمی نہیں ملتا۔ زندگی ہے تو کما کھاؤں گا پر دل میں یہ ہوس تو نہیں رہ گئی کہ ہائے یہ نہیں کیا، اُس وید کے پاس نہیں گیا۔ نہیں تو شاید یہ اچھے ہوجاتے۔ ہم تو کہتے ہیں اب بھی کوئی دادا کو ایک بول بُلا دے تو ہم اپنا گھردُوار بیچ کر اُس کی غلامی کریں۔ سنسار میں اور ہے کیا۔ اسی مایا موہ کا نام تو زندگی ہے۔ دھن سے پیاری جان ہوتی ہے۔ اور جان سے پیارا ایمان۔ بابوصاحب آپ تو میرے باپ کے برابر ہیں۔ آپ سے کیا کہوں۔ اگر میں دادا کے لیے کوئی بات اُٹھا رکھتا تو آج روتے نہ بنتی۔ اپنا ہی دل اپنے تئیں دھکّارتا۔ نہیں تو اس گھڑی مجھے ایسا جان پڑتا ہے کہ میرے سر سے ایک فرض کا بوجھ اُتر گیا۔ اُن کی آتما سکھ سے رہے گی تو میری بھلائی ہوگی۔

منشی اُلفت رائے سر جھکائے یہ باتیں سُنتے رہے۔ اس کا ایک ایک لفظ تیر کی طرح

ان کے جگر میں چبھتا جاتا تھا۔ اس سعادت مندی اور فیاضانہ فرض پروری کی روشنی میں انھیں اپنی مادہ پرستی، اپنی سفلہ طبعی، اپنی سنگدلی، اپنی بے حسی نہایت مکروہ نظر آرہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اِسی چتا میں جا بیٹھوں۔ اور زندگی کا خاتمہ کردوں۔

ہندی ماہنامہ سرسوتی جون 1920 کے شمارہ میں شائع ہوا۔ بعد میں اردو ماہنامہ زمانہ کے جولائی 1920 میں شائع ہوا۔ کسی اردو مجموعہ میں شامل نہیں ہے ہندی میں گپت دھن نمبر 2 میں پتر پریم کے عنوان سے شامل ہے۔

بوڑھی کاکی

بڑھاپا اکثر بچپن کا دورِ ثانی ہوا کرتا ہے۔ بوڑھی کاکی میں ذائقہ کے سوا اور کوئی حسّ باقی نہ تھی اور نہ اپنی شکایتوں کی طرف مخاطب کرنے کا رونے کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ۔ آنکھیں۔ ہاتھ۔ پیر سب جواب دے چکے تھے۔ زمین پر پڑی رہتیں اور جب گھر والے کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف کرتے۔ کھانے کا وقت ٹل جاتا یا مقدار کافی نہ ہوتی یا بازار سے کوئی چیز آتی اور انھیں نہ ملتی۔ تو رونے لگتی تھیں اور ان کا رونا محض بسورنا نہ تھا۔ وہ بہ آوازِ بلند روتی تھیں۔ ان کے شوہر کو مرے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا۔ سات بیٹے جوان ہو ہو کر داغ دے گئے۔ اور اب ایک بھتیجے کے سوا دُنیا میں، اُن کا اور کوئی نہ تھا۔ اسی بھتیجے کے نام انھوں نے اپنی ساری جائداد لکھ دی تھی۔ ان حضرت نے لکھاتے وقت تو خوب لمبے چوڑے وعدے کیے۔ لیکن وہ وعدے صرف قلی ڈپو کے دلالوں کے سبز باغ تھے۔ اگرچہ اس جائداد کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ دوسو روپے سالانہ سے کم نہ تھی۔ لیکن بوڑھی کاکی کو اب پیٹ بھر روکھا دانہ بھی مشکل سے ملتا تھا۔ اس میں پنڈت بدھ رام کی خطا تھی یا ان کی بیوی روپا کی۔ اس کا تصفیہ کرنا مشکل ہے۔ بدھ رام طبیعت کے نیک آدمی تھے۔ لیکن اسی وقت تک کہ ان کی جیب پر کوئی آنچ نہ آئے۔ روپا طبیعت کی تیز تھی۔ لیکن ایشور سے ڈرتی تھی۔ اس لیے بوڑھی کاکی پر اس کی تیزی اتنی نہ کھلتی تھی۔ جتنی بدھ رام کی نیکی۔

بدھ رام کو کبھی کبھی اپنی بے انصافی کا احساس ہوتا۔ وہ سوچتے کہ اسی جائداد کی بدولت میں اس وقت بھلا آدمی بنا بیٹھا ہوں اور اگر زبانی تسکین یا تشفی سے صورت حال میں کچھ اصلاح ہوسکتی۔ تو انھیں مطلق دریغ نہ ہوتا۔ لیکن مزید خرچ کا خوف ان کی نیکی کو دبائے رکھتا تھا۔ اس کے برعکس اگر دروازہ پر کوئی بھلا مانس بیٹھا ہوتا اور بوڑھی کاکی اپنا نغمہ بے ہنگام شروع کردیتیں۔ تو وہ آگ ہوجاتے تھے اور گھر میں آکر انھیں زور سے ڈانٹتے تھے۔ لڑکے جنھیں بڈھوں سے ایک بغض للہ ہوتا ہے۔ والدین کا یہ رنگ دیکھ کر بوڑھی

کاکی کو اور بھی دق کرتے۔ کوئی چٹکی لے کر بھاگتا۔ کوئی ان پر پانی کی کلی کر دیتا۔ کاکی چیخ مار کر روتیں۔ لیکن یہ تو مشہور ہی تھا کہ وہ صرف کھانے کے لیے روتی ہیں۔ اس لیے کوئی ان کے نالہ و فریاد پر دھیان نہ دیتا تھا۔ ہاں اگر کاکی کبھی غصہ میں آکر لڑکوں کو گالیاں دینے لگتیں تو روپا موقع واردات پر ضرور جاتی۔ اس خوف سے کاکی اپنی شمشیر زبانی کا شاذ ہی کبھی استعمال کرتی تھیں۔ حالانکہ رفع شر کی یہ تدبیر رونے سے زیادہ کارگر تھی۔

سارے گھر میں اگر کسی کو کاکی سے محبت تھی۔ تو وہ بدھ رام کی چھوٹی لڑکی لاڈلی تھی۔ لاڈلی اپنے دونوں بھائیوں کے خوف سے اپنے حصّے کی مٹھائی یا چبینا بوڑھی کاکی کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتی تھی۔ یہی اس کا ملجا تھا۔ اور اگرچہ کاکی کی پناہ ان کی سائلانہ سرگرمی کے باعث بہت گراں پڑتی تھی۔ لیکن بھائیوں کے دست تطاول سے بدرجہا قابلِ ترجیح تھی۔ اس مناسبت اغراض نے ان دونوں میں محبت اور ہمدردی پیدا کر دی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ بُدھ رام کے دروازے پر شہنائی بج رہی تھی۔ اور گاؤں کے بچوں کا جم غفیر نگاہِ حیرت سے گانے کی داد دے رہا تھا۔ چارپائیوں پر مہمان لیٹے ہوئے نائیوں سے مکّیاں لگوا رہے تھے۔ قریب ہی ایک بھاٹ کھڑا کبت سُنا رہا تھا اور بعض سخن فہم مہمانوں کی واہ واہ سے ایسا خوش ہوتا تھا۔ گویا وہی اس داد کا مستحق ہے۔ دو ایک انگریزی پڑھے ہوئے نوجوان ان بے ہودگیوں سے بیزار تھے۔ وہ اس دہقانی مجلس میں بولنا یا شریک ہونا اپنی شان کے خلاف سمجھتے۔ آج بُدھ رام کے بڑے لڑکے سکھ رام کا تِلک آیا ہے۔ یہ اسی کا جشن ہے۔ گھر میں مستورات گا رہی تھیں اور رُوپا مہمانوں کی دعوت کے سامان کرنے میں مصروف تھی۔ بھٹوں پر کڑاہ چڑھے ہوئے تھے۔ ایک میں پوریاں کچوریاں نکل رہی تھیں۔ دوسرے میں سموسے اور پٹیراکیں بنتی تھیں۔ ایک بڑے ہنڈے میں مصالحے دار ترکاری پک رہی تھی۔ گھی اور مصالحے کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

بوڑھی کاکی اپنی اندھیری کوٹھڑی میں خیال غم کی طرح بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ لذّت آمیز خوش بو انھیں بے تاب کر رہی تھی۔ وہ دل میں سوچتی تھیں۔ شاید مجھے پوریاں نہ ملیں گی اتنی دیر ہوگئی۔ کوئی کھانا لے کر نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ لوگ سب کھا گئے ہیں۔ میرے لیے کچھ نہ بچا، یہ سوچ کر انھیں بے اختیار رونا آیا۔ لیکن شگون کے خوف

سے رو نہ سکیں۔

آہا! کیسی خوش بو ہے۔ اب مجھے کون پوچھتا ہے۔ جب روٹیوں ہی کے لالے ہیں تو ایسے نصیب کہاں کہ پوریاں پیٹ بھر ملیں۔ یہ سوچ کر انھیں پھر بے اختیار رونا آیا۔ کلیجہ میں ایک ہوک سی اٹھنے لگی۔ لیکن روپا کے خوف سے انھوں نے پھر ضبط کیا۔

بوڑھی کاکی دیر تک انھیں افسوسناک خیالوں میں ڈوبی رہیں۔ گھی اور مصالحے کی خوش بو رہ رہ کر دل کو آپے سے باہر کیے دیتی تھی۔ منہ میں پانی بھر بھر آتا تھا۔ پوریوں کا ذائقہ یاد کرکے دل میں گدگدی ہونے لگتی تھی۔ "کسے پکاروں آج لاڈلی بھی نہیں آئی۔ دونوں لونڈے روز دق کیا کرتے ہیں۔ آج ان کا بھی کہیں پتہ نہیں کچھ معلوم ہوتا۔ کہ کیا بن رہا ہے۔"

بوڑھی کاکی کی چشمِ خیال میں پوریوں کی تصویر ناچنے لگی۔ خوب لال لال پھولی پھولی نرم نرم ہوں گی۔ روپا نے خوب مائن دیا ہوگا۔ کچوریوں میں اجوائن اور الائچی کی مہک آرہی ہوگی۔ ایک پوری ملتی تو ذرا ہاتھ میں لے کر دیکھتی۔ کیوں نہ چل کر کڑاہ کے سامنے ہی بیٹھوں۔ پوریاں چھن چھن کرکے کڑاہ میں تیرتی ہوں گی۔ کڑاہ سے گرماگرم نکل کر کٹھوتے میں رکھی جاتی ہونگی۔" پھول ہم گھر میں بھی سونگھ سکتے ہیں۔ لیکن سیر باغ کا کچھ اور ہی لطف ہے۔

اس طرح فیصلہ کرکے بوڑھی کاکی اکڑو بیٹھ کر ہاتھوں کے بل کھسکتی ہوئی بمشکل تمام چوکھٹ سے اتریں اور دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی کڑاہ کے پاس جا بیٹھیں۔ یہاں انھیں کچھ وہی تسکین ہوئی جو کسی بھوکے کتّے کو کھانے والے کے سامنے بیٹھنے میں ہوتی ہے۔

روپا اس وقت ایک سراسیمگی کی حالت میں تھی۔ کبھی اس کمرے میں جاتی۔ کبھی اس کمرے میں۔ کبھی کڑاہ کے پاس۔ کبھی کوٹھے پر۔ کسی نے باہر سے آکر کہا۔ "مہراج ٹھنڈائی مانگ رہے ہیں۔" ٹھنڈائی دینے لگی۔ اتنے میں پھر کسی نے آکر کہا۔ بھاٹ آیا ہے۔ اُسے کچھ دے دو۔ بھاٹ کے لیے سیدھا نکال رہی تھی۔ کہ ایک تیسرے آدمی نے آکر پوچھا۔ "ابھی کھانا تیار ہونے میں کتنی دیر ہے؟ ذرا ڈھول مجیرا اتار دو۔" بیچاری اکیلی عورت۔ چاروں طرف دوڑتے دوڑتے حیران ہورہی تھی۔ جھنجلاتی تھی۔ کڑھتی تھی۔ پر غصہ باہر نکلنے کا موقع نہ پاتا تھا۔ خوف ہوتا تھا۔ کہیں پڑوسنیں یہ نہ کہنے لگیں کہ اتنے ہی میں اُبل

پڑیں۔ پیاس سے خود اس کا حلق سوکھا جاتا تھا۔ گرمی کے مارے پھُنکی جاتی تھی۔ لیکن اتنی فرصت کہاں کہ ذرا پانی پی لے یا پنکھا لے کر جھلے۔ یہ بھی اندیشہ تھا۔ کہ ذرا نگاہ ہٹی۔ اور چیزوں کی لوٹ مچی۔ اس کشمکش کے عالم میں اس نے بوڑھی کاکی کو کڑاہ کے پاس بیٹھے دیکھا۔ تو جل گئی۔ غصہ نہ رک سکا یہ خیال نہ رہا کہ پروسنیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ دل میں کیا کہیں گی۔ مردانے میں لوگ سنیں گے۔ تو کیا کہیں گے۔ جیسے مینڈک کیچوے پر جھپٹتا ہے۔ اسی طرح وہ بوڑھی کاکی پر جھپٹی۔ اور انھیں دونوں ہاتھوں سے جھنجوڑ کر بولی۔ ''ایسے پیٹ میں آگ لگے۔ پیٹ ہے کہ آگ کا کنڈ ہے۔ کوٹھڑی میں بیٹھتے کیا دم گھٹتا تھا۔ ابھی مہمانوں نے نہیں کھایا۔ دیوتاؤں کا بھوگ تک نہیں لگا۔ تب تک صبر نہ ہو سکا۔ آکر چھاتی پر سوار ہو گئیں۔ نوج ایسی جیبھ۔ دن بھر کھاتی نہ رہتیں۔ تو نہ جانے کس کی ہانڈی میں منہ ڈالتیں۔ گاؤں دیکھے گا۔ تو کہے گا کہ بڑھیا بھرپیٹ کھانے کو نہیں پاتی۔ تب ہی تو اس طرح بوکھلائی پھرتی ہے۔ (اس خیال سے اس کا غصہ اور بھی تیز ہوگیا)۔ ڈائن نہ مرے۔ نہ ماچا چھوڑے۔ نام بیچنے پر لگی ہے۔ ناک کٹوا کے دم لے گی۔ اتنا ٹھونستی ہے۔ نہ جانے کہاں بھسم ہو جاتا ہے۔ لے بھلا چاہتی ہو تو جاکر کوٹھڑی میں بیٹھو۔ جب گھر کے لوگ کھانے لگیں گے تو تمھیں بھی ملے گا۔ تم کوئی دیوی نہیں ہو کہ چاہے کسی کے منہ میں پانی تک نہ جائے۔ لیکن پہلے تمھاری پوجا کر دے۔

بوڑھی کاکی نے سر نہ اُٹھایا۔ نہ روئیں۔ نہ بولیں۔ چپ چاپ رینگتی ہوئی وہاں سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ صدمہ ایسا سخت تھا۔ کہ دل و دماغ کی ساری قوتیں۔ سارے جذبات ساری حسیات اسی طرف رجوع ہو گئی تھیں۔ جیسے ندی میں جب کراڑ کا کوئی بڑا ٹکڑا کٹ کر گرتا ہے تو آس پاس کا پانی چاروں طرف سے سمٹ کر اسی خلا کو پورا کرنے کے لیے دوڑتا ہے۔

(۲)

کھانا تیار ہوگیا۔ آنگن میں پتّل پڑ گئے۔ مہمان کھانے لگے۔ عورتوں نے جیونار گانا شروع کیا۔ مہمانوں کے نائی اور خدمت گار بھی اسی جماعت کے ساتھ پر ذرا ہٹ کر کھانے بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن آدابِ مجلس کے مطابق جب تک سب کے سب کھا نہ چکیں۔ کوئی اُٹھ نہ سکتا تھا۔ دو ایک مہمان جو ذرا تعلیم یافتہ تھے۔ خدمت گاروں کی پُرخوری

پر جھنجلا رہے تھے۔ وہ اس قید کو بے معنی و مہمل سمجھتے تھے۔

بوڑھی کاکی اپنی کوٹھڑی میں جاکر پچتا رہی تھیں کہ کہاں سے کہاں گئی۔ انھیں روپا پر غصہ نہیں تھا۔ اپنی عجلت پر افسوس تھا۔ سچ تو ہے۔ جب تک مہمان لوگ کھا نہ چکیں گے۔ گھر والے کیسے کھائیں گے۔ مجھ سے اتنی دیر بھی نہ رہا گیا۔ سب کے سامنے پانی اتر گیا۔ اب جب تک کوئی بلانے نہ آئے گا نہ جاؤں گی۔

دل میں یوں فیصلہ کرکے وہ خموشی سے بلاوے کا انتظار کرنے لگیں۔ لیکن گھی کی مرغوب خوشبو بہت صبر آزما ثابت ہورہی تھی۔ انھیں ایک ایک لمحہ ایک ایک گھنٹہ معلوم ہوتا تھا۔ اب پتّل بچھ گئے ہونگے۔ اب مہمان آگئے ہوں گے۔ لوگ ہاتھ پیر دھورہے ہیں۔ نائی پانی دے رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ لوگ کھانے پر بیٹھ گئے۔ جیونار گایا جارہا ہے۔ یہ سوچ کر بہلانے کے لیے لیٹ گئیں اور دھیرے دھیرے ایک گیت غنغنانے لگیں۔ انھیں معلوم ہوا کہ مجھے گاتے بہت دیر ہوگئی۔ کیا اتنی دیر تک لوگ کھا ہی رہے ہونگے۔ کسی کی بول چال نہیں سُنائی دیتی۔ ضرور لوگ کھا پی کے چلے گئے۔ مجھے کوئی بلانے نہیں آیا۔ روپا چڑگئی ہے۔ کیا جانے نہ بلائے۔ سوچتی ہو کہ آپ ہی آئیں گی۔ کوئی مہمان نہیں۔ کہ بُلاؤں۔

بوڑھی کاکی چلنے کے لیے تیار ہوئیں۔ یہ یقین کہ اب ایک لمحہ میں پوریاں اور مصالحے دار ترکاریاں سامنے آئیں گی۔ ان کے حسِ ذائقہ کو گدگُدانے لگا۔ انھوں نے دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھے۔ ''پہلے ترکاری سے پوریاں کھاؤں گی۔ پھر وہی اور شکر سے۔ کچوریاں رائتے کے ساتھ مزے دار معلوم ہوں گی۔ چاہے کوئی بُرا مانے یا بھلا۔ میں تو مانگ مانگ کر کھاؤں گی۔ یہی نہ لوگ کہیں گے۔ انھیں لحاظ نہیں ہے۔ کہا کریں۔ اتنے دنوں کے بعد پوریاں مل رہی ہیں تو منہ جھوٹا کرکے تھوڑے ہی اُٹھ آؤں گی۔''

وہ اُکڑو بیٹھ کر ہاتھوں کے بل کھسکتی ہوئی آنگن میں آئیں۔ مگر وائے قسمت! اشتیاق نے اپنی پرانی عادت کے مطابق وقت کا غلط اندازہ کیا تھا۔ مہمانوں کی جماعت ابھی بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی کھا کر انگلیاں چاٹتا تھا۔ اور کنکھیوں سے دیکھتا تھا کہ اور لوگ ابھی کھا رہے ہیں یا نہیں۔ کوئی اس فکر میں تھا کہ پتّل پر پوریاں چھوٹی جاتی ہیں۔ کاش کسی طرح انھیں اندر رکھ لیتا۔ کوئی دہی کھاکے زبان چٹخارتا تھا۔ لیکن دوسرا شکورا مانگتے ہوئے شرماتا

تھا کہ اتنے میں بوڑھی کاکی رینگتی ہوئی ان کے بیچ میں جا پہنچیں۔ کئی آدمی چونک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آوازیں آئیں۔"ارے یہ کون بڑھیا ہے؟ یہ کہاں سے آگئی؟ دیکھ کسی کو چھو مت رے!"

پنڈت بُدھو رام کاکی کو دیکھتے ہی غصہ سے تلملا گئے۔ پوریوں کا تھال لیے کھڑے تھے۔ تھال کو زمین پر پٹک دیا اور جس طرح بے رحم ساہوکار اپنے کسی نادہند مفرور اسامی کو دیکھتے ہی جھپٹ کر اس کا ٹیٹوا لیتا ہے۔ اسی طرح لپک کر انھوں نے بوڑھی کاکی کے دونوں شانے پکڑے اور گھسیٹتے ہوئے لاکر انھیں اس اندھیری کوٹھڑی میں دھم سے گرا دیا۔ آرزوؤں کا سبز باغ لُو کے ایک ہی جھونکے میں ویران ہوگیا!

مہمانوں نے کھانا کھایا۔ گھر والوں نے کھایا۔ باجے والے دھوبی۔ چمار بھی کھا چکے لیکن بوڑھی کاکی کو کسی نے نہ پُوچھا۔ بُدھورام اور روپا دونوں ہی انھیں ان کی بے حیائی کی سزا دینے کا تہیہ کرچکے تھے۔ ان کے بڑھاپے پر۔ بے کسی پر فتورِ عقل پر کسی کو ترس نہیں آتا تھا۔ اکیلی لاڈلی ان کے لیے کڑھ رہی تھی۔

لاڈلی کو کاکی سے بہت اُنس تھا۔ بے چاری بھولی۔ سیدھی لڑکی تھی۔ طفلانہ شوخی اور شرارت کی اُس میں بُو تک نہ تھی۔ دونوں بار جب اس کے باپ اور ماں نے کاکی کو بے رحمی سے گھسیٹا۔ تو لاڈلی کا کلیجہ اینٹھ کر رہ گیا۔ وہ جھنجلا رہی تھی۔ کہ یہ لوگ کاکی کو کیوں بہت سی پوریاں نہیں دے دیتے۔ کیا مہمان سب کی سب تھوڑے ہی کھا جائیں گے۔ اور اگر کاکی نے مہمانوں سے پہلے ہی کھا لیا تو کیا بگڑ جائے گا؟ وہ کاکی کے پاس جاکر انھیں تشفی دینا چاہتی تھی۔ لیکن ماں کے خوف سے نہ جاتی تھی۔ اس نے اپنے حصے کی پُوریاں مطلق نہ کھائی تھیں۔ اپنی گڑیوں کی پٹاری میں بند کررکھی تھیں۔ وہ یہ پوریاں کاکی کے پاس لے جانا چاہتی تھی۔ اس کا دل بے قرار ہورہا تھا۔ بوڑھی کاکی میری آواز سنتے ہی اُٹھ بیٹھیں گی۔ پوریاں دیکھ کر کیسی خوش ہوں گی۔ مجھے خوب پیار کریں گی۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ روپا آنگن میں پڑی سو رہی تھی۔ لاڈلی کی آنکھوں میں نیند نہ آتی تھی۔ کاکی کو پوریاں کھلانے کی خوشی اُسے سونے نہ دیتی تھی۔ اُس نے گڑیوں کی پٹاری سامنے ہی رکھی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ اماں غافل سو رہی ہیں تو وہ چپکے سے اُٹھی اور سوچنے لگی۔ کہ کیسے چلوں۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ صرف چولہوں میں آگ

چمک رہی تھی اور چولھوں کے پاس ایک کُتا لیٹا ہوا تھا۔ لاڈلی کی نگاہ دروازے والے نیم کے درخت کی طرف گئی۔ اسے معلوم ہوا۔ کہ اس پر ہنومان جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی دُم۔ ان کی گدا سب صاف نظر آتی تھی۔ مارے خوف کے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اتنے میں کتا اُٹھ بیٹھا۔ لاڈلی کو ڈھارس ہوئی۔ کئی سوتے ہوئے آدمیوں کی نسبت ایک جاگتا ہوا کُتا اس کے لیے زیادہ تقویت کا باعث ہوا۔ اس نے پٹاری اُٹھائی۔ اور بوڑھی کاکی کی کوٹھڑی کی طرف چلی۔

(۳)

بوڑھی کاکی کو محض اتنا یاد تھا کہ کسی نے میرے شانے پکڑے۔ پھر انھیں ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی پہاڑ پر اُڑائے لیے جاتا ہے۔ ان کے پَیر باربار پتھروں سے ٹکرائے۔ تب کسی نے انھیں پہاڑ پر سے پٹک دیا۔ وہ بے ہوش ہوگئیں۔

جب ان کے ہوش بجا ہوئے۔ تو کسی کی ذرا بھی آہٹ نہ ملتی تھی۔ سمجھ گئیں۔ کہ سب لوگ کھا پی کر سوگئے۔ اور ان کے ساتھ میری تقدیر بھی سوگئی۔ رات کیسے کٹے گی۔ رام! کیا کھاؤں؟ پیٹ میں آگ جل رہی ہے۔ ہا! کسی نے میری سدھ نہ لی۔ کیا میرا ہی پیٹ کاٹنے سے دھن ہوجائے گا؟ ان لوگوں کو اتنی دیا بھی نہیں آتی کہ بڑھیا نہ جانے کب مرجائے۔ اس کا رویاں کیوں دکھائیں۔ میں پیٹ کی روٹیاں ہی کھاتی ہوں کہ اور کچھ۔ اس پر یہ حال۔ میں اندھی اپاہج ٹھہری۔ نہ کچھ سُوجھے نہ بُوجھے۔ اگر آنگن میں چلی گئی۔ تو کیا بدھ رام سے اتنا کہتے نہ بنتا تھا کہ کاکی ابھی لوگ کھا رہے ہیں۔ پھر آنا؟ مجھے گھسیٹا۔ پٹکا۔ انھیں پوریوں کے لیے روپا نے سب کے سامنے گالیاں دیں۔ انھیں پوریوں کے لیے اور اتنی دُرگت کرکے بھی ان کا پتھر کا کلیجہ نہ پسیجا۔ سب کو کھلایا میری بات نہ پوچھی۔ جب تب ہی نہ دیا۔ تو اب کیا دیں گی، یہ سوچ کر مایوسانہ صبر کے ساتھ لیٹ گئیں۔ رقت سے گلا بھر بھر آتا تھا۔ لیکن مہمانوں کے لحاظ سے روتی نہ تھیں۔

یکایک ان کے کان میں آواز آئی۔ ”کاکی اُٹھو۔ میں پوریاں لائی ہوں۔“

کاکی نے لاڈلی کی آواز پہچانی۔ چٹ پٹ اُٹھ بیٹھیں۔ دونوں ہاتھوں سے لاڈلی کو ٹٹولا۔ اور اسے گود میں بٹھالیا۔ لاڈلی نے پوریاں نکال کردیں۔ کاکی نے پوچھا۔ ”کیا تمھاری امّاں نے دی ہیں؟“

لاڈلی نے فخر سے کہا۔ "نہیں یہ میرے حصّے کی ہیں۔"

کاکی پوریوں پر ٹوٹ پڑیں۔ پانچ منٹ میں پٹاری خالی ہوگئی۔ لاڈلی نے پوچھا۔ کاکی پیٹ بھر گیا؟"

جیسے تھوڑی سی بارش ٹھنڈک کی جگہ اور بھی ہمس پیدا کردیتی ہے۔ اسی طرح ان چند پوریوں نے کاکی کی اشتہا اور رغبت کو اور بھی تیز کردیا تھا۔ بولیں۔ نہیں بیٹی! جاکے اماں سے اور مانگ لاؤ۔"

لاڈلی۔ "اماں سوتی ہیں۔ جگاؤں گی تو ماریں گیں۔"

کاکی نے پٹاری کو پھر ٹٹولا۔ اس میں چند ریزے گرے تھے۔ انھیں نکال کر کھا گئیں۔ بار بار ہونٹ چاٹتی تھیں۔ چٹخارے بھرتی تھیں۔ دل مسوس رہا تھا۔ کہ اور پوریاں کیسے پاؤں؟ صبر کا باندھ جب ٹوٹ جاتا ہے تو خواہش کا بہاؤ قابو سے باہر ہوجاتا ہے۔ مستوں کو سرود کی یاد دلانا انھیں دیوانہ بنانا ہے۔ کاکی کا بیتاب دل خواہش کے اس بہاؤ میں بہہ گیا۔ حلال حرام کی تمیز نہ رہی۔ وہ کچھ دیر تک اس خواہش کو روکتی رہیں۔ یکایک لاڈلی سے بولیں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے چلو۔ جہاں مہمانوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔

لاڈلی اس کا منشا نہ سمجھ سکی۔ اس نے کاکی کا ہاتھ پکڑا اور انھیں لاکر جھوٹے پتلوں کے پاس بٹھا دیا اور غریب بھوک کی ناری۔ فاتر العقل بڑھیا پتلوں سے پوریوں کے ٹکڑے چُن چُن کر کھانے لگی۔ وہی کتنا لذیذ تھا۔ سالن کتنا مزہ دار کچوریاں کتنی سلونی سموسے کتنے خستہ اور نرم؟

کاکی فتورِ عقل کے باوجود جانتی تھیں کہ میں وہ کر رہی ہوں جو مجھے نہ کرنا چاہیے۔ میں دوسروں کے جھوٹے پتّل چاٹ رہی ہوں۔ لیکن بڑھاپے کی حرص مرض کا آخری دور ہے۔ جب سارے حواس ایک ہی مرکز پر آکر جمع ہوجاتے ہیں۔ بوڑھی کاکی میں یہ مرکز ان کا حسِّ ذائقہ تھا۔

عین اسی وقت روپا کی آنکھ کھلی۔ اسے معلوم ہوا کہ لاڈلی میرے پاس نہیں ہے چونکی چارپائی کے اِدھراُدھر تاکنے لگی۔ کہ کہیں لڑکی نیچے تو نہیں گرپڑی۔ اُسے وہاں نہ پاکر وہ اُٹھ بیٹھی۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ لاڈلی جھوٹے پتلوں کے پاس چپ چاپ کھڑی ہے اور بوڑھی کاکی پتلوں پر سے پوریوں کے ٹکڑے اُٹھا اُٹھاکر کھا رہی ہیں۔ روپا کا کلیجہ سن سے

ہو گیا۔ کسی گائے کی گردن پر چھری چلتے دیکھ کر اس کے دل کی جو حالت ہوتی۔ وہی اس وقت ہوئی۔ ایک براہمنی دوسروں کا جھوٹا پتل ٹٹولے۔ اس سے زیادہ عبرتناک نظارہ ناممکن تھا۔ پوریوں کے چند لقموں کے لیے اس کی پچیری ساس ایسا رکیک اور حقیر فعل کر رہی ہے۔ یہ وہ نظارہ تھا۔ جس سے دیکھنے والوں کے دل کانپ اُٹھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین رُک گئی ہے۔ آسمان چکر کھا رہا ہے۔ دنیا پر کوئی نئی آفت آنے والی ہے۔ رُوپا کو غصہ نہ آیا۔ عبرت کے سامنے غصّے کا ذکر کیا؟ درد اور خوف سے اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس اَدھرم اور پاپ کا الزام کس پر ہے؟ اس نے صدق دل سے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھاکر کہا۔ ”پرماتما! میرے بچوں پر رحم کرنا۔ اس اَدھرم کی سزا مجھے مت دینا۔ ہمارا ستیاناس ہو جائے گا۔“

روپا کو اپنی خودغرضی اور بے انصافی آج تک کبھی اتنی صفائی سے نظر نہ آتی تھی۔ ہائے میں کتنی بے رحم ہوں۔ جس کی جائداد سے مجھے دو سو روپیہ سال کی آمدنی ہو رہی ہے۔ اس کی یہ دُرگت اور میرے کارن! ”اے ایشور مجھ سے بڑا بھاری گناہ ہوا ہے۔ مجھے معاف کرو۔ آج میرے بیٹے کا تلک تھا۔ سیکڑوں آدمیوں نے کھانا کھایا۔ میں ان کے اشارے کی غلام بنی ہوئی تھی۔ اپنے نام کے لیے اپنی بڑائی کے لیے سیکڑوں روپے خرچ کردیئے۔ لیکن جس کی بدولت ہزاروں روپے کھائے اسے اس تقریب کے دن بھی پیٹ بھر کھانا نہ دے سکی۔ محض اس لیے نہ کہ وہ بڑھیا ہے۔ بے کس ہے۔ بے زبان۔“

اس نے چراغ جلایا۔ اپنے بھنڈارے کا دروازہ کھولا۔ اور ایک تھالی میں کھانے کی سب چیزیں سجاکر لیے ہوئے بوڑھی کاکی کی طرف چلی۔

آدھی رات ہوچکی تھی۔ آسمان پر تاروں کے تھال سجے ہوئے تھے اور ان پر بیٹھے ہوئے فرشتے بہشتی نعمتیں سجارہے تھے۔ لیکن ان میں کسی کو وہ مسرت نہ حاصل ہوسکتی تھی۔جو بوڑھی کاکی کو اپنے ساتھ تھال دیکھ کر ہوئی۔ روپا نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔”کاکی! اُٹھو کھانا کھا لو مجھ سے آج بڑی بھول ہوئی، اس کا بُرا نہ ماننا۔ پرماتما سے دعا کرو کہ وہ میری خطا معاف کر دے۔

بھولے بھالے بچّے کی طرح جو مٹھائیاں پاکر مار اور گھڑکیاں سب بھول جاتا ہے۔

بوڑھی کاکی بیٹھی ہوئی کھانا کھا رہی تھیں۔ ان کے ایک ایک روئیں سے سچی دعائیں نکل رہی تھیں، اور روپا بیٹھی یہ روحانی نظارہ دیکھ رہی تھی۔

اردو ماہنامہ کہکشاں جولائی1920 صفحہ (51-45)میں شائع ہوئی۔ اردو مجموعہ پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سرودور نمبر 8 میں درج ہے۔

مِرتیو کے پیچھے

بابو ایشور چند کو سماچار پتروں میں لکھ لکھنے کی چاٹ انھیں دنوں پڑی جب وہ وِدّیا بھاس (تحصیل علم) کر رہے تھے۔ نِتّہ (روزانہ) نئے وِشوؤں (موضوعات) کی چِنتا میں لین رہتے۔ پتروں میں اپنا نام دیکھ کر انھیں اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوتی تھی جتنی پریکھاؤں (امتحانوں) میں اُتیرن (کامیاب) ہونے یا ککشا (درجہ) میں اُوچّ استھان پَراپت کرنے سے ہوسکتی تھی وہ اپنے کالج کے "گرم دل" کے نیتا تھے۔ سماچار پتروں میں پریکھا پتروں (امتحانات کی کاپیاں) کی جٹیلتا (مشکلات) یا ادھیّاپکوں کے انوچت (نامناسب) وِہوار کی شکایت کا بھار انھیں کے سر تھا۔ اس سے انھیں کالج میں پرتی نِدھتیو (نیابت) کا کام مل گیا۔ پرتی رُودھ (مخالفت) کے پَرتیک اَوسَر (ہر ایک موقع) پر انھیں کے نام نِترتو (رہنمائی) کی گوٹی پڑجاتی تھی۔ انھیں وشواش ہوگیا کہ میں اس پَریمیت چھیتر (محدود علاقہ) سے نکل کر سنسار کے وِستریت (وسیع) چھیتر میں اَدھیک سپَھل ہوسکتا ہوں۔ سارؤجنِک جیون (عمومی زندگی) کو وہ اپنا بھاگیہ سمجھ بیٹھے تھے۔ کچھ ایسا سنجوگ ہوا کہ ابھی ایم ۔ اے پریکھار تھیوں میں ان کا نام نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ "گورَو" کے سمپادک مہودے نے وان پرست (ترکِ دنیا) لینے کی ٹھانی اور پتریکا کا بھار ایشور چند دت کے سر پر رکھنے کا نشچے کیا۔ بابو جی کو یہ سماچار ملا تو اُچھل پڑے۔ دَھنیہ (لائق ستائش) بھاگیہ کہ میں اس سمانت پد کے یوگیہ سمجھا گیا۔ اس میں سندیہہ نہیں کہ وہ اس دائتیو (ذمہ داری) کے گُروتو (بوجھ) سے بھلی بھانتی پریچیت (واقف) تھے۔ لیکن کیرتی لابھ (شہرت) کے پریم نے انھیں بادَھک پرِستھتیوں (حالات) کا سامنا کرنے پر اُدھت (مجبور) کر دیا۔ وہ اس وِوَسائے (روزگار) میں سوتن ترِیہ (آزادی) آتم گورَو (دلی عظمت) انوشیلن (غور و فکر) اور دائتیو (ذمہ داری) کی ماترا (مقدار) کو بڑھانا چاہتے تھے۔ بھارتی پتروں کو پچھم کے آدرش پر چلانے کے اِچھوک (خواہش مند) تھے۔ ان

ارادوں کے پورا کرنے کا سُواَوسَر ہاتھ آیا۔ وہ پریم اُلاس سے اُوتجیت (بے تاب) ہوکر نالی میں کود پڑے۔

(۲)

ایشور چند کی پتنی ایک اونچے اور دھناڑھ (سرمایہ دار) گُل کی لڑکی تھی۔ اور وہ ایسے گلوں کی مَریاد پریتا (اچھے رسم و رواج) تتھا (نیز) میتھیا گورَو پریم (عظمت محبت) سے سمپن تھی۔ یہ سماچار پاکر ڈری کہ پتی مہاشے کہیں اس جھنجھٹ میں پھنس کر قانون سے منہ نہ موڑ لیں۔ لیکن جب بابو صاحب نے آشواشن (تسلی) دیا کہ یہ کاریہ ان کے قانون کے اَبھیاس میں بادھک نہ ہوگا۔ تو کچھ نہ بولی۔

لیکن ایشور چند کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ پتر سمپادن ایک بہت ہی اِرشا یُوکت (حسد سے بھرا ہوا) کاریہ ہے۔ جو چت کی سمگر (تمام) وِرتیوں (رجحان) کا اَپہرن (اغوا) کر لیتا ہے۔ انھوں نے اسے منورنجن کا ایک سادھن اور کھیاتی لابھ (ناموری) کا ایک یَنتر (ہتھیار) سمجھا تھا۔ اس کے دوارا (ذریعے) جاتی کی کچھ سیوا کرنا چاہتے تھے۔ اس سے دَرَوِیوپارجن (مال و دولت جمع کرنے) کا وِچار تک نہ کیا تھا۔ لیکن نوکا میں بیٹھ کر انھیں انوبھو ہوا کہ یاترا اتنی سُوکھد نہیں جتنی سمجھی تھی۔ لیکھوں کے سنشودھن (ترمیم)، پریوردَھن (اضافہ)، پریورتن (ردّ و بدل) لیکھک گن (تخلیق کار)، سے پترِوِہوار (باہمی خط و کتابت) اور چت آکرشک (دلچسپ) وشوؤں (موضوعات) کی کھوج اور سہیوگیوں سے آگے بڑھ جانے کی چنتا میں انھیں قانون کا اَدھین (مطالعہ) کرنے کا اوکاش ہی نہ ملتا تھا۔ صبح کو کتابیں کھول کر بیٹھتے کہ سو پرشٹ (ورق) سماپت کیے بِنا کداپی (ہرگز) نہ اُٹھوں گا۔ کِنتو (لیکن) جوں ہی ڈاک کا پلندہ آجاتا، وہ ادھیر ہوکر اس پر ٹوٹ پڑتے۔ کتاب کھلی کی کھلی رہ جاتی تھی۔ بار بار سنکلپ کرتے کہ اب نِیمیت روپ (پابند طریقہ) سے پوستکاؤ لوکن (کتب بینی) کروں گا۔ اور ایک نِردِیشٹ (مقررہ) سَمے سے ادھیک سمپادن کاریہ (امورِ ادارت) میں نہ لگاؤں گا۔ لیکن پتریکاؤں کا بنڈل سامنے آتے ہی دل قابو کے باہر ہوجاتا ہے۔ پتروں کے نوک جھوک، پتریکاؤں کے ترک ویترک (بحث و مباحثہ)، آلوچنا و پریتالوچنا (نقد و نظر)، کویوں کے کاویہ چمتکار (جوہرانہ شاعری)، لیکھکوں کی رَچنا کوشل (تخلیقی صلاحیت) اتیادی

(وغیرہ) سبھی باتیں ان پر جادو کا کام کرتیں۔ اس پر چھپائی کی کٹھنائیاں، گراہک سنکھیا بڑھانے کی چنتا اور پتریکا کو سروانگڑ (جامع) سندر بنانے کی آکانچھا (خواہش) اور بھی پرانوں (جان) کو سنکٹ میں ڈالے رہتی تھی۔ کبھی کبھی انھیں کھید ہوتا کہ ویَرتھ (بیکار) ہی اس جھمیلے میں پڑا یہاں تک کہ پریکچھا کے دن سر پر آگئے اور وہ اس کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ وہ اس میں سمّیلیت (شامل) نہ ہوئے۔ مَن کو سمجھایا کہ ابھی اس کام کا شری گنیش (شروعات) ہے۔ اسی کارن یہ سب بادھائیں اُوپستھت (ظاہر) ہوتی ہیں۔ اگلے ورش یہ کام ایک سُوَیوستھت (با قاعدہ) روپ میں آجائے گا اور تب میں نِشچنت ہوکر پریکچھا میں بیٹھوں گا۔ پاس کرلینی کیا کٹھن ہے۔ ایسے بدھو پاس ہوجاتے ہیں جو ایک سیدھا سا لیکھ بھی نہیں لکھ سکتے۔ تو کیا میں ہی رہ جاؤں گا؟ مانکی نے ان کی یہ باتیں سُنی تو خوب دل کے پھپھولے پھوڑے۔ میں تو جانتی تھی کہ یہ دھن تمھیں ملیا میٹ کردے گا۔ اس لیے بار بار روکتی تھی۔ لیکن تم نے میری ایک نہ سُنی۔ آپ تو ڈوبے ہی، مجھے بھی لے ڈوبے۔ ان کی پُوجیہ پِتا بھی بگڑے۔ ہتیشیوں (ہمدردوں) نے بھی سمجھایا۔ ابھی اس کام کو کچھ دنوں کے لیے استھگِت (ملتوی) کردو۔ قانون میں اُوترن (کامیاب) ہوکر نِروِدر (بے خطر) ویشوَدھار (خدمتِ ملک) میں پرویرت (مائل) ہوجانا۔ لیکن ایشور چندر ایک بار میدان میں آکر بھاگنا نِندھ (بزدلی) سمجھتے تھے۔ ہاں، انھوں نے دِڑھ پرتگیاں (مضبوط ارادے) کی کہ دوسرے سال پریکچھا کے لیے تن من سے تیاری کروں گا۔

اَتوے (چنانچہ) نئے ورش کے پدارپَن (تشریف آوری) کرتے ہی انھوں نے قانون کی پوستکیں سنگرہ کیں۔ پاٹھیہ کرم (نصابِ تعلیم) نِشچت کیا۔ روزنامچہ لکھنے لگے اور اپنے چنچل اور بہانے باز چت کو چاروں اُور سے جکڑا۔ مگر چٹپٹے پدارتھوں (مواد) کا آسوادن (ذائقہ) کرنے کے بعد سَرل بھوجن کب روچی کر (مرغوب) ہوتا ہے۔ قانون میں وہ گھاتیں کہاں۔ وہ اُنماد (مدہوشی) کہاں۔ وہ چوٹیں کہا۔ وہ اُتّجنا (اشتعال) کہاں۔ وہ ہلچل کہاں۔ بابو صاحب اب نِتیہ ایک کھوئی ہوئی دشا میں رہتے۔ جب تک اپنے اِچھانوکول (خواہش کے مطابق) کام کرتے تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں گھنٹے دو گھنٹے قانون بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ اس نشے نے مانسِک شکتیوں (ذہنی طاقت) کو شیتھل (سُست) کردیا۔ اَسنایو

(رگ) نِرجیو (کمزور) ہوگئے۔ انھیں گیات ہونے لگا کہ اب میں قانون کے لائق نہیں رہا اور اس گیان نے قانون کے پَرتی اُداسِنتا (مایوسی) کا روپ دھارن کیا۔ مَن میں سنتوش ورتی (صبر پسندی) کا پُرُدُبھارَو (درشن) ہوا۔ پُراربھد (مقدر) اور پُوروَ سنسکار کے سِدّھانت کی شرن لینے لگے۔

ایک دن مانکی نے کہا۔ یہ کیا بات ہے؟ کیا قانون سے پھر جی اُچاٹ ہوا؟

ایشور چندر نے دُشاہس پورن بھاؤ (گستاخانہ انداز) سے اُتر دیا۔ ہاں بھئی میرا جی اس سے بھاگتا ہے۔

مانکی نے وَینگ سے کہا۔ بہت کٹھن ہے۔

ایشور چندر۔ کٹھن نہیں ہے۔ اور کٹھن بھی ہوتا تو میں اس سے ڈرنے والا نہ تھا۔ لیکن مجھے وکالت کا پیشہ ہی پَتِیت (رذیل) پُرتیت (معلوم) ہوتا ہے۔ جوں جوں وکیلوں کی آنترک دَشا کا گیان ہوتا ہے مجھے اس پیشے سے گھرنا ہوجاتی ہے۔ اسی شہر میں سینکڑوں وکیل اور بیرسٹر پڑے ہوئے ہیں جو سوارتھرتا (خودغرضی) کے ہاتھوں بِک نہ گیا ہو۔ چھل اور دُھرتتا (مکاری) اس پیشے کا مُول تتو (بنیادی عنصر) ہے۔ اس کی بنا کسی طرح نِرواہ نہیں اگر کوئی مہاشے جاتیہ آندولن میں شریک بھی ہوتے ہیں تو سوارتھ سِدھ (خودغرضی ثابت) کرنے کے لیے، اپنا ڈھول پیٹنے کے لیے، ہم لوگوں کا سمگر (تمام) جیون وَاسنا بھکتی (شہوت پرستی) پر اَرپت (سپرد) ہوجاتا ہے۔ دُربھاگیہ سے ہمارے دیش کا شکچھت سموادائے (تعلیم یافتہ طبقہ) اسی درگاہ کا مجاور ہوجاتا ہے اور یہی کارن ہے کہ ہماری جاتیہ سنستھاؤں کی مثری وِردھی (ترقی) نہیں ہوتی جس کام میں ہمارا دل نہ ہو، ہم کیول (صرف) کھیاتی (شہرت) اور سوارتھ لابھ کے لیے اس کے کرن ہار (ناخدا) بنے ہوئے ہوں۔ وہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ ورتمان سماجک ویوستھا (انتظام) کا انیائے ہے جس نے اس پیشے کو اتنا اُونچ استھان پردان کر دیا ہے۔ یہ ویدیشی سَبھیتا (تہذیب) کا نِکرِشتم (انتہائی قبیح) سوروپ ہے کہ دیش کا بُدھی بل سُویم (خود) دھنوپارجن (دولت حاصل) نہ کرکے دوسروں کی پیدا کی ہوئی دولت پر چین کرنا، شہد کی نہ بن کر چیونٹی بننا اپنے جیون کا لکچھ (مقصد) سمجھتا ہے۔

مانکی چڑ کر بولی۔ پہلے تم وکیلوں کی اتنی نِندا نہ کرتے تھے!

ایشور چندر نے اُتّر دیا..........۔

مانکی۔ کیا جانے تمھیں پتروں سے کیوں اتنا پریم ہے۔ میں جسے دیکھتی ہوں اپنی کٹھنائیوں کا رونا روتے ہوئے پاتی ہوں۔ کوئی اپنے گراہکوں سے نئے گراہک بنانے کا انورودھ کرتا ہے۔ کوئی چندہ نہ وصول ہونے کی شکایت کرتا ہے۔ بتا دو کہ کوئی اُوچ شکچھا پراپت منُش (اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان) کبھی اس پیشے میں ہے۔ جسے کچھ نہیں سوجھتی، جس کے پاس نہ کوئی سند ہو، نہ کوئی ڈگری وہی پتر نکال بیٹھتا ہے۔ اور بھوکوں مرنے کے اُپیکچھا (نسبتاً) روکھی روٹیوں پر ہی سنتوش کرتا ہے۔ لوگ ولایت جاتے ہیں وہاں کوئی ڈاکٹری پڑھتا ہے۔ کوئی انجینیری، کوئی سِول سروس۔ لیکن آج تک نہ سُنا کہ کوئی ایڈیٹری کا کام سیکھنے گیا ہو۔ کیوں سیکھے؟ کسی کو کیا پڑی ہے کہ جیون کی مہتواکانچھاؤں (آرزومندی) کو خاک میں ملاکر تیاگ اور وِیراگ میں عمر کاٹ دے۔ ہاں جن کو سنک سوار ہوگئی ہو۔ ان کی بات نرالی ہے۔

ایشور چندر۔ جیون کا اُدیش کیول (صرف) دَھن سنچے (دولت اکٹھا) کرنا ہی نہیں ہے۔

مانکی۔ ابھی تم نے وکیلوں کی نِندا کرتے ہوئے کہا۔ یہ لوگ دوسروں کی کمائی کھاکر موٹے ہوتے ہیں۔ پتر چلانے والے بھی تو دوسروں کی کمائی کھاتے ہیں۔

ایشور چندر نے بغلیں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ہم لوگ دوسروں کی کمائی کھاتے ہیں تو دوسروں پر جان بھی دیتے ہیں۔ وکیلوں کی بھانتی (طرح) کسی کو لوٹتے نہیں۔“

مانکی۔ یہ تمھاری ہٹ دھرمی ہے۔ وکیل بھی تو اپنے موکلوں کے لیے جان لڑا دیتے ہیں۔ ان کی کمائی بھی اتنی ہی ہے جتنی پتر والوں کی۔ اَنتر کیول (صرف) اتنا ہے کہ ایک کی کمائی پہاڑی سُروتا ہے دوسرے کی برساتی نالا۔ ایک میں نِتیہ (ہمیشہ) جل پرواہ ہوتا ہے۔ دوسرے میں نِتیہ (ہمیشہ) دھول اُڑا کرتی ہے۔ بہت ہوا تو برسات میں گھڑی دو گھڑی کے لیے پانی آگیا۔

ایشور۔ پہلے تو میں یہی نہیں مانتا کہ وکیلوں کی کمائی حلال ہے اور یہ مان بھی لوں تو یہ کسی طرح نہیں مان سکتا کہ سبھی وکیل پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ اپنا اپنا بھاگیہ سبھی جگہ ہے۔ کتنے ہی وکیل ہیں جو جھوٹی گواہیاں دے کر پیٹ پالتے ہیں اس دیش میں

سماچار پتروں کا پرچار ابھی بہت کم ہے۔ اسی کارن پتر چالکوں کی آرتھک (مالی) دشا اچھی نہیں ہے۔ یوروپ اور امریکہ میں پتر چلا کر لوگ کروڑپتی ہوگئے ہیں۔ اس سمے سنسار کے سبھی سمونت (ترقی یافتہ) دیشوں کے شتردھار (کرتا دھرتا) یا تو سماچار پتروں کے سمپادک اور لیکھک یا پتروں کے سوامی ایسے کتنے ہی ارب پتی ہیں جنھوں نے اپنی سمپتی کی نیو پتروں پر کھڑی کی ہے۔

ایشور چندر سدھ کرنا چاہتے تھے کہ دھن کھیاتی اور سمان پراپت (حاصل) کرنے کا پتر سنچالن سے اُوتّم اور کوئی سادھن نہیں ہے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس جیون میں ستیہ اور نیائے کی رکشا کرنے کے سچے اَوسر ملتے ہیں۔ پرنتو مانکی پر اس دکترتا (اظہارِ بیان) کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ استھول (کثیف) دِرشٹی کو دور کی چیزیں صاف نہیں دِکھتیں۔ مانکی کے سامنے سپھل سمپادک کا کوئی اُداہرن (مثال) نہ تھا۔

(۳)

۱۶ ورش گزر گئے۔ ایشور چندر نے سمپادکیہ جگت میں خوب نام پیدا کیا۔ جاتیہ آندولن میں اگرسر (پیش رو) ہوئے پُستکیں لکھیں۔ ایک دینک پتر نکالا۔ ادھیکاریوں کے بھی سمان پاتر (عزت کے حقدار) ہوئے۔ بڑا لڑکا بی۔ اے میں جا پہنچا۔ چھوٹے لڑکے نیچے درجوں میں تھے ایک لڑکی کا وِواہ بھی ایک دھن سمپن کُل (دولت سے معمور خاندان) میں کیا ہے۔ وِیدت (معلوم) یہی ہوتا تھا کہ ان کا جیون بڑا ہی سکھ مے ہے۔ مگر ان کی آرتھک دشا اب بھی سنتوش جنک نہ تھی۔ خرچ آمدنی سے بڑھا ہوا تھا۔ گھر کی کئی ہزار کی جائداد ہاتھ سے نکل گئی۔ اس پر بینک کا کچھ نہ کچھ دینا سر پر سوار رہتا تھا۔ بازار میں بھی ان کی ساکھ نہ تھی۔ کبھی کبھی تو یہاں تک نوبت آجاتی کہ انھیں بازار کا راستہ چھوڑنا پڑتا۔ اب وہ اکثر اپنی یُووا اَوستھا کی آدُوردرشتا (غیر دور اندیشی) پر افسوس کرتے تھے۔ جاتیہ سیوا کا بھاؤ اب بھی ان کے ہردے میں ترنگیں مارتا تھا۔ لیکن وہ دیکھتے تھے کہ کام تو میں طے کرتا ہوں اروَیش (تعریف) وکیلوں اور سیٹھوں کے حصّوں میں آجاتا تھا۔ ان کی گنتی ابھی تک چُھٹ بھیوں میں تھی۔ یدیپی (اگرچہ) سارا نگر جانتا تھا کہ وہاں کے سارواجنک جیون (عمومی زندگی) کے پران وہی ہیں۔ پر یہ بھاؤ کبھی ویکت (ظاہر) نہ ہوتا تھا۔ اپنی

کارنوں سے ایشور چندر کو سمپادن کاریہ سے اَروچی (غیر دلچسپی) ہوتی تھی۔ دنوں دن اُتساہ چھین ہوتا جاتا تھا۔ لیکن اس جال سے نکلنے کا کوئی اُوپائے نہ سُجھتا تھا، ان کی رَچنا سچیتا (سرگرمی) نہ تھی، نہ لیکھنی میں شکتی۔ ان کے پتر اور پتریکا دونوں ہی سے اُداسینتا کا بھاؤ جھلکتا تھا۔ انھوں نے سارا بھار سہایکوں پر چھوڑ دیا تھا۔ خود بہت کم کام کرتے تھے۔ ہاں دونوں پتروں کی جڑ جم چکی تھی۔ اسی لیے گراہک سنکھیا کم نہ ہونے پاتی تھی۔ وہ اپنے نام پر چلتے تھے۔

لیکن اس سنگھرش (جد و جہد) اور سنگرام کے کال میں اُوداسینتا کا نِرواہ کہاں۔ گورَو کے پرتی یوگی (حریف) کھڑے کردیے جن کے نوین اُتساہ (نیا حوصلہ) نے گورَو سے بازی مار لی۔ اس کا بازار ٹھنڈا ہونے لگا نئے پرتی یوگیوں (حریفوں) کا جنتا نے بڑے ہرش سے سواگت کیا ان کی اُنتی (ترقی) ہونے لگی۔ یددھپی (اگرچہ) ان کے سدھانت بھی وہی، لیکھ بھی وہی، ویشے بھی وہی تھے۔ لیکن آنکتوگوں (آنے والوں) نے وہی پرانی باتوں میں نئی جان ڈال دی۔ ان کا اُتساہ (حوصلہ) دیکھ ایشور چندر کو بھی جوش آیا کہ ایک بار پھر اپنی رُکی ہوئی گاڑی میں زور لگائیں۔ لیکن نہ ان میں سامَرتھ (اہلیت) تھی نہ کوئی ہاتھ بٹانے والا نظر آتا تھا۔ ادھر اُدھر نِراش نیتروں سے دیکھ کر ہتوتساہ (نا امید) ہوجاتے تھے۔ میں نے اپنا سارا جیون سارْوَاجنک کاریوں (عام کاموں) میں ویتیت (بسر) کیا۔ کھیت کو کھودا، سینچا، دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا دھوپ میں جلا، پانی میں بھیگا اور اتنے پریشرم (محنت) کے بعد جب فصل کاٹنے کے دن آئے تو مجھ میں ہنسیا پکڑنے کا بھی بوتا نہیں۔ دوسرے لوگ جن کا اس سَمے کہیں پتہ نہ تھا۔ اناج کاٹ کاٹ کر کھلیان بھر لیتے ہیں اور میں کھڑا منہ تاکتا ہوں۔ انھیں پورا وِشواس تھا کہ اگر کوئی اُتساہ شیل (پُرحوصلہ) یُووَک میرا شریک ہوجاتا تو "گورَو" اب بھی اپنے پرتی دُوندیوں (حریفوں) کو پَراست (زیر) کرسکتا۔ سبھیہ (مہذب) سماج میں ان کی دھاک جمی ہوئی تھی۔ انھیں اپنے بڑے لڑکے سے زیادہ اُپیوکت (مناسب) اس کام کے لیے اور کوئی نہ دِکھتا تھا۔ اس کی روچی بھی اس کام کی اُور تھی۔ پر مانکی کے بھئے سے وہ اس وِچار کو زبان پر نہ لاسکے تھے۔ اسی چِنتا میں دو سال گزر گئے اور یہاں تک نوبت پہنچی کی یا تو "گورَو" کا ٹاٹ اُلٹ دیا جائے یا اسے پونہہ (پھر

سے) اپنے استھان پر پہنچانے کے لیے کٹی بدھ (کمر بستہ) ہوا جائے۔ ایشور چندر نے اس کے پُونُرُودھار (ازسرنو تعمیر جدید) کے لیے انتیم (آخری) اُدیوگ (صنعت) کرنے کا دِڑھ نشچے (مضبوط ارادہ) کرلیا۔ اس کے سوا اور کوئی اُپائے نہ تھا۔ یہ پتریکا ان کے جیون کا سَروسو (سب کچھ) تھی۔ اس سے ان کے جیون اور مرتیو کا سمبندھ تھا۔ اس کو بند کرنے کی وہ کلپنا بھی نہ کرسکتے تھے۔ یدھپی (چنانچہ) ان کا سواستھ اچھا نہ تھا۔ پر پران رکشا کی سوَبھاوِک (فطری) اِچھا نے انھیں اپنا سب کچھ اپنی پتریکا پر نچھاور کرنے کی اُدھت (ظاہر) کردیا۔ پھر دن کے دن لکھنے پڑھنے میں رَت (مشغول) رہنے لگے ایک چھن کے لیے بھی سر نہ اُٹھاتے۔ "گورَو" کے لیکھوں میں پر بجیو تا (سرگرمی) کا اُدبھو (ظہور) ہو، وِیدّاجنوں (دانشوروں) میں پھر اس کی چرچا ہونے لگی۔ سہیوگیوں نے پھر اس کے لیکھوں کو اُدگھرت (ماخوذ) کرنا شروع کیا۔ پتریکاؤں میں پھر اس کی پرشنسا سوچک (پُر تعریف) آلوچنائیں (تنقیدیں) نکلنے لگیں، پرانے استاد کی للکار پھر اکھاڑے میں گونجنے لگی۔

لیکن پتریکا کے پُنہ سنسکار کے ساتھ ان کا شریر اور بھی جرجر ہونے لگا۔ ہردے روگ کے لکچھن دِکھائی دینے لگے۔ رَکت نیونتا (کمی) سے مکھ پر پیلاپن چھا گیا۔ ایسی دَشا میں وہ صبح سے شام تک اپنے کام میں تلین (مشغول) رہتے۔ دیش، دھن اور شرم (محنت) کا سنگرام (جنگ) کا سکچھی (کیڑا) بنا دیا تھا۔ دھن وادیوں (دولت مندوں) کا کھنڈن (تردید) اور پرتی واد (جوابی بیان) کرتے ہوئے ان کے خون میں سرگرمی آجاتی تھی۔ شبدوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی تھیں۔ یدھپی (چنانچہ) یہ چنگاریاں کِندرتھ (مرکزی) گرمی کو چھین کیے دیتی تھی۔

ایک دن رات کے دس بج گئے تھے۔ سردی خوب پڑ رہی تھی۔ مانکی دبے پیر ان کے کمرے میں آئی۔ دیپک کی جیوتی میں ان کے مُکھ کا پیلاپن اور بھی اسپشٹ (ظاہر) ہوگیا تھا۔ وہ ہاتھ میں قلم لیے کسی وِچار میں مگن تھے۔ مانکی کے آنے کی انھیں بھی آہٹ نہ ملی۔ مانکی ایک چھن انھیں وِیدنا یوکت (پُردرد) نیتروں سے تاکتی رہی۔ تب بولی۔ اب تو یہ پوتھا (پلندہ) بند کرو۔ آدھی رات ہونے کو آئی۔ کھانا پانی ہوا جاتا ہے۔

ایشور چندر نے چونک کر سر اُٹھایا اور بولے۔ کیوں۔ کیا آدھی رات ہوگئی؟ نہیں،

ابھی مشکل سے دس بجے ہوں گے۔ مجھے ابھی ذرا بھی بھوک نہیں ہے۔

مانکی۔ کچھ تھوڑا سا کھالو نہ۔

ایشور۔ ایک گراس (نوالہ) بھی نہیں۔ مجھے اس سمے اپنا لیکھ سماپت کرنا ہے۔

مانکی۔ میں دیکھتی ہوں تمھاری دَشا دن دن بگڑتی جاتی ہے۔ دوا کیوں نہیں کرتے؟ جان کھپا کر تھوڑے ہی کام کیا جاتا ہے؟

ایشور۔ اپنی جان کو دیکھوں یا اس گھور سنگرام کو دیکھوں جس نے سمست (سارے) دیش میں ہلچل مچا رکھی ہے۔ ہزاروں لاکھوں جانوں کی حمایت میں ایک جان نہ بھی رہے تو کیا چنتا؟

مانکی۔ کوئی سویوگیہ (با صلاحیت) سہایک کیوں نہیں رکھ لیتے۔

ایشور چندر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ بہت کھوجتا ہوں۔ پر کوئی نہیں ملتا۔ ایک وِچار کئی دنوں سے میرے من میں اُٹھ رہا ہے اگر تم دَھریہ (استقلال) سے سننا چاہو تو کہوں۔

مانکی۔ کہو، سنوگی۔ ماننے لائق ہوگا تو مانوں گی کیوں نہیں!

ایشور چندر۔ میں چاہتا ہوں کہ کرشن چندر کو اپنے کام میں شریک کرلوں۔ اب تو وہ ایم۔ اے بھی ہوگیا۔ اس پیشے سے اُسے روچی بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایشور نے اسے اسی کام کے لیے بنایا ہے۔

مانکی نے اَوہلنا بھاؤ سے کہا۔ کیا اپنے ساتھ اسے بھی لے ڈوبنے کا ارادہ ہے؟ گھر کی سیوا کرنے والا بھی کوئی چاہیے۔ کہ سب دیش کی ہی سیوا کریں گے؟

ایشور۔ کرشن چندر یہاں کسی سے بُرا نہ رہے گا۔

مانکی۔ چھما کیجیے باز آئی۔ وہ کوئی دوسرا کام کرے گا۔ جہاں چار پیسے ملیں۔ یہ گھر پھونک کام آپ ہی کو مبارک رہے۔

ایشور چندر۔ وکالت میں بھیجوگی۔ پر دیکھ لینا۔ پچھتانا پڑے گا۔ کرشن چندر اس پیشے کے لیے سروتھا (یقیناً) آیوگیہ (نا مناسب) ہے۔

مانکی۔ وہ چاہے مزدوری کرے پر اس کام میں نہ ڈالوں گی۔

ایشور چندر۔ تم نے مجھے دیکھ کر سمجھ لیا کہ اس کام میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ پر اسی دیش میں ایسے بھاگیہ وان لوگ موجود ہیں جو پتروں کی بدولت دھن اور کرتی (ناموری) سے مالا مال ہو رہے ہیں۔

مانکی۔ اس کام میں تو اگر کنچن بھی برسے تو میں اُسے نہ آنے دوں۔ سارا جیون ویراگ میں کٹ گیا۔ اب کچھ دن بھوگ بھی کرنا چاہتی ہوں۔

یہ جاتیہ کا سچّا سیوک اَنت کو جاتیہ کشٹوں کے ساتھ روگ کے کشٹوں کو نہ سہہ سکا۔ اس وارتالاپ (گفتگو) کے بعد مشکل سے نو مہینے گزرے تھے کہ ایشور چندر نے سنسار سے پرستھان کیا۔ ان کا سارا جیون ستیہ کے پوشن نیائے کی رکشا اور پرجا کشٹوں کے ویرُدھ (مخالف) میں کٹا تھا۔ اپنے سِدھانتوں (اصولوں) کے پالن میں انھیں کتنی ہی بار ادھیکاریوں کی تیز دِرشٹی کا بھاجن بننا پڑا تھا۔ کتنی ہی بار جنتا کا اَوِشواس (عدم اعتماد) یہاں تک کہ مِتروں (دوستوں) کی اَوہلنا بھی سہنی پڑتی تھی۔ پر انھوں نے اپنی آتما کا کبھی ہنن (ختم) نہیں کیا آتما کے گورو کے سامنے دَھن کو کچھ نہ سمجھا۔

اس شوک سماچار کے پھیلتے ہی سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ بازار بند ہوگئے۔ شوک کے جلسے ہونے لگے۔ سہیوگی پتروں نے پرتی دُوبندتا (حریفانہ) کے بھاؤ کو تیاگ دیا، چاروں اُور ایک دَھونی (صدا) آتی تھی کہ دیش سے ایک سوتنتر (آزاد) ستیہ وادی اور وِچار شیل (صاحبِ فکر) سمپادک تتھا (نیز) ایک نِربھیک تیاگی دیش بھکت اُٹھ گیا اور اس کا استھان چِر کال تک خالی رہے گا۔ ایشور چندر اتنے بہوجن پریہ ہیں اِس کا ان کے گھر والوں کو دھیان بھی نہ تھا۔ ان کا شَو (نعش) نکلا تو سارا شہر گنیہ اگنیہ (شمار و بے شمار) ارتھی کے ساتھ تھا۔ ان کے اسمارک (یادگار) بننے لگے۔ کہیں چھاترورتیاں (تعلیمی وظیفے) دی گئیں۔ کہیں ان کے چتر بنوائے گئے۔ پر سب سے ادھیک مہتو شیل (اہم) وہ مورتی تھی جو شرم جیویوں (محنت کشوں) کی اُور سے پرتِشٹھیت (معزز) ہوئی تھی۔

مانکی کو اپنے پتی دیو کا لوک سمّان دیکھ کر سکھ مۓ کوتوہل (خوشی کا استعجاب) ہوتا تھا۔ اسے اب کھید ہوتا تھا کہ میں نے ان کے دِبیہ گنوں (ماورائی خوبیاں) کو نہ پہچانا، ان کے پوتر بھاؤں (پاکیزہ جذبات) اور اُوچ وِچاروں کی قدر نہ کی۔ سارا نگر ان کے لیے شوک

منا رہا ہے۔ ان کی لیکھنی نے اَوشیہ (یقیناً) ان کے ایسے اُپکار کیے ہیں جنھیں یہ بھول نہیں سکتے اور میں اَنت تک ان کا مارگ کنٹک بنی رہی، سدیو (ہمیشہ) ترشنا کے وَش ان کا دل دُکھاتی رہی۔ انھوں نے مجھے سونے میں مَڑھ دیا ہوتا۔ ایک بھَو بھون بنوایا ہوتا، یا کوئی جائداد پیدا کرلی ہوتی۔ تو میں خوش ہوتی۔ اپنا دھنیہ بھاگیہ سمجھتی۔ لیکن تب دیش میں کون ان کے لیے آنسو بہاتا۔ کون ان کا یَش (نیک نامی) گاتا؟ یہیں ایک سے ایک دَھنک (مال دار) پُرش پڑے ہوئے ہیں۔ وہ دنیا سے چلے جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ سُنتی ہوں پتی کے نام چھاتروں کو وِرتی (وظیفہ) دی جائے گی۔ جو لڑکے وِرتی (وظیفہ) پاکر وِدّیا لابھ (تحصیل علم) کریں گے وہ مرتے دم تک ان کی آتما کو آشرواد دیں گے۔ شوک! میں ان کے آتم تیاگ مرم (راز) نہ جانا۔ سوارتھ نے میری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔

مانکی کے ہردے میں جوں جوں یہ بھاؤنائیں جاگرت ہوتی تھیں۔ اسے پتی میں شردھا (عزت) بڑھتی جاتی تھی۔ وہ گوروشیلا (پُر عظمت) اِستری تھی۔ اس کِرتی گان (ناموری) اور جن سمّان (عوامی وقار) سے اس کا مستشک (سر) اونچا ہوجاتا تھا۔ اس کے اُپرانت (بعد) اب اس کی آرتھیک دَشا (مالی حالت) پہلے کی سی چِنتا جنک (تشویشناک) نہ تھی۔ کرشن چندر کے اَسادھارن (غیر معمولی) اَدھیہ وَسائے (استقلال) اور بُدھی بل نے ان کی وکالت کو چمکا دیا تھا۔ وہ جاتیہ کاموں میں اَوشیہ (یقیناً) بھاگ لیتے تھے۔ پتروں یتھاشکتی (حسبِ طاقت) لیکھ بھی لکھتے تھے۔ اس کام سے انھیں وِشیش (خاص) پریم تھا۔ لیکن مانکی ہمیشہ ان کاموں سے دور رکھنے کی چیشٹا (کوشش) کرتی تھی۔ کرشن چندر اپنے اوپر جبر کرتے تھے۔ ماں کا دل دُکھانا انھیں منظور نہ تھا۔

ایشور چندر کی پہلی برسی تھی۔ شام کو برہمن بھوج ہوا۔ آدھی رات تک غریبوں کو کھانا دیا گیا۔ پراتیہ کال مانکی اپنی سیج گاڑی پر بیٹھ کر گنگا نہانے گئی۔ یہ اس کی چِرسَنچیت (دیرینہ) ابھیلاشا تھی جو اب پُتر کی ماتر بھکتی نے پوری کردی تھی۔ یہ اِدھر سے لوٹ رہی تھی کہ اس کے کانوں میں بینڈ کی آواز آئی اور ایک چھِن کی بعد ایک جلوس سامنے آتا ہوا دِکھائی دیا۔ پہلے کوتل گھوڑوں کی مالا تھی۔ اس کے بعد اَسوارُوہی (گھوڑ سوار) سُویم سیوکوں

کی سینا اس کے پیچھے سینکڑوں سواریاں گاڑیاں تھیں۔ سب سے پیچھے ایک سجے ہوئے رتھ پر کسی دیوتا کی مورتی تھی۔ کتنے ہی آدمی اس ویمان کو کھینچ رہے تھے۔ مانکی سوچنے لگی۔ یہ کس دیوتا کا ویمان ہے؟ نہ تو رام لیلا کے ہی دن ہیں نہ رتھ یاترا کے۔ سہسا (اچانک) اس کا دل زور سے اُچھل پڑا۔ یہ ایشور چندر کی مورتی تھی۔ جو شُرم جیویوں کی اُور سے بنوائی گئی تھی اور لوگ اسے بڑے میدان میں استھاپت کرنے کے لیے لیے جاتے تھے۔ وہی سوروپ تھا، وہی وَستر وہ مُوکھا کرتی (چہرے کی بناوٹ)۔ مورتی کار نے ولکچھن (نادر) کوشل دِکھایا تھا۔ مانکی کا ہردے بانسوں اُچھلنے لگا۔ اُتکنٹھا (بے تابی) ہوئی کہ پردے سے نکل اس جلوس کے سمّکھ پتی کے چرنوں پر گر پڑوں۔ پتھر کی مورتی مانُو شریر سے ادھیک سردھاسپد (قابلِ عقیدت) ہوتی ہے۔ کِنتو (لیکن) کون منہ لے کر مورتی کے سامنے جاؤں؟ اس کی آتما نے کبھی اس کا اتنا تِرسکار نہ کیا تھا۔ میری دھن لِپسا (دولت کی لالچ) ان کے پیروں کی بیڑی نہ بنتی تو وہ نہ جانے کس سمان پر پہنچتے۔ میرے کارن انھیں کتنا چھوپ ہوا۔ گھر والوں کی سہانُوبھوتی (ہمدردی) باہر والوں کے سمّان سے کہیں اُتساہ جنک (ولولہ انگیز) ہوتی ہے۔ میں انھیں کیا کچھ نہ بنا سکتی تھی۔ پر کبھی ابھرنے نہ دیا۔ سوامی جی۔ مجھے چھما کرو۔ میں تمھاری اَپرادھنی ہوں۔ میں نے تمھارے پوتر بھاؤں کی ہتیا کی ہے۔ میں نے تمھاری آتما کو دُکھی کیا ہے۔ میں نے باز کو پنجڑے میں بند کرکے رکھا تھا۔ شوک!۔

سارے دن مانکی کو وہی پسچاتاپ ہوتا رہا۔ شام کو اس سے نہ رہا گیا۔ وہ اپنی کہارن کو لے کر پیدل اس دیوا کے درشن کو چلی جس کی آتما کو اس نے دُکھ پہنچایا تھا۔

سندھیا کا سمے تھا۔ آکاش پر لالیما (لالی) چھائی تھی۔ اَستاچل (مغرب) کی اُور کچھ بادل بھی ہو آئے تھے۔ سُوریہ دیو کبھی میگھ پٹ میں چھپ جاتے تھے۔ کبھی باہر نکل آتے تھے۔ اس دھوپ چھاؤں میں ایشور چندر کی مورتی دور سے کبھی پَربھات کی بھانتی پَرسن مُکھ (ہنستا ہوا چہرہ) اور کبھی سندھیا کی بھانتی مَلین (میلا) دیکھ پڑتی تھی۔ مانکی اس کے نِکٹ گئی، پر اس کے مُکھ کی اُور نہ دیکھ سکی۔ ان آنکھوں میں کرون وِیدتا (دردناک تکلیف) تھی۔ مانکی کو ایسا معلوم ہوا۔ مانو وہ میری اُور تِرسکار پورن بھاؤ (توہین آمیز جذبات) سے دیکھ

رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے گلانی اور لجّا کے آنسو بہنے لگے۔ وہ مورتی کے چرنوں پر گر پڑی اور منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ مَن کے بھاؤ دَرَویت (سیّالی) ہوگئے۔

وہ گھر آئی تو نو بج گئے تھے۔ کرشن اسے دیکھ کر بولے۔ اماں آج آپ اس وقت کہاں گئی تھیں۔

مانکی نے ہَرش سے کہا۔ گئی تھی تمھارے بابو جی کی پَرتیا کے ہَردرشن کرنے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ وہی ساکچھات (سامنے) کھڑے ہیں۔

کرشن۔ جے پور سے بن کر آئی ہے۔

مانکی۔ پہلے تو لوگ ان کا اتنا آدر نہ کرتے تھے؟

کرشن۔ ان کا سارا جیون ستیہ اور نیائے کی وکالت میں گزرا ہے۔ ایسے ہی مہاتماؤں کی پوجا ہوتی ہے۔

مانکی۔ لیکن انھوں نے وکالت کب کی؟

کرشن۔ ہاں! یہ وکالت نہیں کی جو میں اور میرے ہزاروں بھائی کر رہے ہیں۔ جس سے نیائے اور دھرم کا خون ہو رہا ہے۔ ان کی وکالت اُوچ کوٹی کی تھی۔

مانکی۔ اگر ایسا ہے تو تم بھی وہی وکالت کیوں نہیں کرتے؟

کرشن۔ بہت کٹھن ہے۔ دنیا کا جنجال اپنے سر لیجیے۔ دوسروں کے لیے روئیے۔ دِیدنوں (غریبوں) کی رکچھا کے لیے لٹھ لیے پھریے۔ اور اس کشٹ اَپمان اور یَنترنا (رنج) کا پُرسکار کیا ہے؟ اپنی جیونا بھی لاشاؤں (زندگی کی تمناؤں) کی ہتیا!

مانکی۔ لیکن یَش ملتا ہے تو تم بھی وہی کام کرو ہم لوگ اس پوتّر آتما کی اور کچھ سیوا نہیں کرسکتے تو اسی باٹیکا کو جلاتے جائیں جو انھوں نے اپنے جیون میں اتنے اُتزگ (قربانی) اور بھکتی سے لگائی۔ اس سے ان کی آتما کو شانتی ہوگی۔

کرشن چندر نے ماتا کو شردھائے نیتروں (عقیدت مندانہ نظروں) سے دیکھ کر کہا۔ کروں تو، مگر سمبھو (ممکن) ہے تب یہ ٹیم ٹام نہ نبھ سکے۔ شاید پھر وہی پہلے کی سی دَشا ہو جائے۔

مانکی۔ کوئی حرج نہیں سنسار میں یَش تو ہوگا؟ آج تو اگر دھن کی دیوی بھی میرے سامنے

آئے تو میں آنکھیں نہ نیچی کروں۔

اردو میں بعد از مرگ کے عنوان سے صبح امید اگست ستمبر 1920 صفحہ (12 - 8) میں ہے کسی اردو مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ ہندی میں مرتیو کے پیچھے کے عنوان سے مان سرودر 6 میں ہے۔یہاں یہ افسانہ ہندی سے رسم الخط بدل کر اردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مرضِ مُبارک

رات کے نو بج گئے تھے۔ ایک نازنین انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ہوئی آگ پھونکتی تھی۔ اور اُس کے رخسارے آگ کے کندنی رنگ میں شعلہ افروز تھے۔ اس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھیں دروازہ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ کبھی چونک کر آنگن کی طرف تاکتی۔ کبھی کمرہ کی طرف۔ پھر آنے والوں کی اس تاخیر سے تیوریوں پر بل پڑجاتے۔ اور آنکھوں میں خفیف سا غصہ نظر آتا۔ کنول پانی میں جھکولے کھانے لگتا۔

اسی اثناء میں آنے والوں کی آہٹ ملی۔ کہار باہر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ بوڑھے لالہ ہرنام داس نے آتے ہی اُسے ایک ٹھوکر لگا کر کہا۔ "کم بخت! ابھی شام ہوئی ہے۔ اور ابھی سے لمبی تان دی۔"

نوجوان لالہ ہری داس گھر میں داخل ہوئے۔ چہرہ پژمردہ متفکر، دیوکی نے آکر اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور غصہ و پیار کی ملی ہوئی آواز سے بولی۔ "آج اتنی دیر کیوں ہوئی؟"

دونوں نوشگفتہ پھول تھے۔ ایک پر شبنم کی تازگی تھی۔ دوسرا دھوپ سے مُرجھایا ہوا۔

ہری داس۔ ہاں آج دیر ہوگئی۔ تم یہاں کیوں بیٹھی رہیں؟

دیوکی۔ کیا کرتی۔ آگ بجھی جاتی تھی۔ کھانا نہ ٹھنڈا ہوجاتا۔

ہری داس۔ تم ذرا سے کام کے لیے اتنی دیر آگ کے سامنے نہ بیٹھا کرو۔ باز آیا گرم کھانے سے۔

دیوکی۔ اچھا کپڑے تو اُتارو۔ آج اتنی دیر کیوں کی؟

ہری داس۔ کیا بتاؤں، والد نے ایسا ناک میں دم کردیا ہے۔ کہ کچھ کہتے نہیں بنتا؟ اس روز کی جھنجٹ سے تو یہی اچھا ہے۔ کہ میں کہیں اور نوکری کرلوں۔

لالہ ہرنام داس ایک آٹے کی چکی کے مالک تھے۔ جب ان کے شباب کا زمانہ تھا۔ اس وقت اس نواح میں دوسری چکی نہ تھی۔ انھوں نے خوب دھن کمایا۔ مگر اب وہ حالت

نہ تھی۔ چکیاں حشرات الارض کی طرح پیدا ہوگئی تھیں۔ نئی مشینوں اور ایجادوں سے آراستہ۔ اُن کے کارکن بھی جوشیلے نوجوان تھے۔ مستعدی سے کام کرتے تھے۔ اس لیے ہرنام داس کا کارخانہ روز گرتا جاتا تھا۔ بوڑھے آدمیوں کو نئی چیزوں سے جو چڑ ہوجاتی ہے وہ لالہ ہرنام داس کو بھی تھی۔ وہ اپنی پُرانی مشین ہی کو چلاتے تھے۔ کسی قسم کی ترقی یا اصلاح کو کفر سمجھتے تھے۔ مگر اپنی اس سرد بازاری پر کڑھا کرتے تھے۔ ہری داس نے ان کی مرضی کے خلاف کالجیٹ تعلیم حاصل کی تھی۔ اور اس کا ارادہ تھا۔ کہ اپنے والد کے کارخانہ کو نئے اُصولوں پر چلاکر سرسبز کرے۔ لیکن جب وہ ان سے کسی تبدیلی یا اصلاح کا ذکر کرتا۔ تو لالہ صاحب جامہ سے باہر ہوجاتے۔ اور تفاخرانہ انداز سے کہتے۔ کالج میں پڑھنے سے تجربہ نہیں آتا۔ تم ابھی بچے ہو۔ اس کام میں میرے بال سفید ہوگئے ہیں۔ تم مجھے صلاح مت دو۔ جس طرح میں کہتا ہوں۔ کام کیے جاؤ۔

بارہا ایسے موقعے آچکے تھے۔ کہ بہت ہی خفیف معاملات میں اپنے والد کی روش کے خلاف عمل کرنے کی پاداش میں ہری داس کو سخت پھٹکاریں سہنا پڑی تھیں۔ اسی وجہ سے اب وہ اس کام سے کچھ برداشتہ خاطر ہوگیا تھا۔ اور کسی دوسرے کارخانہ میں قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ جہاں اُسے اپنے خیالات کو عملی صورت دینے کی زیادہ سہولتیں حاصل ہوں۔

دیوکی نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔"تم اس فکر میں کیوں جان کھپاتے ہو۔ جیسے وہ کہیں ویسے ہی کرو۔ بھلا دوسری جگہ نوکری کرلوگے تو وہ کیا کہیں گے۔ اور چاہے وہ غصہ کے مارے کچھ نہ بولیں لیکن دنیا تو تمھیں کو بُرا کہے گی۔"

دیوکی نئی تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ تھی۔ اس نے خود پروری کا سبق نہ پڑھا تھا۔ مگر اس کا شوہر اپنے "المامیٹر" کا ایک ممتاز رُکن تھا۔ اُسے اپنی قابلیت پر کامل اعتماد تھا۔ اس پر نام و نمود کا جوش۔ اس لیے وہ اپنے پدر بزرگوار کی بوسیدہ روش پر بے صبر ہوجاتا تھا۔ اگر اپنی قابلیتوں کے مفید استعمال کی کوشش کے لیے دُنیا اُسے بُرا کہے۔ تو اس کو پروا نہ تھی۔ جھنجلاکر بولا۔ "کچھ میں آبِ حیات تو پی آیا نہیں ہوں۔ کہ ساری عمر اُن کے مرنے کا انتظار کیا کروں۔ جہلاء کی بے جا نکتہ چینیوں کے خوف سے کیا اپنی عمر برباد کر دوں۔ میں اپنے بعض ہم عمروں کو جانتا ہوں جو ہرگز میری سی قابلیت نہیں رکھتے۔ لیکن وہ موٹر پر ہوا کھانے نکلتے ہیں۔ بنگلوں میں رہتے ہیں۔ اور شان سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو

میں کیوں ہاتھ پر ہاتھ رکھے زندگی کو دائمی سمجھے بیٹھا رہوں۔ فقر و قناعت کا زمانہ گیا یہ جد و جہد کا زمانہ ہے۔ یہ میں جانتا ہوں۔ کہ باپ کی تعظیم کرنا میرا فرض ہے مگر اصول کے معاملہ میں۔ میں اُن سے کیا کسی سے بھی نہیں دب سکتا۔"

اسی اثناء میں کہار نے آکر کہا۔ "لالہ جی تھالی مانگتے ہیں۔"

لالہ ہرنام داس ہندو رسم و رواج کے بڑے پابند تھے۔ مگر بڑھاپے کے باعث چوکے کے چکر سے نجات پاچکے تھے پہلے کچھ دنوں تک جاڑوں میں رات کو پوریاں کھاتے رہے۔ اب ضعف کے باعث پوریاں نہ ہضم ہوتی تھیں۔ اس لیے چپاتیاں ہی اپنی بیٹھک میں منگا لیا کرتے تھے۔ مجبوری نے وہ کرایا تھا۔ جو حجت و دلیل کے قابو سے باہر تھا۔

ہری داس کے لیے بھی دیوکی نے کھانا نکالا۔ پہلے تو وہ حضرت بہت کسلمند نظر آتے تھے۔ لیکن بگھار کی خوشبو نے رغبت پیدا کردی تھی۔ اکثر ہم اپنی آنکھ اور ناک سے ہاضمہ کا کام لیا کرتے ہیں۔

(۲)

لالہ ہرنام داس رات کو بھلے چنگے سوئے۔ لیکن اپنے فرزند کی ناسعادت مندیاں اور گستاخیاں نیز اپنے کاروبار کی سُستی اور سرد بازاری سوہانِ روح ہو گئیں۔ اور خواہ اسی خلجان کا اثر ہو۔ خواہ پیرانہ سالی کا۔ صبح ہونے سے پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوگیا۔ زبان بند ہوگئی۔ اور چہرہ مسخ ہوگیا۔ ہری داس ڈاکٹر کے پاس دوڑا۔ ڈاکٹر آئے۔ مریض کو دیکھا۔ اور بولے:۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ صحت ہوگی۔ مگر تین ماہ سے کم نہ لگیں گے دماغی افکار کے باعث یہ حملہ ہوا ہے۔ اس لیے کوشش کرنی چاہیے۔ کہ وہ آرام سے سوئیں۔ پریشان نہ ہوں۔ اور زبان کھُل جانے پر حتی الامکان بولنے سے پرہیز کریں۔"

غریب دیوکی بیٹھی رو رہی تھی۔ ہری داس نے آکر اس کی تشفی کی۔ تب ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لاکر دی۔ تھوڑی دیر میں مریض کو ہوش آیا۔ اِدھراُدھر نگاہِ جستجو سے دیکھا۔ گویا کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ تب اشارہ سے لکھنے کے لیے کاغذ مانگا۔ ہری داس نے کاغذ اور پنسل رکھ دی۔ تب بوڑھے لالہ صاحب نے ہاتھوں کو خوب سنبھال کر لکھا۔

"انتظام دینا ناتھ کے ہاتھ میں رہے۔"

یہ الفاظ ہری داس کے جگر میں تیر کی طرح لگے۔ افسوس! اب مجھ پر بھی بھروسہ نہیں، گویا دینا ناتھ میرا آقا ہوگا۔ اور میں اس کا غلام بن کر رہوں گا۔ یہ نہیں ہونے کا۔ کاغذ لیے ہوئے دیوکی کے پاس آئے۔ اور بولے۔"لالہ جی نے دینا ناتھ کو منیجر بنایا ہے۔ انھیں مجھ پر اتنا اعتبار بھی نہیں ہے۔ لیکن میں اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ اُن کی بیماری کا افسوس تو ضرور ہے۔ مگر شاید پرماتما نے مجھے اپنی قابلیت کے اظہار کا یہ موقع عطا کیا ہے۔ اور اس سے میں ضرور فائدہ اُٹھاؤں گا۔ کارخانہ کے ملازموں نے اس حادثہ کی خبر سُنی۔ تو بہت گھبرائے۔ اُن میں کئی نکمّے بے مصرف آدمی بھرے ہوئے تھے۔ جو محض خوشامد اور شیریں بیانیوں کی روٹی کھاتے تھے۔ مستری نے کئی دوسرے کارخانوں میں مرمت کا کام اُٹھا لیا تھا۔ اور روز کسی نہ کسی بہانے سے کھسک جاتا تھا۔ فائرمین اور مشین مین دن کو تو جھوٹ موٹ چکی کی صفائی میں کاٹتے تھے۔ اور رات کو کام کر کے زائد وقت کی اُجرت لے لیا کرتے تھے۔ دینا ناتھ ضرور ہوشیار اور کارکردہ آدمی تھا۔ مگر اُسے بھی کام کرنے کے مقابلہ میں "جی ہاں" کا ورد کرنے میں زیادہ عافیت نظر آتی تھی۔ لالہ ہرنام داس اُجرت دینے میں بہت لیت و لعل کیا کرتے تھے۔ اور اکثر کاٹ کپٹ کے بھی عادی تھے۔ اسی کو وہ کاروبار کا اچھا اُصول سمجھتے تھے۔

ہری داس نے کارخانے میں پہنچتے ہی صاف لفظوں میں کہہ دیا۔ "کہ تم لوگوں کو میرے وقت میں تن دہی سے کام کرنا ہوگا۔ میں اسی مہینہ میں کام دیکھ کر سب کی ترقی کردوں گا۔ مگر اب ٹال مٹول کا گزر نہیں۔ جنھیں منظور نہ ہو۔ وہ اپنا بوریا بستر سنبھالیں۔" اس کے بعد اس نے دینا ناتھ کو بُلاکر کہا۔ "بھائی صاحب مجھے خوب معلوم ہے۔ کہ آپ ہوشیار اور فہیم آدمی ہیں۔ آپ نے اب تک یہاں کا جو رنگ دیکھا۔ وہی اختیار کیا۔ لیکن اب مجھے آپ کے تجربہ اور محنت کی ضرورت ہے۔ پُرانے حسابات کی جانچ پڑتال کیجیے۔ باہر سے کام لانا میرا ذمہ ہے۔ لیکن یہاں کا انتظام آپ کے سُپرد ہے۔ جو کچھ نفع ہوگا۔ اُس میں آپ بھی شریک ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ دادا کی عدم موجودگی میں کچھ کارگزاری دکھا سکوں۔" اس مستعدی اور چستی کا اثر بہت جلد کارخانہ میں نظر آنے لگا۔ ہری داس نے خوب اشتہارات بٹوائے۔ اس کا اثر یہ ہوا۔ کہ کام آنے لگا۔ دینا ناتھ کی مستعدی کی بدولت گاہکوں کو وقت معین پر اور کفایت سے آٹا ملنے لگا۔ پہلا مہینہ بھی ختم نہ ہوا

تھا۔ کہ ہری داس نے نئی مشین منگوائی۔ چندکارکردہ آدمی رکھ لیے۔ پھر کیا تھا۔ سارے شہر میں اس کارخانہ کی دھوم مچ گئی۔ ہری داس گاہکوں سے ایسی خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ کہ جو ایک بار اُس سے معاملہ کرتا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اس کا خریدار بن جاتا۔ ملازموں کے ساتھ اُس کا اصول تھا۔ کام سخت اور اُجرت معقول۔ اس کی اعلیٰ اور ذاتی وجاہت کا بھی نمایاں اثر ہوا۔ قریب قریب سبھی کارخانوں کا رنگ پھیکا پڑگیا۔ اس نے بہت ہی کم نفع پر کئی ٹھیکے لے لیے۔ مشین کو دم مارنے کی مہلت نہ تھی۔ رات اور دن کام ہوتا تھا۔ تیسرا مہینہ ختم ہوتے ہوتے اس کارخانہ کی حیثیت ہی بدل گئی۔ احاطہ میں گھُستے ہی ٹھیلے اور گاڑیوں کا مجمع نظر آتا تھا۔ کارخانہ میں سرگرمی اور چہل پہل تھی۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف۔ اس کے ساتھ ہی حسن ترتیب اور انتظام کی یہ برکت تھی۔ کہ بھدّی عجلت کا کہیں نشان نہ تھا۔

(۳)

لالہ ہرنام داس کو رفتہ رفتہ صحت ہونے لگی۔ ایک مہینہ کے بعد وہ رُک رُک کر کچھ بولنے لگے۔ اگرچہ ڈاکٹر کی سخت تاکید تھی۔ کہ انھیں کامل سکون کی حالت میں رکھا جائے۔ پر جب سے ان کی زبان کھلی۔ انھیں ایک دم کو بھی چین نہ تھا۔ دیوکی سے کہا کرتے۔ سارا کاروبار مٹی میں ملا جاتا ہے۔ یہ لڑکا نہیں معلوم کیا کر رہا ہے۔ سارا کام اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ میں نے تاکید کردی تھی۔ کہ دینا ناتھ کو منیجر بنانا۔ لیکن اُس نے ذرا بھی پروا نہ کی۔ میری ساری عمر کی کمائی برباد ہوئی جاتی ہے۔ دیوکی تشفی دیتی۔ کہ آپ ان باتوں کا اندیشہ نہ کریں۔ کاروبار بہت خوبی سے چل رہا ہے۔ اور خوب نفع ہورہا ہے۔ پر وہ بھی اس معاملہ کو طول دیتے ہوئے ڈرتی تھی۔ کہ کہیں فالج کا پھر حملہ نہ ہوجائے۔ ہوں ہاں کرکے ٹالنا چاہتی تھی۔ ہری داس جوں ہی گھر میں آتا۔ لالہ جی اس پر سوالوں کی بوچھار کردیتے۔ اور جب وہ ٹال کر کوئی دوسرا ذکر چھیڑ دیتا۔ تو بگڑ جاتے۔ اور کہتے ظالم! تو جیتے جی میرے گلے پر چھُری پھیر رہا ہے۔ میرا سرمایہ اڑا رہا ہے۔ تجھے کیا معلوم، کہ میں نے ایک ایک کوڑی کس مشقت سے جمع کی ہے۔ تو نے دل میں ٹھان لی ہے۔ کہ اس بڑھاپے میں مجھے گلی گلی ٹھوکر کھلائے۔ مجھے کوڑی کوڑی کا محتاج بنا دے۔ ہری داس پھٹکار کا کوئی جواب نہ دیتا۔ کیونکہ بات بات سے بڑھتی ہے۔ اس کی خموشی سے لالہ صاحب کو یقین

ہو جاتا۔ کہ ضرور کارخانہ تباہ ہو گیا۔

ایک روز دیوکی نے ہری داس سے کہا۔"ابھی کتنے دن اور ان باتوں کو لالہ جی سے چھپاؤ گے؟"

ہری نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں کی نئی مشین کا روپیہ ادا ہو جائے۔ تو انھیں لے جاکر سب کچھ دکھا دوں۔ تب تک ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے موافق تین مہینے بھی پورے ہو جائیں گے۔"

دیوکی۔ لیکن اس چھپانے سے کیا فائدہ۔ جب وہ آٹھوں پہر اسی کی رٹ لگائے رہتے ہیں۔ اس سے تو فکر اور بڑھتی ہی ہے۔ کم نہیں ہوتی۔ اس سے تو یہی اچھا ہے۔ کہ ان سے سب کچھ کہہ دیا جائے۔

ہری داس۔ میرے کہنے کا تو انھیں یقین آچکا۔ ہاں دینا ناتھ کہیں، تو شاید یقین ہو۔

دیوکی۔ اچھا تو کل دینا ناتھ کو یہاں بھیج دو۔ لالہ جی اسے دیکھتے ہی خود بلالیں گے۔ تمھیں اس روز روز کی پھٹکار سے تو نجات مل جائے گی۔

ہری داس۔ اب مجھے ان پھٹکاروں کا ذرا بھی ملال نہیں ہوتا۔ میری محنت اور قابلیت کا نتیجہ آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ جب میں نے کارخانہ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ آمدنی اور خرچ کی میزان مشکل سے بیٹھتی تھی۔ آج پانچ سو کا نفع ہے۔ تیسرا مہینہ ختم ہونے والا ہے۔ اور میں مشین کی آدھی قیمت ادا کر چکا۔ غالباً آئندہ دو مہینوں میں پوری قیمت ادا ہو جائے گی۔ اس وقت سے کارخانہ کا خرچ تگنے سے زیادہ ہے۔ لیکن آمدنی پچگنی ہو گئی ہے۔ حضرت دیکھیں گے۔ تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ کہاں احاطہ میں ہُو کا عالم رہتا تھا۔ ایک میز پر بیٹھے آپ اُونگھا کرتے تھے۔ ایک پر دینا ناتھ کان کُریدا کرتا تھا۔ مستری اور فائرمین تاش کھیلتے تھے۔ بس دن میں دو چار گھنٹہ چکی چل جاتی تھی۔ اب دم مارنے کی فرصت نہیں ہے۔ ساری زندگی میں جو کچھ نہ کر سکے۔ وہ میں نے تین ماہ میں کر کے دکھا دیا۔ اسی تجربہ اور کارروائی پر آپ کو اتنا گھمنڈ تھا۔ جتنا کام وہ ایک مہینہ میں کرتے تھے، اتنا میں روز کر ڈالتا ہوں۔

دیوکی نے ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔"اپنے مُنہ میاں مٹھو بننا کوئی تم سے سیکھ جائے۔ جس طرح ماں اپنے بیٹے کو ہمیشہ دُبلا ہی سمجھتی ہے اسی طرح باپ بھی بیٹے کو

ہمیشہ نادان سمجھا کرتا ہے۔ یہ اُن کی ماتما ہے۔ بُرا ماننے کی بات نہیں۔

"ہری داس نے ندامت سے سے سر جھکا لیا۔

(۴)

دوسرے روز دینا ناتھ عیادت کے بہانے سے لالہ ہرنام داس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لالہ جی اسے دیکھتے ہی تکیہ کے سہارے اُٹھ بیٹھے۔ اور ایک وحشیانہ اضطراب سے پوچھا۔

"کیوں! کاروبار سب تباہ ہوگیا۔ یا ابھی کچھ کسر باقی ہے۔ تم لوگوں نے تو مجھے مُردہ سمجھ لیا۔ کبھی بات تک نہ پوچھی۔ کم از کم تم سے مجھے ایسی اُمید نہ تھی۔ بہو نے میری تیمارداری نہ کی ہوتی۔ تو مر ہی گیا ہوتا۔

دینا ناتھ۔ آپ کی خیریت مزاج روز بابو صاحب سے دریافت کرلیا کرتا تھا۔ آپ نے میرے ساتھ جو نیکیاں کی ہیں۔ انھیں میں بھول نہیں سکتا۔ میرا ایک ایک رویاں آپ کا احسان مند ہے۔ مگر اس دوران میں کچھ کام ہی ایسا تھا کہ حاضر ہونے کی مہلت نہ ملی۔

ہرنام داس۔ خیر کارخانہ کی کیا کیفیت ہے۔ دیوالہ ہونے میں کیا کسر باقی ہے؟

دینا ناتھ نے تعجب کے ساتھ کہا۔"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ کہ دیوالہ ہونے والا ہے۔ اس عرصہ میں کاروبار میں جو ترقی ہوئی ہے۔ وہ آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔"

ہرنام داس۔ طنز کے ساتھ بولے۔"شاید تمھارے بابو صاحب نے تمھاری خاطر خواہ ترقی کردی۔ اچھا اب آقا پرستی چھوڑو۔ اور صاف بتلاؤ۔ میں نے تاکید کردی تھی۔ کہ کارخانے کا انتظام تمھارے ہاتھ میں رہے گا مگر شاید ہری داس نے سب کچھ اپنے ہی ہاتھ میں رکھا۔

دینا ناتھ۔ جی ہاں! مگر مجھے اس کا مطلق ملال نہیں۔ وہی اس کام کے لیے موزوں بھی تھے۔ جو کچھ انھوں نے کر دکھایا۔ وہ مجھ سے ہرگز نہ ہوسکتا۔

ہرنام داس۔ مجھے یہ سُن سُن کر حیرت ہوتی ہے۔ بتلاؤ تو کیا ترقی ہوئی۔

دیناناتھ۔ تفصیل تو بہت زیادہ ہوگی۔ مگر مختصر یہ سمجھ لیجیے۔ کہ پہلے ہم لوگ جتنا کام ایک

چھینے میں کرتے تھے۔ اتنا اب روز ہوتا ہے۔ نئی مشین آئی تھی۔ اس کی آدھی قیمت ادا ہوچکی ہے۔ وہ اکثر رات کو بھی چلتی ہے۔ ٹھاکر کمپنی کا پانچ ہزار من آٹے کا ٹھیکہ لیا تھا۔ وہ اب پورا ہونے والا ہے۔ جگت رام بنواری لال سے کم ریٹ کا ٹھیکہ لیا ہے۔ انھوں نے ہم کو پانچ سو بورے ماہوار کا بیعانہ دیا ہے۔ اسی طرح اور پھٹکل کام کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ آمدنی کے ساتھ مصارف بھی بڑھے ہیں۔ کئی آدمی زائد رکھے گئے ہیں۔ ملازموں کو اُجرت کے ساتھ کمیشن بھی ملتا ہے۔ مگر خالص نفع پیشتر کے مقابلہ میں چوگنے کے قریب ہے۔

ہرنام داس نے بڑی توجہ سے یہ باتیں سُنیں۔ وہ غور سے دینا ناتھ کے چہرہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید اُس کے دل میں بیٹھ کر حقیقت حال کی تہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ شبہ آمیز انداز سے بولے۔"دینا ناتھ! تم کبھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ لیکن تاہم مجھے ان باتوں پر یقین نہیں آتا۔ اور جب تک اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لوں گا۔ یقین نہ آئے گا۔"

دینا ناتھ کسی قدر مایوس ہوکر رخصت ہوا۔ اسے امید تھی۔ کہ لالہ صاحب ترقی اور کارگزاری کا یہ تذکرہ سُنتے ہی پھولے نہ سمائیں گے۔ اور میری ...... جانفشانی کی داد دیں گے۔ اس غریب کو نہ معلوم تھا۔ کہ بعض دلوں میں ظنّیات کی جڑ اتنی مضبوط ہوتی ہے۔ کہ ثبوت و دلیل کی ضربیں۔ اس پر کچھ اثر نہیں کرسکتیں۔ یہاں تک کہ وہ نظری مشاہدہ کو بھی شعبدہ یا طلسم سمجھتا ہے۔

دینا ناتھ کے چلے جانے کے بعد لالہ ہرنام داس کچھ دیر تک گہرے خیال میں ڈوبے رہے۔ دفعتاً کہار سے بگھّی منگوائی۔ لاٹھی کے سہارے بگھی میں آبیٹھے۔ اور اُسے اپنے چکّی گھر چلنے کا حکم دیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ کارخانوں کے مزدور کھانا کھانے کے لیے غول کے غول بھاگے چلے آتے تھے۔ مگر ہری داس کے کارخانہ میں کام جاری تھا۔ بگھی احاطہ میں داخل ہوئی۔ دو رویہ پھولوں کی قطار نظر آئی۔ مالی کیاریوں میں پانی دے رہا تھا۔ ٹھیلے اور گاڑیوں کے مارے بگھی کو نکلنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ جدھر نگاہ جاتی تھی۔ صفائی اور ہریالی نظر آتی تھی۔ ہری داس اپنے محرر کو چند خطوط کا مسودہ لکھا رہا تھا۔ کہ بوڑھے لالہ جی لاٹھی ٹیکتے ہوئے

کارخانہ میں داخل ہوئے۔ ہری داس فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور انھیں ہاتھوں کا سہارا دیتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے کہلا کیوں نہ بھیجا۔ کہ میں آنا چاہتا ہوں۔ پالکی منگوا دیتا۔ آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔“ یہ کہہ کر اُس نے ایک آرام کرسی بیٹھنے کے لیے کھسکا دی۔ کارخانہ کے ملازم دوڑے۔ اور اُن کے چاروں طرف مؤدب کھڑے ہوگئے۔ ہرنام داس کُرسی پر بیٹھ گئے۔ اور بوروں کے سر بہ سقف انبار پر نظر دوڑا کر بولے۔ ”معلوم ہوتا ہے۔ دینا ناتھ سچ کہتا تھا۔ مجھے یہاں کئی نئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ بھلا کتنا کام روز ہوتا ہے؟“

ہری داس۔ آج کل کام زیادہ آگیا تھا۔ اس لیے کوئی پانسو من روزانہ تیار ہوجاتا تھا۔ لیکن اوسط ڈھائی سو من کا رہے گا۔ مجھے نئی مشین کی قیمت ادا کرنا تھی۔ اس لیے اکثر رات کو بھی کام ہوتا ہے۔

ہرنام داس۔ کچھ قرض لینا پڑا۔

ہری داس۔ ایک کوڑی نہیں۔ صرف مشین کی آدھی قیمت باقی ہے۔ ہرنام داس کے چہرہ پر اطمینان کا رنگ نظر آیا۔ شبہ نے یقین کو جگہ دی۔ محبت آمیز نگاہوں سے لڑکے کی طرف دیکھا۔ اور رقت آمیز آواز سے بولے۔ ”بیٹا! میں نے تمھارے اُوپر بڑا ظلم کیا۔ مجھے معاف کرو۔ مجھے مردم شناسی کا غرّہ تھا۔ لیکن مجھے بہت دھوکا ہوا۔ مجھے اب سے بہت پہلے اس کام سے دست بردار ہونا چاہیے تھا۔ میں نے تمھیں بہت نقصان پہنچایا۔ یہ مرض مبارک ہے۔ جس نے مجھے تمھاری پرکھ کا موقع دیا۔ اور تمھیں اپنی لیاقت کے دکھانے کا۔ کاش یہ حملہ پانچ سال پہلے ہی ہوتا! ایشور تمھیں سرسبز کرے۔ اور ہمیشہ برکت دے۔ یہی تمھارے بوڑھے باپ کی دعا ہے۔“

پہلی بار پریم بتیسی میں شائع ہوا۔ ہندی میں مبارک بیماری کے عنوان سے گپت دھن نمبر1 میں شامل ہے۔

نوک جھونک

(بیوی)

"میں درحقیقت بدنصیب ہوں ورنہ کیوں مجھے روز ایسے نفرت انگیز نظارے دیکھنے پڑتے۔" افسوس تو یہ ہے کہ یہ مجھے صرف دیکھنے ہی نہیں پڑتے بلکہ بدنصیبی نے بعض کو میری زندگی کا جزوِ خاص بنا دیا ہے۔ میں اس عالی ظرف برہمن کی لڑکی ہوں جس کا احترام بڑی بڑی ہندو مذہبی سوسائٹیوں میں کیا جاتا ہے، جو آج مذہب کا ستون سمجھا جاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے گھر پر کبھی بغیر نہائے اور پوجا کیے مُنھ میں پانی کی ایک بوند تک بھی ڈالی ہو۔ مجھے ایک بار بخار کی حالت میں بغیر نہائے ہوئے مجبوراً دوا پینی پڑی تھی۔ اُس کا مجھے مہینوں رنج رہا۔ ہمارے گھر میں دھوبی قدم نہیں رکھنے پاتا تھا۔ چماریاں تو دالان میں بھی نہ بیٹھ سکتی تھیں۔ اور جولاہوں کے لڑکوں کے ساتھ تو کھیلتے ہوئے مجھے سخت نفرت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن یہاں آکر گویا میں ایک ظلمت کدہ میں پہونچ گئی۔ میرے شوہر بڑے رحیم، خوش اخلاق، قابل شخص ہیں۔ اُن کے یہ اوصاف دیکھ کر میرے باپ اُن پر محو ہوئے۔ لیکن افسوس وہ کیا جانتے تھے کہ یہ لوگ ایسے لامذہب ہیں۔ سندھیا اور عبادت درکنار، کوئی یہاں روزانہ نہاتا بھی نہیں۔ ہمیشہ کمرے میں مسلمان، عیسائی آیا کرتے ہیں۔ اور آپ وہیں بیٹھے بیٹھے پانی چائے دودھ پی لیتے ہیں۔ اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ وہیں بیٹھے بیٹھے مٹھائیاں بھی کھالیتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میں نے انھیں لمنیڈ پیتے دیکھا تھا۔ سائیس جو چمار ہے، بغیر روک ٹوک گھر میں -آتا ہے اور بورے سے چنے نکال لے جاتا ہے۔ سُنتی ہوں وہ اپنے مسلمان دوستوں کے یہاں دعوتیں کھانے بھی جایا کرتے ہیں۔ یہ بے عنوانیاں مجھ سے دیکھی نہیں جاتیں۔ میری طبیعت متنفر ہوتی جاتی ہے۔ جب وہ مسکراتے ہوئے میرے قریب آجاتے ہیں اور میرا ہاتھ پکڑکر اپنے پاس بیٹھا لیتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور میں اُس میں سما جاؤں۔ اپنی اس ذلت پر اپنے

نامعقول طرز زندگی پر میرے چشم دل سے لہو کے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اُف! ہندو قوم! تو نے ہم عورتوں کو ایسا کمزور بنا دیا۔ کیا اپنے خاوندوں کی لونڈی بننا ہی ہماری زندگی کا فرض اولیٰ ہے؟ کیا ہمارے خیال، ہمارے ارادے اور ہمارے فرائض کی کچھ قیمت نہیں ہے؟

"اب مجھے صبر نہیں آتا۔ آج میں ان حالات کا فیصلہ کردینا چاہتی ہوں۔ میں اس دام بلا سے نکلنا چاہتی ہوں۔ یہ شرمناک زندگی اب مجھ سے ایک ساعت بھی نہیں برداشت ہوسکتی۔ میں نے اپنے والدین کے دامن میں پناہ لینے کا ارادہ کرلیا ہے۔ آج یہاں عام دعوت ہو رہی ہے۔ میرے شوہر اس میں صرف شامل ہی نہیں ہیں بلکہ اُس کے خاص محرکوں میں ہیں۔ انھیں کی کوشش اور ایما سے اس نامہذبانہ بدعت کا ظہور ہوا ہے۔ مختلف مذاہب کے لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہیں۔ سُنتی ہوں مسلمان بھی اسی قطار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آسمان کیوں نہیں گر پڑتا۔ کیا بھگوان مذہب کی حفاظت کے لیے اب اُوتار نہ لیں گے؟ کیا اُس سے بھی زیادہ کسی مذہبی کجروی کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ برہمن ذات اپنے خاص بھائیوں کے علاوہ دوسرے برہمن تک کا چھوا ہوا کھانا کھانا گوارا نہیں کرتی۔ وہی ذی وقعت قوم آج اس پستی کو پہونچ گئی ہے کہ کایستھوں۔ بنیوں۔ مسلمانوں کے ساتھ تک بیٹھ کر کھانے میں دریغ نہیں کرتی۔ بلکہ اُسے قومی عروج، قومی اتحاد کا باعث سمجھتی ہے؟

شوہر۔ وہ کون سا مبارک وقت ہوگا جبکہ اِس ملک کی عورتیں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں گی اور قومی شیرازہ بندی میں مردوں کا ساتھ دیں گی؟ یہ مذہبی تنگ خیالیاں کب مٹیں گی؟ ہم کب تک برہمن، غیر برہمن کے قید میں پھنسے رہیں گے! ہمارے شادی بیاہ کے طریقے کب تک خاندانی قید کی رسّی سے بندھے رہیں گے؟ ہم کو کب معلوم ہوگا کہ عورت اور مرد کے خیالات کی موافقت نسبتی پابندیوں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو برندا میری زوجہ نہ ہوتی۔ اور نہ میں اُس کا شوہر۔ ہم دونوں کے خیالات میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اگرچہ وہ ظاہراً نہیں کہتی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میرے اِن آزادانہ خیالات کو نفرت کی نظر سے دیکھتی

ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے چھونا بھی نہیں چاہتی! یہ اُس کا قصور نہیں، یہ ہمارے ماں باپ کا قصور ہے۔ جنھوں نے ہم دونوں پر ایسا ظلم کیا۔ تاہم مجھے خوشی ہے کہ برندا اتنی خود دار ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ مشکلات میں بھی اپنے خیالات پر خواہ وہ صحیح ہوں یا غیر صحیح نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رہتی ہے۔

کل برندا کُھل پڑی۔ میرے کئی دوستوں نے عام دعوت کی تجویز کی تھی۔ میں نے بخوشی اس کی تائید کی تھی۔ کئی دن کی بحث و تکرار کے بعد آخر کل میرے گنے گنائے دوستوں نے دعوت کا سامان کر ہی ڈالا۔ ماسواء میرے صرف چار برہمن تھے۔ باقی بقال۔ کایستھ، اور چند اور مذاہب کے لوگ تھے۔ یہ آزاد روی برندا کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ میں جب کھانا کھا کر واپس آیا۔ تو وہ ایسی بے چین تھی گویا اُس کے دل پر کوئی سخت صدمہ پہنچا ہے۔ میری طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

"اب تو بہشت کا دروازہ ضرور کُھل گیا ہوگا۔"

یہ ناملائم الفاظ میرے دل پر تیر کی طرح لگے۔ کرخت آواز سے بولا۔"بہشت اور دوزخ کے خیال میں وہ رہتے ہیں جو کاہل ہیں۔ مردہ ہیں۔ ہماری دوزخ اور بہشت سب اسی زمین پر ہے، ہم اس دارِ عمل میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

برندا۔"آفریں ہے آپ کی ہمّت اور مردانگی کو اب دنیا میں آرام و چین کا راج ہو جائے گا۔ دنیا کو آپ نے بچالیا۔ اس سے بڑھ کر اس کی اور کیا بھلائی ہوسکتی ہے۔"

میں نے جھلّا کر کہا۔"جب ایشور نے تمھیں ان باتوں کے سمجھنے کی قوّت ہی نہیں دی تو میں تمھیں کیا سمجھاؤں۔ اس باہمی تفریق اور تمیز سے ہمارے ملک کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اُسے موٹی سے موٹی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے اس تفرقہ کے مٹنے سے قوم کو جو نفع ہوگا، وہ اظہر من الشّمس ہے۔ البتہ جو لوگ جان کر بھی انجان بنیں اُن کی دوسری بات ہے۔

برندا۔ کیا بغیر ایک ساتھ بیٹھ کر کھائے ہوئے آپس میں محبت نہیں پیدا ہوسکتی؟ میں نے اِس بحث میں پڑنا فضول تصور کرکے کسی ایسے اصول کی آڑ لینا مناسب خیال کیا

جس میں مباحثہ کی گنجائش ہی نہ ہو۔ برندا مذہبی عقائد پر جان دیتی ہے۔ میں نے اسی کے منتر سے اُسے تسخیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم مرد لوگ مذہبی عقائد کا بھی احترام نہیں کرتے۔ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے ذرا غور تو کرو یہ کتنی بڑی نا انصافی ہے کہ ہم سب ایک ہی خالق کی مخلوق ہوتے ہوئے ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں، اعلیٰ اور ادنیٰ کی تخصیص کریں! یہ ساری دنیا اُسی معبود حقیقی کا جلوہ ہے۔ ہرایک ذی روح اسی نور حقیقی سے منوّر ہے۔ صرف اسی نفسانیت کے پردے نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ اسی خودپروری نے ہمیں اندھا بنا دیا ہے۔ ورنہ دراصل ہم سب ایک ہیں۔ جس طرح سورج کی روشنی مختلف مکانوں میں جاکر اختلافی صورت نہیں اختیار کرتی اُسی طرح پرودگارِ عالم کی روشنی بھی مختلف اجسام میں جاگزیں ہوکر علیٰحدہ نہیں ہوجاتی۔ کیا سورج کی روشنی جھونپڑیوں پر نہیں پڑتی؟ میں تو کہوں گا کہ جھونپڑیوں پر محلوں سے کہیں زیادہ روشنی پڑتی ہے۔" علیٰ ہذا میرے اِس عارفانہ سیلاب نے برنداؔ کے سوکھے ہوئے دل کو شاداب کردیا۔ وہ ہم تن گوش ہوکر میری باتیں سنتی رہی۔ جب میں خاموش ہوگیا تو اُس نے میری طرف اِرادت مندانہ نگاہوں سے دیکھا اور رونے لگی۔

انسان کا دل بلاک کے مانند ہے۔ اُس کے نشانات مٹانا یوں تو ناممکن ہے، مگر اُسے گرم کرکے ہم اُس کی جگہ نئے نشانات مرتسم کرسکتے ہیں۔ برندا کے دل سے خاندانی عظمت اور قومی غرور کے حروف مٹ گئے۔ اُن کی جگہ عالمگیر روحانی ارتباط کے حروف منقوش ہوگئے۔

بیوی۔ سوامی جی کے گیان اُپدیش نے مجھے بیدار کردیا۔ اُف! میں اندھے کنوئیں میں پڑی تھی اس نے اُٹھاکر مجھے ایک روشن قلۂ کوہ پر پہنچا دیا۔ میں نے اپنے اعلیٰ خاندان کے غرور میں، اپنی اونچی ذات کے ناجائز فخر میں کتنے ہی نفوس کی بے عزتی کی۔ اے پرماتما تو مجھے معاف کر، اپنے قابل احترام شوہر سے جو کدورت پیدا ہوگئی تھی اور جو محبت کی کمی میری طرف سے ظاہر ہوئی ہو اُسے معاف فرما۔

جب سے میں نے وہ نورانی الفاظ سُنے ہیں۔ میرا دل بہت نازک ہوگیا ہے۔ طرح

طرح کے نیک اِرادے ہوتے رہتے ہیں۔

کل دھوبن کپڑے لے کر آئی تھی۔ اُس کے سر میں بڑا درد تھا۔ کراہ رہی تھی۔ پہلے میں اُسے اس حالت میں دیکھ کر شاید زبانی ہمدردی کرتی یا مہری سے تھوڑا سا تیل دلا دیتی۔ پر کل میرا دل بے چین ہوگیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا گویا وہ میری بہن ہے۔ میں نے اُسے اپنے پاس بٹھالیا۔ اور کامل ایک گھنٹہ تک اس کے سر میں تیل ملتی رہی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اِس وقت مجھے کتنا روحانی لُطف آرہا تھا۔ میرا دل خودبخود کسی زبردست کشش کے تابع ہوکر اُس کی طرف کھینچا جاتا تھا۔ میری نند نے آکر میرے اس فعل پر کسی قدر ناک بھوں چڑھائی۔ تیور بدلے۔ مگر میں نے ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ آج علی الصباح سخت سردی تھی۔ ہاتھ پاؤں گلے جاتے تھے۔ مہری کام کرنے اُٹھی تو کھڑی کانپ رہی تھی۔ میں لحاف اوڑھے انگیٹھی کے پاس بیٹھی تھی۔ اُس پر بھی مُنھ کھولنا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ مہری کو دیکھتے ہی میرا دل بھرآیا۔ مجھے اپنی خودغرضی پر شرم آئی۔ میں نے خیال کیا جو یہ ہے وہی میں ہوں۔ اِس کی روح میں بھی وہی روشنی ہے۔ لیکن میں آرام سے آگ کے پاس بیٹھی ہوں۔ اور یہ میری خدمت میں مصروف، یہ نا انصافی کیوں؟ کیا اِس وجہ سے کہ میں ایک دولت مند شخص کی بیوی ہوں؟ کیا اس وجہ سے کہ خودی نے ہماری نگاہوں پر پردے ڈال دیئے ہیں۔ مجھے کچھ سوچنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ فوراً اُٹھی اور اپنا شال لاکر مہری کو اُڑھا دیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر انگیٹھی کے پاس بٹھا لیا۔ اُس نے متعجب ہوکر کہا۔ ”بہو جی! چھوڑیئے۔ میں کام کروں۔ سرکار کو کچہری جانے میں دیر ہوجائے گی۔“

میں نے اپنا لحاف اُتار دیا اور اس کے ساتھ بیٹھ کر برتن دھونے لگی۔ غریب عورت مجھے باربار ہٹانا چاہتی تھی۔ میری نند نے آکر استعجاب کی نگاہ سے مجھے دیکھا اور اس طرح منہ بناکر چلی گئی گویا میں کوئی سوانگ بھر رہی ہوں۔ تمام گھر میں ہلچل مچ گئی۔ گویا کوئی نہایت تعجب خیز واقعہ ہوگیا ہے ہم کتنے خودپرست ہیں۔ ہم پرماتما کی توہین کرتے ہیں، نفسانیت کے دام میں پھنس کر اپنے ہی اوپر انواع و اقسام کے ظلم کرتے ہیں! افسوس۔

شوہر۔ شاید میانہ روی عورتوں کی سرشت میں داخل ہی نہیں۔ وہ حدود ہی پر رہ سکتی ہیں۔ برندا کہاں تو ابھی اپنی عالی نسبی پر جان دیتی تھی، قومی وقار کا راگ الاپتی تھی،

کہاں اب مساوات اور ہمہ اوست کی مورت بنی بیٹھی ہے۔ میری ذرا سی تعلیم کا یہ اثر ہے! اب میں بھی اپنی قوتِ تالیف پر ناز کروں گا۔ واقعی یہ جنس تمیز سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ اس میں مجھے اعتراض نہیں ہے۔ کہ وہ نیچی ذاتوں کی عورتوں کے ساتھ بیٹھے، ہنسے، بولے۔ انھیں پڑھ کر کچھ سُنائے۔ لیکن اُن کے پیچھے اپنے آپ کو بالکل کھو دینا میں کبھی بھی گوارا نہیں کرسکتا۔

"تین دن ہوئے میرے پاس ایک چمار اپنے زمیندار کے مظالم کا رونا رونے آیا۔ بیشک زمیندار نے اس کے ساتھ سختی برتی تھی۔ لیکن وکیل مُفت میں تو مقدمہ نہیں دائر کیا کرتا اور پھر ایک چمار کے پیچھے ایک بڑے زمیندار سے دشمنی کروں۔ ایسا کروں تو پھر وکالت کرچکا۔ اس کی فریاد کی آواز برندا کے کان میں پڑگئی۔ وہ میرے درپے ہوئی کہ اس مقدمہ کی پیروی ضرور کیجیے۔ اور لگی بحث مباحثہ کرنے۔ میں نے حیلہ وحوالہ کرکے اُسے کسی طرح ٹالنا چاہا۔ لیکن اُس نے مجھ سے وکالت نامہ پر دستخط بنواہی لی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تین دنوں میں میرے پاس کئی مقدمے ایسے ہی مفت خوروں کے آئے اور مجھے کئی بار برندا کو سخت الفاظ میں فہمائش کرنا پڑی۔ اسی وجہ سے بزرگوں نے عورتوں کو مذہبی مسائل کی تلقین کے قابل نہیں سمجھا۔ اتنا بھی نہیں جانتی کہ ہرایک اصول کی عمل شان کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ خدا عادل ہے۔ پر اُس کی عدالت کے پیچھے اپنے ماحول کو کوئی نہیں بھولتا۔ اگر وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر عمل کیا جائے تو تمام دنیا میں آج امن و عافیت کی دُہائی پھر جائے۔ لیکن یہ مسئلہ فلسفے کا ایک اصول ہی رہے گا اور انسانی اخوت ہمارے نظامِ معاشرتی کی ایک محال تمنا۔

ہم اُن دونوں مسائل کی زبان سے تعریف کرتے ہیں، ان پر مناظرے کرتے ہیں۔ ان کی حمایت کرتے ہیں، عوام کی نظروں میں وقار حاصل کرنے کے لیے ان سے مدد لیتے ہیں۔ لیکن ان پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ برندا اتنی ذرا سی معمولی اور موٹی بات بھی نہیں سمجھتی!

برندا کا انہماک روزانہ ناقابلِ برداشت ہوتا جاتا ہے۔ آج سب کے کھانے کے لیے ایک ہی قسم کا کھانا بنا ہے۔ اب تک گھر کے خاص آدمیوں کے لیے باریک چاول پکتے

تھے۔ ترکاریاں گھی میں بنائی جاتی تھیں۔ دودھ، مکھن اور میوہ جات وغیرہ منگائے جاتے تھے۔ نوکروں کے لیے موٹا چاول، تیل کی ترکاری، مٹر کی دال رہتی تھی۔ دودھ وغیرہ انھیں نہیں دیے جاتے تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں کے یہاں بھی یہی دستور زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے۔ میں نے کوئی نئی بات نہیں کی ہے اور نہ نوکروں نے اس کے متعلق کبھی شکایت کی۔ لیکن آج دیکھتا ہوں تو برندا نے سب کے لیے ایک ہی قسم کا کھانا بنوایا ہے۔ آج ملازموں نے بھی وہی کھانے کھائے ہیں جو گھر کے لوگوں نے کھائے۔ میں کچھ نہ بول سکا۔ متحیّر ہوگیا۔ برندا خیال کرتی ہے کہ کھانے میں فرق کرنا نوکروں پر ظلم ہے۔ کیسا بچّوں کا سا خیال ہے! یہ اپنے مساوات کی دُھن میں شریف، رذیل، چھوٹے، بڑے کا فرق مٹانا چاہتی ہے۔ اے بے وقوف! یہ تفریق ہمیشہ قائم رہی ہے اور قائم رہے گی۔ میں بھی ملکی اتحاد کا حامی ہوں اور تمام تعلیم یافتہ ابنائے وطن اس اتحاد پر جان دیتے ہیں لیکن کوئی خواب میں بھی یہ خیال نہیں کرتا کہ ان مزدوروں، خدمتگاروں کو برابری کا حق دیا جائے۔ ہم اُن میں تعلیم پھیلانا چاہتے ہیں۔ ان کو حالت افلاس سے نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ ہوا تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ پر اس کی اصلیت کیا ہے۔ یہ ہمارے دل ہی جانتے ہیں۔ خود اسُ کا اظہار نہ کیا جاوے۔ اس کا اصلی مطلب یہی ہے کہ ہمارا ملکی وقار قائم ہو۔ ہمارا دائرہ اثر وسیع ہو۔ ہم اپنے حقوق کے لیے کامیابی کے ساتھ جدوجہد کرسکیں۔ ہمیں یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ ہماری آواز صرف تعلیم یافتوں کی آواز نہیں ہے۔ بلکہ تمام قوم کی متحدہ آواز ہے۔ لیکن برندا اتنا بھی نہیں سمجھتی۔

بیوی۔ کل میرے شوہر کا منشا ظاہر ہوا۔ اس وقت میری طبیعت سخت محزوں ہے۔ اے خدا! دنیا میں اتنی نمائش ہے۔ لوگ اتنے خود غرض ہیں۔ اتنے ظالم ہیں مجھے کل یہ دردناک تجربہ ہوا۔ میں اس نصیحت کو سُن کر اپنے شوہر کو دیوتا سمجھنے لگی تھی۔ مجھے اِس بات کا فخر تھا کہ ایسی نفس مطمئنہ کی خدمت گذاری کا مجھے موقع حاصل ہے۔ یہ میرے مقدر کی خوبی ہے۔ لیکن یہ مجھے آج معلوم ہوا کہ جو لوگ ایک ساتھ دو ناؤں پر بیٹھنے میں مشاق ہیں، زیادہ تر وہی قومی خیراندیش کہلاتے ہیں۔

کل میری نند کی رخصتی تھی۔ وہ سُسرال جا رہی تھی۔ شہر کی بہتیری عورتیں آئی

تھیں۔ وہ سب عمدہ لباس اور مرصّع زیورات سے آراستہ ہوکر قالینوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں اُن کی مہمانداری میں مصروف تھی کہ یکایک مجھے دروازے پر چند عورتیں اِس جگہ زمین پر بیٹھی ہوئی نظر آئیں جہاں ان عورتوں کی سلیپریں اور جوتیاں رکھی تھیں۔ یہ بیچاریاں بھی رخصتی دیکھنے آئی تھیں۔ مجھے اُن کا وہاں بٹھانا نامناسب معلوم ہوا۔اس لیے میں نے اُن کو بھی لاکر قالین پر بٹھلا دیا۔ اس پر اُن خاتونوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور تھوڑے عرصے میں سب کی سب کسی نہ کسی حیلہ سے ایک ایک کرکے چلی گئیں۔ اتنے میں کسی نے میرے شوہر تک یہ خبر پہنچا دی۔ وہ باہر سے نہایت مغلوب الغیض ہوکر آئے۔ اور بھری سبھا میں مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

آج علی الصباح اُٹھی۔ تو میں نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ شب میں مہمانوں کی دعوت و مدارات کے بعد جو جھوٹے پتّل۔ شکورے۔ دونے وغیرہ باہر میدان میں پھینک دی گئی تھیں۔ اس وقت پچاسوں آدمی اُنھیں پتلوں پر گرے ہوئے اُن کو چاٹ رہے تھے! ہاں انسان تھے۔ انسان اور وہی انسان جن میں پرماتما کا جلوہ ہے۔ روشنی ہے۔ بہتیرے کتّے بھی پتلوں پر جھپٹ رہے تھے۔ پر یہ کنگلے کتّوں کو مار کر ہٹا دیتے تھے۔ ان کی حالت کتوں سے بھی گئی گزری تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ایشور! یہ بھی ہمارے بھائی بہن ہیں۔ ہماری ہی روحیں ہیں۔ اُن کی ایسی قابلِ رحم حالت میں نے اسی وقت مہری کو بھیج کر اُن آدمیوں کو بلایا اور چینی مٹھائیاں وغیرہ جو مہمانوں کے لیے رکھی ہوئی تھیں سب کی سب پتلوں میں رکھ کر اُنھیں دے دیں۔ مہری تھرانے لگی کہ مالک سُنیں گے تو میرے سر کا ایک بال نہ چھوڑیں گے۔ لیکن میں نے اُسے ڈھارس دی تب اُس کی جان میں جان آئی۔

ابھی یہ بیچارے مٹھائیاں کھا ہی رہے تھے۔ کہ میرے شوہر صاحب بھی غصّے میں بھرے ہوئے آئے۔ اور نہایت سخت آواز سے بولے۔"تمھاری عقل پر پتھر تو نہیں پڑ گیا ہے کہ جب دیکھو ایک نہ ایک آفت مچائے رہتی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ مٹھائیاں ڈومڑوں کے لیے نہیں بنوائیں گئیں تھیں۔ مہمانوں کے لیے بنوائی گئیں تھیں۔ اب اُن کو کیا دیا جائے گا؟ کیا تم نے میری عزت کو خاک میں ملانے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے؟

میں نے مستقل مزاجی سے کہا۔ آپ فضول غصّہ کرتے ہیں آپ کی جس قدر مٹھائیاں میں نے خرچ کی ہیں وہ سب منگا دوں گی۔ یہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا کہ کوئی شخص تو مٹھائیاں کھائے اور کوئی پتّل اور دونے چاٹے۔ ڈومڑے بھی تو انسان ہیں، اُن کی روح بھی تو وہی ہے۔ کیا یہ ناانصافی نہیں ہے؟

شوہر صاحب بولے۔ ''رہنے بھی دو۔ بے وقوف کی شہنائی بجاتی ہو۔ جب دیکھو وہی مرغ کی ایک ٹانگ کہ سب روحیں ایک سی ہیں۔ اگر ایک سی ہیں تو ایشور کو کس نے منع کردیا تھا کہ سب کو ایک حالت میں نہ رکھے۔ اس اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق اُس نے کیوں رکھی؟ بے سر پیر کی بحث کرتی ہو۔''

میں خاموش رہ گئی۔ بول نہ سکی۔ میرے دل سے شوہر کی عزّت اور محبت اُٹھنے لگی۔ افسوس! نفسانیت نے ہم کو کس قدر خودغرض بنادیا ہے۔ ہم ایشور کا بھی سوانگ بھرتے ہیں! کتنی شرمناک ریاکاری ہے۔ ہم حقیقت کو مُلکی مفاد اور ذاتی اغراض پر قربان کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ہماری کوششیں بارور نہیں ہوتیں تو تعجب کیا ہے۔''

اردو ماہنامہ زمانہ دسمبر1920 میں شائع ہوا۔ اردو مجموعہ خواب و خیال میں شامل ہے۔ ہندی میں برھم کا سوانگ کے عنوان سے مان سرو ور 8 میں شامل ہے۔

رُوحِ حیات

میرے گاؤں میں گجراتی یتیم لڑکی تھی۔ ماں باپ کی صورت تک اُسے یاد نہ تھی۔ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتی، کوئی مارتا تو روتی پھر کھیلنے لگتی۔ کوئی ترس کھاکر کچھ دے دیتا تو دوڑکر لے لیتی۔ جہاں نیند آجاتی وہیں سو رہتی، جہاں کھانے کو پاتی وہیں کھالیتی، جو کچھ پھٹے پُرانے، چیتھڑے مل جاتے وہی پہن لیتی۔ اگر کوئی رحم سے گود میں اُٹھا لیتا تو پھولے نہ سماتی تھی۔ مگر وہ اپنے ہم سن بچّوں سے زیادہ دُبلی، اُداس، یا رونی نہ تھی۔ اس کے گدرائے ہوئے بدن پر دوسری مائیں رشک کرتی تھیں، اس کی خندہ روئی دلوں کو پگھلا دیتی تھی۔ لوگ اُسے دیکھ کر خواہ مخواہ گود میں اُٹھا لیتے تھے۔

جب اُس نے ہوش سنبھالا تو کھیتوں میں مزدوری کرنے لگی۔ ٹوکری سر پر رکھے ہوئے گاتی، کھیت نراتے ہوئے ہم جولیوں سے چہل کرتی۔ سارے گاؤں کی لونڈی تھی سارے گاؤں کی دُلاری، کسی کے لیے بازار سے سودے لاتی، کسی کے بچّوں کو کھلاتی، کسی کے دھان کوٹتی، کوئی اُسے اُتارے کُرتے دے دیتا۔ کوئی پھٹی پرانی ساڑی، وہ اسی میں مگن تھی۔ نہ بیٹھی ہوئی بسورتی، نہ اپنے حال پر آنسو بہاتی، کسی کے گھر میں گانا اُٹھے کہیں ڈھول کی صدا کانوں میں آئے، سب سے پہلے وہاں جا پہنچتی۔ اُس کا دل مسرت کا بھوکا تھا۔ زندگی اُس کے لیے اجیرن، جنجال، سوہانِ رُوح، نہ تھی۔ یہ ایک نعمت تھی جس کا وہ فطرتاً، طبعًا لطف اُٹھاتی تھی۔ یہاں تک کہ شباب آپہنچا۔ نگاہوں میں شوخی نمودار ہوئی۔ جوانی گردن اُٹھاکر چلنے لگی۔ گاؤں والوں کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ سیانی لڑکی گاؤں میں کنواری کیسے رہے۔ اِسے اُن کی غیرت گوارا نہ کرسکتی تھی۔ آپس میں صلاح ہوئی۔ کسی نے اناج دیا۔ کسی نے روپے، بر کی تلاش ہونے لگی۔

(۲)

سُسرال میں گجراتی کی حالت اپنے گاؤں سے بھی بدتر تھی۔ اُس کا شوہر رام رتن

قریب کے ریلوے اسٹیشن پر پانی پانڈے تھا۔ مزاج کا بڑا سخت، نہایت غصہ ور ہمیشہ تیوریاں چڑھی رہتی تھیں، باوجودیکہ گجراتی اسٹیشن کے ملازمین کے گیہوں پیستی تھی، اور اپنی روٹیوں کے لیے شوہر کی محتاج نہ تھی۔ لیکن اس سے رام رتن کی سختی اور حکومت میں کوئی کمی نہ واقع ہوتی تھی۔ باہر وہ ایک زندہ دل، خوش باش آدمی تھا۔ مگر گھر میں قدم رکھتے ہی اُس کے سر پر بھوت سوار ہوجاتا تھا۔ شاید اس کا باعث اُس کی بدگمانی تھی۔ وہ نہ چاہتا تھا کہ گجراتی کسی کے گھر جائے یا کسی سے راہ و رسم پیدا کرے۔ اور یہ گجراتی کے لیے غیر ممکن تھا۔ اُس نے اب تک آزادانہ زندگی بسر کی تھی۔ یہ قید اب اُس سے نہ سہی جاتی تھی۔ اسی آزادی نے اُسے خانہ داری کی فکروں سے بے نیاز بنا رکھا تھا۔ رام رتن تنخواہ کے علاوہ روزانہ کچھ نہ کچھ اُوپر سے کما لیا کرتا تھا۔ اور طرفہ یہ کہ پانی کو دودھ کے داموں بیچ کر وہ ٹھنڈے پانی کی مرغوب صدا لگاتا ہوا ہر ایک گاڑی کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک تیزی سے نکل جاتا تھا۔ غالبًا وہ اسی خوش آیند صدا کو مسافروں کی تسکین کے لیے کافی سمجھتا تھا۔ چاروں طرف سے "پانی پانی" کی آوازیں آتی تھیں لیکن رام رتن اُس وقت تک مخاطب نہ ہوتا تھا جب تک کہ اُس کی قیافہ شناسی یا مسافر کی بے نقاب نوازش اُسے متحرک نہ کرتی تھی۔ اتنی احتیاط پر بھی جب عسرت سے اس کا گلا نہ چھوٹتا تھا تو اُسے قدرتاً گجراتی پر غصہ آتا تھا۔ مگر گجراتی اِن آئے دن کی کشمکشوں کو زندگی کی ایک معمولی کیفیت خیال کرتی تھی۔ اُس کی شگفتہ طبعی، اور آزادہ روی پر ان کا بہت ہی خفیف اثر پڑتا تھا۔

(۳)

گجراتی کی شادی کے پانچ سال بعد میں پھر اپنے موضع پر گئی۔ شہر میں پلیگ پھیلا ہوا تھا۔ ورنہ ہم شہریوں کو دیہات کی زندگی میں کیا لطف؟ ساون کا مہینہ تھا۔ گاؤں کی کئی لڑکیاں سُسرال سے آئی ہوئی تھیں۔ میرا آنا سُن کر سب کی سب مجھ سے ملنے آئیں۔ ان میں گجراتی بھی تھی۔ اُس کا چہرہ شگفتہ تو نہ تھا پر اُس کے حُسنِ متین کے پردے میں شباب کی حرارت اور سُرخی جھلک رہی تھی۔ صبحِ خنداں نہ تھی، شبِ ماہ تھی، ضبط اور شوقِ پنہاں کی تفسیر۔ اس کی گود میں ایک چاند سا بچّہ تھا۔ میں نے اس سے گلے ملنے کے بعد بچّہ کو گود میں لیا تو میرا کلیجہ سَن سے ہوگیا۔ وہ دونوں آنکھوں کا اندھا تھا۔ گجراتی سے پوچھا۔ "اسے کوئی بیماری ہوئی تھی یا جنم سے ایسا ہی ہے۔"

گجراتی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ”نہیں بہن جی۔ اسے سیتلا جی نکل آئی تھیں۔ اُسی میں دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔ بہت مان منوتی کی مگر دیبی جی نے آنکھیں لے ہی لیں۔ جان چھوڑ دی یہی بہت کیا۔“

”بیچارے کی زندگی ہی خراب ہوگئی۔“

”بھگوان کی یہی مرضی تھی تو کسی کا کیا بس چلتا۔“

”اِس کا باپ ابھی اُسی اسٹیشن پر ہے؟“

گجراتی کے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آنسو کی بوندیں گر پڑیں۔ بولی۔ ”انھیں تو بھگوان نے بلا لیا۔ سال بھر ہوگئے۔ ایک مسافر کو پانی پلانے لگے کہ اتنے میں گاڑی کھل گئی۔ مسافر جیب میں سے پیسہ نکالنے لگا۔ یہ اُسے لینے کو لپکے۔ گاڑی تیج ہوگئی۔ نہ جانے کیسے گر پڑے۔ پٹری کے نیچے دب گئے۔ بھاگ میں مُنہ دیکھنا بھی نہ بدا تھا۔ تب سے پھر یہیں چلی آئی ہوں۔ محنت مجوری کر کے دن کاٹتی ہوں۔ آپ لوگوں کے دیا دھرم سے یہ لڑکا جی جائے۔ بس مجھے اور کچھ نہ چاہیے۔ یہیں کی رُوٹیاں کھا کر پلی ہوں۔ یہیں مروں گی۔

دوسرے دن ناگ پنچمی تھی۔ گاؤں کی بڑی چھوٹی لڑکیاں بناؤ سنگار کر کے اپنی اپنی گڑیاں لے کر میلے چلیں۔ ایک تالاب کے کنارے میلا لگتا ہے۔ وہیں ناگ کی پوجا ہوتی ہے۔ انھیں دودھ چاول کھلایا جاتا ہے۔ گجراتی بھی خوش خوش اس مجمع میں تھی۔ اُس کے گانے کی سُریلی آواز دل کو کھینچے لیتی تھی۔ اُس کا دل رنج و غم کے بارِ گراں کے نیچے اُسی طرح خوش فعلیاں کر رہا تھا جیسے کوئی جاندار گھوڑا سوار کی ران کے نیچے جوش سے اینڈتا ہوا چلتا ہے۔

میں ساون بھر اپنے موضع میں رہی۔ آئے دن عورتوں کا گانا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی سوانگ بھرے جاتے تھے اور نقلیں بھی ہوتی تھیں۔ گجراتی ان تفریحوں کی روح رواں تھی۔ میں نے اُسے نصیبوں کو کوستے یا تقدیر کو روتے نہیں دیکھا۔ حیات ایک نعمت ہے۔ اُس کی زندگی اس حقیقت کی بدیہی مثال تھی۔

(۴)

مجھے ایک مدّت دراز تک پھر اپنے موضع میں جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ پلیگ کا دورہ تو

ہر سال ہی ہوتا تھا پر اب ہم اس کے خوگر ہوگئے تھے۔

دس سال گزر گئے۔ ایک روز گجراتی نے میرے پاس ایک نائی کے ہاتھوں نوید بھیجا۔ میں نے نوید پڑھا تو بے اختیار اُسے قبول کرلیا۔ گجراتی نے اپنا نیا مکان بنوایا تھا۔ اس کا گرہ پربیش دھوم سے ہونے والا تھا۔ گجراتی نے مجھ سے بہت پیار سے کہا کہ بہن تم ضرور آؤ نہیں تو مجھے رنج ہوگا۔ اور میں پھر تمھیں کبھی اپنا مُنہ نہ دکھاؤں گی۔ مجھے تو حیرانی ہوئی کہ اُسے اپنا مکان بنوانے کی توفیق کیوں کر ہوئی۔ روٹیاں ہی مشکل سے چلتی تھیں۔ گھر کیوں کر بنوا لیا۔ تقریب کی مقررہ تاریخ کو میں اپنے موضع جا پہنچی۔ گجراتی ایسی خوش ہوئی گویا اندھا آنکھیں پاجائے۔ میرے پیروں پر گرپڑی اور روکر بولی میں جانتی تھی کہ تم جرور سے جرور آؤگی۔ میرا مَن کہتا تھا کہ تم مجھے بھولی نہیں ہو۔ یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے نئے گھر میں لے گئی۔ کچا مکان تھا مگر پٹا ہوا۔ دروازے پر وسیع صحن۔ ایک طرف پکا کنواں، اور اُسی سے لگا ہوا شیوجی کا مندر تھا۔ اندر کا آنگن بھی چوڑا، چاروں طرف برآمدے، کمرے ہوادار سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو آرہی تھی۔ اور اگرچہ دھوپ تیز تھی مگر اندر ایک خاص طراوت معلوم ہوتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ایسا مکان تو سارے گاؤں میں نہ ہوگا۔ دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔''

گجراتی نے اندازِ تفاخر سے کہا، بہن جی، یہ سب تمھاری دَیا ہے۔ میرے دل میں یہی ارمان تھا وہ پورا ہوگیا، آٹھ سال ہوگئے میں نے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ چار چار پنسیری گیہوں روز رات کو پیستی تھی۔ دِن بھر مجوری کرتی تھی۔ گاؤں بھر کے کپڑے سیتی تھی۔ اور سچّی بات تو یہ ہے کہ گاؤں والوں کی کرپا ہے نہیں تو میرا کیا کیا ہوتا۔ کسی نے لکڑی دی، کسی نے بانس دیے، گھر تیّار ہوگیا۔ جس لڑکے کو جنم دیا ہے، اُس کی ناؤ تو کسی طرح پار لگانی ہی تھی۔ آنکھیں ہوتیں تو کون چنتا تھی کماتا کھاتا۔ لیکن جب بھگوان نے آنکھیں لے لیں تو اُس کے بیٹھنے کا ٹھکانہ کرنا میرا دھرم ہوگیا۔ نہیں تو بیچارے کو کون پوچھتا۔ باپ رہتا تو یہ بوجھ اُس کے سر پڑتا۔ اب تو ان کا بوجھ بھی مجھی کو اُٹھانا پڑے گا۔ ان کے نام کو رونے اور نصیبے کو کوسنے سے تھوڑے ہی کچھ ہوتا۔

اسی اثنا میں گجراتی کا لڑکا بھی اندر آگیا۔ اُس کے جسم پر ایک زعفرانی رنگ کا کرتہ تھا۔ دھوتی زرد تھی، کھڑاؤں پہنے ہوئے تھا۔ چہرے سے معصومیت برس رہی تھی۔ گجراتی

نے کہا بیٹا تمھاری ماسی آئی ہیں۔ انھیں کچھ سناؤ۔

لڑکے نے فوراً ادب سے میرے پیروں پر سر جھکا دیا اور ایک سنسکرت کا شلوک پڑھنے لگا۔ لب و لہجہ ایسا صاف تھا اور طرزِ ادا ایسا دلکش کہ مجھے بے اختیار اُس کی حالت پر رونا آگیا۔ کاش بینا ہوتا تو نہ جانے کیا کرتا۔ شاید فطرت نے اُس کی ذہانت اور فطانت کے توازن کے اعتبار سے اُسے بینائی سے محروم کر دیا تھا۔

گجراتی نے لڑکے کو مادرانہ غرور کی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''بہن جی انھیں مین نے شاستری جی کے یہاں پڑھنے کو بٹھا دیا ہے۔ صبح کو پہنچا دیتی ہوں۔ سانجھ کو لوا لاتی ہوں۔ دوپہر کو یہ شاستری جی کے گھر کھا لیا کرتے ہیں۔ بیچارے بھلے آدمی ہیں۔ اُن پر بڑی دَیا رکھتے ہیں۔ کہتے تھے کہ دوسال میں یہ پنڈتائی کے کام میں پورے ہوجائیں گے۔ بھاگوت کا ارتھ (معنی) تو یہ ابھی لگا لیتے ہیں۔ کسی دن اِن سے کوئی کتھا سنواؤں گی۔ میں نے سمجھا اِن سے اور کوئی اُدّم تو ہوگا نہیں۔ یہ کام سیکھ لیں گے تو بھلے بُرے کسی طرح نباہ ہوہی جائے گا۔'' گاؤں کی عورتیں جمع تھیں میں وہیں جا بیٹھی۔ میرا ہی انتظار تھا۔ گانا شروع ہوگیا۔ گجراتی بھنڈارے کی طرف چلی گئی۔ آنگن میں کئی کڑھاؤ چڑھے ہوئے تھے۔ پوریاں نکل رہی تھیں۔ دروازے پر مہمان آتے جاتے تھے۔ قرب و جوار کے کئی گاؤں کے لوگ مدعو ہوئے تھے۔ دن ڈھل گیا تھا۔ گجراتی چاہتی تھی کہ چراغ جلتے جلتے اہلِ دعوت کی قطاریں اُٹھنی شروع ہوجائیں۔ اُس کا انہماک، حُسنِ انتظام اور جزرسی دیکھ کر بے اختیار بلائیں لینے کو جی چاہتا تھا۔ ایک ایک عضو سے تیزی اور چُستی ٹپک رہی تھی ضعف اور کوتاہ ظرفی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ وہ نا اہلیت جو ایسے موقعوں پر اکثر ہماری گلوگیر ہوجاتی ہے یہاں نام کو بھی نہ تھی۔ تیسرے دن بڑے اصرار کے بعد گجراتی نے مجھے رخصت کیا۔

(۵)

مگر یہ نیا مکان گجراتی کو راس نہ آیا۔ موضع میں ایک بوڑھا سادھو آکر ٹھہرا۔ گجراتی نے اُس کی بڑی آؤبھگت کی۔ اُس کا لڑکا ستیہ دیو اکثر بابا جی کے پاس جاکر بیٹھا کرتا۔ ایک روز باباجی اُس کے ساتھ غائب ہوگئے۔ چاروں طرف تلاش ہوئی۔ پولیس میں حُلیہ لکھایا گیا۔ میں نے کئی اخباروں میں اعلان کرایا پر لڑکے کا سُراغ نہ ملا۔ یہی لڑکا گجراتی کی زندگی کا سہارا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ اس صدمے سے جاں بر نہ ہوسکے گی۔ اس کے تھوڑے

ہی دنوں بعد جب مجھے خبر ملی کی وہ تیرتھ کرنے چلی گئی ہے تو میرے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ بہت رنج ہوا۔ نیرنگیٔ روزگار نے ہرا بھرا باغ ویران کر دیا۔ ایک نادار، بے کس، بیوہ کے ارادے اور ہمّت کو کتنی بے دردی سے پامال کر دیا!

گجراتی کو تیرتھ کرنے میں سال بھر لگا۔ اُس نے خیال کیا تھا کہ تیرتھ کے مقاموں مٰیں شاید ستیہ دیو کا کچھ پتہ چلے۔ لیکن سال بھر کی تگ و دَو کے بعد وہ لوٹ آئی۔ میں نے اُس کی واپسی کی خبر سنی تو اظہارِ ہمدردی کے لیے اُس کے ہاں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر ایک نہ ایک رخنہ پڑتا گیا۔ اور چھ مہینے تک مجھے فرصت نہ ملی۔ بالآخر ساتویں مہینے خانگی تردداّت سے مُنہ موڑ کر اپنے موضع میں جا پہنچی۔

میں نے سمجھا تھا گجراتی کے دروازے پر خاک اُڑ رہی ہوگی، سناٹا چھایا ہوگا اور وہ خود سوگواروں کی سی غمگین صورت بنائے اُداس بیٹھی ہوگی۔ لیکن جب اُس کے دروازے پر پہنچی تو امید کے برعکس چاروں طرف رونق اور چہل پہل نظر آئی۔ باہر صحن میں کیاریاں بنی ہوئی تھیں اُن میں گلاب اور بیلے کھلے ہوئے تھے۔ مندر کے محرابوں پر لتائیں چڑھی ہوئی تھیں۔ کنوئیں پر دو تین سادھو بیٹھے ہوئے گانجے کے دَم لگا رہے تھے۔ اندر گئی تو آنگن میں کئی گائیں اور بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ بچھڑے کلیلیں کررہے تھے۔ نو بج گئے تھے۔ ایک طرف دَہی ملایا جا رہا تھا۔ دوسری طرف بڑی بڑی ہانڈیوں میں دودھ گرم ہو رہا تھا۔ چاروں طرف برآمدوں میں کھونٹیوں پر پنجرے لٹکے ہوئے تھے۔ اُن میں طرح طرح کی چڑیاں پلی ہوئی تھیں۔ ایک کنارے ایک ہرن کا بچّہ کٹوری میں دُودھ پی رہا تھا۔ گجراتی مجھے دیکھتے ہی ٹوٹ کر گلے ملی۔ اُس کے جسم پر ایک زیور بھی نہ تھا۔ گلے میں کنٹھی تھی اور کلائیوں میں چاندی کی چوڑیاں مگر چہرہ پھول کی طرح شگفتہ تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں سے رُوحانیت ٹپک رہی تھی۔ تعزیت کے الفاظ ہونٹوں تک آکر رُک گئے۔ اُس نے میرے دُبدھے کا صحیح اندازہ کرکے خود ہی پہل کی اور بولی۔

''آو۔ بہن جی۔ تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ بڑی راہ دکھائی۔ گھر پر تو سب کشل ہے۔ بچّے اچھی طرح ہیں؟''

میں نے کہا، ''تمھارے یہاں تو ایک پورا گئو شالہ کُھل گیا۔''

گجراتی۔ ''ہاں یہ گاؤں کے بچّوں کا گئوشالہ ہے۔ جندگی میں آدمی کو کچھ نہ کچھ کام تو

کرنا ہی چاہیے۔ یہ سب دودھ گاؤں بھر کے لڑکوں کو پلاتی ہوں۔ کبھی کبھی سادھو سنت لوگ آجاتے ہیں۔ انھیں کچھ دے دیتی ہوں۔ چڑیاں دل بہلانے کے لیے پال رکھی ہیں۔ اِنھیں جانوروں کے رکھ رکھاؤ میں دن کٹ جاتا ہے بہن جی تم سے پردہ نہیں کرتی، مجھ سے تو نراس ہو کے رویا نہیں جاتا۔ اور کیوں روؤں۔ پہلے اکیلے ستیہ دیو کے لیے سب کچھ کرتی تھی۔ اب گاؤں بھر کے بچّوں کے لیے کرتی ہوں۔ جب سب بچّے آآکر اپنا اپنا حصّہ دودھ پینے لگتے ہیں جو خوشی ہوتی ہے وہ تم سے کہہ نہیں سکتی۔ ستیہ دیو یہاں رہتے تو یہ سکھ مجھے کہاں میسّر ہوتا۔ کبھی برائی میں بھی بھلائی ہوجاتی ہے۔ گاؤں کے لوگ چارہ بھوسہ دے دیتے ہیں۔ مجھے بیٹھے بٹھائے سینت میں جنس ملتا ہے بس اب ایک لالسہ اور ہے کہ گاؤں میں ایک چھوٹی سی دھرم سالہ بن جائے۔ مجھے آٹھوں پہر اس کی چنتا رہتی ہے۔ دیکھیں بھگوان کب تک یہ مراد پوری کرتے ہیں۔ مرنے سے پہلے اتنا کام اور ہوجاتا تو میرا جیون سپھل ہوجاتا۔ تمھیں بھی کچھ نہ کچھ میری مدد کرنی پڑے گی۔"

کتنی ہمّت عالی تھی، کتنا پاکیزہ جوش خیر! میں اُس کی جگہ پر ہوتی تو یا تو رو رو کر مر ہی جاتی یا زندہ بھی رہتی تو مُردہ سے بدتر۔ بولی! "ہاں تم کام شروع کرو۔ مجھ سے جو کچھ ہوسکے گا اُس میں دریغ نہ کروں گی۔ تمھاری ہمّت کو دھنیہ ہے کہ اکیلی جان پر اتنی بلائیں اُٹھا رکھی ہیں۔ اتنے ثواب کا بوجھ لے کر کیسے سورگ میں جاؤ گی۔

(۶)

تھوڑے ہی دنوں میں گجراتی نے دھرم سالے کی تعمیر شروع کردی۔ قرب و جوار کے زمین داروں اور مہاجنوں نے مدد کی۔ کام چل نکلا اور چند ماہ میں ایک پختہ دو منزلہ عمارت کھڑی ہوگئی۔ جس میں پچاس آدمی بہ آسایش ٹھہر سکتے تھے۔ مگر اِدھر تو دھرم شالہ بن رہی تھی۔ اُدھر گجراتی پر فالج کا حملہ ہوا۔ شبانہ روز کی مصروفیت بلائے جان ہوگئی۔ سال بھر تک علاج ہوتا رہا۔ بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ سارا جسم ماؤف ہوگیا تھا۔ لیکن حیات باقی تھی۔ جان بچ گئی۔ ہاں دونوں ہاتھ بیکار ہوگئے اور آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہی۔ گؤشالہ تباہ ہوگئی۔ چشمۂ فیض خشک ہوگیا۔ چڑیاں بند قفس سے آزاد ہوگئیں، کتّے اور بلّیاں، ہرن اور نیولا آوارہ گرد ہوگئے۔ ایک بار پھر لہلہاتا ہوا باغ ویران ہوگیا۔ میں بھی پرششِ حال کے لیے گجراتی کے پاس پہنچی۔ اُس کی بالکل کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ بدن تار تار،

چہرہ زرد، سر کے بال خال خال رہ گئے تھے۔ جیسے کسی نے پودے کی ٹہنیاں اور پتے توڑ لیے ہوں صرف ٹھونٹھ باقی رہ گیا ہو۔ دونوں آنکھیں بیٹھ گئیں تھیں۔ میں اُس کی حالت دیکھ کر رو پڑی۔ گجراتی نے کہا۔ بہن جی، تم خوب آئیں۔ بھینٹ ہوگئی۔ کون جانے اب ملنا بدا ہے یا نہیں۔ اب تھوڑے ہی دنوں کی مہمان ہوں اتنا کرنا کہ دھرم شالہ بنا رہے اور ہر سال اس کی مرمّت ہوتی جائے۔

میں نے تشفّی دیتے ہوئے اُس سے کہا کہ تم بے فکر رہو۔ میں اس کے لیے اسی موضع کا ایک حصّہ وقف کر دوں گی۔ یہاں اکیلے پڑے تمھاری طبیعت گھبراتی ہوگی۔ کوئی تیمارداری کرنے والا بھی نہیں۔ کیوں نہ تم میرے ہاں چلے چلو وہاں بال بچّوں میں جی بہلتا رہے گا اور میں خود تمھاری خدمت میں حاضر رہوں گی۔ بالکل تکلیف نہ ہوگی۔"

گجراتی نے رُوکھی ہنسی ہنس کر کہا۔ "جو کام زندگی بھر نہ کیا وہ اب کروں۔ تن پالوں؟"

میں نے کچھ آزردہ خاطر ہوکر کہا۔ "اس میں تن پالنے کی کون بات ہے۔ تمھارا اس حالت میں پڑے رہنا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔"

گجراتی کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ چار پانچ عورتیں گھونگھٹ نکالے ہوئے آگئیں اور بولیں۔

"بواجی۔ آج تو بال کانڈ[1] ہوگا نہ۔ تھوڑا ہی تو رہ گیا ہے۔ اس آج سماپت[2] کردیجیے۔"

گجراتی نے طاق کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "ہاں آج ہوجائے گا۔ رامائن اُتار لو۔"

ایک عورت نے رامائن اُتار لی۔ اور ایک ایک چوپائی پڑھنے لگی۔ گجراتی اس کے مطلب سمجھاتی تھی۔ مجھے اب تک نہ معلوم تھا کہ گجراتی نے اتنی استعداد بہم پہنچا لی ہے۔ غور سے سننے لگی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے تک راماین کی کتھا ہوتی رہی۔ ابھی یہ عورتیں بیٹھی ہی تھیں کہ گاؤں کی کئی لڑکیاں آگئیں۔ گجراتی انھیں پڑھانے میں مصروف ہوگئی۔ اور دوپہر تک یہ شغل جاری رہا۔ اسی دوران میں کئی عورتیں اپنے بچّوں کو دکھانے بھی ائیں۔ گجراتی انھیں دیکھ

---

[1] رامائن کا ایک باب [2] ختم

دیکھ کر دوائیں دیتی جاتی تھی۔ سادھو سنتوں کے فیض صحبت سے اُسے اس فن میں ملکہ ہوگیا تھا۔

جب تخلیہ ہوا تو گجراتی نے مجھ سے کہا۔ "تمھارے ساتھ چلوں تو یہ سب کام کون کرے گا۔ پڑے پڑے آرام سے کھانے میں یہ سُکھ کہاں مِل سکتا ہے؟"

میں نے اُس کی طرف معذرت کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "میں نہ جانتی تھی کہ اس حالت میں بھی تم نے اتنے پاؤں پھیلا رکھے ہیں۔"

میری آنکھیں کُھل گئیں۔ زندگی کا کیسا سہانا پہلو تھا یہی زندہ دلی روحِ حیات ہے جو سانحات کی پرواہ نہیں کرتی، جو نیرنگئ زمانہ سے بے انتہا سنگین حالت میں، خواہ وہ کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو، خدمت اور ایثار کے راستے نکال لیتی ہے۔ نہیں۔ بلکہ ہرایک پہلو سے بڑی مصیبت سے اس کے جوہر کھلتے جاتے ہیں، زمانہ اُسے جتنا ہی پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے اتنی ہی اُس کی ہمتیں مضبوط ہوتی جاتی ہیں۔ اُتنی ہی اس کی نگاہیں وسیع تر اور ارادے زیادہ بلند ہوتے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی اصیل گھوڑا مہمیز کی چوٹ کھاکر اور بھی طرارے بھرنے لگتا ہے۔

گجراتی ابھی زندہ ہے اور میرا موضع اُسی طرح اُس کی ذات سے فیض پارہا ہے۔

اردو ماہنامہ زمانہ کے جنوری 1921 میں شائع ہوا۔ کسی اردو یا ہندی کے مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔

معمہ

میرے دفتر میں چار چپراسی ہیں۔ ان میں ایک کا نام غریب ہے۔ وہ بہت نیک، بہت فرمان بردار، اپنے کام کو بخوبی انجام دینے والا، گھڑکیاں کھانے کے بعد خاموش رہ جانے والا، اسم با مسمیٰ آدمی ہے۔ مجھے اس دفتر میں ایک سال سے زائد گزر گیا۔ مگر میں نے اُسے ایک دن کے لیے بھی دفتر سے غیر حاضر نہیں پایا۔ میں اُسے نو بجے دفتر میں اپنی پھٹی وردی میں بیٹھے ہوئے دیکھنے کا ایسا عادی ہو گیا ہوں کہ گویا وہ بھی اس عمارت کا ایک حصّہ ہے۔ سیدھا اتنا کہ کسی کی بات ٹالنا جانتا ہی نہیں۔

دفتر میں کُل چار چپراسی ہیں۔ ان میں ایک مسلمان ہے۔ اس سے تمام دفتر ڈرتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟ مجھے تو اس کا سبب بجز اس کی تعلّیوں کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے بیان کے مطابق اس کا چچا زاد بھائی ریاست رام پور میں قاضی ہے۔ پھوپھودیا ٹونک میں کوتوال ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر میرے دفتر میں تمام صاحبان نے اُسے قاضی کا خطاب دے رکھا ہے۔ بقیہ دو صاحب ذات کے برہمن ہیں۔ ان کے آشرباد کی قیمت ان کے کام سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ تینوں کام چور ہیں، گستاخ اور کاہل ہیں۔ معمولی سے کام بھی بغیر ناک بھوں چڑھائے نہیں کرتے۔ کلرکوں کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ صرف ایک بڑے بابو کا کسی قدر لحاظ کرتے ہیں۔ تاہم کبھی کبھی ان سے اُلجھ پڑتے ہیں۔ مگر باوجود اِن سب برائیوں کے دفتر میں کسی کی مٹی ایسی خراب نہیں ہے جتنی کہ بے چارے غریب کی۔ ترقی کا موقع آتا ہے تو یہی تینوں بازی مار لے جاتے ہیں۔ غریب کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ اور سب دس دس روپے پاتے ہیں اور یہ بیچارہ ابھی چھ ہی روپے میں پڑا ہے۔ صبح سے شام تک اس کا پیر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رُکتا۔ یہاں تک کہ تینوں چپراسی بھی اُسی پر اپنا رُعب جماتے ہیں اور اوپر کی آمدنی میں تو اس بیچارے کا حصّہ ہی نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ دفتر کے تمام کارپرداز چھوٹے سے لے کر بڑے بابو تک، سب کے سب اس

سے ناراض ہی رہتے ہیں۔ اس کی کئی بار شکایتیں ہوچکی ہیں۔ کتنے ہی بار جرمانہ دے چکا ہے اور ڈانٹ ڈپٹ تو روزانہ ہی ہوا کرتی ہے۔ اس کا سبب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ہاں مجھے اس پر ترس ضرور آتا تھا اور میں اپنے برتاؤ سے یہ دکھلانا چاہتا تھا کہ میری نظر میں اس کی عزّت دوسرے چپراسیوں سے مطلق کم نہ ہے۔ یہاں تک کہ میں کئی بار اس کے پیچھے دوسرے عملوں سے اُلجھ بھی پڑا ہوں۔

(۲)

ایک روز بڑے بابو نے غریب سے میز صاف کرنے کو کہا۔ وہ فوراً میز صاف کرنے لگا۔ اتفاقاً جھاڑو کا جھٹکا لگا تو دوات اُلٹ گئی اور روشنائی میز پر پھیل گئی۔ بڑے بابو دیکھتے ہی جامے سے باہر ہوگئے۔ اس کے دونوں کانوں کی خوب زور سے گوشمالی کی اور ہندوستان کی مروّجہ زبانوں سے مغلظات چن چن کر سنانے لگے۔ بیچارہ غریب آنکھوں میں آنسو بھرے خاموش کھڑا سُنتا رہا، گویا اس نے کوئی خون کیا ہو۔ مجھے بڑے بابو کا اس ذراسی بات پر اس قدر بگڑنا ناگوار گزرا۔ اگر کسی دوسرے چپراسی نے اس سے بھی کوئی بڑی خطا کی ہوتی تو انھیں اس پر اتنا غیض و غضب نہ آتا۔ میں نے انگریزی میں کہا۔ ”بابو صاحب! آپ اس موقع پر ناانصافی سے کام لے رہے ہیں۔ اس نے دیدہ دانستہ تو روشنائی گرائی نہیں۔ اُس پر اِس قدر عتاب سراسر نامناسب ہے۔“

بابوصاحب نے ملائمت سے کہا۔ ”آپ اسے نہیں جانتے یہ بڑا شریر ہے۔“

”میں تو اس کی کوئی شرارت نہیں دیکھتا۔“

”آپ ابھی اسے نہیں جانتے۔ ایک ہی پاجی ہے۔ اس کے گھروں میں دو ہلوں کی کھیتی ہوتی ہے۔ ہزاروں کا لین دین کرتا ہے۔ کئی بھینسیں لگتی ہیں۔ انھیں باتوں کا اُسے گھمنڈ ہے۔“

”گھر کی ایسی حالت ہو تو بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔“

”ابھی آپ ان باتوں کو نہیں جانتے۔ کچھ روز اور رہیے تو آپ کو خود معلوم ہوجائے گا کہ یہ کتنا کمینہ ہے۔“

ایک دوسرے صاحب بول اُٹھے۔”بھائی صاحب اس کے گھر منوں دودھ دہی ہوتا ہے، منوں مٹر جوار، چنے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی کبھی اتنی ہمّت نہیں ہوئی کہ یہ چیزیں

تھوڑی بہت دفتر والوں کے بھی نذر کرے۔ یہاں ان چیزوں کو ترس کر رہ جاتے ہیں تو پھر کیوں نہ جی جلے اور یہ سب ٹھاٹھ اسی نوکری کی بدولت ہوا ہے۔ ورنہ پہلے تو گھر میں چوہے رینگتے تھے۔"

بڑے بابو کچھ شرمندہ ہوکر بولے۔"یہ کوئی بات نہیں۔ اس کی چیز ہے خواہ وہ کسی کو دے یا نہ دے۔ لیکن بالکل جانور ہے۔ میں کسی قدر واقف ہوگیا بولا۔ "اگر واقعی ایسی اوچھی طبیعت کا آدمی ہے تو درا‌صل جانور ہے مجھے بالکل معلوم نہ تھا۔"

اب بڑے بابو جی کھلے۔ جھینپ مٹی۔ بولے۔"ان سوغات سے کسی کی روٹیاں تو چلتی نہیں۔ صرف دینے والے کی سیر چشمی ظاہر ہوتی ہے اور امید بھی اس سے کی جاتی ہے جو اس کے قابل ہوتا ہے۔ جس میں اس کی استعداد ہی نہیں اس سے کوئی توقع نہیں کرتا۔ ننگے سے کوئی کیا لے گا۔"

معمّہ حل ہوگیا۔ بڑے بابو نے معمولی طور پر ساری باتیں واضح کردیں۔دولت کے سبھی دشمن ہوتے ہیں۔ خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ ہماری سُسرال یا نانہال غریب ہوتو ہم اس سے کوئی امید نہیں رکھتے۔ ہم غالبًا بھول جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ صاحبِ ثروت ہوکر ہم سے تغافل جتائے تو ہمارے دل پر سخت چوٹ لگتی ہے۔ اور چھاتی پر سانپ لوٹتا ہے۔

ہم اپنے کسی غریب دوست کے گھر جائیں تو اس کے ایک بیڑے پان ہی سے ہماری تسکین ہوجاتی ہے۔ لیکن ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو اپنے دولت مند دوست کے گھر سے بغیر مُنہ میٹھا کیے واپس آکر اس کا شکوہ نہ کرے۔ سداما کرشن سے اگر نامراد واپس آتے تو شاید وہ ان کے شش پال اور جراسندھ سے بڑے دشمن ہوتے۔ یہ انسانی خاصہ ہے۔

(۳)

چند روز کے بعد میں نے غریب سے پوچھا۔ "کیوں جی تمھارے گھر کچھ کھیتی باڑی ہوتی ہے؟"

غریب نے لجاجت کے ساتھ کہا۔"ہاں سرکار ہوتی ہے۔ آپ کے دوگلام ہیں وہی کرتے ہیں"

"گائیں اور بھینسیں بھی لگتی ہیں؟"

"ہاں حجور بھینسیں لگتی ہیں۔ گائیں ابھی گابھن ہیں۔ آپ لوگوں کی مہربانی سے پیٹ کی روٹی چل جاتی ہے۔"

"دفتر کے بابو لوگوں کی بھی کبھی خاطر کرتے ہو؟"

غریب نے نہایت عاجزانہ لہجے میں کہا۔"سرکار میں آپ لوگوں کی کیا کھاتر کر سکتا ہوں۔ کھیتی میں جو، چنا، مکّا جوار کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ آپ لوگ رئیس ہیں۔ راجہ ہیں۔ یہ موٹے اناج کس مُنہ سے آپ کے بھینٹ کروں۔ ڈرتا ہوں کہ کوئی ڈانٹ نہ بیٹھے کہ اس ٹکے کے آدمی کی یہ مجال۔ اسی لیے بابو جی کبھی ہمّت نہیں پڑتی۔ نہیں تو دودھ دہی کی کیا بساط تھی۔ مُنہ کے لائک بیڑا تو ہونا چاہیے۔"

"اچھا ایک دن کچھ لاکر دو تو۔ دیکھوں لوگ کیا کہتے ہیں۔ شہر میں یہ چیزیں کہاں میسر ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کی طبیعتیں بھی کبھی کبھی ان چیزوں کی طرف لپکتی ہیں۔"

"اگر سرکار کوئی کچھ کہے تو! صاحب سے شکایت کردے تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔"

"اس کا میں ذمّے دار ہوں۔ تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ اگر کوئی کچھ کہے گا تو میں اسے سمجھا دوں گا۔"

"تو ہجور آج کل تو مٹر کا دن ہے۔ چنے کا ساگ بھی ہوگیا ہے اور کولھو بھی کھڑا ہوگیا ہے اور تو کچھ نہیں ہے۔"

"بس تو یہی چیزیں لاؤ۔"

"کچھ الٹی سیدھی پڑی تو سرکار ہی کو سنبھالنا ہوگا۔"

"ہاں جی کہہ تو دیا دیکھ لوں گا۔"

دوسرے روز غریب آیا تو اس کے ساتھ تین توانا آدمی تھے۔ دو کے سر پر دو ٹوکرے تھے جن میں مٹر کی پھلیاں تھیں۔ ایک کے سر پر مٹکا تھا جس میں ایکھ کا رس تھا۔ تینوں ایکھ کا ایک ایک گٹھر بھی بغل میں دبائے ہوئے تھے۔ غریب آکر چپکے سے برآمدے کے سامنے درخت کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ اس کی دفتر میں آنے کی ہمّت نہ پڑتی تھی۔ گویا کوئی مجرم ہو۔

وہ درختوں کے نیچے کھڑا ہی تھا کہ اتنے میں دفتر کے چپراسیوں اور دوسرے عملوں نے انسے گھیر لیا۔ کوئی ایکھ لے کر چوسنے لگا کوئی مٹر پھلیاں لے کر الگ ہوگیا۔ ایک لوٹ

سی مچ گئی۔ اسی عرصہ میں بڑے بابو بھی دفتر میں وارد ہوئے اور یہ تماشہ دیکھ کر بلند آواز سے بولے۔ یہ کیا آفت مچا رکھی ہے؟ چلو اپنا کام کرو۔

میں نے جاکر ان کے کان میں کہا "غریب اپنے گھر سے یہ سوغات لایا ہے۔ کچھ آپ قبول فرمایئے کچھ ہم لوگ۔ بڑے بابو نے مصنوعی عتاب کرکے کہا۔"کیوں غریب تم یہ چیزیں یہاں کیوں لائے؟ ابھی واپس لے جاؤ۔ ورنہ میں صاحب سے رپورٹ کردوں گا۔ کیا تم نے ہم لوگوں کو کوئی مربھوکا سمجھ رکھا ہے؟"

غریب کا رنگ اُڑ گیا۔ کانپنے لگا۔ مُنہ سے ایک بات بھی نہ نکلی۔ لگا میری طرف تقصیروار نگاہوں سے دیکھنے۔

میں نے اس کی طرف سے معافی مانگی۔ بڑی گفت و شنید کے بعد بابو صاحب راضی ہوئے۔ سب چیزوں میں سے نصف گھر بھیجوائیں۔ باقی نصف دوسروں کے حصّے میں آئیں۔ اس طرح یہ ناٹک ختم ہوا۔

(۴)

اب دفتر میں غریب کی عزت ہونے لگی۔ اب اُسے روزانہ گھڑکیاں نہ ملتیں۔ تمام دن دوڑنا نہ پڑتا۔ اہلکاروں کی خفگی اور چپراسیوں کی بدزبانیاں غائب ہوگئیں۔ چپراسی لوگ خود اس کا کام کرتے۔ اس کے نام میں بھی تھوڑی سی تبدیلی آئی۔ غریب سے غریب داس بنا۔

عادتیں بھی بدلنے لگیں۔ انکساری کی جگہ خودداری کا ظہور ہوا۔ چستی کی جگہ کاہلی آئی۔ وہ اب کبھی کبھی دیر کرکے دفتر آتا۔ کبھی کبھی بیماری کا حیلہ کرکے گھر بیٹھ رہتا۔ اس کے اب تمام قصور معاف ہوجاتے۔ اسے حصول عزت کا راز معلوم ہوگیا۔ وہ اب دسویں پانچویں دودھ دہی وغیرہ لاکر بڑے بابو کی نذر کرتا۔ دیوتا کو خوش کرنے کا ہنر سیکھ گیا۔ سادگی کی جگہ اب اس میں حرفت آگئی۔ چالاک بن گیا۔

ایک روز بڑے بابو نے اسے سرکاری فارموں کا پارسل چھڑانے کے لیے اسٹیشن بھیجا۔ کئی بڑے بڑے پلندے تھے۔ ٹھیلے پر آئے۔ غریب نے ٹھیلے والوں سے بارہ آنہ مزدوری طے کی تھی۔ جب کاغذات دفتر میں پہنچ گئے تو اس نے بڑے بابو سے بارہ آنہ ٹھیلے والوں کی اجرت لی۔ لیکن دفتر سے کچھ دور چل کر اس کی نیت بگڑی۔ اپنی دستوری

مانگنے لگا۔ ٹھیلے والے راضی نہ ہوئے۔ اس پر غریب نے سب پیسے جیب میں رکھ لیے اور تند لہجے میں بولا "اب ایک پیسہ بھی نہ دوں گا۔ جاؤ جہاں چاہو فریاد کرو۔ دیکھیں کیا بنا لیتے ہو۔" قلیوں کو جب یقین ہوگیا کہ اب بغیر دستوری دیے ایک پیسہ بھی ہاتھ نہ لگے گا۔ جمع ہی غائب ہوجائے گی تو مجبوراً چار پیسے دینے پر راضی ہوگئے۔ غریب نے آٹھ آنہ ان کے حوالے کیا اور بارہ آنہ کی رسید پر انگوٹھے کا نسان بنوا لیا۔ رسید دفتر میں داخل ہوگئی۔

یہ تماشہ دیکھ کر میں حیران ہوگیا۔ یہ وہی غریب ہے جو کئی مہینے پیشتر بھولے پن اور فروتنی کی تصویر تھا، جسے دوسرے چپراسیوں سے بھی کبھی اپنے حصّے کے پیسے مانگنے کی ہمّت نہ ہوتی تھی، جو دوسروں کو کھلانا بھی نہ جانتا تھا کھانے کا ذکر ہی کیا۔ اس کی فطرت میں یہ انقلاب دیکھ کر مجھے بے حد رنج ہوا۔ اس کا جوابدہ کون ہے؟ میں...... جس نے اسے خود پروری اور سفلہ پن کا پہلا سبق پڑھایا تھا۔ میرے دل میں سوال پیدا ہوا کہ اس فتنہ پروری سے جو دوسروں کا خون کرتی ہے وہ سادگی اور کس مپرسی کیا بُری تھی جو دوسروں کا ظلم برداشت کرلیتی تھی۔ وہ منحوس ساعت تھی جب میں نے اُسے احساسِ عزت کی راہ دکھانی چاہی تھی۔ دراصل وہ اس کے اخلاقی پستی کی راہ تھی۔ میں نے اس کی ظاہری عزت کے لیے اس کی روحانی عزت کا خون کردیا۔

یہ افسانہ پہلی بار ہندی ماہنامہ پربھا کے جنوری 1921 میں شائع ہوا۔ عنوان تھا 'وشم سمسیا'، مان سرور 6 میں شامل ہے۔ سمسیا کے عنوان سے یہی کہانی مان سرور 4 میں بھی شامل ہے اردو میں یہ زمانہ کانپور مارچ 1921 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اردو کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔

عجیب ہولی

ہولی کا دن تھا۔ مسٹر اے۔ بی کراس شکار کھیلنے گئے ہوئے تھے۔ سائیس۔ اردلی۔ مہتر۔ بھشتی گوالا دھوبی سب ہولی منا رہے تھے۔ سبھوں نے صاحب کے جاتے ہی خوب گہری بھنگ چڑھائی تھی۔ اور اس وقت باغیچہ میں بیٹھے ہوئے خوب پھاگ گا رہے تھے۔ لیکن رہ رہ کر بنگلہ کے پھاٹک کی طرف جھانک لیتے تھے کہ صاحب آتو نہیں رہے ہیں۔ اتنے میں شیخ نور علی آکر سامنے کھڑے ہوگئے۔

سائیس نے پوچھا۔ کہو خانساماں جی۔ صاحب کب تک آئیں گے؟

نُور علی بولا۔ اس کا جب جی چاہے آئے۔ میرا آج سے استعفا ہے۔ اب اِس کی نوکری نہ کروں گا۔

اردلی نے کہا۔ ایسی نوکری پھر نہ پاؤ گے۔ چار پیسے اوپر کی آمدنی ہے ناحق چھوڑتے ہو۔

نور علی۔ اجی لعنت بھیجو۔ اب مجھ سے غلامی نہ ہوگی۔ یہ ہمیں جوتوں سے ٹھکرائے اور ہم اس کی غلامی کریں! آج یہاں سے ڈیرا کوچ ہے۔ آؤ تم لوگوں کی دعوت کروں۔ چلو آؤ کمرے میں۔ آرام سے میز پر ڈٹ جاؤ وہ وہ بوتلیں پلاؤں کہ کلیجہ تر ہو جائے۔

سائیس۔ اور جو کہیں صاحب آجائیں؟

نور علی۔ وہ ابھی نہیں آئے گا۔ چلے آؤ۔

صاحبوں کے ملازم عموماً شرابی ہوتے ہیں۔ جس روز سے صاحب کے یہاں غلامی کا پٹہ لکھا۔ اُسی روز سے یہ بلا اُن کے سر پڑجاتی ہے۔ جب مالک خود بوتل کی بوتل انڈیل جاتا ہو تو بھلا نوکر کیوں چوکنے لگے۔

یہ دعوت پاکر سب کی باچھیں کھل گئیں۔ بھنگ کا نشہ چڑھا ہی ہوا تھا۔ ڈھول

مجیرے چھوڑ چھاڑ کر نور علی کے ساتھ چلے اور صاحب کے کھانے کے کمرے میں کرسیوں پر جابیٹھے۔ نور علی نے وسکی کی بوتل کھول کر گلاس بھرے اور چاروں نے ڈھالنا شروع کردیا۔ ٹھرا پینے والوں نے جب یہ مزے دار چیزیں پائیں تو گلاس پر گلاس چڑھانے لگے۔ خانساماں بھی حوصلہ افزائی کرتا جاتا تھا۔ ذرا دیر میں سبھوں کے سر پھر گئے۔ خوف جاتا رہا۔ ایک نے پھاگ چھیڑا دوسرے نے سر ہلایا اور گانا ہونے لگا۔ نور علی نے ڈھول مجیرا لاکر رکھ دیا۔ وہیں مجلس جم گئی۔ گاتے گاتے ایک اُٹھ کر ناچنے لگا۔ دوسرا اُٹھا۔ حتیٰ کہ سب کے سب کمرہ میں چوکڑیاں بھرنے لگے۔ ہو حق مچنے لگا۔ کبیر۔ پھاگ۔ چوتالا۔ گالی گلوچ مار پیٹ غرض باری باری سے سب کا نمبر آیا۔ سب سے نڈر ہوگئے تھے۔ گویا اپنے ہی مکان میں ہوں۔ کُرسیاں اُلٹ گئیں دیواروں پر کی تصویریں ٹوٹ گئیں۔ ایک نے میز اُلٹ دی۔ دوسرے نے کاپیوں کا گیند بناکر اُچھالنا شروع کیا۔

یہاں یہ ہنگامہ برپا تھا کہ شہر کے رئیس لالہ اُجاگرمل تشریف لائے اُنھوں نے یہ تماشا دیکھا تو چکرائے۔ خانساماں سے پوچھا کہ یہ کیا گول مال ہے۔ شیخ جی! صاحب دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟

نور علی۔ صاحب کا حکم ہی ایسا ہے تو کیا کرے؟ آج اُنہوں نے اپنے ملازموں کی دعوت کی ہے اُن سے ہولی کھیلنے کو بھی کہا ہے۔ سُنتے ہیں لاٹ صاحب کے یہاں سے حکم آیا ہے کہ رعایا کے ساتھ خوب ربط ضبط رکھو اور ان کے تیوہاروں میں شریک ہو۔ جبھی تو یہ حکم دیا ہے۔ ورنہ ان کے تو مزاج ہی نہ ملتے تھے۔ آیئے تشریف رکھیے۔ نکالوں کوئی مزے دار چیز؟ ابھی حال میں ولایت سے پارسل آیا ہے۔

رائے اُجاگرمل بڑے آزاد خیال تھے۔ انگریزی دعوتوں میں بے دھڑک شریک ہوتے تھے۔ طرزِ معاشرت بھی انگریزی تھا اور یونین کلب کے تو وہ کرتا دھرتا تھے۔ انگریزوں سے ان کی خوب چھنتی تھی۔ اور مسٹر کراس تو اُن کے گہرے دوست تھے۔ حاکم ضلع سے خواہ وہ کوئی ہو۔ ہمیشہ ان کا گہرا تعلق رہتا تھا۔ نور علی کی باتیں سنتے ہی ایک کُرسی پر بیٹھ گئے اور بولے۔ اچھا یہ بات ہے۔ ہاں تو پھر نکالو کوئی مزے دار چیز۔ کچھ گزک بھی ہو۔

نور علی۔ حضور۔ آپ کے لیے سب کچھ حاضر ہے۔

لالہ صاحب کچھ تو گھر سے پی کر چلے تھے یہاں کئی گلاس چڑھائے تو لڑکھڑاتی ہوئی

زبان سے بولے۔ کیوں نور علی آج صاحب ہولی کھیلیں گے؟

نور علی۔ جی ہاں۔

اُوجاگر۔ لیکن میں رنگ ونگ تو کچھ لایا نہیں۔ بھیجو چٹ پٹ کسی کو میرے مکان سے رنگ پچکاری وغیرہ لائے (سائیس سے) کیوں گھسیٹے آج تو بڑی بہاز ہے۔

گھسیٹے۔ بڑی بہار ہے۔ بڑی بہاز ہے۔ ہولی ہے۔

اوجاگر (گاتے ہوئے) آج صاحب کے ساتھ میری ہولی مچے گی۔ خوب پچکاری چلاؤں گا۔

گھسیٹے۔ خوب عبیر لگاؤں گا۔

گوالا۔ خوب گلال اُڑاؤں گا۔

اردلی۔ خوب کبیر سناؤں گا۔

اوجاگر۔ آج صاحب کے ساتھ میری ہولی مچے گی۔

نور علی۔ اچھا سب لوگ سنبھل جاؤ۔ صاحب کا موٹر آرہا ہے۔ سیٹھ جی یہ لیجیے میں دوڑ کر رنگ پچکاری لایا بس ایک چوتالہ چھیڑ دیجیے اور جیوں ہی صاحب کمرے میں آویں اُن پر پچکاری چھوڑیئے اور (دوسرے سے) تم لوگ اُن کے مُنہ میں گلال ملو۔ صاحب خوشی کے مارے پھُول جائیں گے۔ وہ موٹر احاطہ میں آگیا۔ ہوشیار!

(۲)

مسٹر کراس اپنی بندوق لیے ہوئے موٹر سے اُترے اور لگے آدمیوں کو بُلانے۔ مگر وہاں تو زوروں سے چوتالا ہو رہا تھا۔ سُنتا کون ہے؟ چکرائے کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ کیا سب میرے بنگلے میں گا رہے ہیں؟ غصّے سے بھرے ہوئے کمرے میں تشریف لائے تو ڈرائنگ روم (کھانے کا کمرہ) سے گانے کی آواز آرہی تھی۔ اب کیا تھا جامے سے باہر ہوگئے۔ چہرہ تمتما گیا۔ ہنٹر لے کر ڈرائنگ روم کی طرف چلے۔ لیکن ابھی ایک قدم دروازے کے باہر ہی تھا کہ سیٹھ اوجاگرلال نے پچکاری چلائی۔ سارے کپڑے تر ہوگئے۔ آنکھوں میں بھی رنگ چلا گیا۔ آنکھیں پونچھ ہی رہے تھے کہ سائیس گوالا سب کے سب دوڑے اور صاحب کو پکڑ کر ان کے مُنہ پر رنگ ملنے لگے۔ دھوبی نے تیل اور کاجل کا مرکب لگا دیا۔ صاحب کے غُصّے کی حد نہ رہی۔ ہنٹر لے کر سبھوں کو اندھا دُھند مارنے لگا۔ بیچارے سوچے ہوئے تھے کہ صاحب خوش ہوکر انعام دیں گے۔ ہنٹر پڑے تو نشہ کافور ہوگیا۔ کوئی اِدھر بھاگا

کوئی اُدھر۔

سیٹھ اوجاگرلال نے یہ رنگ دیکھا تو تاڑ گئے کہ نورعلی نے چکمہ دیا۔ ایک گوشے میں دبک رہے۔ جب کمرہ نوکروں سے خالی ہوگیا تو صاحب ان کی طرف بڑھے۔ لالہ صاحب کے ہوش اُڑگئے۔ تیزی سے کمرے کے باہر نکلے اور سر پر پَیر رکھ کر بے تحاشا بھاگے۔ صاحب ان کے پیچھے دوڑے۔ سیٹھ جی کی فٹن پھاٹک پر کھڑی ہوئی تھی۔ گھوڑے نے دھم دھم کھٹ پٹ کی آواز سُنی تو بھڑکا۔ کنوتیاں کھڑی کیں اور فٹن کو لے کر بھاگا۔ عجیب منظر تھا۔ آگے آگے فٹن۔ اس کے پیچھے سیٹھ اوجاگرلال۔ ان کے پیچھے ہنٹر گیر مسٹر کراس۔ سب بگٹٹ دوڑے چلے جاتے تھے۔ سیٹھ جی ایک بار ٹھوکر کھاکر گرے مگر صاحب کے پہنچتے پہنچتے سنبھل گئے۔ احاطے کے باہر سڑک تک گھوڑدوڑ رہی بالآخر صاحب رُک گئے۔ مُنہ میں کالک لگائے اب اور آگے جانا مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ یہ خیال بھی ہوا کہ سیٹھ جی کو کافی سزا مل چکی۔ اپنے نوکروں کی خبر لینا ضروری تھا۔ واپس گئے۔ سیٹھ اوجاگرلال کی جان میں جان آئی۔ بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ گھوڑا بھی ٹھٹھک گیا۔ کوچوان نے اُتر کر انھیں سنبھالا اور گودی میں اُٹھاکر گاڑی میں بٹھلا دیا۔

(۳)

لالہ اوجاگرلال شہر کی موالاتی جماعت کے پیشوا تھے۔ انھیں انگریزوں کی نیک نیتی پر پورا اعتقاد تھا۔ انگریزی سلطنت کی تعلیمی مالی اور ملکی ترقّی کا راگ الاپا کرتے تھے۔ اپنی تقریروں میں تارکانِ موالات کو خوب پھٹکارا کرتے تھے۔ انگریزوں میں ادھر قدرومنزلت خاص طور پر ہونے لگی تھی۔ کئی بڑے بڑے ٹھیکے جو پہلے انگریز ٹھیکہ داروں ہی کو ملا کرتے تھے ان کو دیے گئے تھے۔ ترکِ موالات کی تحریک نے ان کی عزّت و دولت میں خوب اضافہ کیا تھا۔ بس وہ زبان سے تحریک مذکورہ کی خواہ کتنی مذمت کریں، مگر دل سے اس کی ترقّی ہی چاہتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ یہ تحریک ایک ہوا ہے۔ جب تک بہتی رہے اس میں اپنے بھیگے کپڑے سکھا لیں۔ وہ تارکانِ موالات کے کاموں کو خوب بڑھا بڑھا کر بیان کرتے تھے۔ اور حکام کو ان مصنوعی باتوں پر یقین کرتے دیکھ کر دل میں ان پر خوب ہنستے تھے۔ جیوں جیوں عزت بڑھتی تھی، ان کی خودداری میں بھی افزونی ہوتی جاتی تھی۔ وہ اب پہلے کی طرح بُزدل نہ تھے۔ گاڑی پر بیٹھے اور ذرا سانس ٹھکانے ہوئی۔ تو اس واقعہ پر غور

کرنے لگے۔ ضرور نور علی نے مجھے دھوکا دیا۔ اس کی تارکانِ موالات سے سانٹھ گانٹھ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مانا کہ میرا پچکاری چلانا صاحب کو بُرا معلوم ہوا اور یہ لوگ ہولی نہیں کھیلتے تو بھی ان کا غصّے سے اس قدر دیوانہ ہوجانا اس کے سوا اور کیا ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ ہمیں کتّوں سے بہتر نہیں سمجھتے۔ ان کو اپنے اقتدار پر کتنا غرہ ہے! یہ میرے پیچھے ہنٹر لے کر دوڑے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ جو میری تھوڑی بہت عزت کرتے تھے وہ صرف ایک دھوکا تھا۔ دل میں ہمیں اب بھی ذلیل اور کمینہ خیال کرتے ہیں۔ سُرخ رنگ کوئی تیز نہیں تھا۔ ہم بڑے دن میں گرجے جاتے ہیں انھیں ڈالیاں دیتے ہیں۔ وہ ہمارا تہوار نہیں ہے مگر یہ ذراسا رنگ ڈال دینے پر اتنا بگڑ اُٹھا۔ آہ یہ بے عزتی۔ مجھے اس کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہوجانا چاہیے تھا۔ بھاگنا بُزدلی تھی۔ اسی سے یہ شیر ہوجاتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ یہ سب ملاکر اسہوگیوں کو زیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ منکسرمزاجی اور شرافت صرف اُلّو سیدھا کرنے کے لیے ہے۔ اُن کی خودمختاری ان کا غرور ہی ہے ذرا بھی فرق نہیں۔

سیٹھ جی کے دلی خیالات نے سنگین صورت اختیار کی۔ میری یہ ذلت! اپنی بے عزتی کی یاد ان کے دل کو رہ رہ کر بے قرار کر رہی تھی۔ یہ میرے موالاتی ہونے کا نتیجہ ہے! میں اِسی قابل ہوں۔ میں ان کی ہمدردانہ باتیں سُن سُن کر پھولا نہ سماتا تھا۔ مجھے کوتاہ فہمی سے اتنا بھی نہ سُوجھتا تھا کہ آزاد اور غلام میں کوئی میل جول نہیں ہوسکتا۔ میں اُسہوگیوں کی بے تعلّقی پر ہنستا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ ہنسنے کے قابل نہیں بلکہ میں خود ہی قابلِ مذمت ہوں۔

وہ اپنے گھر نہ جاکر سیدھے کانگریس کمیٹی کے دفتر کی طرف گئے۔ وہاں ایک بڑی مجلس دیکھی۔ کمیٹی نے شہر کے اچھوت چھوٹے بڑے سب کو ہولی کا جشن منانے کے لیے مدعو کیا تھا۔ ہندو مسلمان ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے محبت سے ہولی کھیل رہے تھے۔ پھل وغیرہ کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔ اس وقت لکچر ہو رہا تھا۔ سیٹھ جی گاڑی سے تو اُترے مگر جلسے میں جاتے ہوئے تامل ہوتا تھا۔ ٹھٹھکے ہوئے آہستہ سے جاکر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ انھیں دیکھ کر لوگ چونک پڑے۔ یہ خوشامدیوں کے سرغنہ آج یہاں کیسے بھول پڑے؟ انھیں تو موالاتی جلسہ میں بادشاہ کی تجویز پاس کرنا چاہیے تھی۔ شاید مخبر بن کر آئے ہیں کہ ہم لوگ کیا کر رہے ہیں۔ انھیں چڑانے کے لیے لوگوں نے کہا۔ کانگریس

کی جے!

اوجاگرلال نے بلند لہجے میں کہا۔ اسھیوگ کی جے۔

پھر آواز اُٹھی ۔ خوشامدیوں کی چھے!

سیٹھ جی نے بلند آواز سے کہا۔ جی حضوروں کی چھے!

یہ کہہ کر وہ کُل حاضرین جلسہ کو حیرت میں ڈالتے ہوئے پلیٹ فارم پر جا پہنچے۔ اور متانت آمیز لہجے میں بولے۔

بھائیو۔ دوستو، میں نے اب تک آپ سے ترک تعلق کیا تھا۔ اسے معاف فرمایئے۔ میں تہہ دِل سے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے گھر کا بھیدی جاسوس یا بھبھیکن نہ سمجھیے۔ آج میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا ہے۔ آج اس پاک اور محبت انگیز ہولی کے دن میں آپ سے ملاپ کرنے آیا ہوں۔ اپنی فراخ دلی سے کام لیجیے۔ آپ سے دشمنی کرنے کی آج مجھے سزا مل گئی۔ حاکم ضلع نے آج میری بڑی بے عزّتی کی۔ میں وہاں سے ہنٹروں کی مار کھا کر آپ کی پناہ مین آیا ہوں۔ میں ملک کا دشمن تھا۔ قوم کا دشمن تھا۔ میں نے اپنی خودغرضی سے جھوٹے اعتبار میں آکر ملک کا بڑا نقصان کیا۔ اس کے لیے خوب کانٹے بوئے اس کی یاد آتے ہی جی چاہتا ہے کہ دل کے ٹکڑے کرڈالوں (ایک آواز)۔

ہاں ضرور کر ڈالیے۔ آپ سے نہ ہوسکے تو میں کرڈالوں (پریسڈنٹ کی آواز) یہ سخت باتوں کا موقعہ نہیں ہے۔ نہیں آپ کو تکلیف اُٹھانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی یہ کام اچھی طرح کرسکتا ہوں مگر ابھی بہت کچھ کفارہ کرنا ہے نہ جانے کتنے پاپوں کا پراشچت کرنا ہے۔ اُمید کہ زندگی کے بقیہ دن یہی پرائشچت کرنے میں یہی مُنہ کی کالک دھونے میں بسر کروں۔ آپ سے صرف اتنی ہی التجا ہے مجھے اصلاح کا موقعہ دیجیے۔ مجھ پر اعتبار کیجیے اور مجھے اپنا غریب خادم سمجھیے۔ میں آج سے اپنا تن من دھن سب آپ پر قربان کرتا ہوں۔

پہلی بار ہندی ماہنامہ سودیش (گورکھپور) کے مارچ 1921 کے شمارہ میں وچتر ہولی کے عنوان سے شائع ہوا۔ مان سروور 3 میں شامل ہے۔ اردو مجموعہ خاکِ پروانہ میں شامل ہے۔

دستِ غیب

لالہ جیون داس کو بستر مرگ پر پڑے ہوئے چھ مہینے گزر گئے ہیں۔ حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے۔ حکماء پر اب اُنھیں مطلق اعتماد نہیں رہا۔ محض تقدیر کا بھروسہ ہے۔ کوئی ہمدرد کسی ویَد یا ڈاکٹر کا نام لیتا ہے تو وہ مُنہ پھیر لیتے ہیں۔ انھیں اپنی موت کا کامل یقین ہوگیا ہے۔ یہاں تک کہ اب انھیں اپنی بیماری کے ذکر سے بھی نفرت ہوتی ہے۔ اپنی حالت کا احساس اتنا ساری ہوگیا ہے کہ پرسشِ حال بھی اُن کے زخم پر نمک ہوجاتی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھول جانا چاہتے ہیں کہ میں موت کے آغوش میں ہوں ایک لمحے کے لیے اس بارِگراں کو سر سے پھینک کر آزادی سے سانس لینے کو ان کی طبیعت بے قرار ہوجاتی ہے۔ اُنھیں سیاسیات سے ہمیشہ نفرت تھی۔ اپنے ذاتی معاملات انھیں مصروف رکھنے کے لیے کافی تھے۔ لیکن اب انھیں ملکی حالات سے خاص دلچسپی ہوگئی ہے۔ انھیں اپنی بیماری کے ذکر کے علاوہ وہ ہر ایک بات کو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ مگر جوں ہی کسی نے از راہِ ہمدردی کسی دوا کا نام لیا ان کے تیور بدل جاتے ہیں۔ تاریکی میں صدائے درد اتنی خوش آیند نہیں ہوتی جتنی روشنی کی ایک جھلک۔

وہ مستقل مزاج آدمی تھے۔ سزا و جزا۔ عذاب و ثواب کے مسئلے ان کے دائرۂ فکر سے باہر تھے۔ یہاں تک کہ نامعلوم دہشت کا بھی اُن پر غلبہ نہ تھا۔ آیندہ کے جانب سے وہ بالکل بے فکر تھے۔ مگر اس کا باعث ان کا ذہنی جمود نہ تھا۔ بلکہ فکرِ دنیا نے فکرِ عقبیٰ کی گنجائش نہ باقی رکھی تھی۔ اُن کا کُنبہ بہت مختصر تھا۔ بیوی تھی اور ایک خورد سال بچّہ۔ مگر مزاج میں ریاست کی بُو تھی اور حوصلہ فراخ۔ نفی اثبات پر غالب رہتی تھی۔ اس پر اس طولانی اور لاعلاج مرض نے نفی پر کئی درجوں کا اضافہ کردیا تھا۔ میرے بعد ان بیکسوں کا کیا حشر ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی اُن کے دل میں ایک ہیجان سا برپا ہوجاتا تھا۔ اِن کا نباہ کیسے ہوگا؟ یہ کس کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے؟ کون اِن کی خبر لے گا؟ آہ! میں نے شادی

کیوں کی؟ صاحبِ عیال کیوں بنا؟ کیا اسی لیے کہ یہ دنیا کے احسانِ بارد کے دستِ نگر بنیں۔ کیا اپنے خاندان کی عزّت اور حرمت کو یوں پامال ہونے دوں۔ جس دُرگا داس کے دستِ کرم سے سارے شہر نے فیض اُٹھایا اُسی کی بہو اور پوتا در بدر ٹھوکریں کھاتے ہوں۔ ہائے کیا ہوگا؟ کوئی ہمدرد نہیں، گزران کی کوئی صورت نہیں، چاروں طرف ہولناک بیابان ہے، کہیں برگ و بار نظر نہیں آتا۔ یہ بھولی نازنین یہ گلفام بچّہ، انھیں کس پر چھوڑوں!

ہم وضعداری میں فرد تھے، ہم نے کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ کسی کے شرمندۂ احسان نہیں ہوئے۔ ہمیشہ سر اُٹھاکر چلے۔ اور اب یہ نوبت ہے کفن کا بھی ٹھکانہ نہیں۔

(۲)

آدھی رات گزر چکی تھی۔ جیون داس کی حالت آج بہت نازک تھی، بار بار غشی طاری ہوجاتی، بار بار دل کی حرکت بند ہوجاتی، انھیں معلوم ہوتا تھا کہ اب انجام قریب ہے۔ کمرے میں ایک لیمپ جل رہا تھا۔ اُن کی چارپائی کے قریب ہی پربھاوتی اور اُس کا بچہ ساتھ سوئے ہوئے تھے۔ جیون داس نے در و دیوار پر مایوسانہ نگاہ ڈالی جیسے کوئی گم گشتہ مسافر کسی مسکن کی تلاش میں ہو۔ چاروں طرف سے گھوم کر ان کی نگاہیں پربھاوتی کے چہرہ پر جم گئیں۔ آہ! یہ حسینہ چند لمحوں میں بیکس ہوجائے گی۔ یہ بچّہ چند منٹوں میں یتیم ہوجائے گا۔ یہی دونوں ہستیاں میری زندگی کی آرزوؤں کا مرکز تھیں۔ میں نے جو کچھ کیا انھیں کے لیے کیا۔ انھیں کے لیے میری زندگی وقف تھی۔ اور اب انھیں اس منجدھار میں چھوڑے جاتا ہوں اس لیے کہ وہ گردابِ بیکسی کا لقمہ بن جائیں۔ ان خیالات نے اُن کے دل کو مسوس لیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُن آنکھوں میں کتنا درد تھا۔ کتنا جذبۂ محبت، کتنا جوشِ ایثار! دفعتاً ان کے خیالات نے پہلو بدلا۔ درد کی جگہ چہرے پر عزمِ قوی کی جھلک نظر آئی، جیسے صاحبِ خانہ کی جھڑکیاں سُن کر درویش سائل کے تیور بدل جاتے ہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں اپنے لختِ جگر کو اپنی پیاری بیوی کو، تقدیر کا ستم بردار نہ بننے دوں گا۔ میں اپنے خاندان کی عزّت و ناموس کو یوں برباد نہ ہونے دوں گا۔ میں نیم جان

ہوں، خستہ حال ہوں، لبِ مرگ ہوں، لیکن تقدیر کے سامنے سر نہ جُھکاؤں گا، اس کا محکوم نہیں۔ حاکم بنوں گا۔ اُس کی آستانہ بوسی نہ کروں گا۔ اُسے اپنے پیروں پر جھکاؤں گا اپنی کشتی کو عناصر کا پابوس نہ بننے دوں گا!

بے شک دنیا میرے اس فعل پر مُنہ بنائے گی، مجھے قاتل اور سفاک کہے گی۔ اس لیے کہ اس کی شیطانی دلچسپیوں میں اُس کے خون آشام تفریحات میں ایک کم ہوجائے گی۔ کیا مضایقہ۔ مجھے یہ اطمینان ہو رہے گا کہ دنیا کی ستم اندیشیاں مجھے کوئی گزند نہیں پہونچا سکیں۔ میں اس کی جفا شعاریوں سے آزاد ہوں۔

جیون داس کے چہرے پر عزم زرد نمودار تھا۔ وہ عزم جو خودکشی کا پیش خیمہ ہے۔ وہ چارپائی سے اُٹھے۔ مگر ہاتھ پاؤں تھرتھر کانپ رہے تھے۔ کمرے کی ہرایک چیز اُن کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑکر دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ انھیں الماری کے شیشے میں اپنا عکس نظر آیا۔ چونک پڑے۔ تو کون؟ مگر خیال آگیا کہ یہ تو اپنا ہی سایہ ہے۔ انھوں نے الماری سے ایک چمچہ اور پیالہ نکالا۔ پیالے میں وہ زہریلی دوا تھی جو ڈاکٹر نے اُن کے سینے پر مالش کرنے کے لیے دی تھی۔ پیالے کو مضبوط پکڑے چاروں طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے تاکتے ہوئے وہ پربھاوتی کے سرہانے آکر کھڑے ہوگئے۔ دل پر رقت کا غلبہ ہوا۔ ہائے ستم! اِن پیاروں کو کیا میرے ہی ہاتھوں مرنا لکھا تھا۔ میں ہی اِن کا دیو اجل بنوں گا۔ یہ اپنے ہی کردار کی سزا ہے۔ میں نے کیوں آنکھیں بند کرکے تاہّل کی زنجیر گلے میں ڈالی۔ اُن آنے والے حوادث کی طرف میرا خیال کیوں نہ گیا؟ میں اُس وقت ایسا شاداں و خنداں تھا گویا زندگی ایک نغمہ قائم ہے۔ ایک گلشن بے خار۔ یہ اِنھیں ناقابل اندیشیوں کی، اسی ناانجام بینی کی سزا ہے کہ آج میں یہ روزِ سیاہ دیکھ رہا ہوں۔

دفعتاً اِنھیں اپنے پیروں میں لغزش معلوم ہوئی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھاگیا۔ نبض ساکت ہونے لگی۔ یہی دورۂ غشی کی علامتیں تھیں۔ وہ حسرتناک خیالات دل سے دور ہوگئے۔ کون جانے یہی دورۂ پیغام مرگ ہو! وہ تیزی سے سنبھل کر اُٹھے۔ اور پیالے سے دوا کا ایک چمچہ نکال کر پربھاوتی کے مُنہ میں ڈال دیا۔ اُس نے نیند میں دوا ایک بار مُنہ چلاکر کروٹ بدل لی۔ تب اُنھوں نے لکھن داس کا مُنہ کھول کر اُس میں بھی دوا کا ایک چمچہ ڈال

دیا۔ اور تب پیالے کو زمین پر پٹک دیا۔ اُن کے پیروں کی لغزش غائب ہوگئی۔ بے ہوشی کی سب علامتیں دور ہوگئیں۔ دل و دماغ پر ایک اپناپن کا غلبہ ہوا۔ وہ کمرے میں ایک لمحے بھی نہ ٹھہر سکے۔ افشائے فعل کا خوف اقدامِ فعل سے بھی زیادہ ہوش ربا تھا۔ خوفِ پاداش نہ تھا۔ بلکہ ایک ہنگامہ ناخوشگوار سے بچنے کی خواہش۔ شماتت۔ وہ اس کا نشانہ نہ بننا چاہتے تھے۔ مگر افسوس! انھیں نہ معلوم تھا کہ تقدیر یہاں اُن کے ساتھ ...... کھیل رہی ہے۔ جس دوا کو اُنھوں نے زہر سمجھا تھا وہ دراصل وہ ٹانک تھا جو ڈاکٹر نے اُن کی تقویتِ دل کے لیے دیا تھا۔ وہ گھر سے اس طرح نکلے جیسے کسی نے انھیں ڈھکیل دیا ہو۔ وہ کبھی اتنے چاق و چست نہ تھے۔ مکان لب راہ تھا۔ دروازے پر ایک تانگہ ملا۔ وہ اُس پر اُچھل کر جا بیٹھے۔ اعضاء میں برقی موج دوڑ رہی تھی۔

تانگے والے نے پوچھا کہاں چلوں؟

جہاں چاہو۔

اسٹیشن چلوں؟

وہیں سہی۔

چھوٹی لین چلوں یا بڑی لین؟

جہاں گاڑی جلد مل جائے۔

تانگے والے نے انھیں حیرت سے دیکھا۔ پہچانتا تھا۔ بولا۔ آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ کیا اور کوئی ساتھ نہ جائے گا؟

نہیں میں اکیلا ہی جاؤں گا۔

آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟

بہت باتیں نہ کرو۔ یہاں سے فوراً چلو۔

تانگے والے نے گھوڑے کو چابک لگایا اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چلا۔ جیون داس وہاں پہنچتے ہی تانگے سے کود پڑے اور اسٹیشن کی طرف دوڑے۔ تانگے والے نے کہا پیسے؟

جیون داس کو اب یاد آیا کہ میں گھر سے کچھ لے کر نہیں چلا۔ یہاں تک کہ جسم پر کپڑے بھی نہ تھے۔ بولے۔ پیسے پھر ملیں گے۔

آپ نہ جانے کب لوٹیں گے۔

میرا جوتا نیا ہے۔ لے لو۔

تانگہ وان کی جرأت اور بھی بڑھی۔ سمجھا انھوں نے ضرور شراب پی لی ہے۔ اپنے آپے میں نہیں ہیں۔ چپکے سے جوتے لیے اور چلتا ہوا۔

گاڑی کے آنے میں ابھی گھنٹوں کی دیر تھی۔ جیون داس پلیٹ فارم پر جاکر ٹہلنے لگے۔ رفتہ رفتہ اِن کے قدم تیز ہونے لگے۔ گویا وہ کسی کے تعاقب سے بچنا چاہتے ہیں۔ انھیں اس کی مطلق فکر نہ تھی کہ میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ جاڑے کے دن تھے لوگ سردی کے مارے اکڑے جا رہے تھے۔ مگر اُنھیں اوڑھنے بسترے کا بھی خیال نہ تھا۔ ان کی قوتِ ادراک زائل ہوچکی تھی۔ صرف اپنے کردار کا احساس زندہ تھا۔ ایسا گمان ہوتا تھا کہ پربھاوتی میرے پیچھے دوڑی چلی آتی ہے۔ کبھی معلوم ہوتا۔ لکھن داس بھاگتا ہوا آرہا ہے۔ کبھی پڑوسیوں کی صدائے گیرو دار کانوں میں آتی۔ لمحے بہ لمحے واہمہ متشکل ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مال کے بوروں کے ڈھیروں میں جا چھپے۔ ایک ایک منٹ پر چونک پڑتے تھے۔ اور پُر وحشت نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر چھپ جاتے تھے۔ انھیں اب یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں۔ صرف ایک تحفظِ جان کا حس باقی تھا۔ گھنٹیاں بجیں۔ جوق جوق مسافر آنے لگے۔ قلیوں کی بم چخ۔ مسافروں کی چیخ و پکار، آنے جانے والے انجنوں کی دھک دھک، گھنٹیوں کی صدائے برخیز نے ایک قیامت برپا کردی۔ مگر جیون داس بے جان تودوں کے درمیان اس طرح پیترے بدل رہے تھے گویا وہ اِنھیں گھیر کر گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔

آخر گاڑی اسٹیشن پر آکر کھڑی ہوگئی۔ جیون داس سنبھل گئے۔ حافظہ عود کر آیا وہ لپک کر بوروں کے نرغہ سے نکلے اور گاڑی میں جا بیٹھے۔

اتنے میں گاڑی کے دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ جیون داس نے چونک کر دیکھا۔ ٹکٹ چیکر کھڑا تھا اُن کی ازخود رفتگی غائب ہوگئی۔ خطرے کا وجود بازیافت کا منتر ثابت ہوا۔ وہ کون سا نشہ ہے جو مار کے آگے ہرن نہ ہوجائے۔ ضرر کا اندیشہ اوسان کو بیدار کر دیتا ہے۔ انھوں نے پُھرتی سے غسل خانے کا دروازہ کھولا اور جاکر ایک کونے میں

دبک گئے۔ ٹکٹ چیکر نے پوچھا اور کوئی باقی تو نہیں ہے۔ مسافروں نے جیون داس کو غسل خانے میں جاتے دیکھا تھا۔ اُنھیں یقین تھا کہ ان کے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ لیکن سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ اب کوئی نہیں باقی ہے۔ عوام کو اہلِ اختیار سے ایک ازلی کد ہوتی ہے۔

گاڑی چلی تو جیون داس باہر نکلے۔ مسافروں نے ایک قہقہے سے اُن کا خیر مقدم کیا۔ یہ دیرہ دون تھا۔

(۳)

جیون داس کو تصورات سے نجات نہ ملی۔ ہردوار پہنچ کر وہ ہیجان بہت کچھ فرو ہو چکا تھا۔ عناصر کی حقیقت کا احساس ہوا۔ سردی سے پہلے ہی انجماد کی حالت طاری تھی۔ اب بُھوک کی آگ نے جلانا شروع کیا۔ احسان کے کچے دھاگے کو وہ طوقِ آہنی سمجھتے تھے۔ مگر احتیاج کے سامنے سر جُھکانا پڑا۔ سدابرت میں جاکر کھانا کھایا اور وہیں سے ایک کمبل بھی لائے۔

اس طرح کئی دن گزر گئے۔ مگر موت کا تو ذکر ہی کیا۔ اب ان عوارض میں بھی افاقہ نظر آتا تھا جنھوں نے زندگی سے مایوس کر رکھا تھا۔ اُنھیں اپنے جسم میں روز بروز توانائی کا احساس ہونے لگا۔ چہرے کی زردی مٹنے لگی، اشتہا نے بھی فطری حالت اختیار کی۔ غلبہ اختلاط توازن پر آیا۔ گویا دو عزیز جانوں کے صدقے نے موت کو رام کرلیا تھا۔

جیون داس کو یہ روزافزوں اصلاح اُن مُہلک دوروں سے بھی جانگداز معلوم ہوتی تھی۔ وہ اب موت کو بُلاتے، دعا کرتے کہ وہ مہلک علامتیں پھر نمودار ہوں ہرایک قسم کی بدپرہیزی اور بے احتیاطی کرتے۔ لیکن بے سود۔ اُن صدموں نے موت کو فی الواقع رام کرلیا تھا۔

اب انھیں اندیشہ ہوا کیا میں سچ مچ زندہ رہوں گا۔ آثار ایسے ہی نظر آتے تھے۔ روزبروز اس کا یقین ہوتا جاتا تھا۔ انھوں نے تقدیر کو اپنے پیروں پر جھکانا چاہا تھا۔ مگر اب اپنے تئیں اس کے پیروں کے نیچے پڑا ہوا پاتے تھے۔ انھیں باربار اپنے اوپر غصہ آتا۔ کبھی کبھی بیتاب ہو کر اُٹھتے کہ زندگی کا خاتمہ کردوں۔ تقدیر کو دکھادوں کہ میں اب بھی اُسے

کچل سکتا ہوں۔ لیکن اس کے ہاتھوں اتنی بڑی شکست پاکر اُنھیں خوف ہوتا تھا کہ کہیں اس سے بھی بدتر کوئی صورت نہ پیدا ہوجائے۔ اُس کی طاقت کا کچھ اندازہ ہوگیا تھا۔

اِن خیالات نے ان کے دل میں فلسفیانہ شکوک پیدا کرنے شروع کیے۔ مادّی تعلیم نے اُنھیں پہلے ہی بدیہہ پرست بنا دیا تھا۔ اب اُنھیں سارا نظامِ عالم پُرفریب اور سفّاک نظر آنے لگا۔ یہاں انصاف نہیں، رحم نہیں، ہمدردی نہیں، غیر ممکن ہے کہ یہ نظام کسی ذاتِ کریم کے مطیع ہو اور اس کے علم میں ایسی ایسی بدعتیں ایسی ایسی جفاشعاریاں، ایسی ایسی کرشمہ سازیاں وقوع میں آئیں۔ وہ نہ رحیم ہے نہ کریم۔ وہ علیم وخبیر بھی نہیں ہوسکتا۔ یقیناً وہ ذات شریر، خبیث، کج رو اور ستم شعار ہے۔ اہلِ دنیا نے اس کی قوتِ شر سے خائف ہوکر از راہِ تملّق اِسے صفات حسنہ کا منبع، تقدّس اور جلال کا سرچشمہ، خیراور برکت کا ماخذ بنا دیا ہے، یہ بکیسانہ اور عاجزانہ ہرزہ سرائی ہے، اپنی خاکساری کا خالص اعتراف اسی بے دست و پائی کو ہم عبادت کہتے ہیں اور اُس پر ناز کرتے ہیں۔ اہلِ فلسفہ فرماتے ہیں: ساری کائنات اٹل قوانین کے تابع ہے۔ ان کا عمل ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ بھی اُن کی سہل اعتقادی ہے۔ قوانین بے حِس، جامد اور نابینا ہوتے ہیں، ان میں ستمگاری کا سلیقہ نہیں۔ انھیں ایذا رسانی سے غرض نہیں۔ وہ اگر کسی کے دوست نہیں تو کسی کے دشمن بھی نہیں۔ ان قوانین کا محرک، اس شعبدے کا کوئی مداری ضرور ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ مگر وہ قوتِ غیب فرشتہ نہیں، انسان نہیں، شیطان ہے۔

ان خیالات اور شکوک نے رفتہ رفتہ عمل کے دائرے میں قدم رکھا۔ اطاعتِ خیر ہمیں رفعت کی جانب مائل کرتی ہے۔ نہ اطاعتِ ناخیر پستی کی طرف۔ جیون داس کی کشتی کا لنگرِ ثبات اُکھڑ گیا۔ اب اُسے نہ سکون نہ قرار۔ لہروں کے تلاطم سے زیر و زبر ہوتی رہتی تھی۔

(۴)

پندرہ سال گزر گئے۔ جیون داس اب امیرانہ شان و شکوہ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ عالی شان مکان تھا۔ سواریاں تھیں۔ خدام تھے۔ آئے دن عیش و طرب کی مجلس ہوتی تھی۔ اب نفس پروری ان کا ایمان تھا، خودپرستی ان کا دین، ضمیر اور اخلاق کی پابندیوں سے آزاد

ہو گئے تھے۔ حُسن و خطا کا احساس فنا ہو گیا تھا۔ وسائل کی بھی کمی نہ تھی۔ سرقہ مہذّب، کذب مکلّف، افترا محجوب، تحریف رو پوش، تلبیس بانقاب، اتنے آقاؤں کے غلام کو کس بات کی کمی۔ وہاں صرف ظاہری وقار کا لحاظ رکھا جاتا تھا اور کسی قدر سختی سے۔ اس دائرے کے سوا سمندِ نفس کی خوشخرامیوں کے لیے اور کوئی سدِّ راہ نہ تھا۔ ندیم و جلیس بھی اسی قماش کے تھے، کوئی یک فن قادر، کوئی ہر فن مولا۔

جیون داس کو اب اپنے بیوی بچوں کا غم نہ ستاتا تھا۔ ماضی اور مستقبل دونوں مٹ گئے تھے، صرف حال پر اُن کی نگاہ رہتی تھی۔ وہ ثواب کو عذاب سمجھتے تھے۔ اور عذاب کو ثواب، اُنھیں نظامِ دُنیا کا یہی بنیادی اُصول نظر آتا تھا۔ اور وہ خود اس معکوس خیال کی زندہ مثال تھے۔ ضمیر کی گرہوں کو توڑ کر وہ جتنی رفعت پر پہونچے وہاں تک ضمیر کے قفس میں پڑے ہوئے شاید ان کی نگاہ بھی نہ پہنچتی۔ گرد و پیش کی مثالیں اس انحراف کی مویّد تھیں۔ شعبدہ اور ریا کی قوت فیصلہ کن نظر آتی تھی۔ یہی حیات موفور کا راز تھا۔ آزاد اُڑتے تھے، پابند ایڑیاں رگڑتے تھے۔ تجارت اور سیاست کی شبستاں، علم و سخن کا مندر، سلوک و صفا کے دائرے، خلوص و اتحاد کی مجلسیں، سب اسی شمع سے منور نظر آتی ہیں۔ ایسی دیوی کی اُپاسنا کیوں نہ کی جائے۔

گرمی کے دن تھے، شام کا وقت۔ ہردوار کے ریلوے اسٹیشن پر جاتریوں کا ہجوم تھا۔ جیون داس ایک گیروے رنگ کی ریشمی چادر گلے میں ڈالے سُنہری عینک لگائے، زہد و اتقا کی زندہ مورت بنے ہوئے اپنے دوستوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ اُن کی ناقد نگاہیں جاتریوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دفعتاً اُنھیں دوسرے درجے کے کمرے میں ایک شکار نظر آیا۔ یہ ایک شکیل خوش وضع نوجوان تھا۔ بشرے سے امارت ٹپک رہی تھی۔ گھڑی کی زنجیر طلائی تھی۔ تنزیب کی اچکن میں سونے کی بٹن، سامانِ سفر بھی پُر تکلف، دو خدمتگار ساتھ تھے۔ جس طرح قصّاب کی نگاہ جانور کے گوشت و پوست پر رہتی ہے، اِسی طرح جیون داس کی نگاہ میں انسان ایک جنس تصرّف تھا۔ اِن کے قیافہ نے حیرت انگیز مہارت بہم پہنچا لی تھی۔ اُن سے کبھی سہو نہ ہوتا تھا۔ یہ نوجوان ضرور کوئی رئیس زادہ ہے اور سادہ لوح۔ مغرور بھی ہے۔ اس لیے آسانی سے دام میں آجائے گا۔ صرف تالیف کافی

ہے۔ ذکی اور طبّاع ہے۔ اس کی تالیف کے لیے شعبدہ بازی کی ضرورت ہے۔ اس پر اپنے عارفانہ کمال کا سکہ بٹھانا چاہیے۔ اس کے حُسن عقیدت پر نشانہ مارنا چاہیے۔ میں پیر بنوں۔ یہ دونوں رفیق مُرید بن جائیں، پریدن اور پرانیدن کی گھاتیں چلیں، تزویر کی چوٹیں پڑیں۔ میرے تبحر اور معرفت، خوارق و معجزات، بے لوثی اور نا دنیا طلبی، پر گوہر فشانیاں کی جائیں۔ مجھے مافوق البشر بتایا جائے۔ تعریفوں کے پُل باندھ رکھے جائیں۔ فصاحت اور بلاغت کے انبار لگا دیئے جائیں۔ اور طائر کے سامنے دانہ بکھیر کر اُس پر جال ڈال دیا جائے۔

یہ فیصلہ کرکے جیون داس اپنے دونوں گرگوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ نوجوان نے اِن کی طرف غور سے دیکھا گویا اپنے کسی از یاد رفتہ دوست کو پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔ دفعتاً بے صبرانہ انداز سے بولا۔

مہاتماجی آپ کا استھان کہاں ہے؟

جیون داس دل میں باغ باغ ہوگئے۔ بولے۔ بابا سنتوں کا استھان کیا۔ سارا سنسار ہمارا استھان ہے۔

نوجوان نے پھر پوچھا۔ آپ کا نام لالہ جیون داس تو نہیں ہے؟

جیون داس چونک پڑے۔ سینہ بلیوں اُچھلنے لگا۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ کہیں خفیہ پولیس کا کوئی افسر تو نہیں ہے۔ نوجوان کے چہرے کی طرف تجسس کی نگاہ سے دیکھا۔ اقرار کروں یا انکار اس کا فیصلہ نہ کرسکے۔ دونوں صورتیں خطرناک تھیں۔ گُم سُم سے ہوگئے۔

نوجوان نے انھیں حیص بیص میں دیکھ کر کہا۔ مہاراج میری اس بے ادبی کو معاف فرمائیے گا۔ میں نے یہ پوچھنے کی جرأت صرف اس لیے کی ہے کہ آپ کی صورت میرے پتاجی سے بہت ملتی ہے جو عرصۂ دراز سے لاپتہ ہیں۔ لوگ کہتے ہیں سنیاسی ہوگئے۔ برسوں سے اُنھیں کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔

جس طرح اُفق پر طوفان کی موجیں چڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور طرفۃ العین میں آسمان پر محیط ہوجاتی ہیں۔ اُسی طرح جیون داس کو اپنے دل میں رقت کی ایک لہر سی اُٹھتی

ہوئی محسوس ہوئی۔ گلا پھنس گیا اور نظروں میں ہر ایک چیز تیرتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ انھوں نے نوجوان کی طرف پُھٹتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ مغائرت کا پردہ ہٹ گیا۔ اُس کے گلے سے لپٹ گئے اور بولے "لکھو"۔

لکھن داس اُن کے پیروں پر گر پڑا اور بولا "لالہ جی۔"

"میں نے بالکل نہیں پہچانا۔"

"مدتیں گزر گئیں"۔

(۵)

آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ لکھن داس سو رہا تھا۔ اور جیون داس کھڑکی سے باہر سر نکالے خیالات میں غرق تھے۔ مشیّت کا نیا کرشمہ اُن کے پیش نظر تھا۔ وہ عقائد جو مدّت دراز سے ان کے مشعل ہدایت بنے ہوئے تھے متزلزل ہوگئے تھے۔ میں اپنی نخوت کے زعم میں کتنا ازخود رفتہ ہوگیا تھا۔ سمجھتا تھا میں ہی نظام دنیا کا سرشتہ دلا ہوں۔ میں ہی قضا کا داروغہ ہوں۔ رزق کی کنجی میرے ہی ہاتھوں میں ہے۔ اپنی موت پر پسماندوں کی ذلت اور خرابی کو یقینی سمجھتا تھا۔ میرا یہ زعم کتنا باطل ثابت ہوا۔ جنھیں میں نے زہر دینے میں دریغ نہ کیا وہ آج زندہ ہیں خوش و خرم ہیں صاحبِ ثروت ہیں۔ غیر ممکن تھا کہ میں لکھو کو ایسی اعلیٰ تعلیم دے سکتا۔ اس کا اخلاقی نشو و نما بھی اتنے خوبی سے مجھ سے انجام نہ ہوسکتا تھا۔ اور اُسے اتنی اونچی حیثیت پر پہنچانے کا تو میں کبھی خواب میں بھی گمان نہ کرسکتا تھا۔ میں سمجھتا تھا وہ میرے مرتے ہی خستہ و خوار ہوجائیں گے۔ اس کے برعکس میری گم شدگی اس کے حق میں کیمیا ہوگئی۔ کتنا خلیق، خوش کلام، خندہ رو، بے لوث نوجوان ہے کتنا منکسر، کتنا موقعہ شناس۔ مجھے تو اب اُس کے ساتھ بیٹھنے میں بھی اپنی پستی کا احساس ہوتا ہے۔ مجھ جیسا سیہ کار، کور باطن، نفس پرور انسان اتنا خوش نصیب ہو! افسوس میری خودبینی میرے لیے غارِ سیاہ بن گئی جس کی تہ میں پڑا ہوا میں تاریکی کے جانداروں سے بھی زیادہ ناپاک اور مکروہ ہوں میں نظامِ عالم کو کسی شیطانی طاقت کا مطیع سمجھتا تھا۔ جو اہلِ دُنیا کے ساتھ گربہ و موش کا تماشا کرتی ہے۔ کیسی جہالت تھی۔ آج مجھ جیسا آشیاں برباد دنیا کے خوش نصیب ترین آدمیوں میں ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس کا

منتظم مصدرِ فیوض و برکات ہے۔ ورنہ میں اِن عطاہائے بیکراں کے قابل کب تھا۔ صبح ہوتے ہوتے مجھے اس دیوی کے درشن ہوں گے جس کے ساتھ میری زندگی کے بہترین ایام گزرے ہیں۔ میرے پوتے اور پوتیاں میری گود میں کھیلیں گے، عزیز و احباب میرا خیرمقدم کریں گے۔ مجھے مبارکبادیں دیں گے، ایسے برکت پاش خیرالوجود کو میں مایۂ منتر سمجھتا تھا۔

انھیں خیالات میں جیون داس کو نیند آگئی۔ جب آنکھیں کُھلیں تو لکھو کی مانوس اور شیریں صدا کانوں میں آئی۔ وہ چونک کر اُٹھ بیٹھے۔ لکھن داس اسباب اُتروا رہے تھے۔ اسٹیشن سے باہر اُن کی فٹن کھڑی تھی۔ دونوں آدمی اُس پر بیٹھے۔ جیون داس کا دل ہجومِ مسرت سے بیٹھا جاتا تھا۔ اُن کے چہرے پر خوشحالی کے بجائے پژمردگی سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ گویا دنیا کی مطلق خبر نہیں ہے۔ گویا کوئی حس بھی نہیں۔ کیا سیلابِ مراد بھی آبِ نسیان کی کثرت ہے جو کِشت زار دل کو ڈبا دیتی ہے۔

فٹن روانہ ہوئی۔ جیون داس کو ہرایک چیز نئی معلوم ہوتی تھی۔ نہ وہ مکانات تھے۔ نہ وہ بازار، نہ وہ گلی کوچے، نہ وہ انسان، ایک انقلاب سا ہوگیا تھا۔ دفعتاً اُنھیں ایک صاف ستھرا خوشنما بنگلہ نظر آیا جس کے پھاٹک پر جلی حروف میں منقوش تھا۔ ”جیون داس پاٹ شالا“جیون داس بولے یہ کیا ہے؟

لکھن داس نے کہا۔ اماں نے آپ کی یادگار میں یہ پاٹ شالا کھولی ہے۔ اس میں مُفت تعلیم دی جاتی ہے۔ اور کئی لڑکے وظیفے پاتے ہیں۔

جیون داس کا دل اور بیٹھ گیا۔ مُنہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکل آئی۔

ایک لمحے اور گزرا۔ فٹن رُک گئی۔ لکھن داس اُتر پڑے۔ جیون داس نے دیکھا تو ایک عالیشان پختہ عمارت تھی۔ اُن کے پُرانے کھپریل والے پیارے گھر کا کوئی نشان نہ تھا۔ صرف ایک نیم کا درخت اُس کی یادگار رہ گئی تھی۔ کئی نوکروں نے دوڑکر اسباب اُتارا، دو گلعذار بچّے 'بابوجی' بابوجی' پُکارتے ہوئے دوڑے اور لکھن داس کے پیروں سے چمٹ گئے۔ سارے گھر میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ محلے کے لوگ مزاج پُرسی کے لیے آنے لگے۔ دیوان خانہ کُھل گیا جو تکلفات سے آراستہ تھا۔ جیون داس ایسے گم گشتہ سے ہو رہے تھے گویا یہ کوئی نیرنگ ہے۔

(۶)

آدھی رات گزر چکی تھی۔ جیون داس کو کسی کروٹ نیند نہ آتی تھی۔ اپنی عمر گزشتہ کا نقشہ اُن کے پیشِ نظر تھا۔ اِن پندرہ سالوں میں اُنھوں نے جو کانٹے بوئے تھے وہ اس وقت اُن کے جگر میں چبھ رہے تھے۔ جو غار کھودے تھے وہ اس وقت اُنھیں نگلنے کے لیے مُنہ کھولے ہوئے تھے۔ ایک ہی دن میں اُن کی حالت بالکل متغیر ہوگئی تھی۔ بے اعتقادی کی جگہ دستِ غیب کا اعتقاد دل پر حاوی ہوگیا تھا۔ اور یہ اعتقاد محض ذہنی نہیں، بلکہ غیبی تھیا۔ مشیّت غیب کا خوف ایک دیو سیاہ کی صورت میں اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس سے اب اُنھیں کوئی مفر نظر نہ آتا تھا۔ اب تک اُن کی ذاتِ وہ آگ کی بے ضرر چنگاری تھی جو کسی ریگ زار میں پڑی ہو۔ لیکن آج وہ چنگاری ایک خرمن کے دامن میں پڑی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کب مشتعل ہوکر خرمن کو خاکِ سیاہ کردے۔

جوں جوں رات گزرتی جاتی تھی یہ دہشت ندامت کی صورت اختیار کرتی جاتی تھی۔ میں اس قابل نہیں کہ اس مجسّم رحم و عفو کو اپنا روئے سیاہ دکھاؤں۔ اُس نے مجھے ہمیشہ اپنے رحم و کرم کے سایہ میں رکھا اور یہ مبارک دن دکھایا۔ میری سیہ روئی اُنھیں کے رحم و کرم پر ایک داغِ سیاہ ہے۔ میں ننگِ وجود اس رحیمی کے صدقہ کے قابل بھی نہیں۔

کیا میں اُس وجودِ پاک کی نظروں میں حقیر بنوں؟ کیا میری سیہ کاری میرے خاندان کو ملوّث نہ کردے گی۔ میری طوفان انگیزیاں اس بہار کو ملیا میٹ نہ کردیں گی۔

آہ! اسی خاندان کے ننگ و نام کی حفاظت کے لیے اُس کا وقار قائم رکھنے کے لیے میں جلاد بنا تھا۔ کیا اب میں خود ننگِ خاندان کہلاؤں اپنے اعمال کی سیاہی سے اس کے روشن کارنامے کو سیاہ کروں؟ اپنی زندگی سے وہ ستم برپا کروں اور قہر ڈھا دوں، جو موت کبھی نہ کرسکتی تھی۔ میرے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ پرماتما! وہ خون رنگ نہ لائے۔ یہ دل گناہوں کے جرائم سے متعفّن ہو رہا ہے۔ پرماتما۔ یہ خاندان اِن کے متعدی اثر سے مامون رہے۔

اِن تصوّرات نے جیون داس کے جذبۂ ندامت اور خوف کو اس حد تک متحرک کیا کہ وہ متوحش ہوگئے۔ جس طرح پرتی زمین میں بیج غیر معمولی نشو پاتا ہے اُسی طرح اعتقاد سے خالی دل میں جب اعتقاد جاگزیں ہوتا ہے تو اس میں حیرت انگیز صداقت اور ہدایت

ہوتی ہے۔ اس میں علم کے بجائے عمل کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ سرفروشانہ جوش اُس کی خاص صفت ہوتی ہے۔ جیون داس کو اپنے چاروں طرف ایک وجود محیط، ایک دستِ غیب، ایک نگاہ ساری کا احساس ہورہا تھا۔ اور یہ حسیات لمحے بہ لمحے تیز اور روشن ہوتی جاتی تھیں۔ اپنی پُر آشوب زندگی کی واردات لپکتے ہوئے شعلے بن بن کر اُس گھر کی طرف، اس امن و خوشی کے جلوہ گاہ کی طرف، دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں گویا وہ اُسے نگل جائیں گی۔

مشرق کی طرف صبح کی تنویر نظر آنے لگی تھی۔ جیون داس گھر سے نکلے۔ اُنھوں نے اپنے وجودِ نحس کو فنا کر دینے کا عزم کرلیا تھا۔ اپنے گناہوں کی آنچ سے اپنے خاندان کو بچانے کا فیصلہ کرچکے تھے۔ اپنی ہستی کو مٹاکر اپنی ندامت کو مٹا دینے کا تہیہ کرلیا تھا۔

آفتاب پردۂ اُفق سے باہر نکلا۔ اُسی وقت جیون داس گومتی کی لہروں میں سما گئے۔

اردو ماہنامہ زمانہ کے اپریل1921 کے شمارہ میں شائع ہوا۔ اردو مجموعہ خواب و خیال میں شامل ہے۔

ہندی میں پراربدھ کے عنوان سے مان سروور 7 میں شامل ہے۔

لال فیتہ

ذہانت کسی طبقے کی میراث اور کسی اُصول وراثت کی مطیع نہیں۔ مسٹر ہری بلاس اس کی مجسّم دلیل تھے۔ وہ ذات کے کُرمی تھے۔ آبائی پیشہ زراعت تھا۔ مگر بچپن ہی سے ان کا شوقِ تعلیم دیکھ کر والدین نے مصلحت سے کام لیا۔ انھیں ہل میں نہ جوتا۔ خود موٹا کھاتے تھے۔ موٹا پہنتے تھے۔ اور موٹے کام کرتے تھے۔ لیکن ہری بلاس کے لیے مہین چیزوں کی کمی نہ تھی۔ باپ لڑکے کو رامائن پڑھتے دیکھ کر پھُولا نہ سماتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کے پاس سمن، چٹھیاں یا لگان کی رسیدیں پڑھوانے آتے تو اس کا سر غرور سے اونچا ہوجاتا تھا۔ لڑکے کے پاس ہونے کی خوشی اور فیل ہونے کا غم اسے لڑکے سے بھی زیادہ ہوتا تھا۔ اور اس کے انعامات دیکھ کر تو اس کا دماغ عرش معلے پر جا پہنچتا تھا۔ ہری بلاس کا نشۂ علم ان ہواؤں سے اور بھی تیز ہوجاتا تھا۔ یہاں تک کہ ابتدائی مرحلے طے کرتے ہوئے میٹریکولیشن تک پہنچے۔ بوڑھے رام بلاس نے سمجھا تھا کہ اب فصل کاٹنے کے دن آئے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ علم کی انتہا نہیں بلکہ آغاز ہے تو اس کا جوش ٹھنڈا پڑگیا۔ مگر ہری بلاس کا شوقِ طلب گرمی اور سردی سے مستغنی تھا۔ اس عزم قوی کے ساتھ جو اکثر نادار لیکن ذہین طلباء کا ماہر الامتیاز ہے، وہ کالج میں داخل ہوگیا۔ اگرچہ وہ ایک رئیس کے لڑکے کو پڑھاکر تعلیمی مصارف نکال لیا کرتا تھا مگر وقتاً فوقتاً اُسے یکمشت رقموں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کا بار رام بلاس پر تھا۔ غریب اب ضعیف ہورہا تھا اور کھیتی مشقت کا دوسرا نام ہے۔ کسی موقع پر سینچائی نہ کرسکتا۔ کبھی وقت پر جُتائی نہ ہوسکتی۔ فصلیں خراب ہوجاتیں۔ مگر ہری بلاس کی ضرورتوں کو زاہدانہ توکل کے ساتھ پورا کرتا تھا۔ کچھ اراضی بیع کرنی پڑی۔ کچھ رہن ہوگئی۔ کچھ قرضے کی علت میں نیلام ہوگئی۔

ہری بلاس کا ایم۔ اے اس کی جائداد کا مرثیہ تھا۔ حُسنِ اتفاق سے ملازمت کے دروازے پر اس زمانے میں انتخاب کا پہرہ نہ تھا۔ ہری بلاس مقابلے کے امتحان میں شریک

ہوئے۔ کامیابی یقینی تھی۔ ڈپٹی مجسٹریٹ کا منصب ہاتھ لگا۔ رام بلاس نے جب یہ خبر سُنی تو دیوانوں کی طرح دوڑا ہوا آیا۔ ٹھاکر دوارہ گیا۔ اور ٹھاکر جی کے پیروں پر گر پڑا۔ اور دوسرے ہی دن سے جانے کہاں غائب ہوگیا۔ حقیقت خواب سے بھی زیادہ ہوش رُبا تھی۔

(۲)

ہری بلاس میں طباعی کے ساتھ حُسنِ طبع کا میل ہوگیا تھا۔ صاف گو شیریں زبان غریب دوست تھے۔ ان کے اوصاف کا سب سے نمایاں پہلو اُن کی حق پسندی تھی۔ آئین کے دائرے سے جو بھر بھی نہ ٹلتے تھے۔ رعایا ان سے دبتی تھی۔ پر انھیں پیار کرتی تھی۔ حکام ان کی عزت کرتے تھے۔ پر دل میں ان سے بدظن رہتے تھے۔

انھوں نے سیاسیات کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ اس شعبہ سے انھیں خاص مناسبت تھی۔ ان کا افسر قانون تھا۔ شخصی اور ذاتی احکام کی تعمیل انھوں نے کبھی نہیں کی۔ اسے وہ اپنا فرض نہ سمجھتے تھے۔ افسروں کو خوش ضرور رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اسی حد تک کہ انھیں قانون کے پاک دائروں سے باہر نہ نکلنا پڑے۔

ملازمت کے پانچ سال گزر چکے تھے۔ وہ متھرا میں تعینات تھے۔ ٹھاکر اجیت سنگھ کے گھر ڈاکہ پڑا۔ پولیس کو اسامیوں پر شبہ ہوا۔ کئی گاؤں کے اسامی ماخوذ ہوئے۔ شہادتیں تیار ہوئیں۔ اور استغاثہ تیار ہوا۔ بیچارے کسان ناکردہ گناہ تھے۔ حاکم ضلع ٹھاکر صاحب کے منت شناس تھے۔ سال میں دو چار بار ان کے یہاں دعوتیں کھاتے۔ ان کے علاقے میں شکار کھیلتے۔ ان کے موٹر، فٹن پر سیر کرتے۔ وہ اسامیوں کی اس جسارت پر برہم ہوگئے۔ انھیں سخت سُست کہہ کر نکال دیا۔ شعلہ اور بھی مشتعل ہوا۔ سارے علاقے میں آگ لگ گئی۔ مسٹر ہری بلاس کے اجلاس میں استغاثہ پیش ہوا۔ صاحب بہادر نے انھیں بنگلے پر بلایا۔ اور اس معاملے میں انصاف مصلحت آمیز سے کام لینے کی تاکید کی۔ ہری بلاس نے بڑے غور سے مقدمے کی ساعت کی۔ معلوم ہوگیا شہادتیں مصنوعی ہیں۔ ٹھاکر صاحب کی زیادتی معلوم ہوئی۔ ملزموں کو بری کر دیا۔ حاکم ضلع کو یہ فیصلہ ناگوار گزرا۔ ان کی رپورٹ کی۔ تبادلہ ہوگیا۔

اسی طرح ایک بار انھیں نیچ ذاتوں کی حمایت کرنے کا یہی صِلہ ملا۔ لکھنؤ میں مقیم تھے وہاں دیہاتی مدارس میں نیچ ذات کے لڑکوں کا داخلہ نہ ہوتا تھا۔ کچھ تو مدرسوں کو

احتراز تھا۔ اس سے زیادہ طلباء کے والدین کو۔ ہری بلاس دَورے پر گئے تو شکایت سُنی۔ مدرسوں کو تنبیہ کی۔ کئی آدمیوں پر جرمانہ کیا۔ ان کے پرگنہ کے زمینداروں نے یہ کیفیت دیکھی تو بگڑے۔ گمنام عرضیاں، فرضی شکایات سے بھری ہوئی حکام کے پاس پہنچنے لگیں۔ تحصیلداروں نے زمینداروں کو اور بھی مشتعل کیا۔ کُرمی ہوکر ایسے منصب پر مامور ہو۔ یہ سبھی کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی مدرسے بند ہوگئے۔ کئی مدرسوں نے استعفے پیش کر دیئے۔ ہری بلاس کی کافی بدنامی ہوگئی۔ حاکم ضلع نے ان کا وہاں رہنا مصلحت کے خلاف سمجھا اور ان کا تبادلہ کرا دیا تنزل کے ساتھ۔

ان نارسائیوں کے باوجود ہری بلاس کا سا دیانت پرور، فرض شناس ملازم سارے صوبے میں نہ تھا۔ ان کے ذہن میں شاہی اعلانوں کے وہ پُر شکوہ الفاظ نقش ہجر ہوگئے تھے، جن میں قانون کے احترام اور حق کی حقانیت کو نظامِ سیاست کا مدار قرار دیا گیا ہے۔ قریبی حکام کی ناشناسیوں کا اس نقش اطاعت پر مطلق اثر نہ پڑتا تھا۔ یہ اسی دَور کی برکت ہے کہ میں ایسے منصب پر مامور ہوں ورنہ میرے لیے یہ مواقع کہاں تھے۔ زیردستوں اور بے کسوں کی اتنی حمایت کب ہوئی۔ مساوات کے اُصول پر کب اس طرح عمل ہوا۔ تعلیم کو یہ فروغ کب حاصل ہوا۔ یہی خیالات تھے جن سے متاثر ہوکر دوران جنگ یورپ میں مسٹر ہری بلاس نے ہرایک ممکن طریق سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا اور رائے بہادری کے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔

(۳)

کرسمس کے دن تھے۔ رائے ہری بلاس اپنے بڑے بیٹے شیو بلاس سے باتیں کر رہے تھے جو لاہور میڈیکل کالج کا طالب علم تھا اور تعطیل منانے گھر آیا ہوا تھا۔ اسی اثناء میں دو تین زمیندار صاحبان بھی آگئے اور شکار کی گفتگو شروع ہوگئی۔

ایک خان صاحب نے فرمایا۔ حضور آج کل مرغابیاں خوب آئی ہوئی ہیں شکار کا اچھا موقع ہے۔

دوسرے ٹھاکرصاحب بولے۔ جس دن حضور چلنے کو کہیں۔ بیگار ٹھیک کرلیے جائیں۔ دو تین ڈونگیاں بھی طے کرلی جائیں۔

شیوبلاس نے پوچھا۔ کیا ابھی آپ لوگوں کو بیگار ملتے چلتے ہیں۔

خان صاحب۔ جی ہاں ابھی تک تو مار پیٹ سے مل جاتے ہیں اور ہمیں چاہے نہ ملیں۔ پر حاکموں کے لیے تو محض حکم کی دیر ہے۔ ہاں آئندہ خیریت نہیں نظر آتی۔
ٹھاکر صاحب۔ جب سے کوئی لوگ بصرہ بھرتی ہوئے کے گئے تب سے کوؤ کا مجاج نائیں ملت ہے۔ بات تک سنت ناہیں ہیں۔ اے لڑائی ہمکا ملیا میٹ کے دیہیں۔
شیوبلاس۔ آپ لوگ مزدوری بھی تو بہت کم دیتے ہیں۔
ٹھاکر۔ ہجور، پہلے دن بھر کے دوئی پیسہ دیت رہن۔ اب تو چار دیت ہیں۔
شیوبلاس۔ خوب! آپ چار پیسے تو مزدوری دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آدمیوں کو غلام بنالیں۔ شہروں میں عام مزدوروں کی مزدوری ۸/ر سے کم نہیں۔
خان صاحب۔ حضور بجا ارشاد فرماتے ہیں چار پیسے تو ایک آدمی کے لیے چبینے بھر کے لیے کافی نہیں ہوسکتے۔ مگر رعایا جبرو تشدد کی ایسی عادی ہوگئی ہے کہ ہم چاہے ۸/ر یومیہ ہی کیوں نہ دیں پر بلا سختی کیے مخاطب ہی نہیں ہوتی۔ بیگار کا نام بُرا ہے۔ ہاں یہ تو بتایئے حضور، جو کالج اور مدرسے بند ہوگئے تھے وہ ابھی کھلے یا نہیں؟ سنتے ہیں لوگ سرکاری عدالتوں کو توڑکر قومی عدالتیں قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس کام کے لیے کروڑوں کے چندے ہو رہے ہیں۔

رائے صاحب کو معلوم تھا کہ شیوبلاس کیا جواب دیں گے۔ ان کے سیاسی خیالات سے واقف تھے۔ دونوں آدمیوں میں ان مسائل پر اکثر مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن انھیں نامنظور تھا کہ ان زمینداروں کے روبرو اپنے خیالات ظاہر کریں۔ اس لیے انھوں نے شیوبلاس کو بولنے کا موقع نہ دیا۔ خود ہی بولے میں تو اُسے جنون سمجھتا ہوں۔ اور کچھ نہیں، لوگوں کو گمان ہے کہ ان کاروائیوں سے ہماری سرکار کو شکست دیں گے۔ اسی خیال سے پنچائتیں، کانگریس کمیٹیاں قومی مدارس قائم کیے جارہے ہیں۔ لیکن لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ کسی ملکی نظام کا مدار ہمیشہ حق اور انصاف پر ہوتا ہے اور جب تک اربابِ حکومت ان اصولوں سے گریز نہ کریں سلطنت کا زوال پذیر ہونا غیر ممکن ہے۔ ہماری سرکار نے ہمیشہ حق کو اپنا مطمح نظر رکھا ہے ہر ایک فرقہ کو ہرایک فرد کو اس حد تک قول و فعل کی آزادی ہے کہ اس سے کسی دوسرے کو نقصان نہ پہنچے۔ یہی حق پسندی ہماری سرکار کی سب سے زبردست معاون طاقت ہے اور کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوسکتی کہ سرکار نے جادۂ حق

سے بو بھر بھی انحراف کیا ہے۔

اتنے میں ڈاکیے نے خطوط کا پلندا لاکر ڈپٹی صاحب کے سامنے رکھ دیا وہ پہلے سرکاری خطوط کھولنے کے عادی تھے آج صرف ایک لفافہ سرکاری تھا اسے کھولا تو اندر سے سُرخ فیتے میں بندھا ہوا ایک سرکاری مُراسلہ نکل پڑا۔ اسے غور سے پڑھنے لگے۔

(۴)

آدھی رات گزر گئی تھی۔ مگر مسٹر ہری بلاس ابھی تک کروٹیں بدل رہے تھے۔ سامنے میز پر ایک لیمپ جل رہا تھا۔ وہ اسی سُرخ فیتے والے مراسلے پر باربار نگاہیں ڈالتے اور پھر خیال میں ڈوب جاتے۔ وہ سُرخ فیتہ انھیں حق اور راستی کے خون میں رنگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسی قاتل کی خونبار آنکھیں تھیں جو اُن کی طرف گھور رہی تھیں یا ایک شعلۂ سُرخ تھا جو اُن کے ضمیر اور احساس حق کو نگل جانے کے لیے ان کی طرف لپکا آتا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے اب تک میں سمجھتا تھا کہ میرا کام انصاف کرنا ہے۔ اب معلوم ہورہا ہے کہ میں غلطی پر تھا۔ میرا کام انصاف کرنا نہیں انصاف کا خون کرنا ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں دیہاتوں میں اخبار بیں لوگوں پر نگاہ رکھوں۔ جو لوگ کسانوں کی حمایت پر آمادہ نظر آئیں۔ جو لوگ انھیں رسد اور بیگار دینے سے علانیہ یا اشارۃً روکیں ان کو تنبیہ کروں۔ ان سادھو، سنیاسیوں سے بازپُرس کروں جو عوام میں دھرم اُپدیش کرتے پھرتے ہیں۔ جن لوگوں کو چرخے اور کرگھے کے استعمال کی ترغیب دیتے ہوئے دیکھوں۔ جسے گاڑھے اور کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے پاؤں اس کا نام بھی اپنے روزنامچے میں درج کروں۔ جو لوگ قومی مدارس کی امداد کریں جو قومی مجلسوں میں شریک ہوں، نہیں بلکہ ان پاک نفسوں کو بھی جو اپنی جان خطرے میں ڈال کر وبا اور طاعون میں رعایا کی جان بچاتے ہیں اور مفت دوائیں تقسیم کرتے پھرتے ہیں سرکشوں میں شمار کروں اور مسکرات کے معاملے میں چوں و چرا کرنے والوں کو فوراً شکنجے میں کس دوں۔ خلاصہ یہ کہ مجھے قوم کے دوستوں اور قوم کے خادموں کا دشمن بننا چاہیے۔

انھوں نے ایک بار پھر سُرخ فیتے کی طرف دیکھا۔ جو پنکھے کے جھونکوں سے مارِ آتشیں کی طرح اِدھراُدھر رینگتا ہوا معلوم ہوتا تھا ہاں تو ایسی حالت میں میرا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے؟ میں سرکار کا غلام ہوں۔ مگر حکومت کا رعب قائم کرنے کے لیے

نہیں۔ بلکہ رعایا کی خدمت کرنے کے لیے۔ تو جب قوم اور سرکار کے مفاد میں اس قدر تبائن ہے تو میرے لیے اس کے سوا اور کیا تدبیر ہے کہ اپنے تئیں اس شکنجے کا پرزہ نہ بننے دوں۔ میرا منصبی تعلق عارضی ہے وطنی تعلق دائمی ہے۔

پھر کیا میں اپنے ذاتی مفاد کے خیال سے ضمیر کا خون کروں؟ ایک تو وہ ہیں جو اپنے تئیں قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیتے ہیں، اس کے لیے طرح طرح کی اذیتیں جھیلتے ہیں۔ میں اپنے تئیں ان سے کہیں زیادہ قوم کا دوست سمجھتا ہوں۔ ایک دیانتدار سرکاری ملازم کی ذات سے رعایا کو جتنا فیض پہنچ سکتا ہے اتنا دس قومی جاں نثاروں سے ممکن نہیں۔ لیکن جب سرکاری ملازمت میں قوم اور ملک کے خلاف کارروائی کرنی پڑے تو اس سے بڑھ کر اور کیا ذلت ہوسکتی ہے کہ وہ پھر بھی اس کی ہوا خوری کا دم بھرتا رہے۔ نہیں ۔ نہیں۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔

لیکن گزران کی کیا صورت ہے؟ اتنا سرمایہ بھی نہیں کہ دوچار مہینے بھی فراغت سے بیٹھ سکوں۔ آہ! جن بچّوں کو نازونعم میں پالا۔ انھیں اب بینوائی کا شکار بننا پڑے گا۔ جو خاندان اب تک امیرانہ طریق پر بسر کرتا تھا اسے عسرت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ خاندانی جائداد میری تعلیم کی نذر ہوچکی۔ نہیں اور کچھ نہ ہوتا تو کاشتکاری ہی کرتا۔ کیسی قناعت کی زندگی تھی۔ پسینے کی روٹی کھاتے تھے اور مزے کی نیند سوتے تھے۔ تعلیم نے تکلفات کا عادی اور نمود کا غلام بنا دیا۔ غیرضروری باتوں کا خوگر ہوگیا۔ تہذیب کے نشہ نے ستیاناس کر دیا۔ اب تو سادہ اور بے لوث زندگی کا خیال کرتے ہی روح فنا ہوجاتی ہے۔

افسوس! دل میں کیا کیا ارمان تھے۔ کیسے کیسے خیالی پلاؤ پکاتا تھا۔ شیوبلاس کو ولایت بھیجنے کا قصد تھا۔ سنت بلاس وکالت کا فیصلہ کر چکا ہے۔ ہری بلاس ابھی سے مجسٹریٹی کی دُھن میں مست ہے۔ لڑکوں کو تو خیر ان کے حال پر ہی چھوڑا وہ کسی نہ کسی طرح گزر کرہی لیں گے۔ لڑکیوں کو کیا کروں؟ سوچا تھا ان کی شادی اونچے خاندان میں اور بلا قید تفریق کروں گا۔ وہ سب آرزوئیں دل ہی میں رہ جاتی ہیں۔ نوکری تلاش کروں تو اتنی تنخواہ کہاں ملی جاتی ہے اور پھر رئیسوں کے دربار میں رسائی مشکل۔ سرکاری ملازمت سے دست کش ہونے والے کے لیے کہیں ٹھکانہ نہیں۔ اگر کسی نے از راہِ پرورش رکھ بھی لیا تو ہمیشہ اس کی مزاج داری کرنی پڑے گی۔ جو کبھی نہ کیا۔ اس پر اپنے تعلق کا مدار رہے

گا۔ یہ ذلت اب کس سے برداشت ہوگی۔ پرماتما مجھے اس مخمصے سے نکالے۔ میرے ہاتھوں سے انصاف کا خون نہ کراؤ۔

(۵)

لال فیتے کا مراسلہ آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ رائے ہری بلاس نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ وہ ہردم کچھ افسردہ خاطر رہتے۔ اجلاس پر بہت کم آتے۔ اور آتے بھی تو مقدمات کی تاریخیں ملتوی کرکے پھر چلے جاتے۔ لڑکوں لڑکیوں سے بھی بہت کم مخاطب ہوتے۔ بات چیت پر جھنجھلا پڑتے۔ بیوی سے اپنے دقتوں کا ذکر کیا۔ لیکن وہ ترک ملازمت پر راضی نہ ہوئی۔ اور لڑکوں سے ذکر کرتے ہوئے انھیں بہت تامل ہوتا تھا۔ ان کی دل شکنی کا خیال مانع تھا۔ سرکار کے نیک ارادوں پر اب اعتبار نہ تھا۔ اس کی ملازمت کو وہ اب ذریعۂ نجات نہ سمجھتے تھے۔ ملازمت کا ایک ایک لمحہ ان پر گراں گزرتا تھا۔ مگر اپنی بے کسی کا احساسِ کش مکش کا خاتمہ نہ ہونے دیتا تھا۔ کوئی ہنر کوئی پیشہ نہ جانتے تھے جس پر تکیہ کرسکتے۔ یہاں تک کہ معمولی خرید و فروخت بھی جو ہزاروں حرف ناشناسوں کا وسیلۂ معاش ہے ان کے لیے منزل ہفت خواہوں سے کم نہ تھی۔ وہ ملازمت کے سوا اپنے تئیں کسی دوسرے کام کے قابل نہ پاتے تھے۔ یہ مجبوری اور بھی سوہانِ روح ہو رہی تھی۔ غرض اور فرض کی الجھن میں پڑے ہوئے۔ ان کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔

آٹھویں دن انھیں خبر ملی کہ قریب کے کسی موضع میں منشیات کی روک کے لیے کوئی نئی پنچائت ہونے والی ہے۔ اُپدیش ہوں گے۔ بھجن گائے جائیں گے اور نشہ بازوں سے تاوان لیے جانے کے مسئلے پر بھی غور کیا جائے گا۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ نشہ کا رواج ملک اور بالخصوص ادنیٰ طبقے کی جان کا گاہک ہو رہا ہے اور اس لیے انسداد کی کوشش بہمہ وجوہ قابلِ تعریف ہے۔ کئی سال قبل وہ صیغۂ مسکرات کے کمشنر رہ چکے تھے۔ اس وقت وہ اس مسئلے کو حاکمانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مسکرات کی تخفیف کو خفیہ سازی اور خفیہ فروشی کا مترادف سمجھتے تھے۔ پرنس ریفارمروں کی خیرسگالیاں انھیں گورنمنٹ کی بے جا مخالفت پر مبنی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن زمانے اور تجربے کے ساتھ اس خیال میں بہت کچھ ترمیم ہوچکی تھی۔ اس لال فیتے والے مراسلے کے مطابق ان کا فرض تھا کہ پنچائت کی کارروائیوں کو دیکھیں اور اگر اسے ترکِ مسکرات کے لیے کسی کے ساتھ سختی یا بے جا دباؤ

ڈالتے دیکھیں تو اس کا تدارک کریں۔ یہ طرز عمل انھیں سخت ناگوار معلوم ہو رہا تھا۔ انسانی اور منصبی فرائض کی کشاکش میں پریشان بیٹھے ہوئے تھے کہ حلقے کا داروغہ پولیس کئی مسلح چوکیداروں کے ساتھ ان کی امداد کے لیے آپہنچا۔ ہری بلاس اس کی صورت دیکھتے ہی جل گئے۔ تحکمانہ انداز سے بولے۔ آپ کا یہاں کیا کام ہے؟

سب انسپکٹر۔ حضور کو اس پنچائت کی اطلاع تو ملی ہی ہوگی۔ وہاں شر و فساد کا اندیشہ ہے۔ حضور کی ہمراہی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

ہری بلاس۔ مجھے اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہاں آپ کی بیجا مداخلت سے فساد ہونا یقینی ہے۔

سب انسپکٹر نے حیرت سے دیکھ کر کہا۔ میں تو حضور کے ہم رکاب رہوں گا۔

ہری بلاس۔ ”آپ کو میرے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں۔“

سب انسپکٹر۔ مجھے سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر کا تاکیدی پروانہ ملا ہے کہ حضور کی امداد کے لیے حاضر رہوں۔

ہری بلاس۔ میں آپ کے سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر دام اقبال و حشمتہ کا غلام نہیں ہوں۔“

سب انسپکٹر۔ ”تو میرے لیے کیا ارشاد ہوتا ہے؟“

ہری بلاس۔ ”آپ جاکر کچھ دنوں گھر بیٹھیے اور گناہوں کی تلافی کیجیے۔ امنِ عامہ کی بہت کچھ حفاظت کی۔ ڈاکے اور سرقے کا خوب انسداد کیا۔ غربا کا بہت گلا گھونٹا۔ زندگی کے باقی دن یادِ الٰہی کی نذر کیجیے۔ ممکن ہے اس کے دربار تک جاتے جاتے اعمال کا بوجھ کچھ ہلکا ہوجائے۔

یہ مجذوبانہ تقریر سُن کر سب انسپکٹر صاحب کچھ سٹ پٹا سے گئے۔ خیال کیا یا تو ان حضرت نے آج شراب پی لی ہے یا اور کوئی صدمہ ایسا آپڑا ہے جس سے ان کے حواس میں فتور آگیا ہے۔ سلام کیا اور رخصت ہوگئے۔

ان الفاظ میں مسٹر ہری بلاس کی روحانی کش مکش اور ان کا آخری فیصلہ دونوں مخفی تھے۔ یہ گویا ان کے فیصلے کا اعلان تھا۔ داروغہ جی نے ادھر رخصتی سلام کیا۔ ادھر ہری بلاس نے اپنا استعفا لکھنا شروع کیا۔

(۶)

جناب من! میرا عقیدہ ہے کہ نظام سلطنت مشیت ایزدی کی ظاہری صورت ہے۔ اور اس کے قوانین بھی رحم، حق اور انصاف پر قائم ہیں۔ میں نے پندرہ سال تک سرکار کی خدمت کی اور حتیٰ الامکان اپنے فرائض کو دیانتداری سے انجام دیا۔ ممکن ہے حکام بعض موقعوں پر مجھ سے خوش نہ رہے ہوں۔ اس لیے کہ میں نے شخصی احکام کی اطاعت کو کبھی اپنا فرض نہ سمجھا۔ جب کبھی میرے احساسِ قانون اور حکمِ حاکم میں تناقض ہوا میں نے قانون کی پیروی کی۔ میں ہمیشہ سرکاری ملازمت کو خدمتِ ملک کا بہترین ذریعہ سمجھتا رہا۔ لیکن مراسلہ نمبر...... مورخہ ...... میں جو احکام نافذ کیے گئے ہیں وہ میرے ضمیر اور اُصول کے مخالف ہیں۔ اور میرے خیال میں ان میں ناحق پروری کا اتنا دخل ہے کہ میں اپنے تئیں ان کی تعمیل کے لیے کسی حالت میں آمادہ نہیں کرسکتا۔ وہ احکام رعایا کی جائز آزادی میں مخل اور ان کی سیاسی بیداری کے قاتل ہیں۔

ان حالات پر نظر کرکے میرا اس نظام حکومت سے تعلق رکھنا ملک اور قوم کی بیخ کنی کرنی ہے۔

دیگر حقوق کے ساتھ رعایا کو سیاسی جدوجہد کا حق بھی حاصل ہے اور چونکہ گورنمنٹ اس حق کو پامال کرنے کے درپے ہے۔ لٰہذا میں ہندوستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلامزید تاخیر اس عہدہ سے سبکدوش کیا جائے۔

(۷)

احباب نے استعفیٰ کی خبر سُنی تو ہری بلاس کو سمجھانے لگے۔ مگر وہ اپنے ارادے پر ثابت قدم رہے۔ استعفیٰ داخل کردیا۔ اب بھی لوگوں کو امید تھی کہ شاید حکام اسے جلد نہ منظور کریں۔ لیکن دوسرے دن تار کے ذریعے سے منظوری آگئی۔ ہری بلاس بہت خوش ہوئے۔ علی الصبح خوش خوش دفتر گئے اور ہنس ہنس کر چارج دیا۔ مگر شام ہوتے ہوتے ان کی زندہ دلی غائب ہوگئی اور گوناگوں تفکرات نے آگھیرا۔ بزاز کے کئی سو روپے باقی تھے۔ ملازموں کی تنخواہیں باقی پڑی ہوئی تھیں۔ مکان کا کرایہ چھ مہینے سے نہ دیا تھا۔ حلوائی اور گوالے کا حساب بھی چکانا تھا۔ ان حساب داروں کا مجمع دیکھ کر ہری بلاس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ

ماہوار ادائیگی کے ایسے عادی ہوگئے تھے۔ ایک معین تاریخ پر ایک معین رقم کا ہاتھ آجانا ان کے لیے ایسا فطری عمل ہوگیا تھا کہ آج دوران ماہ میں یہ حساب کتاب کرنا انھیں بلائے جان معلوم ہو رہا تھا اور وہ بھی تہی دستی کی حالت میں۔ مجبوراً سیونگ بنک سے روپے منگوائے اور حساب بیباق کر دیا۔ یوں معمولاً وہ کچھ اور باقی ملاکر اپنے سبیتھے کے مطابق روپے دیا کرتے تھے۔ لیکن آج حال اور باقی کی رقمیں مل کر اس طرح بڑھیں جیسے صاف فرش اُٹھا دینے سے نیچے خاک کا ایک انبار نظر آنے لگتا ہے۔ انھیں اب تک گمان بھی نہ ہوا تھا کہ میں اس حد تک مقروض ہوگیا ہوں۔ پاس بک میں ایک تشویش ناک تخفیف ہوگئی۔ آخر سازوسامان نیلام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب انھیں رکھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ دوسرے دن نیلام شروع ہوگیا اور چیزیں ایک ایک کرکے ان سے ترکِ موالات کرنے لگیں۔ ہری بلاس برآمدے میں مغموم بیٹھے ہوئے تھے۔ اس خانہ تباہی کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ کتنی ہی چیزیں ایک مدّت سے ان کے پاس تھیں۔ اب ان کا جدا ہونا شاق گزرتا تھا۔ سب سے دل شکن وہ موقع تھا۔ جب ان کا گھوڑا اور فٹن نیلام ہوئے۔ وہ اس نظارہ کے متحمل نہ ہوسکے۔ گھر میں گئے تو ان کی آنکھیں آب گوں تھیں۔ سمترا نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ ناحق دل اتنا چھوٹا کرتے ہو۔ رنجیدہ ہونے کی کون سی بات ہے یہ تو اور خوشی کی بات ہے کہ جس کام کے کرنے میں ادھرم ہوتا تھا اس سے نجات مل گئی۔ اب کسی کا گلا کاٹنے کے لیے کوئی تمھیں مجبور تو نہ کرے گا۔ روزی کا ایک یہی وسیلہ نہیں ہے۔ بھگوان نے مُنہ چیرا ہے تو اہار بھی دیں گے۔ آخر اپنے بھائی بندوں پر ظلم کرتے تو اس کا دوش پاپ ہمارے ہی بال بچوں پر نہ پڑتا۔ بھگوان کو کچھ اچھا ہی کرنا تھا۔ تبھی اس نے تمھارے من میں یہ بات ڈالی ہے۔

ہری بلاس کو ان باتوں سے گونہ تشفی ہوئی۔ پہلے سمترا استعفیٰ پر راضی نہ ہوتی تھی۔ لیکن شوہر کی روحانی کش مکش کا خاتمہ کرنے کے ارادے نے اس کی قناعت اور توکل کو بیدار کردیا تھا۔

ہری بلاس نے سمترا کی طرف عقید تمندانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ جانتی ہو کتنی تکلیفیں اُٹھانا پڑیں گے۔

سمترا تکلیفوں سے ڈرنا۔ دھرم کے لیے آدمی سب کچھ سہہ لیتا ہے۔ جان تک کی

پرواہ نہیں کرتا۔ آخر ہمیں بھی تو ایشور کے دربار میں جانا ہے۔ جب وہ پوچھتا کہ تم نے اپنے سکھ چین کے لیے اپنی آتما کا خون کیوں کیا تو اُسے کیا جواب دیتے۔

ہری بلاس۔ کیا بتاؤں یہ پاک اعتقاد مجھ میں نہیں ہے۔ مجھے تو مادی تعلیم نے نفس اور خواہشات کا غلام بنا دیا ہے۔ ایشور پر سے بھروسہ ہی اُٹھ گیا۔ گو میں نے انھیں وجوہ سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ لیکن مجھ میں وہ زندہ جاگتا ہوا ایمان نہیں ہے جو انسان کو منافی الحق کر دیتا ہے۔ مجھے ابھی تک کچھ سوجھ نہیں پڑتا کہ آئندہ گزران کی کیا صورت ہوگی؟ شیوبلاس اگر سال بھر اور تعلیم جاری رکھ سکتا تو وہ ہاتھ پیر سنبھال لیتا۔ سنت بلاس کو ابھی کم سے کم تین سال تک سہارے کی ضرورت ہے اور غریب سری نواس کی ابھی کوئی گنتی ہی نہیں۔ اب یہ بیچارے کہیں کے نہ رہیں گے معلوم نہیں دل میں کیا سمجھتے ہوں گے۔

سمترا۔ اگر ایشور نے انھیں سمجھ دی ہے تو اب وہ تمھیں اپنا پیارا باپ سمجھنے کے بدلے دیوتا سمجھتے ہوں گے۔

رات کا وقت تھا۔ شیوبلاس اور اس کے دونوں چھوٹے بھائی بیٹھے ہوئے انھیں معاملات کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

شیوبلاس۔ اس وقت دادا کی حالت دیکھ کر ارادہ ہوتا ہے کہ شادی نہ کروں۔ کئی بار جی چاہا کہ چل کر ان کی تشفی کروں۔ لیکن ان کے روبرو جاتے ہوئے مجھے خود رونا آتا ہے۔ آخر انھیں ہمیں لوگوں کی فکر ہے نہ۔ ورنہ اپنی کیا فکر تھی۔ چاہیں تو کسی کالج میں ملازمت کرسکتے ہیں۔ فلاسفی اور علم اقتصاد میں انھیں اچھا دسترس ہے۔

سنت نواس۔ آپ نے کالج سے اپنا نام خارج کرانے کی درخواست ناحق دے دی۔ ڈاکٹری کا صیغہ تو بُرا نہ تھا۔ آپ خانگی طور پر کام کرسکتے تھے۔ دادا سے بھی آپ نے نہ پوچھا۔ انھیں یہ خبر سن کے سخت رنج ہوگا۔

شیوبلاس۔ اسی وجہ سے تو میں نے اب تک ان سے کہا نہیں۔ صیغہ کتنا ہی اچھا ہو۔ لیکن میں اسے معاش کا وسیلہ نہیں بنانا چاہتا۔ بس جو طے کرلیا ہے اسی پر قائم ہوں۔ کیوں تم میری مدد کروگے نا؟

سنت بلاس۔ میں تو ایم۔ اے کے قبل شاید ہی آپ کی مدد کرسکوں۔ اس سال مجھے معاف

ہی رکھیے۔ آئندہ سے کچھ نہ کچھ وقت ضرور آپ کی نذر کر دوں گا۔

شیوبلاس۔ ایم، اے سے تمھیں کیوں اتنا عشق ہے؟

سری بلاس۔ (شرارت آمیز تبسم کے ساتھ) ایم، اے کے معنی ہیں۔ آف......"

سنت بلاس۔ یہ میری بہت پرانی آرزو ہے۔ اور اب منزلِ مقصود سے اس قدر قریب پہنچ کر قدم ہٹانا نہیں چاہتا۔

شیوبلاس۔ اس کے بعد پھر وہی ایل۔ ایل۔ بی کا معینہ دور آئے گا اور تم موٹے حروف کے سائن بورڈ لگا کر موکلوں سے دون کی لینا شروع کروگے۔

سنت بلاس۔ آپ تو اس انداز تحقیر سے کہہ رہے ہیں گویا میں ایسا کروں تو کوئی شرمناک بات نہ ہوگی۔ بیشک مجھے یہ ہوس ہے اور میں اپنے تئیں اس کے لیے قابلِ سرزنش نہیں سمجھتا۔ وکالت کے پیشے سے مجھے عشق نہیں چاہے ضرورت سے مجبور ہوکر اسے اختیار ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ لیکن ڈگری سے ضرور محبت ہے۔ آج کل انسان کی وقعت ڈگریوں ہی پر منحصر ہے۔ ابھی تک شاید ہی کوئی ایسا آدمی ملا ہوگا جو اپنی عملی ڈگریوں سے دست بردار ہوگیا ہو۔ وہ حضرات بھی جو تعلیمی رفاقت کے پیشوا بنتے ہیں۔ اپنے ناموں کے پیچھے بڑی بڑی ڈگریوں کا چھلہ لگانا معیوب نہیں سمجھتے۔ قومی مدرسوں اور کالجوں میں بھی انھیں حضرات کی قدر ہے جو ولایت کی ڈگریاں پائے ہوئے ہیں۔ یہی ہماری قیمت کا معیار ہے۔ تو پھر میں ہی کیوں اپنے اوپر جبر کروں۔ بُرا نہ مانیے گا۔ اخبار کے ابتدائی ہفتوں میں غالباً آپ بھی میرے ڈگریوں کے اظہار کے بعد ہی چھاپیں گے۔

شیوبلاس۔ (نادم ہوکر) ہاں یار بات تو سچی کہتے ہو۔ اس کو روحانی غلامی کہتے ہیں۔

سنت بلاس۔ اپنی پالیسی تو آپ نے سوچ ہی لی ہوگی۔ اگر آپ نے بھی وہی آئین اختیار کیا جو دوسرے اخباروں کا ہے تو علاحدہ اخبار نکالنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

سری بلاس۔ مجھ سے تو آپ لوگ کچھ پوچھتے ہی نہیں۔ میں بھی مدرسہ چھوڑ رہا ہوں۔ کل میرا نام بھی اخباروں میں نکلے گا۔

شیوبلاس۔ تم میرے اخبار کے دفتر کے کلرک ہوجانا۔

سری بلاس۔ جی ہاں! سارا دن میز پر بیٹھے بیٹھے سر کون کھپائے گا۔ میں نے کھیتی باڑی

کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ہل جوتوں گا اور نئی نئی فصلیں پیدا کروں گا۔

شیو بلاس۔ ہاں اخبار کی پالیسی کے متعلق تم سے گفتگو کرنے کا مجھے اب تک موقع نہیں ملا۔ میں سیاسیات کی اُلجھن میں نہ پڑکر تمدنی اصلاحوں پر اپنی ساری قوت صرف کرنا چاہتا ہوں۔ ہم اس وقت آنکھیں بند کیے ہوئے مغربی معاشرت کے پیچھے دوڑے جا رہے ہیں۔ میں تکلف اور نمائش کی زندگی کے خلاف آواز بلند کروں گا۔ ''بیدار اور سادہ معاشرت'' میرا اصول عملی ہوگا۔ مغرب کی تقلید دولت کو شرافت، انسانیت، اعزاز اور وقار کا پیمانہ بنا دیا ہے۔ ہم اپنے اسلاف کی قناعت، اعتدال اور پاک نفسی کو بھول گئے ہیں۔ جہاں دیکھیے وہاں سرمایہ داروں کی، اہلِ دولت کی، زمینداروں کی نمود ہے۔ میں بیکسوں کی حمایت کو اپنا دستور العمل قرار دوں گا۔ گو یہ خیالات نئے نہیں ہیں۔ کبھی کبھی اخباروں میں ان مباحث پر مضامین نظر آجاتے ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کی وقعت عالمانہ استدلال سے زیادہ نہیں ہے۔ اور وہ بھی یورپ کے بعض فلاسفروں کی تقلید ہے۔ مثلاً ایڈورڈ کانپٹر رسکن، رسل وغیرہ۔ ان خیالات کے موید اپنے اصول و عمل میں ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتے اور اس وجہ سے ان کی تلقین کا کسی پر اثر نہیں پڑتا۔ میری زندگی ان اصولوں کی زندہ مثال ہوگی۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ دولت کی یہ گرم بازاری دیکھ کر کبھی کبھی میں اپنے ملک کی طرف سے مایوس ہوجاتا ہوں۔ چھوٹے بڑے امیر و غریب سب اس کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ علم و کمال کی عزت ہی اُٹھ گئی۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ بڑے بڑے تاجدار اہلِ کمال کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ ایک زمانہ یہ ہے کہ مذہبی تحریکیں بھی اہل زر کی دست نگر رہتی ہیں۔ ہمارے سادھو مہاتما اُپدیشک کبھی دیہاتوں میں بھول کر بھی نہیں جاتے۔ وہ پُر تکلف پنڈالوں میں تقریریں کرتے ہیں۔ موٹروں پر ہوا کھاتے ہیں اور اہلِ زر کے مہمان ہوتے ہیں۔ علماء و فضلاء بھی اس معبود زرّیں کی پرستش میں سرگرم ہیں۔ جنھیں بیدار اور سادہ معاشرت کا نمونہ بننا چاہیے تھا، وہ نفس کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ ایثار دُنیا سے معدوم ہوگیا۔

سمنت بلاس۔ آپ کے خیالات تو بالکل بالشویکوں کے سے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ انھوں نے علماء اور فضلاء کی کیا قدر کی ہے۔

شیوبلاس۔ خوب معلوم ہے۔ وہ علماء اور فضلاء اسی سلوک کے سزاوار تھے۔ جس طرح اہل زمین اپنی جائدادوں کو، اہلِ تجارت اپنی مصنوعات کو تن پروری کا وسیلہ بناتے ہیں اسی طرح ہمارے علماء بھی کمال اور روشنی کو دولت پر قربان کرتے ہیں۔ ان کے لیے تعلیم گاہوں میں بیش قرار مشاہرے رکھے جاتے ہیں۔ ان کی قدر و منزلت کا یہی معیار ہوگا۔ کیا یہ حالت افسوناک نہیں ہے؟

سنت بلاس۔ تو کیا آپ کا منشاء ہے کہ ہم دو ہزار سال پیچھے کی نیم وحشیانہ طرزِ معاشرت اختیار کرلیں۔ اس ترقی کے دور میں اس سادہ معاشرت کو واپس لانے کا خیال مضحکہ خیز ہے۔

شیوبلاس۔ تم مجھے خواہ مخواہ ایک طولانی مباحثے میں کھینچے لیے جاتے ہو۔ تم اس زمانے کو اس لیے ترقی کا دَور کہتے ہو کہ اس میں طبیعات نے حیرت انگیز ایجادیں کی ہیں۔ انسانی معلومات کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے۔ اور دولت کمانے کے لیے بے انتہا ذرائع نکل آئے ہیں۔ اور قدیم زمانے کو نیم وحشیانہ دور اس لیے کہتے ہو کہ اس وقت یہ ایجادیں، یہ عملی انکشافات، یہ وسائلِ تجارت اور حصولِ زر نہ تھے۔ کیا میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ انسان کی زندگی کا تمھارے خیال میں کیا منشاء ہے؟

سنت بلاس۔ انسان کی زندگی کا منشاء ہے زندہ رہنا۔ قدرت کے عطا کیے ہوئے وسائل سے فائدہ اُٹھانا۔ قدرت کے چھپے ہوئے خزانوں کو ڈھونڈنا، انسانی زندگی کو زیادہ کامل، زیادہ وسیع، زیادہ رفیع بنانا۔

شیوبلاس۔ میرا تم سے کل اتفاق ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم طبیعات اور نظریات کے قائل ہو۔ میں تزکیہ اور تہذیبِ نفس کا۔ تم مجاز کے پیرو ہو میں حقیقت کا۔ یہ لو دادا خود آرہے ہیں۔

(۹)

تینوں لڑکوں نے اُٹھ کر باپ کی تعظیم کی۔ اور سر جھکا کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ رائے صاحب نے متفکرانہ انداز سے شیوبلاس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ تمھارا کالج کب کھلے گا؟

شیوبلاس۔ کالج تو دوسری تاریخ کو کھل جائے گا۔ لیکن اب میں وہاں جانا نہیں چاہتا۔ استعفیٰ

بھیج دیا۔

ہری بلاس۔ یہ تم نے کیا حماقت کی۔ کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیتے۔ کیا مجھے اتنا جاننے کا حق بھی نہیں ہے؟

شیوبلاس۔ اتنی خطا ضرور ہوئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا کورس ختم ہوگیا ہے۔ اب صرف امتحان دینا باقی ہے۔ اور چونکہ میں اس پیشے کو معاش کا وسیلہ نہیں بنانا چاہتا اس لیے امتحان میں شریک ہونے کی کوئی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔

ہری بلاس۔ مگر کسبِ معاش کا مسئلہ تو حل کرنا ہی پڑے گا۔ اس کی کیا صورت نکالی ہے؟

شیوبلاس۔ اس کی مجھے زیادہ فکر نہیں۔ کیونکہ میں اپنی ضرورتوں کو گھٹا کر بہت قلیل آمدنی میں گذر کرسکتا ہوں۔ کچھ باغبانی کا کام کرکے گزران کرلوں گا۔ باقی وقت قومی خدمت میں صرف کرنے کا ارادہ کرتا ہوں۔ میرا قصد ایک اخبار نکالنے کا ہے۔

ہری بلاس۔ تمھارے خیال میں اخبار نکالنا آسان ہے؟ اوّل تو کافی سرمایہ چاہیے۔ پھر نامساعد ملکی حالات کا مقابلہ۔ ابھی تم نے مشکلات کا اندازہ نہیں کیا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ راستہ آسان ہے۔ مگر چند ہی قدم چل کر تمھیں معلوم ہوجائے گا کہ یہاں قدم قدم پر کانٹے ہیں۔ میں اتنا خودغرض اور دُنیا پرور نہیں ہوں کہ تمھارے قومی جوش خدمت کو دبانا چاہتا ہوں۔ لیکن اتنا جتا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ خوب سوچ سمجھ کر اس میدان میں آنا۔ ورنہ چند قدم چل کر ہمّت ہار دی تو اس میں سراسر سب کی رسوائی ہے۔ میں تم سے امداد کا طالب نہیں ہوں اور نہ میرے لیے یہ کم فخر کی بات ہے کہ میرا لڑکا قوم کا سرفروش خادم بنے۔ صرف تمھیں مشکلات سے باخبر کر دینا چاہتا ہوں۔ تم کب جاؤگے سنتو؟

سنت بلاس۔ میرا کالج تو ۱۵ر جنوری کو کھلے گا۔

ہری بلاس۔ تمھیں کتنے روپوں کی ضرورت ہے؟

سنت بلاس۔ کم سے کم ڈھائی سو۔ کیونکہ اسی مہینے میں چھ ماہ کی فیس بھی داخل کرنی ہوگی۔

ہری بلاس۔ (بغلیں جھانکتے ہوئے) اس سے کم میں کام نہیں چل سکتا؟ میں آج کل زیربار ہورہا ہوں۔

سنت بلاس۔ میری عادت سے آپ واقف ہیں۔ میں خود ہی حتی الامکان کفایت سے رہتا

ہوں۔ اس سے کم میں کچھ انتظام نہ کرسکوں گا۔ فیس کے علاوہ ایک سوٹ بھی بنوانا ہے۔ میرے پاس کوئی اچھا سوٹ نہیں ہے۔

ہری بلاس۔ بھئی اس وقت سوٹ کو ملتوی رکھو۔ میں کوئی وسیلہ نکال لوں تو اس کی فکر کرلینا۔ ہاں فیس اور بورڈنگ کا انتظام کیے دیتا ہوں۔ اس سے کہاں نجات۔ پڑھو تو دو، نہ پڑھو تو دو۔

سنت بلاس۔ میں آپ کے اوپر خواہ مخواہ بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ اگر آپ انتظام نہیں کرسکتے تو میں خود ہی کوئی فکر کرلوں گا۔ مگر اس تخمینے میں میں نے کمی کی مطلق گنجائش نہیں رکھی ہے۔

ہری بلاس۔ یہ تمھاری بُری عادت ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر چڑھ جاتے ہو۔ میری حالت دیکھ رہے ہو۔ پھر بھی تمھاری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ معلوم نہیں سارا فرنیچر نیلام کرکے بھی مطالبوں سے نجات ہوتی ہے یا نہیں۔

سنت بلاس۔ اگر آپ کا یہی منشا ہے کہ میں بھی کالج سے نام خارج کرا لوں تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔

ہری بلاس۔ (جھنجھلاکر) بہتر ہے۔ نام خارج کرا لو۔ دیکھتا ہوں تم ضرورتوں کے غلام ہوتے جاتے ہو۔

آج کل ہندوستان ہی نہیں۔ یورپ میں بھی بیدار مغزوں کا میلان سادہ اور بے تکلف معاشرت کی طرف ہو رہا ہے۔ اہلِ علم سے اب ایثار اور خدمت کی اُمید کی جاتی ہے۔ نہ کہ نمود اور جاہ طلبی کی۔ سوسائٹی میں اب وکیلوں پر اعتقاد کی نگاہیں نہیں پڑتیں۔ لوگ اس سے بدظن ہوتے جا رہے ہیں۔ اور فی الواقع یہ طبقہ اسی برتاؤ کا سزاوار ہے۔ میں بھی عام دستور کے موافق انھیں اس پیشے کے لیے تیار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اب مجھے اس کی برائیاں نظر آرہی ہیں۔ اس پیشے کی بدولت ہماری عدالتوں میں انصاف اتنا گراں ہوگیا ہے کہ عوام کے لیے قریب قریب ناممکن الحصول ہے۔ جب ایک ایک پیشی کے دو دو چارچار سو روپے اور یہاں تک کہ ایک ایک ہزار روپے لیے جاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ محنت اور وقت کا معاوضہ نہیں۔ بلکہ محض لوگوں کے بغض اور حسد اور دُنیا طلبی کا تاوان ہے۔ جس پیشے کا مدار اور قیام محض انسانی خباثت اور کمزوریوں پر ہو وہ کبھی سوسائٹی کے

لیے فلاح اور برکت کا باعث نہیں ہوسکتا۔ میں تمھیں مجبور نہیں کرتا۔ اگر وکالت کے بجائے تم کوئی زیادہ حلال صورتِ معاش نکالو تو مجھے زیادہ اطمینان ہوگا۔

سنت بلاس نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ چیں بہ جبیں ہوکر چلے گئے۔ تب ڈپٹی صاحب نے سری بلاس سے پوچھا۔ ”تم امتحان کی تیاری کر رہے ہو نا؟“

سری بلاس۔ جب آپ فرما رہے ہیں کہ دولت مندوں کی آج کل کوئی قدر نہیں کرتا تو پھر ایسی تعلیم سے کیا فائدہ جس کا منشاء دولت پیدا کرنا ہے؟ میرا نام بھی مدرسے سے خارج کرا دیجیے۔ میں آپ ہی کی خدمت سے فیض اُٹھانا چاہتا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کھیتی کرنے کو۔ آخر آپ دیہات میں رہیں گے تو کچھ نہ کچھ کھیتی باڑی ضرور ہی کرائیں گے۔ یہ کام میرے سپُرد کر دیجیے۔ میں نئے تجربوں اور اصولوں کے مطابق کھیتی کروں گا۔ بھینس پالوں گا۔ فرصت کے وقت اپنے گاؤں کے لڑکوں کو پڑھاؤں گا اور آپ سے پڑھوں گا۔

اسی اثناء میں سمترا آگئی۔ ہری بلاس نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ لو سری بلاس نے تمھاری فکروں کا خاتمہ کر دیا۔ تم سوچ رہی تھیں کہ کیسے کیا ہوگا۔ اب چل کر آرام سے گاؤں میں رہو۔ یہ کھیتی کریں گے۔ تم بکھاروں میں اناج بھرنا اور رام کا نام لینا۔

(۱۰)

تیسرے دن بابو ہری بلاس اپنے موضع میں آگئے۔ مکان بے مرمت پڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف گھاس جم گئی تھی۔ گاؤں والوں نے دروازے پر کھاد اور کوڑے کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ اِدھر کئی سال سے بابوصاحب گھر نہ آئے تھے۔ گھر میں قدم رکھتے کراہت سی معلوم ہوتی تھی۔ صاف بنگلوں میں رہنے کے عادی ہوگئے تھے۔ شیوبلاس نے اسباب اُتارا۔ اور جھاڑو دے کر دروازے کی صفائی کرنے لگے، انجنی جو ڈپٹی صاحب کی بڑی لڑکی تھی اندر جھاڑو لگانے لگی۔ سری بلاس کچھ دیر تو کھڑا تاکتا رہا۔ پھر ایک ٹوکری لے کر کوڑا پھینکنے لگا۔ سنت بلاس یہاں نہ آئے تھے۔ ماں سے ضد کرکے روپے اینٹھ لیے تھے اور الہ آباد کی راہ پکڑی تھی۔ گاؤں میں جوں ہی معلوم ہوا کہ ہری بلاس نے استعفیٰ دے دیا ہے لوگ اِدھر اُدھر سے مزاج پرسی کو آنے لگے۔ ہری بلاس باہر ایک ٹوٹی کھاٹ پر غم زدہ بیٹھے سوچ رہے تھے کہ موروثی جائداد کیوں کر ہاتھ آئے۔ سمترا اندر کھڑی یہ سوچ رہی تھی کہ

یہ کوڑے کرکٹ کا انبار کیوں کر ٹلے گا۔ اس کے قبل یہ لوگ جب گھر آتے تھے تو گاؤں والے ان پر حیرت آمیز رشک کرتے تھے۔ اور ان کے سازوسامان کو اس طرح دیکھتے تھے گویا کسی عجائب خانے کی سیر کر رہے ہیں۔ ان غریبوں کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان سے کچھ بولیں مگر اب وہ سارے سامان غائب تھے۔ نہ لڑکوں میں وہ رعونت تھی نہ ڈپٹی صاحب اور سمترا میں وہ مربیانہ گفتگو۔ لوگوں کو ان کے ساتھ کچھ ہمدردی سی ہوگئی۔ عورتیں انجنی کے ساتھ صفائی کرنے لگیں۔ کئی مردوں نے شیوبلاس کو جھاڑو اور سری بلاس کو ٹوکری سے نجات دی۔ یہ دونوں پسینے میں شل ہو رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ موٹا کام دُنیا کے خیال میں چاہے کتنا ہی دلآویز کیوں نہ ہو۔ واقعات کی دُنیا میں وہ اتنا پسندیدہ نہیں۔ رام بھروسے پنڈت نے بابو ہری بلاس سے کہا۔ بھیا تم نے اچھا کیا استیپھا دے دیا۔ دیس پردیس مارے مارے پھرتے تھے۔ اب سکھ سے گھر میں رہوگے۔ گھر مٹی میں ملا جاتا تھا۔ اب بس جائے گا۔

شیخ عیدو بولے۔ چاکری چاہے چھوٹی ہو چاہے بڑی چاکری ہے۔ جب اللہ نے سب کچھ تمھارے گھر میں دے دیا ہے تو کیوں کسی کی بندگی کرو۔

گوبر چوکیدار بولا۔ مدا بابو ھدا بڑا تھا۔

بھوجو کُرمی نے کہا۔ ھدا تو بڑا تھا۔ مدا کتنے گریبوں کا گلا ریتنا پڑتا تھا۔ سینکڑوں کو جیل بھیجا ہوگا۔ اس لڑائی میں پرجا کو مار مار کر سرکار کو کرج دلایا ہوگا۔ دورے پر جاتے ہوں گے تو بیگار لینا پڑتی ہوگی۔ ان کے ہاتھوں کتنے کسانوں کا اکھراج اور بے دکھلی ہوئی ہوگی۔ گھر میں رہیں گے تو اس جھنجھٹ سے تو گلا چھوٹ جائے گا۔

گوبرچوکیدار۔ روآب کتنا تھا۔ حکومت کتنی تھی۔

بھوجو۔ روآب ھدّے سے نہیں ہوتا۔ روآب بھل منسیٔ سے ہوتا ہے۔ بدّیا اور دھرم سے ہوتا ہے۔ رام بھروسے پنڈت کون ھدّے والے ہیں۔ لیکن کیوں سب لوگ کھاٹ سے اُٹھ کر پالاگن کرتے ہیں۔ تھانیدار آتے ہیں تو ان کی کھاتر ایک چلم تماکھو دینا سب کو اکھر جاتا ہے۔ لیکن ساستری مہاراج جس کے گھر اپنے دس پانچ چیلوں سمیت آجاتے ہیں وہ اپنے بھاگ کو سراہتا ہے۔ جلا میں ایک سے ایک حاکم پڑے ہیں۔ مدا ساستری جی کی طرح کس کا روآب ہے۔ آج جو حکم دے دیں تو لوگ

آگ میں کود پڑیں۔

رام بھروسے۔ بابو سنت بلاس نہیں دکھائی پڑتے۔

ہری بلاس۔ وہ وکالت پڑھنے چلے گئے۔

رام بھروسے۔ بھیّا یہ بدیّا تو تم انھیں ناہک پڑھاتے ہو۔ بڑے کوکرم کرنے پڑتے ہیں۔ وکیلوں کا مارا سارا جلا تو راہ ہوگیا۔ سب کو لڑلڑا کے بھکاری کر دیا۔

عیدو۔ بھیّا تم اپنی جمین چھڑالو۔ اور مجھ سے کھیتی کراؤ۔ چاکری بہت کی۔ اب کچھ دن گرہستی کا مجا چکھو۔ یہاں اتنا چین تو نہ ملے گا۔ لیکن چولا مست رہے گا۔ پردیس میں جو کچھ کماتے تھے سب کا سب کپڑے لتّے۔ کرسی میج۔ میوہ۔ مٹھائی، دودھ ملائی میں اُڑجاتا ہوگا۔ بیس پچیس کا تو دودھ ہی پی جاتے ہوگے اور نہیں تو پچاس روپیہ گھر کا کرایہ ہوگا۔ کھا پی کے سب برابر ہوجاتا ہوگا۔

ہری بلاس۔ زمین چُھڑانے کے واسطے روپے کہاں سے لاؤں؟

سب آدمیوں نے ان کی طرف حیرت آمیز اشتباہ سے دیکھا۔ گویا کوئی انوکھی بات کہہ رہے ہیں۔ آخر بھوجو بولا۔ کیا کہتے ہو بھیّا۔ کون بہت روپے چاہیے ہوں گے۔ تین چار ہزار تو تمھارے بکس کے ایک کونے میں دھرے ہوں گے۔ اتنی بڑی طلب پاتے تھے۔ بخر بخرانہ لیتے رہے ہوں گے۔ یہ سب کہاں اُڑا دیا؟

ہری بلاس۔ میں کسی سے نذر نذرانہ نہ لیتا تھا۔ تنخواہ میں گذر مشکل ہوتا تھا۔ بچت کہاں سے ہوتی۔

بھوجو۔ ایسا کیا ہوگا۔ دس بیس ہزار تو بٹورا ہی ہوگا۔

ہری بلاس۔ نہیں چچا۔ سچ مانیے۔ میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔

بھوجو۔ تب گجر بسر کیسے ہوگا؟

ہری بلاس۔ پرماتما مالک ہیں۔ ابھی تو کچھ نذر نہیں آتا۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ٹھاکر کرن سنگھ جو اس نواح میں سب سے بڑے زمیندار تھے اپنے دو مصاحبوں کے ساتھ ہاتھی پر بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ لوگ چارپائیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہری بلاس جب تک برسرِ اقتدار تھے ایسے کتنے ہی زمیندار روزانہ انھیں سلام کرنے کو حاضر ہوتے تھے۔ پر کرن سنگھ کو دیکھ کر وہ اضطراری طور پر تعظیماً اُٹھ بیٹھے۔

ہاتھی سامنے آکر رُکا۔ کرن سنگھ اُتر پڑے اور ہری بلاس کو چارپائی پر بٹھاکر خود بیٹھتے ہوئے بولے۔ بابوصاحب آپ کے مبارک قدموں سے آج یہ گاؤں پوتر ہوگیا۔ آج اخبار کھولا تو پہلے آپ ہی کی خبر نظر آئی۔ غرور سے متوالا ہوگیا۔ آپ کی ہمّت اور ایثار کو آفرین ہے۔ ہری بلاس۔ نے احسان مندانہ انکسار سے کہا۔ آپ کا مزاج تو اچھا ہے؟ کچھ دُبلے نظر آرہے ہیں۔

کرن سنگھ۔ اب آپ کی دَیا سے بہت اچھی طرح ہوں۔ مہینوں سے بیمار تھا۔ آج آپ کی خبر دیکھ کر خودبخود چنگا ہوگیا۔ پرماتما نے ہماری کاربراری کے لیے آپ کے دل میں یہ تحریک کی۔ ہم نے اِدھر کچھ دنوں سے ایک پنچائت قائم کی ہے۔ پر اُس کا کوئی سرپنچ ایسا نہ ملتا تھا۔ جس پر خاص و عام کو بھروسہ ہو۔ آپ کو پرماتما نے اس کا بیڑا پار کرنے کے لیے بھیج دیا۔ میں آج ہی صبح اُٹھ کر راجا صاحب ملاؤں، ٹھاکرصاحب بگہا اور دونی چند ساہ کے پاس گیا۔ تینوں اصحاب آپ کا نام سُن کر اُچھل پڑے۔ ان لوگوں کی طرف سے میں آپ سے یہ درخواست کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سرپنچی کا عہدہ قبول فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

ہری بلاس۔ میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ پر اپنے تیئں اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھتا۔ جس پنچائت کے اراکین ایسے ایسے صاحبِ ثروت لوگ ہوں۔ اس کے صدر بننے کی جُرأت میں نہیں کرسکتا۔

کرن سنگھ۔ بابوصاحب یہ نہ کہیے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے اس جوار میں اس وقت آپ کو لوگ کن نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ کیا چھوٹے کیا بڑے سب آپ کے معتقد ہوگئے ہیں۔ پہلے آپ پرگنہ کے حاکم تھے۔ اب آپ کی حکومت رعایا کے دلوں پر ہے۔ میری یہ ناچیز استدعا قبول کیجیے۔

ہری بلاس اعزاز کے بار سے سر نہ اُٹھا سکے۔ ان کی خموشی رضامندی کی معترف تھی۔ کرن سنگھ اُٹھے اور پھولوں کا ہار اپنے ایک مصاحب سے لے کر ان کی گردن میں ڈال دیا۔ اور تب ایک لمحہ تک کسی تشویش انگیز خیال میں غرق رہنے کے بعد شرماتے ہوئے بولے بابوجی آپ نے میری ایک عرض تو قبول کرلی اب مجھے دوسری درخواست کرنے کی اجازت دیجیے تو عرض کروں۔

ہری بلاس۔ شوق سے فرمائیے۔ میں آپ کی خدمت کے لیے دل و جان سے حاضر ہوں۔

کرن سنگھ نے جیب سے ایک لفافہ سربمہر نکالا۔ اور بولے میں اسے آپ کے قدموں پر نثار کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

ہری بلاس نے دبی ہوئی متجسس نگاہوں سے لفافے کی طرف دیکھا۔ لکھا ہوا تھا ''بیع نامہ و رہن نامہ رام بلاس کورمی۔ موضع بدوکھر۔''

احسان کے آنسوؤں سے ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ شکریہ اور احسان مندی کا اظہار کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔ لیکن کرن سنگھ نے انھیں بولنے کا موقع نہ دیا۔ اسی وقت اس لفافے کے پُرزے کر دیے۔

ہری بلاس نے لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ یہ کیسے کاغذ تھے۔ یہ دادا کے لکھے ہوئے بیع نامے اور رہن نامے تھے۔ یہ کہتے کہتے رقت سے ان کی زبان بند ہوگئی۔

اردو ماہنامہ زمانہ جولائی1921 میں شائع ہوا۔ اردو مجموعہ خواب و خیال میں شامل ہے۔ ہندی میں پریم چترتھی میں شائع ہوئی تھی۔ کسی مجموعہ میں نہیں ہے۔

لاگ ڈاٹ

جوکھو بھگت اور بیچن چودھری میں تین پیڑھیوں سے عداوت چلی آتی تھی۔ کچھ ڈانڑھ میڑھ کا جھگڑا تھا۔ ان کے پرداداوں میں کئی بار خون کھچر ہوا۔ باپوں کے سمے سے مقدمے بازی شروع ہوئی۔ دونوں کئی بار ہائی کورٹ تک گئے۔ لڑکوں کے سمے میں سنگرام کی بھیشنتا (شدت) اور بھی بڑھی، یہاں تک کی دونوں ہی اُشکت (مجبور) ہوگئے پہلے دونوں اسی گاؤں میں آدھے آدھے حصے دار تھے اب ان کے پاس اس جھگڑے والے کھیت کو چھوڑ کر ایک انگل زمین نہ تھی۔ بھومی گئی، دھن گیا، مان مریادہ گیا لیکن وہ وِیواد جیوں کا تیوں بنا رہا ہائی کورٹ کے دھورندر نیتگیے (جید مدبّر) ایک معمولی سا جھگڑا طے نہ کرسکے۔

ان دونوں سجنوں (شریفوں) نے گاؤں کو دو ورودھی دَلوں میں وِبھگت کر دیا تھا۔ ایک دَل کی بھنگ بوٹی چودھری کے دُوار پر چھنتی۔ دوسرے دَل کے چرس گانجے کے دم بھگت کے دُوار پر لگتے تھے۔ استریوں اور بالکوں کے بھی دو دَل ہوگئے تھے۔ یہاں تک کے دونوں سجنوں کے سماجک اور دھارمک وِچاروں میں بھی وِبھاجک ریکھا کھینچی ہوئی تھی۔ چودھری کپڑے پہنے ستو کھا لیتے بھگت کو ڈھونگی کہتے۔ بھگت بنا کپڑا اُتارے پانی بھی نہ پیتے اور چودھری کو بھرشٹ بتلاتے۔ بھگت سناتن دھرمی بنے تو چودھری نے آریہ سماج کا آشرے لیا۔ جس رنگریز، پنساری یا کنجڑے سے چودھری سودے لیتے اس کی طرف بھگت جی تاکنا بھی پاپ سمجھتے تھے۔ اور بھگت جی کی حلوائی کی مٹھائیاں ان کے گوالے کا دودھ اور تیلی کا تیل چودھری کے لیئے تیاجیے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے آروگیتا (تندرستی) کے سدھانتوں (اصولوں) میں بھی بھنّتا تھی۔ بھگت جی ویدھک (فنِ معالج) کے قائل تھے۔ چودھری یونانی پرتھا (رواج) کے ماننے والے تھے۔ دونوں چاہے روگ سے مر جاتے، پر اپنے سدّھانتوں کو نہ توڑتے۔

(۴)

جب دیش میں راج بھگت آندولن شروع ہوا تو اس کی بھنک اس گاؤں میں آ پہنچی۔ چودھری نے آندولن کا پکش لیا۔ بھگت ان کے وپکشی (حزبِ مخالف) ہوگئے۔ ایک سجّن نے آکر گاؤں میں کسان سبھا کھولی۔ چودھری اس میں شریک ہوئے۔ بھگت الگ رہے۔ جاگرتی اور بڑھی۔ سوراجیہ کی چرچا ہونے لگی۔ چودھری سوراجیہ وادی ہوگئے۔ بھگت نے راج بھکتی کا پکش لیا۔ چودھری کا گھر سوراجیہ وادیوں کا اڈّا ہوگیا۔ بھگت کا گھر راج بھکتوں کا کلب بن گیا۔

چودھری جنتا میں سوراجیہ واد کا پرچار کرنے لگے:

"متّرو، سوراجیہ کا ارتھ ہے اپنا راج۔ اپنے دیش میں اپنا راج ہو وہ اچھا ہے کہ کسی دوسرے کا راج ہو وہ؟"

چودھری۔ تو یہ سوراجیہ کیسے ملے گا؟ آتم بل سے۔ پُروشارتھ (مردانگی) سے۔ میل سے۔ ایک دوسرے سے دویش کرنا چھوڑ دو۔ اپنے جھگڑے آپ مل کر نپٹا لو۔

ایک شنکا۔ آپ تو نتیہ (روزانہ) عدالت میں کھڑے رہتے ہیں۔

چودھری۔ ہاں، پر آج سے عدالت جاؤں تو مجھے گؤ ہتیا کا پاپ لگے۔

تمھیں چاہیے کہ تم اپنی گاڑھی کمائی اپنے بال بچوں کو کھلاؤ، اور بچے تو پروپکار میں لگاؤ۔ وکیل مختاروں کی جیب کیوں بھرتے ہو، تھانے دار کو گھوس کیوں دیتے ہو، عملو کی چِروری کیوں کرتے ہو؟ پہلے ہمارے لڑکے اپنے دھرم کی شِکشا پاتے تھے۔ اب وہ وِدیشی مدرسوں میں پڑھ کر چاکری کرتے ہیں، گھوس کھاتے ہیں، شوق کرتے ہیں، اپنے دیوتاؤں اور پُوروَجوں کی نِندا کرتے ہیں، سگریٹ پیتے ہیں، سال بناتے ہیں اور حاکموں کی گوڑ دھریا کرتے ہیں۔ کیا ہمارا کرتبیہ نہیں ہے کہ ہم اپنے بالکوں کو دھرمانشار شکشا دیں؟

جنتا۔ چندا کرکے پاٹھ شالہ کھولنا چاہیے۔

چودھری۔ ہم پہلے مدیرا کا چھونا پاپ سمجھتے تھے۔ اب گاؤں گاؤں اور گلی گلی میں مدیرا کی دُکانیں ہیں۔ ہم اپنی گاڑھی کمائی کے کروڑوں روپے گانجے شراب میں اُڑا دیتے ہیں۔

جنتا۔ جو دارو بھانگ پیے اسے ڈانڑھ لگانا چاہیے!

چودھری۔ ہمارے دادا بابا، چھوٹے بڑے سب گڑھا گجی پہنتے تھے۔ ہماری دادیاں، نانیاں چرخا کاتا کرتی تھیں۔ سب دھن دیش میں رہتا تھا۔ ہمارے جلاہے بھائی چین کی بنسی بجاتے تھے۔ اب ہم ودیش کے بنے ہوئے مہین رنگین کپڑوں پر جان دیتے ہیں۔ اس طرح دوسرے دیش والے ہمارا دھن ڈھولے جاتے ہیں۔ بے چارے جلاہے کنگال ہوگئے۔ کیا ہمارا یہی دھرم ہے کہ اپنے بھائیوں کی تھالی چھین کر دوسرے کے سامنے رکھ دیں؟

جنتا۔ گاڑھا کہیں ملتا ہی نہیں۔

چودھری۔ اپنے گھر کا بنا ہوا گاڑھا پہنو، عدالتوں کو تیاگو، نشے بازی چھوڑو، اپنے لڑکوں کو دھرم کرم سکھاؤ، میل سے رہو، بس یہی سوراجیہ ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ سوراجیہ کے لیے خون کی ندی بہے گی، وہ پاگل ہیں۔ ان کی باتوں پر دھیان مت دو۔

جنتا یہ باتیں چاؤ سے سنتی تھیں۔ دنوں دن شروتاؤں کی سنکھیا بڑھتی جاتی تھی۔ چودھری کے سب شردھا بھاجن (عقیدت کے مستحق) بن گئے۔

(۳)

بھگت جی بھی راج بھکتی کا اپدیش کرنے لگے۔ بھائیو! راجا کا کام راج کرنا اور پرجا کا کام اس کی آگیا کا پالن کرنا ہے۔ اسی کو راج بھکتی کہتے ہیں۔ ہمارے دھارمک گرنتھوں میں ہمیں اسی راج بھکتی کی شکشا دی گئی ہے۔ راجا ایشور کا پرتی ندھی (نمائندہ) ہے اس کے آگیا ورُدھ (خلاف) چلنا مہان پاتک (گناہ کبیرہ) ہے۔ راج ومکھ پرانی (جاندار) نرک کا بھاگی ہوتا ہے۔

ایک شنکا۔ راجا کو بھی تو اپنے دھرم کا پالن کرنا چاہیے؟

دوسری شنکا۔ ہمارے راجا تو نام کے ہیں۔ اصل راجا تو ولایت بیپے مہاجن ہیں۔

تیسری شنکا۔ بیپے دھن کمانا جانتے ہیں۔ راج کرنا کیا جانیں۔

بھگت۔ لوگ تمھیں شکشا دیتے ہیں کہ عدالتوں میں مت جاؤ۔ پنچائتوں میں مقدمے لے جاؤ۔ لیکن ایسے پنچ کہاں ہیں۔ جو سچّا نیائے کریں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیں! یہاں منہ دیکھی باتیں ہوں گی۔ جن کا کچھ دباؤ ہے۔ ان کی جیت ہوگی۔

جن کا کچھ دباؤ نہیں ہے وہ بے چارے مارے جائیں گے۔ عدالتوں میں سب کاروائی قانون پر ہوتی ہے۔ وہاں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔ شیر بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں۔

دوسری شدکا۔ عدالتوں کے نیائے کہنے ہی کو ہے۔ جس کے پاس بنے ہوئے گواہ اور داؤ پیچ کھیلے ہوئے وکیل ہوتے ہیں، اس کی جیت ہوتی ہے۔ جھوٹے سچّے کی پرکھ کون کرتا ہے؟ ہاں، حیرانی البتہ ہوتی ہے۔

بھگت۔ کہا جاتا ہے کہ ودیشی چیزوں کا ویوہار مت کرو۔ یہ غریبوں کے ساتھ گھور انیائے ہے۔ ہم کو بازار میں جو چیز سستی اور اچھی ملے وہ لینی چاہیے۔ چاہے سودیشی ہو یا ودیشی۔ ہمارا پیسہ سینت میں نہیں آتا ہے کہ اسے رڈی بھدی سودیشی چیزوں پر پھینکیں۔

ایک کاشتکار۔ اپنے دیش میں تو رہتا ہے۔ دوسروں کے ہاتھ میں تو نہیں جاتا۔

دوسری شدکا۔ اپنے گھر میں اچھا کھانا نہ ملے تو کیا وِجاتیوں کے گھر اچھا بھوجن کھانے لگیں گے؟

بھگت۔ لوگ کہتے ہیں۔ لڑکوں کو سرکاری مدرسوں میں مت بھیجو۔ سرکاری مدرسے میں نہ پڑھتے تو آج ہمارے بھائی بڑی بڑی نوکریاں کیسے پاتے۔ بڑے بڑے کارخانے کیسے بنا لیتے؟ بنا نئی وِدیا پڑھے اب سنسار میں نِباہ نہیں ہوسکتا۔ پرائی وِدیا پڑھ کر پترا دیکھنے اور کتھا بانچنے کے سوائے اور کیا آتا ہے؟ راج کاج کیا پتّی پوتھی بانچنے والے لوگ کریں گے؟

ایک شدکا۔ ہمیں راج کاج نہ چاہیے۔ ہم اپنی کھیتی باری ہی میں مگن ہیں۔ کسی کے غلام تو نہیں۔

دوسری شدکا۔ جو وِدیا گھمنڈی بنا دے۔ اس سے مورکھ ہی اچھا۔ یہ نئی وِدیا پڑھ کر تو لگ سوٹ بوٹ، گھڑی چھڑی، ہیٹ کیٹ، لگانے لگتے ہیں اور اپنے شوق کے پیچھے دیش کا دھن وِدیشیوں کے جیب میں بھرتے ہیں۔ یہ دیش کے دروہی ہیں۔

بھگت۔ گانجا شراب کی طرف آج کل لوگوں کی کڑی نگاہ ہے۔ نشہ بُری لت ہے۔ اسے سب جانتے ہیں۔ سرکار کو نشے کی دکانوں سے کروڑوں روپے سال کی آمدنی ہوتی

ہے۔ اگر دکانوں میں نہ جانے سے لوگوں کی نشے کی لت چھوٹ جائے تو بڑی اچھی بات ہے۔ وہ دکان پر نہ جائے گا۔ تو چوری چھپے کسی نہ کسی طرح دُگنے چوگنے دام دے کر سزا کاٹنے پر تیار ہوکر اپنی لت پوری کرے گا۔ تو ایسا کام کیوں کرو کہ سرکار کا نقصان الگ ہو اور غریب رعیت کا نقصان الگ ہو۔ اور پھر کسی کسی کو نشہ کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ میں ہی ایک دن افیم نہ کھاؤں گانٹھوں میں درد ہونے لگے۔ دم اُکھڑ جائے اور سردی پکڑ لے۔

ایک آواز۔ شراب پینے سے بدن کی پھرتی آجاتی ہے۔

ایک شنکا۔ سرکار اُدھرم سے روپے کماتی ہے۔ اُسے یہ اُچت نہیں۔ اُدھرمی کے راج میں رہ کر پرجا کا کلیان کیسے ہوسکتا ہے؟

دوسری شنکا۔ پہلے دارو پلا کر پاگل بنا دیا۔ لت پڑی تو پیسے کی چاٹ ہوئی۔ اتنی مجوری کس کو ملتی ہے کہ روٹی کپڑا بھی چلے اور دارو شراب بھی اُڑے؟ یا تو بال بچوں کو بھوکا مارو یا چوری کرو۔ جوا کھیلو اور بے ایمانی کرو۔ شراب کی دکان کیا ہے ہماری غلامی کا اڈّہ ہے۔

(۴)

چودھری کے اُپدیش سننے کے لیے جنتا ٹوٹتی تھی۔ لوگوں کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملتی۔ دنوں دنوں چودھری کا مان بڑھنے لگا۔ ان کے یہاں نتے (ہر روز) پنچایتوں کی راشٹر اُنتّی کی چرچا رہتی۔ جنتا کو ان باتوں میں بڑا آنند اور اُتساہ ہوتا۔ ان کے راج نیتک گیان کی وِردھی (اضافہ) ہوتی۔ وہ اپنا گورو اور مہتو (فخر و اہمیت) سمجھنے لگے۔ انھیں اپنی ستا (اقتدار) کا انوبھو ہونے لگا۔ نِرنکشتا (بے لگامی) اور اَنیائے پر اب ان کی تیوریاں چڑھنے لگیں۔ انھیں سوتنترتا (آزادی) کا سواد ملا۔ گھر کی روٹی، گھر کا سوت، گھر کا کپڑا، گھر کا بھوجن، گھر کی عدالت، نہ پولیس کا بھئے، نہ عملہ کی خوشامد، سکھ اور شانتی سے جیون ویتیت (گزارنا) کرنے لگے۔ کتنوں ہی نے نشے بازی چھوڑ دی اور سدبھاوؤں (اخلاص) کی ایک لہر سی دوڑنے لگی۔

لیکن بھگت جی اتنی بھاگیہ شالی نہ تھے۔ جنتا کو دنوں دن ان کی اُپدیشوں سے اَروچی (غیر دلچسپی) ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ بہودھا (بہتوں) ان کے سروتاؤں میں پٹواری،

چوکیدار، مدرس، اور انھیں کرم چاریوں کے متروں کے اَترکت (علاوہ) اور کوئی نہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی بڑے حاکمُ بھی آنکلتے اور بھگت جی کا بڑا آدر ستکار (عزت و توقیر) کرتے۔ ذرا دیر کے لیے بھگت جی کے آنسو پونچھ جاتے لیکن چھن بھر کا سمّان آٹھوں پہر کے اپمان کی برابری کیسے کرتا! جدھر نکل جاتے اُدھر ہی انگلیاں اُٹھنے لگتیں۔ کوئی کہتا خوشامدی ٹٹو ہے۔ کوئی کہتا خفیہ پولیس کا بھیدی ہے۔ بھگت جی اپنی پرتیدوندی (مخالف) کی بڑائی اور اپنی لوک نِندا (لوگوں کی اہانت) پر دانت پیس پیس کر رہ جاتے تھے۔ جیون میں یہ پہلا ہی اَوسر (موقعہ) تھا کہ انھیں سب کے سامنے نیچا دیکھنا پڑا۔ چرکال (عرصوں سے) جس کل مریادہ کی رکشا کرتے آئے تھے اور جس پر اپنا سروس (سب کچھ) اَرپن کرچکے تھے وہ دھول میں مل گئی۔ یہ داہ مَے چِنتا (پُرحسد فکر) انھیں ایک چھن کے لیے چین نہ لینے دیتی۔ نِت سَمسیّا سامنے رہتی کہ اپنا کھویا ہوا سمّان کیوں کر پاؤں۔ اپنے پَرتی پکشی کو کیوں کر پددَلت (پامال) کروں۔ کیسے اس کا غرور توڑوں؟

اَنت میں انھوں نے سنگھ کو اس کی ماند میں پچھاڑنے کا نِشچے کیا۔

(۵)

سندھیا کا سَمے تھا۔ چودھری کے دُوار پر ایک بڑی سبھا ہو رہی تھی۔ آس پاس کے گاؤں کے کسان بھی آگئے۔ ہزاروں آدمیوں کی بھیڑ تھی۔ چودھری انھیں سوراجیہ وِشیک (کے متعلق) اُپدیش دے رہے تھے۔ بار بار بھارت ماتا کی جے جے کار کی دھونی اُٹھتی تھی۔ ایک طرف اِستریوں کا جماؤ تھا۔ چودھری نے اپنے اُپدیش سَماپت کیا اور اپنی جگہ پر بیٹھے۔ سوَیم سِوکوں (رضاکاروں) نے سوراجیہ فنڈ کے لیے چندا جمع کرنا شروع کیا کہ اتنے میں بھگت جی نے جانے کدھر سے لپکے ہوئے آئے اور سُروتاؤں (سامعین) کے سامنے کھڑے ہوکر اُچّ سوَر (اونچی آواز) میں بولے:

”بھائیو! مجھے دیکھ کر اَچرج مت کرو۔ میں سوراجیہ کا وِرودھی نہیں ہوں۔ ایسا پَتِت (رذیل) کون پَرانی (انسان) ہوگا جو سوراجیہ کا نِندک ہو۔ لیکن اس کے پَراپت کرنے کا وہ اُپائے نہیں ہے جو چودھری نے بتایا ہے اور جس پر تم لوگ لٹو ہو رہے ہو۔ جب آپس میں پھوٹ اور رار ہے۔ پنچایتوں سے کیا ہوگا؟ جب وِلاشتا (عیش) کا بھوت سر پر سوار ہو تو نشہ کیسے چُھٹے گا۔ مدیرا کی دکانوں کا بہشکار (بائیکاٹ) کیسے ہوگا؟ سگریٹ، صابن، موزے،

بنیان، اڈھی، تن زیب سے کیسے پنڈ چھٹے گا؟ جب رعب اور حکومت کی لالسا بنی ہوئی ہو تو سرکاری مدرسے کیسے چھوڑیں گے۔ وِدھرمی شِکشا کی بیڑی سے کیسے مُکت (آزاد) ہوسکو گے؟ سوراجیہ لینے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ آتم سَنیم (نفس کشی) ہے یہی مہا اوشدھی (اہم دوا) تمھارے سَمست روگوں کو سمول نشٹ (پوری طرح سے ختم کرنا) کرے گی۔ آتما کو بلوان بناؤ۔ اِندریوں کو سادھو۔ من کو وَش (قابو) میں کرو۔ تم میں ماتر بھاؤ پیدا ہوگا۔ تبھی وِمتبھے (اختلاف) مٹے گا۔ تبھی اِرشا اور دویش کا ناش ہوگا۔ تبھی بھوگ وِلاش سے مَن ہٹے گا۔ تبھی نشے بازی کا دَمن ہوگا۔ آتم بَل کے بنا سوراجیہ کبھی اُپلبھد (حاصل) نہ ہوگا۔ سویم سیوا سب پاپوں کا جڑ ہے۔ یہی تمھیں عدالتوں میں لے جاتا ہے۔ یہی تمھیں وِدھرمی شِکشا کا داس بنائے ہوئے ہے۔ اس پِشاچ کو آتم بل سے مارو اور تمھاری کامنا پوری ہوجائے گی۔ سب جانتے ہیں۔ میں چالیس سال سے افیون کا سیون کرتا ہوں۔ آج سے مَیں افیون کو گئو کا رَکت (گائے کا خون) سمجھتا ہوں۔ چودھری سے میری تین پیڑھیوں کی عداوت ہے۔ آج سے چودھری میرے بھائی ہیں۔ آج سے مجھے یا میرے گھر کے کسی پُرانی (آدمی) کو گھر کے کَتے سوت سے بُنے ہوئے کپڑے کے سوائے کچھ اور پہنتے دیکھو تو مجھے جو دنڈ چاہو دو۔ بس مجھے یہی کہنا ہے۔ پرماتما ہم سب کی اِچھا پوری کرے۔

یہ کہہ کر بھگت جی گھر کی طرف چلے کہ چودھری دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گئے۔ تین پشتوں کی عداوت ایک چھن میں شانت ہوگئی۔

اس دن سے چودھری اور بھگت ساتھ ساتھ سوراجیہ کا اُپدیش کرنے لگے۔ ان میں گاڑھی مِترتا ہوگئی اور یہ نِشچے کرنا کٹھن تھا کہ دونوں میں جنتا کس کا اَدھیک سمّان کرتی ہے۔

پُرتی وِوندِتا (مخالفت) وہ چنگاری تھی جس نے دونوں پُرشوں کے ہردَیے دیپک کو پرکاشِت (روشن) کر دیا تھا۔

یہ افسانہ پہلی بار جولائی 1921 میں ہندی رسالہ 'پربھا' میں شائع ہوا۔ اردو کے کسی مجموعے میں نہیں ہے۔ ہندی میں 'مان سرودر 6 میں درج ہے۔ رسم الخط بدل کر اردو میں شائع کیا جا رہا ہے۔

تحریکِ خیر

پٹنہ میں بیرا نام کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں ایک ضعیف، بیکس، خستہ حال، گونڈن رہتی تھی، بُھنگی نام تھا۔ اُس کے نہ کوئی اولاد تھی، نہ گھر نہ دوار، نہ جگہ نہ زمین، زندگی کا سہارا صرف ایک بھاڑ تھا۔ گاؤں کے لوگ عموماً ایک وقت چبینا یا ستّو پر بسر کرتے ہی ہیں۔ اس لیے بھنگی کے بھاڑ پر ہمیشہ ایک بھیڑ لگی رہتی تھی۔ جو کچھ بُھنائی میں ملتا اُسی کو پیس یا بُھون کر کھا لیتی اور وہیں بھاڑ کی جھونپڑی کے ایک گوشے میں پڑ رہتی۔ وہ روز سویرے اُٹھتی اور چاروں طرف سے بھاڑ جھونکنے کے لیے سوکھی پتّیاں بٹور لاتی۔ بھاڑ کے پاس ہی پتّیوں کا ایک انبار لگا رہتا تھا۔ دوپہر کے بعد اس کا بھاڑ گرم کیا جاتا تھا۔ لیکن جب "ایکادشی" یا "پُورنماشی" کے دن رواج کے مطابق بھاڑ نہ گرم ہوتا یا گاؤں کے زمیندار ٹھاکر بیر سنگھ کے دالے بھوننے پڑتے اُس دن اُسے بُھوکے ہی سو رہنا پڑتا تھا۔ کیونکہ ٹھاکر صاحب کا کام بیگار میں کرنا پڑتا تھا۔ اس بیگار کے علاوہ بُھنگی کو اُن کا پانی بھی بھرنا پڑتا تھا۔ وہ ان کے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس لیے اُنھیں اس قسم کی خدمت لینے کا پُورا حق تھا۔ اسے جبر نہیں کہا جاسکتا۔ جبر صرف اتنا تھا کہ یہ بیگار بالکل سوکھی ہوتی تھی۔ ٹھاکر صاحب کا خیال تھا کہ اگر مزدوری ہی دے کر کام کرایا تو پھر بیگار کیسی۔ کسان کو پورا اختیار ہے کہ وہ دن بھر بیلوں کو ہل میں جوتنے کے بعد شام کو بے آب و دانہ کھونٹے سے باندھ دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو یہ اُس کا رحم نہیں، محض اپنی غرض ہے ٹھاکر صاحب کو مزدوری دینے سے تو اصولاً انکار تھا۔ رہی غرض۔ اس کی کوئی فکر نہ تھی۔ کیونکہ ایک تو دن بھر بھوکے رہنے سے بڑھیا مر نہیں سکتی تھی، بوڑھے بلا کے سخت جان ہوتے ہیں، موت کی نگاہ بچا کر نکل بھاگنے میں مشاق، ورنہ بوڑھے ہوتے ہی کیوں، دوسرے اگر خدانخواستہ بڑھیا مر بھی جاتی تو اس کی جگہ گاؤں میں دوسرا گونڈ بہت آسانی سے بسایا جاسکتا تھا۔

(۴)

چیت کا مہینہ تھا اور سنکرانت کے قبل کا دن۔ آج بہار اور دوسرے مشرقی اضلاع میں نئے اناج کا ستو کھایا اور خیرات کیا جاتا ہے۔ گھروں میں چولھے نہیں جلتے۔ بُھنگی کے بھاڑ کا ہنگامہ خوب گرم تھا۔ بھاڑ کے سامنے ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ دَم مارنے کی فرصت نہ تھی۔ کبھی کبھی وہ گاہکوں کی عُجلت پر جھنجھلا پڑتی۔ کیا کروں، دو کے چار ہاتھ بنالوں۔ کھرا نہ بُھنے گا تو مجھی کو گالیا دوگے کہ اتنے میں ٹھاکر صاحب کے یہاں سے اناج کے دو بڑے بڑے ٹوکرے آپہنچے، اور حکم ہوا کہ ابھی بُھون دے۔ بُھنگی ٹوکرے دیکھ کر سہم اُٹھی۔ ابھی دوپہر تھا۔ پھر سُورج ڈوبنے سے پہلے اتنا اناج بُھونا دشوار تھا۔ گھڑی دوگھڑی اور مل جاتی تو ایک اٹھوارے کے کھانے بھر کو اناج مل جاتا۔ بھگوان سے اتنا بھی نہ دیکھا گیا۔ اِن "جم دوتوں" کو بھیج دیا۔ اب پہر رات تک مفت بھاڑ میں جلنا پڑے گا۔ اُس پر سینکڑوں چھدے۔ اناج گھٹ گیا۔ کھرا نہیں بُھونا۔ یا بہت کھرا کردیا۔ دیر لگا دی۔ مایوسانہ انداز سے دونوں ٹوکرے رکھوا لیے۔

چپراسی نے تند لہجے میں کہا۔ دیر نہ لگے۔ نہیں تو تم جانو گی۔

بُھنگی۔ یہیں بیٹھے رہو۔ جب سب دانہ بُھن جائے تو لے کر جانا۔ اگر کسی دوسرے کا اناج چھوؤں تو ہاتھ کاٹ لینا۔

چپراسی۔ ہمیں بیٹھنے کی مہلت نہیں ہے۔ لیکن تیسرے پہر تک دانہ بُھن جائے۔

چپراسی تو یہ تاکید کرکے رُخصت ہوا اور بُھنگی دانے بھوننے لگی۔ دوسرے گاہک تکرار کرنے لگے۔ ہم دو گھنٹہ سے کھڑے ہیں۔ ہمارا دانہ نہیں بُھونا۔ اب کل ستو کیسے بنے گا؟

بُھنگی نے چڑھ کر کہا۔ "میں کیا کروں۔ جمدار کا اناج نہ بُھونوں تو رہوں کہاں، تمھارے مُنہ نہیں تھا۔ چپراسی سے کیوں نہ کہا اتنا اناج تو تم اکیلے دیے جاتے ہو۔ ہمارا اناج کون بھونے گا؟

لاچار لوگوں نے اپنی اپنی چھبڑیاں اُٹھائیں اور چلتے ہوئے۔ بُھنگی فدائیانہ جوش کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھی۔ مگر من بھر سے زیادہ اناج بُھونا کوئی دل لگی تو تھی نہیں۔ اور پھر تھوڑی دیر میں بُھونا چھوڑکر بھاڑ بھی جھونکنا پڑتا تھا تاکہ تاؤ ٹھنڈا نہ

پڑجائے۔ تیسرا پہر ہوگیا اور ابھی آدھا اناج بھی نہ ختم ہوا۔ وہ ڈری کہ کہیں زمیندار کے آدمی آتے ہوں۔ آتے ہی گالیاں دینے لگیں۔ بھاڑ پھوڑنے لگیں اور تیزی سے ہاتھ چلانا شروع کیا۔ ایک نگاہ دروازے کی طرف تھی۔ دوسری ناند کی طرف یہاں تک کہ بالو ٹھنڈا ہوگیا اور دانہ سیوڑا نکلنے لگا۔ لوہے کا وزنی چمچہ چلاتے چلاتے دونوں ہاتھ شل ہوگئے۔ مُصیبت کا سامنا تھا۔ اپنی بیکسی پر رونے لگی۔ نہ جانے نارائن کہاں بُھول گئے ساری دُنیا مرتی ہے۔ مجھے موت بھی بُھول گئی۔ جس کی یہاں دُرگت ہے اُسے کوئی وہاں بھی نہیں پوچھتا۔ کون میرے آنسو پونچھتا ہے اپنا خون جلاتی ہوں تو کہیں دانہ میسر ہوتا ہے، لیکن جب دیکھو سر پر سوار۔ اسی لیے نہ کہ ان کے گاؤں میں رہتی ہوں۔ ان کی چار انگل دھرتی پر میرا نباہ ہو رہا ہے۔ ایسی کتنی زمین گاؤں میں پڑی ہوئی ہے۔ کتنے ہی بڑے بڑے گھر اُجڑے ہوئے ہیں۔ وہاں تو کیسر نہیں ہوتی۔ پھر مجھی پر آٹھوں پہر یہ دھونس کیوں رہتی ہے۔ کوئی ذرا سی بات ہوتی ہے تو یہی دھمکی ملتی ہے کہ بھاڑ کھود کر پھینک دوں گا۔ اُجاڑ دوں گا۔ میرے سر پر بھی کوئی ہوتا تو کیوں یہ دھکے سہنے پڑتے۔

وہ انھیں خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ زمیندار کے دونوں چپراسیوں نے آکر پوچھا، اناج بھُن گیا؟ بُھنگی نے بے خوف ہوکر کہا۔ بھُن تو رہا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو۔

چپراسی۔ سارا دن گزر گیا اور تجھ سے اتنا اناج نہ بُھونا گیا۔ اور تو یہ بُھون رہی ہے کہ اناج کا ستیا ناس کر رہی ہے۔ یہ تو بالکل سیوڑے ہیں۔ ان کا ستّو کیسے بنے گا۔ دیکھ تو آج ٹھاکر تیری کیا دُرگت کرتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اُسی رات کو بھاڑ کھود کر پھینک دیا گیا۔ اور حرماں نصیب، آفت زدہ بُڑھیا کا کوئی سہارا نہ رہا۔

(۳)

بُھنگی کی روٹیوں کے لالے پڑگئے۔ گاؤں والوں کو بھی بھاڑ کے بغیر تکلیف ہونے لگی۔ کتنے ہی گھروں میں تو دوپہر کو دانہ ہی نہ میسر ہوتا۔ لوگوں نے جاکر ٹھاکر صاحب سے سفارش کی کہ بُڑھیا کو بھاڑ جلانے کا حکم دے دیجیے لیکن ٹھاکر صاحب نے پروا نہ کی۔ بولے یہ شیطان کی خالہ ہے۔ نہ جانے کس گھمنڈ میں بھولی ہوئی ہے۔ بُھوکوں مرے گی تو سیدھی ہوجائے گی۔ میرا من بھر دانہ چوپٹ کرکے رکھ دیا۔ سمجھتی ہوگی ٹھاکر میرا کر کیا

لیں گے۔ یہ نہیں جانتی کہ ٹھاکر ہی کی بدولت چین کی بنسی بجاتی ہوں۔

ٹھاکر صاحب کی یہ مردانہ باتیں سُن کر لوگ لوٹ آئے۔

ایک اسامی نے کہا۔ اس مرے مُردے پر کیا تاؤ دکھاتے ہیں۔ کسی مرد سے ہاتھ ملاتے تو معلوم ہوتا۔

دوسرا بولا۔ ان کی ٹھکرائی غریبوں کو پینے ہی میں رہ گئی ہے۔ سرکاری پیادوں کو دیکھ کر تو کانپنے لگتے ہیں، مردوں کے مُنہ کیا آئیں گے۔ ہاں ہم لوگ ان کے گاؤں میں بسے ہیں جو چاہیں کریں۔

کئی دن تک تو بُھنگی جوں توں کر کے بسر کرتی رہی۔ سنکرانت کے دن اناج زیادہ مل گیا تھا۔ لیکن جب وہ اناج خرچ ہوگیا تو فاقے کرنے لگی۔ کئی آدمیوں نے سمجھایا تیرا اس گاؤں میں کیا رکھا ہے کیوں کسی دوسرے گاؤں میں نہیں چلی جاتی۔ ہم وہاں چل کر تیرا بھاڑ بنوا دیں گے۔ تیرے رہنے کو ایک جھونپڑی بھی اُٹھا دیں گے۔ آرام سے رہنا۔ سب زمیندار ایسے ہی تھوڑے ہیں۔ مگر بڑھیا نے یہ تجویز منظور نہ کی۔ اس گاؤں میں اس نے اپنی مصیبت کے پچاس برس کاٹے تھے۔ یہاں کے ایک ایک پیڑ پتّے سے اُسے محبت ہوگئی تھی۔ یہاں وہ بچّے بچّے کو جانتی تھی۔ بچّہ بچّہ اُسے جانتا تھا سارا گاؤں اپنا گھر معلوم ہوتا تھا۔ زندگی کے سُکھ دُکھ سب اسی گاؤں میں جھیلے تھے۔ اب آخری وقت میں اس سے کیونکر ناتا توڑے۔ اس خیال ہی سے اُسے قلق ہوتا تھا۔ دوسرے گاؤں کے سُکھ سے یہاں کا دُکھ بھی پیارا تھا۔

اس طرح ایک پورا مہینہ گزر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ ٹھاکر بیر سنگھ اپنے دو تین چپراسیوں کو لیے لگان وصول کرنے جارہے تھے۔ کارندوں پر اُنھیں اعتبار نہ تھا۔ نذر نذرانے میں، حق دستور میں، وہ کسی غیر کو شریک نہ کرنا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی کہا کرتے زمینداری میں کیا رکھا ہے۔ سرکاری مطالبہ اور عدالت کے خرچ نکال کر سینکڑے میں دس روپے بھی نہیں بچتے۔ اب تو جو کچھ ہے وہ یہی اوپری رقم ہے۔ اسی پر یہ سارا ٹھاٹ بنا ہوا ہے۔ غرور کی نگاہوں سے اِدھر اُدھر تاکتے۔ اسامیوں کے سلاموں کا تبسم سے جواب دیتے چلے جاتے تھے۔ کتنا رُعب تھا، کتنی تعظیم، عورتیں انھیں دیکھتے ہی جھٹ گھونگھٹ بڑھا کر مُنہ پھیر لیتی تھیں۔ دروازوں پر بیٹھے ہوئے لوگ گھبرا کر کھڑے ہوجاتے تھے کوئی

اپنی پگڑی سنبھالنے لگتا۔ کوئی اپنا ناریل آڑ میں رکھ آتا تھا۔ اس شان سے گاؤں کا چکر لگاتے ہوئے وہ بُھنگی کی بھاڑ کی طرف گزرے۔ اُدھر تاکنا تھا کہ بدن میں آگ لگ گئی۔ بھاڑ کی ازسرِ نو تعمیر ہو رہی تھی۔ بڑھیا مٹی کے لوندے اُٹھا اُٹھاکر بڑی تیزی سے رکھ رہی تھی۔ شاید اُس نے کچھ رات رہتے ہی کام میں ہاتھ لگا دیا تھا اور طلوعِ سحر سے پہلے ہی اُسے ختم کر دینا چاہتی تھی۔ آج دیوی کی پوجا تھی۔ رواج کے مطابق اُن کی چبوترے پر گاؤں کی کنواری لڑکیوں کو ستو کھلایا جانے والا تھا۔ بڑھیا نے اس تقریب کے لیے ہمیشہ اپنے بھاڑ میں دانہ بھونا تھا۔ اس کی مزدوری وہ کچھ نہ لیتی تھی۔ اگر آج بھاڑ نہ تیار ہوگیا تو دانہ کون بُھونے گا؟ کسی دوسرے گاؤں سے دانہ بھُن کر لایا گیا تو کہیں دیوی جی ناراض نہ ہو جائیں۔ نہ جانے گاؤں پر کیا آفت آئے۔ ٹھاکر بگڑیں گے۔ کوئی پروا نہیں۔ دیوی تو خوش ہوں گی۔ ٹھاکر بگڑیں گے تو بہت کریں گے میرا بھاڑ پھر کھدوا دیں گے۔ دیوی بگڑے گی تو گاؤں کی خیرت نہیں۔ اور پھر ٹھاکر صاحب بھی تو دیوی کے بھگت ہیں۔ وہ ایسی جرأت کیسے کریں گے؟ دیوی سے تو راجا بھی ڈرتا ہے۔ ٹھاکر کی کون گنتی۔ ان خیالوں نے بڑھیا کو بھاڑ کی مرمت پر آمادہ کیا تھا۔ وہ اپنے کام میں ایسی محو تھی کہ ٹھاکر صاحب کے آنے کی بھی اُسے خبر نہ ہوئی۔ دفعتاً اس کے کان میں آواز آئی۔ کس کے حکم سے؟

بُھنگی نے چونک کر سر اُٹھایا تو ٹھاکر صاحب کھڑے تھے۔ کچھ جواب نہ دے سکی۔

ٹھاکر صاحب نے پھر وہی سوال کیا۔ کس کے حکم سے؟

بُھنگی نے دلیرانہ انداز سے جواب دیا۔ دیوی جی کے حکم سے۔

ٹھاکر۔ اس گاؤں کا مالک میں ہوں۔ دیوی نہیں۔

بُھنگی نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ٹھاکر ایسی بات مُنہ سے نہ نکالو۔ دیوی سنسار کی مالک ہیں ہم تم کِس گنتی میں ہیں؟

ٹھاکر۔ (چپراسیوں سے) کیسی چگھڑ بڑھیا ہے۔ دیوی کا خوف دلاکر مجھے نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ گرا دو اس کے بھاڑ کو۔

چپراسیوں میں کسی کو اس حکم کی تعمیل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ٹھاکر صاحب کا غصہ اور بھی تیز ہوا۔ چپراسیوں کو نمک حرام اور ڈرپوک کہتے ہوئے گھوڑے سے اُتر پڑے اور بھاڑ میں زور سے ایک ٹھوکر ماری۔ مٹی گیلی تھی۔ سب کچھ لیے دیے بیٹھ گئی۔ دوسری

ٹھوکر ناند پر چلائی لیکن بڑھیا سامنے آگئی۔ ٹھوکر اس کی کمر پر پڑی۔ اوندھے مُنہ گر پڑی۔ آنکھوں کے سامنے تتلیاں اُڑنے لگیں۔ اب اسے غصہّ آیا۔ کمر سہلاتی ہوئی بولی۔ ٹھاکر۔ تمھیں آدمی کا ڈر نہیں ہے تو دیوی دیوتا کا ڈر تو ہونا چاہیے۔ مجھے اس طرح اُجاڑ کر کیا پاؤ گے؟ کیا اس چار انگل دھرتی میں سونا نکل آئے گا۔ میں تمھارے ہی بھلے کو کہتی ہوں۔ گریب کی ہائے بُری ہوتی ہے۔ میرا دل مت دُکھاؤ۔

ٹھاکر۔ اب تو یہاں پر بھاڑ نہ بنائے گی؟

بُھنگی۔ بھاڑ نہ بناؤں گی تو کھاؤں گی کیا؟

ٹھاکر۔ تیرے پیٹ کا ہم نے ٹھیکہ لیا ہے؟ گاؤں چھوڑکر نکل جا۔

بھنگی۔ کیوں نکل جاؤں؟ بارہ سال کھیت جوتنے سے آسامی کاشتکار ہوجاتی ہے۔ میں تو اسی جھونپڑی میں بوڑھی ہوگئی۔ میرے ساس سسر اور اُن کے باپ دادے اسی جھونپڑی میں رہے۔ اب جم راج کو چھوڑکر مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔

ٹھاکر۔ اچھا تو اب تو قانون بھی بگھارنے لگی۔ ہاتھ پیر جوڑتی تو چاہے رہنے بھی دیتا۔ لیکن اب تجھے نکال کر ہی دم لوں گا۔ (چپراسیوں سے) ابھی جاکر اس کے پتوں کی ڈھیری میں آگ لگا دو دیکھیں اب کیسے بھاڑ جلاتی ہے۔

بھنگی نے کہا۔ آج دیوی کی پوجا ہے۔ بھاڑ جلانے دو۔ کل جو جی میں آئے کرنا۔

ٹھاکر۔ تیرا ہی ایک بھاڑ نہیں ہے۔ دوسرے گاؤں میں بھی بھاڑ گرم ہوتے ہیں۔

(۴)

ایک لمحے میں شعلے اُٹھنے لگے۔ اُن کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرنے لگیں لپٹیں کسی دیوانے کی طرح اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں۔ سارے گاؤں کے لوگ اُس کوہِ آتشیں کے چاروں طرف جمع ہوگئے۔ بُھنگی اپنے بھاڑ کے پاس غم ناک بیٹھی ہوئی یہ دل سوز نظارہ دیکھتی رہی۔ اس کے دل میں نہ جانے کیا کیا خیالات آرہے تھے۔ مجھ پر اتنا غصہّ! اسی ابھاگے پیٹ کے لیے اتنی مصیبت۔ دھتکار ہے ایسی جندگانی پر، کون کوئی میرے آگے پیچھے بیٹھا ہوا ہے کہ یہ سب اندھیر سہ کر بھی جیتی رہوں۔ اب سہارا ہی کیا ہے۔ بھاڑ ہی ٹوٹ گیا۔ پتیاں جل ہی گئیں۔ کیا بھیک مانگ کر پیٹ پالوں۔ اتنی عُمر بیت گئی۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اب کے دن کے لیے یہ دھکّے سہوں یہ سوچتے سوچتے بڑھیا رونے لگی۔

ناکامی اور یاس کا غلبہ اور بھی زیادہ ہوا۔ سر پر ایک جنون سا سوار ہوگیا۔ وہ تیزی سے اُٹھی اور دھکتے ہوئے شعلوں میں گھُس گئی۔ لوگ چاروں طرف سے دوڑے لیکن کسی کو ہمت نہ پڑی کہ آگ کے مُنہ میں جائے۔ ٹھاکر صاحب گھوڑے پر سوار یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جوں ہی بڑھیا شعلوں میں گھُسی وہ بجلی کی طرح گھوڑے سے کودے اور دم زدن میں ہوا کی طرح شعلوں کے اندر داخل ہوگئے۔ ساری خلقت دم بخود، ہراس اور وحشت کے عالم میں کھڑی تھی۔ ایک لمحہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ٹھاکر صاحب بُھنگی کو گود میں لیے آگ سے باہر نکلے۔ اُن کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔ بُھنگی کے کپڑے بھی جل رہے تھے۔ وہ بے ہوش تھی۔ لوگوں نے اپنے کمل اُتار اُتار کر اُنھیں اوڑھا دیے۔ بھنگی کی جان کی کسی کو پروا نہ تھی۔ سب کے سب ٹھاکر صاحب کی جان کی خیر منا رہے تھے۔ خیریت یہ تھی کہ اُنھیں آگ سے کوئی گزند نہ پہنچا تھا۔ صرف کہیں کہیں جلد پر آنچ آگئی تھی۔ مگر بڑھیا کا سارا جسم جھلس گیا تھا۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ شعلے ابھی تک دہک رہے تھے اور ٹھاکر صاحب بڑھیا کو گود میں لیے اُس کی جلن کو اپنے آنسوؤں سے ٹھنڈا کر رہے تھے۔ ان کے گھر کی عورتیں بھی آگئی تھیں۔ کوئی بڑھیا کو پنکھا جھلتی تھی۔ کوئی اس کے جسم پر مسکے کا لیپ کر رہی تھی۔ اور لوگ بھی اپنے اپنے دیہاتی لٹکے کام میں لا رہے تھے۔

دفعتاً ٹھاکر صاحب نے کہا۔ "کسی کو شہر بھیج دو ابھی ڈاکٹر کو بُلا لائے۔"

ٹھکرائن نے کہا۔ انھیں دیہاتی لٹکوں سے اچھی ہوجائے گی۔ ڈاکٹر بُلا کر کیا ہوگا؟

ٹھاکر۔ اگر وہ مر گئی تو میں زہر کھالوں گا۔

ٹھکرائن۔ اب وہ نہ مرے گی۔

ٹھاکر۔ (جوش سے) ہاں اگر میرے امکان میں ہے تو اب وہ اس صدمے سے نہ مرے گی اپنی موت سے مرے گی۔

(۵)

ٹھاکر بیر سنگھ اپنے علاقے میں بہت نیک نام نہ تھے۔ اس واقعے نے اُنھیں منظورِ خاص و عام بنا دیا۔ اسامیوں نے بالعموم ان کی جانبازی کی تعریف کی۔ مگر زمینداروں نے اسے فوری جنون سمجھا۔ ایک بڑھیا کے لیے آگ میں کودنا فضول تھا۔ اُس کے مرجانے سے

کون سنسار سونا ہوا جاتا تھا۔ کوئی اس کے نام کو رونے والا بھی تو نہ تھا۔ ہاں آپ مرجاتے تو البتہ خاندان بے چراغ ہوجاتا۔

ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ بُھنگی ٹھاکر صاحب کے مکان میں لیٹی ہوئی تھی۔ بیر سنگھ اس کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتاً بُھنگی نے کہا۔ بھیّا اب تو میں اچھی ہوگئی۔ مجھے اپنا بھاڑ کیوں نہیں جھونکنے دیتے۔ یہاں کب تک پڑی رہوں گی۔ بہت دن تو ہوگئے۔

بیر سنگھ نے کہا ''بھنا جی روب گیا۔ کوئی تکلیف ہے؟

بُھنگی۔ ہاں بھیّا جی کیوں نہ روبے گا۔ دودھ اور حلوا کھانے اور آٹھوں پہر پان کی طرح پھیرے جانے سے کس کا جی نہ روبے گا۔ اس سے بڑھ کر اور کون تکلیپھ ہوگی! کیوں بھیّا۔ جب تم میرے پیچھے آگ میں گھُسے تمھیں ڈر نہ لگا۔ یہ بھی نہ سمجھا کہ ایک بڑھیا کے لیے کیوں اپنی جان جوکھم میں ڈالوں۔ میں بہت سوچا کرتی ہوں کہ اُس گھڑی تمھارے من میں کیا بات آئی۔

ٹھاکر۔ میں نے کچھ نہ سوچا سمجھا۔ مجھے تو جیسے ایک نشہ سا آگیا۔ میں آپے میں نہ تھا۔ خود بخود میرے پیر آگ کی طرف دوڑے۔ مجھے ذرا بھی خیال نہ تھا کہ کیا کرتا ہوں، کہاں جاتا ہوں، کیوں جاتا ہوں۔ کچھ بھی ہوش حواس نہ تھا۔ سب کچھ آپ ہی آپ ہوگیا۔ ایشور کو مجھے کلنک سے بچانا منظور تھا۔ اور کیا۔

یہ افسانہ پہلی بار روزنامہ 'آج' بنارس جولائی 1921 میں شائع ہوا۔ ہندی میں مان سرودر8 میں وڑھنس کے نام سے شامل ہے۔ ہمایوں کے اپریل1922 کے شمارے میں شائع ہوئی۔ اردو کے کسی مجموعے میں نہیں ہے۔

آدرش ورودھ

مہاشے دیا کرشن مہتا کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے ان کی وہ آکانکشا پوری ہوگئی تھی جو ان کے جیون کا مدھر سوپن تھا۔ انھیں وہ راجیہ ادھکار مل گیا تھا جو بھارت نواسیوں کے لیے جیون سورگ ہے۔ وائس رائے نے انھیں اپنی کاریہ کارنی سبھا کا ممبر نیکت کرلیا تھا۔

مترگن انھیں بدھائیاں دے رہے تھے۔ چاروں اُور آنند وتسو منایا جارہا تھا۔ کہیں دعوتیں ہوتی تھیں۔ کہیں آشواسن پتر (یقین دہانی) دیے جاتے تھے۔ وہ ان کا ویکتی گت سمّان (ذاتی عزت) نہیں، راشٹریہ سمّان سمجھا جاتا تھا۔ انگریز ادھکاری ورگ بھی انھیں ہاتھوں ہاتھ لیے پھرتا تھا۔

مہاشیہ دیاکرشن لکھنؤ کے ایک سُوِکھیات (معروف) بیرسٹر تھے۔ بڑے اُدار ہردے، راج نیتی میں کُشل تتھا پرجابھکت تھے۔ سدیو ساروجنک کاریوں (رفاہِ عام کے کاموں) میں تلّین (لگے) رہتے تھے۔ سمست دیش میں شاسن کا ایسا نربھے تتوانویشی (بے خوف حقیقت کا متلاشی)، ایسا نِسپرہ (بے نفس) سما لوچک (ناقد) نہ تھا اور نہ پرجا کا ایسا سوکچھم درشی (باریک بیں)، ایسا وشوسنیہ (قابلِ بھروسہ) اور ایسا سہردے بندھو۔

سماچار پتروں میں اِس نیکتی (مامور کرنے) پر خوب ٹیکائیں ہو رہی تھیں۔ ایک اُور سے آواز آرہی تھی ہم گورنمنٹ کو اس چناؤ پر بدھائی نہیں دے سکتے۔ دوسری اُور کے لوگ کہہ رہے تھے، یہ سرکاری اُدارتا اور پرجاہت جنتا کا سروتّم پرمان ہے۔ تیسرا دَل بھی تھا، جو دبی زبان سے کہتا تھا کہ راشٹر کا ایک اور استمبھ (ستون) گر گیا۔

سندھیا کا سمے تھا۔ کیسرباغ میں لبرل لوگوں کی اُور سے مہاشے مہتا کو پارٹی دی گئی۔ پرانت بھر کے وششٹھ پروش (خاص لوگ) ایکتر (جمع) تھے۔ بھوجن کے پشچات سبھا پتی نے اپنی وکترتا (تقریر) میں کہا۔ ہمیں پورا وشواس ہے کہ آپ کا ادھکار پرویش

پرجا کے لیے ہِت کر ہوگا، اور آپ کے پریتنوں (کوششوں) سے ان دھاراؤں میں سنشودھن (ترمیم) ہوجائے گا، جو ہمارے راشٹر کے جیون میں بادھک ہیں۔

مہاشے مہتا نے اُتر دیتے ہوئے کہا۔ راشٹر کے قانون ورتمان پرستھتیوں کے ادھین ہوتے ہیں۔ جب تک پرستھتیوں میں پریورتن نہ ہو، قانون میں سُویوستھا کی آشا کرنا بھرم ہے۔

سبھا وِسرجت ہوگئی۔ ایک دَل نے کہا۔ کتنا نیائے نِیکت (انصاف پسند) اور پرشنسنیہ (قابلِ تعریف) راج نیتک وِدھان ہے۔ دوسرا پکش بولا۔ آگئے جال میں۔ تیسرے دَل نے نیراشیہ پورن بھاو (نااُمیدی کے احساس) سے سر ہلا دیا پر مُنہ سے کچھ نہ کہا۔

(۲)

مسٹر دیا کرشن کو دلی آئے ہوئے ایک مہینہ ہوگیا۔ پھاگن کا مہینہ تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ وہ اپنے اڈھان (محل) میں حوض کے کنارے مخملی آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ مسز راجیشوری مہتا سامنے بیٹھی پیانوں بجانا سیکھ رہی تھیں۔ اور مِس منورما حوض کی مچھلیوں کو بسکٹ کے ٹکڑے کھلا رہی تھیں۔ سہسا اس کے پتا نے پوچھا۔ یہ ابھی کون صاحب آئے تھے۔

مہتا۔ کونسِل کے سِینئر ممبر ہیں۔

منورما۔ وائس رائے کے نیچے یہی ہوں گے؟

مہتا۔ وائس رائے کے نیچے تو سبھی ہیں۔ وَیتن بھی سب کا برابر ہے۔ لیکن ان کی یوگیتا کو کوئی نہیں پہنچتا۔ کیوں راجیشوری۔ تم نے دیکھا، انگریز لوگ کتنے سجّن اور وِنے شیل ہوتے ہیں۔

راجیشوری۔ میں تو انھیں وِنے کی مورتی کہتی ہوں۔ اس گُن میں بھی یہ ہم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کی پتنی مجھ سے کتنے پریم سے گلے ملیں۔

منورما۔ میرا تو جی چاہتا تھا، ان کے پیروں پر گر پڑوں۔

مہتا۔ میں نے ایسے اُدار، ششٹھ، نشکپٹ اور گُن گراہی (خاصیتوں والے) مُنشیہ نہیں دیکھے۔ ہمارا دَیا دھرم کہنے ہی کو ہے۔ مجھے اس کا بہت دُکھ ہے کہ اب تک کیوں ان سے بدگمان رہا۔ سامانیتہ (عام طور سے) ان سے ہم لوگوں کو جو شکایتیں ہیں ان کا کارن

پارسپرک سمّلن (آپسی ملاقات) کا نہ ہونا ہے۔ ایک دوسرے کے سوبھاو اور پرکرتی سے پرچت نہیں۔

راجیشوری۔ ایک یونین کلب کے بڑی آوشیکتا ہے جہاں دونوں جاتیوں کے لوگ سہواس کا آنند اُٹھاویں۔ متھیا، دویش بھاو کے مٹانے کا ایک ماتر یہی اُپائے ہے۔

مہتا۔ میرا بھی یہی وچار ہے (گھڑی دیکھ کر) ۷ بج رہے ہیں، وِیوسائے منڈل کے جلسہ کا سمے آگیا۔ بھارت نواسیوں کی وِچتر دشا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی ممبر کونسل میں آتے ہی ہندوستان کے سوامی ہوجاتے ہیں۔ اور جو چاہیں سوچھندتا (اپنی مرضی) سے کرسکتے ہیں۔ آشا کی جاتی ہے کہ وہ شاسن کی پرچلت نیتی (مستعمل حکمت عملی) کو پلٹ دیں، نیا آکاش اور نیا سوریہ بنا دیں۔ ان سیماؤں پر وچار نہیں کیا جاتا ہے جن کے اندر ممبروں کو کام کرنا پڑتا ہے۔

راجیشوری۔ اس میں ان کا دوش نہیں۔ سنسار کی یہ ریتی ہے کہ لوگ اپنوں سے سبھی پرکار کی آشا رکھتے ہیں۔ اب تو کونسل کے آدھے ممبر ہندوستانی ہیں۔ کیا ان کے رائے کا سرکار کی نیتی پر اثر نہیں ہوسکتا؟

مہتا۔ اوشیہ ہوسکتا ہے، اور ہو رہا ہے۔ کنتو اس نیتی میں پریورتن نہیں کیا جاسکتا۔ آدھے نہیں، اگر سارے ممبر ہندوستانی ہوں تو بھی وہ نئی نیتی کا اُدگھاٹن نہیں کرسکتے وہ کیسے بھول جاویں کہ کونسل میں ان کی اُپستھتی (موجودگی) کیول سرکار کی کرپا اور وشواس پر نربھر ہے۔ اس کے اترکت وہاں آکر انھیں آنترک اَوستھا کا انوبھو ہوتا ہے اور جنتا کی ادھیکانش شنکائیں اسنگت پرتیت ہونے لگتی ہیں۔ پد کے ساتھ اتّردائتو (فرائض) کا بھاری بوجھ بھی سر پر آپڑتا ہے۔ کسی نئی نیتی کی سرشٹی (بناتے ہوئے) کرتے ہوئے ان کے من میں یہ چِنتا اُٹھنی سوابھاوک (فطری) ہے کہ کہیں اس کا پھل آشا کے وردھ نہ ہو۔ یہاں وستتہ (عام طور سے) ان کی سوادھینتا نشٹ (آزادی صلب) ہوجاتی ہے۔ ان لوگوں سے ملتے ہوئے بھی جھجکتے ہیں جو پہلے ان کے سہکاری تھے، پر اب اپنے اچھر نکھل (غلط) وِچاروں کے کارن سرکار کی آنکھوں میں کھٹک رہے ہیں۔ اپنی وکترتاؤں میں نیائے اور ستیہ کی باتیں کرتے ہیں اور سرکار کی نیتی کو ہانی کر سمجھتے ہوئے بھی اس کا سمرتھن کرتے ہیں۔ جب اس کے پرتکول

وہ کچھ کرہی نہیں سکتے، تو اس کا وِرودھ کر کے اپمانت کیوں بنیں؟ اس اوستھا میں یہی سَرو وچِت (سب سے صحیح) ہے کہ شبداڈمبر (لفظی بازی گری) سے کام لے کر اپنی رکشا کی جائے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایسے سجّن، اُدار، نیتکیہ شُبھ چنتکوں کے وِرُدھ کچھ کہنا یا کرنا منشیتو اور سدویوہار کا گلا گھونٹنا ہے۔ یہ لو، موٹر آگئی۔ چلو وَیوسائے منڈل میں لوگ آگئے ہوں گے۔

یہ لوگ وہاں پہنچے تو کرتل دھونی ہونے لگی۔ سبھاپتی مہودیہ نے ایڈریس پڑھا جس کا نشکرش (خلاصہ) یہ تھا کہ سرکار کو ان شِلپ کلاؤں کی رکشا کرنی چاہیے جو انیہ ویشے پرتی دوندھتا کے کارن مٹّی جاتی ہیں۔ راشٹر کی ویاوسایک اُنّتی (کاروباری ترقی) کے لیے نئے نئے کارخانے کھولنے چاہئیں اور جب وہ سپھل ہوجاویں تو انھیں ویاوسایک سنستھاؤں کے حوالے کردینا چاہیے۔ ان کلاؤں کی آرتھک سہایتا کرنا بھی ان کا کرتویّہ ہے۔ جو ابھی شیش اوستھا میں ہیں۔ جس سے جنتا کا اُتساہ بڑھے۔

مہتا مہودیہ نے سبھاپتی کو دھنیہ واد دینے کے پشچات سرکار کے اودھیوگِک نیتی کی گھوشڑاں کرتے ہوئے کہا۔ آپ کے سدّھانت نردوش ہیں کنتو ان کو ویوہار میں لانا نتانت دُستر ہے۔ گورنمنٹ آپ کو سمّتی پردان کرسکتی ہے، لیکن ویاوسائک کاریوں میں اگرسر بننا جنتا کا کام ہے۔ آپ کو اسُمرن رکھنا چاہیے کہ ایشور بھی انھیں کی سہایتا کرتا ہے جو اپنی سہایتا آپ کرتے ہیں۔ آپ میں آتم وشواس، اوڈھوگک اتساہ کا بڑا آبھاو ہے۔ پگ پگ پر سرکار کے آگے ہاتھ پھیلانا اپنی ایوگیتا اور اکرمنیّتا کی سوچنا دینا ہے۔

دوسرے دن سماچار پتروں میں اس وکترتا پر ٹیکائیں ہونے لگیں۔ ایک دَل نے کہا۔ مسٹر مہتا کی اسپیچ نے سرکار کی نیتی کو بڑی اسپشٹتا (وضاحت) اور کشلتا (مہارت) سے نردھارت کردیا ہے۔

دوسرے دَل نے لکھا۔ ہم مسٹر مہتا کی اسپیچ پڑھ کر استنبھت (متعجب) ہوگئے۔ وَیوسائے منڈل نے وہی پتھ گرہن کیا جس کے پردرشک (رہنما) سُیم مسٹر مہتا تھے۔ انھوں نے اس لوکوکتی کو چرتارتھ (کرداری مثال) کردیا کہ 'نمک کی کھان میں جو کچھ جاتا ہے نمک ہوجاتا ہے۔

تیسرے دَل نے لکھا۔ ہم مہتا مہودیہ کے اس سدھانت سے پُورن سہمت ہیں کہ

ہمیں پگ پگ پر سرکار کے سامنے دین بھاو سے ہاتھ نہ پھیلانا چاہیے۔ یہ وکترتا ان لوگوں کی آنکھیں کھول دے گی جو کہتے ہیں کہ ہمیں یوگیتم پروشوں کو کونسل میں بھیجنا چاہیے۔ ویوسائے منڈل کے سدسیوں پر دَیا آتی ہے جو آتم وشواس کا اپدیش گرہن کرنے کے لیے کانپور سے دلّی گئے تھے۔

(۳)

چیت کا مہینہ تھا۔ شملہ آباد ہوچکا تھا۔ مہتا مہاشے اپنے پستکالیہ میں بیٹھے ہوئے کچھ پڑھ رہے تھے کہ راجیشوری نے آکر پوچھا۔ یہ کیسے پتر ہیں؟

مہتا۔ یہ آئے ویئے (آمد و خرچ) کا مسوّدہ ہے۔ آگامی سپتاہ (آئندہ ہفتے) میں کونسل میں پیش ہوگا۔ ان کی کئی مدیں ایسی ہیں جن پر مجھے شدکا تھی اور اب بھی ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر انومتی (اجازت) کیسے دوں۔ یہ دیکھو تین کروڑ روپے اُچّ کرمچاریوں کے ویتن ورڈھی (تنخواہ میں اضافے) کے لیے رکھے گئے ہیں۔ یہاں کرمچاریوں کا ویتن پہلے ہی سے بڑھا ہوا ہے۔ اس ورڈھی کی ضرورت ہی نہیں، پر بات زبان پر کیسے لاؤں؟ جنھیں اس سے لابھ ہوگا وہ سبھی مجھ سے ملنے والے ہیں۔ سینک ویئے (فوجی اخراجات) میں بیس کروڑ بڑھ گئے ہیں۔ جب ہماری سینائیں اتنے دیشوں میں بھیجی جاتی ہیں تو ودِت ہی ہے کہ ہماری آوشکتا سے اَدِھک ہیں، لیکن اس مد کا ورودھ کروں تو کونسل مجھ پر انگلیاں اُٹھانے لگے۔

راجیشوری۔ اس بھئے سے چپ رہ جانا تو اچت نہیں، پھر تمھارے یہاں آنے سے ہی کیا لابھ ہوا۔

مہتا۔ کہنا تو آسان ہے، پر کرنا کٹھن ہے۔ یہاں جو کچھ آدر سمّان ہے، سب ہاں حضور میں ہے۔ وائس رائے کی نگاہ ذرا ترچھی ہوجائے تو کوئی پاس نہ پھٹکے۔ نکّو بن جاؤں۔ یہ لو، راجا بھدر بہادر سنگھ جی آگئے۔

راجیشوری۔ شیو راجپور کوئی بڑی ریاست ہے۔

مہتا۔ ہاں پندرہ لاکھ وارشک سے کم آئے (آمدنی) نہ ہوگی اور پھر سوادھین راجیہ ہے۔

راجیشوری۔ راجا صاحب منورما کی اُور بہت آکرشِت (پرکشش) ہو رہے ہیں۔ منورما کو بھی ان سے پریم ہوتا جان پڑتا ہے۔

مہتا۔ یہ سمبندھ ہوجائے تو کیا پوچھنا۔ یہ میرا ادھکار ہے جو راجا صاحب کو ادھر کھینچ رہا ہے۔ لکھنؤ میں ایسے سو اوسر کہاں تھے؟ وہ دیکھو ارتھ سچیو (معاشی سکریٹری) مسٹر کاک آگئے۔

کاک۔ (مہتا سے ہاتھ ملاتے ہوئے) مسیز مہتا، میں آپ کے پہناوے پر آسکت ہوں۔ کھید ہے، ہماری لیڈیاں ساڑی نہیں پہنتیں۔

راجیشوری۔ میں تو اب گاون پہننا چاہتی ہوں۔

کاک۔ نہیں مسیز مہتا، خدا کے واسطے یہ انرتھ نہ کرنا۔ مسٹر مہتا، میں آپ کے واسطے ایک بڑی خوش خبری لایا ہوں۔ آپ کے سُبوگیہ پتر ابھی آرہے ہیں یا نہیں؟ مہاراج بھند انھیں اپنا پرائیوٹ سیکرٹری بنانا چاہتے ہیں۔ آپ انھیں آج ہی سُوچنا دے دیں۔

مہتا۔ میں آپ کا بہت انوگرہیت (احسامند) ہوں۔

کاک۔ تار دے دیجیے تو اچھا ہو۔ آپ نے کابل کی رپورٹ تو پڑھی ہوگی۔ ہز میجیسٹی امیر ہم سے سندھی کرنے کے لیے اُتسک نہیں جان پڑتے۔ وہ بولشیوکوں کی اور جھکے ہوئے ہیں۔ اوستھا چنتا جنک ہے۔

مہتا۔ میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔ گت شتابدی میں کابل کو بھارت پر اکرمن کرنے کا ساہس کبھی نہ ہوا۔ بھارت ہی اگرسر ہوا۔ ہاں وہ لوگ اپنی رکشا کرنے میں کشل ہیں۔

کاک۔ لیکن چھما کیجیے گا، آپ بھول جاتے ہیں کہ ایران، افغانستان اور بولشیوک میں سندھی ہوگئی ہے۔ کیا ہماری سیما پر اتنے شتروؤں کا جمع ہوجانا چنتا کی بات نہیں؟ ان سے سترک (ہوش) رہنا ہمارا کرتویہ ہے۔

اتنے میں لنچ (جلپان) کا سمے آیا۔ لوگ میز پر جا بیٹھے۔ اس سمے گھڑدوڑ اور ناٹیہ شالا کی چرچا ہی رُچکر پرتیت ہوئی۔

(۴)

مہتا مہودیہ نے بجٹ پر جو وچار پرکٹ کیے ان سے سمست دیش میں ہل چل مچ گئی۔ ایک دل ان وچاروں کو دیووانی سمجھتا تھا، دوسرا دل بھی کچھ انشوں کو چھوڑ کر شیش وچاروں سے سہمت تھا۔ کنتو تیسرا دل وکترتا (بیان) کے ایک ایک شبد پر نراشا سے سر دھنتا اور

بھارت کی اَدھوگتی پر روتا تھا۔ اسے وشواس ہی نہ آتا تھا کہ یہ شبد مہتا کی زبان سے نکلے ہوں گے۔

مجھے آشچریہ ہے کہ غیرسرکاری سدسیوں نے اسک سوَر سے پرستاوت وییے (مجوزہ خرچ) کے اُس بھاگ کا ورودھ کیا ہے، جس پر دیش کی رکشا، شانتی، سُدشا اور اُنّتی اَولمبت ہے۔ آپ شکشا سمبندھی سدھاروں کو، آروگیہ ودھان کو، نہروں کی ورڈھی کو ادھک مہتوپورْ سمجھتے ہیں۔ آپ کو الپ ویتن والے کرمچاریوں کا زیادہ دھیان ہے۔ مجھے آپ لوگوں کے راجنیتک گیان پر اس سے اَدھک وشواس تھا۔ شاسن کا پردھان کرتویہ بھیتر اور باہر کی اَشانتی کاری شکتیوں سے دیش کو بچانا ہے۔ شکشا اور چکتسا اُدھوگ اور وَیوسائے گونڑ کرتویّہ ہیں۔ ہم اپنی سمست پرجا کو اگیان ساگر میں نمگن دیکھ سکتے ہیں۔ سمست دیش کو پلیگ اور ملیریا میں گرست رکھ سکتے ہیں، الپ ویتن والے کرمچاریوں کو دارون چنتا کا آہار بنا سکتے ہیں، کرشکوں کو پرکرتی کی انشچت دشا پر چھوڑ سکتے ہیں، کنتو اپنی سیما پر کسی شترو کو کھڑا نہیں دیکھ سکتے۔ اگر ہماری آے سمپورنڑ تا دیش رکشا پر سَرپت ہوجائے، تو بھی ہم کو آپتّی نہ ہونی چاہیے۔ آپ کہیں گے اِس سے کسی آکرمن کی سمبھاونا نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں سنسار میں اسمبھو کا راجیہ ہے۔ ہوا میں ریل چل سکتی ہے، پانی میں آگ لگ سکتی ہے۔ ورکشوں میں وارتا لاپ (بات چیت) ہوسکتا ہے۔ جڑ چیتنیہ ہوسکتا ہے۔ کیا یہ رہسیہ نتیہ پرتی ہماری نظروں سے نہیں گزرتے؟ آپ کہیں گے راجنیتکیوں کا کام سمبھاوناوں کے پیچھے دوڑنا نہیں۔ ورتمان اور نکٹ بھوشیہ کی سمسّیاوں کو حل کرنا ہے۔ راجنیتکیوں کے کرتویّہ کیا ہیں، میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ لیکن اتنا تو سبھی مانتے ہیں کہ پتھہ اَوشدھی سیون سے اچھا ہوتا ہے۔ آپ کا کیول یہی دھرم نہیں کہ سرکار کے سینک وییے کا سمرتھن کریں، بلکہ یہ منتویہ آپ کی اُور سے پیش ہونا چاہیے۔ آپ کہیں گے کہ سویم سیوکوں کی سینا بڑھائی جائے۔ سرکار کو حال کے مہاسنگرام میں اس کا بہت ہی کھیدجنک انوبھو ہوچکا ہے۔ شکشت ورگ، ولاس پریہ، ساہس ہین اور سوارتھ سیوی ہیں۔ دیہات کے لوگ شانتی پریہ، سنکیرن ہردے (میں بھیرو نہ کہوں گا) اور گرہ سیوی ہیں۔ ان میں وہ آتم تیاگ کہاں، وہاں ویرتا کہاں، اپنے پرکھوں کی وہ ویرتا کہاں؟ اور شاید مجھ یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ کسی شانتی پریہ جنتا کو آپ دو چار ورشوں میں اَن کُشل اور سمر پروین نہیں بنا سکتے۔

(۵)

جیٹھ کا مہینہ تھا، لیکن شملہ میں نہ لو' کی جوالہ تھی اور نہ دھوپ کا تاپ۔ مہاشے مہتا ولایتی چٹھیاں کھول رہے تھے۔ بال کرشن کا پتر دیکھتے ہی پھڑک اُٹھے، لیکن جب اسے پڑھا تو مکھ منڈل پر اُداسی چھا گئی۔ پتر لیے ہوئے راجیشوری کے پاس آئے۔ اس نے اُتسک ہوکر پوچھا۔ بالا کا پتر آیا۔

مہتا۔ ہاں یہ ہے۔

راجیشوری۔ کب آرہے ہیں۔

مہتا۔ آنے جانے کے وشے میں کچھ نہیں لکھا۔ بس سارے پتر میں میرے جاتی دروہ اور درگتی کا رونا ہے۔ اس کی درشٹی میں میں جاتی کا شترو، دھورت، سوارتھاندھ، درآتما، سب کچھ ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے وچاروں میں اتنا انتر کیسے ہوگیا۔ میں تو اسے بہت ہی شانتی پرکرتی، گمبھیر، سُشیل، چرتر اور سِدھانت پریے نویوک سمجھتا تھا اور اس پر گرو کرتا تھا۔ اور پھر یہ پتر لکھ کر ہی اسے سنتوش نہیں ہوا۔ اس نے میری اسپیچ کا وسترت وویچن ایک پرسِدھ انگریزی پتریکا میں چھپوایا ہے۔ اتی کشل ہوئی کہ وہ لیکھ اپنے نام سے نہیں لکھا نہیں تو میں کہیں منہ دکھانے یوگیہ نہیں رہتا۔ معلوم نہیں یہ کن لوگوں کی کو،سنگتی کا پھل ہے۔ مہاراج بھند کی نوکری اس کے وچار میں غلامی ہے۔ راجا بھدر بہادر سنگھ کے ساتھ منورما کا وِواہ گھرنڑت اور ایمان جنک ہے۔ اسے اتنا ساہس کہ مجھے دھو،رت، مکّار، ایمان بیچنے والا، کلدروہی کہے۔ یہ اپمان۔ میں اس کا مُنہ نہیں دیکھنا چاہتا۔

راجیشوری۔ لاؤ، ذرا اس پتر کو میں بھی دیکھوں۔ وہ تو اتنا منہ پھٹ نہ تھا۔

یہ کہہ کر اس نے پتی کے ہاتھ سے پتر لیا اور ایک منٹ میں آدھیانت پڑھ کر بولی۔ یہ سب کٹو باتیں کہاں ہیں؟ مجھے تو اس میں ایک بھی اپ شبد نہیں ملتا۔

مہتا۔ بھاؤ دیکھو، شبدوں پر نہ جاؤ۔

راجیشوری۔ جب تمھارے اور اس کے آدرشوں میں ورودھ ہے تو اسے تم پر شرڈھا کیوں کر ہوسکتی ہو۔

لیکن مہتا مہودے جامے سے باہر ہورہے تھے۔ راجیشوری کی سہشرُدتا پورمرن باتوں

سے وہ اور جل اُٹھے۔ دفتر میں جاکر اسی کرودھ میں پتر کو پتر لکھنے لگے جس کا ایک ایک شبد چھری اور کٹار سے بھی زیادہ تیکھا تھا۔

اُوپریکت گھٹنا کے دو سپتاہ پیچھے مسٹر مہتا نے ولایتی ڈاک کھولی تو بال کرشن کا کوئی پتر نہ تھا۔ سمجھے میری چوٹیں کام کر گئیں۔ آگیا سیدھے راستہ پر، تبھی تو اُتر دینے کا ساہس نہیں ہوا۔ 'لندن ٹائمز' کی چٹ پھاڑی (اس پتر کو بڑے چاؤ سے پڑھا کرتے تھے) اور تار کی خبریں دیکھنے لگے۔ سہسا ان کے مُنہ سے ایک آہ نکلی۔ پتر ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا پہلا سماچار تھا۔

''لندن میں بھارتیہ دیش بھکتوں کا جماؤ، آنریبل مسٹر مہتا کی وکترتا پر اسنتوش، مسٹر بال کرشن مہتا کا ورودھ اور آتم ہتیا۔''

گت شنوار کو بیکسٹن ہال میں بھارتیہ یووکوں اور نیتاؤں کی ایک بڑی سبھا ہوئی۔ سبھاپتی مسٹر تالبجا نے کہا۔ ہم کو بہت کھوجنے پر بھی کونسل کے کسی انگریز ممبر کی وکترتا میں ایسے مرم بھیدی، ایسے کٹھور شبد نہیں ملتے۔ ہم نے اب تک کسی راجنیتکیہ کے مکھ سے ایسے بھرانتی کارک، ایسے بز نکّش وچار نہیں سنے۔ اس وکترتا نے سِدّھ کردیا کہ بھارت کے اُدّھار کا کوئی اُپائے ہے تو وہ سوراجیہ ہے جس کا آشئے ہے۔ من اور وچن کی پورن سوادھینتا۔ کرماگت اُنّتی(Evolution) پر سے یدی ہمارا اعتبار اب تک نہیں اُٹھا تھا تو اب اُٹھ گیا۔ ہمارا روگ اَسادھیہ ہوگیا ہے۔ یہ اب جورنوں اور اولیھوں سے اچھا نہیں ہوسکتا۔ اسے بزورت ہونے کے لیے ہمیں کایاکلپ کی آوشیکتا ہے۔ اونچے راجیہ پد ہمیں سوادھین نہیں بناتے، بلکہ ہماری آدھیاتمک پرادھینتا کو اور بھی پشٹ کردیتے ہیں۔ ہمیں وشواس ہے کہ آنریبل مسٹر مہتا نے جن وچاروں کا پرتپادن کیا ہے انھیں وہ انتاکرن سے متھیا سمجھتے ہیں۔ لیکن سمّان لالسا، شرے پریم اور پدانراگ نے انھیں اپنی آتما کا گلا گھونٹنے پر بادھیہ کر دیا ہے۔ (کسی نے اُچّ سُور سے کہا۔ یہ متھیا دوشاروپن ہے۔)

لوگوں نے وِسمت ہوکر دیکھا تو مسٹر بال کرشن اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ کرودھ سے ان کا شریر کانپ رہا تھا۔ وہ بولنا چاہتے تھے، لیکن لوگوں نے انھیں گھیر لیا اور ان کی نِندا اور اَپمان کرنے لگے۔ سبھا پتی نے بڑی کٹھنائی سے لوگوں کو شانت کیا، کنتو مسٹر بال کرشن وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ دوسرے دن مترگنڑ بال کرشن سے ملنے گئے تو ان کی لاش

فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ پستول کی دو گولیاں چھاتی سے پار ہوگئی تھیں۔ میز پر ان کی ڈائری کھلی پڑی تھی، اس پر یہ پنکتیاں لکھی ہوئی تھیں۔

"آج سبھا میں میرا گرو ذلت ہوگیا۔ میں اپمان نہیں سہہ سکتا۔ مجھے اپنے پوجیہ پتا کے پرتی ایسے کتنے ہی نند اسوچک درشیہ دیکھنے پڑیں گے۔ اس آدرش ورودھ کا انت ہی کردینا اچھا ہے۔ سمبھو ہے، میرا جیون ان کے ہردیہٹ مارگ میں بادھک ہو۔ ایشور مجھے بل پردان کریں۔"

یہ افسانہ پہلی بار شری شاردا کے 6 رجولائی 1921 کے شمارے میں شائع ہوا یہ مان سرور 8 میں شامل ہے۔ ہندی سے رسم خط بدل کر شاملِ اشاعت ہے۔

فلسفی کی محبت

لالہ گوپی ناتھ کی طبیعت دورِ شباب ہی سے فلسفے کی جانب مائل تھی۔ ابھی وہ انٹرمیڈیٹ کلاس ہی میں تھے کہ مل اور برکلے ان کے نوکِ زبان ہوگئے تھے۔ وہ ہر قسم کی دلچسپیوں اور تفریحوں سے الگ رہتے۔ یہاں تک کہ کالج کے کریکٹ میچوں میں بھی ان کا جوش تماشا بیدار نہ ہوتا۔ زندہ دل، رنگین طبع، بزلہ سنج، احباب کی صحبت سے کوسوں بھاگتے۔ اور ان سے حُسن و محبت کا ذکر کرنا تو گویا شیطان کو لاحول سُنانا تھا۔ علی الصبح کوئی فلسفے کی کتاب بغل میں دباکر گھر سے نکل جاتے اور شہر سے باہر کسی گھنے درخت کے نیچے بیٹھ کر مطالعے میں غرق و محو ہوجاتے۔ فسانے اور شعر و سخن سے انھیں مطلقً ذوق نہ تھا۔ شاید ہی زندگی میں انھوں نے کوئی قصّے کی کتاب پڑھی ہو۔ اسے تضیعِ اوقات ہی نہیں بلکہ دل و دماغ کے لیے سمِ قاتل سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان میں قومی جوش کی کمی نہ تھی۔ سیواسمتیوں میں بڑا انہماک تھا۔ ابنائے وطن کی خدمت کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اکثر محلے کے غریب دکانداروں کی دکان پر جا بیٹھتے اور ان کے خانگی تردّدات اور گھاٹے ٹوٹے کی داستان سنتے۔ رفتہ رفتہ کالج سے ان کی طبیعت متنفر ہوگئی۔ انھیں اگر اب کسی مضمون سے شوق تھا تو وہ فلسفے تھا۔ اور کالج کا نصابِ تعلیم ان کے مطالعۂ خاص میں خارج تھا۔ انھوں نے کالج چھوڑ دیا۔ اور یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ اپنے مطالعے میں مصروف ہوگئے۔ مگر اس شوقِ طلب کے ساتھ عملی خدمات کا جوش بھی بڑھتا گیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ اضطراری طور پر خدامِ قوم کے زمرے میں شامل ہوگئے۔ فلسفے میں روحانی شکوک تھے اور تاریکی اور ہیجانِ قلب خدمت میں تجسّس تھی۔ اور شہرت اور تشکر خاموش۔ وہ زندہ دلی اور حرارت جو برسوں سے فلسفیانہ مسائل کے نیچے دبی ہوئی تھی، طوفانی جوش کے ساتھ اُبل پڑی شہر کی تحریکاتِ عامّہ میں کود پڑے۔ دیکھا تو یہاں میدان خالی تھا۔ جدھر نگاہ دوڑاتے سنّاٹا نظر آتا تھا۔ علم برداروں کی کمی نہ تھی۔ پر سچّے

خادم معدوم تھے۔ چاروں طرف اُن کی کھینچ ہونے لگی۔ کسی تحریک کے سکریٹری ہوئے، کسی کے صدر۔ کسی کے کچھ، کسی کے کچھ۔ اس جوشِ خدمت میں فلسفے کا ذوق بھی رخصت ہوا۔ پنجرے میں گانے والی چڑیا کہسار میں آکر اپنے نغمے بھول گئی۔ حالانکہ اب بھی وہ موقع نکال کر تھوڑی دیر کے لیے روزانہ کتابیں اُلٹ پلٹ کیا کرتے تھے۔ پر تحقیق و تفحیص کی فرصت کہاں۔ اکثر دل میں کش مکش بھی ہوتی۔ کدھر جاؤں۔ اِدھر یا اُدھر؟ فلسفے اپنی جانب کھینچتا قوم اپنی طرف کھینچتی۔ ایک روز وہ اسی اُلجھن میں گنگا کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ دریا ساحل کے شور و غل سے بے خبر، ہواؤں کے جھونکوں سے بے اثر ایک روانی بے تاب کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف دوڑا چلا جاتا تھا۔ فلسفی نے سوچا۔ میں بھی اسی طرح کیوں نہ یکسو ہوجاؤں۔ وہ اپنے حافظے میں کسی ایسے فلاسفر کی مثال تلاش کرنے لگے جس نے خدمتِ قوم کے ساتھ دریائے حقیقت کی غواصی بھی کی ہو۔ دفعتاً ان کے کالج کے ایک پروفیسر پنڈت تربھون ناتھ اگنی ہوتری آکر بیٹھ گئے اور بولے۔ گوپی ناتھ کیا خبریں ہیں؟

گوپی ناتھ نے بے رُخی سے جواب دیا کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ دنیا اپنی رفتار قدیم پر چلی جاتی ہے۔

تربھون ناتھ۔ میونسپل وارڈ نمبر۲۱ کے لیے آپ لوگوں نے کسے تجویز کیا ہے؟

گوپی ناتھ۔ دیکھیے کون ہوتا ہے۔ آپ بھی تو امیدوار ہیں؟

تربھون ناتھ۔ مجھے لوگوں نے زبردستی کھینچ لیا۔ ورنہ مجھے کہاں فرصت۔

گوپی ناتھ۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ پروفیسر کو عملی سیاسیات میں اُلجھنا مناسب نہیں۔

تربھون ناتھ۔ اس طنز سے بہت خفیف ہوئے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انتقام کے ارادے سے بولے۔ آج کل فلسفے کا مطالعے کرتے ہو یا نہیں؟

گوپی ناتھ۔ بہت کم۔ اس کش مکش میں پڑا ہوں کہ قومی تحریکوں میں شریک ہوجاؤں یا تلاشِ حق میں عمر صرف کردوں۔

تربھون ناتھ۔ قومی تحریکوں میں شریک ہونے کا زمانہ بعد کو آئے گا۔ ابھی تو تمھاری تحصیلِ علم کا زمانہ ہے جب تک عقائد میں استحکام اور متانت نہ پیدا ہوجائے اس وقت تک محض فوری تحریکوں سے کسی کام کو ہاتھ میں لینا مناسب نہیں۔ ابھی

تمھاری عمر ہی کیا ہے۔ قومی خدمت بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔

گوپی ناتھ نے فیصلہ کرلیا۔ یہ زندگی خدمت قوم کے نذر ہوگی۔ تربھون ناتھ نے فیصلہ کیا۔ میں دکھا دوں گا کہ تدریس کے ساتھ میونسپلٹی کی خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔

(۲)

گوپی ناتھ کا وقار پہلے ہی سے قائم تھا۔ خاندان مرفہ حال تھا۔ شکر اور سونے چاندی کی دلالی ہوتی تھی۔ ان کے والد بزرگوار کا تاجروں کے حلقے میں بہت اعزاز تھا۔ دو بڑے بھائی تھے وہ بھی دلالی کرتے تھے۔ آپس میں اتفاق تھا۔ دولت تھی۔ لڑکے بالے تھے۔ اگر نہ تھی تو تعلیم اور تعلیم یافتہ طبقے میں عزت۔ وہ گوپی ناتھ کی بدولت حاصل ہوگئی۔ ان کی بیکاری کسی کو ناگوار نہ گزری۔ کسی نے انھیں فکرِ معاش کے لیے مجبور نہ کیا۔ وہ آزاد اور بے فکر ہوکر رفاہ خلق میں منہمک ہوئے۔ کہیں کسی یتیم خانے کے لیے چندہ جمع کرتے۔ کہیں کسی لڑکی کے لیے روپے مانگتے۔ ان کی جاںنثاری اور الوالعزمی نے ان تحریکوں میں جان ڈال دی۔ وہ صبح سے شام تک اور بسا اوقات پہر رات تک انھیں فکروں میں رواں دواں رہتے۔ چندے کا رجسٹر ہاتھ میں لیے انھیں روزانہ شام سویرے امراء کے آستانے پر کھڑے دیکھنا ایک عام نظارہ تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے عقیدت مندوں کی ایک خاص تعداد ہوگئی۔ لوگ کہتے۔ کتنا بے غرض، بے نفس، جاںنثار، خادمِ قوم ہے۔ کون صبح سے شام تک بلا کسی قسم کے ذاتی مفاد کے محض فلاح خلق کے لیے یوں دوادوش کرے گا۔ ان کا ایثار اکثر بے غرضوں میں بھی حسنِ اعتقاد پیدا کردیتا تھا۔ گوپی ناتھ کو بسا اوقات رؤسا و اُمراء کی بے رُخی، ترشی یہاں تک کہ ملامت بھی برداشت کرنی پڑتی تھی۔ انھیں روزبروز تجربہ ہوتا تھا کہ قومی خدمت کم و بیش محض چندے مانگنے کا کام ہے۔ اس کے لیے انھیں اہلِ زر کی دربار داری یا دوسرے الفاظ میں خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ فلسفے کے اس بے نیاز مطالعے اور اس قومی گداگری میں کتنا فرق تھا۔ کہاں مل اور کانٹ اسپنسر اور اسپنوزا کے ساتھ خلوت میں بیٹھے حیات و ممات، روح اور مادّہ کے حقائق پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ کہاں اہلِ مغرور، نااہل، کندۂ ناتراش بیوپاریوں کے سامنے سر نیاز خم کرنا پڑتا تھا۔ وہ دل میں انھیں حقیر سمجھتے تھے۔ ان میں دولت کے سوا اور مجھ پر کون سی فضیلت ہے۔ زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو مشکوک اور ناپسندیدہ ذرائع سے روپے کماتے تھے۔ پر یہ سب کے سب

میرے معبود ہیں۔ انھیں کی ذات اور دستِ کرم پر میری خدمت کا دارومدار ہے۔ کیا ایسی کوئی صورت نہیں ہوسکتی کہ میں اس جماعت سے بے نیاز رہ کر خدمت کرسکوں؟

اس طرح کئی سال گزر گئے۔ لالہ گوپی ناتھ کا شہر کے معززین میں شمار ہونے لگا۔ وہ غریبوں کے دستگیر، محتاجوں کے معاون تھے۔ عمر بھی تیس سے تجاوز ہوچکی تھی۔ چاروں طرف سے شادی کے تقاضے ہو رہے تھے۔ گوپی ناتھ ٹالتے چلے آئے تھے۔ لیکن اب آخری فیصلے کا زمانہ آپہنچا۔ ایک روز ان کے والد بزرگوار نے کہا اگر تم شادی نہ کروگے تو میں زہر کھالوں گا۔ مجھے خاندان کی رسوائی منظور نہیں۔ اس کا انجام ایک نہ ایک دن رسوائی کا ہونا ہے۔ گوپی ناتھ بڑی تشویش میں پڑے۔ ہفتوں ہوگئے اور کسی فیصلے پر نہ پہنچے۔ قوم اور ذات میں جنگ ہو رہی تھی۔ شادی کا مفہوم تھا اپنی نگاہوں کو تنگ کرنا۔ اپنی وسیع دنیا کو چار دیواری میں بند کر دینا۔ قوم کے لیے مرجانا۔ اور صرف عیال کے لیے زندہ رہنا۔ وہ اب اتنے اونچے معیار سے گرنا شرمناک سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کسی نہ کسی وجہ سے اپنے کو نااہل اور ناقابل پاتے تھے۔ کسبِ معاش کے لیے جس دردسر کی کاوش کی، جبیں سائی کی، تحمّل کی ضرورت ہے وہ ان میں مفقود ہوگئی تھی۔ قومی خدمت میں بھی دردِ سر اور کدوکاوش کی کمی نہ تھی۔ لیکن اس میں ان کی شان بے نیازی قائم رہتی ہے۔ قوم کے لیے بھیک مانگنا فخر ہے۔ اپنے لیے صلۂ خدمت کی تمنا بھی مایۂ شرم۔ عیال داری میں اس اُبالی پن کا بے فکری کا کہاں گزر۔ ساری قوم کی فکر ایک طرف اور ایک بچے کی بیماری ایک طرف۔ ان خامیوں کے لیے قومی خدمت بہت اچھا بہانہ تھا۔

ایک روز سیر کرنے جا رہے تھے کہ راستے میں پروفیسر اگنی ہوتری سے ملاقات ہوگئی۔ پروفیسر صاحب اب میونسپل بورڈ کے سیکریٹری ہوگئے تھے۔ مسکرات کا ٹھیکہ لینے کی طرف طبیعت لپکتی تھی۔ مگر بدنامی سے ڈرتے تھے۔ افسر مسکرات سے ان کا یارانہ تھا۔ رعایت سے معاملہ ہوجانے کا یقین تھا۔ پھر بھی رسوائی اور انگشت نمائی کا خوف کوئی رائے قائم کرنے نہ دیتا تھا۔ بولے! کہیے لالہ صاحب مزاج تو اچھے ہیں؟ آپ کی شادی کے متعلق کیا بات طے ہوئی؟ کب تک ہوگی؟

گوپی۔ میرا تو ارادہ شادی کا نہیں ہے حالانکہ والدصاحب بہت اصرار کر رہے تھے۔

اگنی ہوتری۔ ایسی غلطی مت کرنا۔ تم ابھی نوجوان ہو۔ نفس کی ترغیبات سے واقف نہیں۔

میں نے ایسی کئی مثالیں دیکھی ہیں جہاں تجرّد سے فائدے کے عوض نقصان ہی ہوا ہے۔ شادی انسان کو محتاط رکھنے کا بہترین طریقہ ہے جو اَب تک انسان نے دریافت کیا ہے۔ اس تجرد سے کیا فائدہ جس کا انجام چھچھوراپن ہو۔

گوپی ناتھ نے از راہِ انتقام کہا۔ آپ نے مسکرات کے ٹھیکے کے متعلق کیا فیصلہ کیا؟

اگنی ہوتری۔ ابھی تک تو فیصلہ نہیں کرسکا ہوں مگر اس پیشے کی طرف طبیعت راغب نہیں ہوتی۔ کچھ نہ کچھ سبکی کا باعث ضرور ہے۔

گوپی ناتھ۔ ایک کالج کے پروفیسر کے لیے محض باعث سُبکی ہی نہیں بلکہ شرمناک ہے۔

اگنی ہوتری۔ کوئی پیشہ بذاتہ شرمناک نہیں ہوتا۔

گوپی ناتھ۔ میں آپ سے اس امر میں متفق نہیں ہوں۔ کتنے ہی ایسے پیشے ہیں جنھیں ایک تعلیم یافتہ آدمی بغیر نشانۂ ملامت بنے کبھی قبول نہیں کرسکتا۔

گوپی ناتھ نے آکر اپنے باپ سے کہا۔ میں شادی نہ کروں گا۔ آپ مجھے مجبور کریں گے تو میں فقیر ہوجاؤں گا۔

اگنی ہوتری نے دوسرے دن ٹھیکے کی درخواست دے دی۔

(۳)

دوسال گزر گئے ہیں۔ گوپی ناتھ نے ایک لڑکیوں کا مدرسہ قائم کیا ہے اور اس کے منتظم ہیں۔ تعلیمی مسائل کا انھوں نے غائر مطالعہ کیا ہے۔ فلسفے کے۔اس شک میں انھیں تجرد کا دعویٰ ہے۔ اس مدرسے میں وہ اپنے معیاروں کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے بڑی حدتک اس بے دلی کا ازالہ کردیا ہے جو والدین کو لڑکیوں کی جانب سے ہے۔ معززینِ شہر اپنی لڑکیوں کو بلا تامل بھیجتے ہیں۔ طرزِ تعلیم ایسا دلچسپ ہے کہ لڑکی ایک بار وہاں آکر گویا طلسم میں مسحور ہوجاتی ہے۔ پھر اسے گھر پر چین نہیں آتا۔ تین ہی چار سال میں اُسے نسوانی ہنروں میں کافی دستگاہ ہوجاتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں مذہبی مسائل بھی نظرانداز نہیں کیے جاتے۔ اہل ہنود کے مختلف فرقوں کے لیے ایک ہی سلسلۂ کتب مقرر ہے مگر کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی۔ امسال انھوں نے انگریز جماعتیں بھی کھول دی ہیں۔ ایک انگریزی تعلیم یافتہ گجراتی خاتون کو بمبئی سے بُلا رکھا ہے۔ ان کا نام آنندی بائی ہے۔ بیوہ ہیں۔ ہندی زبان سے بے گانہ ہیں۔ لیکن گجراتی زبان میں کئی کتابیں تصنیف

کرچکی ہیں۔ تعلیم کے اصول اور طرز میں ماہر ہیں۔ ان کے تقرر سے مدرسے میں اور بھی رونق ہوگئی ہے۔ کئی اصحاب نے جو اپنی لڑکیوں کو منسوری اور نینی تال کے انگریزی مدرسوں میں بھیجنا چاہتے تھے اب انھیں اسی مدرسے میں داخل کرا دیا ہے آنندی بائی رُوساء کے گھروں میں جاتی ہیں اور تعلیم کا شوق پیدا کرتی ہیں۔ ان کی وضع قطع میں نفاست ہے۔ خود بھی متمول خاندان کی عورت ہے۔ اس لیے شہروں میں ان کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ لڑکیاں ان پر جان دیتی ہیں۔ انھیں "ماں" کہہ کر پکارتی ہیں۔ گوپی ناتھ اپنے انتخاب پر پھولے نہیں سماتے۔ جس سے ملتے ہیں آنندی بائی کے محاسن اور اوصاف کی داستان سُناتے ہیں۔ باہر سے اگر کوئی نامور شخص آجاتا ہے اس سے اپنے مدرسے کا معائنہ ضرور کرواتے ہیں۔ آنندی بائی کی تعریف سے انھیں وہی مسرت حاصل ہوتی ہے جو اپنی تعریف سے ہوتی۔ اسے وہ بالواسطہ اپنی ہی تعریف سمجھتے ہیں۔ آنندی بائی کو بھی فلسفے سے شوق ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ انھیں گوپی ناتھ سے حُسنِ ارادت ہے۔ وہ دل سے ان کی تعظیم کرتی ہیں۔ ان کے ایثار اور بے نفس خدمت نے انھیں مسخر کرلیا ہے۔ وہ مُنہ پر لالہ جی کی تعریف سے اجتناب کرتی ہیں۔ مگر رُوسا کے گھرانوں میں ان کا راگ گاتی ہیں۔ ایسے آدمی آج کل کہاں؟ لوگ نام و نمود پر جان دیتے ہیں۔ کسی کے واسطے مرتا کون ہے۔ میں انھیں آدمی نہیں دیوتا سمجھتی ہوں۔ کتنی سادگی اور قناعت ہے۔ نہ کوئی شوق نہ کوئی تکلف۔ صبح سے شام تک سرگرداں رہتے ہیں۔ نہ کھانے کا وقت معیّن نہ سونے کا۔ کوئی ایسا نہیں جو اُن کی آسائش کا خیال رکھے۔ بیچارے جلے بھُنے گھر پر آئے جو کسی نے سامنے رکھ دیا۔ چپکے سے کھا لیا۔ پھر چھڑی اُٹھائی اور اپنی منزل پر چل کھڑے ہوئے۔

کنوار کا مہینہ تھا۔ کنیا پاٹ شالہ میں وجے دسمی منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک ڈرامہ کھیلنے کی تجویز تھی۔ عمارت خوب سجائی گئی تھی۔ شہر کے رؤسا کی دعوت کی گئی تھی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس کا جوش زیادہ تھا۔ آنندی کا یا لالہ گوپی ناتھ کا۔ گوپی ناتھ سامان فراہم کرتے تھے۔ انھیں سلیقے سے چُننے کی خدمت آنندی بائی نے اپنے سر لی تھی۔ ڈرامہ بھی انھیں کی تصنیف تھا۔

دسمی کا دن تھا۔ دوپہر تک لالہ گوپی ناتھ فرش اور کرسیوں کا انتظام کرتے رہے۔ جب ایک بج گیا اور اب بھی وہ کھانا کھانے گھر نہ گئے تو آنندی نے کہا، مہاشے آپ کو

کھانے میں دیر ہورہی ہے۔ اب سب کام ہوگیا۔ جو کچھ کسر ہے وہ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔
گوپی ناتھ۔ کھالوں گا۔ میں وقتِ معین پر کھانے کا ایسا پابند نہیں ہوں۔ پھر گھر تک کون جائے۔ گھنٹوں کی دیر ہوگی۔ کھانے کے بعد آرام کرنے کو بھی جی چاہے گا۔ شام ہوجائے گی۔
آنندی۔ کھانا تو میرے ہاں تیار ہے۔ براہمنی پکاتی ہے۔ چل کر بھوجن کرلیجیے۔
گوپی۔ یہاں کیا کھالوں۔ ایک وقت کھانا نہ کھاؤں گا تو ایسا کون سا نقصان ہوگا۔
آنندی۔ جب کھانا تیار ہے تو فاقہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟
گوپی۔ آپ جائیں۔ بیشک آپ کو دیر ہو رہی ہے۔ میں کام میں ایسا بھولا کہ آپ کی یاد نہ رہی۔
آنندی۔ آپ فاقہ کرتے ہیں۔ تو مجھے ایک ہی وقت کھانا نہ کھانے کیا نقصان ہوسکتا ہے۔
گوپی۔ نہیں۔ نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں اکثر ایک ہی وقت کھاتا ہوں۔
آنندی۔ آپ کے انکار کا راز سمجھ گئی۔ تعجب ہے۔ اب تک یہ معمولی سی بات کیوں نہ سوجھی۔ کتنی سست عقل ہوں۔
گوپی۔ کیا سمجھ گئیں؟ میں چھوت چھات کا قائل نہیں ہوں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔
آنندی۔ اتنا جانتی ہوں۔ مگر جس وجہ سے آپ میرے یہاں بھوجن نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے متعلق میں آپ سے اتنا عرض کرتی ہوں کہ مجھے آپ سے محض ماتحتی کا تعلق نہیں ہے۔ مجھے آپ سے روحانی پریم ہے۔ آپ کا میرے پان پھول سے انکار کرنا اپنے سچے بھگت کی دل شکنی کرنا ہے۔ میں آپ کو اسی نظر سے دیکھتی ہوں۔
گوپی ناتھ کوئی عذر نہ کرسکے۔ جاکر کھانا کھا لیا۔ وہ جب تک آسن پر بیٹھے رہے۔ آنندی پنکھا جھلتی رہی۔

اگنی ہوتری اور ان کے ندیموں نے اس واقعے کی یوں تفسیر کی۔ لالہ صاحب اب تو وہیں کھانا بھی تناول فرماتے ہیں۔ کیوں نہ ہو۔ دونوں میں روحانی مناسبت ہے۔ دیکھیں یہ روحانیت کیا گل کھلاتی ہے۔

(۴)

ضابطے اور تکلف کا پردہ ہٹنے لگا۔ لالہ گوپی ناتھ کو اب ضرورتاً تصنیف کا شوق ہوگیا تھا۔ گھر سے انھیں ضروری مصارف مل جاتے تھے۔ مگر اخباروں اور کتابوں کے لیے کبھی کبھی انھیں بہت مجبور ہونا پڑتا تھا۔ علاوہ بریں اب اُن کی خودداری ذرا ذرا سی باتوں کے لیے بھائیوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے مانع ہوتی تھی۔ وہ اپنی ضرورتیں آپ ہی پوری کرلینا چاہتے تھے۔ گھر پر لڑکے اتنا شور و غل کرتے کہ کام کرنے میں ان کی طبیعت نہ لگتی۔ گھر کے لڑکوں پر ان کے اصول تعلیم کا اچھا اثر نہ نظر آتا تھا۔ اس لیے جب ان کی طبیعت جولان پذیر ہوتی تو بے تکلف کنیا پاٹ شالا میں چلے جاتے۔ آنندی بائی بھی وہیں رہتی تھیں۔ تخلیہ ملتا۔ کام کرنے میں جی لگتا۔ کھانے کا وقت آجاتا تو وہیں کھانا بھی کھا لیتے۔ رفتہ رفتہ آنندی نے محرّر کی خدمت اپنے ذمّے لی۔ لالہ صاحب بولتے جاتے تھے وہ لکھتی جاتی تھیں۔ لالہ صاحب کی ہی تحریک سے آنندی نے ہندی سیکھ لی تھی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اتنی استعداد پیدا کرلی تھی کہ اب اُسے لکھنے میں ذرا بھی جھجک نہ ہوتی تھی۔ لکھتے وقت اُسے بعض اوقات ایسے الفاظ اور محاورے سُوجھ جاتے کہ لالہ صاحب پھڑک اُٹھتے۔ عبارت میں جان سی پڑجاتی۔ کہتے اگر تم خود لکھو تو مجھ سے بہت اچھا لکھوگی۔ میں تو محض بیگار کرتا ہوں۔ تم میں خدا داد ملکہ ہے۔ شہر کے قاضیوں میں رائے زنی ہونے لگی۔ پر اہلِ فلسفے اپنے ضمیر کی صفائی کے سامنے زبانِ حسد کی کب پرواہ کرتے ہیں۔ آنندی کہتی دُنیا کے مُنہ میں زبان ہے جو چاہے کہے۔ پر میں اس آدمی سے پرہیز نہیں کرسکتی جس سے مجھے روحانی تعلق ہے۔ گوپی ناتھ اتنے بے باک نہ تھے۔ زبانِ خلق پر اُن کے نام نیک کا انحصار تھا۔ وہ اس کی تحقیر نہ کرسکتے تھے۔ اس لیے رفتہ رفتہ انھوں نے دن کی بجائے رات کو تصنیف کا شغل اختیار کیا۔ کنیا پاٹ شالا میں رات کو کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا تھا۔ تنہائی میں خوب کام کرتے۔ وہ خود آرام کرسی پر لیٹ جاتے۔ آنندی میز پر بیٹھی، قلم لیے ان کی طرف دیکھا کرتی۔ اس کی نگاہ سے ادب اور احترام، عقیدت اور محبت ٹپکی پڑتی تھی۔ گوپی ناتھ جب کسی خیال کو دل میں ترتیب دینے کے بعد بولنے کے قبل آنندی کی طرف دیکھتے کہ وہ لکھنے کے لیے تیار ہے کہ نہیں۔ تو دونوں کی نگاہیں مل جاتیں۔ گوپی ناتھ اس طرزِ عمل کے ایسے عادی ہوتے جاتے تھے کہ اگر کبھی یہاں آنے کا موقع نہ ملتا تو گونہ

اضطراب ہوتا تھا۔

گوپی ناتھ کو آنندی کے آنے سے قبل صنفِ نازک کا ذاتی تجربہ نہ تھا۔ حکمائے سابق و حال کی کتابیں ان کی نظر سے گزری تھیں۔ سب جگہ عورت روحانی ترقی کی مانع، قومی خدمت کی سدِ راہ، دل کو پستی، تنگیٔ خیال اور کام جوئی کی طرف لے جانے والی، زہریلی ناگن، شرابِ دوآتشہ، دو دھاری تلوار بتائی گئی تھی۔ یہاں تک کہ مغرب کے علماء کا بھی یہی فیصلہ تھا۔ انھیں وجوہ سے انھوں نے تجرد کو ترجیح دی تھی۔ مگر اب تجربہ بتلا رہا تھا کہ عورت تحریک خیر بھی کرسکتی ہے۔ وہ حقیقت کے راستے کی رفیق بھی بن سکتی ہے۔ اس کے فیضِ صحبت سے اچھے کام بھی ہوسکتے ہیں۔ تب ان کے دل میں سوال پیدا ہونا شروع ہوا۔ اگر آنندی کے ساتھ ہی میری شادی کرنے کی تجویز ہوتی تو مجھے کیا عذر ہوسکتا تھا۔ اس کے ساتھ تو میری زندگی بڑے لطف سے گزرتی۔

ایک روز وہ آنندی کے یہاں آئے تو سر میں درد تھا۔ کچھ لکھنے کی طرف طبیعت مائل نہ ہوئی۔ آنندی نے ان کے سر میں تیل ملنا شروع کیا۔ وہ بہت نہیں نہیں کرتے رہے۔ پر اس نے شیشی اُن کے سر پر انڈیل ہی دی۔ اس وقت گوپی ناتھ کے دل پر ایک عجیب سکون بخش سرور انگیز کیفیت طاری ہوئی۔ جذبات نے ناطقے پر یورش کی۔ لیکن گوپی ناتھ نے درد اور حسرت کا ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلنے دیا۔ ہاں اُسی دن سے انھوں نے آنندی کے یہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ پورا ایک ہفتہ گزر گیا اور نہ گئے۔ آنندی نے لکھا۔ آپ کے آنے کی سخت ضرورت ہے۔ مدرسے کے متعلق کئی انتظامی امور میں آپ سے صلاح لینی ہے۔ گوپی ناتھ نے اس کا جواب نہ دیا۔ آنندی نے پھر لکھا۔ آپ کی کتاب اُدھوری پڑی ہے۔ اسے ختم کر ڈالیے تو جلد پریس چلی جائے۔ تب بھی نہ گئے۔ تیسری بار اس نے لکھا۔ معلوم ہوتا ہے آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر تو آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن واقعی آپ ناراض ہیں تو میں یہاں رہنا اپنی خودداری کی شان کے خلاف سمجھتی ہوں۔ اگر آپ اب بھی نہ آئیں گے تو مدرسے کا چارج استانی کو دے کر چلی جاؤں گی۔ گوپی ناتھ اب بھی نہ پسیجے۔ آخر دو مہینے کی بے اعتنائی کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ آنندی بیمار ہے اور دو دن سے مدرسے نہیں آئی۔ تب وہ کسی حیلہ اور دلیل سے اپنے نفس کو نہ تسکین دے سکے۔ آئے کچھ جھجکتے کچھ

شرماتے۔ آنندی کے کمرے میں قدم رکھا۔ دیکھا تو وہ خاموش پڑی ہوئی تھی۔ چہرہ زرد تھا۔ جسم گھل گیا تھا۔ اس نے ان کی طرف چشم فریاد سے دیکھا۔ اُٹھنا چاہا۔ مگر ضعف نے اجازت نہ دی۔ گوپی ناتھ نے کہا۔ لیٹی رہو۔ کوئی ضرورت نہیں۔ میں بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب آئے تھے؟

خادمہ نے کہا۔ جی ہاں۔ دوبار آئے تھے۔ دوا دے دی ہے۔

گوپی ناتھ نے نسخہ دیکھا تو ضعفِ جگر معلوم ہوا۔ زیادہ تر ادویات مسکن و مقوی تھیں۔ آنندی کی طرف پھر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بے اختیار جی بھر آیا۔ جگر میں ایک ٹیس سی ہونے لگی۔ دل کی زبان پر رکھ کر بولے آنندی تم نے اپنی بیماری کی اطلاع مجھے پہلے نہ دی۔ ورنہ یہ نوبت نہ آتی۔

آنندی۔ کوئی بات نہیں اچھی ہوجاؤں گی۔ جلد ہی اچھی ہوجاؤں گی۔ مر بھی جاؤں گی تو کون رونے والا بیٹھا ہے؟ یہ کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

گوپی ناتھ فلسفی تھے۔ مگر ابھی ان کے جذبات میں جان باقی تھی۔ کانپتی ہوئی، آواز سے بولے۔ آنندی کم سے کم دنیا میں ایک ایسا کوئی ہے جو تمھارے لیے اپنی جان تک دے دے گا۔ یہ کہتے کہتے وہ رک گئے۔ انھیں اپنا اندازِ کلام کچھ غیر موزوں معلوم ہوا۔ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے وہ ان سوقیانہ الفاظ کی نسبت زیادہ پاکیزہ، زیادہ مہرانگیز طرزِ ادا چاہتے تھے۔ پر وہ الفاظ ذہن میں نہ آئے۔

آنندی نے شکوہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ دو مہینے تک کس پر چھوڑ دیا تھا؟

گوپی ناتھ۔ آنندی چھوڑ نہیں دیا تھا۔ اپنی تقدیر کو روتا تھا۔ یہی سمجھ لو کہ میں نے نہ جانے کیا سمجھ کر خودکشی نہیں کر لی۔ میں نے نہ سمجھا تھا کہ اپنے عہد پر قائم رہنا میرے لیے اتنا دُشوار ہوجائے گا۔ میں نے اس دوران میں ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ اخباروں کی چٹ تک نہیں کھولی۔ شاید ہی کبھی آنکھوں میں نیند آئی ہو بس ایک ہی خیال۔ ایک ہی صورت۔ ایک ہی بات شب و روز دل میں جمی رہتی تھی۔

آنندی نے گوپی ناتھ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ اب تو آپ کبھی اتنی بے اعتنائی نہ کیجیے گا۔

گوپی ناتھ۔ انجام کیا ہے؟

آنندی۔ کچھ بھی ہو۔
گوپی ناتھ۔ کچھ بھی ہو؟
آنندی۔ ہاں۔ کچھ بھی ہو۔
گوپی ناتھ۔ رسوائی۔ تحقیر۔ بدنامی۔ شرمندگی۔
آنندی۔ میں سب کچھ سہہ سکتی ہوں۔ اور میرے لیے آپ کو بھی سہنا پڑے گا۔
گوپی ناتھ۔ آنندی۔ میں اپنے تیئں پریم پر نثار کرسکتا ہوں۔ لیکن نام کو نہیں۔ میں انگشت نمائیوں کی، پُرمعنی نگاہوں کی، اہانت آمیز باتوں کی چوٹیں نہیں برداشت کرسکتا۔
آنندی۔ نہ کیجیے۔ آپ نے بہت ایثار کے بعد یہ کمائی کی ہے۔ میں آپ کو اس سے محروم کرنا نہیں چاہتی(گوپی ناتھ کا ہاتھ پکڑکر)۔ اس کو چاہتی ہوں۔ اس سے اور زیادہ تیاگ کی تمنا نہیں رکھتی۔
گوپی ناتھ۔ دونوں باتیں ساتھ ممکن ہیں؟
آنندی۔ ممکن ہیں۔ میرے لیے ممکن ہیں۔ میں آپ کے پریم کے لیے اپنی آتما بھی نچھاور کرسکتی ہوں۔

(۵)

اس کے بعد لالہ گوپی ناتھ نے آنندی کی بُرائی کرنی شروع کی۔ دوستوں سے کہتے۔ ان کی طبیعت اب کام میں نہیں لگتی۔ پہلے کی سی تن دہی نہیں ہے۔ کسی سے کہتے۔ وہ اب یہاں سے برداشتہ خاطر ہیں۔ گھر جانا چاہتی ہیں۔ ان کی منشاء ہے مجھے سالانہ ترقی ملا کرے۔ اور اس کی یہاں گنجائش نہیں۔ مدرسے کے کئی معائنے کیے اور کیفیت بہت خراب لکھی۔ انتظام۔ تعلیم۔ سبھی صیغوں میں ایک افسوسناک انحطاط کا اظہار کیا۔ سالانہ انتظام میں جب بعض ممبروں نے آنندی کی ترقی کا مسئلہ پیش کیا تو گوپی ناتھ نے سخت مخالفت کی۔ ادھر آنندی نے بھی لالہ گوپی ناتھ کے دکھڑے رونے شروع کیے۔ کہتیں یہ آدمی نہیں پتھر کے دیوتا ہیں۔ انھیں خوش رکھنا محال ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ انھوں نے شادی نہیں کی۔ ورنہ غریب ان کے نخروں کی نذر ہوجاتی۔ کہاں تک کوئی صفائی اور انتظام کی طرف دھیان دے۔ دیوار پر ایک دھبہ بھی پڑگیا، کسی کونے کھڑکی میں ایک جالا بھی لگ گیا یا برآمدوں میں ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی پڑا مل گیا تو آپ میرے سر ہو جاتے ہیں۔ تیوریاں چڑھ جاتی

ہیں۔ دوسال میں نے جوں توں کر کے نباہا۔ لیکن دیکھتی ہوں لالہ صاحب کی سخت گیریاں روزبروز بڑھتی جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں زیادہ دن یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔ میرے لیے روزانہ فرمائشیں آتی رہتی ہیں۔ جب چاہوں گی اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ یہاں آپ لوگوں سے محبت ہوگئی ہے۔ لڑکیوں سے پیار ہوگیا ہے اسی لیے چھوڑکر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ تعجب یہی تھا کہ اور کسی دوسرے آدمی کو مدرسے کے انتظام یا تعلیم میں انحطاط نظر نہ آتا تھا۔ بلکہ حالت پہلے سے بہتر تھی۔

ایک دن پروفیسر اگنی ہوتری سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے پوچھا کہیے مدرسے کی کیا کیفیت ہے؟

گوپی ناتھ۔ کچھ نہ پوچھیے۔ آج کل حالت روزبروز گرتی جاتی ہے۔

اگنی ہوتری۔ آنندی بائی نے تساہل شروع کر دیا؟

گوپی ناتھ۔ جی ہاں۔ سراسر۔ اب کام میں ان کا جی نہیں لگتا۔ بس زیادہ تر یوگ اور گیان کی کتابیں پڑھا کرتی ہیں۔ کہتا ہوں تو جواب دیتی ہیں۔ میں اب اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتی۔ کچھ پرلوک کی فکر چاہیے کہ چوبیسوں گھنٹے پیٹ ہی کی نظر کروں۔ پیٹ کے لیے پانچ گھنٹے بہت ہیں۔ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ پہلے کچھ دنوں تک بارہ گھنٹے دیے تھے۔ مگر وہ حالت ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی۔ میں نے یہاں تک اپنی صحت زائل کر دی۔ ایک بار سخت بیمار پڑگئی۔ کیا کمیٹی نے میرے معالجے کی فکر کی؟ کوئی بات پوچھنے بھی نہ آیا۔ پھر میں کیوں جان دوں۔ سُنا ہے عورتوں میں میری بدگوئی بھی کیا کرتی ہیں۔

پروفیسر صاحب نے عارفانہ انداز سے ہنس کرکہا۔ یہ سب روحانیت کے کرشمے ہیں۔ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔

دو سال گزر گئے۔ رات کا وقت تھا۔ کنیا پاٹ شالہ کے اوپر والے کمرے میں لالہ گوپی ناتھ میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قریب ہی آرام کرسی پر آنندی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ کئی منٹ خاموشی کے بعد گوپی ناتھ نے کہا۔ میں نے تم سے پہلے ہی ماہ میں کہا تھا۔ متھرا چلی جاؤ۔

آنندی۔ میرے پاس، اتنے روپے کہاں تھے اور نہ تمھیں کچھ انتظام کرسکتے تھے۔ اس لیے

میں نے سوچا۔ تین چار مہینے یہاں اور رہوں۔ اس عرصے میں کچھ پس انداز بھی کرلوں گی۔ تمھاری کتاب سے بھی کچھ روپے مل جائیں گے۔ تب متھرا چلی جاؤں گی۔ مگر کیا معلوم تھا کہ بیماری بھی اس موقع کی منتظر ہے۔ میری طبیعت ایک ہفتے کے لیے سنبھلی بھی اور میں نہ روانہ ہوئی۔ مگر موجودہ حالت میں سفر کرنا میرے لیے تقریباً غیر ممکن ہے۔

گوپی ناتھ۔ مجھے یہ خوف ہے کہیں یہ بیماری طول نہ کھینچے۔ مہینے دو مہینے بھی یہاں رہنا پڑے تو راز افشا ہوجائے گا۔

آنندی۔ (چڑھ کر) ہوجائے گا۔ ہوجائے گا۔ اب اس سے کہاں تک ڈروں۔

گوپی ناتھ۔ میں بھی نہ ڈرتا۔ اگر میرے باعث شہر کی کئی تحریکوں کی زندگی خطرے میں نہ پڑتی۔ مجھے اس لیے نام نیک کی پرواہ ہے۔ سوسائٹی کی ان قیدوں کو مہمل سراسر ناروا سمجھتا ہوں۔ تم اس بارے میں میرے خیالات سے بخوبی واقف ہو۔ مگر کروں کیا۔ بدقسمتی سے میں نے اپنے اوپر قومی خدمت کا بار لے لیا ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج مجھے اپنے بنائے اصولوں کو توڑنا پڑرہا ہے اور جو چیز مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے اسے یوں خطروں سے ہٹانے کے سوا اور کوئی نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔

مگر آنندی کی طبیعت سنبھلنے کی بجائے روزبروز گرتی ہی گئی۔ ضعف سے اُٹھنا بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ پر کسی ڈاکٹر یا وید کو اس کی حالت افشا کے خوف سے نہ دکھائی جاتی تھی۔ گوپی ناتھ دوائیں لاتے تھے۔ آنندی کمرے میں پڑے پڑے پیتی تھی۔ اور ضعیف سے ضعیف تر ہوتی جاتی تھی۔ مدرسے سے اس نے رخصت لے لی تھی۔ کسی سے ملتی جُلتی نہ تھی۔ باربار ارادہ کرتی۔ متھرا چلی جاؤں۔ مگر ایک انجان دیس میں بے یار و مددگار کیسے رہوں گی۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ کوئی ایک دو گھونٹ پانی دینے والا بھی نہیں۔ یہ سب سوچ کر اس کی ہمّت رخصت ہوجاتی تھی۔ اس پس وپیش اور حیص بیص میں دو مہینے اور گزر گئے۔ اب آنندی نے یہ فیصلہ کیا۔ ہرچہ بادا باد۔ یہاں سے چل ہی دوں۔ ہم کو تکلیف دہ فیصلوں میں التوا میں نجات نظر آتی ہے۔ آنندی نے اب سوچا۔ سفر میں مرجاؤں گی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ان کے نام نیک پر تو حرف نہ آئے گا۔ میرے مُنہ پر تو کالکھ نہ لگے گی۔

انھیں میرے باعث ذلت اور خفت تو نہ اُٹھانی پڑے گی۔ طعنے نہ سُننے پڑیں گے۔ سفر کی تیاریاں کرنے لگی۔ جو آج سے دو مہینہ قبل ہوتیں تو منشاء پوری ہوجاتی۔ پَر اب مشقت بعد از جنگ تھیں۔

رات کو جانے کا قصد تھا۔ ٹانگے والے سے وقت پر آنے کی تاکید کردی گئی تھی۔ دفعتاً سرِ شام ہی سے آنندی کو دردِ زہ شروع ہوا۔ اور گیارہ بجتے بجتے ایک ننھی سی صنف اور نیم جان ہستی ظہور میں آئی۔ بچّے کے رونے کی آواز سنتے ہی لالہ گوپی ناتھ بے تحاشا اوپر سے اُترے۔ اورگرتے پڑتے گھر بھاگے۔ غریب آنندی نے اس راز کو دمِ آخر تک چھپائے رکھا۔ اپنے درد جاں گزا کی کسی کو اطلاع نہ دی۔ خادموں کو پہلے ہی سے شکوک تھے۔ انھیں زیادہ تعجب نہ ہوا۔ آنندی بے ہوش تھی۔

(۶)

دوسرے دن دس بجتے بجتے خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ گھرگھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کوئی تعجب کرتا تھا۔ کوئی نفرت کرتا تھا۔ کوئی مذاق اُڑاتا تھا۔ لالہ گوپی ناتھ کے بدخواہوں کی تعداد کافی تھی۔ پنڈت تربھون ناتھ اگنی ہوتری ان کے سرغنہ تھے۔ ان لوگوں نے مہاشے گوپی ناتھ کو بدنام کرنا شروع کیا۔ جہاں دیکھیے وہاں دوچار آدمی بیٹھے رازدارانہ انداز سے اس واقعے کی تلمیح و تفسیر کرتے نظر آتے تھے۔ کوئی کہتا تھا اس عورت کے لچھن پہلے ہی سے بُرے معلوم ہوتے تھے نہیں تو بمبئی سے یہاں آتی ہی کیوں۔ اُسے جواب ملتا تھا۔ اس غریب کی خطا نہیں ہے۔ یہ سارے کرتوت اسی بنے ہوئے عینک باز فلاسفر کے ہیں۔ اگر یہی کرنا تھا تو شادی کیوں نہ کرلی۔ تب تو برہم چاری بننے کا حمق سوار تھا۔ اب اس چھچھورے پن پر کمر باندھی ہے۔ اُسے تو مُنہ میں کالکھ لگاکر کہیں ڈوب مرنا چاہیے۔ استفسار حال کے بہانے سے لوگ گوپی ناتھ کے گھر جاتے اور انھیں خفیف کرکے چلے آتے تھے۔ ہر شخص کو انھیں خفیف کرنے میں مزا آرہا تھا۔ اس کے برعکس آنندی کی حالت پر لوگوں کو رحم آتا تھا۔

مگر گوپی ناتھ کے کتنے ہی عقیدت مند ایسے تھے جو اس واقعے کو ان کی ذات سے کسی طرح منسوب نہ کرسکتے تھے۔ یہ کسی شریرالنفس کی حرکت ہے۔ جس شخص نے کبھی عورتوں کا ذکر تک نہ کیا وہ آج یہ حرکت کرے گا۔ اگر انھیں یہی کرنا ہوتا تو شادی نہ

کر لیتے!

گوپی ناتھ نے خود ایک مشکک کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ سب کی سنتے تھے اور خاموش رہتے تھے۔

سوال تھا اب کیا ہو۔ آنندی کی نسبت تو کلام کا موقع نہ تھا۔ وہ عضو ناقص تھی۔ بحث یہ تھی۔ لالہ گوپی ناتھ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ عام فیصلہ تھا کہ انھوں نے جو حرکت کی اس کا پھل کھائیں۔ آنندی بائی کو باقاعدہ طور پر گھر میں رکھیں۔ لیکن اکابر شہر غیر جانبداری کو ترجیح دیتے تھے۔ ہمیں اس سے کیا مطلب۔ آنندی جانیں اور وہ جانیں۔ ہاں انھیں اب پاٹ شالہ کی منیجری سے الگ کردینا چاہیے۔

پروفیسر اگنی ہوتری اور ان کے رفقا گوپی ناتھ کو اتنے سستے نہ چھوڑنا چاہتے تھے۔ انھیں گوپی ناتھ سے پرانا حسد تھا۔ یہ کل کا لونڈا محض دو چار کتابیں اِدھر اُدھر پڑھ کر فلسفے میں شُد بُد کرکے شہر میں لیڈر بنا ہوا گھومے۔ عینک لگائے۔ ریشمی دوپٹہ گلے میں ڈالے۔ سب کو مربیانہ انداز سے دیکھے۔ گویا پارسائی اور ایثار کا پُتلا ہے۔ ایسے لوگوں کا پردہ کیوں نہ فاش کیا جائے۔ قوم کو ایسے دغاباز، حرام کار خدمت گزاروں سے کیوں نہ متنبہ کیا جائے۔ یہ لوگ کنیا پاٹ شالہ کی معلموں سے چوکیداروں سے۔ خادماؤں سے تفتیش کرتے تھے۔ لالہ گوپی ناتھ یہاں کب آتے تھے؟ کب جاتے تھے؟ کتنی دیر تک رہتے تھے؟ کیا کرتے تھے؟ تم لوگ وہاں جاتے تھے یا جانے کی ممانعت تھی؟ چھوٹی چھوٹی تنخواہوں کے ملازم اور وہ بھی ایسے جو گوپی ناتھ کی سخت گیریوں سے بیزار تھے۔ ایسے عزت کے معاملے میں مخبر کا کام کرنے سے گریز کرتے تھے۔ پر کسی قسم کی شہادت نہ ہونے پر بھی زبانِ خلق نے گوپی ناتھ کو مجرم قرار دے دیا تھا۔ اور اب فیصلے کی کہیں بھی اپیل نہ تھی۔

ادھر لالہ صاحب نے اسی دن سے آنندی کے یہاں آنا جانا ترک کر دیا۔ دو ہفتے تک وہ غریب کسی طرح کنیا پاٹ شالہ میں رہی۔ پندرہویں دن انتظامیہ کمیٹی نے اس کے نام برطرفی کا پروانہ بھیج دیا۔ ایک مہینے کی رسمی اطلاع دینا بھی ضروری نہ سمجھی۔ بدنصیب عورت، ننھا سا نیم جان بچہ گود میں لیے ایک تنگ مکان میں چلی گئی۔ اور زندگی کے دن کاٹنے لگی۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ بچہ کمزور، خود بیمار، نہ کوئی تیماردار، نہ غمگسار۔ محض ایک مہری مل گئی۔ جو اس حالت پر ترس کھاکر اس کے برتن دھو دیا کرتی تھی۔ بچاری بچہ کو

چھاتی سے لگائے، رات بھر بیٹھ کر گزارتی۔ عجب مصیبت کا سامنا تھا۔ پر واہ رے صبر، اور توکل، اور تحمل، لالہ گوپی ناتھ سے نہ زبان پر شکایت تھی۔ نہ دل میں۔ سوچتی، موجودہ حالتوں میں انھیں مجھ سے بے التفاتی کرنی ہی چاہیے تھی۔ اس کے سوا اور کیا علاج تھا۔ ان کی رسوائی سے شہر کو کتنا بڑا نقصان ہوتا۔ گو اب بھی کتنے ہی آدمیوں کو ان پر شُبہ ہے۔ مگر کوئی ان پر علانیہ الزام لگانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ وہی میں، میری ہستی ہی کیا۔ میری بدنامی سے دُنیا کو نقصان۔

تین مہینے گزر گئے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ گزرچکی تھی۔ آنندی سوامی ابھیدانند کی ایک کتاب کا ترجمہ کر رہی تھی۔ اب وہ بچّے کے سوجانے پر ترجمہ کیا کرتی تھی۔ معاش کی اور صورت نہ تھی۔ دفعتہً کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ وہ چونک پڑی۔ دبے پاؤں دروازے پر جاکر سننے لگی۔ لالہ گوپی ناتھ کی آواز معلوم ہوئی۔ فوراً دروازہ کھول دیا۔ گوپی ناتھ داخل ہوئے اور سوتے ہوئے بچّے کو پیار کی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ آنندی میں تمھیں مُنہ دکھانے کے لائق نہیں ہوں۔ میں اپنے کو اتنا بودا۔ اتنا کم ہمت۔ اتنا بے غیرت نہ سمجھتا تھا۔ پر میرا بوداپن، میری بے غیرتی اور بے شرمی مجھے بدنامی سے نہ بچا سکی۔ میری بدنامی جو کچھ ہوسکتی تھی، میری ذات سے چلنے والی تحریکات کو جو نقصان پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا۔ اب غیر ممکن ہے کہ میں پبلک کو پھر اپنا مُنہ دکھاؤں۔ اور نہ اب قوم ہی مجھ پر اعتبار کرسکتی ہے۔ باوجود اس کے مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ اپنے فعل کی ذمہ داری اپنے سر لوں۔ میں پہلے سوسائٹی کی قیدوں کی شمہ برابر پرواہ نہ کرتا تھا۔ پر اب قدم قدم پر اس کے خوف سے میری روح فنا ہوجاتی ہے۔ لعنت ہے مجھ پر کہ تمھارے اوپر اتنی افتادیں پڑیں۔ تمھیں ہماری عسرت، اور رسوائی کا یوں مقابلہ کرنا پڑے۔ تم پر ایسی ایسی کٹھن گھڑیاں گزریں اور میں یوں الگ رہوں۔ گویا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میراہی دل جانتا ہے کہ اس پر کیا گزرتی ہے۔ کتنی ہی بار یہاں آنے کا ارادہ کیا اور پھر ہمّت ہار گیا۔ اب مجھ پر روشن ہوگیا کہ میری ساری فلاسفی نمائش تھی۔ مجھ میں قوت عمل معدوم ہے۔ میں محض اصولوں کا دفتر ہوں۔ محض مستعمار خیالات کا ایک تودۂ بے جان، بے حِس لیکن اس کے ساتھ ہی تم سے الگ رہنا میرے لیے عذاب ہے۔ تم سے دُور رہ کر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اپنے پیارے بچّے کو ایک بار دیکھنے کے لیے میرے دل میں کتنی

بار گدگدی سی ہوئی ہے۔ پر یہ امید کرنے کی جرأت کیوں کر کروں کہ میرے اخلاقی ضعف کا ایسا دل شکن ثبوت پانے کے بعد تم مجھ سے نفرت نہیں کرنے لگی ہو۔

آنندی نے باچشمِ تر کہا۔ سوامی آپ ایسا خیال کرکے مجھ پر ظلم کر رہے ہیں۔ میں ایسی نادان نہیں ہوں کہ محض اپنی آسائش اور اطمینان کے لیے آپ کے نامِ نیک میں داغ لگاؤں۔ میں آپ کو اپنا دیوتا سمجھتی ہوں۔ یہی میری سب سے بڑی تمنا ہے۔ آپ مجھے ایک بار اسی وقت روزانہ درشن دے دیا کریں۔

گوپی ناتھ اس طفلانہ بھولے پن پر شرمسار ہوگئے۔ جی چاہا کہ شادی اور بیاہ کی بے معنی قیدوں کو توڑ دوں۔ اس دفتر بے معنی کو غرق مے ناب کر دوں۔ اپنا گھر بناؤں۔ آنندی اس گھر کی دیوی بنے۔ بچّہ اس کے صحن میں کھیلے۔ اس کے رخِ روشن سے یہ تیر و تاریکی زندگی روشن کروں۔ مگر ایک ہی لمحے میں یہ جوشِ غیرت پھر فنا ہوگیا۔ رسوائی کا خوف پھر دل پر مسلط ہوگیا۔ فلسفے نے پھر کوتہ عملی کے سامنے سر جُھکا دیا۔ نیک نامی کا خوانِ شیریں زمین پر گر کر خاک میں مل چکا تھا۔ پر دل چیونٹی کی طرح پھر انھیں خاک آلودہ ریزہائے شکر سے جا چمٹا۔

اس واقعے کو پندرہ سال گزر گئے ہیں اور اب بھی لالہ گوپی ناتھ روزانہ رات کو یکہ و تنہا آنندی کے کمرے میں بیٹھے نظر آسکتے ہیں۔ لیکن وہ نام پر جان دیتے ہیں آنندی پریم پر۔ بدنام دونوں ہیں۔ لیکن آنندی کے ساتھ لوگوں کو ہمدردی ہے گوپی ناتھ سب کی نظروں سے گِر گئے ہیں۔ ہاں ان کے قریبی دوست اس واقعے کو تقاضائے بشری سمجھ کر اب بھی ان کی عزّت کرتے ہیں۔ لیکن پبلک اتنی متحمل نہیں۔

پہلی بار ہندی کے مریادا نومبر 1921 کے شمارہ میں شائع ہوا۔ ہزار داستان نومبر 1921 میں بھی شائع ہوا۔ اردو مجموعہ خواب و خیال اور ہندی میں تیاگی کا پریم کے عنوان سے مان سروور 6 میں شامل ہے۔

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں مدن گوپال کی اہمیت مسلّم ہے پریم چند کے خطوط کے حوالے سے بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔ اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔

مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔ 1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے اس کے علاوہ دینک ٹریبون چندی گڈھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے 1982 میں سبکدوش ہوئے۔